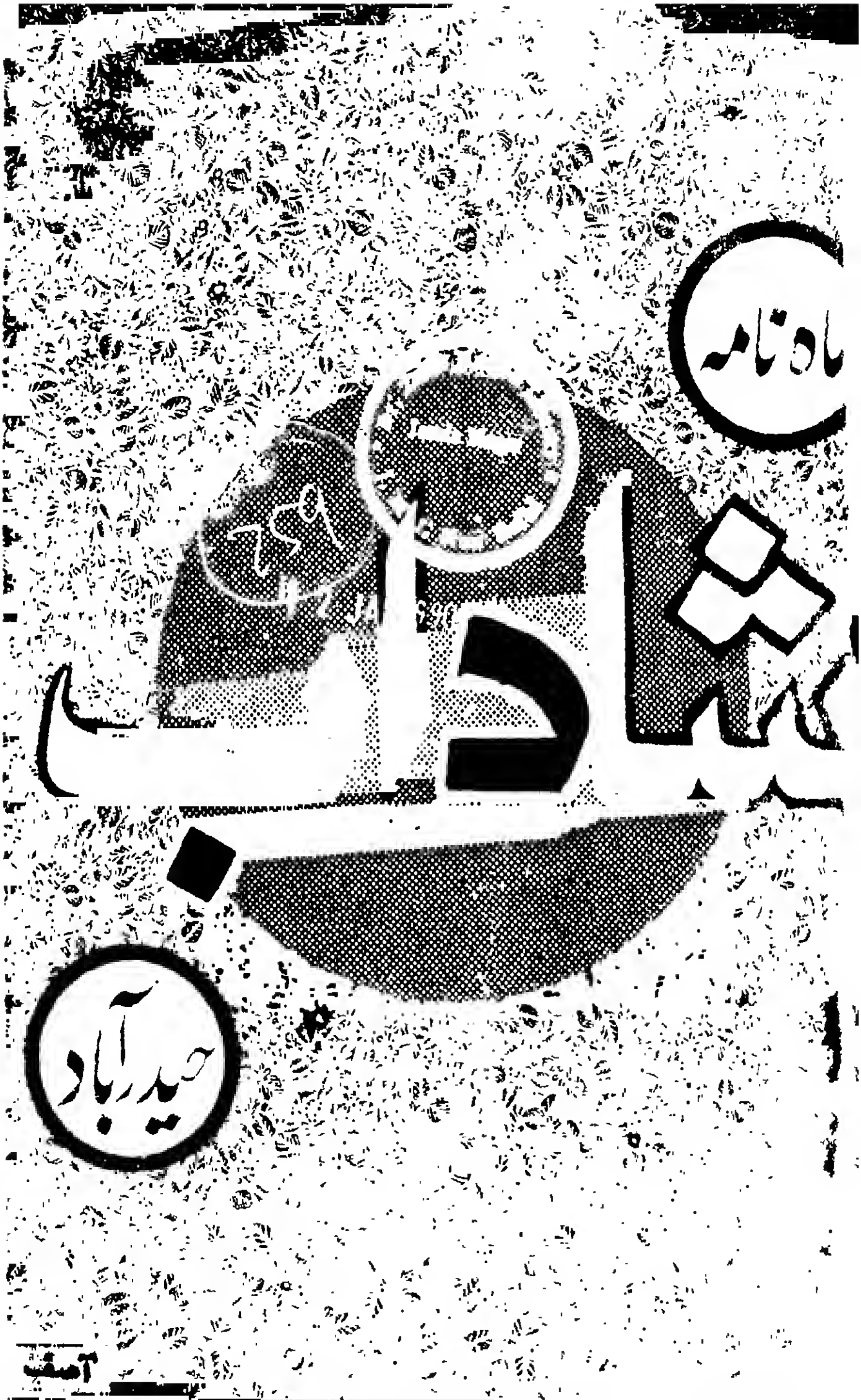

سب رس
حیدرآباد
آصف

ماہنامہ

شاداب

حیدرآباد

جلد (۷) شمارہ (۱) جنوری ۹۰ء حیدرآباد

ایڈیٹر	جائنٹ ایڈیٹر	مینجنگ ایڈیٹر
محمد قمرالدین صابری	رشید الدین	کلیم الدین احسن

قیمت : 5/-

مجلس مشاورت

• محترمہ عائشہ بیگم رباب • یوسف ناظم • ڈاکٹر محمد یوسف الدین • پروفیسر رضی الدین احمد
• منیر احمد صدیقی • محمد منظور احمد صدیقی • محترمہ سیدہ مہر • ڈاکٹر منشاء الرحمٰن خاں منشار
• پروفیسر میر تراب علی

زرِ تعاون

	ہندوستان	خلیجی ممالک	امریکہ	انگلستان	پاکستان
سالانہ	50 روپے	150 روپے	35 ڈالر	20 پونڈ	125 پاکستانی روپے
۲ سال	90 روپے	270 روپے	65 〃	35 〃	205 〃 〃
تاحیات	1000 روپے	2500 روپے	650 〃	300 〃	2000 〃 〃

ترسیلِ زر کا پتہ

ماہنامہ "شاداب" 147-5-11 ریڈ ہلز، حیدرآباد (اے۔پی)

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر محمد قمرالدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان سے چھپوا کر
دفتر "شاداب" 147-5-11 ریڈ ہلز حیدرآباد اے پی سے شائع کیا۔

فہرست

حرف اول	ایڈیٹر	۳
قیام خلافت	مولانا محمد جلال الدین کامل حسامی	۴
سائینس ٹکنالوجی اور تیسری دنیا	پروفیسر عبدالسلام	۱۱
آزادی کے بعد کا ہندوستان اور مسلمان ادبا	انیس چشتی	۱۸
مسلم آبادی کا ارتقاء	ڈاکٹر عادل طہ یونس	۲۴
مولانا حسرت موہانی	سید حسام الدین	۲۸
گنج گرانمایہ : منشی نولکشور	مسعود احمد شروانی	۳۱
عائشہ آپا	سیدہ مہر	۳۴
علیگڑھ مسلم یونیورسٹی اور اردو ذریعہ تعلیم	آل احمد سرور	۳۸
سہ لسانی فارمولا اور اس میں اردو کا مقام	ڈاکٹر راج بہادر گوڑ	۴۷
اردو میں اعراب کا مسئلہ	ڈاکٹر جمیل جالبی / ڈاکٹر صابر سنبھلی	۵۱
اردو تعلیم پر ہندی کی پرچھائیں	ڈاکٹر سید حامد حسین	۵۵
بھارت میں تحریک ماحولیات	پی آئی بی	۵۹
غزلیات	ڈاکٹر منشاء ور شوق	۶۳
〃	امین بیدوی و عزیز ناگپوری	۶۴

حرف اول

خوش آئند تبدیلی!

آندھرا پردیش میں ماہ گزشتہ ایک خوشگوار تبدیلی آئی ہے اور تلگودیشم کی چھ سالہ حکومت کا خاتمہ ہو کر پھر کانگریس (آئی) برسر اقتدار آئی ہے۔ افسوس کا مقام ہے کہ تلگودیشم پارٹی اپنے چھ سالہ دورِ حکومت میں کبھی اقلیتوں اور خصوصاً اردو والے اقلیت کا اعتماد حاصل نہ کرسکی گو اس کے دور میں بھی اردو کیلئے بعض کام کئے گئے لیکن کانگریس (آئی) کی اقلیت دوستی اور اردو نوازی کے سامنے یہ کبھی پسندیدگی کی نظروں سے نہیں دیکھے گئے۔

نئی تبدیلی کے ساتھ ہی ڈاکٹر ایم چناریڈی نے پھر ایک بار حکومت سنبھالی ہے جو اقلیتوں اور خصوصاً اردو دنیا میں بے حد مقبول ہیں۔ ڈاکٹر صاحب جامعہ عثمانیہ کے قدیم سپوت ہیں جنھوں نے ایم بی بی ایس تک اردو میں تعلیم حاصل کی۔ ویسے بھی شخصی طور پر یہ اردو کے دوست مشہور ہیں اور ان کے حلقہ احباب میں اردو والوں کی بڑی تعداد پائی جاتی ہے۔

ایسی صورت میں اردو والوں کا ان کے وزیر اعلیٰ بننے پر خوش ہونا نامناسب نہیں ہے گو ایک ماہ سے وہ نظم ونسق کی گتھیوں میں الجھے ہوئے ہیں اور ابھی دیگر مسائل کی طرف توجہ کرنے کا انہیں موقعہ نہیں ملا ہے اس لئے وہ اردو کے تعلق سے کوئی اعلان نہیں کرسکے ہیں لیکن توقع ہے کہ وہ اطمینان کے ساتھ اردو مسائل پر بھی غور کریں گے۔

گزشتہ ماہ ۲۴ دسمبر کو اردو تعلیمی کمیٹی کی ۱۱ ویں اردو کانفرنس میں انہیں اردو کے تعلق سے کوئی اہم اعلان کرنے کا موقعہ ہاتھ آیا تھا لیکن انہوں نے صرف اتنا ہی کہا کہ اردو والے کیا چاہتے ہیں انہیں وضاحت کے ساتھ پیش کیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ وہ اپنے دوسرے دور حکومت میں یقیناً اردو کے تعلق سے کوئی ٹھوس کام کریں گے۔ اردو اکیڈیمی کی تنظیم جدید اور اس کی گرانٹ میں اضافہ بھی ان کی توجہ کا مستحق ہے۔ توقع ہے کہ ڈاکٹر چناریڈی اردو والوں کو مایوس نہیں کریں گے۔

— ایڈیٹر

مولانا محمد جلال الدین کامل حسامی
سرپرست اعلیٰ امارت شرعیہ (اے۔پی)
حسامی منزل، پنجہ شاہ، حیدرآباد

قیام خلافت

ع "بھولے ہوئے سبق کی ہے یہ یاد دہی"

قائم ہی سہی یہ ارض و سما، لیکن ہے فضا میں زہر گھلا
دیتے ہیں گزرتے لمحے صدا، انسان مٹا کیا عرض کریں

اگرچہ یہ حقیقت ناقابل انکار ہے کہ مذہب اسلام علاقوں یا خاندانوں میں محدود نہیں ہے بلکہ یہ عالمی مذہب ہے۔ اور آج بھی دنیا کے کونے کونے میں تک مسلمان پائے جاتے ہیں خواہ وہ اپنے اپنے مقام پر دوسروں کے بہ نسبت کم ہی سہی مگر بسنے والے ہیں ضرور ہے

اسلام کا یہ پھیلاؤ حضرات صحابہ کرامؓ کے جذبۂ اعلائے کلمۃ اللہ اور عربوں کی مجاہدانہ خلوص نیت کے سبب سے ہوا ہے۔ جس کی جس قدر، قدر کی جائے کم ہے۔ اور آئندہ بھی انشاء اللہ تعالیٰ مسلمانوں میں عددی اضافہ ہوتا ہی رہے گا۔ مگر اب ان میں تنظیم پیدا کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ ہے

بے تمیزی ہے، یہاں تک کہ، زمانے میں ظفر
نہ وہ تنظیم ہی شئے ہے نہ وہ آداب ہی شئے

جس کا ایک سبب مشیت الٰہی اور دوسرا سبب مرور زمانہ ہے جس نے مسلمانوں میں انتشار اور پراگندگی پیدا کردی ہے۔ قرآن مجید میں ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِیَعًا۔ یعنی بے شک جن لوگوں نے اپنے دین کو جدا جدا کردیا اور گروہ گروہ بن گئے۔ (پ ۸ ع ۷) اور یہ خیال نہ کیا کہ بقول علامہ اقبال ؒ

منفعت ایک ہے اس قوم کی، نقصان بھی ایک ایک ہے سب کا نبی، دین بھی ایمان بھی ایک
حرم پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

قیام خلافت کیلئے حالات خاطرہ ناسازگار ہونے کے وجوہ

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

چونکہ ایسے طور طریق کے غلط ہونے کے متعلق نقلی و عقلی دلائل موجود ہیں - اور یہ کہ مسلمانوں کی حیات اجتماعی کا سب سے بڑا سانحہ سلسلہ خلافت کا انقطاع ہے ۔ اس لئے ہر دور میں مسلمان قوم کے دلوں میں اس کی درستی کے لئے قیام خلافت کی امنگیں پیدا ہوتی رہیں تو انہوں نے اپنے اپنے ماحول کے مزاجوں کے پیش نظر قیام خلافت کی راہ ہموار کرنے کیلئے حتی المقدور مختلف اصلاحی طریقوں کو اپنانے کی کوششیں کیں ۔ جیسے علمائے حق کے علمی حلقے وجود میں آئے ۔ ہمدرد قوم و ملت لیڈر بھی پیدا ہوئے ۔ درد مندان اسلام نے بھی اصلاح المسلمین کا بیڑہ اٹھایا ۔ جنکی وجہ اگر کچھ اصلاح ہوتی بھی تو پھر دوسری نسل میں وہ اثرات ماند پڑتے رہے جیسے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بھی تبلایا ہیکہ

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ

یعنی پیران (سلف صالحین) کے بعد ان کے جانشین ایسے ناخلف آئے جنھوں نے نماز کو ضائع کیا اور (نفسانی) خواہش کی پیروی کی (پ ۱۶ ع ۸) اس لئے اب تو بقول کیفی

غیرت و شرم و حمیت تو رہی کوسوں دور
اب تو قسمت سے ندامت بھی بھٹکتی ہی نہیں

کے جیسا حال ہے اور اچھے مسلمان خال خال رہ گئے ہیں ہر طرف گمراہی کے جال پھیلائے جا رہے ہیں گو بقدر بھی داعیان حق موجود ہیں ان کی سنوائی کم ہوتی جارہی ہے اور سچے مسلمان بننے کے اسباب اس لئے معدوم ہو رہے ہیں کہ خالص علوم دینیہ عربیہ حاصل کرنے کے ذوق کے بجائے ہماری نئی نسل نے دنیاوی علوم حاصل کرنے کے شوق کو مقصد زندگی سمجھ چکی ہے اور ہر ایک کے ذہن میں یہ ہیکہ سو

فقرۂ روزگار ہے در پیش ✣ کیا کریں دین کے مسائل کو (اکبر الہ آبادی)

حالانکہ اللہ تعالیٰ نے جو رزاق مطلق ہے فرمایا ہے کہ

فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْيَا

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو دنیا ہی میں دیدے تو ایسوں کے بارے میں فرمایا وَمَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۔ یعنی ایسے کو آخرت میں کوئی حصہ نہ ملے گا ۔ (پ ۲ ع ۹) ..

لہٰذا یہ سمجھنا چاہیئے کہ صرف دنیا کو طلب کرنا آخرت کی بھلائی سے محرومی کا باعث ہوتا ہے۔ آج کل کے مسلمانوں کی ذہنیت پر غور کیا جائے تو ثابت ہوتا ہے کہ الٹی ہوگئی ہے مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جس وعدہ کیاہے اس پر یقین کرنے کے بجائے شک کیا جاتاہے اور جس امر کا اللہ تعالیٰ نے یقین نہیں دلایا ہے اس پر یقین۔ اللہ تو کا ارشاد ہے۔ فَیَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَاءُ وَیُعَذِّبُ مَنْ یَّشَاءُ یعنی پس جو کو چاہے گا بخشے گا اور جسے چاہے گا (نوبخشکر) اسے عذا دے گا (پ۳ ر۸) تو ہر مسلمان اپنے کو بخشا ہوا ہی سمجھتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے یہ فرماکر وَمَا مِنْ دَابَّۃٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزْقُھَا یعنی کوئی (رزق کھانے والا) جاندار روئے زمین پر چلنے والا ایسا نہیں کہ اس کی روزی اللہ تعالیٰ کے ذمہ نہ ہو (پ۱۲ ر۱) رزق رسانی کا یقین دلایا ہے اس پر شک کرتے ہوئے دنیا طلبی میں اس قدر معروف رہتے ہیں کہ دین کو فراموش کر دیتے ہیں حالانکہ ایسوں کے بارے میں صراحتہً اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہیکہ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِکْرِیْ فَاِنَّ لَہٗ مَعِیْشَۃً ضَنْکًا۔ یعنی اور جو شخص میری نصیحت سے منہ پھیرے گا تو اس کے لئے تنگی کا جینا ہوگا۔ (پ۱۶ ر۱۶) تو ایسے لوگ اس نے گھاٹے میں رہتے ہیں کہ دنیا طلبی کی کوششوں میں عمریں صرف کرنے کے باوجود انہیں اتنی ہی دنیا ملتی ہے جتنی قسمت میں رہتی ہے اس لئے فرمایا گیا ہے کہ اَلْنَّصِیْبُ یُصِیْبُ یعنی نصیب میں جس قدر رہتا ہے اتنا ہی نصیب ہوا کرتا ہے مگر آخرت میں کچھ نہ ملے گا۔ ؎

نہ خدا ہی ملا۔ نہ وصال صنم ... نہ ادھر کے ہوئے نہ ادھر کے ہوئے

لہٰذا ہر مسلمان کیلئے مناسب طریقہ یہ ہیکہ دین کو بہرحال حاصل کریں مگر اس سے غافل ہوکر دنیا ہی میں منہمک نہ ہو جائے۔ اسلام میں ترک دنیا سے منع کیا گیا ہے اور یہ فرمایا گیا ہے کہ وَمِنْھُمْ مَنْ یَّقُوْلُ رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ اور بعضے آدمی (جو مومن ہیں) ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو دنیا کی بھلائی بھی دے اور آخرت میں بھی بھلائی عطا فرما اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا (پ۲ ر۹) اس آیت کے بعد اللہ تعالیٰ نے دنیا کے ساتھ آخرت کی بھلائی طلب کرنے والوں کے بارے میں فرمایا ہیکہ

اُولٰٓئِکَ لَھُمْ نَصِیْبٌ مِّمَّا کَسَبُوْا وَاللّٰہُ سَرِیْعُ الْحِسَابِ ۝ ایسے لوگوں کو (دونوں جہاں میں) بڑا حصہ ملے گا سبب ان کے عمل کے اور اللہ تعالیٰ جلد حساب لینے والا ہے (پ۲ ر۹) ان آیات کی روشنی میں بتانا یہ ہیکہ دینی علوم کے ساتھ دنیاوی علوم بھی حاصل کریں۔

تم شوق سے کالج میں پڑھو پارک میں پھولو
جائز ہے غباروں پر اڑو۔ چرخ پہ جھولو
پر ایک سخن اکبرِ مسکیں کا رہے یاد
اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

جتنے مسلمان دنیاوی تعلیم پا رہے ہیں اتنے علوم دینیہ عربیہ سے مستفید نہیں ہو رہے۔ کچھ فیصد کا نرے عالم باعمل بنتے جانا بھی تو لازمی سمجھنا چاہئے تاکہ دین سے غفلت کی وجہ جو مسلمانوں کی زندگیاں تنگ ہو رہی ہیں اس تنگی کو اللہ تعالیٰ دور کر دے۔ اور اللہ تعالیٰ نے ہر دو طریقوں کے اثرات سے واقف کر کے مسلمانوں کو اپنی آپ درستی کا ذمہ دار بتایا ہے چنانچہ اس سلسلے میں ارشاد الٰہی کا منظوم ترجمہ یہ ہے کہ ؎

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی ؛ نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

سطور بالا کا مقصد جدید تعلیم پانے سے روکنا نہیں ہے بلکہ دین بیزاری سے روکنا ہے کیونکہ فی زمانا اسکی وجہ مسلمانوں میں کئی دینی خرابیاں پیدا ہونے لگی ہیں جیسے اسلام کی حقیقی تعلیمات کے خلاف عمل پایا جا رہا ہے اور یہ بھی ہو رہا ہے کہ ؎

جسے چاہیں اسے حق مانتے ہیں
جسے چاہیں خطا گردانتے ہیں

پھر یہ کہ دینی معلومات کو زائد از ضرورت اور از خود سمجھ میں آ جانے والا سمجھ لیا جا رہا ہے۔ حالانکہ دینی علوم صرف قرآن مجید کے ترجموں سے حاصل نہیں ہو سکتے بلکہ علوم دینیہ عربیہ سے حاصل ہوتے ہیں جو مستقل کئی علوم کا مجموعہ ہیں اور مسلمانوں کی صحیح ترقی کا راز ان کے ہی حصول میں پوشیدہ ہے۔ حتیٰ کہ قیام خلافت کو عملی جامہ پہنانا بھی دینی لگاؤ پیدا ہونے کی وجہ سے ہی ہو سکتا ہے۔ اسی سلسلے میں ایک اور المیہ یہ بھی ہے کہ مشاہدہ یہ بتاتا ہے کہ محض دنیاوی تعلیم پائے ہوئے مسلمان انگریز زدہ ہو جاتے ہیں چنانچہ ان میں سے جن مسلمانوں کو دینی معلومات کی رغبت ہوتی ہے تو وہ علمائے حق کی تصانیف کے مطالعے کے بجائے اسلام سے منحرف مستشرقین کی انگریزی تصانیف سے اسلامی تعلیمات سے واقف ہونے کو ترجیح دیتے ہیں جسکی وجہ اسلام کی بو باس کے بجائے بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

ترے علم و ادب سے آ رہی ہے بوئے نعرانی
یہی ہے مرنے والی امتوں کا عالم پیری

ایسے لوگ صرف اسلام کی حقانیت کو معلوم کرنا ہی آخرت کیلئے کافی سمجھتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ اس کا معلوم کرنا تو صرف غیر مسلموں کیلئے ضروری ہے جو خود پہلے سے مسلمان ہی ہیں تو اپنے لئے ارکان اسلام۔ ایمانیت نماز۔ زکوٰۃ۔ روزہ۔ اور حج کے مسائل فقہی کو معلوم کر کے صحیح طور پر عبادات کی ادائی کے لئے نکھرے اسلام

کہ محنتوں سے مستفید ہونے کو ضروری سمجھنا چاہیئے اور یہ باتیں کسی مستشرق سے معلوم نہیں ہوسکتیں سخن

لکھتا ہوں اسد سوزش دل سے سخن گرم　　تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پہ انگشت

غرض محض دنیوی تعلیم کی وجہ ہماری مسلمان نئی نسل کی اکثریت کا انداز فکر دینی مزاج سے ہٹتا جارہا ہے معلوم نہیں کہ انجام اس کا کیا ہو سے

طفل دل محو طلسم رنگ کالج ہوگیا　　ذہن کو تپ آگئی ۔ مذہب کو فالج ہوگیا

جسکی وجہ اسلامی اصلاحات جیسے قیام خلافت وغیرہ پر توجہ کم ہوتی جارہی ہے اور دنیاوی علوم میں مہارت کے نشے میں جدید تعلیمیافتہ اپنے اپنے ناتمام دینی معلومات کی وجہ "نیم ملا خطرہ ایمان" کے مصداق بنکر اپنے اپنے خیال کے مطابق اسلامی مسائل کو ڈھالنے لگے ہیں یعنی اللہ ورسول کے صریح احکام میں رائے زنی سے تاویلات پیدا کرکے حسب منشا مسئلے تراش کے خلاف ورزی کی جارہی ہے جس کی وجہ دینی مسائل میں سے فقہی روح نکلتی جارہی ہے ۔ مثلاً طے شدہ متعدد مسائل پر جیسے طلاق کے بارے میں جو غیر متعلقہ لوگوں کے آجکل تبصرے ہورہے ہیں یا مسئلہ مہر کے متعلق رائے زنی اور وراثت میں لڑکی کو لڑکے کے برابر حصہ دار بنانے وغیرہ کی کوششیں اسلام کو بھی اسی طرح مسخ کرنے والی ہورہی ہیں جس طرح یہودیت اور عیسائیت مسخ ہوچکی ہیں ۔ کیا ایسے لوگ اسکی گیارنٹی دے سکتے ہیں کہ قیامت میں اللہ تعالیٰ ان کی کثرت رائے کی وجہ سے اپنی نافرمانی کو نظر انداز فرمادے گا ؟ ہرگز نہیں کیونکہ قیامت میں تو یہی دیکھا جائے گا کہ کس نے اللہ ورسول کے احکام کی پابندی کیا ہے اور کس کس نے نافرمانی کی ہے اور ثواب وعذاب انہی بنیادوں پر رہے گا اسلیئے اگر ثواب پانا ہے تو محض تعمیل حکم کو اپنے پر لازم سمجھنا چاہیئے کیونکہ اعمال اسلام اللہ ورسول کے مقرر کردہ ہیں نہ کہ بادشاہ کے ۔ چنانچہ زیر بحث موضوع "قیام خلافت" بھی ایسا ہی ہے ۔ اور خلیفہ کی مذہبی ضرورت صرف اس لئے ہے کہ مسلمانان عالم کو اللہ اور رسول کے احکام کا پابند بنایا جائے ۔ اور سطور بالا میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا مقصد یہی ہے کہ خلیفۃ المسلمین کا صحیح انتخاب مسلمانان عالم کے دینی مزاج بننے کے بعد ہی فروغ اسلام کا سبب ہوسکے گا ۔ ورنہ یہ اسکیم بھی فیل ہوجانے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ امت مسلمہ اپنی درستی سے ناامید ہوجائے گی ۔ اور اللہ ورسول کے احکام کے بموجب خلیفہ بنانا شرعاً بے فائدہ ہوجائے گا ۔

قیام خلافت سے کیا ہوگا ۔ مخفی نہ رہے کہ موجودہ نظام ہائے حکومت کے پیش نظر تعمیل احکام

ام کے دو حصوں (۱) تعزیرات اور (۲) ان کے سوا دیگر اصلاحات ہیں چونکہ تعزیرات یعنی حدود شرع فاذ بغیر سیاسی اقتدار کے ناممکن ہے اس لئے خلیفۃ المسلمین کیلئے دوسرے حصہ یعنی مسلمانوں کی اخلاق صلاح اور اسلام کی عبادات کے پابند بنانے اور عمل صالح پر مسلمانوں کو قائم رکھنے کی ذمہ داری سونپی جاسکتی جس کا ثانوی اثر چونکہ مسلمانوں کو حدود شرعی کے قابل نہ ہونے دیگا اس لئے حدود شرعی کا فائدہ یرات کے بغیر خود حاصل ہوتے رہے گا۔ اس لئے اس اسکیم کو یہ کہکر ٹالا نہیں جاسکتا کہ کیا خلیفۃ المسلمین ر کا ہاتھ کاٹ سکے گا یا زنا کی وجہ سنگسار کرسکے گا۔ وغیرہ وغیرہ۔ جب یہ نہ کرسکے گا تو پھر خلیفۃ المسلمین نے سے کیا فائدہ ؟

. چونکہ یہ مانی ہوئی حقیقت ہے کہ انتشار اور پراگندگی بیشمار خرابیوں کا سبب ہونے سے مضر ثابت ہوتی اور مسلمانانِ عالم میں آج کل انتشار موجود ہے اس لئے اسے دور کرنے کا واحد طریقہ مسلمانوں میں پیدا کرنا ہے اور تنظیم کیلئے مرکز کا قیام لازمی ہوتا ہے۔ چنانچہ اس قدر وسیع و عریض کائنات بھی خالق کائنات مرکز ہے کہ سب اسی کے محتاج اور اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انی نظام مستحکم ہے۔ لہذا مسلمانوں کے بھی کام اسی صورت میں مفید طریقہ پر ہوسکتے ہیں جبکہ اسکے بھی مرکزیت موجود ہو۔ اور مرکز کی اہمیت اس سے بھی واضح ہوتی ہے کہ کسی چیز کا تعین اس وقت نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کے لئے کسی نہ کسی کو مرکز تسلیم نہ کیا جائے۔ مثلاً خطوط کھینچنا ہو یا ئرہ وغیرہ بنانا ہو تو سب سے پہلے کسی نہ کسی کو مرکز قرار دینا پڑتا ہے۔ پھر وہاں سے ہر چیز بنائی سکتی ہے۔ اور یہ کہ دائرے سے مرکز کی طرف جتنے خطوط کھینچیں خواہ وہ سیدھے ہوں یا ٹیڑھے ز ہی پر ختم ہوتے ہیں۔ اسی طرح ٹیڑھے مسلمان ہوں یا سیدھے سب کیلئے خلیفۃ المسلمین کی مرکزیت وری اور کارآمد ہوتی ہے اور چونکہ قیام خلافت کا مقصد سر دست حدود شرعی کا نفاذ نہیں بلکہ مسلمانوں ی دینی درستگی پیدا کرنا ہے۔ اس لئے دنیا کے کسی کونے میں مسلمان بستا ہو وہاں کے حکومتی نظام کراؤ کے بغیر اپنے مرکز دینی یعنی خلیفہ سے اسی طرح مربوط رہ سکتا ہے جس طرح عیسائی خواہ کسی ملک رہے مگر وہ اپنے مذہبی رہنما "پوپ" کا مذہبی حیثیت سے پابند رہتا ہے کوئی حکومت اسکی وجہ اپنا باغی نہیں کہتی۔

. ہمارے ہندوستانی مسلمانوں کو بھی یہ خوف نہ کرنا چاہیئے کہ خلافت کی تحریک چلانا ہمارے ملک

میں پابندی عائد ہونے کا باعث ہوگا۔ کیونکہ سیکولر جمہوریہ ہے۔ ہر مذہب والا اپنے اپنے مذہبی احکام کے موافق عمل کرنے میں آزاد ہے اور خلافت کا قیام خالص مذہبی ہے اس لئے بھی کہ احکام اسلام کے تحت خلیفہ کی فرمانبرداری ویسی ہی ہے جیسی کہ صلوٰۃ وصوم میں اللہ ورسول کی اطاعت ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں ہمارے برادران وطن کے مہاتما آنجہانی گاندھی جی خود تحریک خلافت کے نمایاں علمبردار رہے ہیں چنانچہ معماران پاکستان کے دوش بدوش تحریک خلافت میں جسکے محرکین میں مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی تھے گاندھی جی نے بھی سرگرمی سے حصہ لیکر اپنے ملنے والوں پر یہ واضح کر دیا ہے کہ ہندوستان کی اکثریت پر بھی قیام خلافت کی تائید کرنا لازمی ہے۔ ایسی صورت میں کسی سے مخالفت کی توقع کیسے ہوسکتی ہے۔

۴۔ قرآن مجید سے ثابت ہے کہ زمین پر انسانوں کو آباد کرنے کا اللہ تعالیٰ نے جب ارادہ کیا تو انسانوں کو پیدا کرنے سے قبل سب سے پہلے انسان کا "خلیفہ" کے نام ہی سے تعارف کروایا۔ اس کے بعد ان کا نام آدمؑ رکھا گیا۔ جن سے انسانوں کی نسلیں پوری زمین پر پھیل گئیں اور سب انکی نسبت سے آدمی کہلانے لگے اس لئے آدمی ہی خلیفہ ہوسکتا ہے اس کے سوا زمین پر کوئی دوسری مخلوق "خلیفہ" کے لقب کی سزاوار نہیں ہوسکتی۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدمیوں کو ہی مخاطب کرکے قرآن مجید میں فرمایا ہے کہ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَاءَ الْأَرْضِ یعنی اور کرتا ہے (اللہ تعالیٰ) تم (آدمیوں) کو زمین میں خلیفے (پ۲۰ س۱) اس لئے یہ تحریک خلافت ہماری مذہبی کتاب قرآن مجید کے بموجب ہے نہ کہ کسی غلط نیت کی بنا پر سے

پاک دامن ہو تو ارمان وصال اچھا ہے ۔۔۔ اچھی نیت ہو تو اچھوں کا خیال اچھا ہے

۵۔ قرآن مجید میں مسلمانوں کے لئے خلیفہ کے لزوم سے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ ؎
یعنی اے ایماندارو تم اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کرو اور رسول کی (بھی) فرمانبرداری کرو اور ان کی بھی جو تم (امیتوں) میں سے صاحب حکم (امیر) ہو (پ۵ ر۵) اس آیت میں یہ بھی سمجھنے کی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نام کے ساتھ اَطِيعُوا (یعنی فرمانبرداری کرو) جس طرح فرمایا ہے اسی طرح رسول کیلئے اَطِيعُوا (یعنی فرمانبرداری کرو) کو دہرایا ہے جس سے یہ واضح [بقیہ آئندہ شمارہ میں]

پروفیسر عبدالسلام
ڈائرکٹر انٹرنیشنل سنٹر فار تھیورٹیکل فزکس
ٹریسٹے ۔ اٹلی

سائنس، ٹکنالوجی اور تیسری دنیا

[سی پی ایس ۔ تہذیب الاخلاق انعامات ۱۹۸۷ء برائے عام فہم سائنسی مضمون نگاری کی تقسیم کا جلسہ علی گڑھ یونیورسٹی میں ۱۳ ارمئی ۱۹۸۹ء کو منعقد ہوا ۔ اردو میں عام فہم سائنسی ادب کیلئے سی پی ایس (سنٹر فار پروموشن آف سائینس) کی کوششوں کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ چھ مضمون نگاروں کو 1500 روپے فی کس انعام اول، چار مضمون نگاروں کو 500 روپے فی کس خصوصی انعام اور مزید چار کو 250 روپے فی کس تشویقی انعام دیئے گئے ۔ اردو دنیا کے واحد نوبل انعام یافتہ سائینداں، پروفیسر عبدالسلام نے انعامات تقسیم کئے اور مندرجہ بالا موضوع پر اپنا معلوماتی اور گراں بہا لکچر دیا ۔ ماہنامہ تہذیب الاخلاق کے شکریہ کے ساتھ یہ لکچر قارئین شاداب کی نذر ہے ۔]

اپنی بات کہنے سے پہلے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک قول پیش کرونگا جس کا مفہوم یہ ہے کہ جو شخص اللہ کا شکر ادا نہیں کرتا وہ خدا کا شکر گذار نہیں ۔ اس ارشاد گرامی کے پیش نظر اس میز کے گرد بیٹھے ہوئے معزز اشخاص میں سے بائیں طرف سے شروع کرتے ہوئے سب سے پہلے میں جناب سید حامد کا دلی شکریہ ادا کروں گا جنہوں نے اپنے دور میں مجھے یہاں پہلی بار مدعو کر کے اس عظیم یونیورسٹی کو دیکھنے کا موقع عطا فرمایا اور اس یونیورسٹی کی اعزازی ڈگری دیکر علیگ برادری میں شامل کیا ۔ سید حامد صاحب کا ان مخلصانہ کلمات کے لئے بھی شکر گذار ہوں جو ابھی انہوں نے میرے بارے میں کہے ہیں ۔ اسلامی سائینس کی بابت انہوں نے میرے جذبات کی صحیح ترجمانی کی ہے ۔ اس کے بعد جناب پرو وائس چانسلر صاحب ہیں جن کا شکریہ

ادا کرنا مجھ پر واجب ہے، جنھوں نے وائس چانسلر صاحب کی عدم موجودگی میں مجھے یہاں مدعو کیا تھا اور میری بڑی عزت افزائی کی تھی۔ اب یہ جواں سال شیروانی صاحب ہیں جن کی مجھ پر بڑی کرم فرمائیاں ہیں۔ آپ نے مجھے ڈیوٹی سوسائٹی کے سرپرستوں میں شامل کیا اور ڈیوٹی سوسائٹی کی طرف سے دعوت نامے بھیجے۔ مجھے یہ دیکھ کر دلی خوشی ہیکہ شیروانی صاحب آج بھی پرجوش اور فعال ہیں اور میرے مقابلے میں کم عمر دکھائی دیتے ہیں۔

یہ آپ کے وائس چانسلر جناب سید ہاشم علی صاحب ہیں جن کی اس لحاظ سے مجھ پر دیرینہ نوازشیں رہی ہیں کہ مجھے کئی موقعوں پر یاد کیا اور یہ انہیں کے اخلاص کی کشش ہے جو میں آج آپ کے درمیان موجود ہوں۔ میرے اعزاز میں اس جلسے اور دوسرے کئی پروگراموں کا اہتمام کر کے سید ہاشم علی صاحب نے جس طرح اپنی نوازشوں کی بوچھار کی ہے، اس کے لئے میں تہ دل سے بہت بہت شکر گزار ہوں۔

اس کے بعد میں جناب حکیم عبدالحمید صاحب کا شکریہ ادا کروں گا جنھوں نے سب سے پہلے مجھے ہندوستانی مسلمانوں کے تعلیمی مسائل سے آگاہ کیا اور انکی تعلیمی پسماندگی کی طرف متوجہ کیا۔ حکیم صاحب کی یہاں موجودگی سے میری عزت افزائی ہوئی ہے اور میں آپ تمام حضرات کے ساتھ مل کر تن تنہا ایک یونیورسٹی قائم کر لینے پر انہیں دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

اب میں ڈاکٹر اسرار احمد کا شکریہ ادا کروں گا جو اکثر تراشے میں مجھے یہاں کے سائنسی پروگراموں کی پیشرفت سے ازراہ مہربانی آگاہ کرتے رہے ہیں اور جنھوں نے میری پذیرائی میں ماہنامہ تہذیب الاخلاق کا یہ خوبصورت یادگار شمارہ نکالا ہے جسکے پہلے صفحے پر میرے اقوال نقل کئے ہیں۔ میں ان کا اس لئے بھی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے سرسید کے زریں اقوال کی ایک فہرست پیش کی ہے اور اس لئے بھی کہ وہ تہذیب الاخلاق کو ایک مفید رسالہ بنانے کی انتھک کوشش کر رہے ہیں۔

یہ رہے میرے دوست انعام یافتگان جنھوں نے اردو زبان میں معیاری عام فہم سائنسی مضامین لکھ کر انعام حاصل کیا ہے۔ ان کا شکریہ ادا کرنا مجھ پر اس لئے واجب ہیکہ انہوں نے سائنس کے فروغ میں دلچسپی لی جو میرا مشن ہے۔

آخر میں میں تمام معزز مہمانوں، اساتذہ اور طلباء کا شکریہ ادا کروں گا کہ اس جلسے میں بھاری تعداد میں شریک ہوکر میری بڑی عزت افزائی کی اور میری باتوں کو سننے کے لئے اپنا قیمتی وقت صرف کیا۔

حضرات!

اب میں خصوصیت کے ساتھ تیسری دنیا میں سائنس اور ٹکنالوجی کی حالت کے بارے میں گفتگو کروں گا۔ کل میں آپ کے وزیر اعظم سے ملا تھا اور انہیں تھرڈ ورلڈ اکیڈمی آف سائنس کے زیر اہتمام شائع ہونے والی اپنی کتاب Notes on Science, Technology and Science Education in the Development of South. کا تحفہ پیش کیا۔ اس کتاب کو ساؤتھ کمیشن کے لئے تیار کیا گیا ہے۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہوگا اس کمیشن کو قائم کرنے میں آپ کے وزیر اعظم راجیو گاندھی نے بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ اس کمیشن کے تعلق سے میرا یہ کام رہا ہے کہ سائنس اور ٹکنالوجی کو اس کے صحیح پس منظر میں دیکھا جائے۔ میری درخواست پر آپ کے وزیر اعظم نے اس کتاب کے خلاصے کو دلچسپی سے پڑھا جسے میں یہاں دہرانا چاہوں گا۔

یہ کرہ ارض دو مختلف قسم کے انسانوں سے آباد ہے۔ یو۔ این۔ ڈی۔ پی کی ۱۹۸۳ء کے اعداد و شمار کے مطابق تقریباً ایک ارب انسان یعنی دنیا کی چوتھائی آبادی ترقی یافتہ ہے جو زمین کے تقریباً ⅗ رقبہ پر بستی ہے اور جس کے قبضے میں تقریباً اسّی فیصد قدرتی ذخائر اور وسائل ہیں۔ اس کے مقابلے میں باقی تقریباً ساڑھے تین ارب انسان جو زمین کے ⅖ رقبہ پر بستے ہیں غریب پسماندہ اور مصیبتوں کے مارے ہوئے ہیں انسانوں کے ان دونوں گروہوں میں فرق یہ ہے کہ اوّل الذکر گروہ کے پاس جوش ولولہ طاقت اور دولت ہے جو بنیادی طور پر اس دور کی سائنسی اور ٹکنالوجی پر اس کی مہارت کی وجہ سے ہے۔ اب یہ ان لیڈروں کو طے کرنا ہے جن کے ہاتھ میں پسماندہ انسانیت کی قسمت ہے کہ کیا وہ ان اقدامات کو کرنے کے لئے تیار ہیں جن سے تیسری دنیا کے لوگ اس قابل ہوسکیں کہ جدید سائنس اور ٹکنالوجی میں مہارت

حاصل کرکے تخلیقی کام کریں اور اسے ترقی کے لئے استعمال کریں"

یہی میرا پیغام ہے جسے میں ملک ملک پہونچا رہا ہوں۔ اس پیغام کی تفسیر اس کتاب میں ہے ماہرین معاشیات کو شکایت یہ ہے کہ میں نے معاشی محرکات پر خاموشی اختیار کی ہے۔ میرے نزدیک معاشی محرکات کی بات دوسرے درجے میں آتی ہے۔ اول کام ان اقدامات کا کرنا ہے جن سے دولت کی تخلیق ہوسکے۔

اس دور کی سائینس اور ٹکنالوجی چار اقسام کی ہیں۔

۱۔ بنیادی سائینس　۲۔ اطلاقی سائینس　۳۔ روایتی ادنیٰ ٹکنالوجی　۴۔ اعلیٰ ٹکنالوجی

۱۔ بنیادی سائینس : بنیادی سائینس کا منبع تجسس، غور وفکر اور جاننے اور سمجھنے کی ہمک ہے۔ اس کی پانچ اہم شاخیں ہیں ۔

(الف) فزکس (ب) کمیسٹری (ج) ریاضی (د) بیالوجی اور (ر) بنیادی میڈیکل سائینس بنیادی سائینس کا تجسس سے کتنا گہرا تعلق ہے، اس کی خوبصورت تشریح وولف گانگ وائلڈ نے اس طرح کی ہے ۔

" قرون وسطیٰ میں جتنا کچھ گرجا گھروں کی تعمیر پر صرف کیا جاتا تھا، اس سے نسبتاً کہیں کم ہم بنیادی تحقیق پر صرف کررہے ہیں۔ حقیقت کی تلاش اور علم میں ترقی ایک ایسا مقصد ہے جس کی عظمت کسی طرح سے بھی گرجا گھروں کی تعمیر سے کم نہیں - یہ سوچنا حقیقت کے خلاف نہیں کہ انسانی تاریخ کے اس دور کا سب سے اہم اور عظیم کارنامہ سائینسی علوم کی ترقی ہے اس لئے ہمیشہ مشہور ریاضی داں ڈیوڈ ہلبرٹ کے اس قول سے اتفاق ہونا چاہیئے ۔

" ہمیں ضرور جاننا چاہیئے ۔ ہم ضرور جائیں گے "

ڈیوڈ ہلبرٹ نے کوئی نئی بات نہیں کہی تھی ۔ اس نے جو کچھ کہا وہ رسول اللہؐ کی تعلیمات کے زیر اثر صدیوں پہلے سے مسلمانوں کی تہذیب کا ایک جزو تھا، مگر افسوس ہیکہ دوسری اقوام نے اسے اپنی تہذیب کا ایک جزو بنالیا ہے اور ہم صدیوں سے اسے بھولے بیٹھے ہیں ۔

ترقی یافتہ ممالک میں بنیادی سائینس میں ریسرچ اور تربیت یا تو یونیورسٹیوں میں دی جاتی ہے یا

مخصوص تحقیقی مراکز میں۔ اس سلسلے کے اخراجات بالعموم نیشنل سائنس فاونڈیشنز یا سائنسی اکیڈیمیز برداشت کرتی ہیں۔

جہاں تک ترقی پذیر ممالک کا تعلق ہے یہاں بنیادی سائنس پر کوئی زور نہیں ہے۔ کسی بنا پر یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ یہ غیر ضروری ہے اور یہ کہ دوسروں کی سائنسی تحقیقات سے ہمارا کام چل سکتا ہے۔ اس رجحان نے سائنس کے لئے سم قاتل کا کام کیا ہے۔ ایک مثال کافی ہوگی۔ ترقی پذیر ممالک کے حکمراں ٹولے کے اس رویے کے سبب تیسری دنیا اپنے ان ذہنی تخلیقی افراد سے محروم ہورہی ہے جنھوں نے اپنے اپنے مخصوص علمی میدانوں میں مہارت حاصل کی تھی اور جو ملک کی ترقی میں سائنس کے استعمال کی بابت ماہرانہ صلاح و مشورہ دے سکتے تھے۔

۲۔ اطلاقی سائنس: اطلاقی سائنس کے درج ذیل پانچ بڑے میدان ہیں۔

(ل) زراعت (اس میں جنگلات، مچھلی کی پیداوار وغیرہ شامل ہیں)

(ب) صحت عامہ اور دواسازی (ج) توانائی یا انرجی (د) ماحولیات اور آلودگی

(ر) ارضی سائنس (سینچائی، مٹی، معدنیات وغیرہ بھی)

یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ بنیادی اور اطلاقی سائنس کے درمیان فرق کی حتمی لکیر نہیں کھینچی جاسکتی۔ یہی بات باقی سائنس اور ٹکنالوجی کے لئے بھی صحیح ہے۔ ان کی سرحدیں ایک دوسرے میں مدغم ہیں۔ اس دور میں جب کسی خاص میدان میں سائنس آگے بڑھ رہی ہو تو یہ کہنا مشکل ہے کہ کون سی ریسرچ بنیادی ہے اور کون سی اطلاقی۔ سر جارج پورٹر کے بقول سائنس صرف دو طرح کی ہے۔ ایک وہ جس کا اطلاق ہوچکا ہے۔ دوسری وہ جس کا اطلاق ہونا ابھی باقی ہے۔

۳۔ روایتی ادنیٰ ٹکنالوجی: روایتی ٹکنالوجی کی پانچ اہم شاخیں ہیں۔

(ل) زیادہ مقداری کیمیاوی صنعتیں۔ (ب) لوہے، فولاد اور دوسری دھاتوں کی صنعتیں (ج) کپاس، چمڑے وغیرہ سے متعلق صنعتیں (د) پٹرولیم کی صنعتیں (ر) پاور کی پیداوار

کسی ملک کی صنعتی ترقی کے لئے روایتی ٹکنالوجی میں مضبوط ہونا ضروری ہے۔ اس کے لئے سائنس کے نئے قوانین یا اصولوں میں مہارت کی ضرورت نہیں۔ یہاں ماضی کی سائنس کا استعمال ہے۔ البتہ ڈیزائن، کوالٹی، بدلتے زمانے کے ساتھ ضروری تبدیلیوں اور قیمتوں پر نگاہ ضروری ہے۔

۴. اعلیٰ ٹکنالوجی : یہ ٹکنالوجی کا وہ میدان ہے جس میں دولت ہی دولت ہے۔ آج کل اس زمرے میں درج ذیل ٹکنالوجیاں شامل ہیں۔

(ا) مصنوعی خام مال (ب) مواصلاتی سائینس (۱. مائیکرو الکٹرانکس ۲. فوٹانکس)
(ج) فضائی اور خلائی سائینس (د) اعلیٰ درجے کی کیمیاوی اشیاء بایوٹکنالوجی

آخرالذکر یعنی بایوٹکنالوجی سے زراعت، توانائی اور میڈیسن میں زبردست انقلاب کی توقع ہے ہائی ٹکنالوجی (اعلیٰ ٹکنالوجی) روایتی ٹکنالوجی سے اس لحاظ سے مختلف ہیکہ اس میں متعلقہ بنیادی سائینس جیسے فزکس، کیمسٹری، بایولوجی وغیرہ میں اعلیٰ سطح کے تربیت یافتہ سائینسدانوں کی ضرورت ہے۔ اس میں بہت کم مقدار میں خام مال کی ضرورت ہوتی ہے۔

ترقی پذیر ممالک میں چند کو چھوڑ کر تقریبًا سبھی ممالک کا یہ خیال ہیکہ اعلیٰ ٹکنالوجی ان کے بس کی چیز نہیں۔ آج اسی خیال کے بدلنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ مستقبل اسی میدان میں ہے۔ یہ ممالک اگر یہ سوچتے ہیں کہ اعلیٰ ٹکنالوجی کو ترقی یافتہ ممالک سے منتقل کیا جاسکتا ہے تو یہ سوچنا سراسر غلطی ہے، کیونکہ کوئی ترقی یافتہ ملک اپنی تحقیقات سے بھرپور فائدہ اٹھانے سے پہلے اسے ترقی پذیر ممالک کو منتقل کرنے سے رہا۔ اس لئے ترقی پذیر ممالک کے کرنے کا کام یہ ہے کہ شائع شدہ تحقیقی مقالوں کی مدد سے اعلیٰ ٹکنالوجی کی بنیاد خود ڈالیں۔

ترقی پذیر دنیا کا سائینس اور ٹکنالوجی کے میدان میں پیچھے رہنے کا ایک بنیادی سبب یہ ہیکہ انہیں سائینسی علوم کی اہمیت کا کوئی احساس نہیں۔ وہ شائد یہ نہیں جانتے کہ سائینس کو ترقی کیلئے استعمال میں لایا جاسکتا ہے۔ اس احساس کے پیدا ہونے سے کتنا فرق پڑسکتا ہے اس کی مثال جاپان ہے۔ وہاں کے شہنشاہ نے ۱۸۷۰ء میں میجی انقلاب کے زمانے میں پانچ حلف اٹھائے تھے ان میں سے ایک حلف یہ تھا۔

"جاپان کی عظمت اور تحفظ کے لئے علم کو دنیا کے کونے کونے اور ہر ممکن طریقے سے حاصل کیا جائے گا۔

ترقی پذیر ممالک میں سائینس اور ٹکنالوجی کتنی پیچھے ہے اس کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جاسکتا ہے کہ ترقی یافتہ ممالک میں سائینسدانوں کی تعداد کئی ہزار فی دس لاکھ ہے۔ جبکہ

ترقی پذیر ممالک میں یہ تعداد ایک یا دو سو فی دس لاکھ ہے ۔ اس پسماندگی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ ترقی پذیر ممالک سائینسی ریسرچ اور متعلقہ امور پر قومی آمدنی کا بہت کم حصہ صرف کرتے ہیں ۔ یہ جان کر آپ کو حیرت ہوگی کہ جبکہ ترقی پذیر اور ترقی یافتہ ممالک دونوں گروپ ریسرچ پر اپنی قومی آمدنی کا تقریباً ۰٫۵۶ ٪ یعنی برابر برابر خرچ کرتے ہیں ۔ سائینس اور ٹکنالوجی پر ترقی پذیر ممالک کا خرچ ترقی یافتہ ممالک کے مقابلہ میں قومی آمدنی کے لحاظ سے تقریباً دس گنا کم ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ترقی پذیر ممالک کے لوگ سائینس کے بارے میں سنجیدہ نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ترقی کے میدان میں جتنی مدت میں ترقی پذیر ممالک دس قدم آگے بڑھتے ہیں ۔ ترقی یافتہ ممالک سو قدم آگے بڑھ جاتے ہیں ۔

مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہیکہ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی میں نہ صرف یہ کہ سائینس اور ٹکنالوجی کی تعلیم پر کافی زور ہے بلکہ یہاں ایسے پروگرام شروع کئے گئے ہیں جس سے ملک میں سائینس کا فروغ ہو ۔ یہاں کے فروغ سائینس کے پروگرام کافی غور و خوض کے بعد بنائے گئے ہیں اور ان کی کامیابی کے اشارے بھی ملنا شروع ہو گئے ہیں ۔ تیسری دنیا میں شائد ہی کوئی دوسری یونیورسٹی ایسی ہو جہاں سائینس کو عوام تک پہنچانے اور مذہبی طبقے کو سائینسی تعلیم کی طرف راغب کرنے کا یہاں جیسا کوئی پروگرام چل رہا ہو ۔ اگر یہ کام اسی انہماک اور لگن سے چلتا رہا تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ سرسیدؒ نے جس امید پر اس درسگاہ کی بنیاد ڈالی تھی اس کے پورے ہونے کا وقت زیادہ دور نہیں

میں ایک بار پھر تمام انعام یافتگان کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ خدا آپ لوگوں کی عام فہم زبان میں سائینس کی اشاعت کی کوششوں کو کامیاب کرے ۔

شکریہ ۔

انیس چشتی
۴۲۵ کیداری روڈ، پونہ ۴۱۱۰۰۱

آزادی کے بعد کا ہندوستان اور مسلمان ادباء

[مورخہ ۷، ۸ راور ۹ راکتوبر ۱۹۸۹ء کو حیدرآباد میں رابطۂ ادب اسلامی کا بین الاقوامی سیمینار منعقد ہوا تھا۔ اس کا موضوع تھا تحریک آزادی اور اصلاح عوام میں ادب اسلامی کا حصّہ۔ اس مذاکرۂ علمی میں ملک اور بیرون ملک سے تقریباً ۸۰ مقالہ نگاروں نے شرکت کی تھی۔ مذاکرہ کی صدارت مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے فرمائی۔ درج ذیل مقالہ اپنی نوعیت اور موضوع کی مناسبت سے مذکورہ سیمینار میں منفرد تھا۔ سامعین میں سے شائد ہی کوئی فرد ایسا ہوگا جو اپنے آنسوؤں پر قابو رکھ پایا ہو۔ مقالے کے اہم حصے ہدیۂ ناظرین ہیں ۔ ادارہ]

جناب صدر اور مہمانانِ گرامی!

ہمارے برادران وطن جب آزادی کی تحریک کا ذکر کرتے ہیں تو گاندھی سے شروع کرتے ہیں اور مہاتما گاندھی پر ختم کرتے ہیں۔ گویا ۱۹۰۸ء سے شروع کرتے ہیں اور ۱۹۴۸ء پر ختم کرتے ہیں۔ اگر بہت غیرت دلائی جائے اور واویلا مچایا جائے تو ضمنی طور پر طوعاً و کرہاً مولانا ابوالکلام آزاد کا نام بھی لے لیا جاتا ہے۔ جو ذرا وسیع القلب اور بالغ النظر ہیں یا جن کی عمر اردو کے خوانِ یغما پر بسر ہوئی ہے یا جن کی راہ و رسم مسلم دانشوروں اور ادیبوں سے ہے جب تحریک آزادی اور تقریر و تحریر کا ذکر لے کر بیٹھتے ہیں تو اس طویل مختصر فہرست میں دو چار نام اور شامل کر لیتے ہیں یعنی مولانا محمد علی، شوکت علی، سر سید احمد خاں، ڈاکٹر اقبال اور بس۔ بڑی دقت نظر اور عرق ریزی کا مظاہرہ کیا تو اس فہرست میں مولانا حسرت موہانی کا نام اور شامل کر لیا۔ اب رہا سوال ٹیپو سلطان سراج الدولہ اور بہادر شاہ ظفر کا تو یہ تمام فلم بنانے اور ٹیلی ویژن سیریل پر مشاعرہ برپا کرنے

یا پھر بنکم چندر چیٹرجی کے مسلم دشمن ناول "آنند مٹھ" میں ہندو دشمن بنانے کے کام آتے ہیں۔

ہم لوگوں کا معاملہ یہ ہے کہ جب آزادی اور تحریک آزادی پر لکھنے بیٹھتے ہیں تو قلب کی کیفیت ایک بازی ہارے ہوئے جواری کی سی ہو جاتی ہے یا اس کباڑیے کی سی جس کی دوکان میں اگلے وقتوں کا مال بھرا ہے۔ بس بھرا ہے۔ لیکن رکھ رکھاؤ باقرینہ نہیں بلکہ بے قرینہ ہے۔ وہ ایسے وقت کا منتظر ہے جب اگلا زمانہ پھر لوٹ آئے گا اور اسے اپنی ایک ایک چیز کا منہ مانگا دام ملے گا۔ کیونکہ اسے معلوم ہے کہ ۱۸۵۷ء میں ۵ لاکھ مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ ۳۰۰ خدائی خدمتگار "قصہ خوانی بازار" میں سینے پر گولیاں کھا کر شہید ہوئے۔ تین ہزار مسلمانوں کو "عبور دریائے شور" یعنی کالا پانی کی سزا ہوئی۔ دہلی اور اودھ میں شاہی بیگمات کی بے حرمتی کی گئی، بادشاہ بیگم زینت محل اور بیگم حضرت محل کے ساتھ تقریباً ۱۰۰ بیگمات یا تو شہید ہوئیں یا جلا وطن کر دی گئیں۔ ۱۸۵۷ء کا دہلی اور اودھ خاک و خون میں لتھڑا ہوا اور ہر مسلم قصبہ اور محلہ خون میں نہایا ہوا تھا۔ غالب کا یہ کہنا ایک تاریخی دستاویز سے کم نہیں کہ۔

گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے　　　زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے　　　گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر دہلی ہے ذرّہ ذرّہ خاک　　　تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا

آپ پوچھیں گے کہ یہ غالب کون ہے؟ کوئی بتلائے یا نہ بتلائے ہم بتلاتے ہیں کہ یہی وہ غالب ہیں جن کا بھائی یوسف مرزا عین غدر میں مارا گیا اور بغیر غسل و کفن کے تھور خانی کی مسجد کے صحن میں گھسیٹ گھساٹ کر دفن کر دیا گیا۔ یہی وہ غالب ہیں جو مسلمان ہونے کے جرم میں کرنل برن کے پاس پھانسی پر لٹکائے جانے کے لئے چوک تک لے جائے گئے اور لطیفہ سنا کر چھوٹ گئے۔ یہی وہ غالب ہیں جن کا عزیز دوست شاگرد اور بادشاہ وقت بہادر شاہ ظفر جلا وطن کر دیا گیا۔ دوسرا دوست یعنی نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ بھی اس تپش سے محفوظ نہ رہ سکے۔ ان کے علاوہ مولانا امام بخش صہبائی، نواب اکبر خاں چگنش، نواب مظہر الدولہ اور دیگر ۳۰ نوابین اور سرداران سے دار پہنچے۔ یہی وہ غالب ہیں جنھوں نے اپنا آدھا سے زیادہ دیوان مولانا فضل حق خیرآبادی کے کہنے پر دریا برد کر دیا۔ انہوں نے ہی کلام غالب کو لگام بھی دی اور داد بھی۔ مولانا فضل حق خیرآبادی

صفِ اول کے انگریز دشمن اور مسلح جدوجہد کے حامل اور حامی تھے۔ بظاہر وہ حضرت اسمعیل شہیدؒ کے ناقد و مخالف تھے لیکن انگریز دشمنی میں ان کا جواب نہیں تھا۔ انہیں انڈمان بھیج دیا گیا۔ کالے پانی کی سزا ہوئی اور وہیں انہوں نے دائی اجل کو لبیک کہا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا یہ بیج شاہ ولی اللہ نے بویا تھا۔ حضرت سید احمد شہیدؒ، حضرت اسمعیل شہیدؒ اور ان کے رفقاء ہی دراصل وہ افراد ہیں جن کے ذہنوں میں آزادی کا مرکزی خیال در آیا تھا اور انقلاب کی مرکزی قوت و طاقت تھے۔

جنگ آزادی پر بہت کچھ لکھا گیا اور لکھا جانا بھی چاہیئے۔ لیکن ایک خیال جو بار بار ذہن میں کچوکے لیتا ہے وہ یہ کہ آزادی کے بعد موجودہ بھارت میں تاریخ آزادی کی جو شکل بن رہی ہے اور جو نئے بت تراشے جا رہے ہیں وہ نہ صرف یہ کہ ملک کی موجودہ فرقہ وارانہ صورت حال کے لئے خطرناک بلکہ مستقبل میں آنے والی مسلم نسلوں کیلئے ایک مستقل خطرے کی گھنٹی ہے۔ مسلمان دانشوروں اور مورخوں کو اس کی خبر لینی چاہیئے۔ ایسے قلم نے تحریک آزادی پر لکھنا چاہیئے جو پُر شور ہونے سے زیادہ پرزور ہو۔ اردو میں نہ ہو بلکہ انگریزی میں ہو، ہندی میں ہو، ریاستوں کی مقامی زبانوں میں ہو۔ یہ کام ابھی ہونا چاہیئے۔ NOW OR NEVER کے مصداق۔ اگر اس کام میں ہم ایک لحظہ بھی غافل ہوئے تو سمجھ لیجئے کہ منزل صد سال نہیں بلکہ ہزار سال دور ہو جائے گی۔ اگر ہم نے تاریخ آزادی میں زبردستی اگائے ہوئے خس و خاشاک کو پاک نہیں کیا تو سمجھ لیجئے کہ یہ جنگل اتنا گھنیرا اور دشوار گذار ہو جائے گا کہ اس میں حق و راستی کسی چراغ کا جلانا مشکل ہو جائے گا۔

ان دنوں آزادی کے جن بڑے سورماؤں کے نام ہمارے برادران اور ذرائع ابلاغ اکثر لیتے رہتے ہیں ان میں دو بڑے نام دادا بھائی نوروجی اور جمشید جی ٹاٹا کے بھی ہیں۔ سرکاری اخراجات پر ان دونوں کی بڑی بڑی یادگاریں قائم کی جارہی ہیں۔ بڑی بڑی تقریبات اور برسیاں منائی جارہی ہیں۔ یہ دونوں شخصیتیں پارسی تھیں۔ پارسی قوم خود تارک وطن ہے۔ ان کا مذہب یہودیوں کی طرح نسلی ہے۔ دادا بھائی ۱۸۲۵ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۱۷ء میں وفات پاگئے۔

جمشید جی ٹاٹا ۱۸۳۹ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۰۴ء میں وفات پا گئے۔ دادا بھائی بمبئی کے الفنسٹن کالج میں ریاضی پڑھی اور کانگریس میں شامل ہو گئے۔ اس وقت کانگریس یعنی ابتدائی کانگریس

نعل آج کی ہی کانگریس کی طرح محفوظ و مامون اور یقینی و بے خطر تھی ۔ سرائے ، اور ہیوم اس کے جدوبانی تھے ۔ ظاہر ہے کہ اس انگریز افسر کی محبت بھارت سے بالکل ایسی ہی تھی جیسے کسی کرایہ دار کرائے کے مکان سے ہوتی ہے یا ریلوے کے مسافر کو ویٹنگ روم سے تقریباً یہی اصول ہر ترک وطن پر چسپاں کیا جا سکتا ہے ۔ تاریخ بتاتی ہے کہ یہ دونوں پارسی بزرگ کبھی جیل نہیں گئے ۔ انہوں نے کبھی انگریزوں کی لاٹھی نہیں کھائی ۔ البتہ نہایت تزک و احتشام سے گول میز کانفرنسوں میں شرکت کرتے رہے ۔ کئی بار انگلستان گئے اور ہر واپسی پر ایک نیا پرمٹ ، ایک نیا کارخانہ اور ایک نیا آرڈر ساتھ لاتے گئے ۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اندرون ملک اور ساحلی علاقوں پر اس وقت بھی اور اس وقت جتنے بڑے لوہے کے کارخانے اور کپڑوں کی ملیں ہیں اکثر پارسیوں کی ملکیت میں ہیں ۔ حد یہ ہے کہ ان کارخانوں کے قیام کے لئے انگریزوں نے نہ صرف اجازت نامے دیئے بلکہ سرمایہ بھی فراہم کیا اور فنّی ماہرین بھی مہیا کئے ۔ جن دنوں یہ کارخانے اپنی چمنیوں سے دھواں اگل رہے تھے اور برادران وطن صنعتی انقلاب کی جانب پیش قدمی کر رہے تھے ، عین انہیں دنوں مولانا محمد علی جوہر ویسٹ منسٹر ایبے میں انگریزوں سے نبرد آزما تھے اور زندگی کی آخری سانسیں لے رہے تھے اور بیت المقدس میں دفن ہو رہے تھے اور مولانا حسرت موہانی جیل میں اپنے موٹے میلے اور کھردرے ہاتھوں سے چکی پیس رہے تھے اور انگریزوں کی مار سے پھٹی پھٹی انگلیوں میں جیل کے وارڈن سے مانگا ہوا کوئلہ پکڑ کر کوٹھری کی دیواروں پر لکھ رہے تھے .

ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشہ ہے حسرت کی طبیعت بھی

اور پھر صرف اسی پر بس نہیں بلکہ ان کی پردہ نشین بیوی گز سے ناپ ناپ کر کھادی کا کپڑا بیچ رہی تھیں جو اس زمانے میں انقلاب کی علامت بن گیا تھا اور انگریزی سرکار کی نظر میں قابل گرفتاری جرم تھا ۔ مسلمانوں کی معاشی بدحالی میں جو رہی سہی کسر تھی وہ ۱۹۲۱ء کی سودیشی تحریک نے پوری کر دی ۔ آپ جن بڑی بڑی بین الاقوامی کمپنیوں کے نام سنتے ہیں ان میں سے اکثر کی ایجنسیاں مسلمانوں کے ہاتھ میں تھیں ۔ مثلاً باٹا کے جوتوں پر داؤد اینڈ کمپنی کی اجارہ داری قائم تھی ۔ مغل لائن جہاز رانی کمپنی مکمل طور پر مسلمانوں کے قبضے میں تھی ۔ دیگر جہاز راں کمپنیاں بوٹا والا صاحب اور آگ بوٹا

والا کی ملکیت میں تھیں۔ اس کمپنی کے ملاح اور مالکین جس محلے میں رہتے تھے وہ محلہ آج بھی بمبئی میں ناخدا محلے کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اسٹینڈرڈ بیٹری، مانچسٹر کا کپڑا اور برمنگھم کا کاغذ بالترتیب حاجی، آدم جی اور عبدالرحمٰن سیٹھ ہی درآمد کر سکتے تھے۔ اسی طرح لپٹن، بروک بانڈ، پرائمس اسٹو، مانٹین لائٹ، لائف بوائے، پیٹرومیکس کی گیس بتیاں اور دیگر لاتعداد مصنوعات کی ایجنسیاں اور بڑے بڑے شہروں کی ڈیلرشپ مسلمانوں کے ہی قبضے میں تھی۔ لیکن جیسے ہی گاندھی جی نے سودیشی تحریک کا صور پھونکا، مسلمان تاجروں نے دھڑا دھڑ اپنی ایجنسیاں انگریزوں کو واپس کر دیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت یہ ساری ایجنسیاں انگریزوں سے پارسیوں، گجراتیوں اور مارواڑیوں نے اونے پونے حاصل کر لیں۔ ملک سے وفاداری کی سزا معاشی بدحالی کی صورت میں بھارت کے مسلمان آج تک بھگت رہے ہیں۔

کیرالا کے اس اسکول ہیڈ ماسٹر کا واقعہ شائد آپ ابھی تک نہ بھولے ہوں گے۔ ابھی دو سال بھی نہیں ہوئے جب انہوں نے انکار کر دیا تھا کہ میں اپنے اسکول میں بھارت کا قومی ترانہ جن گن من پڑھنے کی اجازت نہیں دوں گا۔ کیونکہ نوبل یافتہ رابندر ناتھ ٹیگور نے یہ نظم استقبالیہ کے طور پر جارج پنجم کی آمد کے موقع پر لکھی تھی اور ہگلی کی بندرگاہ پر پڑھی بھی گئی تھی۔ بعض باتیں بلا تبصرہ بھی چھوڑنی پڑتی ہیں۔ اس میں ایک خبر یہ بھی ہے کہ بنکم چندر چٹرجی کا ناول آنند مٹھ جس کا مشہور گیت وندے ماترم ہے پریس جانے سے پہلے انگریز دشمنی پر مبنی تھا۔ انگریزوں نے صرف یہ کروایا کہ اس میں جہاں جہاں لفظ انگریز تھا اسے کٹوا کر لفظ مسلمان لکھوا لیا۔ اس کے نتیجے میں تقسیم کرو اور حکومت کرو کی پالیسی میں انگریزوں کو مزید تقویت ملی۔

آزادی کے بعد ہم مسلمان ادیبوں کی یہ ایک بہت بڑی ذمہ ہو جاتی ہے کہ جس طرح مغربی مستشرقین اسلام اور مسلمانوں کے متعلق لکھتے رہتے ہیں، اسی طرح مسلمان دانشوروں کو بھی چاہیے کہ وہ آزادی کی ان لمنارہ قدیم مسلم شخصیتوں پر بھی قلم اٹھائیں اور انتہائی متانت، باریک بینی اور دقیقہ سنجی کے دبیز پردے پڑے ہوئے ہیں۔ یہ کام جہاں بہت تحقیق کا ہے وہیں بڑی احتیاط کا بھی ہے کہ آج ملک کی فضا مسموم سے مسموم تر ہوتی جا رہی ہے اور ملک کا سمجھدار اور ناسمجھ طبقہ اپنے خود ساختہ بتوں کے خلاف ایک لفظ بھی سننے کے لئے تیار نہیں۔ لیکن اگر یہ کام ہو گیا تو سمجھ لیجئے کہ جنگ آزادی میں

...ں کو اپنا مقام بتانے میں اور اتنے بڑے آزاد ملک کے PURSPECTIVE میں اپنی جگہ متعین ...نے میں بڑی مدد ملے گی جس کے لیے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ پچھلے چالیس برسوں میں ہم یہ کام ...یں کر پائے ہیں۔

آزادی کے بعد مسلمان اس ملک کے (GROSS NATIONAL PROFIT) قومی آمدنی میں اپنا حصہ ...ل نہیں کر پائے۔ قربانیوں کے تناظر اور ملک کی مجموعی آمدنی سے اگر ان کو ملنے والے حصے کا مقابلہ و ...زنہ کیا جائے تو آپ کو سن کر حیرت ہوگی کہ وہ نہ صرف نقصان میں ہیں بلکہ نفی میں ہیں۔ ...س لیے آج ضرورت پیدا ہو گئی ہے کہ ہم نے کیا کھویا اور کیا پایا کے تحت ایک ایسا جائزہ پیش کیا ...ئے جس سے ایک طرف تو مسلمانوں کے حوصلے بلند ہوں دوسری طرف برادرانِ وطن مسلمانوں کو ...س سرزمین پر بوجھ اور ان کے حصے کا راشن کھانے والا طبقہ سمجھنا چھوڑ دیں۔

...مانِ گرامی! سب سے آخر میں میں یہ بات بھی عرض کرتا چلوں کہ تحریکِ آزادی کے دوران ...ت کیا گیا ادب اگر قوم مسلم کی شانِ جلالی کا ظہور تھا تو وقت آگیا ہے کہ اب اس کی شانِ جمالی کا ...ہور ہو جائے۔ حکایاتِ خونچکاں کی تحریر نے ہمارے شعلہ نوا ادیبوں کے ہاتھ ہی نہیں بلکہ سر ...م کروا دیئے۔ اب ایسا ادب تخلیق ہونا چاہیئے جو تحریکِ آزادی کی بعض دھاندلیوں کو بے نقاب ...ر دے۔ اب ہماری یہ پوزیشن ہے کہ پوری مسلم قوم گویا مجرموں کے کٹہرے میں کھڑی کر دی گئی ہے ...ور ہم ہیں کہ اپنی صفائی پیش کر رہے ہیں اور انصاف کی دہائی دے رہے ہیں۔ برادرانِ وطن مولانا ...بوالکلام آزاد کے ۳۰ صفحات کو بھی بغیر ڈکار لیے ہضم کر گئے۔ ہمیں یہ محسوس ہوا تھا کہ شائد پنڈت ...جواہر لال نہرو، گاندھی جی اور ولبھ بھائی پٹیل کے نام لیوا اب کونوں کھدروں میں منہ چھپاتے پھریں گے ...لیکن کہیں کچھ نہیں۔ محسوس یہ ہوا کہ گیند ابھی تک سامنے والے کے کورٹ میں پہنچی ہی نہیں۔ اس کی وجوہات ...بھی ہو سکتی ہیں۔ دانشورانِ محفل سر جوڑ کر بیٹھیں اور کسی ایسے نتیجے پر پہنچیں کہ ملت اسلامیہ ہندیہ ...مجرموں کے کٹہرے سے باہر نکلے۔ یہ معرکہ نہ ایجیٹیشن سے سر ہو سکتا ہے نہ نعرے بازیوں سے نہ سیاست ...کے میدان میں محاذ آرائی سے۔ یہ خالص اور خالص علمی، صحافتی اور ادبی موضوع ہے اور اس دنیا کے ...ادو صرف وہی جماعت عبور کر سکتی ہے جس کے پاس ولی اللّٰہی سوزِ دروں، ابوالکلام کا نطق، محمد علی جوہر ...کا قلم اور سرسید کا دماغ ہوگا —

وما علینا الا البلاغ

ڈاکٹر عادل طہٰ یونس

مسلم آبادی کا ارتقاء

گذشتہ چند صدیوں میں مسلمانوں کی آبادی میں کمی یا زیادتی اور مستقبل میں کس شرح سے اضافہ ہوگا سا اگر جائزہ لیا جائے تو یہ موضوع باعث دلچسپی ہوگا، سرکاری ادارے اقتصادی، اجتماعی اور ثقافتی ادارے بلکہ ہر شخص یہ جاننا چاہے گا کہ دنیا کے مختلف ممالک میں آبادی میں اضافہ کی شرح کیا ہوگی۔

مسلم ممالک کی آبادی کی تفصیلات اور خاص طور سے مسلمانوں کی تعداد اور عالم اسلام میں ان کا تناسب ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ اس سلسلہ میں جو اعداد و شمار ملتے ہیں وہ تخمینی ہیں جو اصل تعداد سے کم اور زائد ہو سکتے ہیں۔ اور اسلامی حوالوں کا ملاحظہ کرنے والوں نے مسلمانوں کی تعداد کے متعلق جو اندازے پیش کئے ہیں ان میں سے زیادہ قدیم وہ رسالہ ہے جسکو محمد توفیق البکری جو مصر میں بیسویں صدی کے ایک صوفی شیخ تھے کا ہے یہ رسالہ ۱۹۰۱ میں شائع ہوا، اور اس کا نام "اسلام کا مستقبل" تھا اس میں مسلمانوں کی تعداد ۱۹۰۰ تک ۳۲۰ ملین مذکور ہے جو دنیا کی کل آبادی ۱۵۷۰ کی ۲۰ فیصد ہوتی ہے۔ اس کے بعد ہی شکیب ارسلان کے اعداد و شمار ہیں، جو انہوں نے ۱۹۳۴ء میں اسٹیوڈ کی کتاب "حاضر العالم الاسلامی" میں پیش کیا ہے اس میں مسلمانوں کی تعداد ۴۰۰ ملین ہے جو دنیا کی کل آبادی ۲۰۷۰ ملین کا ۱۹٪ ہے۔ "دنیا کے زندہ مذاہب" نامی کتاب جس کو انگریزی میں ایک پاکستانی محقق احمد المصدوسی نے مرتب کیا ہے اور جو ۱۹۵۲ء میں شائع ہوئی ہے اور اس کا شمار جدید کتب مراجع میں ہوتا ہے جس میں مولف نے دنیا کے مختلف علاقوں میں مسلمانوں کی تعداد کو تفصیل سے لکھا ہے، اس تفصیل پر اعتماد کرتے ہوئے ۱۹۵۰ء تک مسلمانوں کی تعداد ۵۱۰ ملین مذکور ہے جبکہ پوری دنیا کی آبادی ۲۵۱۳ ملین تھی جس سے مسلمانوں کا تناسب ۲۰٫۳٪ ہے۔

اس صدی کی چھٹی دہائی میں جو سب سے معتمد اعداد و شمار مسلمانوں کی تعداد کے بارے میں ملتے ہیں وہ ہیں جس کو ہندوستان کی جمیعۃ علماء نے شائع کیا ہے۔ ڈاکٹر عبدالحمید بخت مرحوم نے اپنی کتاب "عربی اسلامی معاشرہ میں جو ۱۹۶۶ء میں قاہرہ سے شائع ہوئی میں ۱۹۶۰ء تک کے مسلمانوں کی تعداد ۶۳۰ ملین تحریر کی ہے اور پوری دنیا کی آبادی ۲۹۸۶ ملین میں ان کا تناسب ۲۱٪ ہے۔

اور ساتویں دہائی میں "قسمات العالم الاسلامی" کے نام سے ڈاکٹر مصطفیٰ مومن کی کتاب شائع ہوئی جس میں ۱۹۷۰ء تک کے اعداد و شمار درج ہیں یعنی ۷۴۰ ملین جس میں دنیا کی آبادی ۳۶۱۸ ملین مذکور ہے اور اسی طرح مسلمانوں کا تناسب ۲۰٫۴٪ ہے۔

اور ساتویں ہی دہائی میں مشہور محقق پروفیسر محمود شاکر کی مسلمانوں کی تعداد سے متعلق ایک بہترین مجموعہ شائع ہوا جس میں مسلمانوں کی تعداد ۸۵۰ ملین مذکور ہے، جب دنیا کی آبادی ۳۹۶۷ ملین بتائی گئی ہے اس طرح مسلمانوں کا تناسب ۲۱٫۴٪ ہوتا ہے۔

اور مغربی ذرائع کے اعداد و شمار جو ماضی اور موجودہ آبادی کی تعداد پر مبنی ہے، اور اسی صدی کے اوائل سے ساتویں دہائی تک کے تعداد کا احاطہ کرنے سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں کی تعداد گذشتہ تین صدیوں میں اس طرح رہی ہوگی

سنہ عیسوی	دنیا کی آبادی ملین میں	مسلمانوں کی آبادی ملین میں	تناسب
۱۶۵۰	۴۷۰	۱۰۰	۲۱٫۲٪
۱۷۵۰	۶۹۴	۱۵۰	۲۱٫۶٪
۱۸۵۰	۱۰۹۰	۲۱۰	۱۹٪
۱۹۰۰	۱۵۷۱	۳۲۰	۲۰٪
۱۹۳۰	۲۰۷۰	۴۰۰	۱۹٪
۱۹۵۰	۲۵۱۳	۵۱۰	۲۰٫۳٪
۱۹۶۰	۲۹۸۶	۶۳۰	۲۱٪
۱۹۷۰	۳۶۱۸	۷۴۰	۲۰٫۴٪
۱۹۷۵	۳۹۶۷	۸۵۰	۲۱٫۴٪

اس نقشہ سے واضح ہوجاتا ہے کہ گزشتہ تین صدیوں میں مسلمانوں کی تعداد پانچ بار بڑھی ہے۔ ۱۶۵۰ء میں مسلمانوں کی تعداد ۱۰۰ ملین تھی مگر وہ تعداد ۱۹۵۰ء تک ۵۰۰ ملین سے زائد ہوگئی، اور گزشتہ ربع صدی ۱۹۵۰ء سے ۱۹۷۵ء تک مسلمانوں کی تعداد تیزی سے بڑھی اور ۵۱۰ ملین سے ۸۵۰ ملین ہوگئی ہے یعنی ۳۴۰ ملین بڑھی اور یہ اضافہ ۱۳٪ سے زائد ہے:

آٹھویں دہائی میں مقالہ نگار نے خود دنیا کے مسلمانوں کی تعداد کو جمع کیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی تعداد ۱۹۸۰ء تک ۹۷۰ ملین ہوگئی تھی جبکہ پوری دنیا کی آبادی ۴۴۳۱ ملین تھی اس طرح مسلمانوں کا تناسب ۲۱،۹٪ ہوتا ہے۔

اور مسلمانوں کی تعداد جیسا کہ مقالہ نگار تحریر کرتا ہے، اقوام متحدہ کے آفس کے تحت دنیا کی آبادی کے اعداد و شمار کے مطابق ہیں جو اس نے جولائی ۱۹۸۸ء میں شائع کئے ہیں اس میں دنیا کی آبادی ۵۰۸۳ ملین تھی اسی لحاظ سے مسلمانوں کا اوسط ۲۲،۸٪ ہوتا ہے ۱۹۸۰ء سے ۱۹۸۸ء تک کی آبادی کی ترتیب اس طرح ہے۔

سنہ عیسوی	دنیا کی آبادی ملین میں	مسلمانوں کی آبادی ملین میں	تناسب
۱۹۸۰	۴۴۳۱	۹۷۰	۲۱،۹٪
۱۹۸۱	۴۵۰۸	۹۹۲	۲۲٪
۱۹۸۲	۴۵۸۶	۱۰۱۸	۲۲،۲٪
۱۹۸۳	۴۶۶۸	۱۰۳۶	۲۲،۲٪
۱۹۸۴	۴۷۴۶	۱۰۶۸	۲۲،۵٪
۱۹۸۵	۴۸۲۶	۱۰۹۲	۲۲،۷٪
۱۹۸۶	۴۹۱۰	۱۱۱۶	۲۲،۷٪
۱۹۸۷	۴۹۹۴	۱۱۳۹	۲۲،۸٪
۱۹۸۸	۵۰۸۳	۱۱۵۸	۲۲،۸٪

اس نقشہ سے معلوم ہوجاتا ہے کہ ۱۹۸۱ء تک مسلمانوں کی تعداد ۹۹۲ ملین پہونچ گئی تھی اور بعد کے سالوں میں ان کی تعداد بڑھتی مسلمانوں کی آبادی پہلی بار یعنی ۱۹۸۱ء میں ۲۲٪ ہوئی جیسا کہ آٹھ سالوں ۱۹۸۱ ۔ ۱۹۸۸ء میں مسلمانوں کی تعداد ۱۳۶ ملین بڑھی ہے، یہ اضافہ عالمی پیمانے پر ۲۱ ملین سال کے قریب ہے اور جب ہم عالم اسلامی میں آبادی کا جائزہ لیتے ہیں تو مسلمانوں کی تعداد میں فطری اضافہ کو دیکھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی تعداد دوسرے مذاہب کے مقابلہ میں زیادہ ہے، کیونکہ ایک بڑی تعداد ہر سال حلقہ بگوش اسلام ہوتی ہے اس لیے مسلمانوں کی تعداد بڑھ رہی ہے، سابقہ اعداد وشمار سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا ہے کہ ۲۰۰۰ء تک یعنی اکیسویں صدی کے آغاز میں مسلمانوں کی تعداد ۱۴۰۰ ملین ہو جائیگی جو ۶۲۶۰ ملین کی آبادی میں ۵ و ۲۲ فیصد ہوگی، اس لئے یہ اندازہ بھی لگایا جاسکتا ہے کہ آنے والے سالوں میں مسلمانوں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہوگا، اس کے بعد مسلمانوں پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے، وہ ان مخلصانہ کوششوں کا علمی جائزہ لیں اور ان وسائل سے پوری طرح فائدہ اٹھائیں جو امت اسلامیہ کے فلاح و بہبود کے باعث ہیں۔

(تعمیر حیات لکھنؤ ۲۵ جنوری ۸۹ء سے ماخوذ)

ممتاز اور مشہور مزاح نگار جناب مرزا شکور بیگ کی تازہ تصنیف

مزاحیہ تقاریر و مضامین مرزا شکور بیگ

شائع ہوگئی ہے

قیمت: پچیس روپیہ • پانچ ریال • دو ڈالر ۔

پبلشر: مرزا شکور بیگ

ملنے کے پتے: • سیل سیکشن، روزنامہ "سیاست" حیدرآباد ۔ اے پی • ادبی مرکز ۔ اعجاز پرنٹنگ پریس چھتہ بازار، حیدرآباد ۔ اے پی • حسامی بکڈپو ۔ چارکمان ۔ حیدرآباد ۔ (اے ۔ پی)
• ماہنامہ شگوفہ ۔ ۱۳۱ بیچلرز کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ ۔ حیدرآباد ۔ اے پی
• مرزا شکور بیگ، احمد منزل ۔ ۱۱-۲-۱۰ سیف آباد، حیدرآباد ۔ اے پی فون 33717

سید حسام الدین ایم۔اے، ایم۔فل (عثمانیہ)

مولانا حسرت موہانی

جدوجہد آزادی میں حصہ لینے والے قومی رہنماؤں کی ایک طویل فہرست ہے جن میں مولانا حسرت موہانی کو نمایاں مقام حاصل ہے چونکہ انہوں نے ہندوستان کی تاریخ میں سب سے پہلے ۱۹۲۱ء میں احمد آباد کے کانگریس کے اجلاس میں ہندوستان کی مکمل آزادی کا مطالبہ کیا تھا۔

حسرت کا نام سید فضل الحسن تھا وہ ضلع اناؤ (یوپی) کے ایک مشہور قصبہ موہان میں ۱۲۹۵ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام سید اظہر حسین تھا۔ حسرت کی ابتدائی تعلیم قدیم مکتبی طرز کی موہان میں ہی ہوئی اور وہیں سے ۱۸۹۴ء میں اعزاز کے ساتھ اردو مڈل کا امتحان پاس کیا۔ صوبہ بھر میں اول آئے ۱۸۹۵ء میں انٹرنس کا امتحان درجہ اول میں پاس کر کے علی گڑھ چلے گئے اور ۱۹۰۳ء میں بی۔اے پاس کیا سید حیدر یلورم اور مولانا شوکت علی ان کے ساتھیوں میں تھے کالج کی تعلیم کے زمانے میں ان کے سیاسی رجحانات کا علم لوگوں کو ہوگیا تھا اور ارباب کالج ان کو اچھی نگاہوں سے نہ دیکھتے تھے۔ گریجویٹ ہونے کے بعد آپ نے علی گڑھ سے اردوئے معلیٰ جاری کیا اور اس کے ساتھ بال گنگا دھر تلک اور اربندو گھوش کے سیاسی نظریات سے متاثر ہوکر انہوں نے عملی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا۔

۱۹۰۴ء میں وہ کانگریس پارٹی سے وابستہ ہو گئے اور پھر مسلسل شرکت کرتے رہے۔

مولانا حسرت موہانی نے جنگ آزادی میں سرگرم حصہ لیا اور ہندوستان کے دیگر صف اول کے قائدین کے دوش بدوش قید و بند کی سختیاں برداشت کیں۔

ان کے قید و بند کی تاریخ ۱۹۰۸ء سے شروع ہوتی ہے آپ نے ۱۹۰۸ء میں مصر میں انگریزی پالیسی کے متعلق ایک مضمون اردوئے معلیٰ میں شائع کیا اور حکومت نے انہیں جرم بغاوت عائد کر کے دو سال قید کی سخت سزا دی اس کے بعد ۱۹۱۶ء میں پھر اسی جرم میں قید کئے گئے

اور تیسری بار ۱۹۲۲ء میں حکومت بمبئی نے بغاوت کا مقدمہ قائم کرکے دو سال کیلئے بڑودہ سنٹرل جیل بھیجدیا۔ قید فرنگ کے زمانہ میں قیمتی تکلیفیں آپ کو پہونچائی گئیں۔ ان کا اندازہ مشاہدات زنداں سے ہوسکتا ہے جو آپ نے اردو معلی میں شائع کیا تھا۔ حسرت سودیشی تحریک کے بڑے زبردست حامی تھے۔ انہوں نے خود بھی ایک سودیشی اسٹور کانپور میں قائم کیا اور دوسرے مقامات پر بھی متعدد سودیشی دوکانیں قائم کروائیں۔ انہوں نے آخر عمر تک کوئی ولایتی چیز استعمال نہیں کی اور اگر کسی شئے کے متعلق شبہ ہوجاتا تھا کہ یہ دیسی نہیں ہے تو اسے فوراً مسترد کردیتے۔ حسرت اپنے سیاسی عقائد کے لحاظ سے کمیونسٹ تھے لیکن ان کا یہ سیاسی عقیدہ ان کے مذہبی تصورات سے بالکل علحدہ تھا چنانچہ ایک جگہ انہوں نے لکھا ہیکہ" میں قدامت پرست سنی اور صوفی ہوں تصوف کو مذہب کا جوہر سمجھتا ہوں اور تصوف ماحصل میرے نزدیک جذبہ عشق ہے۔

حسرت موہانی سرتاپا جدوجہد تھے انہوں نے ہر ظلم و استبداد سے مقابلہ کیا ان کا ہر لمحہ ایک بلند مقصد کے لئے صرف ہوا۔ وہ ایک اضطراب مسلسل تھے ساری زندگی وہ قوم کے لئے لڑتے رہے اور لڑتے ہی مرے۔ ان کی زندگی میں اخلاص پیہم کا ایک نقش جاوید پایا جاتا ہے۔ حسرت ایک صحافی بھی تھے۔ ایک اچھے شاعر اور ایک عظیم رہنما بھی لیکن ان کی جملہ صفات میں ایک سرفروشانہ عزم اور ایک مجاہدانہ عظمت پائی جاتی ہے وہ ایک صاف گو انسان۔ متین شاعر اور بے باک سیاستداں تھے۔

حسرت موہانی بہت بڑے قوم پرست تھے وطن کی آزادی میں ان کا عظیم الشان حصہ ہے ان کی زندگی طوق و سلاسل میں بسر ہوئی۔ وہ بال گنگادھر تلک کے سچے پیرو تھے جس کا اظہار ذیل کے شعر سے ہوتا ہے۔ ؎

مغموم نہ ہو خاطر حسرت کہ تلک تک　　　پیغام وفا باد صبا لے کے گئی ہے

وہ ایک غیر فرقہ پرست لیڈر تھے جنھوں نے ہمیشہ ہندوستان کے مذہبی رہنماوں اور عبادت گاہوں کا احترام کیا جس کا اظہار ان کے ذیل کے اشعار سے ہوتا ہے ؎

کچھ ہم کو بھی عطا ہو کہ اے حضرت کرشن　　　اقلیم عشق آپ کے زیر قدم ہے خاص

حسرت کی بھی قبول ہو متھرا میں حاضری سنتے ہیں عاشقوں پہ تمہارا کرم ہے خاص
جیل کی صعوبتوں نے ان کے فکر و فن کے سوتوں کو بند نہیں کیا بلکہ بقول ان کے سه
ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی اک طرفہ تماشہ ہے حسرت کی طبیعت بھی
حسرت درویشانہ فطرت کے مالک تھے۔ ان کی آرزوئیں قلیل تھیں اور عزائم جلیل۔ نہ انہوں نے کبھی اپنی لیڈری منوانے کی کوششیں کی اور نہ کبھی بڑے سے بڑے لیڈر سے مرعوب ہوئے۔ وہ بڑے خوددار انسان تھے دنیاوی ضرورتوں کی خاطر کبھی کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلائے۔ ان کی سادگی اور درویشانہ مزاج کے متعلق رشید احمد صدیقی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ

حسرت ہندوستانی پارلیمنٹ کے ممبر تھے لیکن ان کے اپنے انداز درویشانہ میں کوئی فرق نہ آیا نہ ممبروں کی آرام دہ کشادہ اور پر فضا رہائش گاہ نہ ٹیلیفون نہ موٹر نہ تفریح نہ دعوت نہ دید و باز دید۔ نئی دہلی کی ایک غیر معروف شکستہ مسجد میں چٹائی پر قیام رہتا تھا۔ فرش پر آس پاس اخبارات کاغذات اور فائلیں، وقت آیا تو کسی دوکان پر جاکر کھانا کھالیا، کاغذات جھولے میں ڈالے اور پارلیمنٹ پہونچ گئے راستہ اکثر پیدل ہی طے کرتے اور موقع آن پڑتا تو پارلیمنٹ میں ایسی دوٹوک اور بے لاگ تقریر کرتے کہ در و بام گونج اٹھتے'

حسرت موہانی کی ۱۳ر مئی ۱۹۵۱ء کو ۷۵ سال کی عمر میں وفات ہوئی اور وہ انوار باغ لکھنؤ میں اپنے پیر و مرشد کے پاس سپرد خاک کئے گئے۔

سلسلہ صفحہ ۳۳

محبت ہمیشہ موجزن رہا کرتی تھی۔ قوم کی ہر ممکنہ مدد کیلئے وہ ہمیشہ کمربستہ رہتے تھے۔
۱۹ر فروری ۱۸۹۵ء کو ۵۹ سال کی عمر میں منشی نول کشور نے اس دنیائے فانی کو الوداع کہا۔ لیکن رہتی دنیا تک ان کا نام زندہ اور تابندہ رہے گا۔

ہرگز نہ میرد آن کہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت ست بر جریدۂ عالم دوام ما

—:•:—

مسعود احمد شروانی
راحت منزل، حمایت نگر، حیدرآباد

گنج گراں مایہ
منشی نول کشور

۱۸۸۸ء کی کوئی تاریخ ہے۔ پنجاب کے شہر لدھیانہ میں غیر معمولی چہل پہل نظر آرہی ہے۔ شہر کو رنگ برنگے قمقموں اور جھنڈیوں سے آراستہ کیا گیا ہے۔ شہر کے حکام انتظامات کی نگرانی میں منہمک ہیں۔ جابجا یونین جیک اور افغانستان کے جھنڈے لہرا رہے ہیں۔ شہر کے ایک وسیع میدان میں عظیم الشان دیدہ زیب شامیانہ لگایا گیا ہے۔ انتہائی قرینہ سے صوفے اور کرسیاں رکھی گئی ہیں۔

یہ انتظامات ہز میجسٹی شاہِ افغانستان امیر عبدالرحمان خاں کے ورودِ مسعود کے سلسلہ میں کئے جا رہے ہیں۔ جوں ہی جلسہ گاہ میں والیٔ افغانستان رونق افروز ہوئے پنجاب کے لفٹننٹ گورنر نے دیگر اعلیٰ عہدہ داروں کے ساتھ آگے بڑھ کر شاہی مہمان کا کامل احترام کے ساتھ استقبال کیا اور شہ نشین پر مرصع خصوصی کرسی پر تشریف فرما ہونے کی درخواست کی۔ جلسہ میں ہندوستانی راجے مہاراجے اور دیگر والیانِ ریاست بہ نفسِ نفیس شرکت فرما رہے تھے

ایک ہندوستانی کو جو معمولی کپڑے زیب تن کئے ہوئے تھا راجے مہاراجوں اور والیانِ ریاست سے زیادہ بلند اور ممتاز مقام پر جگہ دی گئی تھی۔ حاضرینِ دربار محوِ حیرت اور انگشت بہ دنداں تھے کہ اس شخص کیلئے خصوصی نشست کی کیا وجہ تھی۔ ایک گوشہ سے صدائے احتجاج بلند ہوئی۔ والیٔ افغانستان نے بھی اس شخص کی خصوصی نشست کے اہتمام پر تعجب کا اظہار کیا۔ اپنے وزیر سے اس عجیب صورتحال کے متعلق استفسار کیا۔ وزیر موصوف نے عرض کیا کہ "حضور! یہ وہی نول کشور ہیں جنھوں نے تمام ایشیا میں مشعلِ علم و دانش روشن کی ہے" منشی نول کشور

سا ولیٔ افغانستان سے تعارف کرایا گیا ایستادہ ہوکر ان کا استقبال کیا اور فرمایا کہ "ہندوستان آکر جو مسرت آپکو دیکھنے سے ہوئی اس کا اظہار ممکن نہیں" یہ فرماکر ہز مجسٹی نے منشی نول کشور کو پہلے سے بھی بلند مقام پر بٹھانے کی تاکید کی۔

منشی نول کشور ریتوی ضلع علی گڑھ میں ۳ار جنوری ۱۸۳۶ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے دادا مغل تاجدار شاہ عالم کے زمانہ میں شاہی دربار کے عہدہ دار تھے۔ مرزا غالب نے اپنے خطوط میں جابجا منشی نول کشور کا ذکر کیا ہے۔ انہیں کبھی "زہرہ صورت اور مشتری سیرت" قرار دیا ہے تو کبھی "خوبصورت و خوش سیرت، سعادت مند اور معقول آدمی" لکھا ہے

منشی نول کشور ۱۸ سال کی عمر میں آگرہ کالج سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد لاہور منتقل ہوگئے۔ اس دور کے مشہور اردو صحافی منشی ہرسکھ رائے مدیر "کوہ نور" کی زیر تربیت صحافت طباعت اور اشاعت کے عملی تجربے سے حاصل کئے۔

ہندوستان کی جنگ آزادی کے فوراً بعد ۱۸۵۸ء میں منشی جی لکھنؤ آگئے اور یہاں رکاب گنج محلے میں "نول کشور پریس" قائم کیا۔ ان کی عمر اس وقت صرف ۲۲ سال تھی۔ پریس کے قیام کے ساتھ ہی انہوں نے ایک روزنامہ "اودھ اخبار" جاری کیا۔ ۲۶ر نومبر ۱۸۵۸ء شمالی ہند کا پہلا اردو روزنامہ "اودھ اخبار" کے نام سے ان ہی کی ادارت میں شائع ہوا۔

منشی نول کشور نے مشرقی زبانوں میں علوم و فنون کی ہزاروں کتابیں شائع کیں مختلف عربی کتابوں کے فارسی ترجمے شائع کئے۔ اور فارسی زبان سے اردو میں ترجمے کئے اور شائع کئے۔ ان کا دارالترجمہ ہندی، سنسکرت، مراٹھی، بنگالی، گرمکھی اور انگریزی زبان کے ادیبوں اور انشاپردازوں پر مشتمل تھا۔

منشی نول کشور کی وسیع القلبی کا یہ حال تھا کہ وہ ایک طرف ہندو مذہب کی کتابیں شائع کرتے تو دوسری طرف اسلامی کتابوں کی اشاعت میں بیش از بیش حصہ لیتے تھے۔ انہوں نے ہر مذہب کے ماننے والوں کو باہم دگر قریب لانے کا ہر ممکن کوشش کی۔ قومی یکجہتی اور جذباتی ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے مسلمانوں کی مذہبی کتابوں کو ہندی میں اور سکھوں اور ہندوؤں کی مذہبی کتابوں کو اردو میں شائع کرکے ملک اور قوم کی عظیم خدمت انجام دی

منشی نول کشور کے پریس میں قرآن شریف کی طباعت کا انتظام اسقدر پاکیزہ تھا کہ جو کسی اسلامی پریس میں بھی نہیں ملتا۔ قرآن مجید کی طباعت کا کام مسلمان ملازمین کے تفویض کیا جاتا۔ جو ہر وقت پاک وصاف رہتے۔ منشی جی ملازمین کو جب تک انہوں نے غسل نہ کیا ہو یا باوضو نہ ہوں مشین کے قریب آنے نہیں دیتے تھے۔ طباعت کے بعد وہ پتھر جن پر قرآن کریم کی چھپائی ہوتی تھی دھوئے جاتے۔ ان کا پانی ایک حوض میں جمع کیا جاتا اور وہاں سے سیدھے دریائے گومتی کے درمیان بہادیا جاتا۔

دوران طباعت قرآن شریف کے جو صفحات خراب ہو جاتے ان کو چن چن کر جمع کیا جاتا اور دریا میں احترام کے ساتھ بہادیا جاتا تھا۔

منشی نول کشور نے دنیا کی سب سے ضخیم کتاب "طلسم ہوشربا" بھی طبع کرائی۔ اس کتاب کے مصنفین منشی محمد باقر اور محمد حسین کو دفتر میں لانے اور لے جانے کے لئے پالکی کا استعمال کیا جاتا تھا۔ منشی نول کشور نے اپنی زندگی میں ۱۸۵۸ء سے ۱۸۹۵ء تک فلسفہ، مذہب، تاریخ، سائنس، ادب، صنعت وحرفت، نجوم ورمل، حساب، جغرافیہ، خوش نویسی، مصوری اور موسیقی جیسے مختلف عنوانات پر اتنی بڑی تعداد میں اور ایسی ضخیم کتابیں شائع کیں، جو ساہتیہ اکیڈمی اور اس جیسے ادارے بھی نہیں کرسکتے۔

منشی جی کے پریس میں ۱۲ سو ملازمین کام کرتے تھے اور اسے ایشیا کا سب سے بڑا پریس ہونے کا فخر تھا۔ منشی جی نے لکھنؤ میں شمالی ہندوستان کا پہلا پیپر مل قائم کیا تھا۔ ان کے زمانہ حیات ہی میں ان کے پریس اور بک ڈپو کی شاخیں کانپور، پٹیالہ، لاہور اور لندن میں قائم ہوئیں۔

۱۸۷۷ء میں منشی نول کشور کی خدمات کے اعتراف میں ملکہ وکٹوریہ کے دربار میں انہیں "قیصر ہند" کے اعلیٰ اعزاز سے سرفراز کیا گیا اور دہلی دربار میں ان کو ممتاز جگہ دی گئی۔ انہیں C.I.E کا خطاب بھی دیا گیا۔

اردو زبان کی ترویج واشاعت اور اس کے ادبی سرمایہ کی حفاظت کے سلسلہ میں منشی نول کشور کا احسان کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ان کے دل میں وطن کی بے پایاں

(باقی صفحہ ۳ پر)

سیدہ مہر
ایم اے بی ایڈ

عائشہ آپا

بہت عرصہ ہوا قادر جاوید صاحب نے محترمہ عائشہ آپا کی علمی و ادبی خدمات پر ایک وقیع مضمون لکھا تھا جس میں انہوں نے محترمہ کے عہد سے خلوص اور تعلیمی سرگرمیوں اور ان کی بے لوث خدمات کا جائزہ لیا تھا۔ اس کے بعد حال ہی میں بزم خواتین کی جانب سے (جنکی صدر فخر نسواں محترمہ عظمت عبد القیوم تھیں) ایک جلسہ "عائشہ یوسف الدین کے ساتھ ایک شام" کے عنوان سے منعقد کیا گیا تھا۔ مجھے اس جلسہ کی روئیداد تو معلوم نہ ہو سکی مگر خوشی ہے کہ حیدرآباد کی باذوق خواتین نے انکی شاندار خدمات کا اعتراف کیا۔ اخبار "سیاست" میں وقتاً فوقتاً تذکرے پڑھنے کو ملتے ہیں جس میں مسلم بچوں کی تعلیمی پسماندگی اور ان کے والدین کی بے حسی کا شدید احساس لئے وہ بار بار ان سے ربط پیدا کرتی ہیں ان کے لئے کلاس کا انتظام کرتی ہیں اور ان کی یہ جدوجہد گھر گھر گھوم کر جاری رہتی ہے۔

عائشہ آپا کا وطن اورنگ آباد ہے انکی ابتدائی تعلیم وہیں ہوئی پھر اعلیٰ تعلیم بھی وہیں حاصل کرکے ناگپور سے ایم اے کی تکمیل کی آپکی والدہ ماجدہ بیحد ذہین اور منتظم خاتون تھیں گو وہ زیادہ پڑھی لکھی نہ تھیں مگر اپنے سب بچوں کی تعلیم و تربیت میں نمایاں حصہ لیا۔ آپا صاحبہ نے گریجویشن کی تکمیل کے ساتھ ہی ٹیچر کی خدمت قبول کر لی۔ بعد ازاں صدر مدرسہ ہو گئیں پھر ترقی پاکر ایجوکیشن آفیسر، ڈپٹی ڈائرکٹر اور جائنٹ ڈائرکٹر (دلونہ) پر فائز ہو کر وظیفہ حسن خدمت حاصل کیا۔ اسی دوران ہندی اور مرہٹی پر عبور حاصل کیا۔ دوران تعلیم ہی آپا یوسف بھائی سے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئیں جو جالنہ پر مہتمم پولیس تھے۔ یوسف بھائی نہایت نیک طبیعت اور شریف النفس انسان تھے انہوں نے ہمیشہ آپا کی قدر کی اور حوصلہ افزائی کی مگر عمر کی ایسی منزل پر وہ ان سے جدا ہو گئے جبکہ ان کی رفاقت میں آپا کو مزید تقویت مل سکتی تھی۔ آپ نے بھی کبھی اپنے گھر اور خاندان سے غفلت نہیں برتی انہیں ہمیشہ اس بات کا احساس رہا یہی وجہ تھی کہ ان کے سب بچے انجینئر

اور ڈاکٹر ہیں۔
ان کی علمی وانسانی خدمات کا ایک بسیط کینوس ہے جو بیان کرنے کے لئے ایک طویل مضمون چاہتا ہے۔ وہ شاعرہ بھی ہیں رباب تخلص کرتی ہیں۔

صحت کی خرابی کے باوجود وہ کام سے کبھی نہیں گھبرائیں کبھی انہوں نے ملازمت کے دوران رخصت لیکر آرام کی گھڑیاں نہیں گزاریں ۔ ان کا حسن انتظام یہ تھا جہاں بھی رہیں بہترین ریکارڈ رہا ۔ وہ سادگی پسند ہیں جو ان کی زندگی کے ہر شعبے میں جھلکتی ہے۔ میں نے انہیں کبھی زرق برق اور قیمتی لباس زیب تن کئے نہیں دیکھا نہ کبھی زیورات سے مزین رہیں۔ بلکہ نہایت سیدھا سادہ اور معمولی لباس پہنا کرتیں جس میں نفاست نمایاں رہتی۔

انہیں خانہ داری کی جھنجھٹوں سے ہمیشہ فراغت رہی کیونکہ ان کی زندگی کا مقصد بہت عظیم ہے ان کے وقت کا بیشتر حصہ فلاحی کاموں میں صرف ہوتا ہے۔ کئی خاندان ان کی پرخلوص کوششوں سے سنبھل گئے۔ کئی بن جہیز بیٹھی ہوئی اور رشتوں سے محروم لڑکیوں کے لیے مناسب بر تلاش کئے کئی ازدواجی زندگی کی الجھنیں انکی مصالحانہ خوش اسلوبی سے سلجھ گئیں۔ ان کی نگرانی اور سرپرستی میں کئی نادار بچوں نے تعلیمی سہولتیں پاکر اپنی تعلیم جاری رکھی ہے۔ جو تعلیم سے فارغ ہوکر بے روزگار رہے ان کا اپنے اختیار سے تقرر کردیا یا سفارش کرکے ملازمت دلوادی۔

اورنگ آباد۔ جالنہ اور پربھنی کی صدارت کے دوران ہزارہا طالبات ان کے فیض سے مستفید ہوئیں وہ میٹرک کی طالبات کو بہ نفس نفیس پڑھاتی بھی تھیں ۔ انگریزی اور تاریخ جغرافیہ جیسے مضامین کی زائد کلاس لینے مدرسہ شروع ہونے سے بہت پہلے آجایا کرتیں۔ جسکا اثر نتائج پر نمایاں ہونے لگا ۔ ان کی یہ انتھک محنت دوسروں کے لئے مشعل راہ ثابت ہوتی رہی۔

جس وقت وہ جالنہ گرلز اسکول پر صدارت کی خدمات انجام دے رہی تھیں میں اپنی چھوٹی نند کو شریک کرنے کے لئے گئی اجلاس پر ایک بارعب مگر خوش اخلاق خاتون کو بیٹھا دیکھ کر میں گھبرا گئی۔ دوران گفتگو انہوں نے مشورہ دیا کہ کالج سے نکل کر بیکار گھر میں بیٹھنے کی بجائے کچھ قوم کی خدمت کروں ان کی خوش اخلاقی اور مدلل گفتگو سے اتنی متاثر ہوئی کہ فوری اس مشورے کو قبول کرلیا ۔ آپا نے میرا امید منظوری میرا تقرر کردیا اور دو ایک مہینے بعد حیدرآباد آکر حضور النساء بیگم

مہتمم مدارس نسواں سے کہکر اس تقرر کو معدوم بنا لیا۔ دوران ملازمت مجھے کبھی یہ محسوس نہیں ہوا کہ وہ میری حاکم ہیں ان کا اندازِ تخاطب ایسا دلنشیں ہوتا ہے کہ کام کرتے ہوئے ایک طمانیت اور مسرت کا احساس قائم رہتا ہے صدارت سے ترقی پاکر جب میں ایجوکیشن آفیسر کے عہدے پر پہنچی تو ان ہی کے مسلک کو چراغ راہ بنا لیا اور کامیابی حاصل کی۔

آپا ایک بے تعصب ہستی ہیں وہ قومی یکجہتی کی زبردست حامی ہیں اس ضمن میں بیسوں واقعات میرے حافظے میں ہیں مثال کے طور پر مسز ڈافنے نے خود جذبات تشکر لئے مجھے بتایا کہ وہ ایک بیوہ خاتون ہیں صرف میٹرک پاس تھیں لیکن آپا کی حوصلہ افزائی کی وجہ سے گریجویشن کی تکمیل کا اور اعلیٰ گریڈ پاکر آرام دہ زندگی گزاری۔ منگیکر صاحب ریاضی کے ایک مانے ہوئے استاد تھے ایک دفعہ آپا کے ساتھ میں ان کے گھر گئی تھی جوں ہی آپا نے دہلیز پر قدم رکھا تو بڑے ادب سے کہا یہ میرے گرو کا گھر ہے۔ آپا کے دفتر کے ایک ناظر مسٹر گوڑ بولے کا اچانک عارضۂ قلب پر حملے سے انتقال ہو گیا۔ آپا اتنی متاثر رہیں جیسے ان کا کوئی عزیز چل بسا ہو۔ خلد آباد میں گاندھی صدی تقاریب میں ہر ذات پات کے لوگوں نے شرکت کی دو تین دن کے اس قیام میں آپا سب میں گھل مل کر اس طرح رہیں جیسے وہ ان ہی کے خاندان کے اراکین ہوں۔ انسانی ہمدردی کے دو ایک واقعات کا تذکرہ یہاں بے جا نہ ہوگا۔ ایک ضرورت مند صاحب نے ان سے قرض مانگا اتفاق سے آپا اتنی رقم دینے کے موقف میں نہ تھیں مگر ساتھ ہی ان کو خالی ہاتھ لوٹانا بھی نہیں چاہتی تھیں لہذا اپنے گلے کا ہار ان کے حوالے کر دیا کہ ضرورت رفع ہوتے ہی چھڑا کر دے دیں۔

ایک دفعہ ایک غریب مدرس ان کے پاس تبادلہ کی درخواست لیکر آیا رات کافی ہو گئی تھی۔ گاؤں دور تھا آپا کے سب نوکر چاکر رخصت ہو گئے تھے غریب آدمی کی بھوک کا احساس کر کے انہوں نے خود روٹیاں پکائیں اور اسے کھانا کھلایا۔

زندگی نے انہیں جو بھی رشتے بخشے اس میں وہ نہایت کامیاب رہیں ان کا پیارا روپ تو ایک ماں کا روپ ہے سب ہی کے لئے وہ ایک عظیم ماں کا ممتا بھرا دل رکھتی ہیں جو یہی سوچتا ہے کہ قوم کے بچے کس طرح راہ راست پر گامزن ہو سکتے ہیں

ہماری سیکولر گورنمنٹ جس میں اقلیتوں کے لئے منصفانہ گنجائش رکھی گئی ہے جواباً وہ بھی اپنی

انفرادیت قائم رکھتے ہوئے معاشرے کی خوشحالی میں برابر کے حصہ دار ہیں مگر آج کے بدلتے دور میں
ںکے برخلاف عملدرآمد کے نتیجے میں وہ سہولتیں آہستہ آہستہ ختم کی جارہی ہیں خصوصاً مسلمانوں کے
ساتھ ملازمتوں اور تعلیمی سہولتوں کے سلسلہ میں معاندانہ برتاؤ روا رکھا جارہا ہے اردو مدارس سے
پروابی اساتذہ کے مسائل بحث کی غیر منصفانہ تقسیم کے خلاف انہوں نے جہد مسلسل شروع کردی ہے
ان سارے مسائل کے حل میں ہر وقت جٹی رہتی ہیں کاش ملک کی سربرآوردہ اور تعلیم یافتہ خواتین
ن کے اس مشن میں ان کا ہاتھ بٹا سکیں ان ہی کی طرح فعال بن کر قوم کے مسائل کو حل کرنے کی طرف
متوجہ ہوجائیں۔

آج کل آپا حیدرآباد کے پسماندہ طلباء کیلئے کوچنگ کلاس چلانے کی نگرانی کررہی ہیں وہ اکثر مدارس
تعلیمی اداروں کا دورہ کرکے وہاں کی کوتاہیوں سے ارباب حل و عقد کو متوجہ کرتی ہیں اس کے علاوہ
ساتذہ، نگرانکار اداره جات اور خود طلباء کی رہبری کرتی ہیں طلباء کو ان کے رجحان طبع کے لحاظ سے
مشورے دیتی ہیں۔ انہیں حکومت کا غیر مساویانہ سلوک اور اردو زبان سے اس کی ناانصافی کا
قلق ہے حال ہی میں وہ امریکہ سے لوٹی ہیں "سیاست" میں ان کا ایک مضمون شائع ہوا ہے
س میں امریکہ کے مدارس سے ہمارے ملک کے مدارس کا موازنہ کرکے احساس دلایا ہے کہ زندگی کے سب
ضروری شعبے سے ہماری لاپرواہی کسقدر افسوسناک ہے۔ وہ اس شعر کی پوری طرح قائل ہیں۔

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی   نہ ہو جسکو خیال خود اپنی حالت کے بدلنے کا

سچ تو یہی ہے کہ ہماری قوم میں اپنے حق کو خود حاصل کرنے کی صلاحیت ہونی چاہیئے نہ کہ دوسروں سے
شکوہ۔

اگر آج مسلمانوں کا سربرآوردہ اور دولت مند طبقہ اپنے اختلافات بھول کر اپنی زوال آمادہ
م کی حالت سدھارنے کا تہیہ کرے تو کوئی عجب نہیں کہ ترقی یافتہ اقوام کی صف میں ہم بھی سربلند
ں۔ غرض آپا ایک مینارۂ نور ہیں جس سے اکتساب کرنا ہمارا فرض ہے۔

آل احمد سرور

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور اردو ذریعہ تعلیم

اس سوال کا سیدھا سادا جواب یہ ہے کہ ضرور ہونی چاہیے اور اس نیک کام میں کسی انتظار کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن یہیں یہ بات بھی کہنا ضروری ہے کہ صرف اردو ذریعہ تعلیم نہیں ہونی چاہیئے۔ بلکہ انگریزی کے علاوہ اردو بھی ہوتی چاہیئے۔ مطلب یہ ہے کہ انگریزی کے ذریعے سے اعلیٰ تعلیم کا سارا نظام ایک عرصہ دراز تک بدستور چلتا رہے۔ ہاں اسکے علاوہ جلد سے جلد اردو کے ذریعے سے آرٹس، سوشل سائنس، سائنس اور کامرس کی فیکلٹیوں میں پہلی ڈگری تک اردو ذریعہ تعلیم اور اردو ذریعہ امتحان ہو اور جب یہ تجربہ کامیاب اور مستحکم ہوجائے تو اس کے بعد پوسٹ گریجویٹ مرحلے کی تیاری کر کے اس منزل پر بھی اعلیٰ تعلیم کا مناسب انتظام اردو کے ذریعے سے کیا جائے۔

اس اقدام کی خالص علمی اور تہذیبی، تعلیمی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے اہمیت کے متعلق میرے نزدیک اہل نظر میں اتفاق ہے اور تفصیل سے ہر پہلو پر نظر ڈالنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ جن لوگوں کے ذہنوں پر مہریں لگی ہوئی ہیں اور جن کے ذہن پر تالے پڑے ہوئے ہیں ان کو چھوڑ کر ہر صاحب بصیرت اس حقیقت سے واقف ہے کہ خیال اور زبان کا ایک دوسرے سے بہت گہرا تعلق ہے۔ اور کوئی ذہن نہ اپنی مادری زبان کے علاوہ دوسری زبان میں سوچ سکتا ہے نہ خیال کے چراغ سے دوسرے دوسرے خیال کا چراغ جلا سکتا ہے۔ کسی دوسری زبان کے ذریعے سے تعلیم پانے والا کتاب خواں تو ہو سکتا ہے صاحب کتاب نہیں ہو سکتا۔ وہ مانگے کے اجالے سے اپنے گھر میں کچھ روشنی کر سکتا ہے مگر اپنی محفل میں چراغاں نہیں کر سکتا وہ ساری عمر تقلید کرتا رہے گا۔ کبھی اجتہاد نہ کر سکے گا۔ وہ زیادہ سے زیادہ ترجمانی کا حق ادا کر دے گا مگر وہ نہیں کر سکے گا جو نئی تخلیق کے لئے فضا ہموار کرتی ہے۔ وہ قدروں کا کاروبار اس طرح کرے چلتی ہوئی چیزوں اور بکاؤ مال کو مقبول بنائے۔ اس میں آزادِ فکر، اخلاق تخیل اور بے باک

جمعہ ۱۰

[illegible]

نہ پیدا ہوسکے گا۔ [illegible] رہے گا۔ اور روگی کے الفاظ میں تحفہ سے ہی سن کے علم کا رشتہ رہے گا اور نتیجے میں یہ علم سانپ بن جائے گا۔ مگر چونکہ دل سے اس کا تعلق ہوگا اس لئے علم کی پارس کی قیمت اسے حاصل نہ ہوسکے گی۔ پھر چونکہ زبان تہذیب کا آلہ ہوتی ہے اس لئے اپنی زبان میں علم نہ حاصل کرنے کی وجہ سے اس کی اپنی تہذیب کی حیات بخش رحیات آفریں بنیاد اسے نہ مل سکے گی۔ وہ ہمیشہ خلاء میں معلق رہے گا۔ اپنی دھرتی اور پنی فضا سے اس کا تعلق نہ ہوگا جس کے رس اور جس کے فیض سے اس کو اپنی سیرت و شخصیت پورے قد تک پہنچانے کا موقع ملتا ہے۔ مالی توسکی کے وقت سے بات اب سماجی علوم ماہرین ماننے لگے ہیں کہ ہر زبان میں خواہ وہ کسی وجہ سے آگے نہ بڑھی ہو، یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ دنیا کی ان زبانوں کی تخلیق میں ہمسری کرسکے جو ترقی یافتہ کہلاتی ہیں بشرطیکہ ان کو اقع ملتے رہیں۔ آج کی [illegible] کو وحشیانہ کہکر نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ جہاں تک اردو تعلق ہے اس بات پر زیادہ زور دینے کی ضرورت نہیں کہ یہ خاصی ترقی یافتہ زبان ہے۔

دوستان کی مشترکہ تہذیب کی کمائی ہوئی ساری دولت اس کے پاس ہے۔ ہندوستان کی تاریخ ے ہر موڑ کا اس نے ساتھ دیا ہے اور یہ اس کے درد و داغ اور آرزو و جستجو کی ہر منزل ے زادِ راہ لیتی رہی ہے اور "انقلاب زندہ باد" سے لے کر "آرام حرام ہے" اور "غریبی ہٹاؤ" کے نعرے میں اسی کا سہارا لیا گیا ہے۔ پھر دلی کالج۔ سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی، دارالترجمہ ثمانیہ یونیورسٹی، انجمن ترقی اردو ہند اور اب ترقی اردو بورڈ کے ذریعہ سے جدید ترین علمی کار و مسائل، نظریات و نگارشات کے اظہار پر قادر ہورہی ہے۔ آزادی کے بعد بھی جب مختلف سیاسی اسباب کی بنا پر اس کے چلن اور تعلیم پر پابندیاں عائد کی گئیں، بہار میں یہ دوسری سرکاری ن ہے اور اب اتر پردیش میں بھی حکومت اس غرض کے لئے ایک بل لائی ہے۔ آندھرا پردیش نہ صرف ثانوی تعلیم بلکہ اعلیٰ تعلیم بھی اس کے ذریعے سے دی جارہی ہے اور تلنگانہ میں یہ ری زبان ہے۔ مہاراشٹر میں اس کے ذریعے سے ثانوی تعلیم کا ایک اچھا اور خاصا کارآمد چا نیل ہے۔ ہندی ریاستوں میں بھی ابتدائی تعلیم کے علاوہ کہیں کہیں ثانوی تعلیم کا کچھ م ہے۔ جموں و کشمیر کی یہ سرکاری زبان ہے اور اس کے تین علاقوں، کشمیر، جموں اور

لداخ میں لنک لینگویج یا تینوں حصوں کو ایک دوسرے سے منسلک کرنے والی زبان ہے۔ آزادی کے بعد بھی اس کا ادب ہندوستان کی دوسری قومی زبانوں کے مقابلے میں کسی طرح کم مایہ نہیں کہا جاسکتا۔ ملک کی ایک تہائی یونیورسٹیوں میں اردو کے شعبے قائم ہیں۔ ہندی کے بعد سب سے زیادہ اخبارات اس زبان میں شائع ہوتے ہیں اور جس طرح ازمنۂ وسطیٰ کی کلیدی زبان فارسی ہے اور کوئی ازمنۂ وسطیٰ کا طالب علم فارسی سے بے نیاز نہیں ہوسکتا اسی طرح اٹھارویں اور انیسویں صدی کے ذہن، سماج، مزاج اور مسائل کو سمجھنے کے لئے اردو میں جتنا مواد ہے وہ کسی اور زبان میں مشکل سے ملے گا۔ کیونکہ دوسری سب زبانیں علاقائی تھیں۔ اس زمانے میں یہی ملک گیر زبان تھی۔ آخری بات نفسیاتی ہے کسی دوسری زبان کے ذریعہ سے تعلیم حاصل کی جائے تو تعلیم کے ساتھ اس زبان کی تہذیب بھی مزاج اور شخصیت پر اثر انداز ہوتی ہے۔ آدمی ہمیشہ محتاج رہتا ہے۔ کسی ذہنی سہارے، کسی نظریاتی لاٹھی کا جو زبان کے ذریعے سے غیر شعوری طور پر در آتی ہے وہ غنی نہیں ہوسکتا۔ اپنی زبان پر کامل عبور کے بعد دوسری زبان بھی سیکھے گا تو شجر سے پیوستہ رہے گا۔ اپنی زبان پر عبور کے بغیر دوسری زبان سیکھے گا تو اس کی شخصیت خانوں میں تقسیم ہو جائے گی اور وہ ساری عمر ایک ذہنی کشمکش میں مبتلا رہے گا۔ اپنا ورثہ، اپنا ماحول، اپنی تہذیب کی غذا کے بغیر اس کی کیفیت وہ ہوگی جس کی طرف جگر نے ایک مصرع میں اشارہ کیا ہے ؎

سینہ خالی، آنکھیں ویراں دل کی حالت کیا کہیے۔

ہماری آخری تعلیمی کمیشن یعنی کوٹھاری کمیشن نے نہ صرف علاقائی زبانوں کو اعلیٰ تعلیم کی منزل تک ذریعہ تعلیم بنانے کی سفارش کی تھی بلکہ خاص طور پر دو جگہ اس پر زور دیا تھا کہ اردو میں اعلیٰ تعلیم کے لئے دو مرکز ایک شمالی ہند میں، ایک جنوبی ہند میں قائم کئے جائیں۔ قومی تعلیمی پالیسی کی قرارداد میں جو پارلیمنٹ نے ۱۹۶۷ء میں منظور کی علاقائی زبانوں کو اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بنانے کے اصول کی توثیق کر دی گئی۔ گویا اگر ہم اس سلسلے میں کوئی قدم اٹھائیں تو وہ اس پالیسی کے عین مطابق ہوگا اور ہم خاموش بیٹھے رہیں تو یہ ہماری ہی کوتاہی ہوگی۔ حکومت بہرحال ہر قومی زبان اور علاقائی زبان میں اعلیٰ تعلیم دینے کی پالیسی پر گامزن ہے۔ ریاستی حکومتیں اپنی

علاقے میں جدید ترین معیار کے مطابق کتابوں کی تصنیف و تالیف اور ترجمے میں مصروف ہیں۔
چونکہ حکومت ہر قومی زبان کے لئے سہولت دینی چاہتی ہے اس لئے مرکزی ترقی اردو بورڈ اسی
رن سے ۱۹۶۹ء میں وجود میں آیا۔ اس وقت کے وزیر تعلیم نے بورڈ کا مقصد خاص طور سے
نیورسٹی کی تعلیم کے لئے اردو میں مناسب لٹریچر تیار کرنا اور وقت کے تقاضوں کا لحاظ کرتے
ئے اردو داں طبقے میں سائنسی مزاج پیدا کرنے کے لئے سائنسی عام فہم لٹریچر تیار کرنا قرار
تھا۔ اس خاکے کے مطابق بورڈ اپنا کام کر رہا ہے۔ ہاں اردو داں طبقے کی ضرورت کو دیکھتے
ئے لغات، حوالے کی کتابوں اور بچوں کے ادب پر بھی خاص توجہ کی گئی ہے۔
یہ بات بورڈ سے تعلق کی وجہ سے میرے ذاتی علم میں ہے کہ علیگڑھ کے ۱۲۵، استاد
یا کسی طرح ترجمے یا تصنیف و تالیف کے کاموں میں بورڈ کی مدد کر رہے ہیں یعنی اور اصطلاح سازی
کاموں میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی نمائندگی دوسرے تمام اداروں سے زیادہ ہے۔
ان امید افزا حالات کے باوجود نہ معلوم مسلم یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد کیا سوچ رہے
ہیں۔ میں نے ۱۹۷۳ء میں اکیڈمک کونسل کو اردو کو بھی ذریعہ تعلیم بنانے کی طرف توجہ دلائی
۔ اس کے بعد ۱۹۷۵ء کے آخر میں وائس چانسلر صاحب کی خدمت میں اپنی تجویز کی ایک نقل
اس کے ساتھ ایک نوٹ دیا تھا۔ اور انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ جلد اس سلسلے میں مناسب
دم اٹھائیں گے مگر ابھی تک معاملہ سرد خانے میں ہی ہے۔ وقت گزرتا جا رہا ہے۔ حیدرآباد
اردو کے چند خادموں نے پہلے آرٹس میں اور پھر سائنس اور کامرس میں بی۔اے تک تعلیم
انتظام کر دیا ہے۔ اور اس کے لئے ترقی اردو بورڈ کی مدد سے انجمن ترقی اردو ہند کی شاخ حیدرآباد
کتابیں بھی تیار کر دی ہیں۔ ان طلبہ کو عثمانیہ یونیورسٹی ڈگری بھی دے رہی ہے۔ جامعہ ملیہ
اسلامیہ میں بی۔اے کی منزل تک اردو ذریعہ تعلیم عرصے سے ہے۔ سر تیج بہادر سپرو اور
اہل بصیرت عثمانیہ یونیورسٹی کے تجربے کی صحت اور معنویت پر پہلے ہی مہر توثیق ثبت
ہیں۔ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، میر ولی الدین اور دو جنوں مستند اساتذہ کی علمی خدمات
نہیں ہیں کہ ملک انہیں فراموش کر دے۔ مگر یہ بات بڑے رنج سے کہنی پڑتی ہے کہ
مسلم یونیورسٹی جس سے اس معاملے میں آزادی کے بعد پہل کرنے کی توقع تھی وہ حالات

کے دریا میں تنکے کی طرح بہہ رہی ہے۔ اسے نہ یہ خیال ہے کہ ہم کہاں سے چلے تھے اور کدھر جانا ہے۔ نہ اس نے سرسید کے حقیقی پیغام کو ذہن میں رکھا ہے۔ مسلمانانِ ہند کی امیدوں آرزوؤں کا مرکز رہنے کے لئے جدید علوم کی اعلیٰ تعلیم کے علاوہ اسے اسلامیات، عربی، فلسفہ میں ماہرین پیدا کرتے ہیں جو نہ صرف ملکی بلکہ عالمی معیاروں پر پورے اتر سکیں اور ان سے دوسروں کو روشنی مل سکے۔ نیز اسے اردو کے ذریعہ سے جو ہماری مشترک تہذیب کی سب سے شاندار اور جاندار میراث ہے جدید علوم کی تعلیم دے کر ایک ایسی نسل تیار کرنا ہے جو این نہ ہو بلکہ وقت پر حکمرانی کر سکے۔ اردو کا شعبہ تو بجا طور پر اردو زبان و ادب کی تعلیم دے رہا ہے مگر اردو زبان کے ذریعہ سے تعلیم دینا اور اردو میں اس کے لئے علمی ادب کے سرمایہ میں گراں قدر اضافہ کرنا بھی اس کا فرض ہے جس کی طرف سے یہ ابھی تک غافل ہے۔ مجھے خوشی ہے کچھ نوجوان سائنسدانوں نے جن میں سعید الظفر چغتائی پیش پیش ہیں ایک سائنٹفک سوسائٹی بنائی جس نے گذشتہ چند سال تک جلسے بھی کئے اور مختلف علوم پر اردو میں مقالے پیش کئے مگر اب یہ بھی خاموش ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ یونیورسٹی اس سلسلے میں کیا کر رہی ہے۔ اس کے ایکٹ کے مطابق یونیورسٹی کو اب اقلیتی ادارے کا درجہ بھی مل گیا ہے۔ گویا اب اس کی ذمہ داری اور بڑھ گئی ہے کہ وہ عربی، فارسی اور اسلامیات کے فروغ کے علاوہ اردو کے ذریعہ دانشوری کے فرائض انجام دے۔ اگر ہمارا مطالبہ یہ ہوتا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں صرف اردو کے ذریعہ سے تعلیم دی جائے تو اس کی مخالفت سمجھ میں آ سکتی تھی کیونکہ آج ہمارے نام نہاد دانشوری کے بجائے ابن الوقتی کا شکار ہو گئے ہیں اور ان میں حریت فکر، جرأت اندیشہ بے دھڑک آتش نمرود میں کود پڑنے کی صلاحیت کم ہوتی جا رہی ہے مگر ہم تو یہ نہیں کہتے کہ موجودہ طریقۂ تعلیم اور ذریعۂ تعلیم کو ترک کر دیا جائے۔ فلسفے کی دنیا میں بھی اب یہ یا وہ ۱۹۵۷/۵۸ء کا نظریہ مقبول نہیں رہا ہم تو یہ بھی اور وہ بھی کے علمبردار ہیں۔ چاہتے ہیں کہ موجودہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہے۔ ہاں اسکے ساتھ اردو ذریعۂ تعلیم کا انتظام کیا جائے اور جلد سے جلد کیا جائے۔

جب سرسید نے مدرسۃ العلوم کی بنیاد ڈالی تھی تو وہ تین قسم کے مدرسے یا شعبے

ِنا چاہتے تھے ۔ ایک وہ مدرسہ جس میں انگریزی کے ذریعہ تعلیم دی جائے ۔ تیسرے وہ مدرسہ
ِس میں عربی فارسی کے طلباء کو مذہبی تعلیم دی جاتے ۔ پہلے سے دو مدرسے کھلے مزود مگر صرف
ریزی کا مدرسہ چلتا رہا ۔ اردو کا مدرسہ طلبا کی کمی اور حالات کی ناسازگاری کی وجہ سے سات
ل کے بعد بند کر دیا گیا ۔ انگریزی مدرسے کا مقصد صرف ملازمتوں کے لئے تیار کرنا نہیں تھا ۔ ایسے
ابھی تیار کرنا تھا جو اردو میں جدید علوم کو منتقل کر سکیں ۔ مگر انیسویں صدی کی نو آبادیاتی فضا کی
ِجہ سے اور انگریز پرنسپلوں اور پروفیسروں کے سرسید کے مزاج میں دخیل ہونے کی وجہ سے
زمتوں کا حصول اور جنٹلمین کا تصور ہی ایم ۔ اے ۔ او کالج کا مطمح نظر رہا ۔ اگر کچھ اچھے اردو
صنف کالج سے نکلے تو یہ کالج کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کے باوجود ورنہ ایم ۔ اے ۔ او کالج میں تو
یسویں صدی کے شروع تک مغرب اور مغربیت سے اس قدر مرعوبیت تھی کہ ایک طالب علم نے
م ۔ اے میں فارسی لی تو ساتھیوں کے پوچھنے پر اس نے کہا کہ میں لٹریچر میں ایم ۔ اے کر رہا ہوں
۔ اے ۔ او کالج میں معزز صرف انگریزی کا جانا جاتا تھا ۔ اردو کا معزز ادیب یا شاعر بس
رداشت کر لیا جاتا تھا ، ایم ۔ اے ۔ او کالج کی لطیف حکایت کو تسلیم کرتے ہوئے اس پہلو کی
حقیقت کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیئے ۔

ایم ۔ اے ۔ او کالج میں سرسید کی عظیم اصلاحی اور انقلابی تحریک جس طرح سکڑ اور سمٹ
اس کے تاریخی اسباب تھے ۔ سرسید خود اردو کے ذریعے سے تعلیم کے حامی تھے ۔ بعد میں انہوں
انگریزی کے ذریعے سے اعلیٰ تعلیم کی حمایت کی اور اردو کے ذریعہ تعلیم کی مخالفت کی ۔ مگر سرسید
سامنے دو مجبوریاں تھیں ۔ ایک تو وہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں میں جدید ذہن پیدا ہو جو قدیم
بچر سے پیدا نہیں ہو سکتا تھا ۔ دوسرے وہ چاہتے تھے کہ مسلمان جلد سے جلد ملازمتوں میں اپنا
ر حصہ لے لیں اور حکومت کی نظر عتاب ان پر نہ رہے ۔ لیکن آج جب کہ ہم آزاد ہندوستان
سانس لے رہے ہیں ہماری آزادی کو تقریباً چالیس سال اور ہماری جمہوریت کو انتالیس
گزر چکے ہیں ۔ ملک میں جمہوریت کی بنیاد مضبوط ہو رہی ہے اور ہم سیکولرزم اور سوشلزم
ف قدم بڑھا رہے ہیں خواص کے لئے تعلیم کی بجائے سارے سماج کے لئے تعلیم کے مواقع
ا اور چند افراد کے ذریعے سے علم اور تہذیب کے تعاطر کے بجائے عوامی اور جمہوری نظام

تعلیم ہی ہمارا نصب العین ہو سکتا ہے ۔ جب نہ صرف یہ حقیقت مانی جا چکی ہے کہ قومی زبانوں کے ذریعے سے اعلیٰ تعلیم کا انتظام ہونا چاہیئے بلکہ دوسری زبانوں میں اور علاقوں میں ایسا ہو بھی رہا ہے ۔ جب یہ اصول تسلیم کیا جا چکا ہے کہ ہمیں ساری دنیا سے تازہ فکر، تازہ ذہن، نئی غذا لینا چاہیئے ۔ مگر اپنی فطرت، اپنی جینیس، اپنی تہذیب تاریخ، اجتماعی لاشعور، اپنی عصری ... کے اساس پر اور اپنی چیزوں پر اعتماد کی بنیاد پر تو علی گڑھ کو اردو کے ذریعے اعلیٰ تعلیم دینے میں اب دیر نہ کرنی چاہیئے ۔ اس سلسلے میں کتابوں کی تیاری اور مناسب اور موزوں استادوں کے تقرر کے علاوہ یہ مسئلہ بھی قابل توجہ ہوگا کہ جو لوگ اردو کے ذریعہ بی ۔ اے، بی ۔ ایس ۔ سی، بی کام کی تعلیم حاصل کریں گے وہ آئندہ کیا کریں گے ۔ ان کے لئے روزگار کہاں سے آئے گا ۔ مجھے یہ عرض کرنے کی اجازت دیجئے کہ یہ روزگار کا مسئلہ اس قدر بھیانک طریقہ پر اس لئے پیش کیا جاتا ہے کہ لوگ اس کی ہیبت کی وجہ سے سوچنا اور سمجھنا چھوڑ دیں ۔ پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ ہمارے یہاں سے ہر سال جو گریجویٹ نکلتے ہیں ان میں کیا سب کو ملازمت مل جاتی ہے ۔ دوسری بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ آج بھی کچھ لوگ پرائیوٹ اسکولوں اور کالجوں میں استاد ہوتے ہیں یا اخباروں اور رسالوں کے دفتر میں کام کرتے ہیں یا اپنا چھوٹا موٹا کاروبار کرتے جس کا ان ڈگری سے کوئی تعلق نہیں ۔ دوسرے یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ اردو کے یہ گریجویٹ انگریزی اتنی ہی جانتے ہوں گے اور ہندی یا کسی علاقائی زبان سے اتنے ہی واقف ہوں گے جتنے دوسرے گریجویٹ اور چونکہ ہمارے دعوے کے مطابق اردو ذریعۂ تعلیم کی وجہ سے وہ اپنے مضمون کی روح سے اور دوسرے مضامین سے اس کے تعلق سے اور اپنی سیرت و شخصیت کی پختگی اور ذہن کی بیداری کی وجہ سے، ان طلبا سے جو انگریزی کے ذریعہ تعلیم حاصل کرتے ہیں زیادہ ذہین اور متناسب شخصیت رکھتے ہوں گے اس لئے وہ ان راستوں پر جو پامال ہو چکے ہیں ہٹ کر اپنے لئے نئی راہیں نکالنے کے زیادہ قابل ہوں گے ۔ بہر حال یونیورسٹی کے بنیادی مقاصد میں روزگار نہیں ہے ۔ تعلیم اور ہنر میں فرق ہے ۔ ہاں ہر اچھی یونیورسٹی کو اپنے طالب علم کو اس قابل بنانا چاہیئے کہ وہ خواہ مقابلے کے امتحان ہوں یا دوسری ملازمتوں کے ذریعہ ۔ کاروبار کے ذریعہ یا ملک و قوم کی فلاح کے دوسرے راستے ان میں کسی نہ کسی پر گامزن ہو سکے ۔ ان نوجوانوں

آج ہماری قومی طاقت کا خزانہ ہیں خدا کے لئے صرف مصلحت میں نہ بنا لیجئے کیونکہ آہستہ خرامی بلکہ محو خرامی تو ویسے ہی قومی کا مزاج ہے ان کو تجربہ کرتے زندگی کے لاتعداد امکانات دریافت کرنے، ان کو کھونے اور پانے، کچھ کرنے اور کچھ کر لینے کا موقع دیجئے ورنہ صنعتی تہذیب کا سمندر ویسے ہی ان کی ساری انرجی اور حرارت کو پی جانے کے لئے بیتاب ہے۔

پہلے میرا خیال یہ تھا کہ ہر فیکلٹی ان مضامین میں جن کے سربراہ اس کے لئے تیار ہوں موجودہ درجوں کے متوازی اردو کے درجے قائم کرے، جن میں اردو ذریعہ تعلیم ہو۔ اب مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ایک اس سے بہتر صورت بھی ہے کیونکہ اس تجویز میں کچھ انتشار اور کچھ انتظامی دشواریوں کا سامنا ہو سکتا ہے۔ اب غور کر کے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اس کیلئے حسب ذیل طریقہ کار بہتر ہوگا۔

۱. سب سے پہلے اکیڈمک کونسل ایک نمائندہ کمیٹی بنائے جس میں آرٹس سوشل سائنسز اور کامرس کی فیکلٹیوں میں سے دو دو اساتذہ چاروں فیکلٹیوں کے ڈین، ہر فیکلٹی سے ایک ایک طالب علم اور اس کے علاوہ یونیورسٹی کا ایک پروفیسر اور ایک ریڈر اور ایک لیکچرر اور یونین کے تین عہدہ دار مزید ہوں۔ ان ۲۲ ممبروں کی کمیٹی کے صدر وائس چانسلر اور نائب صدر پرو وائس چانسلر ہوں، پرو وائس چانسلر کمیٹی کا جلسہ طلب کریں جو جلد سے جلد حسب ذیل باتوں کے سلسلے میں اپنی سفارش اکیڈمک کونسل کو پیش کرے۔

۱. کیا اصولی طور پر اردو ذریعہ تعلیم سے اتفاق ہے؟

۲. اگر ہے تو اس کے لئے عملی ڈھانچہ کیا مناسب ہوگا؟ متوازی درجوں کا یا ایک علیحدہ کالج کا۔

۳. اگر متوازی درجوں کا انتظام کرنا ہے تو ڈین صاحبان اپنے اپنے طور پر یہ انتظامات کریں گے۔ ہر شعبے کا اختیار ہوگا کہ وہ چاہے تو اگلے تعلیمی سال سے اردو میں تعلیم کا انتظام کرے اور چاہے تو دوسرے شعبوں میں اس کا تجربہ دیکھ لے مگر یہ نہ ہونا چاہئے کہ چند شعبوں کی مخالفت کی وجہ سے جو شعبے یہ تعلیم دینا چاہتے ہیں وہ بھی ایسا نہ کر سکیں۔

۴۔ اکیڈمک کونسل کی رپورٹ فیکلٹیوں کو بھیجی جائے اور وہ شعبوں سے رائے لیکر ایک مہینے کے اندر عملی تجاویز اکیڈمک کونسل کے سامنے رکھیں۔

۵۔ اکیڈمک کونسل کی منظوری کے بعد اگزیکٹیو کونسل میں یہ معاملہ پیش کیا جائے اور قواعد وضوابط میں ضروری ترامیم اس سیشن کے ختم ہونے سے پہلے ہوجائیں

۶۔ اگر کالج کی تجویز منظور ہوجائے تو پہلے سال آرٹس اور سوشل سائنس میں اور دوسرے سال سائنس اور کامرس میں اردو کے ذریعے تعلیم شروع کی جائے۔

۷۔ اساتذہ کو اس کالج میں تعلیم دینے کے لئے ۲۰ فیصدی الاونس دیا جائے۔ اردو ذریعہ تعلیم کا انتظام علی گڑھ میں ضروری بھی ہے اور قابل عمل بھی اب دیکھنا یہ ہیکہ علی گڑھ کے نوجوان اپنے بزرگوں کی سرد مصلحت پسندی اور سایۂ دیوار کے سہارے میں چلنا پسند کرتے ہیں یا زندگی کے تقاضوں کی کڑی دھوپ برداشت کرنے کو تیار ہیں۔ جب تک قانون یا خیابانی صحرا نہ آئے تو صبح کا اردبار چمن نہیں ہوسکتی۔

اردو کو اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بنانے کا ایک تہذیبی اور مقصد بھی ہے۔ اردو ہماری مشترک تہذیب کی بڑی شاندار اور جاندار میراث ہے۔ اردو ذریعہ تعلیم کے ذریعے سے زندگی میں قدم رکھنے والے نوجوان، مشترک تہذیب کی قدروں سے آشنا ہونے کی وجہ سے قومی نقطۂ نظر کے حامل ہوں گے۔ علی گڑھ ادھر صرف تقلید کرنے پر قانع رہا ہے۔ اسے رہنمائی کا فرض کب یاد آئے گا۔ وقت اور زمانہ اس سے کہہ رہا ہے۔

یاران تیز گام نے محمل کو جالیا
ہم محو نالۂ جرس کارواں رہے

(تہذیب الاخلاق اکتوبر ۱۹۸۹ء سے ماخوذ)

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ

سہ لسانی فارمولا اور اس میں اردو کا مقام

سہ لسانی فارمولا' ہندوستانی سماج کی لسانی پیچیدگیوں کے پیش نظر اور ساتھ ہی ملک کے اتحاد و یکجہتی کو مضبوط کرنے کیلئے کافی غور و خوض کے بعد تیار کیا گیا ہے۔ ہندوستان کیا بہ لحاظ موسمی تنوع اور کیا بہ لحاظ لسانی اور تہذیبی گوناگونی ایک براعظم سے کسی طرح کم نہیں ہے۔

ہندوستان میں متعدد زبانوں کے مخصوص علاقے ہیں۔ ان زبانوں کی تاریخ ہے' ان میں قابل قدر ادب ہے اور روز افزوں تخلیق ہو رہا ہے۔ اور اسی کے ساتھ ہر لسانی علاقے یا ریاست میں دوسری زبانوں کے بولنے والی اقلیتیں بھی ہیں۔ کبھی کبھی تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہندوستان اقلیتوں کا ملک ہے اور اقلیتیں ملک کو متحد رکھنے میں اہم رول ادا کر سکتی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ہمارے ملک میں بولی جانے والی زبانوں کے ماخذ بھی مختلف ہیں۔ جہاں شمالی ہند کی زبانیں آریائی ہیں اور مختلف اپ بھرنشوں سے نکلی ہیں تو وہیں جنوبی ہند کی زبانیں دراوڑی ہیں۔ شمال مشرق کی بعض زبانیں اور سنتھالی اور نکوباری اور بھی قدیم ہیں اور آسٹرلائیڈ کہلاتی ہیں۔ اسی طرح شمال مغرب کی زبانیں کشمیری، کوہستانی وغیرہ ہند آریائی کی ہند یورپین شاخ سے نکلی ہیں۔

پھر ہندوستان میں ایسی زبانیں بولنے والے بھی ہیں جو ملک بھر میں بکھرے ہوئے ہیں اور جن کا اپنا کوئی مخصوص علاقہ نہیں۔ اردو ایسی ہی ایک زبان ہے لیکن اردو ایسی بھی بے علاقہ یتیم نہیں۔ اس کا علاقہ وہی ہے جو ہندی کا ہے۔ خاص طور پر دہلی اور یوپی اس کے علاقے ہیں جتنے ہندی کے ہیں۔ کیونکہ دونوں ہی مدھیہ دیشیہ اپ بھرنش کی شاخ کھڑی بولی سے ہیں اور جڑواں بہنیں ہیں۔

ہندوستان کے اندر مختلف غیر ہندی ریاستوں میں اور ہندوستان کے باہر پاکستان' انگلستان اور کناڈا وغیرہ میں جہاں بھی اردو بولنے والے رہتے ہیں ان کا تعلق بھی اسی وادئ گنگ و جمن

سے ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ اور بھی زبانیں اور بولیاں ہیں جو اپنا تشخص منوانا چاہتی ہیں۔ آج سے کچھ برس پہلے کون جانتا تھا کہ کونکنی اپنی حیثیت منوا لے گی اور مرہٹی اور کونکنی دونوں لپیوں میں گوا کی سرکاری زبان بن جائے گی۔

راجستھانی، ڈوگری، نیپالی، میتھلی اور منی پوری سبھی اپنی الگ حیثیت منوانا چاہتی ہیں۔ میگھالیہ کی ریاستی سرکاری زبان انگریزی ہے لیکن اس کے اندر کھاسی، جینتی اور گارو علاقائی کونسلیں ہیں جن کی وہ دفتری زبانیں ہیں اور ان میں سے کسی زبان کا آئین کے آٹھویں شیڈول میں ذکر نہیں لیکن ساہتیہ اکادمی نے ان میں سے کئی زبانوں کو تسلیم کر لیا ہے۔

اس ملک میں جہاں الگ الگ مادری زبانیں اور علاقائی زبانیں ہیں وہیں ملک کو ایک رابطے کی زبان کی بھی ضرورت ہے۔ اور آئین نے ہندی کو یہ مقام دیا ہے۔

اس کے علاوہ ہم کو اعلا علمی اور ٹکنالوجیکل تخلیقات سے واقفیت رکھنی ہو تو انگریزی سے بھی مفر ممکن نہیں۔ انگریزی نہ صرف بین الاقوامی تجارت کی زبان ہے بلکہ کئی ملکوں اور خود ہمارے ملک میں اعلا ادبی اور علمی تخلیقات انگریزی میں ملتی ہیں۔ غلامی ایک زبردست المیہ تو تھی ہی، ستم ظریفی دیکھئے کہ اس کی وجہ سے انگریزی کو ہمارے ملک کے دانشور طبقے میں ایک مقام مل گیا اور آزادی کے بعد تو اس کے چلن میں اور بھی اضافہ ہو گیا ہے۔

اس پس منظر میں جہاں مادری زبان کی اہمیت مسلم ہے وہیں علاقائی زبانیں بھی جو کہ لسانی ریاستوں کی سرکاری زبانیں ہیں، اہمیت رکھتی ہیں۔ اور ہم ان سے ناواقف نہیں رہ سکتے اور پھر ہندوستان کی رابطے کی زبان ہندی ہے۔

اس لئے مادری زبان، علاقائی سرکاری زبان، ملک کی رابطے کی زبان اور انگریزی سبھی کا علم ضروری ہے۔ اسی لئے سہ لسانی فارمولا اقلیتی، علاقائی اور قومی مفاد میں وضع کیا گیا ہے۔

ہندی علاقے میں ہندی مادری زبان والے طلبہ کے لئے یہ فارمولا یوں ہونا چاہیئے

۱۔ ہندی ۲۔ کوئی عصری ہندوستانی زبان بشمول اردو اور ۳) انگریزی اور ان کے۔

جن کی مادری زبان اردو ہے، یا کوئی اور زبان ہے، یہ فارمولا یوں ہوگا۔

(۱) اردو، مادری زبان (۲) ہندی (۳) انگریزی، مگر متعدد ریاستوں میں سہ لسانی فارمولا

عمل نہیں ہو رہا ہے۔ اگر یوپی میں سنسکرت کو شامل کر کے ہندی لڑکوں، لڑکیوں کو دوسری عصری ہندوستانی زبانوں سے محروم رکھا جارہا ہے تو تامل ناڈ میں ہندی نہیں سکھائی جاتی اور آندھرا پردیش میں آٹھویں جماعت سے انگریزی یا ہندی دونوں میں سے کسی ایک کے انتخاب کی بات کی جاتی ہے۔ اور ریاستوں میں بھی اس فارمولے میں ہیرا پھیری کی گئی ہے۔

نگراں کمیٹی نے تجویز کی ہے کہ سنسکرت یا تو ایک مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جائے یا ہندی کے ساتھ مخلوط کورس میں شامل رہے لیکن دوسری زبان کی حیثیت سے کوئی عصری ہندوستانی زبان سکھائی جائے۔

غیر ہندی علاقوں میں صورتِ حال کچھ اور پیچیدہ ہے۔ تلگو، تامل، کنڑی، ملیالم، بنگالی وغیرہ مادری زبان والے طلبہ اپنی ریاستوں میں پہلی زبان کی حیثیت سے مادری زبان سیکھیں گے۔ دوسری ہندی ہوگی اور تیسری انگریزی

لیکن غیر ہندی ریاستوں میں لسانی اقلیتوں کے سامنے ٹیڑھا سوال کھڑا ہے۔ انہیں مادری زبان کے علاوہ ریاستی زبان ہندی اور انگریزی چار زبانیں سیکھنی پڑتی ہیں۔ اس کا حل گجرال کمیٹی نے یہ تجویز کیا ہے کہ

(۱) مادری زبان اردو، زبان اول ہو" (۲) زبان دوم ریاستی زبان ہو (۳) ہندی کو اردو کے ساتھ کمپوزٹ کورس میں شامل کیا جائے اور (۴) انگریزی الگ ہو۔ یہ فارمولا آندھرا پردیش میں یوں ہوگا۔

(۱) اردو اور آگے چل کر آٹھویں جماعت سے اردو، ہندی کمپوزٹ کورس
(۲) تلگو، تیسرے درجے سے
(۳) انگریزی چھٹی جماعت سے

اس فارمولے کا فائدہ یہ ہے کہ پانچویں جماعت کے بعد سلسلہ تعلیم منقطع کردینے والوں کو کچھ تلگو آہی جائے گی۔ اور جو کسی وجہ سے خاص طور پر دیہی علاقوں میں چھٹی سے تلگو ذریعہ تعلیم کے اسکولوں میں شریک ہوتے ہیں، انھیں تکلیف بھی نہ ہوگی۔

چھٹی سے دسویں تک انگریزی پڑھنے سے اتنی انگریزی تو آہی جائے گی کہ لڑکے لڑکیاں ڈپلوما

کورس لے سکیں یا انگریزی ذریعہ تعلیم سے اعلیٰ فنی تعلیم حاصل کر سکیں۔

اس کے علاوہ اگر اردو والے طلبہ کسی وجہ سے تلگو ذریعہ تعلیم کے اسکولوں میں شریک ہوں یا انگریزی میڈیم میں پڑھتے ہیں، انہیں تیسری جماعت سے اردو بحیثیت زبانِ اول کے پڑھائی جائے لیکن حکومت نے چھٹی سے انگریزی اور آٹھویں سے اردو، ہندی کمپوزٹ کورس کی بجائے آٹھویں سے ہندی یا انگریزی میں کسی ایک کے انتخاب کا حق دیا ہے اور یہ اردو مادری زبان والے طلبہ کے حق میں بہت مضر ہے۔ اگر وہ آٹھویں سے انگریزی لیتے ہیں تو ایک تو ہندی سے نابلد رہتے ہیں اور دوسرے دسویں تک اتنی انگریزی بھی نہیں سیکھ پاتے کہ آگے تعلیم جاری رکھ سکیں۔

اس کے برخلاف آٹھویں سے اردو، ہندی کا کمپوزٹ کورس حاصل ہو تو انہیں اتنی ہندی آ ہی جائے گی جتنی کہ "خلاصہ معاف" آئی اے ایس کے ان امیدواروں کو آتی ہے جو غیر ہندی علاقوں سے آتے ہیں۔

اس لیے سہ لسانی فارمولے کو اس کے صحیح پس منظر میں دیکھنا ہے اور جدید ہندوستان میں ایک پڑھے لکھے شہری کی ضرورتوں کو پیشِ نظر رکھنا ہے۔ ہمیں اپنی زبان سے آگہی ساتھ ساتھ علاقائی زبان، رابطے کی زبان اور انگریزی سے کما حقہٗ واقفیت ضروری ہے تو ہم اپنے ہی ہم وطنوں میں اجنبی کی طرح رہنا چاہتے ہیں اور نہ ہی اپنے دہلیز کی کھڑکی کو دنیا کی عصری تحقیقات و تخلیقات کے لئے بند کر دینا چاہتے ہیں۔ ●●

پروفیسر عنوان چشتی — اردو تنقید اور تحقیق کا ایک مستند نام
"عروضی اور فنی مسائل" کے بعد موصوف کے غیر معمولی تنقیدی کارنامے

- حرفِ برہنہ : آزادی کے بعد اردو میں سب سے زیادہ متنازعہ مگر خیال انگیز تنقیدی تحقیقی دستاویز۔ قیمت/-۱۰۰ روپیہ
- اردو میں کلاسیکی تنقید : اردو میں قدیم تنقیدی اصولوں کی بازیافت اور معاصر شاعری کا اطلاق۔ اپنے موضوع پر غیر معمولی کتاب۔ قیمت/-۴۰
- آزادی کے بعد دہلی میں اردو غزل : دہلی میں اردو غزل کا جمالیاتی منظر نامہ و انتخاب۔ قیمت/-۲۴

زنک عمل پبلیکیشنز، انصاری روڈ، مظفر نگر۔ یوپی

ڈاکٹر جمیل جالبی

اردو میں اعراب کا مسئلہ

اردو زبان میں عام طور پر جو اعراب مستعمل ہیں، تین ہیں - زیر، زبر اور پیش، جن کو "ِ" "َ" اور "ُ" کی علامات سے ظاہر کرتے ہیں۔ "زبر" حروف کے اوپر، زیر حروف کے نیچے اور پیش حرف کے اوپر لگایا جاتا ہے جیسے خَیر، عِشرت، اور مُغل۔ یہ تینوں اعراب تین آوازوں کو ظاہر کرتے ہیں لیکن ان تین آوازوں کے علاوہ ایک آواز اور ایسی موجود ہے جس کے لئے اعراب مقرر نہیں ہے مثلاً اگر ہمیں مَیل لکھنا ہے تو ہم ... م پر "زبر" لگا دیں گے۔ اگر ہم مِیل لکھنا ہے تو م کے نیچے زیر لگا دیں گے لیکن اگر ہمیں میل (م ے ل) لکھنا ہے تو ہمارے پاس کوئی علامت یا نشان ایسا نہیں ہے جو صحیح تلفظ کی طرف نشاندہی کر سکے۔ اس قسم کے بہت سے الفاظ ہیں مثلاً پیر (پ ے ر) دیر (د ے ر) شیر (ش ے ر) بیل (ب ے ل) تیل (ت ے ل) جیل (ج ے ل) اور خیل، ریل (ر ے ل) فیل (ف ے ل) سیر (س ے ر) وغیرہ - ضرورت اس بات کی ہے کہ اس آواز کے لئے بھی کوئی علامت مقرر کی جائے اور اس کو زیر، زبر، پیش کے ساتھ شامل کر دیا جائے تاکہ پڑھنے والے اس لفظ کا صحیح تلفظ ادا کر سکیں۔ میری تجویز یہ ہے کہ اس آواز کے لئے ہم کوئی علامت یا نشان مقرر کر لیں اور جیسے مختلف حروف پر زیر، زبر، پیش لگا کر اس کو متعین کر دیتے ہیں۔ اسی طرح اس علامت کو اس آواز کے لئے حرف کے نیچے لگا کر مخصوص کیا جائے۔ اس علامت کو شناخت کے لئے میش (م ے ش) کا نام دیا جائے۔ یہ وہ آواز ہے جس کی ہمیں تیل، فیل، ریل، پیڑ، بیر، میل، پیش، کھیل کے الفاظ لکھتے یا ادا کرتے ہوئے ضرورت ہوتی ہے۔ جیسا کہ آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ یہ آواز زیر اور زبر دونوں آوازوں سے مختلف ہے اسی لئے اس کے لئے الگ علامت کی ضرورت ہے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اس علامت کو "میش" (م ے ش) کہا جائے اور اس کا نشان مخصوص کر کے حرف کے نیچے لگایا جائے جس کی علامت یہ ہوگی -

تیل، فیل، ریل، پیٹر، پیش، کمیں، واضح رہے کہ زیر کے نشان کی صورت یہ ہے ۔
پیپیر، میل، میش کا نشان اس طرح ہوگا جیسا اوپر کے چند الفاظ میں لگایا گیا ہے ۔ یہ ویسا ہی نشان
ہے جیسا آپ اردو میں ۸ کا ہندسہ لکھتے ہوئے استعمال کرتے ہیں ۔ ۸ کا ایک حصہ یہ ہے : اور دوسرا
حصہ یہ ہے ۱ یہ دوسرا حصہ "میش" کی علامت کے طور پر استعمال کیا جائے تو یہ زیر سے
مختلف ہوگا اور واضح بھی ۔

اب صورت یہ ہوگی : اگر ہمیں شیر (دشتی ر) لکھنا ہے تو ہم ش کے نیچے زیر لگا دیں گے۔ اگر
شیر (شے ر) لکھنا ہے تو ہم ش کے نیچے میش لگا دیں گے۔ اگر ہمیں مَیل (مے ل) لکھنا ہے تو
ہم م کے اوپر زبر لگا دیں گے۔ اگر ہمیں میل (م ی ل) لکھنا ہے تو ہم م کے نیچے زیر لگا دیں گے۔ اگر
(م سے ل) لکھنا ہے تو ہم م کے نیچے میش کی علامت لگا دیں گے ۔

یہ صرف ایک تجویز ہے جسے "اخبار اردو" میں اس لئے شائع کیا جا رہا ہے کہ اہل علم اپنے
خیالات کا اظہار فرمائیں اور پھر ان سب کی آراء کی روشنی میں احباب کے مشورے سے یہ مسئلہ طے
کیا جائے ۔ اس کے بعد دوسری اور آوازوں پر غور کیا جائے گا ۔ (ہماری زبان مورخہ ۱۵ر مئی ۱۹۸۹ء) ۔

ڈاکٹر صابر سنبھلی

اردو میں اعراب کا مسئلہ: ۱۵ر مئی ۱۹۸۹ء کے ہفتہ وار "ہماری زبان" میں
ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب کی ایک تحریر شائع ہوئی ہے جس میں موصوف نے ایک آواز کے
ادائیگی کے لئے اردو میں ایک نئی علامت وضع کی ہے اور پیش (و) کا تعقیہ کرکے اس کا
نام "میش" رکھا ہے ۔ محترم و مکرم ڈاکٹر جمیل جالبی اردو زبان و ادب کے اتنے بڑے اسکالر
اور مفکر ہیں کہ ان سے اختلاف کرنا ایک طرح کی خود نمائی ہے مگر اپنی سوچ اور رائے کو ظاہر
کر دینا بھی ایک اچھا عمل ہے اس لئے اس بارے میں کچھ عرض کرنے کی جسارت کر رہا ہوں ۔

ڈاکٹر جالبی صاحب کی ایجاد کردہ علامت نہ صرف یہ کہ قباحت سے خالی نہیں ہے بلکہ
جس آواز کے لئے انہوں نے نئی علامت وضع کی ہے اس آواز کی ادائیگی اردو رسم الخط میں
پہلے سے ہی ہو رہی ہے ۔ ہمارے پاس علامتوں کی کمی نہیں ہے اور جو آوازیں ہمیں اب

شکل سے ورثے میں ملی ہیں۔ ان کی ادائیگی کے لئے علامتیں ہمارے بزرگوں نے ہی وضع کر دی تھیں
یں کچھ اختلاف ہو سکتا ہے۔ اگر یہ نہ رہے تو جس آواز کے لئے ڈاکٹر جالبی صاحب نے نئی تجویز
کی ہے ذ نئی علامت کی، اس کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔

ڈاکٹر جالبی صاحب سے تسامح یہ ہوا ہے کہ انہوں نے کسرہ کی علامت کو یا ے معروف کی
ز کا اظہار سمجھ یا مان لیا ہے اسی لئے ایک نئی علامت کی کھوج کی ضرورت ہوئی۔ جب کہ
ے معروف کے اظہار کے لئے ہمارے یہاں پہلے سے ہی علامت موجود ہے اور وہ ہمیں عربی
سے وراثت میں ملی ہے۔

اردو کے غیر فرہنگی لغات پر لکھتے ہوئے میں نے "ی" کے ساتھ ظاہر ہونے والی تینوں
ازوں کی نمائندہ علامتوں کا استعمال کیا تھا۔ حسن اتفاق سے ان میں سے کوئی بھی اردو کے مزاج
ے خلاف نہیں ہے۔ جب ہمارے پاس پہلے سے علامتیں موجود ہیں تو نئی علامت وضع کرنے
کیا ضرورت ہے۔ میں ذیل میں "ی" کے ساتھ پیدا ہونے والی تینوں آوازوں کو ظاہر کرنے
ں علامتوں کی ایک نہیں کئی مثالیں دے رہا ہوں۔

یر (بہادر)، بیر (ایک پھل)، تیر (دشمنی)، بیل (دمی)، بیل (انگریزی: خشک بیٹری)، سیل
بہاو)، بیل (گھوڑا)، بیل (کمزور تنے کا پودا۔ ایک پھل)، بَیل (نر گاؤ)، چین (سلوٹ ایک ملک)
ین (انگریزی: سلسلہ)، چَین (آرام۔ سکون)، میل (۱۶۰۰ کلومیٹر کا فاصلہ)، میل (دوستی، تعلق)،
یل (گندگی)

مطلب یہ ہوا کہ ڈاکٹر جالبی صاحب نے جس آواز کے لئے نئی علامت وضع کی ہے اس کے
لئے صرف "زیر" کافی ہے۔ جیسے شیر (ایک جنگلی درندہ) اور جب آواز یائے معروف کی ہو تو اس
کھڑا زیر لگانا چاہیئے جیسے شیر (بہ معنی دودھ)

اس نئی علامت کے استعمال میں قباحت یہ ہے کہ بائیں سے دائیں خط کھینچنا (خواہ وہ اوپر سے
بھی آ رہا ہو) اردو والوں کی فطرت اور مزاج کے خلاف ہے۔ اگر یہ عادت ڈال بھی لی جائے
ی اور کمپیوٹر میں اس کے کھڑا زیر بن جانے کا بھی امکان رہے گا۔ یہ بھی ہے کہ نئی علامتیں
وقت ضائع جائیں جب ہماری پرانی علامتیں ہمارا ساتھ نہ دے سکیں۔

واؤ کے ساتھ تین آوازیں پیدا ہوتی ہیں ان کا اظہار بھی میں اپنے مضامین میں کر چکا ہوں ایک بار پھر ان کا اعادہ کر رہا ہوں۔ واضح ہو کہ ان میں بھی کوئی علامت تو ایجاد نہیں ہے بلکہ تینوں وہی ہیں جن کو اردو والے استعمال کرتے رہے ہیں اور وہ عربی سے وراثت میں ملی ہیں۔

نور (روشنی) دور (فاصلے پر) ظہور، چور (دزد۔ سارق) زور (طاقت) مور (طاؤس) غور (سوچ) اور (مزید) دَور (گردش) وغیرہ

البتہ اردو میں ایک نومولود آواز جو انگریزی کے بہت سے دخیل الفاظ سے متعلق ہے ایک نئی علامت چاہتی ہے۔ اس کی طرف ڈاکٹر جمیل جالبی اور ان جیسے دوسرے علمائے زبان و ادب کو توجہ دینی چاہیئے۔ اس آواز کا اظہار اردو میں الف کے ساتھ کیا جاتا ہے مگر وہ "الف" اور "واؤ" کے مابین ہوتی ہے جیسے COLLEGE جس کو ہم کالج لکھتے ہیں مگر "ک" کی آواز "الف" اور "واؤ" کے بیچ میں سنی جاتی ہے اسی طرح KNOWLEDGE جس کا تلفظ "نالج" اور "نولج" کے مابین ہوتا ہے۔ اور ایسے ان گنت الفاظ ہیں جو اردو میں صحیح تلفظ کے ساتھ نہیں لکھے جا سکتے۔ ایسے الفاظ کے لئے ایک نئی علامت کی ضرورت ہے۔

میری یہ تحریر ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب کی نظروں سے تو شاید ہی گزرے۔ اگر ایسا ہو جائے تو فبہا۔ میں دیگر ماہرین صوتیات اور ماہرین رسم الخط سے بھی پرزور گزارش کرتا ہوں کہ وہ اس آواز کے لئے کوئی علامت وضع فرمائیں۔ ویسے یہ ایسا کام ہے جس کو کوئی بھی کر سکتا ہے حتیٰ کہ مجھ جیسا بے علم بھی۔ مگر میں جانتا ہوں کہ یہ میرا منصب نہیں ہے۔

۔ (ہماری زبان، مورخہ ۲۲ جون ۱۹۸۸ء)

جگن ناتھ آزاد کا نیا مجموعہ کلام

بوئے رمیدہ

۱۹۵۹ء سے ۱۹۶۶ء تک کا کلام شامل ہے

صفحات ۴۸۸ - قیمت ۹۵/- روپے

ناشر

نفیس اکیڈمی، اردو بازار، کراچی، پاکستان

ہندوستان میں ملنے کا پتہ

انجمن ترقی اردو (ہند) اردو گھر ۲۱۲ راؤز ایونیو ہند نئی دہلی۔

ڈاکٹر سید حامد حسین

اردو تعلیم پر ہندی کی پرچھائیں

بی اے کا ایک طالب علم اپنا ایک مضمون اصلاح کی غرض سے جبل پور یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے پروفیسر محمد مجاہد اللہ خاں کے پاس چھوڑ گیا۔ مضمون پر نظر ڈالتے ہوئے وہ ایک لفظ پر ٹھٹھک گئے جسے بڑی کوششوں کے بعد "خرمستی" پڑھا جاسکتا تھا لیکن نہ تو وہاں اس لفظ کا محل تھا اور نہ ہی اس استعداد والے طالب علم سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ اس نے "خرمستی" کا لفظ سنا ہو۔ طالب علم جب اپنا مضمون واپس لینے آیا تو قدرتی طور پر پروفیسر صاحب نے اس لفظ کے بارے میں بھی دریافت کیا۔ طالب علم نے پروفیسر صاحب کو ایسی نظروں سے دیکھا جیسے وہ ان کی کم علمی پر ماتم کر رہا ہو اور گویا ہوا "جبر جستی ہی تو لکھا ہے سر" "زبردستی" کا عام بول چال کی ہندی میں "جبرجستی" ہی تلفظ کیا جارہا ہے، ظاہر ہے طالب علم نے لفظ کی یہ شکل اپنے گردوپیش سے اختیار کی ہوگی۔

اس صورت حال کا آج ہندی اکثریت کے علاقوں میں کام کر رہے اردو کے ہر استاد کو سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ عام مدرسوں میں اردو کا طالب علم صرف چالیس یا پینتالیس منٹ اردو پر صرف کرتا ہے اور اسکول کا باقی وقت ہندی ذریعہ تعلیم ہونے کی صورت میں دوسرے مضامین کی تدریس کے دوران ہندی زبان کی مشق میں ہی لگتا ہے۔

ہندی اخبارات و رسائل کے نظر کے سامنے سے گزرنے کے بھی مواقع زیادہ ملتے ہیں اور بات چیت کے دوران ہندی تلفظ اور محاورہ برابر کان میں پڑتا رہتا ہے۔ کیوں کہ اردو اور ہندی میں کئی ظاہری مماثلتیں ہیں اس لئے اردو کے طالب علم کو ہندی میں رائج اشکال کو قبول کرنے کے کافی امکانات ہیں۔ اس بنا پر اردو کے استاد کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ ان اثرات کو اپنی نگاہ میں رکھے اور اپنے طالب علموں کو وقتاً فوقتاً ان سے آگاہ کرتا رہے۔

اردو اور ہندی میں سب سے نمایاں فرق تلفظ کی بنا پر پیدا ہوتا ہے۔ اردو میں مستعمل کئی آوازیں جیسے ز، ذ، ض، ظ، ق، ف، وغیرہ اصلاً ہندی میں نہیں ہیں اور انہیں اکثر "گلاب کی گجل" جیسے تلفظ سننے کو ملتے ہیں۔ اس مسئلہ کی دوسری انتہا یہ ہے کہ بعض ہندی بولنے والوں کو یہ غلط فہمی ہے کہ صحیح اردو تلفظ یہی ہے کہ ہر جگہ ج کی جگہ ز، ک کی جگہ ق، گ کی جگہ غ وغیرہ بولا جائے چنانچہ ٹی وی پر "میر کا قلام" سننے کو ملتا ہے۔ "اقبال مجید" "اقبال مزید" بن جاتے ہیں۔ بیگم کا تلفظ بیغم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اردو کے طالب علموں کو ان قریبی آوازوں میں امتیاز کرنا سکھایا جانا نہایت ضروری ہے۔

تلفظ کے فرق کے ساتھ کئی اردو الفاظ ہندی میں کھپ چکے ہیں۔ تھوک قیمتوں کے مقابلے میں کھدرا (خوردہ) قیمتوں کا ذکر اکثر ریڈیو پر ہندی خبروں میں سننے کو ملتا ہے۔ اسی طرح ہندی اخبارات میں ضبطی کے لئے "جپتی" اور قسط کے لئے "کِست" کے الفاظ دیکھنے کو مل رہے ہیں تحت کو "تہد" اور نذارت کو "نذارت" لکھا دیکھا گیا ہے۔ کارروائی کے لئے "کاریہ واتی" اور ذمہ داری کے لئے "جمے واری" عام ہیں۔ خانہ پری کے لئے "کھانا پوری" لکھا جا رہا ہے اور مسوّدہ کو "مسودہ" بولا جا رہا ہے۔ ملتوی (مل توی) کو "ملت وی" اور رحجان کو "روہ جان" لکھا ہوا دیکھا جا سکتا ہے۔ "جہیز مستعفی" "دہیج" ہو چکا ہے۔

اردو سے لاعلمی کی وجہ سے ہندی میں کئی اور غلطیاں رائج ہو چکی ہیں اور ہندی کے راستے سے ان کے دوبارہ اردو میں داخل ہونے کا اندیشہ ہے۔ اردو کے لئے ایسے الفاظ جو پہلے سے صیغۂ جمع میں ہیں انہیں واحد سمجھ کر ہندی طریقے سے دوبارہ جمع بنا لینے کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔ چنانچہ نہ صرف بول چال میں بلکہ ہندی تحریرات میں بھی حالاتوں، جذباتوں، احساساتوں، الفاظوں کا استعمال ہوتا رہا ہے۔ خلافت کا لفظ سیکولر ہو گیا ہے اور بعض اوقات "مخالفت" کے معنی میں استعمال کیا جا رہا ہے۔ سب سے زیادہ ستم ظریفی لفظ "خلاصہ" کے ساتھ ہوئی ہے جسے "کھلاسا" بولا جاتا ہے اور اسے لفظ کھولنا سے مشتق سمجھ کر "وضاحت" کے معنی میں لیا جاتا ہے چنانچہ اگر آپ سے اصرار کیا جائے کہ بات کا کھلاسا کریں تو آپ سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ آپ اسے پھیلا کر وضاحت کے ساتھ باتیں کریں نہ کہ مختصراً بیان کریں۔

مغربی ہندوستان میں لفظ "حرکت" کو ہرج کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اگر آپ تاخیر کے لئے معذرت خواہ ہیں تو جواب دیا جائے گا کہ کوئی حرکت نہیں یعنی کوئی ہرج نہیں۔ لفظ "راحت" اب اردو صحافت میں ہندی کی معرفت "ریلیف" کے معنی میں داخل ہو گیا ہے۔ وسط ہند کے دو اخبار سیلاب وغیرہ کی تباہیوں کے نتیجے میں کئے جانے والے امدادی کاموں کی بجائے راحت پروگرام کا ذکر کرتے ہیں۔ اسی طرح ذخیرہ اندوزی کے لئے جمع خوری کا لفظ ہندی صحافت سے اردو صحافت میں منتقل ہو رہا ہے۔

ہر زبان کا اپنا محاورہ اور رواج ہوتا ہے اور جہاں تک ہو سکے اسے محفوظ رکھا جانا چاہیئے۔ زبانوں کے درمیان لین دین پر تو کوئی پابندی نہیں لگائی جا سکتی لیکن ایک زبان لفظوں کو جس شکل میں اختیار کر لیتی ہے وہ پھر اس کی اپنی ہو جاتی ہے اور پھر اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنا مناسب نہیں ہوتا۔ اگر ہندی میں اردو کے بعض الفاظ کچھ تبدیلیوں کے ساتھ جذب ہو گئے ہیں یا ان میں معنوی تبدیلی آ گئی ہے تو یہ ہندی زبان نے اپنے مزاج کے مطابق کیا ہے اور اسے ان الفاظ کو اس طرح ا[illegible] کرنے کا حق ہے۔ ہاں اردو میں ان تبدیل شدہ شکلوں کو دوبارہ اختیار کرنے پر اعتراض ہو سکتا ہے اور ہمیں اپنے طالب علموں کو اس سے آگاہ کرنا چاہیئے۔

اردو میں ہندی کے لاتعداد الفاظ مختلف تبدیلیوں کے ساتھ قبول کر لئے گئے ہیں۔ یہ الفاظ اردو کا حصہ بن چکے ہیں "چرچا" ہندی میں مونث ہے۔ اردو میں مذکر بولا جاتا ہے۔ ہندی میں چرچا ہوتی ہے اور اردو میں چرچا ہوتا ہے۔ ہندی میں ایسے بیشتر الفاظ مونث سمجھے جاتے ہیں جو الف پر ختم ہوں۔ جیسے مالا، شکشا، بھاشا وغیرہ۔ غالباً اسی اصول کے مدِ نظر ہندی داں اصحاب ملیش میں آ کر کہتے ہیں "مجھے غصہ آ رہی ہے" اور ہمیں اس پر اصرار کرنا چاہیئے کہ دوسری زبان پر اصل زبان کے اصول عائد کئے جائیں۔

مدھیہ پردیش حکومت کی مقرر کی ہوئی ٹیکسٹ بک کارپوریشن کی جانب سے جو اردو کی درسی کتابیں تیار کی ہیں ان میں سے ایک میں "مینڈک" کا املا "مینڈھک" لکھا گیا ہے۔ یہ صحیح ہے ہندی میں یہ املا "ڈھ" سے ہی ہے لیکن اردو میں اسے "ڈ" کے ساتھ اختیار کر لیا گیا ہے اس کو ہی اردو املا سمجھا جائے گا۔ ہندی کے کئی الفاظ ایسے ہیں جن میں ہائے مخلوط کا استعمال

کیا جاتا ہے لیکن اردو میں ان کو بغیر ہائے مخلوط کے لکھا یا بولا جاتا ہے جیسے بھوکا (ہندی میں بھوکھا) دھوکا (ہندی میں دھوکھا)، جھوٹا (ہندی میں جھوٹھا)، پڑھا (ہندی میں پڑھا) وغیرہ۔ کئی دوسرے الفاظ کو اردو میں تھوڑی تبدیلی کے ساتھ اپنا لیا گیا ہے جیسے ہونٹ (ہندی اوٹھ) لچکیلا (ہندی لچیلا)، جھنجھوڑنا (ہندی جھکجھوڑنا)، ہچکچاہٹ (ہندی ہچک) وغیرہ۔ کئی الفاظ کے تلفظ میں اردو میں ہندی سے فرق آ گیا ہے جیسے ناگن (ہندی ناگِن)، مالن (ہندی مالِن)، بچن (ہندی وچن)، بچار (ہندی وچار)، بدیس (ہندی ودیش)، ناپ (ہندی ماپ) وغیرہ۔ جنم (ہندی جنام۔ اردو جَنَم)، دھرم (ہندی دھرم، اردو دھَرَم)، کرم (ہندی کرم، اردو کَرَم) جیسے الفاظ میں اب اردو میں دھیرے دھیرے ہندی تلفظ کی جانب لوٹ جانے کا رجحان پیدا ہو رہا ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر لفظ کو اس کی اصل شکل کی طرف لوٹایا جائے۔

اردو اور ہندی کا قریبی رشتہ ہے اور ان میں ایک دوسرے کو متاثر کرنے کی صلاحیت ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ دونوں زبانوں کا اپنا محاورہ، مزاج اور لسانی خصوصیات ہیں۔ ان خصوصیات پر توجہ دیتے ہوئے ان کی تعلیم و تدریس کے پروگرام طے کرنے کی ضرورت ہے اور اردو کے اساتذہ کو خصوصیت کے ساتھ اپنے طلبہ کو ان پہلوؤں سے آگاہ کرنا چاہئے جہاں وہ ہندی زبان کی مثال کو سامنے رکھتے ہوئے کسی قسم کی غلط فہمی کا شکار ہو سکتے ہیں۔

سلسلہ صفحہ ۴۲

نہیں ڈھونڈیں گے ہماری ساری کوششیں رائیگاں جائیں گی۔ ماحولیات سے متعلق جو تحریک میں پندرہ سال قبل شروع ہوئی تھی اس کا سب سے اہم فائدہ یہ ہوا ہے کہ ماحول کے تحفظ کے بارے میں عوام میں بیداری پیدا ہوئی ہے اور اب اکثر طبقے اس مسئلے سے متعلق تقریباً ہم اتفاق رائے رکھتے ہیں۔ اب ہمیں جنگلات کے نزدیک رہنے والوں، صنعت کاروں اور عام زیادہ بہتر سہولیات فراہم کر کے ان میں مزید بیداری پیدا کرنی ہوگی۔ دراصل ماحول کا مسئلہ بہت پیچیدہ ہے اور اس کا کوئی ایک حل نہیں ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے صرف قانون بنانا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس پر صحیح طور پر عمل درآمد اس سے کہیں زیادہ ضرو

پی آئی بی

بھارت میں تحریک ماحولیات

انسانی زندگی کی بقاء کا انحصار صرف زمین، ہوا اور پانی پر ہی نہیں ہے بلکہ ہزاروں قسم کے پودوں، جانوروں، کیڑے مکوڑوں، مختلف نوعیت کے نظاموں اور چند طبعی و کیمیاوی پیچیدہ عوامل پر بھی ہے۔ اس طرح انسانی زندگی کی فلاح میں قدرت کی پیدا کردہ اشیاء کا ایک اہم حصہ ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اسی نظام قدرت کے باعث اس کرہ ارض پر زندگی باقی ہے تو بے جا نہ ہوگا۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ قدرت نے ہمیں جن عطیات سے نوازا ہم اپنے ذات، مفاد، ترقی اور انسان کی فلاح و بہبود کے نام پر اسے تباہ و برباد کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ بڑے پیمانے پر درخت کاٹے جا رہے ہیں، دریاؤں میں گندگی اور صنعتی فضلہ پھینکا جا رہا ہے، لاکھوں گاڑیوں اور ہزاروں کارخانوں کی چمنیوں سے خارج ہونے والا دھواں اور گیس فضا میں تحلیل ہو رہی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ مشینوں، گاڑیوں، ہوائی جہازوں، ریڈیو اور لاوڈ اسپیکر کا شور بھی فضاء کو مکدر بنا رہا ہے۔ جس کے مضر اور دور رس نتائج رونما ہو رہے ہیں۔

آبادی میں اضافے، شہروں کے پھیلاؤ، جنگلات کے کٹنے، فضائی آلودگی میں اضافے اور صنعتی ترقی کے نتیجے کے طور پر ایک طرف تو دریاؤں کا پانی کم ہونے لگا اس میں گندگی اور آلودگی میں اضافہ ہونے لگا اور دوسری طرف خود رو پیڑ پودوں کا اگنا، جنگلات اور دیگر زمینی وسائل، جن کہ زندگی کا انحصار قدرت کی اس دین پر تھا اور جو فطری ماحول کے توازن برقرار رکھنے میں معاون تھے، معدوم ہونے لگے۔

موٹر گاڑیاں، کارخانوں اور بجلی گھروں کی چمنیوں سے خارج ہونے والا دھواں فضائی گندگی میں اضافہ کر رہا ہے۔ اندازہ ہے کہ ہر سال ایک کروڑ ۳۰ لاکھ ٹن خام راکھ اور مٹی کی

دھول جیسے ذرات فضا میں تحلیل ہو رہے ہیں۔ ان کے زمین پر گرنے سے زرعی پیداوار کی صلاحیت میں کمی واقع ہو رہی ہے اور انسانی زندگیوں کو خطرہ لاحق ہو رہا ہے۔

ان صنعتوں میں کیمیاوی عمل سے سوڈا تیار کرنے والے کارخانے، [illegible] سے مصنوعی ریشہ تیار کرنے والی صنعتیں، تیل صاف کرنے والے کارخانے، چینی کی فیکٹریاں، تھرمل پاور پلانٹ، سوتی کپڑے اور اونی کپڑے کی ملیں شامل ہیں۔ دیگر صنعتوں کے بارے میں بھی معیارات مقرر کرنے کا کام جاری ہے اور امید ہے کہ جلد ہی سمنٹ کی صنعت کو بھی اس قانون کے دائرہ کار میں لے آیا جائے گا۔ اس قانون کے تحت ملک کی عدالتوں کو پہلی بار اس جرم کے مرتکب افراد اور صنعتوں کو سزا دینے کا اختیار دیا گیا ہے۔ اب آلودگی کے انسدادی اقدامات کی خلاف ورزی کرنے والوں کو پہلی خلاف ورزی پر پانچ سال کی قید اور ایک لاکھ روپے جرمانہ عائد کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ آلودگی پر قابو پانے سے متعلق ریاستی اور مرکزی سطح پر جو بورڈ ۱۹۷۲ء میں قائم کئے گئے تھے انہیں بھی اس نئے قانون کے تحت مزید اختیارات دیئے گئے ہیں۔ ابھی حال ہی میں حکومت نے ماحولیات پر ایک اعلیٰ اختیاراتی قومی اتھارٹی بھی قائم کی ہے۔

<u>جنگلی جانوروں کا تحفظ</u>: طبعی ماحول یعنی زمین، پانی اور ہوا کے بعد روئے زمین پر سب سے زیادہ قیمتی سرمایہ وہ زندگی ہے جو انسان کے ارگرد موجود ہے۔ یہ زندگی ہے پودوں، جانوروں، چرند پرند اور کیڑے مکوڑوں وغیرہ کی اور ان کی زندگی، انسانی زندگی کی بقا کے لئے بے حد ضروری ہے۔ قدرت کے اس نظام میں انسان کی بے جا مداخلت کے باعث تمام نظام درہم برہم ہو گیا ہے۔

دراصل جنگلی جانوروں کے تحفظ اور ماحول کو بنائے رکھنے میں بہت گہرا رشتہ ہے۔ جنگلی جانوروں کی پرورش اور ان کا فروغ فطری ماحول ہی میں ممکن ہے۔ فطری ماحول تب ہی ملے گا جب جنگلات ہوں، موسم سازگار ہو، ان کے کھانے پینے کا وہاں انتظام ہو۔ ماضی میں شکار انسان کا محبوب شوق اور مشغلہ رہا ہے۔ اس شوق کی وجہ سے جنگلی جانوروں کی تعداد [illegible] خطرہ [illegible] اور قیمتی نسلیں ختم ہو گئیں۔ حصولِ آزادی کے بعد حکومت نے جا بجا [illegible]

اہمیت کو محسوس کیا ۔ ۱۹۵۲ء میں جنگلی جانوروں کے تحفظ سے متعلق ایک بورڈ قائم کیا گیا۔ اس کے بعد ۱۹۷۳ء میں "پروجکٹ ٹائیگر" شروع کیا گیا تاکہ ملک کے مختلف حصوں میں نہ صرف جنگل کے بادشاہ "شیر" بلکہ اس کی رعایا یعنی دیگر جنگلی جانوروں کو بھی تحفظ فراہم کیا جا سکے ۔ اس پروجکٹ کے بعد ملک میں جنگلی جانوروں کی کچھ معدوم ہوتی نسلوں کی تعداد میں کافی اضافہ ہوا ہے اور متعلقہ علاقوں میں جنگلات کے کٹنے میں بھی کمی واقع ہوئی ہے ۔ ۲۰۰ سے زائد قومی پارک " پناہ گاہیں اور مخصوص علاقے ہیں" نیز مزید کی منصوبہ بندی بھی کی جارہی ہے

دیگر اقدامات : اتر پردیش میں گنگا کی صفائی کا کام پہلے ہی شروع کیا جا چکا ہے۔ اس سے نہ صرف پینے کا صاف پانی فراہم ہو سکے گا بلکہ علاقوں کی صفائی میں بھی مدد ملے گی ۔ اسی طرح جمنا کی صفائی کا کام بھی شروع کیا گیا ہے ۔

فوج سے فارغ ہونے والے فوجیوں کی خدمات کا فائدہ اٹھا کر علاقائی فوج میں ایکو بٹالینین" تشکیل دی گئی ہے جو جموں وکشمیر، گڑھوال اور راجستھان میں اندرا گاندھی نہر کے ساتھ پودے لگانے کے کام میں مصروف ہیں ۔

ملک بھر میں شجر کاری کی مہموں پر زور دیا جارہا ہے اور ساز گار موسم میں لاکھوں کی تعداد میں پودے لگائے جا رہے ہیں ۔

غور طلب پہلو : ماہرین ماحولیات اس امر سے پریشان ہیں کہ ملک میں نئے جنگلات لگانے اور جنگلات کے ختم ہونے کی رفتار لگ بھگ برابر ہے ۔ یعنی پندرہ لاکھ ہیکٹر جنگلات ہر سال برباد ہو رہے ہیں جبکہ سترہ لاکھ ہیکٹر آراضی پر جنگلات لگائے جا رہے ہیں ۔۔

ایک اندازے کے مطابق ملک کے بڑے شہروں میں ہر مہینے چھ لاکھ لوگ دیہات سے مستقل بھاگ رہے ہیں ۔ اس کی وجہ سے لگ بھگ سب ہی شہروں اور قصبوں میں گندگی اور نقصان صحت کا مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔ جگہ جگہ گندی بستیوں میں کھلی جگہ پر پاخانہ اور پیشاب کرنے سے عوامی صحت کو شدید خطرہ لاحق ہے ۔ اس کے لئے گاؤں میں ہمیں ہی سہولیات اور روزگار کے مواقع پیدا کرنے ہوں گے تاکہ انہیں اپنے گاؤں میں ہی رہنے ترغیب ملے ۔ ساتویں منصوبے کے دوران شہری گندی بستیوں میں ماحول کی بہتری کا

اسکیم کے تحت ۹۰ لاکھ باشندوں کو فائدہ پہونچے گا اور اس اسکیم پر ۳۶۹ کروڑ ۵۵ لاکھ روپے خرچ ہونگے ۔

موٹر گاڑیاں، بجلی گھروں اور کارخانوں سے خارج ہونے والے دھوئیں کو روکنے یا کم کرنے کیلئے جن سے فضائی آلودگی پیدا ہوتی ہے سخت کوششوں اور وافر رقومات کی ضرورت ہوگی ۔ لاکھوں گاڑیوں کا معائنہ اور پھر ان کے انجنوں کو ٹھیک کرنا ایک بہت بڑا کام ہے ۔ جسے منصوبہ بند طریقے پر بتدریج ہی ختم کیا جاسکتا ہے ۔ اسی طرح آلودگی کی مرتکب صنعتوں پر جرمانے کے ساتھ ساتھ ہمیں ایسے یونٹوں کی اس سے نجات پانے کے لئے مدد بھی کرنی ہوگی ۔ اسکے لئے بھی وافر رقومات کی ضرورت پڑے گی ۔

اس کے ساتھ ساتھ ملک کو نیوکلیائی آلودگی اور شور کی زیادتی کو کم کرنے کے لئے بھی اقدامات کرنے ہوں گے ۔ ان ہی سب باتوں کو دھیان میں رکھتے ہوئے ساتویں پنج سالہ منصوبہ میں ماحول کے ساتھ پائیدار ہم آہنگ ترقی کی حکمت عملی اختیار کی گئی ہے تاکہ ملک میں بہتر طور پر شہروں کی ترقی ہو سکے ۔

درکار فوری اقدامات : مختصر یہ کہ ہمیں ماحول کے بگڑنے کے باعث پیدا ہونے والے گوناگوں مسائل کے حل کیلئے کچھ طویل مدتی اور کچھ قلیل مدتی قدم اٹھانے ہوں گے تاکہ انسانی زندگی کو لاحق خطرات کو کم کیا جاسکے ۔ اس وقت جن فوری اقدامات کی ضرورت ہے ان میں سب سے پہلے غیر قانونی اور ناجائز طور پر درختوں کے کاٹے جانے کو ہر حالت میں روکنا ہوگا ۔ اس کے پہلو بہ پہلو جنگل بانی کے کام کو بھی تیز کرنا ہوگا اور اس امر کو یقینی بنانا ہوگا کہ ہر پودہ درخت بن سکے ۔ اسطرح جب تک نئے جنگلات نہ بن جائیں جلد از جلد اور کم سے کم لاگت سے زیادہ سے زیادہ ہریالی پیدا کی جائے ۔ اس کے علاوہ خود رو گھاس جھاڑیوں اور پودوں کی دیکھ بھال بھی کی جانی چاہیئے گاؤں والوں کے مویشیوں کی چارے کی ضروریات کو پورا کرنے کیلئے خاص دھیان دینے کی ضرورت ہے تاکہ جنگلات کی گھاس وغیرہ کو محفوظ کیا جاسکے اور سیلابوں و خشک سالی سے نجات مل سکے ۔

سب سے اہم بات بڑھتی ہوئی آبادی پر قابو پانا ہے کیونکہ جب تک ہم اس مسئلہ پر

باقی بر صفحہ

غزلیں

ڈاکٹر منشاء الرحمٰن منشاؔ
۱۱ اسٹار کی ٹاؤن بمبئی

عقل دل کی زبان کیا جانے
گونگا لطفِ بیان کیا جانے

جو اشارے سمجھ نہیں سکتا
کیا غزل کی ہے شان کیا جانے

کیسے اُگتے ہیں پھول مٹی سے
اک بنجر چٹان کیا جانے

جس کا دل درد سے نہیں مانوس
درد کی آن بان کیا جانے

دل کو کیا ہو گیا ہے بیٹھے بٹھائے
کیوں تڑپتی ہے جاں کیا جانے

ظلم کی جو ادا اصلی ہے تمہیں
وہ ادا آسمان کیا جانے

جوش کے ساتھ ہوش بھی رکھنا
آج کا نوجوان کیا جانے

جسم خاکی پہ یوں نہ اتراؤ
کب گرے یہ مکان کیا جانے

لوگ اپنی حیات سے منشاؔ
کیوں ہوئے بدگماں کیا جانے

مومن خان شوقؔ
اشرف ولا ۲-۷۲۳-۲-۱۱ - ملے پلی
حیدرآباد - ۱

یادوں پہ انکی میرا، گزارہ بھی تھا بہت
میرے لئے تو ایک نظارا بھی تھا بہت

ہنستے ہوئے اس نے مجھے کر تو دیا رخصت
اس کی ہر اک نگاہ میں شکوہ بھی تھا بہت

فرطِ جنوں میں ہم ہی، وہاں تک چلے گئے
لوگوں نے ہر طرح ہمیں، روکا بھی تھا بہت

محلوں میں رہ کے پھر بھی وہ تھا غیر مطمئن
میرے لئے زمین کا ٹکڑا بھی تھا بہت

مانا ضرورتوں نے اسے کردیا بے بس
خود اپنی بے بسی پہ وہ رویا بھی تھا بہت

آنکھوں میں اسکی جھیل نظر آرہی ہے آج
کل تک جو زندگی کو ہنساتا بھی تھا بہت

کیا جانے کیا ہوا، کہ وہ آیا نہیں لب تک
اے شوقؔ جسکے کہنے کا چرچا بھی تھا بہت

حسین بیودی
پرا۔ ضلع امراوتی ۴۴۴۶۰۲

عزیز تنہا گیوری
اناجیل روبرو درگاہ یوسفین مکان 7-124

غزلیں

دکھ درختوں کا وہ کچھ اور بڑھا دیتا ہے
وہ سر شام پرندوں کو اڑا دیتا ہے

لوگ کہتے ہیں شب بھر وہ دیواروں پہ
نام لکھتا ہے مرا اور مٹا دیتا ہے

شام کر دیتی ہے ظلمت کے حوالے مجھ کو
صبح سورج مجھے سولی پہ چڑھا دیتا ہے

گونج اٹھا پھر مری ناکام امیدوں کا کھنڈر
پھر کوئی جسم کے گنبد میں صدا دیتا ہے

آج بھی عہد گزشتہ کا تصور یارو
میری پلکوں کی منڈیروں کو سجا دیتا ہے

رہ کے آشفتہ سکوں بانٹ رہا ہے جو امین
دیکھنا ہے کہ اسے وقت یہ کیا دیتا ہے

جہاں میں جیتا ہوں میں اس لیے خوشی لے کر
کہ لطف آتا ہے جینے کا بے کلی لے کر

جو ہو سکے تو جی ہونٹوں پہ تو ہنسی لے کر
نہ پھر فسانہ غموں کا گلی گلی لے کر

الٰہی ان کا تڑپنا ہے ناگوار مجھے
سکوں دے دے انھیں میری زندگی لے کر

غموں سے حوصلہ زندگی سنورتا ہے
نہ سوچ کیا کروں میں غم کی زندگی لے کر

نہ جانے کون تھا وہ اور کہاں سے آیا تھا
گیا ہے دل کو مرے کوئی اجنبی لے کر

دل عزیز کہیں غم زدہ نہ ہو جائے
نہ آؤ روبرو آنکھوں میں تم نمی لے کر

ماہنامہ

شاداب حیدرآباد

جلد (۷) شمارہ (۲) فروری سنہ ۹۰ حیدرآباد

ایڈیٹر
محمد قمرالدین صابری

جائنٹ ایڈیٹر
رشید الدین

مینیجنگ ایڈیٹر
کلیم الدین احسن

قیمت : 5/-

مجلس مشاورت

• محترمہ عائشہ بیگم رباب • یوسف ناظم • ڈاکٹر محمد یوسف الدین • پروفیسر رضی الدین احمد
• منیر احمد صدیقی • محمد منظور احمد صدیقی • محترمہ سیدہ مہر • ڈاکٹر منشاء الرحمٰن خاں منشاء
• پروفیسر میر تراب علی

زر تعاون

ہندوستان	خلیجی ممالک	امریکہ	انگلستان	پاکستان
سالانہ 50 روپے	150 روپے	35 ڈالر	20 پونڈ	125 پاکستانی روپے
۲ سال ۹۰ روپے	270 "	65 "	35 "	205 " "
تاحیات 1000 روپے	2500 "	650 "	300 "	2000 " "

ترسیل زر کا پتہ

ماہنامہ "شاداب" 147-5-11، ریڈ ہلز، حیدرآباد (اے پی)

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر، محمد قمرالدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان سے
چھپوا کر دفتر شاداب 147-5-11 ریڈ ہلز حیدرآباد سے شائع کیا۔

فہرست

۱۔ حرف اول ۔	ایڈیٹر	۳
۲۔ قیام خلافت ۔	مولانا محمد جلال الدین کامل عباسی	۴
۳۔ انبیاء علیہم السلام کی معراج......	خواجہ حمید احمد	۱۱
۴۔ قادیان سے واپسی	حافظ بشیر احمد مصری	۱۴
۵۔ حیدرآباد کا ایک نادر روزگار کتب خانہ	محمد اسحٰق صدیقی	۲۲
۶۔ مسلمان اور تعلیمی منصوبہ بندی	محمد اسحٰق	۳۳
۷۔ تعلیم کی وسعت	محمد منظور احمد	۳۸
۸۔ خواتین کی ترقی و بھلائی...	پی آئی بی	۴۴
۹۔ جواہر روزگار لوجینا	پی آئی بی	۴۷
۱۰۔ روبوٹ	پی آئی بی	۵۶
۱۱۔ متوازن غذا کیوں	پی آئی بی	۶۱

حرف اوّل

مرکز اور ریاست میں اردو : اردو ہندوستان کی زبان ہے ۔ ہندوستان میں پیدا ہوئی ، بڑھی اور عوامی رابطہ کی زبان بن گئی ۔ آزادی کے بعد اس کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کی جانے لگیں خاص طور پر ہندی والوں کا خیال تھا کہ انہیں ڈر تھا کہ اردو آگے بڑھے گی تو ہندی کیلئے مشکلات پیدا ہونگی ، دراصل یہ ان کی غلط فہمی تھی ۔ اب بڑی حد تک ہندی والوں کی یہ غلط فہمی دور ہو گئی ہے اور توقع ہے کہ ہندی والے اردو کی ترقی میں رکاوٹ ڈالنے کی بجائے معاونت کا باعث بنینگے ۔

موجودہ انتخابات کے بعد مرکز میں جناب آئی کے گجرال صاحب مرکزی وزیر خارجہ ہیں اور ہماری اسٹیٹ آندھرا پردیش میں جناب ڈاکٹر ایم چنا ریڈی صاحب وزیر اعلیٰ ۔ دونوں اردو کے چاہنے والوں میں شمار کیے جا سکتے ہیں ، مرکزی حکومت نے اردو کے لئے ایک کمیٹی بنائی تھی جس کے صدر جناب گجرال تھے ۔ موصوف نے گجرال کمیٹی رپورٹ پیش کی جس میں اردو کی ترقی و استحکام کیلئے سفارشیں کی گئیں ۔ ہمارے وزیر اعلیٰ نے اردو میں طب کی اعلیٰ تعلیم جامعہ عثمانیہ میں حاصل کی ہے ۔ تلگو دیشم حکومت کے دور میں اردو والوں نے اردو کے لئے جد و جہد کی اور تاریخی چار مینار سے جلوس نکالا تو جناب چنا ریڈی نے جلوس کا افتتاح کیا ۔ اب یہ دونوں ہی خواہان اردو مرکز اور ریاست میں اقتدار پر فائز ہیں ہمیں یقین ہے کہ پورے ملک میں اردو کا کام آگے بڑھے گا ۔

حیدرآباد کا چار سو سالہ جشن : دکن کے بادشاہ محمد قلی قطب شاہ نے ہمارے شہر فرخندہ بنیاد کی بنیاد رکھی ۔ اسے چار سو سال گذر چکے ہیں ۔ اب شہر کا چار سو سالہ جشن منایا جا رہا ہے ۔ شاداب نے طے کیا ہے کہ اس جشن میں اپنا حصہ ادا کرے ۔ یہ جشن سال بھر منایا جا رہا ہے ۔ شاداب ہر ماہ ایک خاص نمبر پیش کرے گا ۔ جس میں ہمارے شہر کے عوامی ، سماجی ، مذہبی و ثقافتی و تاریخی پہلوؤں کو اجاگر کیا جائے گا ۔

مولانا محمد جلال الدین کامل حسامی
حسامی منزل، پنجہ شاہ، حیدرآباد

آخری قسط

قیام خلافت

قرآن مجید میں مسلمانوں کیلئے خلیفہ کے لزوم سے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہیکہ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ ط یعنی اے ایماندارو تم اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کرو اور رسول کی (بھی) فرمانبرداری کرو اور ان کی بھی جو تم (امتیوں) میں سے صاحب حکم (امیر) ہو۔ (پ ۵ ر ۵) اس آیت میں یہ بھی سمجھنے کی بات ہیکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نام کے ساتھ اَطِیْعُوا (یعنی فرمانبرداری کرو) جس طرح فرمایا ہے اسی طرح رسول کیلئے اَطِیْعُوا (یعنی فرمانبرداری کرو) کو دہرایا ہے جس سے واضح کیا گیا ہیکہ رسولؐ کے ایسے حکم کی بھی فرمانبرداری لازمی ہے جو احکام الٰہی کے علاوہ بھی ہوں لیکن اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ (یعنی تم میں سے جو صاحب حکم ہوں) کے ساتھ اَطِیْعُوا کو نہ دہراکر یہ اشارہ فرمایا ہیکہ تم میں سے ہونے والے امیر اس کے پابند ہیں کہ وہ اللہ اور رسول کے احکام کے بموجب حکم دیا کریں کیونکہ وہ شارع نہیں ہوتے بلکہ امتی ہوتے ہیں اس لیے اگر وہ ان دونوں کے احکام کے خلاف کوئی حکم دے تو کسی مسلمان پر اسکی فرمانبرداری شرعاً لازم نہیں۔ اسی وجہ سے ایسے ہی امتی کو خلیفہ بنایا جاسکتا ہے جو اپنی طرف سے کوئی نیا حکم ایسا نہ دے جو اللہ و رسول کے احکام کا نافرمان بنانے والا ہو۔ بلکہ وہ اس لئے خلیفہ ہو کہ ہر مسلمان سے اللہ و رسول کی اطاعت کروائے۔ اس نکتہ کا مسلمان ہمیشہ خیال رکھیں تاکہ کوئی مفتی بھی کسی مستند حوالے کے بغیر اپنی رائے دیدے تو وہ مندرجہ بالا وضاحت کے لحاظ سے ناقابل تسلیم سمجھ کر مسترد کر دینے کو ثواب سمجھیں اور وہ دنیاوی تعلیم پائے ہوئے حضرات بھی اس کا بطور خاص خیال رکھیں تاکہ اپنی غیر ذمہ دارانہ طریقے سے احکام شرع کی تعبیرات کو دینی خدمت نہ سمجھیں کیونکہ ؏ مرا بہ خیر تو امید نیست بد مرساں "یعنی جناب والا مجھے آپ سے بھلائی کی امید نہیں ہے لہٰذا کرم برائی تو نہ پہنچایئے"۔ جیسے آج کل سودی قرض کہتے ہیں چونکہ ناجائز اور حرام ہونا ذہن نشین ہو چکا ہے۔ اس لئے جدید تعلیم یافتہ حضرات نے اس کا حل یہ سمجھا کہ سود کا نام بدل کر منافع ک

جائے حالانکہ سود کا طریقہ حرام کیا گیا ہے نہ کہ لفظ سود کو حرام کیا گیا ہے جو نام بدلنے سے حلال ہو سکے اور یہ کہ قرآن مجید میں تو "ربٰوا" ہے جس کا ترجمہ جیسے سود ہو سکتا ہے ویسے ہی اس کا ترجمہ نفع بھی ہے۔ مقام غور یہ ہے کہ اگر حرام کو حلال بنانے کے لئے نام بدلنے کو درست سمجھا جائے تو مجرم اپنا جرم بدل کر رہا ہو سکے گا۔ حلال کو نام بدل کر حرام قرار دیا جا سکے گا جیسے بے نمازی نماز سے بچنے کیلئے اس کا نام "اُٹھ بیٹھ" رکھ لے کر کہہ سکے گا چونکہ خواہ مخواہ کی اٹھ بیٹھ تکلیف کا سبب ہوتی ہے اس لئے چھوڑنا گناہ نہیں ہو سکتا۔ چوری کرنے والا چوری کو جائز کر لینے کیلئے چوری کا نام "بہادری کی کمائی" رکھ کر اسے اپنے لئے موجب ثواب کام قرار دے لے گا۔ رشوت لینے والا اس کا نام "محنت کی کمائی" رکھ کر یہ کہہ سکے گا کہ محنت کی کمائی سے بڑھکر اکل حلال کوئی نہیں اس لئے میرے لئے وہ جائز ہے شراب کی بوتل پر شربت کا لیبل لگا کر شرابی اگر یہ کہے کہ میں شربت پی رہا ہوں اور شربت کا پینا اسلام میں جائز ہے لہذا شراب میرے لئے جائز ہے جسکا جواب اگر یوں دیا جائے کہ "براز" یعنی پاخانہ کا نام اس کی شکل وصورت کی بنا پر "پڈنگ" رکھکر یہ کہا جائے کہ براز کو کھایا جائے کیونکہ پڈنگ کو شوق سے کھایا جاتا ہے تو بجز بھی نام کی وجہ پاخانہ نہ کھائے گا تو سود کا نام منافع رکھنے کی وجہ سے سود کیسے کھایا جا سکے گا لہذا حرام کو حلال کرنے کے لئے نام بدل لینا خود فریبی اور خوش فہمی پیدا کرکے نہ صرف خود گمراہ ہونا ہے بلکہ دوسروں کو بھی گمراہ کرنے والا ہے۔ اس قسم کے لوگ اگر دنیا میں قائل نہ ہوں تو قیامت میں اپنے گمراہ ہونے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرنے کے ضرور قائل ہوں گے کیونکہ قرآن مجید میں ہے ربنا هٰؤلاء الذين اغوينا : اغويناهم كما غوينا ۔ یعنی اے ہمارے پروردگار بیشک یہ وہ لوگ ہیں جن کو ہم نے بہکایا۔ ہم نے ان کو ویسا ہی (بلا جبر و اکراہ) بہکایا جیسا ہم خود بہکے تھے (پ ۲ ع ۱)

توقع رکھتا ہوں کہ میری اس آگاہی سے ضرور آگاہی حاصل کی جائے گی۔

اسلام ایک مکمل مذہب ہے اور مسلمان ہی دنیا کی ان مسلمہ صداقتوں کے وارث ہیں جو قرآن مجید کی صداقتوں کے ساتھ پوری پوری مطابقت رکھتی ہے اور خلیفہ کا تصور محض اسلامی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ منصب جلیلہ ابتدا ہی سے اسلام میں موجود ہے چنانچہ امت محمدیہ میں سب سے پہلے صاحب منصب اللہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ خلیفہ رسول اللہ ہوئے۔ بعد آپ کے خلفائے راشدین کے بعد ملوکیت بنی۔ خاندان بدلتے گئے مگر خلیفہ سے موسوم شخصیتوں کا سلسلہ قائم رہا۔ اس لئے

نہیں کہا جا سکتا کہ خلیفہ کی ضرورت کا مطالبہ نئی تحریک ہے بلکہ یہ ہمارا بھولا ہوا سبق ہے جسے دہرانا فرض ہے۔ اسلام میں خلیفہ کی اہمیت اور ضرورت اس سے بھی واضح ہوتی ہے کہ نماز جمعہ اس وقت تک صحیح نہیں ہوتی جب تک کہ خلیفہ یا اس کا نائب نماز جمعہ میں شامل نہ رہے۔ یہی حال صلوٰۃ عید الفطر اور عید الاضحیٰ کا ہے۔ ان کے علاوہ فقہ اسلامی کے متعدد امور میں خلیفہ کی ضرورت پائی جاتی ہے۔ اس لئے بھی مسلمانانِ عالم کو چاہیئے کہ اپنے میں دینی شعور اجاگر کر کے اس فقہی ضرورت کو پورا کرتے ہوئے اپنا خلیفہ کسی موزوں شخصیت کو بنانے کا سلسلہ شروع کر دیں لیکن جب مسلمانوں کی موجودہ اسلامی زبوں حالی کا جائزہ لیا جاتا ہے تو اس مبارک مقصد کے حصول میں خود ہمارے لوگ ہی رکاوٹ بننے والے نظر آتے ہیں اور بے بسی کا عالم نظر آتا ہے۔ ؎

اپنے ماحی کے مطابق دہر کو کیونکر کروں
مجھکو بے حد غصہ آتا ہے مگر کس پر کروں

ہونٹ بھی اپنے اور دانت بھی اپنے۔ اسلئے قیام خلافت اپنی جگہ اہم اور لازمی ہونے کے باوجود یہ طے کرنا پڑتا ہے کہ کیا رفتار زمانہ کے پیش نظر آئندہ قیام خلافت ممکن الوقوع ہے بھی کہ نہیں۔ کیونکہ بمصداق "ہر آخر بیں مبارک بندہ است" انجام بینی سے پہلے اقدام عقلمندی نہیں۔ مخفی نہ رہے کہ کام کتنا ہی قدیم ہو مگر جب اسے مٹے ہوئے ایک عرصہ گذر جاتا ہے تو اسکی نشاۃ ثانیہ کے وقت متعدد مراحل سامنے آتے ہیں چنانچہ قیام خلافت کیلئے جتنے مراحل سامنے آسکیں گے انمیں سے چند کو ذیل میں پیش کرتا ہوں تاکہ ان کے حل کی صورتیں پیدا کی جا سکیں کیونکہ ؎

مشکلے نیست کہ آساں نشود　　　　مرد باید کہ ہراساں نشود

یعنی کوئی مشکل ایسی نہیں ہے جو آسان نہ ہو جائے اس لئے جوانمرد کے لئے یہ چاہیئے کہ وہ ناامید نہ ہو جائے

۱۔ ان اسباب کو معلوم کریں جنکی وجہ سے ہمارے وہ اسلاف جو آجکل کی شخصیتوں سے زیادہ مشہور اور ہر دلعزیز رہنے کے علاوہ اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہوئے ایسے مبارک مقصد کو حاصل نہ کر سکے تاہم ان کی رعایتیں ملحوظ رکھیں تو خلافت کا احیا ہم سے ہو سکے۔

۲۔ سارے مسلمانان عالم سے قیام خلافت کے بارے میں سب سے پہلے ضروری ہے کہ استصواب کر لیا جائے اور ایسے مشوروں کے بعد انجام دینے کی تدابیر کا تعین ہو مثلاً سرمایہ کی فراہمی اور مسلمانوں کے

تمام حقائق کو نہایت ... سمجھا جاسکے ... مسلمانوں کی جماعت کی تشکیل ... اقامت ... خلافت پر کام ... کر سکے ۔ اگر سارے مسلمان اس پر متفق ہو گئے تب انتخاب خلیفہ کے قواعد اور اسکی ترتیب ہو۔

۔ یہ بھی سوچنا چاہیے کہ مسلمانان عالم جبکہ مسلم حکومتوں کے علاوہ غیر مسلم حکومتوں میں بھی بٹے ہوئے ہیں تو ان سب کو ایک مرکز پر جمع کرنے کیلئے کیا جاسکتا ہے جبکہ آج کل مختصر علاقہ کے مسلمانوں میں مرکزیت پیدا کرنا مشکل تر ہوتا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ جو مسلمان اور غیر مسلم ایسی اصلاحی تحریک میں رخنے ڈالنے اور فسادی رول ادا کرنے کے عادی ہیں تو ان سے نمٹنے کی کیا تدبیر ہونی چاہیئے۔

۔ حالات حاضرہ کے مطالعہ سے جب یہ واضح ہو رہا ہے کہ توپ و تفنگ بھی سرکشی کی سرکوبی میں بے اثر ثابت ہو رہے ہیں اور عامۃ الناس جن میں مسلمان بھی شامل ہیں اخلاقی گراوٹ پھیل رہا ہے اور ارشاد باری تعالیٰ کی اس آیت قرآنی کے بموجب ہوتا ہوا معلوم ہو رہا ہے کہ وَإِذَا أَرَدْنَا أَنْ نُهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُوا فِيهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنَاهَا تَدْمِيرًا ۔ یعنی اور ہم جب کسی بستی کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو اس بستی کے دولت مند (خوش عیش لوگوں) کو حکم دیتے ہیں پھر وہ لوگ وہاں شرارت مچاتے ہیں تب ان پر عذاب نازل کرنے کیلئے حجت پوری ہو جاتی ہے تو اس بستی کو ہم تباہ اور غارت کر ڈالتے ہیں (پ ۱۵ ر ۲) (اس آیت کی وجہ سے بعض ... جو شکوک قضا و قدر کے سلسلے میں پیدا ہو سکتے ہیں ان کا جواب تشفی بخش طریقے پر میرے مسودے میں موجود ہے جسے بخوف طوالت کے علاوہ اصل موضوع " قیام خلافت " سے بالکل ہٹا ہوا محسوس ہونے کے اندیشے سے میں نے یہاں نہیں لکھا ہے جنکو تشفی مقصود ہو وہ مجھ سے بالمشافہ مل سکتے ہیں) یہاں اس تحریت کو کہنے کا مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ نفاذ زمانہ مشیت الٰہی کے بموجب ہے اس لئے بھی اسکی درستگی کیلئے اجتماعی طریقہ کے بجائے ہر مسلمان انفرادی طور سے خود پابند ہونگے۔

۔ تاریخ گواہ ہے کہ عہد نبوی کے قریب ترین زمانہ یعنی خلافت راشدہ میں جبکہ بزرگ ترین صحابہ کرام دنیا میں موجود تھے اس وقت ... ۲۳ھ میں حضرت عمرؓ نے حج سے واپس ہوتے ...

اللہ تعالیٰ سے عرض کیا تھا کہ "الٰہی! میری عمر اب کافی ہو چکی ہے اور اب مجھے اپنی رعایا سے انتشار کا خوف لاحق ہوچلا ہے اس لئے الٰہی کیا اچھا ہو کر تو مجھے اپنی طرف بلا لے اور میں تیرے دربار میں آکر سرخرو ہو آؤں" چنانچہ جیسے ہی آپ نے یہ دعا کی یعنی ذی الحجہ ۲۳ھ ختم بھی ہونے نہ پایا تھا یعنی اسی مہینے کی ۲۶ کو ابولؤلؤ فیروز نامی آتش پرست نے آپ پر قاتلانہ حملہ کر کے اس قدر شدید زخمی کر دیا کہ چار دن کے بعد محرم کی پہلی کو آپ کی روح پرواز کر گئی ؎ علامہ فاضل

چار دن زخمی رہے، پہلی محرم جب ہوئی
سال نو آیا - ادھر پائی شہادت دیکھئے

آپ کے بعد اگرچہ موجود صحابہ میں سب سے افضل حضرت عثمانؓ خلیفہ بنائے گئے مگر حضرت عمرؓ کی دوررس نگاہ نے رعایا میں آئندہ جس پیدا ہونے والے انتشار کو دیکھ لیا تھا وہ خلافت عثمانی کے چھ سال کے بعد کھل کر رونما ہونے لگے یعنی آپکی خلافت کے پچھلے چھ سال میں بڑھتے بڑھتے شرپسندوں کی وجہ سے مسلمانوں کے مزاج میں ایسی تبدیلی آ گئی کہ بڑے بڑے صحابہ کرامؓ تک اسے درست نہ کر سکے اور خود خلیفہ وقت حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دوہرے داماد عشرہ مبشرہ کے فرد، فرید جس کے ہدایت پر رہنے میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں کیا جا سکتا ویسی ہستی کی خلافت کو برداشت نہ کر کے باغیوں نے چالیس دن تک ظالمانہ سلوک کر کے بے قصور خلافت پر شکن خلیفۃ المسلمین کو اپنے ناپاک ہاتھوں سے شہید کر ہی دیا ؎ علامہ فاضلؒ

بجھ گئی افسوس ذوالنورین کی شمع حیات
چل بسا اک نور - اب ہر سمت ظلمت دیکھئے

پھر یہ داستانِ غم اسی پر ختم نہیں ہوئی بلکہ کچھ عرصہ کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ جو اموی خلیفہ ہی تھے مگر ان کے زہد و تقویٰ کی وجہ خلفائے راشدینؓ کے بعد کا درجہ دیا جاتا ہے کیونکہ دینداری میں وہ اپنی آپ مثال تھے اس لئے انہیں بھی بگڑے ہوئے مسلمانوں کی اکثریت نے برداشت نہ کیا اور ساڑھے تین سال ہی میں انہیں زہر دیدیا۔ قرون مشہود لہا بالخیر میں شرپسندوں کا جب یہ حال رہا ہے تو اب چودہ سو برس کے بعد جبکہ زمانہ قیامت سے اور قریب ہو گیا ہے تو خلافت کیلئے موزوں کون مل سکتا ہے ؎

منتخب کس کو چشم شوق کرے　　　ایک سے ایک ہے نیا انداز

باوجود اسکے قدرت کا ایک نیا کرشمہ اور وہ حالیہ انقلاب اسلامیہ ایران ہے جو سامنے آیا ہے کہ
حوصلہ شکن ماحول میں علامہ خمینی نے ایران کے غیر اسلامی ماحول کو بدلنے کیلئے جس جرأت مندانہ استقامت
اعلیٰ ترین کارنامہ انجام دیا اور سیکڑوں سال کے مستحکم شاہی خاندان پہلوی کو راہ فرار اختیار کرنے
مجبور کیا اور بغیر جنگ کے خلافت اسلام کی حکومت کی داغ بیل ڈال کر جمہوریہ اسلامیہ ایران کو قائم کر دیا
رہتی دنیا تک اپنی معجزانہ نوعیت کو انشاء اللہ تعالیٰ منواتی رہے گی لیکن اس زبردست انقلاب اسلامی
قدرت کو تسلیم کرنے کے باوجود یہ کہا جا سکتا ہے کہ سارے مسلمانان عالم کیلئے ایران کی مثال پوری پوری
بق نہیں ہو سکتی کیونکہ سارا ایرانی ایک نسل ایک زبان ایک قوم اور اکثریت کا مسلک بھی ایک
نے کی وجہ اس طرح کا امکان ہے ۔ برخلاف اسکے مسلمانان عالم مختلف النسل اور مختلف زبانوں
مختلف فرقوں پر مشتمل ہونے سے مزاجوں میں باہم زمین و آسمان کا فرق رکھتے ہیں مختصر یہ کہ ان
یران جیسی یکسانیت پیدا نہیں ہو سکتی اگرچہ ؎

کہنے کو اہل علم کی کوئی کمی نہیں　　　لیکن خود اپنی فکر خود اپنی نظر کہاں

ہم ہمکو تاحیات مسلمانان عالم کی اصلاح حال و مآل کیلئے کچھ نہ کچھ سوچنا اور مفید تدابیر اختیار کرنا
نا اور بحکم الٰہی دینی ذمہ داری ہے اور نا امیدی گناہ ہے کیونکہ قرآن مجید میں ہے ۔
لَا تَايْئَسُوا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝
ی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے نا امید نہ ہو ۔ بیشک اللہ تعالیٰ کی رحمت سے وہی لوگ نا امید ہوتے
ہیں جو کافر ہیں ۔ اور یہ مسلم امر ہے کہ ؎

فضل رب کو کب سبب درکار ہے　　　بے سبب دنیا اسے کب بار ہے

سرے شاعر نے کہا ہے ؎

دیر لگتی نہیں ہے قدرت ربانی میں　　　مچھلیاں دشت میں پیدا ہوں ہرن پانی میں

لئے اسے ناممکن بھی نہ سمجھنا چاہیئے کیونکہ یہ دنیا ہمیشہ بدلتی رہی ہے اور بدلتی رہے گی اس لئے کیا
ہے کہ ایسے مرد میدان کو اللہ تعالیٰ دنیا میں بھیج دے جو سارے مسلمانان عالم کو اپنے مرکز پر جمع
سبکو نیک بنا دے ۔ اس لئے مسلمانوں کی جیت ہی اپنا ہار ہے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنا بھی مناسب نہیں کیونکہ ؎

کون سمجھے گا آشفتہ کی زباں ۔۔۔۔ یوں تو پانی پہ داستاں کہئیے ۔

البتہ انسانی بس میں یہ ہے کہ چونکہ یہ دنیا عالم اسباب ہے اس لئے قیام خلافت کے اس بلند مقصد کو یکدم حاصل کرنے کی کوشش صحت نہیں بلکہ ایسے اسباب کو فراہم کرنے کی کوشش کرنا چاہئیے جنکے نتیجہ میں سارے مسلمانان عالم کیلئے خلافت مسلین کو قائم کرنے میں آسانی پیدا ہوسکے ۔ جیکے لئے حالات حاضرہ کے پیش نظر ابتدائی کوشش یہ ہوسکتی ہے کہ ہر ملک میں علاقہ واری امارت شرعیہ قائم کی جائے جیسے ہمارے ہندوستان کی بعض ریاستوں میں قائم ہوچکی ہیں مثلاً بہار' اڑیسہ' کرناٹک' مہاراشٹرا اور خود ہمارے آندھرا پردیش میں بھی دس سال سے قائم ہے اور دو سال پہلے تو اسکی سرکاری رجسٹری بھی کروائی گئی ۔ والحمد للہ ہر ایک ان میں سے اپنے اپنے علاقہ کے مسلمانوں کی کچھ نہ کچھ دینی خدمت کررہا ہے ۔ اگر اسی طرح ہندوستان کی پوری ریاستوں میں امارت شرعیہ قائم ہوجائیں تو پھر پورے ملک ہندوستان کے امرائے شریعت اپنے ملک کی کسی موزوں شخصیت کو مدت مقررہ کے لئے شریعت کا امیر الملک بنا سکیں گے ۔ اگر ایک پورے ملک میں یہ نظم قائم ہوجائے تو اسکی توقع کی جاسکتی ہے کہ دیگر ممالک کے مسلمانوں کو بھی اس طرف متوجہ کرنے سے رفتہ رفتہ پوری دنیا میں شرعی امرائے ملک ہوجائیں جس کے بعد عامۃ المسلمین سے نہیں بلکہ ہر ملک کے امرائے شریعت بشمول ریاستی امرائے شریعت مسلمانان عالم کیلئے خلیفہ کو منتخب کرکے شرع محمدی کیلئے عالمی تنظیم قائم کرسکیں ۔ اس موقع پر میں اپنے مسلمانان آندھرا پردیش سے اپیل کروں گا کہ وہ جبکہ مسلمانان عالم کیلئے خلیفہ کی ضرورت کو محسوس کرتے ہیں تو رجسٹرڈ امارت شرعیہ (اے ۔ پی) کو کارگزار بنانے میں تعاون کرتے ہوئے ضلع اور تعلقہ اور مواضعات میں اور محلہ واری مجالس ابتدائی امارت شرعیہ (اے ۔ پی) قائم کرکے صدر دفتر بمقام حیدرآباد سے منسلک ہوں ۔

من آنچہ شرط بلاغ است با تو می گویم ۔۔۔ تو خواہ از سخنم پند گیر خواہ ملال

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

خواجہ حمید احمد
جامعہ دارالعرفان، ٹولی چوکی، حیدرآباد

انبیاء علیہم السلام کی معراجوں کے قرآنی امتیازات

اللہ تعالیٰ نے اپنے بار یابی اور تکلم سے بعض انبیائے کرام کو جو سرفراز فرمایا اور اس کا ذکر [قرآ]ن میں فرمایا ہے ہمارے لئے بڑا سبق ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اپنا خلیفہ بنایا اور پھر انہیں سجدہ کرنے کا حکم دیا۔ [ح]ضرتِ آدمؑ کو حوا کے ساتھ جنت میں رہنے کا مقام عطا کیا لیکن ابلیس کے ورغلانے پر ان کی اس دنیا میں [آ]نی عمل میں آئی۔ مگر توبہ و استغفار کے ذریعہ انہیں حزن و ملال سے نجات ملی اور علم و ہدایت کا سلسلہ [شروع] ہو گیا۔

حضرت نوح علیہ السلام ساڑھے نو سو سال تک تبلیغ و رسالت کے فرائض انجام دیتے رہے لیکن [تھوڑے] ہی اشخاص ایمان لائے اور باقی کو غرق آب کرنے کیلئے حضرت نوح علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا حکم [ہوا] ۔ وصنع الفلک باعیننا ووحینا (ہماری آنکھوں کے سامنے اور ہماری وحی کے ذریعے ایک [کش]تی بناؤ) جس کے ذریعہ ایمانداروں کو بچالیا گیا اور حضرت نوح علیہ السلام کیلئے یہ ارشاد فرمایا گیا کہ [س]لامٌ علیٰ نوحٍ فی العٰلمین۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اپنی معرفت سے واقف کرانے کی غرض سے ارض و سمٰوات [کی سی]ر کرائی۔ وکذالک نری ابراھیم ملکوت السمٰوٰت والارض .....

حضرت ابراہیمؑ ان نشانیوں کی بے حقیقی کو پہچان کر خالق آلایات کی طرف متوجہ ہو گئے اور فرمانے لگے۔ انی وجھت وجھی للذی فطر السمٰوٰت والارض حنیفا وما انا من المشرکین۔
(سورہ الانعام)

حضرت ابراہیمؑ کا یہی کلمہ ہماری نماز ول کی نیت بن گیا ۔
حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی باریابی اور تکلم کا شرف حاصل ہوا ۔ لیکن تجلی باری تعالیٰ سے غش کھا کر گر گئے ۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب مدین سے اپنی بیوی کو لے کر مصر واپس ہو رہے تھے تو انہیں ندا دی گئی انا اخترتک فستمع لما یوحیٰ .... اسکے ساتھ حضرت موسیٰؑ کو معجزے بھی عطا کئے گئے اور حکم ہوا کہ فرعون کی سرکشی ختم کرنے اور بنی اسرائیل کو غلامی سے آزاد کرانے فرعون کے پاس جائیں ۔
حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا فرمائی ۔
(طٰہٰ)
رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي ٥ وَيَسِّرْ لِي أَمْرِي ٥ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّن لِّسَانِي يَفْقَهُوا قَوْلِي
فرعون کے غرق کئے جانے کے بعد موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کے ہمراہ کوہ طور کی طرف روانہ ہوئے لیکن راستے میں ان کی قوم شرک میں مبتلا ہو گئی ۔ حضرت موسیٰؑ جب اللہ تعالیٰ کے پاس حاضر ہوئے اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا
وَمَا أَعْجَلَكَ عَن قَوْمِكَ يَا مُوسَىٰ ۔ اپنی قوم کو چھوڑ کر اتنی عجلت کیوں کی ۔
اور واپسی پر اپنی قوم کی ان مشرکانہ حرکتوں کی وجہ سے انہیں اپنے الواح کو علحدہ رکھ دینا پڑا ۔
حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے کئی معجزوں سے سرفراز فرمایا ۔ مگر ان کا زمانہ نبوت بہت مختصر رہا ۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد جب حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو نور رسالت اپنے کمال کو پہونچ گیا ۔ آپ کی سیرت کو اسوہ حسنہ قرار دیا گیا ۔ اور آپ پر ایسا قرآن نازل فرمایا گیا جس کے ذریعہ بنی نوع انسانیت کو ظلمات سے نکال کر نورانی ہدایات عطا کی گئیں ۔
فرائض نبوت کی تکمیل کے سلسلے میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو انتہائی مشکلات کا سامنا ہوا تو ۲۷ رجب کو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو معراج سے مشرف فرمایا ۔ اور جیسا کہ پندرہ پارہ کی ابتداء میں ذکر ہے کہ اللہ پاک اپنے بندے کو اپنے ساتھ مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ لے گیا ۔
سُبْحَانَ الَّذِي أَسْرَىٰ بِعَبْدِهِ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَى الْمَسْجِدِ الْأَقْصَى الَّذِي بَارَكْنَا حَوْلَهُ لِنُرِيَهُ مِنْ آيَاتِنَا إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ٥ (بنی اسرائیل)

اور اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو اللہ تعالیٰ سے شرف باریابی ہوا اس کو سورہ والنجم میں اس طرح بیان کیا ہے کہ مَازَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی ۔ اللہ تعالیٰ کے دیدار کے وقت آپ کی نظر بہکی نہیں اور وہ قربت حاصل ہوئی کہ

ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی ۝ فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی ۝ فَاَوْحٰٓی اِلٰی عَبْدِہٖ مَآ اَوْحٰی ۝ (والنجم)

اور اللہ تعالیٰ نے وہ سب کچھ آپ کو بتایا جو بتانا مقصود تھا۔ اس معراج سے واپسی پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنا مکالمہ اپنے صحابہ کے سامنے سنایا وہ مختصراً احادیث شریف میں اس طرح بیان کیا گیا کہ

التحیات للّٰہ والصلوٰت والطیبٰت ۔ تمام روحی جسمانی اور مالی عبادتیں اللہ ہی کیلئے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ کا جواب کیا السلام علیک یا ایہا النبیؐ ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ سلام ہو آپ پر اے نبی اور اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں ۔ آنحضرتؐ نے دوبارہ عرض کی اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللّٰہِ الصّٰلِحِیْنَ ۔ سلام ہو ہم پر اور اللہ تعالیٰ کے تمام نیک بندوں پر ۔ اس پر حضرت جبرئیلؑ اور ملائکہ میں سے ہر ایک کی آواز سنائی دی ۔

اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ ۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں ۔

الحاصل ہماری نمازوں کی نیت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وہ کلمات ہیں جو انہوں نے آیات الٰہی کو دیکھ کر معرفت الٰہی پا لینے پر ادا کئے تھے جبکہ خود نماز میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اللہ تعالیٰ کے دربار میں باریابی یعنی حضور صلعم کی معراج کا ماحصل ہو گئیں یعنی الصلوٰت معراج المومنین ہو گئیں

بلغ العلیٰ بکمالہٖ   کشف الدجیٰ بجمالہٖ
حسنت جمیع خصالہٖ   صلو علیہ وآلہٖ

حافظ بشیر احمد مصری

ترجمہ: سید غلام محی الدین صاحب

قادیان سے واپسی

میرے بہت سے احباب نے مجھ سے متعدد بار خواہش کی کہ میں اپنی وہ کہانی سناؤں جو قادیان ۲
سے متعلق ہے اور اس سلسلہ میں اپنے ذاتی تجربات کی روشنی میں اظہار خیال کروں۔ مفصل طور پر کچھ کہنے کیلئے ایک پوری ضخیم کتاب کی ضرورت ہوگی۔ اس مختصر مضمون میں صرف ان واقعات کا ذکر اجمالی طور پر کیا گیا ہے جس نے مجھے ان مسلمہ عقائد کی مخالفت اور منافقانہ مذہب کی ملامت کرنے پر مجبور کردیا۔

میں ۱۹۱۴ء میں قادیان میں پیدا ہوا یہ میری بدقسمتی تھی جو پچھلے ۳۰ برس سے میرے گلے میں طوق لعنت کی طرح حمائل ہے۔ بچپن میں ہی میرے دل میں یہ بات بٹھلا دی گئی تھی کہ تمام مسلمان کافر ہیں اللہ اور اسلام پر ایمان اس کے ساتھ مشروط ہے کہ مرزا غلام احمد صاحب کو اللہ کا رسول تسلیم کیا جائے اور ان کے بعد ان کے جانشینوں کو خلیفہ مانا جائے۔

میں جیسے جیسے سن شعور کو پہنچتا گیا میں نے یہ محسوس کیا کہ میں ایک ایسے معاشرہ کا فرد ہوں جو دجل و فریب پر مبنی ہے کچھ ایسے بزرگ یقیناً موجود تھے جنہوں نے اس مذہب کو اسلام کی ایک اصلاحی تحریک سمجھ کر اس کے ابتدائی دور میں قبول کرلیا تھا۔ ان مخلص اور سادہ لوح لوگوں میں اس کی صلاحیت نہیں تھی کہ وہ سمجھ سکتے کہ ان کے اردگرد اب کیا ہو رہا ہے یا پھر وہ اپنے آپ کو اس سے صرف نظر کرنے پر مجبور پاتے تھے۔ کم عمری کے باعث میرے لئے اس وقت یہ سمجھنا مشکل تھا کہ اس تحریک سے اسلام کو نقصان پہونچ رہا ہے۔ ابتدائی مرحلہ میں اس تحریک سے قائدین کے اطوار و اخلاق کے بارے میں میرے دل میں شبہات پیدا ہوتے۔ اس ناپختہ شعور کی کیفیت میں قدرت نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ میرا امتحان لینے کیلئے مجھے جہنم کی بھٹی میں ڈھکیل دے

میں ۱۸ سال کا ایک تندرست و توانا نوجوان تھا، جب مجھے یہ پیغام ملا کہ اس وقت تحریک کے

سربراہ (خلیفہ) نے کچھ خفیہ امور پر تبادلۂ خیال کیلئے مجھے رجوع کیا ہے۔ اس زمانے میں ان کو ظل اللہ کہتا تھا، لہٰذا اس دعوت نامہ کو پاکر بے حد مسرت اور عزت محسوس ہوئی۔ میں نے یہ سمجھا کہ وہ مجھے مذہبی امور سے متعلق کوئی خفیہ کام سپرد کرنا چاہتے ہیں۔

پہلی ملاقات محض سرسری تھی۔ خلیفہ مرزا غلام احمد کے بیٹے بشیر احمد آنجہانی تھے انہوں نے مجھ سے کچھ ذاتی سوالات کئے جن کے جوابات میں نے بہت محتاط ہو کر دیئے۔ مجھے حکم دیا گیا کہ میں اس ملاقات کا کسی سے ذکر نہ کروں اور دوسری ملاقات کیلئے وقت بتلا کر رخصت کر دیا۔ بعد کی ملاقاتیں بے تکلفانہ رنگ اختیار کرتی گئیں یہاں تک کہ مجھے "اندرونی حلقہ" میں داخل کرنے کی پیشکش کی گئی۔

عیش پرستی کا مرکز: "ظل اللہ" نے دراصل جنسی عیش کوشی اور مختلف طریقوں سے عیش پرستی کے لئے ایک اندرونی حلقہ قائم کر رکھا تھا۔ اس کے لئے انہوں نے دلالوں اور کٹنیوں کا ایک گروہ اکٹھا کر رکھا تھا۔ غریب خاندانوں یا ایسے لوگ جن کے ذہنوں پر مرزائیت پوری طرح سوار ہو چکی تھی یا پھر دوسرے مجبور اشخاص جو کسی طرح مدافعت کے قابل نہیں تھے، ان کے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو یہاں لایا جاتا، ان میں سے کبھی کوئی شخص صدائے احتجاج بلند کرتا تو اسے بائیکاٹ، مرتد قرار دیکر یا دوسرے طریقوں سے بدنام کر کے خاموش کر دیا جاتا۔

مرزا صاحب کا خاندان اپنے فرقہ میں روحانی اقتدار کا حامل ہی نہیں بلکہ قادیان اور اس کے اطراف میں کثیر زرعی زمینوں کا مالک بھی تھا۔ ان زمینوں پر کاشتکاری کرنے والے ان کے متبعین ہونے کے علاوہ معاشی طور پر ان کے دست نگر تھے، کیونکہ یہاں انہیں بحیثیت کاشتکار کسی قسم کا کوئی حق حاصل نہیں تھا۔ ان حالات میں کسی شخص کی جانب سے ان کی مخالفت ممکن نہ تھی۔ کچھ لوگوں نے اگر کبھی اس کی جرأت کی تو وہ کسی حادثہ کا شکار ہو جاتے یا پھر اس طرح غائب ہو جاتے کہ ان کا کوئی سراغ ہی نہیں ملتا تھا۔ جس زمانہ میں یہ سب کچھ ہو رہا تھا مسلمان اپنی سادہ لوحی کی بنا پر مرزائیت کے خلاف کلامی بحثوں اور مناظرانہ جنگ میں مصروف تھے، اور انہیں اس کی اس گندگی کا کوئی علم نہیں تھا۔

ایسا بھی وقت آیا جب میرے ذہن میں خیال آیا کہ تقدس کے پردہ میں اس بے ایمان گروہ کے سربراہ کو قتل کر کے اس سے چھٹکارا حاصل کیا جا سکتا ہے لیکن اس کم عمری میں بھی عقل نے ساتھ دیا، میں نے اپنے دل میں سوچا کہ لوگ یہی سمجھیں گے کہ کسی دشمن نے مذہبی تعصب کے تحت یہ جرم کیا ہے اور اس طرح

تاریخ نے شہیدوں کی صف میں جگہ دے دی گئی۔ اس کے علاوہ ایسے شخص کی اچانک موت اس کے ظلم کا نشانہ بننے والوں کی نجات دہندہ ثابت ہوگی اور لوگ یہ خیال کرنے لگے کہ اس نے مذہب اور خدا کیلئے اپنی جان دیدی۔ بعد کے حالات سے یہ ثابت بھی ہوا کہ میرا یہ خیال صحیح تھا۔ وہ تھوڑے دنوں کے بعد فالج کا شکار ہو گئے اور طویل عرصہ تک سخت تکلیفیں اٹھا کر راہی فنا ہو گئے۔ ان کی علالت کے زمانہ میں جو ڈاکٹر ان کا علاج کیا کرتا تھا اس نے مجھے بتلایا کہ آخری مرحلہ پر وہ ذہنی طور پر ماؤف ہو چکے تھے اور ہر وقت انتہائی فحش باتیں کیا کرتے تھے اور جب تک گویائی نے ساتھ دیا فحش الفاظ ہی زبان پر رہے اور اسی پر خاتمہ بالشر ہوا۔

مذکورہ بالا وجوہات کے علاوہ ایک اور وجہ تھی جس نے راست اقدام سے باز رکھا تھا۔ میں یہ سمجھ چکا تھا کہ ایک شخص واحد کی موت سے یہ برائی دور ہونے والی نہیں ہے صرف اکیلا یہ شخص جنسی بے راہروی کا شکار نہیں تھا۔ ان کے بھائی اور مرزا صاحب کے خاندان کے افراد کی اکثریت کی اخلاقی حالت بھی کچھ بہتر نہیں تھی۔ اس نام نہاد تقدس مآب گھرانہ کے بزرگوں نے اپنی لمبی داڑھیوں کے باوجود فسق و فجور کے جھنڈے گاڑ رکھے تھے گویا کہ ان کے درمیان ایک سمجھوتہ سا ہوگیا تھا کہ کوئی ایک دوسرے پر انگشت نمائی نہ کرے۔ دراصل اس حلقۂ اقتدار میں صرف انہیں لوگوں کو ذمہ داری سونپی جاتی تھی جو اس خاندان کے اس طرز زندگی کو پوری طرح اپنا چکے تھے۔ یہ وہ خاندان تھا جسے یہ لوگ بے شرمی سے پیغمبر کا خاندان کہتے تھے ان حالات میں یہ تعجب خیز امر نہیں تھا کہ کانا پھوسی کے ذریعہ ان کے کارناموں کا ذکر ہونے لگا۔ اور امیر خاندانوں کے بگڑے ہوئے بہت سے نوجوان اس "اصلاحی تحریک" میں اس لئے شامل ہو گئے تھے کہ انہیں مشرقی اخلاق کی ان حد بندیوں سے نجات مل جائے جس پر اس وقت معاشرہ عمل کر رہا تھا۔

تائب ہونے والے پر مظالم: خلیفہ کے "اندرونی حلقہ" سے اخراج کے بعد میری زندگی کو مسلسل خطرہ پیدا ہوگیا۔ اس کے جرائم پیشہ لوگوں نے میرا تعاقب شروع کر دیا تھا۔ اس وقت میں نے یہ فیصلہ کیا کہ میں اس سے سیدھا مقابلہ کروں، میں خلیفہ کے پاس گیا اور ان کو میں نے ایک طویل خط لکھا جس میں میں نے اس کے سیاہ نامہ اعمال کا پورا ریکارڈ لوگوں کے نام جرائم کے اوقات کے ساتھ لکھ رکھا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ اس خط کی نقلیں میں نے مختلف اشخاص کے پاس اس ہدایت کے ساتھ کر دی ہیں کہ میرے مرنے یا غائب کر دیئے جانے پر اسے کھول کر پڑھ لیں۔ اس کے بعد میں اس قا

ہوگیا کہ آزادی سے قادیانیت کا مرکز ہی بیچ میں پھنس گیا۔ ان لوگوں کی بداخلاقیوں کے بارے میں مجھے بہت سی معلومات میں اضافہ ہوتا گیا اس قدر میں مذہب سے برگشتہ ہوگیا حتیٰ کہ میں ملحد ہوگیا۔ الحاد نے میرے اندر ایک ایسا خلا پیدا کردیا جو میرے لئے از خود بھرنا مشکل تھا۔ لہٰذا میں نے اپنے والد صاحب سے رجوع کیا۔ انہیں میری روداد سن کر سخت دھچکا لگا۔ ظاہر ہے کہ وہ ایک کم عمر نوجوان کی بات پر یقین نہیں کرسکتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے اپنے طور سے معلومات حاصل کرنا شروع کیں اور بہت جلد ہی انہیں میری صداقت کا یقین ہوگیا۔

میرے والد صاحب نے نام نہاد خلیفہ کو ایک طویل مراسلہ لکھا اور یہ مطالبہ کیا کہ وہ خلیفہ کے عہدہ سے دستبردار ہو جائیں۔ متعدد بار یاد دہانی کرانے پر بھی کوئی جواب موصول نہیں ہوا، بلکہ میرے والد شیخ عبدالرحمٰن صاحب مصری اور ان کے خاندان کے تمام لوگوں کو مرتد قرار دے دیا گیا۔ میرے والد صاحب کے تینوں خطوط بعد میں ہندوستانی اخبارات میں شائع ہوئے۔

مرتد ہونے کا مطلب یہ تھا کہ ہمارا سماجی بائیکاٹ شروع ہوگیا۔ ہماری زندگی خطرہ میں پڑ گئی یہاں تک کہ حکومت کو ہمارے گھر کے ارد گرد چوبیس گھنٹے کا پہرہ لگانا پڑا اور ہمارے گھر کا کوئی فرد پولیس کو ساتھ لئے بغیر باہر نہیں جا سکتا تھا۔ اس تمام احتیاط کے باوجود میرے اور میرے دو ساتھیوں پر بازار میں دن کے وقت حملہ کیا گیا۔ میرے ایک ساتھی کے سینہ میں چھرا مارا گیا اور وہ مر گیا۔

دوسرے کی گردن اور کندھے پر زخم آئے تھے اور اسے بہت دنوں تک اسپتال میں رہنا پڑا۔ میں نے مقابلہ کیا اور اپنے حملہ آور کو زخمی کردیا۔ یہ زخمی شخص غائب کردیا گیا اور پولیس نے بعد میں اسے تلاش کرکے گرفتار کیا۔ اسے بعد میں قتل کے الزام میں پھانسی کی سزا ہوئی۔ قادیان میں اس کی موت کے بعد بہت ہی جوش و خروش کا مظاہرہ کیا گیا اور خلیفہ نے خود اس کی نماز جنازہ پڑھائی۔

اس واقعہ کے بعد مجلس احرار اسلام نے اپنے والنٹیرز بھیج کر ہماری حفاظت کا انتظام کیا۔ یہ والنٹیرز ملٹری پولیس کے علاوہ ہمارے گھر کا پہرہ دیتے تھے۔ ان سب لوگوں کے خیموں سے جو ہمارے بنگلے کے میدان میں نصب تھے، ہمارا گھر ایک قلعہ بند قلعہ معلوم ہوتا تھا۔

مرزا کے کارکنوں نے میرے والد کو جھوٹے مقدموں میں پھنسانا شروع کردیا ان کا مقصد انہیں بدنام کرنا اور انہیں مالی طور پر کمزور بنانا تھا۔ اس کے لئے اس درجہ گندی اور گری ہوئی ذہنیت کا مظاہرہ کیا گیا کہ

[illegible] ہمارے لئے زندگی دو بھر ہو گئی۔ [illegible] گیا وہ افراد پر مشتمل اپنے خاندان کے گزارہ کے لئے [illegible]
ذریعہ چکا ہے۔ سب سے [illegible] تھا کہ ہمارے خاندان کے بچوں کو تعلیم منقطع کرنی پڑی۔ جس سے
[illegible] اس زمانے کے اخبارات میں شائع ہوئی تھیں۔

[illegible] لوگوں کی جانب سے ہمارے خاندان پر بہت دباؤ پڑ رہا تھا کہ [illegible] نقل وطن [illegible] ہم لوگ لاہور چلے گئے۔ میرے والد صاحب لاہوری جماعت احمدیہ میں شریک ہو گئے [illegible] قادیانیوں کے عقائد میں کوئی خاص فرق نہیں تھا۔ یہ جماعت بھی [illegible] میں اس طرح [illegible] تھی۔ میں نے اس جماعت سے بھی اپنے آپ کو الگ رکھا کیونکہ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ میرا عقیدہ تو مذہب پر سے ہی اٹھ چکا تھا۔ بہرحال اس زمانے میں مجلس احرار کے قائدین سے میرا ربط ضبط بڑھنے لگا جس نے میرے اوپر بہت اثر ڈالا۔ ان میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، چودھری افضل حق، اور مولانا مظہر علی اظہر شامل تھے۔ میں نے دیکھا کہ یہ لوگ بڑے مخلص دوست اور اچھے مسلمان تھے۔

میرے والد صاحب نے میرے الحاد کو مجبوراً نظر انداز کر دیا تھا۔ حالانکہ انہیں اس پر دلی قلق تھا۔ انہوں نے مجھے بتلایا کہ وہ میرے لئے اللہ سے برابر دعا کرتے رہتے ہیں۔ اور مجھے بھی خدا سے ہدایت طلب کرنے کی تلقین کی۔ میرا جواب یہ تھا کہ وہ مجھ سے ایک ایسی ہستی کی عبادت کرنے کا مطالبہ کر رہے ہیں جس کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ آخر کار بہت مباحثے کے بعد یہ طے پایا کہ میں خدا سے مشروط طور پر دعا مانگوں چنانچہ میں کچھ اس طرح دعا مانگنے لگا

"اے خدا! اگر تیرا وجود ہے تو مجھے کچھ اس کا عرفان عطا کر اور اگر تیرا کوئی وجود نہیں تو مجھ پر ایمان نہ لانے کا کوئی الزام میرے اوپر نہیں ہے۔"

[illegible] ایک سال کے اندر ہی میرے اوپر اس کے [illegible] لگے۔ میں نے ایک خواب دیکھا [illegible] تفصیل بیان کرنا مناسب نہیں [illegible] کافی طویل اور واضح تھا۔ میرے جیسے گناہگار کو بھی اس کا یقین ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کا وجود ہے۔ یہاں میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس خواب کے آخری حصے میں میں نے دیکھا کہ مرزائی خلیفہ صاحب کا

[illegible]

ان خوابوں کے بعد بڑی حیرت انگیز تسکین محسوس ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرے مقدر کا ستارہ چمک گیا ہے۔ لہٰذا میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے اب باقاعدہ طور پر اسلام قبول کر لینا چاہیئے۔ مرحوم مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری نے مجھے مولانا الیاس [illegible] بانی تبلیغی جماعت کے پاس دہلی سے چند میل کے فاصلہ پر موضع میں بھجوا دیا اور وہاں سنہ ۱۹۴۲ء میں ان کے دستِ مبارک پر بیعت کی۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ شیخ الحدیث جناب محمد زکریا صاحب نے مغرب کی نماز کے بعد مولانا محمد یوسف صاحب کے ساتھ جماعت میں موجود تھے۔ تبلیغی جماعت کا اثر میرے لئے [illegible]

سنہ ۱۹۴۱ء میں احساسِ ندامت و قدرے سکون کے ملے جلے جذبات کے ساتھ جنوبی افریقہ چلا گیا۔ بمبئی میں [illegible] پر کھڑے ہو کر میں قرآن شریف کی اس آیت کی تلاوت کرنے لگا۔

وما لكم لا تقاتلون في سبيل الله والمستضعفين من الرجال والنساء والولدان الذين يقولون ربنا اخرجنا من هذه القرية الظالم اهلها واجعل لنا من لدنك وليا واجعل لنا من لدنك نصيرا ۝ (سورۂ نساء آیت ۷۵، پارہ ۵)

اور تمہارے پاس کیا عذر ہے کہ تم جہاد نہ کرو اللہ کی راہ میں اور کمزوروں کی خاطر سے جن میں کچھ مرد ہیں اور کچھ عورتیں ہیں اور کچھ بچے ہیں جو دعا کر رہے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم کو اس بستی سے باہر نکال جس کے رہنے والے سخت ظالم ہیں اور ہمارے لئے غیب سے کسی دوست کو کھڑا کیجئے اور ہمارے لئے غیب سے کسی حامی کو بھیجئے۔"

جنوبی افریقہ میں بیس سال رہنے کے بعد میں سنہ ۱۹۶۱ء میں [illegible] چلا گیا۔

ووکنگ مسجد کی امامت: سنہ ۱۹۶۲ء میں ووکنگ شاہجہان مسجد کا امام مقرر کیا گیا۔ اس کی وجہ بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اس مسجد کو مستشرق ڈاکٹر لیٹنر (Dr. LIETNER) نے سنہ ۱۸۸۹ء میں تعمیر کرایا تھا۔ اس کے لئے ہندوستان کے مسلمانوں نے رقم فراہم کی تھی اور ایک ٹرسٹ بنایا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب برطانیہ میں بالعموم [illegible] نکلتے تھے۔ لہٰذا ٹرسٹ نے اس کا انتظام احمدیت کے مرزائیوں کے سپرد کر دیا تھا۔

سنہ ۱۹۶۱ء کے بعد مسلمانوں کی مختلف انجمنیں انگلینڈ میں قائم ہو چکی تھیں اور وہ اس پر معترض تھیں کہ [illegible] کا انتظام ٹرسٹ کے منشاء کے مطابق مسلمانوں کے ہاتھ میں دے دیا جائے اور اسے اسلامی مرکز بنا

تبدیل کر دیا جائے مجھے ٹرسٹ کے سکریٹری اور منیجر نے بہ حیثیت امام کام کرنے کے لئے درخواست کی۔ میں نے ان سے صاف بتلا دیا کہ میں سنی مسلمان ہوں اور میں نے مرزائیوں کے خلاف اپنے تحریر کردہ کچھ مضامین کی نقلیں بھی ارسال کر دیں۔ انہوں نے مجھے بتلایا کہ وہ میرے خیالات سے واقف ہیں اور مجھے اطمینان دلایا کہ پاکستان کے ہائی کمشنر جو کہ ٹرسٹ کے سرکاری صدر ہیں مجھ سے متفق ہیں۔

مسجد کا عہدہ سنبھالنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ اکثر مسلمان مجھے مرزائی سمجھتے ہیں۔ پچھلے پچیس برسوں سے اس مسجد میں مرزائی امام ہی مقرر ہوتے رہتے تھے۔ لہٰذا عام مسلمانوں کے لئے اس بات پر یقین کرنا مشکل تھا کہ یکایک کوئی مسلمان بھی امام ہو سکتا ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میں دو گھوڑوں پر سوار ہوں۔ مرزائی اور لاہوریوں سے میرے اختلافات ناقابل عبور تھے اور تمام مسلمان مجھے مرزائی سمجھتے تھے مجھے انگلینڈ کے مسلمانوں کا اعتماد حاصل کرنے میں کافی وقت لگا۔

میری یہ تمنا تھی کہ میں مسلم ممالک کا دورہ کر کے ان کی مذہبی حالت کا مشاہدہ کروں (اس دورہ میں میں نے تین سال صرف کئے، اور تقریباً چالیس ملکوں میں ۴۵ ہزار میل کا سفر کیا) مسجد سے مستعفی ہونے سے پہلے میں یہ چاہتا تھا کہ مسجد اور اسلامک سنٹر مستقل طور پر مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہی رہے بورڈ آف ٹرسٹیز میں صرف دو یا تین مرزائی ممبر تھے۔ لیکن وہ بہت سرگرم اور با اثر لوگ تھے۔ وہ اس کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ میرے بعد مرزائی امام ہی مقرر کیا جائے۔

مسلمان ممبروں سے طویل گفتگو اور مشورہ کے بعد میں نے انگلینڈ اور آئرلینڈ کی تمام مسلم انجمنوں کا ایک جلسہ ۲۰ جولائی ۱۹۶۸ء کو مشرقی لندن کی مسجد میں طلب کیا جس میں ایک سو سے زائد نمائندوں نے شرکت کی میں نے انہیں صورتِ حال سے آگاہ کیا اور بتلایا کہ میں سال کے آخر میں واپس جانے والا ہوں اور مرزائی اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ ان کا اپنا امام مقرر کر دیا جائے۔

اس رسہ کشی میں ایک قانونی نکتہ بہت اہم تھا جس سے ہمیں بہت مدد ملی، ٹرسٹ کی رو سے مرزائی شروع سے اس مسجد کے کرایہ دار کی حیثیت رکھتے تھے جسے کسی وقت ختم کیا جا سکتا تھا۔ یہ بات عام طور پر لوگوں کو معلوم نہیں تھی اور میں نے ان کی توجہ اس طرف دلائی۔

اس جلسہ میں متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا گیا کہ ”ووکنگ مسجد کی ایک تشکیل نو کمیٹی“ قائم کی جائے مسجد کا چارج اعلانیہ مجمع کے سامنے لے لے اور میرے جانے کے بعد عارضی طور پر ایک مسلمان کو امام مقرر

یہ بھی طے کیا گیا کہ ٹرسٹ سے کہا جائے کہ وہ اپنے مرزائی ممبروں کی رکنیت ختم کردے اور آئندہ کسی مرزائی کو ممبر نہ بنائے۔ اس طرح نومبر ۱۹۶۹ء میں میں نے مسجد کا چارج دیا اور اپنے دورہ کے لئے انگلینڈ سے روانہ ہوا۔ میں یہاں یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں اپنے مقصد میں ہرگز کامیاب نہ ہوتا اگر بہت سے مسلمان دوستوں نے میری مدد نہ کی ہوتی۔ ان سب کے نام گنانا تو ممکن نہیں ہے لیکن تین اشخاص کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے ان میں مرحوم مولانا لعل حسین اختر ختم نبوت کی ایک بین الاقوامی انجمن کے صدر تھے میری طرح انہیں بھی اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں مرزائیت کا ذاتی تجربہ تھا۔ دوسرے حاجی محمد اشرف گوندل تھے جو بین الاقوامی تبلیغی مشن تھے اور تیسرے جناب ایم ایم لودھی تھے جنہوں نے ووکنگ کی تشکیل نو کمیٹی قائم کرنے کیلئے ان تھک محنت کی تھی۔

آخر میں میں اپنے مسلمان بھائیوں سے قادیانیوں کے خلاف زندگی بھر کی جدوجہد کی روشنی میں چند باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں تاکہ مسلمان زعماء اور حکومتیں اس پر گہرائی سے غور کرسکیں۔ مرزائی مذہب اب اسلام کیلئے کوئی خطرہ نہیں ہے کیونکہ اس کے بدنما چہرہ سے نقاب الگ کی جاچکی ہے۔ اسلام اس قسم کی ارتدادی تحریکوں کا مقابلہ کرنے کی پوری قوت رکھتا ہے لیکن ایک نیا خطرہ یہ ہے کہ قادیانی لیڈروں نے بین الاقوامی سیاست پر مسلم دشمن طاقتوں کو اپنی خدمات سپرد کرنا شروع کردی ہیں۔ سازش اور تخریبی کارروائی اس وقت بہت منفعت بخش پیشہ بن چکا ہے اور مختلف ممالک میں تبلیغ اسلام کے پردہ میں اپنے آدمی مقرر کرنا بہت آسان ہے۔

غیر مسلم عام طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ ہم مرزائیت سے محض مذہبی تعصب کی بناء پر اختلاف رکھتے ہیں ان کیلئے یہ سمجھنا مشکل ہے کہ یہ تحریک اسلام دشمن طاقتوں کی حلیف اور مسلم ممالک میں ان طاقتوں کے سیاسی اور اقتصادی مفاد کی نگہبان بن چکی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی اہم ہے اور جس کا علم سب مسلمانوں کو ہونا چاہئے کہ قادیانیوں کی اخلاق سے بے راہ روی سے مسلم نوجوانوں کے اخلاق پر بھی برا اثر پڑ رہا ہے۔

(بشکریہ "ذکر و فکر" نئی دہلی)

محمد اسحٰق صدیقی
A-5، [illegible] تالاب لکھنؤ

حیدرآباد کا ایک نادر روزگار کتب خانہ

ماہ جون ۱۹۸۲ء کے آخری ہفتے میں سیر و سیاحت کا شوق مجھے حیدرآباد (دکن) لے گیا۔ اپنے دس روزہ قیام میں میں نے وہاں کیا دیکھا، کن لوگوں سے ملا اور کن چیزوں سے متاثر ہوا، اس کے اظہار کے لئے ایک طویل مضمون کی ضرورت ہے۔ فی الحال میں آپ کو ایک ایسے اردو کتب خانے کی سیر کراتا ہوں جسے ایک گمنام انسان نے تقریباً چالیس سال کی مدت میں اپنا پیٹ کاٹ کر ایک ایک پیسہ جمع کر کے بنایا اور جس سے آج نہ صرف ہندوستان بلکہ دیگر ممالک کے بھی اردو ادیب اور محقق مستفید ہو رہے ہیں۔

مجھے اس کتب خانے کا کوئی علم نہ تھا اور شائد میں اسے دیکھنے کبھی نہ جاتا، اگر میرے عزیز دوست اور کرم فرما جناب اسلم محمود صاحب نے اسے دیکھنے کی تاکید نہ کی ہوتی۔ میری آسانی کے لئے انہوں نے اپنے بزرگ دوست ڈاکٹر حسن الدین احمد صاحب کا پتہ بھی عنایت فرمایا تھا اور چلتے چلتے کہا تھا کہ "میں انہیں خط لکھے دیتا ہوں، آپ چاہیں تو ان کے وہاں ٹھہر بھی سکتے ہیں۔ ان کا مکان بہت بڑا ہے اور وہ بہت اچھے انسان ہیں۔ ان کے مکان کے نزدیک ہی عبدالصمد صاحب کا کتب خانہ ہے جہاں اردو رسائل کا بہترین ذخیرہ ہے وہاں ضرور جائیے گا۔"

اس سے پہلے کہ میں آپ کو کتب خانے کی سیر کراؤں، میں اسلم محمود صاحب اور ڈاکٹر حسن الدین احمد کا ذکر ذرا تفصیل کے ساتھ ضروری سمجھتا ہوں، کیونکہ ان کی بدولت ہی میری اس کتب خانے تک رسائی ممکن ہوئی۔ اسلم محمود صاحب ایڈیشنل ڈویژنل ریلوے منیجر ہیں اور اپنے عہدے کی مصروفیت کے باوجود انگریزی اور اردو ادب کا برابر مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ لیکن وہ مانگے کی کتابوں کے قائل نہیں۔ وہ کتابیں خریداری پر بے دریغ [illegible] کرتے ہیں اور ان کے نجی کتب خانے میں ہزاروں کتابیں ہیں جن میں سے کچھ نادر و نایاب [illegible] اور بیشتر جدید ترین۔ شعر و ادب کے علاوہ موصوف کو فنون لطیفہ سے بھی خاص شغف ہے۔ اسی لئے ان کے ذخیرہ کتب میں اسلامی خطاطی، مشرقی اور مغربی مصوری اور فوٹو گرافی سے متعلق

ایک سے ایک خوبصورت کتابیں موجود ہیں ۔ وہ برابر کتابوں کی تلاش میں رہتے ہیں ۔ بلا مبالغہ شاید ہی کوئی ایسا دن ہو جب انہیں کوئی نہ کوئی کتاب کہیں نہ کہیں سے دستیاب نہ ہوتی ہو ۔ انگریزی اور اردو کے کتب فروش انہیں اپنا بہترین گاہک مانتے ہیں اور بڑے بڑے ناشر اپنی فہرست مطبوعات ماہ بہ ماہ بھیجتے ہیں لیکن ان کے کتب خانے تک ہر کس و ناکس کی رسائی ناممکن ہے ۔ وہ اسے اپنا "حرم" سمجھتے ہیں جہاں نامحرموں کا کیا کام ۔

ڈاکٹر حسن الدین احمد صاحب نومبر ۱۹۸۱ء میں وزارت قانون کے شعبہ اوقاف میں ڈپٹی سکریٹری کے عہدے سے سبکدوش ہوئے ۔ (یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ اسلم محمود صاحب بھی چند سال اس عہدے پر فائز رہ چکے ہیں) اپنی خاندانی روایات کے مطابق وہ علم و ادب کی مسلسل خدمت کرتے رہے ہیں ۔ وہ "ساز مغرب" کے مصنف ہیں جو دس جلدوں میں ہے ۔ اس میں انگریزی شاعری کے ایک ہزار منظوم ترجمے ہیں (ناشر ولا اکیڈمی سن اشاعت ۱۹۷۶ء تا ۱۹۸۱ء) انہوں نے ۱۹۸۴ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی سے پی ایچ ڈی کیا ۔ ان کی تحقیقات کا موضوع تھا " انگریزی شاعری کے منظوم ترجموں کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ " ان کا علمی مقالہ اسی نام سے ۱۹۸۴ء میں ولا اکیڈمی (حیدرآباد نے شائع کیا) ہے "اردو الفاظ شماری" ایک دوسرا تحقیقی کارنامہ ہے اور اسی نہج کی ایک زیادہ کارآمد اور مقبول عام کتاب "قرآن فہمی" ہے (دو حصے) ہندو مذہب اور فلسفے پر بھی ان کی گہری نظر ہے جس کا ثبوت ان کا اردو ترجمہ "شریمد بھگوت گیتا" ہے ۔ بزم (دیوانی غالب کا مجموعہ) ادبی شاہکار ہے اور "فطری علاج" انسانی ہمدردی کا ثبوت ۔ بلا مبالغہ وہ قدیم و جدید تمدن کے امتزاج کا حیرت انگیز نمونہ ہیں ۔

ڈاکٹر حسن الدین احمد صاحب کے والد نواب دین یار جنگ بہادر نظام کے دور حکومت میں انسپکٹر جنرل پولیس تھے ۔ ان کی سوانح حیات کے لئے دیکھئے " دین یار جنگ " زندگی اور کام " مصنفہ برقی موسوی (ناشر ولا اکیڈمی) عزیز باغ ، عزیز جنگ روڈ ۔ سلطان پورہ حیدرآباد ۵۰۰۰۲۴
ولا اکیڈمی حسن الدین احمد صاحب کے رہائشی مکان میں ہے ۔ اکیڈمی کا نام ان کے دادا شمس العلماء نواب عزیز جنگ ولا کے نام پر ہے ۔ نواب عزیز جنگ [illegible] انہوں نے فارسی کا ایک [illegible]
داستان [illegible]

زبان میں دوسری اہم تصانیف ہیں ۔ ان کے علاوہ قانون مالگزاری کی تدوین کی تھی ۔
بظاہر حسن الدین احمد صاحب کے بارے میں یہ تفصیلات غیر ضروری معلوم ہوں گی لیکن چونکہ موصوف کا عبدالصمد صاحب کے کتب خانے سے خاص تعلق ہے اس لئے میں نے ان کا ذکر تفصیل سے کرنا ضروری سمجھا ۔
۴ / اپریل کو میں نے اپنی قیام گاہ سمتا لاج معظم جاہی مارکٹ سے انہیں ٹیلی فون کیا ۔ میرے پروگرام کا لحاظ کرتے ہوئے انہوں نے ½ ۲ بجے ملنے کا وقت مقرر فرمایا اور میں سالار جنگ میوزیم کو تیسری بار دیکھنے کے بعد ان سے ملنے کے لئے وقت کے مطابق روانہ ہوا ۔ ایسے اعلیٰ نسب والا حسب ادیب اور عالم سے ملنا میرے لئے بڑے فخر کی بات تھی ۔ انہیں اور ان کے مکان کو دیکھ کر مجھے نظام کے زمانے کے طبقۂ امراء کی شان و شوکت کا اندازہ ہوا ۔
صدر دروازے میں داخل ہونے کے بعد ایک خوش نما باغ نظر آتا ہے (اسی کا نام عزیز باغ ہے) جسکی دونوں طرف متعدد کمرے ہیں (جن میں ولا اکیڈمی کی مطبوعات کا ذخیرہ ہے ۔ پہلے ان میں نواب عزیز جنگ کا پریس تھا جہاں وہ اپنی کتابیں طبع کراتے تھے) سامنے ایک شاندار عمارت نظر آتی ہے جس کا کچھ حصہ دو منزلہ ہے ۔ اسی عمارت کے ڈرائینگ روم میں حسن الدین احمد صاحب سے ملاقات ہوئی ۔ وہ نہایت اخلاق سے پیش آئے ' چائے بسکٹ کی رسمی تواضع کے درمیان ہماری گفتگو کے خاص موضوع تھے اردو الفاظ کی تاریخ اور ہندوستان کے پیغمبر ۔ موصوف نے مجھے اپنا انگریزی زبان میں ایک تحقیقی مقالہ دکھایا جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ قرآن مجید میں ذوالکفل کے نام سے جس ہستی کا ذکر ہے (سورہ ۲۱ آیت ۸۵ اور سورہ ۳۸ آیت ۴۸) اس سے مراد گوتم بدھ ہیں جو کپل وستو کے رہنے والے تھے عربی کا لفظ "کفل" "کپل" کی بدلی ہوئی صورت ہے ۔ ان کے خیال میں مہاتما بدھ ، مہابیر ، رام اور کرشن ہندوستان کے پیغمبر تھے ۔ وہ رامچندر جی پر ایک لکچر دینے وشاکھا پٹنم جانے والے تھے ۔ انہوں نے اپنے مقالے کی ایک ٹائپ شدہ کاپی "اپنی کتاب "بزم" "قرآن فہمی دوسرا حصہ" انگریزی شاعری کے منظوم اردو ترجموں کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ" اور انگریزی کے تین کتابچے عنایت کئے جو اسلامیات سے متعلق تھے ۔
کمرے میں ایک نہایت بارعب اور وجیہ شخص کی تصویر لگی ہوئی تھی جسے دیکھ کر یہ جاننے کا اشتیاق پیدا ہوا کہ یہ کس کی تصویر ہے ۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ان کے دادا مرحوم شمس العلماء نواب عزیز جنگ ولا کی ہے جنھوں نے موجودہ عمارت بنوائی تھی ۔ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں وہ جید عالم تھے ۔ انہوں نے

اپنی ساری کتابیں خود ہی شائع کرائی تھیں۔ ان کی تصانیف ایک خوش نما کٹری کی الماری میں سجی ہوئی تھیں جو پہلے کمرے کے شروع میں رکھی ہیں۔ اس لئے اندر داخل ہونے پر پہلی نظر اسی پر پڑتی ہے۔ حسن الدین احمد صاحب نے میری درخواست پر ان کی فارسی لغت کی ایک جلد باہر نکال کر دکھائی۔ الماری کے بائیں طرف دروازے کے پاس ایک چھوٹی سی میز پر نئی وضع کے ٹیلی فون کے پہلو میں پرانی وضع کا ایک چاندی کا ٹیلیفون رکھا ہوا تھا جو خاندانی شان و شوکت کا مظہر تھا۔ رخصت ہونے سے پہلے میں نے عبدالصمد صاحب کا کتب خانہ دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ فرمایا۔

" قریب ہی ہے۔ میں ایک ضرورت سے باہر جا رہا ہوں ایک آدمی ساتھ کئے دیتا ہوں۔ وہ آپ کو وہاں تک پہونچا دے گا۔

صمد صاحب کا کتب خانہ عزیز جنگ روڈ پر باغ نور خاں کی جس عمارت میں ہے اس کا نام بیت المدینہ ہے۔ یہ عمارت وقف کی ہے جسے حسن الدین احمد صاحب کے چچا نواب غازی یار جنگ (جج ہائی کورٹ) نے قائم کیا تھا۔ یہ عمارت ۱۹۸۳ء میں تعمیر ہوئی تھی۔ پانچ بجے کے قریب میں وہاں پہنچ گیا۔ سیڑھیاں چڑھکر جب پہلی منزل پر پہونچا تو دیکھا سلاخوں والے آہنی دروازے پر تالا پڑا ہے۔ جو شخص میرے ساتھ آیا تھا اس نے دروازہ کھٹکھٹایا قمیص پاجامے میں ملبوس ایک دوہرے بدن کے سانولے انسان نے تالا کھولا۔ میں سمجھ گیا کہ یہی صمد صاحب ہیں میں نے اپنے ہمراہ آئے رہبر کو رخصت کیا اور وہ مجھے اپنے کمرے میں لے گئے۔ ایک چھوٹی میز کے آمنے سامنے بیٹھنے کے بعد میں نے اپنا نام بتایا اور کہا " لکھنو سے آرہا ہوں" فن تحریر کی تاریخ" کا مصنف ہوں۔"

فوراً بولے: تو پھر یوں کہئے کہ آپ نگار کے اسحاق صاحب ہیں کیونکہ کتاب سے پہلے آپ کے مضامین اسی عنوان سے نگار میں شائع ہوتے تھے۔

میں نے کہا۔ آپ بجا فرماتے ہیں۔ آپ کا حافظہ قابل رشک ہے" میں نے دیکھا کہ سامنے دیوار پر دو تصویریں لگی ہوئی ہیں۔ جن میں سے ایک حسن الدین احمد صاحب کی ہے اور دوسری ان کے چچا نواب غازی یار جنگ کا۔ صمد صاحب کی میز اردو کتابوں اور رسالوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ اس کے کونے میں بہت سے انڈیکس کارڈ رکھے ہوئے تھے۔ جلد ہی بے تکلفی سے باتیں کرنے لگے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے کتب خانہ کا سیر کرائی کئی کمروں میں لے گئے۔ بیشتر کتابیں اور رسالے فرش پر رکھے نظر آئے۔ کچھ

ایک پر قرینے سے آراستہ تھے۔ معلوم ہوا کہ کتابوں اور رسالوں کی درجہ بندی اور ترتیب کا کام جاری ہے۔ ایک کمرے میں ویکیوم کلینر نظر آیا۔ میں نے کہا:

"آپ کے پاس ویکیوم کلینر بھی ہے؟"

فرمایا: "اس کے بغیر کام نہیں چلتا۔ گرد بہت ہے۔"

ایک دوسرے کمرے میں ایک صاحب نظر آئے جو فرش پر بیٹھے قلم کاغذ لئے رسالوں کی فہرست تیار کر رہے تھے۔ معلوم ہوا وہ اسی کام کے لئے ملازم ہیں۔ پہلے وہ کتب و رسائل کا معائنہ کرنے کے بعد ان کی فہرستیں تیار کرتے ہیں اور پھر صمد صاحب ان فہرستوں کی مدد سے انڈیکس کارڈ بناتے ہیں یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ رسالوں اور کتابوں کی مرمت اور جلد سازی کے لئے ایک دفتری ملازم بھی ہے۔

باتیں کرتے ہوئے ایک اور کمرے میں لے گئے جہاں ان کا کھانا پکانے کا سامان رکھا ہوا تھا۔ خود اسٹوو پر چائے بنا کر پلائی اور ایک بڑا سا ڈبہ کھول کر سامنے رکھا جو نہایت لذیذ میٹھے بسکٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے دریافت کیا:

کیا آپ خود کھانا پکاتے ہیں؟

بولے "جی ہاں!"

پوچھا۔ کیا آپ کے بیوی بچے نہیں ہیں؟"

بولے: بیوی امریکہ میں ہیں۔ کوئی بچہ نہیں ہے"

یہ بھی معلوم ہوا کہ صمد صاحب کی ایک بہن بھی ہیں جو امریکا کی شہریت رکھتی ہیں۔

اس کے بعد ان کے کتب خانے کے بارے میں باتیں شروع ہوئیں۔ انہوں نے بتایا کہ ان کتب خانے میں ۹۰۰ مختلف ناموں کے تقریباً پچاس ہزار اردو رسالے موجود ہیں جن رسالوں کی مکمل فائلیں موجود ہیں ان میں اردوے معلیٰ، تہذیب الاخلاق، دل گداز، الہلال، البلاغ، نگار، زمانہ، ہمایوں، ساقی، نیرنگ خیال وغیرہ نہایت بیش قیمت ہیں۔

انہوں نے یہ بھی بتایا کہ ان کے کتب خانے میں رسالوں کے علاوہ تقریباً پندرہ ہزار کتابیں ہیں جن میں سے ۳۵۰۰ نایاب یا کمیاب ہیں۔ مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ ان کے کتب خانے میں تقریباً ۳۰۰ سفرنامے ہیں۔ اتنے ہی تذکرے ہیں، ۱۶۸ خودنوشت سوانح عمریاں ہیں، ۱۹۶ اسلامی خاکے ہیں

مکتوبات کے مجموعوں کی تعداد ۸۷ ہے۔ مشاہیر کے بارے میں ۶۰ '۷۰ کتابیں ہیں' فن صحافت پر ۲۳' ۲۴ کتابیں' ڈھائی سو کے قریب طنز و مزاح کی کتابیں ہیں۔ شیکسپیر کے ترجمے ۲۳ کے قریب ہیں۔ پچاس لغات اور بے شمار کتابچے ہیں۔

ان کی گفتگو سے مجھے اندازہ ہوا کہ اردو زبان میں مختلف موضوعات پر کتنا زیادہ کام ہو چکا ہے۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ ان کے کتب خانے میں غالب کے بارے میں رسالوں کے تقریباً ۵۰ خاص نمبر ہیں۔ غالب کے کلام کی ۵۲ شرحیں ہیں۔ اقبال کے بارے میں تقریباً ۲۵۰ کتابیں ہیں۔ افسوس کہ وقت کی کمی کی وجہ سے میں کوئی بھی کتاب نہ دیکھ سکا۔

صمد صاحب سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اردو زبان میں سائنس پر ہزاروں کتابیں چھپ چکی ہیں۔ پہلے رڑکی انجینئرنگ کالج کا پورا نصاب اردو میں تھا۔ غالباً اردو میں سب سے پرانی سائنس کی کتاب "بحر حکمت" ہے جو ۱۲۱۴ ہجری میں یعنی اب سے تقریباً دو سو سال پہلے چھپی تھی اور اسٹیم انجن کے بارے میں ہے۔ ان کے کتب خانے میں ہندو مذہب کی مقدس کتابوں کے اردو ترجمے بھی ہیں اور عیسائی مذہب کے بارے میں تبلیغی ادب بھی۔ ان کے علاوہ عربی' فارسی کتابیں اور پانچ سو کے قریب قلمی نسخے ہیں۔ یہی نہیں ہندوستان اور پاکستان کے سب ہی تاجران کتب اور ناشرین کی شائع کردہ فہرست کتب بھی موجود ہیں۔ سب سے پرانی فہرست ۱۸۸۲ء کی ہے۔

مجھ سے نہ رہا گیا اور پوچھا "آپ نے اندازاً اب تک کتنا روپیہ اردو کتابوں اور رسالوں کی خریداری میں صرف کیا ہوگا۔؟

فرمایا "ساڑھے تین لاکھ" (اس وقت بلاشبہ ان کے ذخیرے کی قیمت اس کی دس گنا ہوگی) فوراً یہ خیال پیدا ہوا کہ اتنا روپیہ کہاں سے آیا اور ان کا ذریعہ آمدنی کیا ہے۔؟

یہاں سے ہماری گفتگو کا رخ کتابوں اور رسالوں سے خود ان کی ذات کی طرف مڑ گیا۔ جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ ان کا ذریعہ معاش موٹر کاروں کی مرمت ہے تو میں دنگ رہ گیا اور سوچنے لگا کہ موٹروں کی مرمت سے اتنا روپیہ کیسے فراہم ہوا کہ وہ ایسا نادر روزگار کتب خانہ بنا سکے۔

دریافت کرنے پر بتایا کہ ان کا پورا نام محمد عبدالصمد خاں ہے ۱۹۱۰ء میں پیدا ہوئے (بمقام پربھنی جہاں اختر جہاں بلقیس سروس میں تھے) جامعہ ملیہ دہلی میں ۱۹۲۵ء سے ۱۹۳۲ء تک تعلیم پائی اور علیگڑھ

ودستی سے میٹرک پاس کیا۔ ان کے والد حامد علی خاں حیدرآباد (دکن) میں غالباً محکمہ پولیس میں ملازم تھے
۱۹۶۲ء میں موضع جشانہ نگر ضلع فتح پور (یو پی) میں انتقال ہوا۔

محمد صاحب کو لڑکپن سے مشینوں میں دلچسپی تھی، خاص کر موٹروں میں، اسی لئے بہت جلد ہی ایک ماہر موٹر
مکینک بن گئے۔ ۱۹۵۵ء سے مرمت اور پرانی موٹروں کی مرمت کرکے انھیں فروخت کرنے کا کام شروع
کیا۔ ان کی ورکشاپ حیدرآباد اور ضلع نظام آباد میں تھی۔ انھیں کتابیں اور رسالے جمع کرنے کا بھی شوق تھا
سکول میں جو کتابیں [illegible] تھیں وہ موجودہ کتب خانے کی بنیاد بن گئیں اور آج تک محفوظ ہیں۔
جیسے جیسے آمدنی بڑھتی گئی کم سے کم خرچ پر گزارہ کرکے زیادہ سے زیادہ روپیہ کتابوں اور رسالوں کی خریداری
پر خرچ کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ایک قابل فخر کتب خانہ بن گیا۔

چند سال کلکتہ میرین انجینیئرنگ کمپنی کے فلاٹی ایشن ڈویژن میں ملازمت کرنے کا موقع ملا۔ اپنی دن
رات کی محنت سے کمپنی کو بہت فائدہ پہنچایا۔ پانچ چھ ہزار روپیہ ماہانہ تنخواہ ملتی تھی۔ دو دو موٹریں انکے
آنے اور جانے کے لئے ہر وقت تیار رہتی تھیں۔ سینکڑوں مزدوروں کی نگرانی کرتے تھے اور کلکتہ ایسے شہر
میں انھیں شکایت کا موقع نہ دیا اور اتنا مطمئن رکھا کہ ان کی ملازمت کے دوران مزدوروں کی یونین بننے اور
ہڑتال کی نوبت نہ آئی۔ پھر یہ سوچ کر ملازمت کی وجہ سے وہ اپنی کتابوں اور رسالوں کی ٹھیک سے دیکھ بھال
نہیں کرسکتے۔ دیمک لگنے اور بارش میں برباد ہونے کا اندیشہ ہے، ملازمت چھوڑدی اور ستمبر ۱۹۸۶ء میں
اپنا کتب خانہ ٹیٹا گڑھ (کلکتہ) سے لیکر حیدرآباد چلے آئے۔

پہلے ان کا کتب خانہ پبلک گارڈنس کے سامنے والی گلی کی پرانی عمارت فیض بلڈنگ میں تھا۔ پھر اکتوبر ۱۹۸۸ء
میں بیت المدینہ میں منتقل ہوگیا۔ یہ وقف کی عمارت ہے، جس کی پہلی منزل کے پانچ کمرے اور دو بڑے
ہال کتب خانے کیلئے کرائے پر حاصل کئے گئے ہیں۔ محمد صاحب نے مجھے بتایا کہ کرائے کی رقم (برائے نام)
حسن الدین احمد صاحب مقامی چندوں اور عطیوں سے بہ وقت تمام فراہم کرتے ہیں۔ کتب خانے کا مکمل پتہ
یہ ہے۔ اردو ریسرچ سنٹر

بیت المدینہ، عزیز جنگ روڈ، نورخاں بازار

حیدرآباد ـــ ۵۰۰۰۲۴

میں نے دریافت کیا کہ آپ نے کتب خانے کا نام اپنے نام پر کیوں نہ رکھا۔؟ خدا بخش لائبریری پٹنہ،

رضا لائبریری رامپور کی طرح ۔؟

فرمایا: "ڈاکٹر گیان چند جین اور دیگر احباب کی رائے سے یہ نام رکھا گیا ۔ اپنے نام کی شہرت کا کوئی شوق نہیں ۔"

اردو ریسرچ سنٹر نے دجو رجسٹرڈ ہے) چند اہم کتابیں بھی شائع کی ہیں جن کی تفصیل یہ ہے ۔

سلسلہ مطبوعات نمبر ۱ : نقرات سرسید ۔ سرسید احمد خاں کی ۱۸۵۸ء کی مولفہ نایاب مذہبی کتاب ۔ مرتبہ حکیم محمد حسین خاں شفا صفحات ۱۶، ۱۹۸۸ء قیمت ۳ روپے ۔

سلسلہ مطبوعات نمبر ۲ : ابتدائی کلام اقبال بہ ترتیب مہ و سال ۔ ڈاکٹر گیان چند جین، پروفیسر اردو یونیورسٹی آف حیدرآباد صفحات ۶۰۴ + ۱۶، ۱۹۸۸ء قیمت /۱۲۵ روپے

محمد صاحب نے ازراہ کرم مجھے دونوں کتابیں عنایت کیں ۔ ان کے علاوہ ماہنامہ "شاداب" (حیدرآباد) کا ستمبر ۱۹۸۷ء کا شمارہ بھی عنایت فرمایا جس میں "وہ مکینک صاحب" کے عنوان سے رضا علی عابدی صاحب کا ایک مضمون محمد صاحب کے بارے میں ہے ۔

مضمون کے پہلے صفحہ کے نیچے بی ۔ بی ۔ سی لندن اور آخری صفحہ پر "ماخوذ" لکھا ہے لیکن مکمل حوالہ نہیں دیا ۔ لکھنو واپس آنے کے بعد میں اپنے کرم فرما اور دوست ڈاکٹر نیر مسعود رضوی سے ملا اور حیدرآباد کے اس اہم کتب خانے اور اس کے حیرت انگیز بانی کا حال بیان کیا ۔ موصوف نے فرمایا کہ وہ محمد صاحب کے بارے میں مذکورہ بالا مضمون پڑھ چکے ہیں اور انہوں نے حوالے کے لئے اصل کتاب لاکر دکھائی جسکی تفصیل یہ ہے ۔

کتب خانہ : پاکستان اور ہندوستان میں ہماری قدیم کتابیں
کہاں کہاں اور کس حال میں
بی بی سی لندن کی اردو سروس کے سلسلے وار
پروگرام "کتب خانہ" پر مبنی دستاویز
رضا علی عابدی، سعد پبلی کیشنز، کراچی ۱۹۸۵ء

رضا علی عابدی صاحب نے اپنے مقالے کی ابتداء اتنے دلکش انداز میں کی ہے کہ جی چاہتا ہے پورا اقتباس نقل کردوں

پرانی داستانوں میں ہم نے ایسے قصے بارہا پڑھے ہیں جن میں لوگ اندھیرے غاروں اور سرنگوں میں چلتے گئے، چلتے گئے - اور اچانک ایک چمکتے جگمگاتے محل میں نکلے جس کے طاقوں میں ہیروں کے نیلم، پکھراج اور زمرد کے اتنے ڈھیر لگے تھے کہ ہوا کے ذرا سے جھونکے سے بھی یہ ہیرے اور موتی فرش پر یوں گرنے لگتے تھے جیسے بہت بڑے نقارے پر بارش کی موٹی موٹی بوندوں کے ساتھ چھوٹے بڑے اولے بھی گرا کرتے ہوں۔

کچھ ایسا ہی منظر ہم نے دکن کی سطح مرتفع پر آباد گنبدوں، میناروں، فصیلوں، محرابوں، باغوں اور فواروں کے شہر حیدرآباد میں بھی دیکھا۔

باغ عامہ کے سامنے ایک گلی میں پہنچ کر ہم ایک ٹوٹی پھوٹی ادھوری اور پرانی عمارت میں داخل ہوئے۔ بالٹیوں کے بھرنے والی ٹونٹیوں سے ٹکراتے اور ربر کے پائپ کو پھلانگتے، بوسیدہ اور پرپیچ سیڑھیوں پر چڑھتے، نیچی چھتوں سے ٹکرا جانے کے خوف سے جھکے جھکے ہم اس ادھی بچی آدھی کچی عمارت کی چھت پر پہنچے اور وہاں بعد میں تعمیر کئے گئے نسبتاً نئے اور کشادہ کمرے میں داخل ہوکے تو کیا دیکھتے ہیں کہ مچانوں پر اور طاقوں میں کتابیں ہی کتابیں چنی ہیں۔ رسالوں، دستاویزوں، قلمی نسخوں، بھاری بھرکم جلدوں اور فنی مطبوعات کے وہاں ڈھیر لگے ہیں۔ اور ان کو چن چن کر سجانے والا ایک شخص سہما بیٹھا ہے کہ کہیں ہوا کا کوئی ذرا سا جھونکا انہیں اڑا نہ لے جائے۔ یہ اسی سہمے ہوئے شخص کی داستان ہے۔

محمد عبدالصمد خاں پیشے کے اعتبار سے موٹر مکینک تھے مگر ذوق کے اعتبار سے کتابوں کے شیدائی تھے۔ ہفتے بھر موٹروں کی مرمت کرتے تھے اور چھٹی والے دن نہ معلوم کہاں کہاں کی خاک چھان کر کتابیں جمع کیا کرتے تھے۔ آخر میں یہ ہوا کہ اس دوڑ میں زمانے کی تیز رفتار کاریں پیچھے رہ گئیں ــــ عبدالصمد خاں نے اپنا موٹر گیرج بند کیا اور اپنے کتب خانہ کو ریسرچ سنٹر کا نام دے کر اسے تحقیق اور مطالعے سے دلچسپی رکھنے والے عام لوگوں کیلئے کھولدیا،

اس تمہید سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ رضا علی عابدی صاحب، صمد صاحب کے کتب خانے سے کتنا زیادہ متاثر ہوئے۔

میرے دل پر صمد صاحب کے اس بیان کا، جسے رضا علی عابدی صاحب نے نقل کیا ہے بڑا

اثر پڑا کہ :

"کتابیں میں اس طرح خریدتا ہوں کہ میں اگر کھانا کھانے جا رہا ہوں اور راستے میں کوئی کتاب فروخت ہو رہی ہے تو سوچتا ہوں کہ چلو بھئی آج رات کا کھانا نہ سہی، کل ناشتہ ہی کر لیں گے یہ سوچ کر کتاب خرید لیتا ہوں۔

افسوس کہ فاضل مقالہ نگار نے یہ نہیں لکھا کہ انہوں نے صمد صاحب کا کتب خانہ کب دیکھا تھا۔ ظاہر ہے کہ اپنی کتاب کی اشاعت یعنی ۱۹۸۵ء سے قبل دیکھا ہوگا۔ اب اس کتب خانہ کا مقام بھی بدل گیا ہے، وہ باغ عامہ کے سامنے گلی میں نہیں ہے بلکہ عزیز جنگ روڈ پر ہے۔

یہاں یہ بتانا میرے لئے باعث مسرت ہے کہ رضا علی عابدی صاحب کی نہایت دلچسپ کتاب میں صفحات ۸۲ - ۸۱ پر ڈاکٹر نیر مسعود رضوی کے حوالے سے لکھنو کے محمد رشید صاحب اور اسلم محمود صاحب کے بھی کتب خانوں کا نیز میرے مختصر ذخیرۂ کتب کا بھی ذکر ہے۔ (رشید صاحب اسلم محمود صاحب کے اور میرے مخلص دوست ہیں۔ اگست ۱۹۸۲ء میں سول سکریٹریٹ کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے ہیں) اپنے کتب خانے کا ذکر (اردو میں بی۔ بی۔ سی لندن سے) دیکھ کر مجھے جو حیرت اور خوشی ہوئی وہ بیان سے باہر ہے۔ لیکن صمد صاحب کے بارے میں "وہ میکینک صاحب" کا عنوان دیکھ کر دکھ ہوا۔ آخر آدمی کو پیشے کے لحاظ سے ہندوستان میں کیوں جانا جاتا ہے؟

صمد صاحب سے معلوم ہوا کہ ان کے کتب خانے کے بارے میں بعض محققین کا خیال ہے کہ اللہ آباد کا تحقیقی کام اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک اس کتب خانے سے استفادہ نہ کیا جائے۔ انہوں نے بتایا کہ ان کے کتب خانے سے ہندوستان کے علاوہ پاکستان، انگلستان اور امریکہ کے ادیب و عالم بھی مستفید ہوتے رہے ہیں۔ بتیس لوگوں نے ان کی فراہم کردہ معلومات کی بنیاد پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی سند حاصل کی ہے۔ تحقیقات کے موجودہ پست معیار پر رائے زنی کرتے ہوئے کہا۔

"آج کل سب سے آسان کام پی۔ ایچ۔ ڈی کرنا ہے۔ بعض ایسے بھی محقق ہیں جو دس دس چیزوں کے بارے میں تحقیق میں لگے ہوئے ہیں حالانکہ تحقیق کا حق تب ہی ادا ہو سکتا ہے کہ زندگی میں کسی ایک موضوع پر تحقیق کی جائے۔"

صمد صاحب سے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ ضرورت مندوں کو کتابوں اور رسالوں کے مطلوبہ صفحات کی فوٹو

کاپیاں بھی فراہم کرتے ہیں اور اس کے لئے کوئی معاوضہ نہیں لیتے۔ کبھی کبھی وہ آنے والوں کو کاغذ اور قلم تک فراہم کرتے ہیں۔ خطوکتابت اور فوٹو کاپیاں تیار کرنے کا خرچ وہ خود برداشت کرتے ہیں!

ریسرچ سنٹر کے پاس نہ تو اپنا اردو ٹائپ رائٹر ہے اور نہ زیراکس مشین

میں نے دریافت کیا کہ آخر آپ کو ان خدمات کے صلے میں کیا ملتا ہے؟ فرمایا: گالیاں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ میں صرف میکنک ہوں مجھے کچھ آتا جاتا نہیں۔ صرف کتابیں اور رسالے جمع کر لئے ہیں۔" یہ جان کر مجھے بڑا دکھ ہوا۔ اب میں ناظرین سے یہ سوال کرتا ہوں کہ کیا وہ شخص جس کی نگرانی میں درجنوں طالب علم پی۔ ایچ۔ ڈی کی سند حاصل کریں اور وہ انہیں گائیڈ کرے اور جس کی معلومات سے یونیورسٹی کے بڑے بڑے پروفیسر صاحبان اور نامور محققین مستفید ہوں۔ کیا وہ اتنا بھی نہیں کر سکتے کہ اپنی یونیورسٹی سے انہیں ان کی خدمات کے صلے میں ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری دلوا دیں تاکہ میکنک صاحب "ایسے خطاب سے انہیں احساس کمتری میں مبتلا نہ کیا جا سکے۔ میکنک ہونا یا اپنی روزی روٹی کے لئے کوئی بھی پیشہ اختیار کرنا برا نہیں۔ سوال اس بات کا ہے کہ انسان اپنی ذات سے سماج کو کتنا فائدہ پہنچاتا ہے۔ محمد صاحب نے بلاشبہ اردو زبان کی جو بے لوث خدمت کی ہے اور اس کے قیمتی سرمائے کو تلف ہونے سے بچانے کیلئے جتنی تکلیفیں برداشت کی ہیں اس کا صلہ ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری ہی ہو سکتی ہے۔

میں نے محمد صاحب کو دل برداشتہ پایا۔ وہ اس لئے پریشان ہیں کہ کتابیں اور رسالے تو انہوں نے بہت جمع کر لئے ہیں لیکن ان کی خاطر خواہ حفاظت نہیں کر سکتے۔ اس کے لئے کئی ہزار روپے ماہوار کی مستقل ضرورت ہے۔ وہ وسائل کی کمی اردو والوں کی بے حسی اور زبانی جمع خرچ کے شاکی تھے۔

میں شام کو ساڑھے چھ بجے ان کے یہاں سے واپس ہوا اور راستے بھر یہ سوچتا رہا کہ محمد صاحب کے بعد ان کے کتب خانے کا کیا ہوگا۔؟ اسے کون چلائے گا؟ کیا دوسرے کتب خانوں کی طرح یہ کتب خانہ بھی دستبرد زمانہ کی نذر ہو جائے گا۔؟

کیا اچھا ہوتا اگر حیدرآباد کی اردو یونیورسٹی یا کوئی اردو اکیڈیمی یہ بیش بہا کتب خانہ معقول معاوضہ دے کر محمد صاحب سے خرید لیتی تاکہ آنے والی نسلیں اس سے مستفید ہوتی رہتیں۔

محمد اسحاق
ریٹائرڈ پرنسپل سلطان العلوم کالج آف حیدرآباد

مسلمان اور تعلیمی منصوبہ بندی

آدمی کا صحت مند رہنا اس لئے ضروری ہے کہ وہ اپنا بوجھ خود اپنے پیروں پر لاد کر لے جا سکے۔ جب
ہ بیمار پڑ جاتا ہے تو دوسروں پر بوجھ ہو جاتا ہے۔ خود چل نہیں سکتا' دوسروں کو سہارا دینا پڑتا ہے
ن طرح آدمی کا صحت مند رہنا نہ صرف اس کی شخصی ذمہ داری ہے بلکہ اخلاقی سماجی اور قومی ذمہ داری
ہے۔ اس کی بیماری نہ صرف گھر والوں کو پریشان رکھتی ہے بلکہ حکومت کو اس کے علاج معالجہ
یلئے قومی آمدنی سے روپیہ خرچ کرنا پڑتا ہے۔ یہی حال اس ان پڑھ اور ناخواندہ کا ہے جو نہ صرف
نقصان کرلیتا ہے' بلکہ خاندان' قوم وملت کیلئے بھی مسئلہ بن جاتا ہے۔

ملک کی آزادی کے بعد سے ہندوستانی مسلمان چار اہم مسائل سے دوچار ہیں۔ معاشی پسماندگی
یمی پسماندگی' مذہبی وثقافتی شناخت کی حفاظت اور برقراری' چوتھے جمہوری حکومت میں مسلمانوں
یر متناسب نمائندگی۔ ان سب مسائل کے حل کا جذبہ عام طور پر پایا جاتا ہے لیکن مسائل اور بھی
یدہ ہوتے جارہے ہیں ان سب میں اہم ترین بنیادی مسئلہ مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی ہے کیونکہ یہ
شاہ کلید ہے جو ہر مسئلے کے حل کے لئے کافی ہے جب تک مسلمانوں میں تعلیم عام نہ ہو تو وہ غربت
شکنجے سے نکل سکتے ہیں اور نہ ہی وہ اپنی زبان' مذہب اور ثقافت کی حفاظت کرسکتے ہیں اور نہ وہ
ری حکومت میں کسی حساب وکتاب میں آسکتے ہیں۔ پنڈت نہرو نے اپنی سوانح حیات میں کوئی ساٹھ
سال پہلے ہی لکھا ہے کہ مسلمانوں کا اصل مسئلہ عام تعلیم سے دوری ہے۔ سر سیدؒ کی علی گڑھ تعلیمی تحریک
ع ہوئے لیک سو برس سے زائد ہو گئے لیکن مسلمانوں میں عام تعلیم کا فیصد ۲۵ سے بڑھ نہ سکا۔ اگر
س حقیقت کو حسابی زبان میں وقت اور فاصلے کے لحاظ سے جانچیں تو معلوم ہوگا کہ ہم نے سو برس میں
م کے میدان میں صرف ۲ کلومیٹر کا فاصلہ طے کیا ہے۔ باقی فاصلہ طے کرنے کیلئے اس رفتار سے مزید
اسو برس لگیں گے۔ یہ کوئی شاعرانہ مبالغہ آرائی نہیں ہے۔

یہ بات بھی نہیں ہے کہ اس مسئلے سے ہمارے سیاسی لیڈر' مذہبی رہنما اور دانشور لاعلم ہیں۔ وہ اس

مسئلے سے اچھی طرح واقف ہیں لیکن آج تک نہ اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کیا گیا اور نہ کوئی عملی قدم اٹھایا گیا ہے۔ اس صورتحال کی چند وجوہات سمجھ میں آتی ہیں۔

۱۔ ایک زمانے سے ہمارا سماج ایک شدید غلطی میں مبتلا ہے کہ پڑھنا لکھنا خود بچے کی انفرادی ذمہ داری ہے۔ اگر کوئی بچہ پڑھ لکھ لیتا ہے تو خود اس کا ذاتی ذوق وشوق ہے یا پھر والدین کی توجہ کا سبب ہوسکتا ہے۔ یہ انفرادی ذمہ داری اس بچے پر ہے جو خود اپنی ذمہ داری سمجھنے کے قابل نہیں ہے افسوس ہے ماں باپ اس روایتی غلط فہمی سے نکلتے نہیں اور بچہ کا مستقبل تباہ کرکے رکھ دیتے ہیں۔

۲۔ اس کام کا پھیلاؤ وسیع اور دیرپا ہے۔ تعلیم میں جو وقت، پیسہ اور محنت صرف ہوتی ہے اسکے نتائج بہت دیر سے ظاہر ہوتے ہیں۔ یہ ایک طویل مدتی کام ہے جو دس تا پندرہ برس پر پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ ایسا کام مسلمانوں کے جذباتی مزاج سے میل نہیں کھاتا۔ وہ تو یہ چاہتے ہیں کام برائے نام ہو اور جلد سے اپنا نام ہو۔

یہی وجہ ہے کہ عام تعلیم (جنرل ایجوکیشن) کے پروگرام کا تذکرہ آپ نہ تو کسی ایجوکیشن سوسائٹی، مذہبی جماعت یا سیاسی جماعت کے دستور یا منشور میں پائیں گے اور اگر کہیں سے بھی تو وہ بھی برائے نام ہوگا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دوراندیشی

جنگ بدر میں اہل مکہ کے جو لوگ گرفتار ہوکر جنگی قیدیوں کی حیثیت سے سامنے لائے گئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی آزادی کی ایک شرط یہ رکھی کہ جو پڑھا لکھا ہو وہ دس صحابیوں کو پڑھنا لکھنا سکھادے۔ یہ پڑھانے والے مسلمان نہیں کافر تھے اور پڑھنے والے معمولی مسلمان نہیں صحابہ کرامؓ تھے اور اس کی اہمیت کو جاننے والے خود رسول کریمؐ تھے جو خود پڑھنا لکھنا نہیں جانتے تھے مگر عام بنیادی تعلیم کی اہمیت سے واقف تھے۔ بعد میں ان ہی صحابہ کرامؓ کی وجہ سے مدینے میں تعلیم عام ہوئی۔ قرآن کریم کی آیات کو لکھ لینا اور احادیث نبوی کے لفظ لفظ کو محفوظ کرلینا اسی کے بعد آسان ہوسکا۔

منصوبہ بندی کا عام مفہوم: عام طور پر منصوبہ بندی کے چار مراحل ہوتے ہیں۔ مقصد کا تعین جسکے لئے نقشے اور پلان بنانا ہے۔ دوسرے مرحلے پر ضروری وسائل اور سرمایہ مہیا کرنا، [illegible] مرحلے پر اصل کام شروع کرنا جس میں سارے عوامل ایک ساتھ حرکت میں آجاتے ہیں اور جب [illegible]

مکمل ہوجائے تو یہ جانچ پڑتال کرنا کہ آیا وقت پر کام ہوا کہ نہیں ۔ کہاں کہاں خامیاں رہ گئیں اور کس ڈھنگ اور معیار کا کام ہوا ہے ۔ یہ جانچ اس لئے ضروری ہے کہ آئندہ کام کرنے میں آسانیاں پیدا ہوں

<u>تعلیمی منصوبہ بندی کی ضرورت</u> : ہمیں جس منصوبہ کا خاکہ پیش کرنا ہے وہ جنرل ایجوکیشن پرائمری تا سکنڈری ایجوکیشن سے متعلق ہے ۔ دستور ہند کی دفعہ ۴۵ کے تحت اس کو "لازمی جبری تعلیم" کا نام دیا گیا ہے ۔ اسکا مقصد یہ ہیکہ ۶ تا ۱۴ سال کی عمر کے لڑکے اور لڑکیوں کو مفت ابتدائی تعلیم دینا تا کہ وہ ۱۴ سال کی عمر تک ساتویں جماعت کامیاب کرلیں ۔ گو یہ بات دستور ہند میں مرکزی اور ریاستی حکومتوں کی ذمہ داری بتلائی گئی ہے لیکن اب تک دو تین مرتبہ حکومت کو ناکامی ہو چکی ہے ۔ اب نیا ٹارگٹ ۱۹۹۵ء رکھا گیا ہے لیکن یہ بھی ناکام ہو جائے گا ۔

یہاں ایک بات کہنے کی یہ ہے کہ اگر ہم اپنے تعلیمی منصوبہ بندی کے پروگرام پر عمل کریں تو دستور ہند کی لازمی جبری تعلیم کی ایک اہم دفعہ کا مقصد پورا کرنے میں مسلمان بحیثیت قوم اپنا حصہ ادا کرسکیں گے ۔

۲ . ملک میں عام تعلیم کا اوسط ۳۷ فیصد ہے اور مسلمانوں کا ۲۵ فیصد کے لگ بھگ ہے ۔ مسلم عورتوں میں تعلیم کا فیصد برائے نام ہی ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر سو میں ۷۵ آدمی پڑھے لکھے نہیں ہیں ان پڑھے لکھے افراد میں غالب اکثریت ایسی ہے جن کی تعلیم چوتھی یا پانچویں جماعت تک ہوتی ہے یا پھر حرف شناس ہیں یا جو شد بد لکھنا پڑھنا جانتے ہیں ۔

۳ . اکثر شہروں میں مسلم ایجوکیشنل سوسائیٹز کی جانب سے کھولے گئے پیشہ وارانہ کالجوں میں اب یہ شکایت عام ہو چکی ہے ۔ حکومت کی جانب سے منظور شدہ نشستوں میں پچاس فیصد بھی مسلم امیدوار دستیاب نہیں ہوتے ۔ یہی حال جامعہ ہمدرد کے بعض کورسس کا ہے ۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ ایک جگہ پر ۲۰ نشستوں میں صرف ایک مسلم امیدوار شریک ہوسکا ۔

اس کا سبب عام طور پر یہ کہہ کر ٹال دیا جاتا ہے کہ مسلم طلباء میں مسابقت کا جذبہ نہیں ، ان کا معیار تعلیم پست ہے ، طلباء کو زیادہ فکر باہر جانے کی رہتی ہے ، عام بے حسی وغیرہ ۔ بے شک یہ تمام باتیں کسی حد تک صحیح ہیں لیکن ۹۰ فیصدی اصلی سبب ہماری پرائمری اور سکنڈری ایجوکیشن کی طرف سے لاپرواہی اور بے حسی ہے ۔ جب تک بنیادی پرائمری اور سکنڈری تعلیم کا پھیلاؤ وسیع نہ ہوگا ۔ یہ "تعلیمی اہرام" کبھی بلند نہیں ہوسکتا ۔

۴۔ ہندوستان کے مزاج کے مطابق جمہوریت اور سیکولرزم یہ دونوں ایسی نعمتیں ہیں کہ مسلمان پوری طرح ان سے استفادہ نہیں کر سکتے۔ اس کی وجہ بھی وہی تعلیم سے محرومی ہے۔ جمہوریت ایسا نظام حکومت ہے جس میں سب شہریوں کو اپنا حق پانے، اپنا حق منوانے، اپنا حق لینے کا حق ہے مگر اس کے لئے تعلیم اہم شرط ہے۔

تعلیمی منصوبہ بندی کے اہم خدوخال: یہ پہلا پنچ سالہ منصوبہ جنرل ایجوکیشن ساتویں جماعت تک تعلیم دلوانے کے پروگرام سے متعلق ہوگا۔ دس سال تک ہماری توجہ اسی ایک بنیادی مقصد پر مرکوز رہے اچھا ہے۔ البتہ خود طلباء اور والدین میٹرک تک طلباء کو لے جانا چاہیں گے جب انھیں اس کی اہمیت کا اندازہ ہو جائے گا۔

اس کام کے لئے منڈل، سیٹی، تعلقہ، ضلع اور ریاستی سطح پر جنرل ایجوکیشن کمیٹیاں قائم کی جا سکتی ہیں۔ چوں کہ تعلیم کا کام سب ہی کا ہے اس لئے مقامی سیاسی سماجی، مذہبی، ادبی انجمنوں کے کارکن آگے آسکتے ہیں۔ اس کمیٹی کا کام یہ ہوگا کہ بڑے شہروں میں محلہ واری اور چھوٹے قصبات میں پوری آبادی کا گھر گھر جاکر ایسے بچوں کا نام رجسٹر کرلیں جو کسی اسکول میں نہیں پڑھتے ہیں۔ یہ کام ایک مرتبہ کرلیں تو پھر یہی اعداد و شمار ۵ برس تک کام آسکتے ہیں۔ یہ کمیٹی کوشش کرے کہ ان بچوں کو جن کی عمریں ۵، ۶ سال ہو چکی ہیں کسی نہ کسی سرکاری مدرسے یا پھر خانگی مکتب میں شریک کروادیں۔ اسکے لئے والدین کو بھی سمجھانا بجھانا ہوگا۔ جب یہ بچے شریک ہو جائیں تو ڈراپ آوٹ* کو روکنے کے لئے ان پر مسلسل نگرانی کی ضرورت ہوگی۔ کیوں کہ مسلم طلباء اگر ۱۰۰ پہلی جماعت میں داخلہ لیں تو میٹرک تک پہونچنے تک صرف دس رہ جاتے ہیں۔ باقی درمیان ہی سے غائب ہو جاتے ہیں۔ اس کمیٹی کا کام یہ بھی ہو کہ مقامی جمع شدہ سرمائے سے غریب طلباء کی مدد کرے۔ شہر میں ایسے بہت سے ادارے ہیں۔

فوائد: ایسے مقامی افراد جنھیں اس کام سے دلچسپی ہوگی، ان کا تعلق گھر گھر سے ہو جائے گا جو مواد جمع کیا جائے گا وہ مردم شماری، مادری زبان، پڑھے لکھے لوگوں کا اوسط اور ان غریب لوگوں کے مسائل سے واقفیت پیدا ہو جائے گی۔ جن کی یہ کمیٹی رہنمائی کر سکتی ہے۔ اگر پانچ سال یہ کام مسلسل جاری رہے تو اس مقام یا قصبہ کی آبادی میں کوئی بچہ بغیر ابتدائی تعلیم کے نہ رہ جائے گا۔

اس اسکیم کی خوبی یہ ہے کہ یہ کام کسی سطح پر شروع کیا جاسکتا ہے۔ اگر کوئی ریاستی مرکزی تنظیم اس کام کو

سنجیدگی سے شروع کرے اور چھوٹے بڑے مقامات پر اس قسم کی جنرل ایجوکیشن کمیٹیاں قائم کرے تو بہت اچھا ہے۔ ورنہ اس کام کو شروع کرنے کے لئے آپ کو کسی سمینار، سمپوزیم یا کانفرنس کے رزولیوشن کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں۔ بس دو روپے کا رجسٹر خرید لیجئے۔ اٹھ کھڑے ہو جائیے۔ دیکھئے کام شروع ہو گیا۔

"بے شک یہ پہلا قدم ہی بڑے انقلاب کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔" (مولانا آزاد)

وہ بھولے ہوئے ہیں یہ عادت خدا کی۔
کہ حرکت میں ہوتی ہے برکت خدا کی۔ (حالی)

آپ شاید اس راز سے واقف نہیں کہ بھلائی کے چھوٹے چھوٹے کام سے بھلا آدمی کتنا بڑا ہو جاتا ہے۔ اور پھر یہ کام ایسا ہے جو ہر قسم کے سیاسی، مذہبی، سماجی، معاشی، معاشرتی، دینی و دنیوی کام کیلئے بنیاد کے پتھر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر یہ کام آج بھی نہ ہوا تو پھر ملت کی قسمت میں حرمان نصیبی کے سوا کچھ بھی نہیں۔

"عروضی اور فنی مسائل" نیز "اردو میں کلاسیکی تنقید" کے بعد

منفرد شاعر اور ممتاز نقاد پروفیسر عنوان چشتی کا تاریخ ساز کارنامہ

حرف برہنہ

جس میں اردو کے مشہور شاعروں اور ادیبوں کی ۲۱ اہم کتابوں کا تنقیدی و تحقیقی جائزہ لیا گیا ہے۔ اردو کے بڑے اور حق گو ادیبوں اور عالموں کی رائے ہے کہ آزادی کے بعد یہ کتاب شعری تنقید کی دنیا میں برہنہ گفتاری کی نئی روایت قائم کرتی ہے جس سے عام قاری سے لے کر شاعروں تک اور طلباء سے لیکر اساتذہ تک استفادہ کر سکتے ہیں۔ اچھی تنقید لکھنے اور اچھی شاعری کرنے کیلئے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے

براہ راست منگوا لیجیے
• اردو سماج - بی ۱۷/۱۱، جامعہ نگر - نئی دہلی ۲۵، • مکتبہ جامعہ جامعہ نگر - نئی دہلی ۲۵
• ادارہ خاتون مشرق، مٹیا محل، جامع مسجد دہلی - ۶

محمد منظور احمد
۱/۳۲۲-۱۳۰۷-۲۲۱
دارالشفاء، حیدرآباد (اے پی)

تعلیم کی وسعت، اغراض و مقاصد اور مطابقت

موجودہ دور میں تعلیم کی اہمیت ضرورت اور قدر و قیمت سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا، جہالت انسان اور انسانیت کی دشمن ہے۔ انسان کی متوازن اور معتدل اور پابند ضبط زندگی کے لئے اس کا زیور تعلیم سے آراستہ ہونا ضروری ہے۔ تعلیم ہی سے سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت پروان چڑھتی ہے۔ برے بھلے اور نیک و بد کی تمیز پیدا ہوتی ہے۔ زندگی کو صحیح ڈھنگ سے برتنے کا انداز اور اس نعمت غیر مترقبہ سے اپنی، اپنے خاندان اور اپنے ملک و قوم کی خدمت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ انسانی معاشرہ کی تشکیل میں تعلیم یافتہ شخص مقدور بھر کوشش کرتا ہے۔ جیو اور جینے دو کی اہمیت سے بھی وہ کما حقہ واقف ہوتا ہے۔ غرض تعلیم دنیا میں امن و سکون، خوشحالی، فارغ البالی، ترقی و کامرانی کی راہ پر آگے بڑھتے رہنے کا جوش اور ولولہ پیدا کرتی ہے اسی تعلیم کی بدولت ہوش کا دامن کبھی کسی کے ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پاتا۔ آج ترقی یافتہ ممالک جہاں کی آبادی میں تعلیم کا اوسط ۸۰٪ سے بھی زیادہ ہے، امن کے استحکام اور خیر سگالی کے جذبہ کی اہمیت کو اچھی طرح محسوس کرنے لگے ہیں۔ شدید نظریاتی اختلاف کے باوجود ایسے تمام ممالک پر امن بقائے باہم کے لئے بات چیت، مفاہمت اور مصالحت کے ذریعہ پیچیدہ سیاسی مسائل کو حل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ تصادم اور ٹکراؤ کی پالیسی، آج کی تباہ کن ہتھیار رکھنے والی دنیا کے وجود ہی کے لئے زبردست خطرہ ہے۔ یہ احساس اور یہ سمجھ بوجھ ذہن و دماغ کی صحیح تربیت کا نتیجہ ہے جو بڑے پیمانہ پر برس ہا برس تک تعلیم کے زیادہ سے زیادہ عام ہونے کی بدولت حاصل ہوا ہے۔ مشاہدات حالات تجربات اور تاریخ نے اشرف المخلوقات کو کرہ ارض پر انسانوں کی طرح زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا ہے۔

ترقی پذیر ممالک، ترقی کی دوڑ میں ثابت قدمی کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں۔ ہمارے ملک ہندوستان

نے ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو سیاسی آزادی حاصل کی اور اس کے بعد ہمہ جہتی ترقی کے لئے جد و جہد شروع کی۔ ارباب اقتدار نے بجا طور پر محسوس کیا کہ ہماری اولین اور بنیادی ضرورت ملک میں تعلیم کو عام کرنا ہے۔ جب تک تعلیم ہر شہر بلکہ ہر دیہات کے ہر گھر تک نہ پہونچے، معیار زندگی کو بلند نہیں کیا جا سکتا۔ آج تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی والے ملک ہندوستان میں، تعلیم کی توسیع اور وسعت ایک بہت بڑا اور اہم مسئلہ ہے۔ اسی لئے تحتانی، وسطانی اور فوقانی تعلیم کے علاوہ ڈگری کالجس اور یونیورسٹی کی تعلیم کے لئے ذرائع اور وسائل کے مہیا کرنے کی ضرورت ہمیشہ سے کہیں زیادہ آج محسوس کی جا رہی ہے۔ پچھلے چالیس سال میں سوچی سمجھی منصوبہ بندی کے ذریعہ حصول تعلیم کے بہتر سے بہتر مواقع فراہم کئے گئے ہیں۔ اور آرٹس، سائنس، کامرس، ٹکنالوجی، صنعت و حرفت، زراعت اور مختلف پیشوں سے واقفیت اور ان میں باقاعدہ مہارت حاصل کرنے کی تعلیم اور تربیت کا معقول انتظام کیا گیا ہے۔ کھیتوں پر کام کرنے والے مزدوروں کے غریب اور نادار بچوں کے لئے بھی، تعلیم کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ حصول تعلیم کی طرف متوجہ کرنے اور تعلیم سے دلچسپی پیدا کرنے کے لئے فیس کی معافی کے ساتھ ساتھ اسکالرشپس بھی دیئے جا رہے ہیں۔ غریب طبقات کیلئے ممکنہ حد تک ہر طرح کی سہولتیں مہیا کی جا رہی ہیں۔ غذا، لباس اور مکان کے مسائل کو بھی حل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے تاکہ نوجوان نسل سکون قلب کے ساتھ زیادہ سے زیادہ تعلیم حاصل کر کے اپنی صلاحیتوں کو نکھار سکے اور مستقبل میں اپنی قوم اور اپنے ملک کی خدمت کی اہل ہو سکے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ تعلیم کی بدولت، اخلاقی مذہبی اور انسانی اقدار کا پاس و لحاظ رکھا جا سکتا ہے۔ اس لئے دیہاتوں میں رہنے والے کم سن بچوں کے لئے پڑھنے اور لکھنے کی تمام سہولتیں ممکنہ حد تک مہیا کی جا رہی ہیں۔ معقول اور صحیح اصول کے مطابق تعلیم اور اسکول کیلئے موزوں عمارت، فرنیچر، آلات تعلیمی، کتب خانے، دارالمطالعہ اچھے محنتی، ہمدرد اور خدمت کا جذبہ رکھنے والے اساتذہ کے انتظام کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ ہر بستی یں والدین اور اسکول کے انتظامیہ میں باہمی ربط اور تعلق قائم رکھنے اور بستی کے لوگوں میں اپنے علاقہ میں واقع اسکول سے دلچسپی پیدا کرنے کی خاطر، بچوں کے والدین اور سرپرستوں کو اسکول کے تعلیمی مسائل سے واقف کروایا جا رہا ہے انہیں تعلیمی سال کے دوران وقتاً فوقتاً اسکول میں مدعو بھی کیا جاتا ہے، نیز ان سے بچوں کی بھلائی اور بہبودی کے سلسلے میں مشورے حاصل کئے جا رہے ہیں چنانچہ اسی لئے والدین اور سرپرست اپنے اپنے علاقے کے مدارس کی ترقی کے لئے خلوص دل اور گہری دلچسپی سے اپنی توانائیوں

کو کام میں لاتے اور دامے درمے قدمے سخنے خدمت کے لئے ہمیشہ آمادہ و تیار رہتے ہیں۔

کسی جمہوری ملک میں تعلیم کی توسیع کے لئے حکومت اور عوام دونوں کی دلچسپی ضروری ہے۔ مدارس میں موزوں اسٹاف ضرورت کے مطابق اساتذہ کی تعداد درس و تدریس سے صحیح معنوں میں دلچسپی رکھنے والے اساتذہ کا تقرر قابل اور احساس فرض رکھنے والے اساتذہ اور صدر مدرس کے علاوہ اسکول کے دارالمطالعہ اور کتب خانہ کے لئے ضرورت کے مطابق آرام دہ فرنیچر نیز طلبا کے لئے گیمس اور اسپورٹس کے تمام ضروری سامان کی فراہمی، اسکول کے لئے پلے گراؤنڈ، کم سن بچوں کیلئے دوپہر میں صحت بخش متوازن لنچ کا انتظام طلباء اسکول کے اساتذہ اور اسٹاف میں شامل دیگر کارکن اصحاب کے لئے پینے کے صاف پانی کا انتظام، جیسے امور کی طرف بھی توجہ ضروری ہے۔ تب ہی طلباء اساتذہ اور صدر مدرس اپنے اپنے فرائض کی ادائیگی میں انہماک سے مصروف ہو سکتے ہیں۔

شکر ہے کہ ۸۰ کروڑ آبادی والے ہمارے ملک ہندوستان میں تعلیم کی اہمیت کو محسوس کیا گیا ہے دیگر کئی مسائل کے ساتھ ساتھ تعلیم جیسے اہم مسئلہ کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا۔ کہیں کہیں ملک کے خوشحال اور دولت مند اصحاب اور اداروں نے نئی نسل کی تعلیم کی ضرورت اور اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے مدارس کالج، بلکہ یونیورسٹیوں کے قیام یا ان کی ترقی کے لئے بخوشی اور برضا و رغبت گراں قدر عطیے بھی دئیے ہیں روز افزوں تعلیمی ضرورتوں کی وجہ سے مدارس کی جماعتوں میں قاعدہ کے مطابق کے بجائے طلبا کی حد سے زیادہ تعداد، اساتذہ اور صدر مدرس کے لئے درس و تدریس اور نظم و ضبط یعنی ڈسپلن کے قائم و برقرار رکھنے میں مشکلات پیدا کر رہی ہیں۔ مدارس کے لئے موزوں عمارتوں کی قلت ہے۔ مدارس کے لیے تنگ و تاریک کمروں میں جہاں تازہ ہوا کا گزر مشکل ہو اور جہاں دن میں بھی اندھیرا سا محسوس ہو، کم سن بچوں کی صحت و تندرستی متاثر ہو سکتی ہے۔

اسکول میں تحصیل علم کی فضاء پیدا کرنے کے لئے، اس بات کی ضرورت محسوس کی جانے لگی ہے کہ جہاں بھی ممکن ہو سرکاری طور پر یا خانگی عطیوں سے مدارس کے لئے موزوں عمارتیں تعمیر کی جائیں۔ مسرت کی بات ہے کہ ملک میں اس اہم مسئلہ کی طرف توجہ کی جا رہی ہے البتہ تیزی سے بڑھتی ہوئی تعلیمی ضروریات کا لحاظ کرتے ہوئے تعمیری تجویزوں اور منصوبوں پر بھی بعجلت ممکنہ تیز رفتاری کے ساتھ عمل کی ضرورت ہے۔
ملک کی تقریباً نصف آبادی عموماً خواتین پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس لئے تعلیم نسواں کی اہمیت اور ضرورت

کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔ چنانچہ ہمارے ملک کی ہر اسٹیٹ میں تعلیم نسواں کو عام کرنے کی کوشش بھی جاری ہے ۔ یہ بات بے حد مسرت انگیز اور حوصلہ افزا ہے کہ ہمارے ملک کی خواتین بھی ہر میدان میں اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کا لوہا منوا رہی ہیں ۔ ان میں صحت مند مسابقت کا جذبہ پیدا ہو گیا ہے اور وہ ہر شعبہ جات میں سرگرمی سے حصہ لے رہی ہیں ۔ مختلف علوم و فنون کے حصول میں وہ مردوں کے قدم بہ قدم آگے بڑھ رہی ہیں ۔ ترقی کے میدان میں آگے بڑھنے کا ان کا یہ صحت مند جذبہ اس لئے بھی اہم ہے کہ زیور تعلیم سے آراستہ مائیں ہی بہتر طور پر اپنے بچوں کی تربیت کر سکتی ہیں ۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے ' ماں کی گود بچہ کی پہلی تربیت گاہ ہے اور یہ قول صد فیصد صحیح بھی ہے ۔ بچہ کی زندگی کے ابتدائی تین تا پانچ سال اس کے مستقبل کی تشکیل و تعمیر میں اہم رول ادا کرتے ہیں اس لئے صحت مند سماج کے وجود کے لئے عورتوں کا زیور تعلیم سے آراستہ ہونا بے حد ضروری ہے ۔ ہندوستان کی ہر ریاست میں تعلیم بالغان کی طرف بھی توجہ کی جا رہی ہے سرکاری اور سماجی ' تہذیبی اور مذہبی ادارے اس کام میں بھی خاص دلچسپی لے رہے ہیں ۔ تعلیم بالغان کے مراکز میں کام کرنے والے اصحاب اپنی محنت کے معاوضہ سے دلچسپی رکھنے کے علاوہ ' اگر قوم و ملک کی پُرخلوص خدمت کے جذبے سے کام کریں تو اس کے نتائج حوصلہ افزا ہوں گے ۔ ہمارے ملک میں خوش قسمتی سے ' خدمت کا جذبہ رکھنے والے اصحاب و خواتین کی کمی نہیں ہے بلکہ سماج میں بہت سے ایسے اصحاب بھی ہیں جو بے غرض محسن کی طرح مصروف کار ہیں ۔ ملک کی ترقی کے لئے یہ ایک نیک شگون ہے ۔ خاندانی منصوبہ بندی کے فوائد کی مناسب انداز میں تشہیر ہو رہی ہے ۔

اقامتی اسکول بھی آج کل تعلیم کی توسیع و اشاعت میں اہم حصہ ادا کر رہے ہیں ' بلا تامل یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان اقامتی اسکولوں میں داخلے کے لئے نوجوان جوق در جوق چلے آ رہے ہیں ۔ اسی طرح پچھلے چند سال سے اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں ڈگری کالجس ' پوسٹ گریجویٹ کالجس ' یونیورسٹیوں میں انجینئرنگ ' طب اور دوسرے کئی ٹکنیکل شعبوں کے علاوہ کالج آف ایجوکیشن کامرس ' معاشیات ' بزنس مینجمنٹ وغیرہ بھی داخلہ کے خواہشمند طلباء کا ہجوم رہا کرتا ہے ۔ اور نوجوان انٹرنس ٹسٹ کے لئے بھی جوش و خروش سے تیاری کرتے ہیں ۔

قوم کی ترقی کے لئے تعلیم کی توسیع و اشاعت کی ضرورت کو بخوبی محسوس کیا گیا ہے ۔ اس لئے پیشہ ورانہ تعلیم کا معقول انتظام کیا جا رہا ہے ۔ کامرس سائنس کورسس کے ساتھ ساتھ اوپن یونیورسٹی کے قیام نے بھی تعلیم کے

محمد منظور احمد
۱/۳۲ھ - ۱۰-۲۲۲،
دارالشفاء، حیدرآباد ۔۵۰۰۲۲ (اے پی)

تعلیم کی وسعت، اغراض و مقاصد اور مطابقت

موجودہ دور میں تعلیم کی اہمیت ضرورت اور قدر و قیمت سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا، جہالت انسان اور انسانیت کی دشمن ہے۔ انسان کی متوازن اور معتدل اور پابندِ ضبط زندگی کے لئے اس کا زیور تعلیم سے آراستہ ہونا ضروری ہے۔ تعلیم ہی سے سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت پروان چڑھتی ہے۔ بُرے بھلے اور نیک و بد کی تمیز پیدا ہوتی ہے۔ زندگی کو صحیح ڈھنگ سے برتنے کا انداز اور اس نعمت غیر مترقبہ سے اپنی، اپنے خاندان اور اپنے ملک و قوم کی خدمت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ انسانی معاشرہ کی تشکیل میں تعلیم یافتہ شخص، مقدور بھر کوشش کرتا ہے۔ جیو اور جینے دو کی اہمیت سے بھی 'وہ کما حقہٗ' واقف ہوتا ہے۔ غرض تعلیم، دنیا میں امن و سکون خوشحالی فارغ البالی، ترقی و کامرانی کی راہ پر آگے بڑھتے رہنے کا جوش اور ولولہ پیدا کرتی ہے اسی تعلیم کی بدولت ہوش کا دامن کبھی کسی کے ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پاتا۔ آج ترقی یافتہ ممالک، جہاں کی آبادی میں تعلیم کا اوسط ۸۰٪ سے بھی زیادہ ہے، امن کے استحکام اور خیرسگالی کے جذبہ کی اہمیت کو اچھی طرح محسوس کرنے لگے ہیں۔ شدید نظریاتی اختلاف کے باوجود ایسے تمام ممالک پرامن بقائے باہم وجودیت کے لئے بات چیت، مفاہمت اور مصالحت کے ذریعہ پیچیدہ سیاسی مسائل کو حل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ تصادم اور ٹکراؤ کی پالیسی، آج کی تباہ کن ہتھیار رکھنے والی دنیا کے وجود ہی کے لئے زبردست خطرہ ہے۔ یہ احساس اور یہ سمجھ بوجھ ذہن و دماغ کی صحیح تربیت کا نتیجہ ہے جو بڑے پیمانہ پر برسہا برس تک تعلیم کے زیادہ سے زیادہ عام ہونے کی بدولت حاصل ہوا ہے۔ مشاہدات حالات تجربات اور تاریخ نے اشرف المخلوقات کو کرہ ارض پر انسانوں کی طرح زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا ہے۔

ترقی پذیر ممالک، ترقی کی دوڑ میں ثابت قدمی کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں۔ ہمارے ملک ہندوستان

نے ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو سیاسی آزادی حاصل کی اور اس کے بعد ہمہ جہتی ترقی کے لئے جدو جہد شروع کی۔ اربابِ اقتدار نے بجا طور پر محسوس کیا کہ ہماری اولین اور بنیادی ضرورت ملک میں تعلیم کو عام کرنا ہے۔ جب تک تعلیم ہر شہر بلکہ ہر دیہات کے ہر گھر تک نہ پہونچے، معیارِ زندگی کو بلند نہیں کیا جا سکتا۔ آج تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی والے ملک ہندوستان میں، تعلیم کی توسیع اور وسعت ایک بہت بڑا اور اہم مسئلہ ہے۔ اسی لئے تحتانی، وسطانی اور فوقانی تعلیم کے علاوہ ڈگری کالجس اور یونیورسٹی کی تعلیم کے لئے ذرائع اور وسائل کے مہیا کرنے کی ضرورت ہمیشہ سے کہیں زیادہ آج محسوس کی جا رہی ہے۔ پچھلے چالیس سال میں سوچی سمجھی منصوبہ بندی کے ذریعہ حصولِ تعلیم کے بہتر سے بہتر مواقع فراہم کئے گئے ہیں۔ اور آرٹس، سائنس، کامرس، ٹکنالوجی، صنعت و حرفت، زراعت اور مختلف پیشوں سے واقفیت اور ان میں باقاعدہ مہارت حاصل کرنے کی تعلیم و تربیت کا معقول انتظام کیا گیا ہے۔ کھیتوں پر کام کرنے والے مزدوروں کے غریب اور نادار بچوں کیلئے بھی، تعلیم کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ حصولِ تعلیم کی طرف متوجہ کرنے اور تعلیم سے دلچسپی پیدا کرنے کے لئے فیس کی معافی کے ساتھ ساتھ اسکالر شپس بھی دیئے جا رہے ہیں۔ غریب طبقات کیلئے ممکنہ حد تک ہر طرح کی سہولتیں مہیا کی جا رہی ہیں۔ غذا، لباس اور مکان کے مسائل کو بھی حل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے تاکہ نوجوان نسل سکونِ قلب کے ساتھ زیادہ سے زیادہ تعلیم حاصل کر کے اپنی صلاحیتوں کو نکھار سکے اور مستقبل میں اپنی قوم اور اپنے ملک کی خدمت کا اہل ہو سکے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ تعلیم کی بدولت، اخلاقی مذہبی اور انسانی اقدار کا پاس و لحاظ رکھا جا سکتا ہے۔ اس لئے دیہاتوں میں رہنے والے کم سن بچوں کے لئے پڑھنے اور لکھنے کی تمام سہولتیں ممکنہ حد تک مہیا کی جا رہی ہیں۔ معقول اور صحیح اصول کے مطابق تعلیم اور اسکول کیلئے موزوں عمارت، فرنیچر، آلاتِ تعلیمی، کتب خانے، دارالمطالعہ اچھے، محنتی، ہمدرد اور خدمت کا جذبہ رکھنے والے اساتذہ کے انتظام کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ ہر بستی میں والدین اور اسکول کے انتظامیہ میں باہمی ربط اور تعلق قائم رکھنے اور بستی کے لوگوں میں اپنے علاقے میں واقع اسکول سے دلچسپی پیدا کرنے کی خاطر، بچوں کے والدین اور سرپرستوں کو اسکول کے تعلیمی مسائل سے واقف کروایا جا رہا ہے انہیں تعلیمی سال کے دوران وقتاً فوقتاً اسکول میں مدعو بھی کیا جاتا ہے، نیز ان سے بچوں کی بھلائی اور بہبودی کے سلسلے میں مشورے حاصل کئے جا رہے ہیں چنانچہ اسی لئے والدین اور سرپرست اپنے اپنے علاقے کے مدارس کی ترقی کے لئے خلوصِ دل اور گہری دلچسپی سے اپنی توانائیوں

کو کام میں لاتے اور دامے درمے قدمے سخنے خدمت کے لئے ہمیشہ آمادہ و تیار رہتے ہیں۔

کسی جمہوری ملک میں تعلیم کی توسیع کے لئے حکومت اور عوام دونوں کی دلچسپی ضروری ہے۔ مدارس میں موزوں اسٹاف ضرورت کے مطابق اساتذہ کی تعداد درس و تدریس سے صحیح معنوں میں دلچسپی رکھنے والے اساتذہ کا تقرر، قابل اور احساس فرض رکھنے والے اساتذہ اور صدر مدرس کے علاوہ اسکول کے دارالمطالعہ اور کتب خانہ کے لئے ضرورت کے مطابق آرام دہ فرنیچر نیز طلبا کے لئے گیمس اور اسپورٹس کے تمام ضروری سامان کی فراہمی، اسکول کے لئے پلے گراؤنڈ، کم سن بچوں کیلئے دوپہر میں صحت بخش متوازن لنچ کا انتظام، طلباء اسکول کے اساتذہ اور اسٹاف میں شامل دیگر کارکن احباب کے لئے پینے کے صاف پانی کا انتظام، جیسے امور کی طرف بھی توجہ ضروری ہے۔ تب ہی طلباء، اساتذہ اور صدر مدرس اپنے اپنے فرائض کی ادائیگی میں انہماک سے مصروف ہو سکتے ہیں۔

شکر ہے کہ ۸۰ کروڑ آبادی والے ہمارے ملک ہندوستان میں تعلیم کی اہمیت کو محسوس کیا گیا ہے دیگر کئی مسائل کے ساتھ ساتھ تعلیم جیسے اہم مسئلہ کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا۔ کہیں کہیں ملک کے خوشحال اور دولت مند احباب اور اداروں نے نئی نسل کی تعلیم کی ضرورت اور اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے مدارس کالج، بلکہ یونیورسٹیوں کے قیام یا ان کی ترقی کے لئے بخوشی اور برضا و رغبت گراں قدر عطیے بھی دیئے ہیں روز افزوں تعلیمی ضرورتوں کی وجہ سے مدارس کی جماعتوں میں قاعدہ کے مطابق کے بجائے طلبا کی حد سے زیادہ تعداد، اساتذہ اور صدر مدرس کے لئے درس و تدریس اور نظم و ضبط یعنی ڈسپلن کے قائم و برقرار رکھنے میں مشکلات پیدا کر رہی ہیں۔ مدارس کے لئے موزوں عمارتوں کی قلت ہے۔ مدارس کے ایسے تنگ و تاریک کمروں میں جہاں تازہ ہوا کا گزر مشکل ہو اور جہاں دن میں بھی اندھیرا سا محسوس ہو، کم سن بچوں کی صحت و تندرستی متاثر ہو سکتی ہے۔

اسکول میں تحصیل علم کی فضاء پیدا کرنے کے لئے، اس بات کی ضرورت محسوس کی جانے لگی ہے کہ جہاں بھی ممکن ہو سرکاری طور پر یا خانگی عطیوں سے مدارس کے لئے موزوں عمارتیں تعمیر کی جائیں۔ مسرت کی بات ہے کہ ملک میں اس اہم مسئلہ کی طرف بھی توجہ کی جارہی ہے البتہ تیزی سے بڑھتی ہوئی تعلیمی ضروریات کا لحاظ کرتے ہوئے تعمیری تجویزوں اور منصوبوں پر بھی بعجلت ممکنہ تیز رفتاری کے ساتھ عمل کی ضرورت ہے۔ ملک کی تقریباً نصف آبادی عموماً خواتین پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس لئے تعلیم نسواں کی اہمیت اور ضرورت

کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔ چنانچہ ہمارے ملک کی ہر اسٹیٹ میں تعلیم نسواں کو عام کرنے کی کوشش بھی جاری ہے ۔ یہ بات بے حد مسرت انگیز اور حوصلہ افزاء ہے کہ ہمارے ملک کی خواتین بھی ہر میدان میں اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کا لوہا منوا رہی ہیں ۔ ان میں صحت مند مسابقت کا جذبہ پیدا ہو گیا ہے اور وہ ہر شعبہ جات میں سرگرمی سے حصہ لے رہی ہیں ۔ مختلف علوم و فنون کے حصول میں وہ مردوں کے قدم بقدم آگے بڑھ رہی ہیں ۔ ترقی کے میدان میں آگے بڑھنے کا ان کا یہ صحت مند جذبہ اس لئے بھی اہم ہے کہ زیور تعلیم سے آراستہ مائیں ہی بہتر طور پر اپنے بچوں کی تربیت کر سکتی ہیں ۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے، ماں کی گود بچہ کی پہلی تربیت گاہ ہے اور یہ قول صد فیصد صحیح بھی ہے ۔ بچہ کی زندگی کے ابتدائی تین تا پانچ سال اس کے مستقبل کی تشکیل و تعمیر میں اہم رول ادا کرتے ہیں اس لئے صحت مند سماج کے وجود کے لئے عورتوں کا زیور تعلیم سے آراستہ ہونا بے حد ضروری ہے ۔ ہندوستان کی ہر ریاست میں تعلیم بالغان کی طرف بھی توجہ کی جا رہی ہے سرکاری اور سماجی، تہذیبی اور مذہبی ادارے اس کام میں بھی خاص دلچسپی لے رہے ہیں ۔ تعلیم بالغان کے مراکز میں کام کرنے والے احباب اپنی محنت کے معاوضہ سے دلچسپی رکھنے کے علاوہ، اگر قوم و ملک کی پُر خلوص خدمت کے جذبے سے کام کریں تو اس کے نتائج حوصلہ افزاء ہوں گے ۔ ہمارے ملک میں خوش قسمتی سے، خدمت کا جذبہ رکھنے والے احباب و خواتین کی کمی نہیں ہے بلکہ سماج میں بہت سے ایسے احباب بھی ہیں جو بے غرض محسن کی طرح مصروف بکار ہیں ۔ ملک کی ترقی کے لئے یہ ایک نیک شگون ہے ۔ خاندانی منصوبہ بندی کے فوائد کی مناسب انداز میں تشہیر ہو رہی ہے ۔

اقامتی اسکول بھی آج کل تعلیم کی توسیع و اشاعت میں اہم حصہ ادا کر رہے ہیں، بلا تامل یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان اقامتی اسکولوں میں داخلے کے لئے نوجوان جوق در جوق چلے آ رہے ہیں ۔ اسی طرح پچھلے چند سال سے اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں ڈگری کالجس، پوسٹ گریجویٹ کالجس، یونیورسٹیوں میں انجنیئرنگ، طب اور دوسرے کئی ٹکنیکل شعبوں کے علاوہ کالج آف ایجوکیشن کامرس، معاشیات، بزنس مینجمنٹ وغیرہ بھی داخلہ کے خواہشمند طلباء کا ہجوم رہا کرتا ہے ۔ اور نوجوان انٹرنس ٹسٹ کے لئے بھی جوش و خروش سے تیاری کرتے ہیں ۔

قوم کی ترقی کے لئے تعلیم کی توسیع و اشاعت کی ضرورت کو بخوبی محسوس کیا گیا ہے ۔ اس لئے پیشہ ورانہ تعلیم کا معقول انتظام کیا جا رہا ہے ۔ کارسپانڈنس کورسس کے ساتھ ساتھ اوپن یونیورسٹی کے قیام نے بھی تعلیم کے

دائرے کو وسعت دینے میں اہم حصہ ادا کیا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ تعلیم خواہ معمولی نوشت و خواند کے سلسلے کا ہو یا تحتانی، وسطانی، فوقانی درجوں کے علاوہ ڈگری اور پوسٹ گریجویٹ کالجوں کی ہو، ہر صورت میں خلوص، گہری دلچسپی، مفوضہ کام میں انہماک اور اعلیٰ معیار کے حصول کی مسلسل اور ان تھک کوشش اور اساتذہ اور تمام متعلقہ اصحاب کے تعاون کا ہر وقت بلکہ ہر لمحہ ضرورت ہوا کرتی ہے۔

اقوام عالم کی صف میں اپنی قوم کو ممتاز مقام و مرتبہ پر دیکھنے کی خواہش رکھنے والے افراد کا فرض ہے کہ وہ تعلیم کے میدان میں مشنری جذبہ سے کام کریں جہاں یہ پرانا قول حرف بہ حرف صحیح ہے کہ علم حاصل کرنا لوہے کے چنے چبانے کے مماثل ہے۔ اور علم کے حصول کیلئے شمع کی مانند پگھلنا پڑتا ہے "پئے علم چوں شمع باید گداخت"۔ وہیں یہ بات بھی صحیح ہے کہ علم حاصل کرنے کا شوق رکھنے والے طلباء کے رہبر و رہنما یعنی اساتذہ کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ خدمت کے جذبہ سے سرشار ہوں۔ تبھی ملک اور قوم کا مستقبل درخشاں ہو سکتا ہے اور ہم بلا لحاظ مذہب و ملت، بنی نوع انسان کی خدمت کرنے کے قابل ہو سکتے ہیں۔

تعلیم انسانیت کے بقا کی ضامن ہے۔ تہذیب و تمدن کے سرمایہ میں گراں قدر اور بیش قیمت اضافہ اور تعلیم کی مزید وسعت کے لئے ہم سب کو عموماً اور ماہرین تعلیم کو خصوصاً سر جوڑ کر بیٹھنے اور باہمی مشورے سے وقتاً فوقتاً سہ سالہ یا پنج سالہ منصوبوں کی صورت گری میں مصروف رہنا چاہیئے۔ ملک کی تعلیم کی ترقی کی رفتار کا سنجیدگی سے جائزہ لیتے رہنے کی بھی ضرورت ہے۔ تعلیم اور روزگار کے دروازے سب کے لئے ہمیشہ کھلے رہیں تو ہر شخص اپنی صلاحیت کے مطابق ترقی کے منازل طے کر سکتا ہے اور اس طرح وہ ملک کا ایک اچھا شہری اور دنیا کے لئے ایک کارآمد انسان ثابت ہو سکتا ہے۔

طریقۂ تعلیم میں بچوں اور ان کے والدین کی نفسیات کو پیش نظر رکھنا بھی ضروری ہے۔ تعلیم کو بہرحال سائنٹفک بنیادوں پر استوار کرنا ہوگا۔ قومی کونسل برائے تعلیمی تحقیقات اور تربیت (این سی ای آر ٹی) کے نام سے ایک ادارہ سائنٹفک پرائمرا اور دوسری نصابی کتابیں مرتب کر رہا ہے۔ ادارہ اقوام متحدہ کے تحت یونیسکو (UNESCO) نے بھی ترقیاتی پروگراموں کے آگے بڑھانے کے لئے سائنس اور جدید ترین ٹکنالوجی سے زیادہ سے زیادہ استفادہ پر زور دیا ہے۔

عوام کے شعور کو بیدار کرنے کیلئے تعلیم کے بین الاقوامی سال کے علاوہ قومی سال اور علاقائی اور ریاستی سال منانے سے تعلیم کی وسعت کا پروگرام کامیابی سے ہمکنار ہوگا۔ تعلیم کی اشاعت اور توسیع سے گو بظاہر فوری طور پر تبدیلی یا فائدہ محسوس نہیں ہوتا لیکن چند سال کے بعد سماج پر اس کے بڑے اچھے اثرات مرتب ہوتے ہیں EARN WHILE YOU LEARN کے اصول پر عمل کرنے سے نوجوانوں میں پیدا ہونے والی بے چینی اور بے اطمینانی کو دور کیا جا سکتا ہے۔ نوجوان بجا طور پر یہ چاہتے ہیں کہ نصاب تعلیم ایسا ہو جو سماج کے عصری تقاضوں کی تکمیل کر سکے۔ وہ اپنی صلاحیتوں کے مطابق کام یا روزگار کی توقع کرتے ہیں جس سے مسرت اور خوشحالی کے سامان فراہم ہو سکیں۔

تعلیم واقعی ایسی ہو جو نوجوانوں میں سماج اور پورے ملک میں پیدا ہونے والے مسائل کے حل کرنے کی صلاحیت پیدا کرے۔ ان میں انسانی اقدار اور ثقافتی اقدار کے احترام کا جذبہ پیدا کرے۔ تعلیم کی منصوبہ بندیاں اور معاشی منصوبہ بندی کرنے والے ماہرین کا فرض ہے کہ وہ ماضی اور حال کے ساتھ ساتھ مستقبل کے صنعتی سماج کی ضروریات کو بھی پیش نظر رکھیں۔

جیسا کہ میں نے لکھا ہے، تعلیم کے لئے ۳ تا ۵ سال کی عمر کے دور کی بے حد اہمیت ہے۔ منصوبہ بندی میں ۱۵ تا ۲۰ سال کی عمر کے اصحاب کے گروہ کی بھی ضروریات، خواہشات کو بھی مناسب مقام دیا جانا چاہیئے درس و تدریس کے سلسلے کی تمام کوششیں اسی وقت کامیاب سمجھی جائیں گی، جب اصول و طریقۂ تعلیم میں انسان کی عظمت کے خیال کو ابھارا جائے گا اور مشینوں کی حکومت کے منفی اثرات کو کم کیا جائے گا کیونکہ بقول اقبال "احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات" اس کے علاوہ ایسی نصابی کتابیں مرتب کی جانی چاہئیں جن سے صحت مند مسابقت اور مقابلے کی حوصلہ افزائی ہو۔ تعلیم کی سماجی طاقت و قوت سے انکار نہیں کیا جا سکتا اس کے ذریعہ سیاسی، سماجی اور معاشی ترقی کی راہیں کھولی جا سکتی ہیں۔ تعلیم کا ایک اہم موضوع مستقبل میں اچھی قیادت کا مسئلہ بھی ہے۔ معاشرہ کا متوازن اور صحت مند ترقی کے لئے عام آدمی کی فلاح و بہبود اور خوشحالی کا خیال اور سماجی انصاف ضروری ہے۔

اگر ماہرین تعلیم، نصاب تعلیم کی تدوین کے وقت، دیہی اور شہری زندگی کے لوازمات اور مسائل اور زندگی اور صنعتی علاقوں کی ضروریات پیش نظر رکھیں تو تعلیم زندگی سے ہم آہنگ ہو سکتی ہے۔

۲۲

پی آئی ڈی حیدرآباد

خواتین کی ترقی و بھلائی کے نئے امکانات

ملک کی تقریباً نصف آبادی خواتین پر مشتمل ہے صدیوں کی سماجی اور تہذیبی پابندیوں نے عورتوں کو ترقیاتی سرگرمیوں میں موثر طور پر حصہ لینے سے باز رکھا عام طور پر عورتوں کے بارے میں یہ تصور ہے کہ یہ ایک صنف نازک ہے جسے خود سماجی اور اقتصادی تحفظ درکار ہے۔ اس تصور اور رویے نے نہ صرف عورتوں کو سرگرم عمل ہونے سے روک رکھا بلکہ ان کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل کے امکانات بھی موہوم ہو گئے۔ اس لئے ایک عرصہ تک تعلیم، روزگار اور دیگر شعبوں میں وہ پسماندگی کا شکار ہیں۔ تاہم۔ اپنے خاندان کیلئے روزگار فراہم کرنے کیلئے عمل میں عورتوں کے نمایاں رول کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ کاشت کاری اور زراعت کے مختلف مرحلوں جیسے بیجوں کی بوائی زمین کو کھاد دینا اور فصلیں کاٹنے وغیرہ جیسے کاموں میں عورتوں نے مردوں کے شانہ بشانہ کام کیا ہے چھوٹے اور بے زمین کسانوں کیلئے کاشتکاری ایک خاندانی پیشہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ جہاں کام کی تقسیم کے سلسلے میں عورتوں اور مردوں میں کسی طرح کا امتیاز نہیں ہے۔

زراعت، ماہی گیری، گھریلو صنعت، کھانے پینے کی اشیاء کی تیاری اور دستی مصنوعات کے شعبوں میں خواتین کی شمولیت اور معیشت کے استحکام میں ان کے رول کو ابھی تک بھی پوری طرح تسلیم نہیں کیا گیا ہے۔ ایک اندازہ کے مطابق غیر منظم شعبوں میں ۹۰ فیصد خواتین حصہ لے رہی ہیں لیکن ان کے حقوق کے تحفظ سے متعلق قانون کے عدم وجود اور دیگر انتظامات کی کمی کے باعث وہ استحصال کا شکار ہیں۔ سماجی امتیازات کے باعث بھی انہیں ضروری تربیت اور ترقی کے مواقعوں سے محروم رکھا جاتا ہے۔ یہ صورتحال خواتین کیلئے نہایت حوصلہ شکن اور مایوس کن بنی ہوئی ہے۔ ایک طرف تو موجودہ سماجی اور اقتصادی حالات انہیں روزگار کے حصول پر مجبور کرتے ہیں تو دوسری طرف خود کو مسابقت کا اہل نہیں محسوس کرتی ہیں۔ اس لئے آج سب سے بڑا کام یہ ہے کہ عورتوں

مناسب تربیت دی جائے تاکہ وہ روزگار کے نئے امکانات سے خود کو ہم آہنگ کرنے کی صلاحیت پیدا کرسکیں۔ منصوبہ بندی کے عہد کی ابتداء ہی سے ایسے وسیع تر اقدامات کئے گئے ہیں جن سے جنس کی بنیاد پر امتیازات کو ختم کیا جاسکتا ہے اور سماجی و اقتصادی حدوں کو عبور کیا جاسکتا ہے۔ اقتصادی سرگرمیوں میں عورتوں کے رول کو موثر بنانے تعلیم تربیت کے ساتھ ساتھ انکی ذہنی صلاحیتوں کی نشوونما کیلئے بے شمار سہولتیں فراہم کی گئیں جن میں قرضوں کی فراہمی خام اشیاء اور دیگر سہولتیں شامل ہیں۔ اس سلسلہ میں مرکزی سوشیل ویلفیر بورڈ کے اقدامات بنیادی اور نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ بورڈ کی جانب سے خواتین کے لئے آمدنی پیدا کرنے کے یونٹوں کے قیام کے سلسلہ میں کام کرنے والی رضاکارانہ تنظیموں کو مالی امداد دی جاتی ہے۔ خواتین اور بچوں کی بھلائی سے متعلق محکمہ ایسے عملی پراجکٹس کی مدد کررہا ہے جو زراعت، ڈائری، افزائش حیوانات، ماہی گیری، کھادی اور دیہی صنعتوں، ہت کرگھا وغیرہ جیسے پیشوں میں عورتوں کی تربیت کیلئے شروع کئے گئے ہوں محکمہ کی جانب سے تکنیکی امداد، قرضوں کی سہولتوں اور مارکٹنگ کے سلسلہ میں تعاون واشتراک کی سہولتیں بھی مہیا ہیں۔ ایک اور اسکیم کے تحت سماج کے کمزور طبقات سے تعلق رکھنے والی خواتین کو عصری شعبوں جیسے الکٹرانکس، گھڑی سازی کمپیوٹر پروگرامنگ، طباعت، ہینڈلوم وغیرہ میں خصوصی تربیت دی جارہی ہے تاکہ وہ اپنا روزگار آپ پیدا کرنے کے موقف میں آجائیں۔ وزارت، زراعت نے جنگلات، زمینی تحفظ اور ڈیری ڈیولپمنٹ کے سلسلے میں خواتین کو تربیت دینے کے کئی پروگرام شروع کئے ہیں۔ خواتین کی تربیت، ان کی ذہنی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے اور خود روزگار سرگرمیوں میں انہیں مالی امداد فراہم کرنے کے علاوہ اس بات کی بھی کوششیں کی جارہی ہیکہ ان کے لئے سائینسی اور ٹکنالوجی کی معلومات بھی فراہم کی جائیں۔ محکمہ سائنس نے خواتین کے لئے سائنس اور ٹکنالوجی کی ایک اسکیم شروع کی ہے۔ جس کا مقصد ان میں سائینسی طرز زندگی پیدا کرنا ہے۔ اعلیٰ تعلیم اور ٹکنیکل تعلیم کے مواقع فراہم کرنے کے لئے بھی کئی اقدامات کئے جارہے ہیں۔ خاتون ہنرمندوں کے لئے ایک علحدہ سیل قائم کیا گیا ہے جہاں ان کیلئے مشورے اور رہنمائی فراہم کی جاتی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ ایسے تربیتی پروگرام بھی شروع کئے گئے ہیں جن کا مقصد خواتین کو خود روزگار کی جانب راغب کرنا ہے۔ ان سارے ترقیاتی اقدامات کے باعث خواتین کی سماجی اور اقتصادی صورتحال کو بہتر بنانے میں بڑی مدد ملی ہے۔ اور اب مختلف

شعبوں میں خواتین کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ ۱۹۷۱ء میں خاتون ملازمین کی تعداد ۱۹٫۳۲ لاکھ تھی جبکہ ۱۹۸۶ء میں یہ بڑھ کر ۳۴٫۷۵ لاکھ ہو گئی۔ ۱۹۸۶ء میں عوامی شعبوں میں ان کی تعداد ۱۱٫۹۵ لاکھ تھی جبکہ خانگی شعبہ میں ۱۹۸۶ء کے دوران یہ تعداد ۱۳٫۰۷ لاکھ تک پہونچ چکی ہے۔ تاہم ان تمام کوششوں کے باوجود ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اقتصادی سرگرمیوں کے قومی دھارے میں پوری طرح شامل کرنے کیلئے خواتین کو زیادہ مواقع فراہم کرنے کی ضرورت ہے۔ اعلیٰ تعلیم اور اعلیٰ عہدوں پر خواتین کیلئے جگہ فراہم کرنے کی ضرورت ہے

تجارت میں بھی ان کی حوصلہ افزائی کا کام باقی ہے کیونکہ تجارتی ترقی کوئی آسان بات نہیں ہے۔ اس کے لئے موزوں میکانیکی عمل درکار ہے۔ جو خواتین کو درپیش مسائل کے حل میں رہنمائی کر سکے۔ آج ملک بھر میں یہ شعور اجاگر ہو چکا ہے کہ صنف نازک کی ترقی پر ہی سماجی ترقی کا انحصار ہے۔ اس لئے نہ صرف حکومت بلکہ رضاکارانہ ادارے بھی سماج کے اس مظلوم طبقہ کو ترقی اور کامیابی کی راہوں پر گامزن کرنے کیلئے کوشاں ہیں۔ نیا ہندوستانی سماج انصاف، مساوات اور احترام آدمیت کا سماج ہے جس میں مرد اور عورتیں شانہ بشانہ بیسوی صدی کا سفر طے کرتے ہوئے اکیسویں صدی کی منزل پر پہنچ رہے ہیں۔

جگن ناتھ آزاد کا مجموعہ کلام

بوئے رمیدہ

۱۹۵۹ء سے ۱۹۶۶ء

تک کا کلام شامل ہے

قیمت = /۹۰ روپے

ناشر: نفیس اکیڈیمی، اردو بازار، کراچی، پاکستان

ہندوستان میں ملنے کا پتہ: انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر، ۲۱۲، راوز ایوینو، نئی دہلی

پی آئی بی

جواہر روزگار یوجنا

غریبی کی سطح سے نیچے زندگی بسر کرنے والے ہر ایک کنبے کے ایک فرد کو روزگار فراہم کرنے کے سلسلے میں ایک اہم قدم اس وقت اٹھایا گیا جب سابق وزیر اعظم شری راجیو گاندھی نے پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں "جواہر روزگار یوجنا" کا اعلان کیا۔ اس یوجنا کا اعلان کرتے ہوئے انہوں نے کہا۔

"ملک کے سامنے کوئی بھی مسئلہ اتنا شدید نہیں ہے جتنا کہ بیروزگاری کا مسئلہ۔ ہماری آبادی کا کوئی بھی حصہ اتنا غیر مستفید نہیں ہے جتنا کہ دیہی غرباء۔ ہمارے عوام کا کوئی بھی طبقہ اتنا مزور تمند نہیں ہے جتنا کہ غریب دیہی کنبوں کی خواتین، خاص طور سے وہ خواتین جنکے پاس اپنی کوئی زمین نہیں ہے۔

جواہر روزگار یوجنا میں قومی دیہی روزگار پروگرام، دیہی بے زمین افراد کا روزگار ضمانتی پروگرام اور منتخب پسماندہ اضلاع میں روزگار کا وسیع پروگرام شامل کر دیا گیا ہے۔ اس بات کا اعلان وزیر خزانہ نے ۲ر فروری ۱۹۸۹ء کو لوک سبھا میں ۹۰-۱۹۸۹ء کا بجٹ پیش کرتے ہوئے کیا تھا۔

بھارت میں دیہی بیروزگاری غریبی کی سطح سے نیچے زندگی بسر کرنے والے تقریباً ۴ کروڑ ۴۰ لاکھ کنبوں کا اہم مسئلہ ہے جنھیں ایک عرصہ سے کوئی کام نہیں ملا ہے یا وہ عرصے سے بہت کم اجرتوں پر کام کر رہے ہیں۔ خوش قسمتی سے غریبی کی سطح سے نیچے زندگی بسر کرنے والے افراد کی تعداد کم ہوتی جا رہی ہے۔ توقع ہے کہ دیہی علاقوں میں غریبی کی سطح سے نیچے زندگی بسر کرنے والے افراد کی تعداد ۹۱-۱۹۹۰ میں کم ہو کر ۲۸،۲ فی صد اور ۹۵-۱۹۹۴ تک ۱۰ فیصد رہ جائے گی نیز اس صدی کے آخر تک محض ۵ فیصد رہ جائے گی۔ توقع ہے کہ غریب افراد کی تعداد ۸۵-۱۹۸۴ء میں ۲۷ کروڑ ۲۰ لاکھ سے کم ہو کر ۹۰-۱۹۸۹ء تک ۲۱ کروڑ ۱۰ لاکھ رہ جائے گی۔ یہ بہتری زیادہ تر دیہی علاقوں میں ہو گی۔ غریبی کے خاتمے کے پروگراموں کی تشکیل اور ان پر عمل درآمد کے کام میں کسی قسم کی بھی لاپرواہی سے صورتحال اس کے برعکس ہو سکتی ہے۔

موجودہ صورتحال کے اسباب، جن کی وجہ سے دیہی علاقوں کے لاکھوں قابل افراد پیداواری روزگار سے محروم رہتے ہیں، معلوم کرنا مشکل نہیں ہے۔

— اثاثے کی ملکیت کا غلط طریقہ

— روایتی سماجی و اقتصادی ڈھانچہ

— دیہی علاقوں میں بہت زیادہ غریبی اور بیروزگاری زیادہ تر سماج میں ڈھانچہ جاتی عدم مساوات کی وجہ سے ہے۔

دیہی غرباء کو براہ راست مستفید کرنے کے لئے پہلی مرتبہ چھٹے پنچسالہ منصوبہ میں ملک گیر پروگراموں کے ذریعہ غریبی پر براہ راست حملہ کیا گیا۔

غریبی پر براہ راست حملے کے لئے جن آلہ کار کا انتخاب کیا گیا وہ تھے غرباء کے لئے خود روزگار کی اسکیمیں یعنی مربوط دیہی ترقیاتی پروگرام اور ٹی آر وائی ایس ای ایم اور ڈی ڈبلیو سی آر اے کے اسکے ضمنی پروگرام نیز قومی دیہی روزگار پروگرام اور دیہی بے زمین افراد کے روزگار ضمانتی پروگرام کے اجرتی روزگار کے پروگرام شروع کرنا۔ یہ پروگرام ایکدوسرے کے امدادی پروگرام ہیں۔ مربوط دیہی ترقیاتی پروگرام کا مقصد غریبی کی سطح سے نیچے زندگی بسر کرنے والے ایک کنبے کو حکومت کی امداد اور تجارتی بینکوں کے قرضوں کے ذریعہ آمدنی مہیا کرنے والا اثاثہ فراہم کرنا ہے جب روزگار کے پروگرام غریب افراد کو اجرتی روزگار کے ذریعہ براہ راست آمدنی مہیا کرتے ہیں۔

غریبی کی فی صد میں متوقع کمی غریبی کے خاتمے کے مختلف پروگراموں کے ذریعہ زیادہ خوشحال روزگار کا نتیجہ ہے۔ ان پروگراموں میں قومی دیہی روزگار پروگرام اور دیہی بے زمین افراد کا روزگار ضمانتی پروگرام بڑے پروگرام ہیں۔

قومی دیہی روزگار پروگرام : قومی دیہی روزگار پروگرام اکتوبر ۱۹۸۰ء میں شروع کیا گیا تھا جو ساتویں منصوبہ میں غریبی کے خلاف حکمت عملی کے ایک اہم جزو کے طور پر جاری رہا۔ اس پروگرام پر مرکز اور ریاستوں کے درمیان نصف سا جھے داری کی بنیاد پر عملدرآمد کیا جا رہا تھا۔ اس پروگرام کے تحت پائیدار امداد کو یقینی بنانے کی غرض سے ایک ضلع میں پروجکٹ کی کل لاگت کے ۱۵ فیصد کی حد تک ساز و سامان پر اخراجات دی گئی۔ اس کے نتیجے میں سماجی جنگل بانی، آبپاشی کے چھوٹے پروجیکٹ

دیہی سڑکوں اور عمارتوں کی تعمیر جیسے پروگراموں کے ذریعہ مختلف اثاثے قائم کئے گئے۔
قومی دیہی روزگار پروگرام شروع کرنے کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ دیہی علاقوں میں بے روزگار مردوں اور خواتین کے لئے مزید مفید روزگار کے مواقع پیدا کئے جائیں، غریب افراد کے فائدے نیز دیہی معیشت اور سماجی بنیادی ڈھانچے کو مستحکم بنانے کے لئے پیداواری اجتماعی اثاثے قائم کئے جائیں جن کی وجہ سے دیہی معیشت کی تیزی سے ترقی ہوگی، دیہی غرباء کی آمدنی میں تیزی سے اضافہ ہوگا اور دیہی علاقوں کے مجموعی معیار زندگی میں بہتری آئے گی۔ ساتویں پنجسالہ منصوبے میں اس سلسلے میں ۲۴۸۷.۴۷ کروڑ روپے کے اخراجات فراہم کئے گئے ہیں جن میں ریاستوں کا ۱۲۳۶.۶۶ کروڑ روپے کا حصہ بھی شامل ہے۔ سالانہ ۲۹ کروڑ افرادی دنوں کا روزگار مہیا کرنے کا منصوبہ تھا۔ منصوبے کے پہلے چار برسوں کے لئے کل ۲۰۹۴.۹۱ کروڑ روپے کی رقم مختص کی گئی ہے۔
دیہی بے زمین افراد کا روزگار ضمانتی پروگرام : دیہی بے زمین افراد کا روزگار ضمانتی پروگرام سو فیصد مرکز کے زیر اہتمام پروگرام کے طور پر ۱۵ راگست ۱۹۸۳ء کو شروع کیا گیا تھا۔ اس کا خاص مقصد روزگار پروگرام کے تحت کی گئی سرمایہ کاری کے ذریعہ روزگار کے براہ راست اور طویل مدتی مواقع میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کرنا اور کم اجرت والے علاقوں میں منڈی کی اجرتی شرح کو اجرت کی قانونی شرحوں کی سطح تک مستحکم بنانے میں مدد کرنا ہے۔
درحقیقت یہ نیا پروگرام چھٹے منصوبے میں قومی دیہی روزگار پروگرام کے اخراجات میں اضافہ کی ایک تجویز کے سلسلے میں وضع کیا گیا تھا تاکہ خاص طور پر دیہی بے زمین کنبوں کو روزگار کے مزید مواقع فراہم کئے جائیں۔ یہ زیادہ مناسب سمجھا گیا کہ اس مقصد کے لئے ایک الگ اسکیم تیار کی جائے۔ اس طرح دیہی بے زمین افراد کا روزگار ضمانتی پروگرام وجود میں آیا۔ اس پروگرام کے تین بنیادی مقاصد ہیں پہلا مقصد یہ ہے کہ خاص طور سے ہر دیہی بے زمین مزدور کے لئے روزگار کے مواقع کو بہتر بنایا جائے اور ان میں اضافہ کیا جائے تاکہ ہر ایک دیہی بے زمین مزدور خاندان کے کم از کم ایک فرد کیلئے سال میں ۱۰۰ دن تک کے روزگار کو یقینی بنایا جائے۔ دیگر دو مقاصد لگ بھگ قومی دیہی روزگار پروگرام کے آخری دو مقاصد جیسے ہی ہیں۔
ساتویں منصوبے کے دوران اس پروگرام کے لئے ۳۷۴۳.۷۸ کروڑ روپیہ کی رقم فراہم کی گئی ہے

اور ۳۰۔۱۰ لاکھ افرادی ذنوں کا روزگار مہیا کرنے کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے ۔ اصل فراہمات اور روزگار کے مواقع کی فراہمی نشانے سے کہیں زیادہ ہے ۔

دیہی روزگار پروگراموں کے تحت اعداد و شمار کے اعتبار سے نشانے عملی طور سے حاصل کر لئے گئے ہیں لیکن اس کے عملدرآمد میں بہت سی کمیاں ہیں کچھ عام اور اہم کمزوریاں یہ ہیں ۔

— کم از کم اجرتوں کی عدم ادائیگی
— اجرتوں کی ادائیگی میں تاخیر
— پروگرام میں ٹھیکے داروں کی مداخلت
— روزگار میں خواتین کو کم ترجیح
— دیکھ بھال کے منصوبے اور قائم کردہ اثاثوں کی فہرست کی کمی ۔
— پیداواری اقتصادی اثاثوں کے بجائے سماجی اثاثوں یعنی تعمیراتی کاموں پر زور
— خشک سالی کی روک تھام کے کاموں پر توجہ نہ دینا ، چھوٹی آبپاشی اور مٹی کے تحفظ کے کاموں کو کم ترجیح ۔
— مستقل اثاثے قائم کرنے کے کام کو ایک مقصد کے طور پر انجام دیا گیا ، کم اجرت والے علاقوں میں اجرتی روزگار کے مواقع پیدا کرنے کی ضرورت اس مقصد کے ماتحت ہو گئی ہے ۔
— مستقل اثاثے قائم کرنے کی فکر سے پروگرام کے تحت روزگار کے امکانات پر اکثر برا اثر پڑا ہے ۔
— منصوبہ بندی اور نگرانی کے ناکافی انتظامات

اس اسکیم کے نفاذ سے حاصل کئے گئے تجربے اور مندرجہ بالا کمزوریوں کی روشنی میں یہ ضروری محسوس کیا گیا کہ تبدیل شدہ ضروریات کے مطابق پروگرام کی تشکیل نو کی جائے ۔ نیا ڈھانچہ تیار کرنے کیلئے مختلف مذاکروں ، سکریٹریوں کی کمیٹیوں اور دیگر فورموں میں اس معاملہ پر تبادلہ خیالات کیا گیا ۔ ان کی سفارشات کا خلاصہ یہ ہے ۔

(i) قومی دیہی روزگار پروگرام اور دیہی بے زمین افراد کے روزگار ضمانتی پروگرام کو روزگار کے ایک پروگرام میں ضم کر دیا جائے ۔

(ii) پروگرام کے تحت اقتصادی پالیسیات ترقیات کی مشق [illegible] کو [illegible] جانی چاہئیں
یہ رقوم [illegible] ختم ہونے کے بعد [illegible] کو منتقل کریں۔ ہر [illegible] پنچایت کو [illegible] کم سے کم
ایک مرتبہ [illegible] کام [illegible] چاہیے۔

(iii) اسکیمیں [illegible] فوائد زیادہ سے زیادہ اضافہ کرنے کیلئے وسیع پیمانے پر پروجیکٹ
تیار کئے جانے چاہئیں۔

(iv) عام طور پر زیادہ کی تیاری پر صرف کی گئی رقم روزگار اسکیموں کے تحت منتقل کردہ رقم کے ۲۵
فیصد سے زائد نہیں ہونی چاہیئے۔

(v) پرائمری اسکولوں کی عمارتوں کو چھوڑ کر دیگر تعمیراتی کاموں پر پابندی عائد ہونی چاہیئے۔

(vi) درج فہرست ذاتوں اور قبیلوں کے لئے انفرادی طور پر مستفید ہونے والوں کے پروگرام شروع
کرنے [illegible] دس فیصد تخصیص کی بجائے ۲۰ فیصد تخصیص کی جانی چاہئیں۔

(vii) اندرا آواس یوجنا میں ترمیم کر کے مکانوں کی تعمیر، بجلی پلاٹوں کو بھی شامل کیا جانا چاہیئے اور
بجلی مکانات پر حکومت کی سرمایہ کاری کم کر کے میدانی علاقوں میں ۶ ہزار روپیہ اور پہاڑی علاقوں
میں ۷۰۰۰ روپے کی جانی چاہیئے۔

(viii) سماجی جنگل بانی کا پروگرام صرف ایسے علاقوں میں شروع کیا جانا چاہیئے جہاں غریبوں کی رسائی
ہو اور مقامی کامکمل طور پر شرکت ہو سکے۔

(ix) اجرتوں اور غیر اجرتوں کا تناسب ۶۰ اور ۴۰ ہونا چاہیئے۔

(x) بلاکوں میں سارا کام پنچایتوں کے ذریعہ ہونا چاہیئے اور اصولی طور پر کسی ٹھیکے دار کی خدمات حاصل
نہیں کی جانی چاہئیں۔

جواہر روزگار یوجنا: سال ۹۰-۱۹۸۹ کے بجٹ میں وزیر خزانہ نے ایک نئی اسکیم کا اعلان کیا
ہے جس کے لئے ۵۰۰ کروڑ روپے کا اہتمام کیا گیا ہے تاکہ بہت زیادہ غریبی اور بیروزگاری والے
پسماندہ اضلاع میں وسیع پیمانے پر روزگار مہیا کیا جائے۔ جواہر لال نہرو روزگار یوجنا کے نام سے
اس اسکیم کا مقصد یہ ہے کہ پسماندہ اضلاع میں نئی اسکیموں کے تحت مختص کی گئی رقومات قومی دیہی روزگار
پروگرام اور دیہی بے زمین افراد کے روزگار ضمانتی پروگرام کے علاوہ استعمال کی جائیں۔ لیکن ان اسکیموں

زیادہ موثر طور پر عمل درآمد کے لیے حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ روزگار کے نئے پروگرام، قومی دیہی روزگار پروگرام اور دیہی بے زمین افراد کے روزگار ضمانتی پروگرام کو ختم کر دیا جائے۔ نئے پروگرام کا نام جواہر روزگار یوجنا رکھا گیا ہے اس یوجنا کے اخراجات مرکز اور ریاستیں ۸۰ اور ۲۰ کے تناسب سے برداشت کریں گے۔

یوجنا کی اہم خصوصیات : جواہر روزگار یوجنا کی مندرجہ ذیل اہم خصوصیات ہیں

(۱) ۔ نئے پروگرام کے تحت مرکزی امداد اضلاع کو براہ راست دی جائے گی۔

فی فرد فی دن اجرتوں کے ایک حصہ کے طور پر ۱٫۵ کلو گرام اناج دینے کا موجودہ نظام جاری رہے گا

(۲) ریاستوں اور مرکزی انتظام کے علاقوں کو غریبی کی صورت حال کی بنیاد پر رقوم دی جائیں گی۔

۲۱۰۰ کروڑ روپیہ کی ریاست وار تقسیم کی تفصیلات اس طرح ہیں۔

غریبی کی صورت حال کے اعتبار سے رقوم کی ریاست وار تخصیص

نمبر شمار	ریاستوں اور مرکزی انتظام کے علاقے	غریبی کی سطح سے نیچے زندگی گذارنے والے دیہی آبادی کی فیصد	۲۱۰۰ کروڑ روپے میں سے رقوم کی تخصیص (لاکھ روپیہ میں)
۱	۲	۳	۴
۱۔	آندھرا پردیش	۷٫۴۲۲	۱۵۵۸۶٫۲۰
۲۔	اروناچل پردیش	۰٫۱۱۸	۲۴۷٫۸۰
۳۔	آسام	۲٫۰۲۸	۴۲۵۸٫۸۰
۴۔	بہار	۱۴٫۸۷۲	۳۱۲۳۱٫۲۰
۵۔	گوا	۰٫۱۳۰	۲۷۳٫۰۰
۶۔	گجرات	۳٫۰۵۶	۶۴۱۷٫۶۰
۷۔	ہریانہ	۰٫۷۴۲	۱۵۳۷٫۲۰
۸۔	ہماچل پردیش	۰٫۳۶۲	۵۵۰٫۲۰
۹۔	جموں و کشمیر	۰٫۳۴۶	۷۶۸٫۶۰
۱۰۔	کرناٹک	۴٫۶۴۶	۹۷۵۶٫۶۰
۱۱۔	کیرالا	۲٫۵۲۴	۵۳۰۰٫۴۰

۱	۲	۳	۴
۱۲.	مدھیہ پردیش	۹٫۸۴۲	۲۰۶۶۸٫۲۰
۱۳.	مہاراشٹر	۷٫۹۵۰	۱۶۶۹۵٫۰۰
۱۴.	منی پور	۰٫۰۶۰	۱۲۶٫۰۰
۱۵.	میگھالیہ	۰٫۱۷۶	۳۶۹٫۶۰
۱۶.	میزورم	۰٫۰۷۲	۱۵۱٫۲۰
۱۷.	ناگالینڈ	۰٫۱۹۴	۴۰۷٫۴۰
۱۸.	اڑیسہ	۴٫۸۶۲	۱۰۲۱۰٫۲۰
۱۹.	پنجاب	۰٫۶۱۸	۱۲۹۷۸٫۸۰
۲۰.	راجستھان	۴٫۷۴۰	۹۹۵۴٫۰۰
۲۱.	سکم	۰٫۰۷۶	۱۵۹٫۶۰
۲۲.	تامل ناڈو	۶٫۶۶۴	۱۳۹۹۴٫۴۰
۲۳.	تریپورہ	۰٫۲۰۸	۴۳۶٫۸۰
۲۴.	اتر پردیش	۱۹٫۸۶۴	۴۱۷۱۴٫۴۰
۲۵.	مغربی بنگال	۸٫۳۰۲	۱۷۴۳۴٫۲۰
۲۶.	انڈمان و نکوبار جزائر	۰٫۰۲۸	۵۸٫۸۰
۲۷.	چنڈی گڑھ	۰٫۰۰۴	۸٫۴۰
۲۸.	دادرا اور نگر حویلی	۰٫۰۱۸	۳۷٫۸۰
۲۹.	دہلی	۰٫۰۹۰	۱۸۹٫۰۰
۳۰.	دمن اور دیو	۰٫۰۱۴	۲۹٫۴۰
۳۱.	لکشدیپ	۰٫۰۰۴	۸٫۴۰
۳۲.	پانڈیچری	۰٫۰۵۸	۱۲۱٫۰۰
	[illegible]	۱۰۰٫۰۰۰	۲۱۰۰۰۰٫۰۰۰

(۲) تاہم ضلعی تخصیص زر مندرجہ ذیل بنیاد پر کی جائے گی۔

(الف) کل کارکنان کی فیصد کے مقابلے میں زرعی کارکنان

(ب) کل دیہی آبادی کی فیصد کے مقابلے میں درج فہرست ذاتوں اور درج فہرست قبیلوں کی دیہی آبادی

(ج) کل ایک ہیکٹر رقبہ سے ایک سال میں زرعی پیداوار کی مالیت کی بنیاد پر نکالی گئی زرعی پیداواریت کا برعکس

(۷) ضلع کی سطح پر مختص شدہ کل رقم میں سے کم از کم ۸۰ فیصد رقم آبادی کی بنیاد پر پنچایتوں اور منڈلیں میں تقسیم کی جائے گی۔

(۸) وسائل کی شعبہ جاتی تخصیص حسبِ ذیل طریقہ سے کی جائے گی۔

پہلی تبدیلی

انتظامی اخراجات	۵ فیصد
رکھ رکھاؤ پر آنے والے اخراجات	۱۰ فیصد
اندرا آواس یوجنا (آئی اے وائی)	۶ فیصد

دیگر شعبہ جاتی کاموں کیلئے بقیہ وسائل

اقتصادی پیداواری اثاثے	۳۵ فیصد
سماجی جنگل بانی	۲۵ فیصد
درج فہرست ذاتوں اور درج فہرست قبیلوں کیلئے انفرادی طور پر مستفید ہونے کی اسکیمیں جن میں لاکھوں کنوں کی اسکیم بھی شامل ہے	۱۵ فیصد
سڑکوں، عمارتوں وغیرہ سمیت دیگر اسکیمیں	۲۵ فیصد

مندرجہ بالا امور کے تقاضا جات سمیت بقیہ ۲۵ فیصد فنڈز کا استعمال سڑکوں، عمارتوں سمیت دیگر اسکیموں کے لئے کیا جا سکتا ہے۔

معائنہ اور نگرانی: بنیادی طور پر اس پروگرام کے تحت معائنہ اور نگرانی کے کام کی ذمہ داری ریاستی حکومتوں پر عائد ہوگی جن میں ضلعی سطح سے معلومات اکٹھا کر کے ماہانہ، سہ ماہی اور سالانہ بنیاد پر مقررہ فارم میں یہ معلومات فراہم کرنی ہوگی جیسا کہ وہ مربوط دیہی ترقیاتی پروگرام کے معاملے میں کرتی ہیں۔ حکومت ہند ابتداء میں ریاستی حکومتوں سے توقع کرے گی کہ وہ وقتاً فوقتاً رپورٹیں پیش کریں جیسا کہ وہ اس وقت دیہی روزگار پروگرام کے معاملے میں کر رہی ہیں۔ ضلع کی سطح سے معلومات مقررہ فارم میں ریاستوں کو مہیا کرتی ہوں گی۔ جیسا کہ اب تک مہیا کی جاتی ہیں۔ اضلاع مناسب طریقہ سے گاؤں کی پنچایتوں کے بلاکوں کے ذریعہ معلومات حاصل کریں گے۔

فوائد: جواہر روزگار یوجنا پر عملدرآمد سے مندرجہ ذیل طریقے سے ان خامیوں کو دور کرنے میں مدد ملے گی جن کی نشاندہی اس سے قبل قومی دیہی روزگار پروگرام اور دیہی بے زمین افراد کے روزگار ضمانتی پروگرام کے سلسلے میں کی جا چکی ہے۔

(ا) روزگار کے ایک واحد پروگرام پر عملدرآمد سے عملی سطح پر کسی بھی ممکنہ پریشانی سے بچا جا سکے گا۔

(اا) اس سے موجودہ سطح پر اقتصادی بوجھ ریاست پر ہی پڑے گا۔

(ااا) غریبوں کا صد فیصد تناسب پسماندگی اور بیروزگاری کیلئے جانچ کا بہترین اصول ہوگی جس سے غریب تر ریاستوں کو اس پروگرام کے تحت روزگار کے مطلوبہ مواقع پیدا کرنے کیلئے مناسب وسائل حاصل کرنے میں مدد ملے گی۔

(۷) پسماندگی کے اصول کی بنیاد پر کی گئی ریاستی تخصیص زر میں سے کی جانے والی ضلعی تخصیص زر سے خاص طور سے پسماندہ علاقوں کی ضروریات پوری ہوں گی۔ اس پسماندگی کا اظہار درج فہرست ذاتوں اور قبیلوں کی آبادی، زرعی مزدوروں کی تعداد، چھوٹے کسانوں اور چھوٹے کاشتکاروں نیز اضلاع کی زرعی پیداواریت سے ہوگا۔

(۷) اضلاع کیلئے رقوم کی براہ راست تقسیم سے عملدرآمد کی اداروں تک وسائل کی بہم رسانی میں ہونے والی تاخیر ختم ہو جائیگی۔ (۷) گرام پنچایتوں کو رقوم کی تخصیص کے نتیجے میں پروگرام کے دائرہ کار میں اضافہ ہوگا ... آخری لیکن اہم بات یہ ہے کہ اس سے منصوبہ بندی کے عمل ... میں عوام شامل ہوں گے۔

روبوٹ

روبوٹ چک زبان کا لفظ ہے جسکے معنی غلام کی طرح کام کے ہیں۔ حقیقت میں آج کل کی دنیا میں روبوٹ ایک بالکل الگ چیز ہے جدید روبوٹ جو صنعتوں اور کارخانوں میں استعمال ہوتے ہیں دیکھنے میں انسان کی طرح نظر نہیں آتے لیکن وہ اکثر انسانوں کی طرح حرکت کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کے دست و بازو انسان کے دست و بازو کی طرح حرکت کرسکتے ہیں۔ دو ہزار سال قبل ہی سے لوگوں نے ایسی میکانیکل اشیاء بنانے کی کوششیں کی ہیں جو کسی انسان یا جانور کی طرح نظر آتی یا چلتی ہوں۔ اس قسم کی سب سے کامیاب مشین ۱۷۳۸ء اور ۱۷۷۴ء کے دوران بنائی گئی اور جنھیں آٹومیٹا کا نام دیا گیا ہے۔ آٹومیٹا خود بخود چلنے والی مشین کو کہتے ہیں۔ چنانچہ اس قسم کی ساز بجانے والی LUTE PLAYER بنائی گئی ہے کہ جب وہ چلتی ہے اور جب وہ ساز کے تاروں پر ہاتھ چلاتی ہے تو اپنا سر ایک طرف سے دوسری طرف ہلاتی ہے۔ یہ بات ذکر کے قابل ہے کہ ایک خود بخود چلنے والی مشین جو گھڑی کی طرح کام کرتی ہے اور صرف ایک ہی قسم کا کام خود بخود کرسکتی ہے کوئی دماغ نہیں رکھتی اور اپنی معینہ حرکت کو بدل نہیں سکتی۔ روبوٹ کا موجودہ تصور اس مرحلہ سے بہت آگے نکل گیا ہے۔

ایک خود بخود حرکت کرنے والی مشین کو دماغ نہیں ہوتا یعنی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہوتی ہے لیکن روبوٹ میں بظاہر ایسی صلاحیت ہوتی ہے روبوٹ کا دماغ اس کا کمپیوٹر ہوتا ہے لیکن ایک کمپیوٹر ہی اس بات کیلئے کافی نہیں ہے کہ روبوٹ میں انسان کی طرح ضرورت کے مطابق حرکت کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ اس کے لئے روبوٹ فیڈ بیک کی ضرورت ہوتی ہے۔

فیڈ بیک کو ایک مثال سے واضح کیا جاسکتا ہے۔ ایک انڈے کو پکڑتے وقت آپ کو اس بات کی اطلاع کہ آپ انڈے کو کس قدر مضبوط پکڑے ہوئے ہیں آپ کو انگلیوں سے پہنچتی

کہ احساس کے ذریعہ دماغ تک پہنچائی جاتی ہے۔ اگر آپ انڈے کو اس قدر مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہیں کہ انڈے کے ٹوٹنے کا اندیشہ ہو جائے تو آپ کا دماغ آپکی انگلیوں کے رگ پٹھوں کو یہ پیغام بھیجتا ہیکہ وہ اپنی گرفت (پکڑ) ڈھیلی (کمزور) کریں۔ اگر آپ گرفت کو بہت زیادہ ڈھیلی کریں کہ انڈے کے گر جانے کا ڈر ہو تو آپ کا دماغ پھر انگلیوں کے رگ پٹھوں کو یہ حکم دیتا ہے کہ وہ انڈے کو اور دبا کے پکڑلیں "احساس" اور "احکام" کے اس سلسلے کو فیڈ بیک کیا جاتا ہے۔ آج کل روبوٹ فیکٹریوں میں پائے جاتے ہیں۔ جہاں وہ زیادہ تھکا دینے والے متواتر کام کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ یہ ایسے کام ہوتے ہیں جو انسان کیلئے دشوار ہوتے ہیں۔ مثلاً کسی چیز کا اٹھانا رنگ کرنا ویلڈنگ کرنا اور پارٹس کو ایک جگہ کرنا اور جانا۔

صنعتی روبوٹ کو عام طور پر ایک بازو ہوتا ہے۔ جسکو ایک کمپیوٹر کے ذریعہ کنٹرول کیا جاتا ہے۔ اس کے پروگرام کو بھی تبدیل کیا جاسکتا ہے تاکہ وہ کئی قسم کے کام کرسکے۔ لیکن روبوٹ کو سمجھ نہیں ہوتی۔ اور ان واقعات سے متاثر نہیں ہوتے جو ان کے اطراف واقع ہورہے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک روبوٹ چیزیں اٹھاتا ہی جائیگا اگرچہ کہ اب کوئی چیز اٹھانے کے لئے باقی بھی نہیں رہی ہو۔

روبوٹ کا دماغ ایک ڈیجیٹل کمپیوٹر ہوتا ہے۔ اس قسم کا کمپیوٹر ہندسوں کی بنیاد پر کام کرتا ہے ہر قسم کے معلومات کو وہ ہندسی بنیاد میں تبدیل کردیتا ہے۔ ابتداء میں کمپیوٹر کو معلومات مہیا کرنا پڑتا ہے۔ یہ عمل ایک آپریٹر کے ذریعہ ہوتا ہے جو ان معلومات کو کمپیوٹر ٹرمنل کے کی بورڈ پر ٹائپ کرتا ہے۔ ایک کمپیوٹر بہت زیادہ معلومات محفوظ رکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور ناقابل یقین تیزی سے اپنا کام کرتا ہے۔ شروع شروع میں کمپیوٹر بہت بڑے سائز کے اور والوز اور تاروں کے بنے ہوئے ہوتے ہیں اس کے بعد ٹرانسسٹر نے والوز کی جگہ حاصل کرلی اور کمپیوٹر سائز میں چھوٹے ہوگئے۔

آج کل ٹرانسسٹرز اور دوسرے الکٹرانک پارٹس کو سیلیکن کے کسی ٹکڑے پر رکھا جاتا ہے سیلیکن چپس کو پلاسٹک کیس میں جمایا جاتا ہے اور سرکٹ بورڈ پر لگا دیا جاتا ہے۔ اس طرح سرکٹ بورڈ کو ایک جگہ اکٹھا کرکے کمپیوٹر بنایا جاتا ہے۔

روبوٹ کا دماغ یا کمپیوٹر کئی اہم اجزاء پر مشتمل ہوتا ہے سب سے پہلے ان پٹ یونٹ ہوتا ہے جس میں معلومات کا مواد داخل کیا جاتا ہے اور جس کے ذریعہ کمپیوٹر کو یہ کہا جاتا ہے کہ اسے کیا کرنا ہے۔ ان پٹ یونٹ ایک کی بورڈ ہو سکتا ہے یا کسی خاص قسم کا آلہ ہو سکتا ہے۔ کمپیوٹر کے اندر سنٹرل پروسسنگ یونٹ ان پٹ ڈیٹا کو وصول کرتا ہے اور دوسرے یونٹ کو بھیجتا ہے۔ حسابی یونٹ حسب ضرورت کام کرتا ہے اور حافظہ ضرورت کے مطابق مزید معلومات فراہم کرتا ہے۔ بعض وقت ایک کمپیوٹر کو زائد حافظے سے معلومات حاصل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب کمپیوٹر اپنا کام کر دیتا ہے تو سنٹرل پروسسنگ یونٹ نتیجے کو اوٹ پٹ یونٹ روانہ کرتا ہے کسی بھی روبوٹ میں اوٹ پٹ الکٹرانک سگنلس کی شکل میں ہوتا ہے مثال کے طور پر کسی روبوٹ کے بازو کو ایسی حرکت دی جاتی ہے جس سے نتیجہ معلوم ہو جاتا ہے۔ یہ بتانے کیلئے کہ روبوٹ کو کیا کرنا چاہیئے اسے ہدایات کی ایک فہرست دی جاتی ہے جسے پروگرام کہتے ہیں اور جو کمپیوٹر میں داخل کیا جاتا ہے لیکن چونکہ ایک کمپیوٹر صرف اپنے سوئچس کو آن اینڈ آف کرتا ہے اس لئے پروگرام کو معمولی درجوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اس میں دو قسم کے درجے ہوتے ہیں۔ ایک درجہ ہدایات کا درجہ ہوتا ہے۔ جو کمپیوٹر کو سیدھا سادھا حسابی عمل کیلئے یا روبوٹ کے ایک حصے کو حرکت دینے کیلئے ہوتا ہے۔ دوسرا درجہ فیصلہ کن ہوتا ہے اور کمپیوٹر خود سے ایسا سوال کرتا ہے جس کا جواب ہاں یا نہیں ہو۔ ہمارے جسم میں ایسے اعضاء جوڑ اور رگ پٹھے موجود ہیں کہ ہم آسانی سے حرکت کر سکتے ہیں اور بے شمار کام انجام دے سکتے ہیں۔ اسی طرح ہم چاہتے ہیں کہ روبوٹ کو ایسے اعضاء اور جوڑ فراہم کئے جائیں کہ وہ انسان کی طرح بآسانی حرکت کر سکے اور اس کے میکانی اعضاء میں انسانی اعضاء کی طرح لچک پیدا ہو سکے ہر جوڑ جس حد کے اندر اور جس طریقے سے حرکت کر سکتے ہیں اسے ڈگری آف فریڈم کہتے ہیں۔ ایک انسان کے دست و بازو حیرت انگیز طور پر لچکدار ہوتے ہیں وہ جملہ چالیس ڈگری آف فریڈم رکھتے ہیں بالفاظ دیگر چالیس مختلف سمتوں میں حرکت کر سکتے ہیں۔ انسانی ہاتھ بائیس ڈگری آف فریڈم رکھتا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ جب انسانی ہاتھ کے جوڑ حرکت میں آتے ہیں تو وہ انگلیوں انگوٹھے اور کلائی کو بائیس مختلف سمتوں میں حرکت دے سکتے ہیں۔ اس کے برخلاف

بہت سے اعلیٰ قسم کے صنعتی بازو چھ ڈگری آف فریڈم رکھتے ہیں یعنی چھ مختلف سمتوں میں حرکت کر سکتے ہیں۔

یہ دس ڈگری آف فریڈم عام طور پر روبوٹ کے بازو کو قابل استعمال اور کارآمد بنانے کے لئے کافی ہیں۔ بعض روبوٹ تو صرف چھ ڈگری آف فریڈم رکھتے ہیں یعنی چھ مختلف سمتوں میں حرکت کر سکتے ہیں۔

مثلاً: ۱۔ بازو کا ایک سمت حرکت کرنا

۲۔ بازو کا اوپر سے نیچے حرکت کرنا

۳۔ بازو کا آگے پیچھے حرکت کرنا

۴۔ کلائی کو نیچے اوپر کرنا

۵۔ کلائی کو دائیں طرف اور بائیں طرف دھکیل دینا

۶۔ کہنی کو نیچے اوپر حرکت دینا

روبوٹ کے ہر ڈگری آف فریڈم حرکت کو ایک علیحدہ جوڑ فراہم کیا گیا ہے۔ دو الگ الگ جوڑوں کو ایک ہی وقت میں حرکت دینے سے روبوٹ کے بازو کو کسی سمت بھی حرکت دی جا سکتی ہے اور حسب ضرورت پوزیشن میں رکھا جا سکتا ہے۔ وہ روبوٹ جو ایک جگہ نصب ہوتے ہیں ان کی پہنچ محدود ہوتی ہے۔ وہ رقبہ جہاں تک ایسے روبوٹ کا ہاتھ پہنچ سکتا ہے اسے روبوٹ کا ورک اسپیس کہتے ہیں۔ ایک روبوٹ کیلئے ایک چیز کو ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ رکھنا اسی صورت میں ممکن ہو سکے گا جب وہ چیز روبوٹ کے ورک اسپیس کے اندر ہو۔ روبوٹ کے ورک اسپیس کے اندر کسی چیز کو اٹھا کر دوسری جگہ رکھنے کیلئے دو حرکتیں کلائی کے ذریعہ اور باقی تین حرکتیں کہنی، بازو اور کمر کی حرکتوں کے شامل ہونی چاہیئے۔

پک اینڈ پلیس روبوٹ کوئی چیز اٹھانے والا اور رکھنے والا روبوٹ سب سے زیادہ آسان لیکن سب سے زیادہ بھدا روبوٹ ہوتا ہے۔ اس قسم کا روبوٹ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے کوئی چیز کو اٹھانے کیلئے اور اسے دوسری جگہ منتقل کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ روبوٹ کے ذریعہ منتقل اور اٹھانے کا یہ کام آسانی اور تیزی سے کیا جا سکتا ہے۔

روبوٹ کے بازو کی حرکت کو بجلی کے ذریعہ کنٹرول کیا جاتا ہے ایک کنٹرولنگ یونٹ اس امر کا اطمینان کرتا ہے کہ بازو صحیح سمت میں حرکت کر رہے ہیں۔ اور اچھی حالت میں ہیں۔ میکانکی رکاوٹیں روبوٹ کے بازو کو بہت دور تک جانے سے روکتی ہیں۔

پک اور پلیس روبوٹ کی پروگرامنگ کافی سادہ ہے۔ روبوٹ کے پلگ بورڈ میں الکٹرک کنکشن کے ذریعہ پلگ لگا کر روبوٹ کی پروگرامنگ کی جاتی ہے ان الکٹرک کنکشن کو بدل کر ہی پروگرامنگ کی جا سکتی ہے۔ ایک پک اور پلیس روبوٹ کے دست و بازو انتہائی قوت سے اس وقت سے ادھر ادھر حرکت کرتے ہیں جب تک کہ وہ کسی میکانی رکاوٹ سے ٹکرا نہ جائیں۔ روبوٹ کو کسی قسم کا احساس نہیں ہوتا اس لئے یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ اس کے دست و بازو کہاں اور کس رفتار سے حرکت کر رہے ہیں۔ زیادہ ترقی یافتہ روبوٹ فیڈ بیک اور کمپیوٹر حافظہ رکھتے ہیں۔

مثال کے طور پر ایک ویلڈنگ روبوٹ کے ہر جوڑ میں ایک مقامی احساس ہوتا ہے۔ وہ مسلسل روبوٹ کے دماغ میں معلومات کو فیڈ بیک کرتا ہے جس کے نتیجے میں روبوٹ کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کے دست و بازو کس پوزیشن میں اور کس رفتار سے حرکت کر رہے ہیں۔ جب روبوٹ کا جوڑ ایک ایسے خاص پوزیشن پر پہنچ جاتا ہے جو روبوٹ کے حافظے میں محفوظ ہے تب اس کے دست و بازو ایک تھوڑے وقفہ کے لئے رک جاتے ہیں اور اس کے بعد دوسرا دور شروع کرتے ہیں۔

روبوٹ پروگرام کے مطابق عمل کرتا ہے اور اپنے دست و بازو کو ایک مستقل رفتار سے ہدایات کے مطابق حرکت دیتا ہے۔ روبوٹ میں ٹیلی ویژن کیمرہ لگانا آسان ہے۔ لیکن یہ بات زیادہ مشکل ہے کہ روبوٹ کا دماغ اس چیز کی شناخت بھی کر سکے جو کیمرہ سے نظر آرہا ہے۔ اس کے لئے سب سے بہتر ترکیب یہ ہے کہ کسی ایک چیز کی تصویر روبوٹ کے حافظے میں محفوظ کر دی جائے۔

جب روبوٹ کام پر ہوتا ہے تب اس چیز کا مقابلہ جسے وہ کیمرہ سے دیکھ رہا ہو اس تصویر سے کرتا ہے جو اس کے حافظے میں محفوظ ہے اور جب دونوں تصویریں یکساں ہو جاتی ہیں تو روبوٹ اس چیز کو پہچانتا ہے اور اسی مناسبت سے جوابی عمل کے قابل ہو جاتا ہے۔ ایک روبوٹ جب چلتا ہے تو اسے اپنا توازن سنبھالنا ضروری ہوتا ہے پہیئے اور راستے پاؤں کے مقابلے میں زیادہ مضبوط اور پائیدار ہوتے ہیں۔ لیکن پہیوں کیلئے بہت چکنی زمین کی ضرورت ہوتی ہے۔

پدماوتی بی، حیدرآباد

متوازن غذا کیوں ۔ ؟

ایک عام ہندوستانی سونچتا ہیکہ متوازن غذا کا وہ متحمل نہیں ہوسکتا۔ لیکن اس کا یہ خیال درست نہیں چونکہ متوازن غذا کے بارے میں اسکی معلومات ناکافی ہیں صحت مند رہنے کیلئے وہ سمجھتا ہیکہ جو بھی غذا وہ استعمال کررہا ہے اسکی زیادہ مقدار پیٹ میں پہنچنے یا پھر قیمتی غذا میں استعمال کرے۔ اسے یہ بات معلوم نہیں کہ گھریلو بجٹ کے مطابق اسی صرفہ سے وہ اپنے خاندان کیلئے متوازن اور مقوی غذا فراہم کرسکتا ہے گو کہ چند غذاوں کی مقدار قلیل ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ ہمیں یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیئے کہ ہمارا غذائی نظام جتنا وسیع ہوگا اتنی ہی ہماری تندرستی بہتر ہوگی۔ اسی لئے ضروری ہیکہ ہم متوازن غذا کی اہمیت اور افادیت سے واقف ہوں۔

انسانی غذا کسی خاص قسم کی غذا تک محدود نہیں حیاتیاتی اور نباتاتی دونوں قسم کے بیشمار غذائیں استعمال کی جاسکتی ہے تنوع انسانی فطرت کا خاصہ ہے چنانچہ اسی فطری خواہش کے تابع ہمیں قسم قسم کی غذائیں استعمال کرنی پڑتی ہے اور کسی ایک قسم کی غذا سے ہم تمام ضروری مقوی اجزاء حاصل نہیں کرسکتے۔ جسم اور دماغ کے صحیح افعال نیز جسمانی اور دماغی طور پر چست رہنے کیلئے ہمیں متوازن غذا استعمال کرنی چاہیئے طبی اصطلاح میں "متوازن غذا" کے معنی ایسی غذا جو ہمیں درکار (۲۳) اہم مقوی اجزاء مہیا کرتی ہے اور جو ہماری روزمرہ زندگی کیلئے ضروری ہے سائنٹفک نقطہ نظر سے اچھی اور مقوی غذا میں پروٹینس، کاربوہائیڈریٹس، چکنائی، وٹامنس، دھاتوں اور پانی کی مناسب مقدار پائی جانی چاہیئے۔ ایسی غذا جسمانی نشوونما، ذہنی چستی طویل عمر اور پرکشش شخصیت کی تشکیل کی ضامن ہوتی ہیں۔ اسی لئے غذا میں مذکورہ اجزاء کو بنیادی اہمیت حاصل ہے

پروٹینس کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ وہ انسانی خلیہ اور بافتی نظام کے اہم اجزاء میں شمار ہوتے ہیں۔ نیز ہمارے مدافعتی نظام میں بھی پروٹینس موثر رول ادا کرتے ہیں وہ جسم کو

داخل ہونے والے مضر افرازات کو ناکارہ بنا دیتے ہیں انسانی زندگی کیلئے پروٹینس کی اہمیت کا اندازہ اس طرح بھی واضح کیا جا سکتا ہے کہ اگر کسی دن جسم کو درکار پروٹینس کی مقدار صفر کی سطح تک پہنچ جائے تو موت واقع ہو جاتی ہے۔

پروٹینس دو قسم کے ہوتے ہیں اعلیٰ درجے کے اور ادنیٰ درجے کے۔ اعلیٰ درجہ کے پروٹینس انڈا، دودھ، پنیر، دہی اور دوسرے حیوانی پروٹینس میں پائے جاتے ہیں۔ ادنیٰ درجہ کے پروٹینس عام طور پر نباتاتی پروٹینس کہلاتے ہیں جو سخت خول والے پھلوں اور پھلیوں اور دالوں میں پائے جاتے ہیں۔

چکنائی یا چربی سے توانائی حاصل ہوتی ہے۔ یہ بھی دو طرح کی ہوتی ہیں۔ حیوانی اور نباتاتی حیوانی چربی عام طور پر نیم ٹھوس ہوتی ہے جبکہ نباتاتی چربی سیال حالت میں ہوتی ہے چربی یا چکناہٹ کے استعمال کا انحصار انسان کے وزن اور اسکی جسمانی حالت سے ہوتا ہے۔

کاربوہائیڈریٹس جسمانی توانائی کے اہم سرچشمے ہیں۔ یہ ہر قسم کے نشاستہ اور شکر میں پائے جاتے ہیں توانائی کے سستے ذرائع ہونے کی وجہ سے ہندوستانی غذاؤں کا بڑا حصہ کاربوہائیڈریٹس پر مشتمل ہوتا ہے۔

اجناس جیسے چاول، گیہوں، مکئی، باجرہ، دودھ، گوشت، مچھلی میں نشاستہ اور پروٹین پائے جاتے ہیں۔ شکر اور گڑ میں نشاستہ اور وٹامن دونوں پائے جاتے ہیں۔ وٹامن میں امینو ایسڈ (AMINO ACID) پایا جاتا ہے۔ وٹامن کی تعداد تقریباً (۲۰) ہے جو انسانی زندگی کے لئے اہمیت کے حامل ہیں۔ وٹامنس کی کمی سے کئی امراض لاحق ہو جاتے ہیں۔ جیسے ہاضمہ کی کمزوری بصارت میں کمی، جلد کی خشکی، مسوڑوں کی سوزش اور ہڈیوں کی کمزوری۔ چند اہم وٹامن یہ ہیں اے۔ بی۔ سی۔ ڈی۔ ای اور کے

وٹامن "اے" جسم کی نشوونما کیلئے ضروری ہے۔ اسکی کمی سے عام طور پر بصارت کمزور ہو جاتی ہے بالخصوص رات کی۔ یہ وٹامن ہمیں متعدی جلدی اور لبری امراض سے محفوظ رکھتا ہے۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ یہ وٹامن، جگر، گردے، دودھ، مکھن، مچھلی کے تیل، پنیر اور انڈوں میں پایا جاتا ہے۔ لیکن ہم اسے گاجر، پھلیوں، کدو، ٹماٹر، پپیتہ، گوبی، پالک، اور پالک کی بھاجی سے بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ سبزیاں موسم پر سستی قیمت پر دستیاب ہوتی ہیں اور ہم ان کو

بھی کرسکتے ہیں ۔

ہمیشہ ہمیں ترکاریاں اور پھلیوں کو ان کی خام حالت میں استعمال کرنا چاہیے لیکن بعض اوقات ایسا کرنا ممکن نہیں۔ بہرحال انہیں زیادہ بھونا اور پکانا نہیں چاہیے چونکہ اس سے وٹامن مکمل طور پر تباہ ہو جاتے ہیں ۔

وٹامن "بی" بھی کافی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ جگر، نشاستہ، گیہوں، چنا، غیر پالش شدہ چاول دودھ، انڈوں اور گوشت میں پایا جاتا ہے۔ اگر ایک متوسط ہندوستانی ان مہنگی اشیاء کا متحمل نہیں ہو سکتا تو وہ اسے گیہوں، چنا اور غیر پالش شدہ چاول سے حاصل کر سکتا ہے۔ جو کم نرخ پر آسانی سے دستیاب ہو سکتے ہیں ۔

وٹامن "سی" سنترہ، لیمو، ٹماٹر، انگور، دالوں، ترکاریوں، پھلیوں، کشمش اور موز میں پایا جاتا ہے اس کی کمی سے جوڑوں میں درد، مسوڑوں میں سوزش، دماغی کمزوری، اور خون میں کمی واقع ہوتی ہے ۔

وٹامن "ڈی" ہماری ہڈیوں کے اندر تیار ہوتا ہے یہ مچھلی کے تیل میں پایا جاتا ہے۔ وٹامن ڈی جسم میں قوت مدافعت پیدا کرتا ہے۔ ان کے علاوہ اور کئی وٹامنس ہیں جن کی نشاندہی ضروری نہیں تاہم انسانی زندگی میں انہیں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ مذکورہ اشیاء کے علاوہ "پانی" بھی متوازن غذا کا ایک اہم حصہ ہے ایک اوسط انسانی جسم میں ۴۵ لیٹر پانی پایا جاتا ہے یعنی انسانی وزن کا ۷۰٪ حصہ پانی پر مشتمل ہوتا ہے ۔ پانی ایک ایسا محلول ہے جس میں ہماری ساری غذا بشرطیکہ وہ زہریلی نہ ہو حل ہو جاتا ہے۔ پانی جسم کے غیر ضروری اشیاء کو فضلہ، پسینہ اور پیشاب کی شکل میں جسم سے خارج کرتا ہے۔

تندرست رہنے اور نابیدگی (DE HYDRATION) سے بچنے کیلئے ضروری ہے کہ ہم روزانہ ۱۰ تا ۱۲ گلاس پانی پئیں۔ متوازن غذا کے بارے میں عوام میں شعور پیدا کرنا چاہیے اور انہیں اس بات سے واقف کرانا چاہیے کہ اچھی صحت ان کے بس میں ہے ۔

متوازن غذا پر متوسط ہندوستانی کے بس کی بات ہے چونکہ یہ صرف ایک یا دو مہنگی قسم کی غذائی اشیاء ہی میں نہیں پائی جاتیں بلکہ یہ کئی اور سستی اشیاء میں پائی جاتی ہیں جن کا حصول ہمارے عوام کیلئے ممکن ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ انہیں اس تعلق سے باشعور بنایا جائے ۔

ممتاز اور مشہور مزاح نگار

جناب مرزا شکور بیگ

کی نئی تصنیف

مزاحیہ تقاریر و مضامین
مرزا شکور بیگ

شائع ہوگئی ہے

قیمت: ۲۵ روپے - پانچ ریال - دو ڈالر

-: پبلشر :-

مرزا شکور بیگ

-: ملنے کے پتے :-

- سیل سکشن روز نامہ "سیاست" حیدرآباد
- ادبی مرکز - اعجاز پرنٹنگ پریس - چھتہ بازار - حیدرآباد - ۲
- حسامی بک ڈپو - چارکمان - حیدرآباد - اے۔پی
- ماہنامہ "شگوفہ" - ۳۱ - بیچلرس کوارٹرز - معظم جاہی مارکٹ - حیدرآباد
- مرزا شکور بیگ - ۱۱-۲-۱۰ - احمد منزل سیف آباد - حیدرآباد

فون: 33717

ماہنامہ

شاداب

حیدرآباد

جلد (۷) — شمارہ (۳) — مارچ [illegible] — حیدرآباد

ایڈیٹر: محمد قمرالدین صابری

جوائنٹ ایڈیٹر: رشیدالدین

مینیجنگ ایڈیٹر: کلیم الدین احسن

قیمت: -/5

مجلسِ مشاورت

محترمہ گلشن بیگم رباب • یوسف ناظم • ڈاکٹر محمد یوسف الدین • پروفیسر رفیع الدین احمد

منیر احمد صدیقی • محمد مصطفیٰ احمد مشکور • محترمہ سیدہ مہر • ڈاکٹر مصطفیٰ الرحمٰن خاں منظر

• پروفیسر میر تراب علی

زرِ تعاون

ہندوستان	خلیجی ممالک	امریکہ	انگلستان	پاکستان
سالانہ 50 روپے	150 روپے	35 ڈالر	20 پونڈ	125 پاکستانی روپے
دو سال 90 روپے	270 روپے	65 "	35 "	205 " "
تاحیات 1000 روپے	2500 [illegible]	[illegible] "	300 "	2000 " "

ترسیلِ زر کا پتہ

ماہنامہ "شاداب" 11-5-147 ریڈ ہلز، حیدرآباد (اے پی) - انڈیا

ایڈیٹر پرنٹر و پبلشر محمد قمرالدین صابری نے [illegible] پرنٹنگ پریس [illegible] سے چھپوا کر دفتر شاداب

11-5-147 ریڈ ہلز حیدرآباد سے شائع کیا

فہرست

حرفِ اول	ایڈیٹر	۳
حیدرآباد کا چار سو سالہ جشن	ایڈیٹر	۵
جب ہمارا قوم ابدی نیند سو گیا	مسعود احمد نشتر خانی	۱۰
عادل صدیقی	ڈاکٹر انصاری ... ہندو مسلم اتحاد کے علمبردار	۱۵
منفرد لہجہ کا شاعر۔ جامی	انور مسعود	۲۰
گولکنڈہ اور گنبدانِ قطب شاہی	مرسلہ۔ سعود احمد شروانی	۲۲
اردو کا صحافتی ادب	عابد صدیقی	۲۴
کاغذی ہے پیرہن پہ مذاکرہ	مرسلہ۔ نعیم الدین رضوی	۲۹
قرآن فہمی آسان راستہ (تبصرہ)	محمد منظور احمد منظور	۳۲
اسلام عورت اور عصر حاضر (〃)	محمد عبدالوحید خان	۳۵
خود کفالت کی جانب پیش رفت	پروفیسر مصطفٰی منقستے	۳۷
مصنوعی سیاروں کا انقلاب	اندرجیت لاہیری	۴۱
پنچایتی راج	پروفیسر کامتا پرساد	۴۴
بین الاقوامی محنت تنظیم کے ستر سال اور بھارت	آر سی راجہ منی	۴۷
فصلوں کی بیماریاں اور اُن کے مضر اثرات	پی آئی بی	۵۱
جنتِ جاوداں (نظم) منظوم ترجمہ	محمد نظام الدین فاروقی راز	۵۵
غزل	ڈاکٹر محمد منصور خان منصور	۵۸
مکالمۂ دل (طویل نظم سے اقتباس)	باقر باقری	۵۹

حرفِ اوّل

گجرال کمیٹی اور اردو

اردو زبان کے مسائل کا جائزہ لینے اور اس کی ترقی و ترویج کے لئے سفارشات پیش کرنے کے لئے
سابق میں گجرال کمیٹی قائم کی گئی تھی جس نے ۱۹۷۵ء میں اپنی تفصیلی رپورٹ پیش کرتے ہوئے سفارشات
بھی پیش کی تھیں ۔ ان سفارشات کا بھی وہی حشر ہوا جو اردو زبان کے بارے میں دوسری تجاویز کا ہوتا ہے
گجرال کمیٹی رپورٹ کے پیش ہونے کے پندرہ سال بعد مرکزی حکومت بدلی اور جناب آئی کے گجرال صدر گجرال
کمیٹی نہ صرف مرکزی وزیر بنے بلکہ وزارت خارجہ کا نہایت اہم قلمدان ان کے تفویض ہوا۔ اردو والوں کو توقعات
ندھیں کہ اب اردو کے بارے میں گجرال کمیٹی سفارشات بھی منظور کی جاکر اردو کی مستحقہ ترقی و ترویج کا باعث
ں گی چنانچہ مرکز کے ایک اور اہم وزیر جناب مفتی محمد سعید وزیر داخلہ نے اعلان کیا کہ حکومت نے اردو کی
قی و ترویج کے لئے گجرال کمیٹی کی سفارشات قبول کر لی ہیں موصوف کے مطابق یہ فیصلہ وزیر اعظم جناب
پی سنگھ کی صدارت میں کابینی اجلاس میں کیا گیا۔ یہ خبر اردو پریس میں چھپی لیکن انگریزی پریس میں یہ
ے اور نتیجے سے سامنے آئی۔ اخبار "ھندو" لکھتا ہے کہ "آئی کے گجرال کمیٹی کی پندرہ سال
یم سفارشات پر غور کرنے کیلئے حکومت نے ممتاز اردو شاعر علی سردار جعفری کی
ر میں ایک پندرہ رکنی اردو ماہرین کی کمیٹی قائم کی ہے یہ کمیٹی سہ لسانی فارمولے میں اردو
ریعہ تعلیم کے طور پر شمولیت کا جائزہ بھی لے گی" ذرائع کے مطابق ایسا جائزہ اس لئے ضروری ہے
م طور پر اردو بولنے والوں میں یہ احساس "پایا جاتا ہے کہ اردو کی ترقی کی راہ میں حائل سب سے بڑی
ٹ اس کا سہ لسانی فارمولہ میں شامل نہ کیا جانا ہے ... نئی کمیٹی کے قریبی ذرائع کا کہنا ہے کہ گجرال کمیٹی کی
ارشات "قابل عمل" ہیں اور ان پر "سنجیدگی" سے غور کیا جانا چاہیے۔ اس کے علاوہ

نی کمیٹی کی جانب سے گجرال کمیٹی کی ان تجاویز پر بھی "سنجیدگی سے ہمدردانہ غور" کیا جاتا رہا ہے جن میں اُردو داں افراد کے دستوری و انتظامی تحفظات کی موثر عمل آوری پر زور دیا گیا ہے۔

جناب مفتی محمد سعید نے آج پریس میں اعلان فرمایا کہ مرکزی حکومت نے اُردو کے بارے میں گجرال کمیٹی کی سفارشات "قبول" کرلی ہیں اور انگریزی پریس میں خبر دی گئی ہے کہ مرکزی حکومت نے جناب علی سردار جعفری کی صدارت میں پندرہ رکنی کمیٹی قائم کی ہے جو گجرال کمیٹی سفارشات پر "سنجیدگی سے غور کرے گی اور ہمدردانہ جائزہ" لے گی کہ ان میں سے کتنی اور کہاں تک قبول کی جاسکتی ہیں

ہونا تو یہ چاہیئے کہ جیسے ہی جناب مفتی محمد سعید نے مرکزی حکومت کے فیصلے کا اعلان فرمایا ہے گجرال کمیٹی کی جملہ سفارشات بتمام وکمال قبول کرلی جائیں۔ اُردو والے نہایت پُر امید ہیں کہ مرکزی حکومت نہ صرف اپنے وزیر داخلہ کی سفارشات کو قبول کرے گی بلکہ ان پر عمل آوری کو بھی یقینی بنائے گی ۔

(بقیہ سلسلہ صفحہ (۹) سے آگے)

نمبر شائع کیئے جائیں گے۔

اس چار سو سالہ دور میں حیدرآباد میں کئی شخصیات پیدا ہوئیں جنھوں نے اپنا کام چھوڑا اور اپنا نام بھی چھوڑا۔ مگر یہ نام امتداد زمانہ کے باعث کچھ دھندلا گئے ہیں اور آج کے حیدرآبادی ان شخصیات اور ان کے کارناموں سے کما حقہٗ واقف نہیں ہیں جیسے حضرت میر مومن کو قطب شاہی دور کے قیام و استحکام میں جو مرکزی حیثیت حاصل ہے آصف جاہی دور میں شمس المورخین جناب شمس اللہ قادری کی شخصیت نمایاں ہے۔ ان دونوں ادوار اور اہم شخصیات نیز حیدرآبادی رسائل جیسے "معلومات حیدرآباد"، "مجلہ محبوب"، "حسن"، "مجلہ عثمانیہ" وغیرہ پر بھی خصوصی نمبرات پیش کئے جائیں گے۔

قارئین شاداب سے خواہش ہے کہ اپنے بیش قیمت مشورے "شاداب" کو دیں تاکہ ان پر عمل کرتے ہوئے حیدرآباد کا چار سو سالہ جشن شایان شان طریقہ پر منایا جائے۔

★★★

محمد کمال الدین صدیقی
ایڈیٹر "شاداب"

حیدرآباد کا چار سو سالہ جشن اور اردو ریسرچ سنٹر

ہمارے شہر حیدرآباد فرخندہ بنیاد کی زندگی کے چار سو سال پورے ہو گئے ہیں بانیٔ شہر محمد قلی قطب شاہ کی دعا منظور ہوئی اور شہر کی آبادی اتنی بڑھی کہ شہر پناہ کی حدود سے نکل کر چاروں طرف میلوں تک پھیل گئی۔ ہر فرقہ، ہر نسل اور ہر مذہب کے لوگ آپس میں شیر و شکر بن گئے اتحاد و یگانگت سے ایسی زندگی گزارتے ہیں کہ کہیں اور ایسی مثال نہیں ملتی۔ محبت و یکجہتی اس شہر کی بنیاد ہے۔ اس شہر کے باسی نہ صرف اپنی زندگی میں میل اور اتحاد و اتفاق سے گذارتے رہے بلکہ ایک گنگا جمنی تہذیب و کلچر کو جنم دے کر دوسروں کے لئے مشعل راہ بنے ہیں اور آج بھی رہبری و رہنمائی کا سہرا انہی کے سر ہے۔ شہر کی اس مثالی مشترکہ تہذیب و ثقافت کے قافلہ سالار جناب عابد علی خاں صاحب نے تحریک شروع کی کہ شہر حیدرآباد کا چار سو سالہ جشن منایا جائے۔ اور اس زمانے کی تاریخ کو اجاگر کرتے ہوئے علاقائی و نسلی اتحاد و اتفاق اور مذہبی یگانگت و رواداری کو نمایاں کیا جائے اور ملک کی اہم ترین ضرورت سیکولرزم و قومی یکجہتی کی تحکیم میں اپنا حصہ ادا کیا جائے۔ جلد ہی شہر کے علمی و ادبی، تہذیبی و ثقافتی اکابر اور ادارے بھی ساتھ ہو گئے۔ صنعتی اور تجارتی اداروں نے بھی دست تعاون دراز کیا حتیٰ کہ حکومت نے بھی طے کیا کہ دامے، درمے، قدمے و سخنے ہر طرح کا تعاون ... سالہ جشن کے منانے میں دیا جائے۔ یہ جشن پورے سال منایا جائے گا۔

[illegible] حیدرآباد کے کئی ادبی اداروں [illegible] اس جشن میں [illegible] ادارۂ "شاداب" نے

[illegible]

نورخاں بازار حیدرآباد کی طرف گیا۔ یہ نادر و نایاب ذخیرہ کتب و رسائل حیدرآباد کی چار سو سالہ تاریخ کے بارے میں جو خزانہ اپنے پاس محفوظ کئے ہوئے ہے وہ کہیں اور دستیاب نہیں ہے اگر اس بیش بہا خزانہ سے استفادہ کرتے ہوئے حیدرآباد کی چار سو سالہ زندگی کے ان گنت پہلوؤں کو اجاگر نہیں کیا گیا تو تاریخ ہمیں کبھی معاف نہیں کرے گی ۔ آج بھی اس بیش قیمت اور بے مثال ذخیرہ کو اس شہر میں محفوظ کرنے کا کوئی انتظام نہیں ہو سکا ہے یہ ذخیرہ جو بیشتر اسی شہر سے متعلق ہے اسی شہر کی کم توجہی بلکہ بے توجہی کا شکار ہے بہت کم ممکن ہے کہ کسی طور یہ ذخیرہ اس شہر سے کہیں اور منتقل ہو جائے اور پھر ہم افسوس کریں کہ ہم نے اس ذخیرہ کی قدر نہ جانی اور اسے اپنے ہاتھ سے کھو دیا ... ادارہ شاداب نے طے کیا ہے کہ اس نایاب ذخیرہ سے استفادہ کرتے ہوئے شہر کے قطب شاہی، آصف جاہی ادوار کی اہم نابغۂ روزگار شخصیتوں اور ان کے کارناموں کو اس طرح نمایاں کیا جائے کہ وہ ہمارے لئے مشعل راہ بنیں اور ملک و قوم کی ترقی میں ہاتھ بٹا سکیں۔

اردو ریسرچ سنٹر بیت المدینہ نورخاں بازار حیدرآباد کی اپنی ایک کہانی ہے۔ نواب سالار جنگ بہادر نے نوادرات کو جمع کیا جس میں ان کا کتب خانہ بھی بہت اہم ہے۔ کتب خانہ آصفیہ اور جامعہ عثمانیہ کا کتب خانہ ایسے بیش قیمت ذخیرے ہیں جو اپنی مثال آپ ہیں ادارہ ادبیات اردو کا کتب خانہ اس لئے اہم ہے کہ حیدرآباد اور دکن کے نوادرات بڑی تعداد میں یہاں جمع ہیں جس طرح ادارہ ادبیات اردو مرحوم ڈاکٹر زور کی شخصیت کا پرتو ہے اسی طرح اردو ریسرچ سنٹر جناب محمد عبدالصمد خان کی انفرادی کوششوں کا نتیجہ

اردو ریسرچ سنٹر کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہ پورا ذخیرہ اردو میں ہے اور حیدرآباد اور دکن سے متعلق بہت زیادہ مواد موجود ہے جو کہیں اور موجود نہیں ہے اس سنٹر میں ۹۰۰ مختلف ناموں کے تقریباً (۵,۰۰۰) اردو رسالے موجود ہیں جن میں اہم رسائل کی تقریباً مکمل فائلیں موجود ہیں دکن سے جاری ہونے والے پرچوں میں دبدبۂ آصفی، معلومات حیدرآباد، حسن، علم نسواں، جریدۂ اعلامیہ، مکتبہ، مجلہ عثمانیہ وغیرہ کے تقریباً فائل یہاں موجود ہیں (۵,۰۰۰) کتابوں میں کم از کم (۰۰...) [illegible]

یہاں ۳۰۰۰ سفرنامے، ۵۰۰ تذکرے، ۴۸۰ خودنوشت سوانح عمریاں، ۲۲۱ لسانیات کی کتب، ۱۰۵۰ طنز و مزاح کی کتب، اقبال کے بارے میں ۵۰۰، ۳ کتب غالب کے بارے میں ۲۰۰ اور ۵۰۰ رسائل کے خاص نمبر اور ۵۲ شرحیں وغیرہ موجود ہیں۔

یہاں اس امر کا اظہار بے محل نہ ہوگا کہ نواب سالار جنگ ایک بہت بڑی جاگیر کے بلا شرکت غیرے مالک تھے اور نوادرات و کتب کی خریداری کے لئے مالی وسائل کی کمی نہ تھی۔ پوری دنیا میں اپنے نمائندے رکھ چھوڑے تھے جو نواب صاحب کے لئے منہ مانگے دام پر یہ اشیاء خرید لیتے تھے مگر یہ صورت جناب محمد عبدالصمد خاں کے ساتھ نہ تھی یہ ایک متوسط خاندان کے فرد ہیں جو ۱۹۴۰ء میں پربھنی (مہاراشٹرا) میں پیدا ہوئے ۱۹۴۵ء سے ۱۹۵۲ء تک جامعہ ملیہ دہلی میں تعلیم پائی، علی گڑھ سے میٹرک کامیاب کی اور حصول معاش کے لئے موٹر میکانک بن گئے مگر مسلسل اور غیر معمولی مطالعہ کی عادت جاری رہی۔ مطالعہ کے لئے کتب و رسائل خریدتے رہے۔ جامعہ ملیہ کی ابتدائی جماعتوں میں جو کتب بطور انعام ملی تھیں وہ اس بیش بہا ذخیرہ کی بنیاد بنیں اور ذخیرہ بڑھتا رہا۔ یہ واضح رہے کہ موٹر میکانک کے مالی وسائل کیا ہوں گے۔ بی بی سی کے رضا علی عابدی صاحب نے اپنے تعارف میں صمد صاحب کے حوالے سے لکھا ہے کہ اکثر ایسا ہوتا کہ صمد صاحب کھانے یا کسی ضرورت سے جا رہے ہیں۔ فٹ پاتھ پر کتاب نظر پڑی۔ خریدتے ہیں تو رات کا کھانا غائب نہ خریدیں تو شاید یہ کتاب بعد میں نہ ملے۔ صمد صاحب نے ہمیشہ اپنی ضرورت کو دبا دیا اور کتاب خرید لی۔ کیا اس طرح سے جمع کردہ ذخیرہ کتب کی قیمت کا تعین کیا جا سکتا ہے؟ پھر بھی فن تحریر کی تاریخ کے مصنف جناب اسحٰق صدیقی (لکھنؤ) نے جب صمد صاحب سے پوچھا کہ اندازاً اب تک خریدی کتب و رسائل پر کیا صرفہ ہوا ہوگا تو انہوں نے بتلایا "۳ لاکھ" جناب صدیقی صاحب کا اندازہ ہے کہ آج بلاشبہ اس ذخیرہ کی قیمت اس کی دس گنا ہوگی۔ اور یہی خیال حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی کے مؤلف صدر شعبہ اردو پروفیسر گیان چند جین کا بھی ہے۔ موصوف کے محتاط اندازے کے مطابق آج اس ذخیرہ کی قیمت ۳۰ اور ۳۵ لاکھ کے درمیان ہے۔

اس قدر بیش قیمت ذخیرے کی اہمیت کا اندازہ بتلاتا ہے کہ نواب سالار جنگ بہادر کے ذخیرہ کو مرکزی حکومت

نے ملک کے جناب [illegible] کے زیر نگرانی [illegible] خان بہادر [illegible] کو بھی سرکاری سرپرستی میں لے لیا اور آج کل ڈاکٹر [illegible] صاحب [illegible] کے لئے وہ تمام وسائل فراہم کئے گئے جو ان کے تحفظ اور ان سے استفادہ کے لئے ضروری تھے۔ مگر جناب صمد صاحب کے اُردو ریسرچ سنٹر کے لئے کوئی توجہ حاصل نہ ہو سکی۔

اس ذخیرہ کو گوشۂ گمنامی سے باہر لانے کا سہرا پروفیسر ڈیوڈ میتھیوز، ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب، صلاح الدین سعدی، رضا علی عابدی صاحبان کے سر ہے۔ آخر الذکر نے بی بی سی کے لئے "کتب خانہ" پروگرام شروع کیا۔ ہندوستان اور پاکستان کا طویل سفر کر کے کئی کتب خانوں کو دیکھا اور اردو سروس کے ہفتہ وار پروگرام میں یہ بیان کیا کہ ہمارے کتب خانے کہاں کہاں اور کس حال میں ہیں۔ موصوف نے دو دو تین تین کتب خانوں پر مشتمل ایک پروگرام پیش کیا۔ مگر جناب صمد صاحب کے ذخیرہ سے ایسے متاثر ہوئے اور اسے ایسا عظیم اور نادر پایا کہ پورا ایک پروگرام صرف اسی ذخیرہ پر مشتمل پیش کیا۔ بی بی سی نے کتب خانوں پر مبنی ان دستاویزات کو بعد میں کتابی صورت میں بھی شائع کر دیا۔ [illegible] کے کچھ افسروں کی توجہ اس جانب مبذول ہوئی۔ جناب مالک رام صاحب (دہلی) نے جناب عابد علی خاں صاحب (سیاست حیدرآباد) کو لکھا جو اخباروں میں بھی چھپا کہ جناب صمد صاحب کا ذخیرہ حیدرآباد سے متعلق ہے صمد صاحب اُسے حیدرآباد میں لئے بیٹھے ہیں، حیدرآباد والوں کو چاہئے کہ اس کے تحفظ کے لئے کچھ کریں ورنہ میں اسے دہلی منتقل کرنے کی کوشش کروں گا۔ اس وقت حیدرآباد والوں کو شکایت نہ ہو کہ مالک رام نے ان کا ذخیرہ دہلی منتقل کروا لیا۔ کئی لوگ متوجہ ہوئے مگر بات آگے نہ بڑھ سکی۔

راقم سطور بھی اسی وقت جناب صمد صاحب سے ملا اور اپنی خدمات پیش کیں۔ جو اس حد تک محدود تھیں، کہ اُردو ریسرچ سنٹر کے اغراض و مقاصد اور قواعد مرتب کر کے اسے سوسائٹیز ایکٹ کے تحت رجسٹر کروا دے اور اس کے باقاعدہ حساب کتاب رکھ کر چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ سے ان کی جانچ کروا دے تاکہ ریاستی و مرکزی حکومت سے کتب خانوں کی امداد حاصل کی جا سکے۔ رجسٹری اور آڈٹ تو ہو گئی مگر امداد حاصل نہ کی جا سکی۔ ناکامی کی صورت میں جناب صمد صاحب نے اپنے ذخیرہ کو [illegible] منتقل [illegible]

کلکتہ میں کوئی [illegible] نہیں [illegible] مگر کلکتہ میں یہ ذخیرہ محفوظ [illegible] نہیں [illegible]
کی حفاظت ہو سکتی تھی اور ریسرچ کرنے والے اس سے استفادہ کر سکتے تھے۔ یہ صورت حال صمد صاحب کو
قطعی منظور نہیں تھی چنانچہ انہوں نے اپنی نہایت اعلیٰ ملازمت چھوڑ دی اور اپنے ذخیرہ کو لے کر حیدرآباد
چلے آئے۔ جناب حسن الدین احمد صاحب [illegible] جنرل کو تمام کام
اردو ریسرچ سنٹر کے لئے مہیا کیا اور [illegible] دے دیئے یہ تیقن بھی دیا کہ اردو ریسرچ سنٹر [illegible] المدینہ
سے منتقل نہیں کیا جائے گا۔ چونکہ [illegible] کی ایک [illegible] کی کوشش کی جا رہی ہے مگر [illegible] امداد بوجوہ
حاصل نہ ہو سکی۔ جناب صمد صاحب خود سنٹر پر قیام پذیر ہیں۔ ذخیرہ کی ترتیب و تدوین میں رات دن
مصروف رہتے ہیں۔ علماء، محققین اور ریسرچ اسکالرس کو مواد کی نشاندہی کر کے مدد کرتے ہیں۔ حیدرآباد
سے باہر والوں کی تحریری خواہش پر اپنے صرفہ سے ضروری مواد زیراکس کرا کے روانہ کرتے ہیں اور [illegible]
تین ہزار سالانہ مزید کتب و رسائل کی خریدی پر صرف کرتے ہیں۔ حیدرآباد والوں کی کم توجہی سے بددل ہیں
اور سوچنے لگے ہیں کہ اپنے ذخیرہ کو لے کر پھر کہیں اور نکل جائیں۔

یہ ذخیرہ حیدرآباد سے متعلق ہے بیشتر حصہ حیدرآباد میں جمع کیا گیا ہے جناب صمد صاحب نہیں
چاہتے کہ یہ ذخیرہ حیدرآباد سے باہر جائے۔ ایک مرتبہ کلکتہ لے جا کر واپس لا چکے ہیں۔ واپسی کے بعد بھی
اس ذخیرہ کے لئے وہ کچھ نہیں ہو سکا جو اس کے تحفظ کے لئے ضروری ہے اس لئے صمد صاحب کی بددلی کا
دور پھر شروع ہو چکا ہے۔ قبل اس کے کہ صمد صاحب اسے لے کر پھر کہیں اور نکل جائیں۔ ادارہ "شاداب"
کی خواہش ہے کہ اس ذخیرہ سے استفادہ کرتے ہوئے جشن حیدرآباد کے سال کے دوران "شاداب" کے خصوصی
نمبرات پیش کئے جائیں۔

حیدرآباد کی چار سو سالہ تاریخ کا ایک نہایت [illegible] اور مفصل دور ہے جو قطب شاہی اور آصف جاہی
دو ادوار پر مشتمل ہے قطب شاہی دور میں بانی شہر محمد قلی قطب شاہ اور آصف جاہی دور میں [illegible]
نظام الملک [illegible] میر عثمان علی خان نہایت نمایاں حیثیت کے حامل ہیں۔ [illegible] کا کام [illegible]
دونوں فرمانرواؤں کے خاص پہلوؤں کو نمایاں کرتے ہوئے اردو ریسرچ سنٹر [illegible] مشتمل خصوصی
([illegible] ۳ [illegible])

سعود احمد شروانی
راحت فزا
حمایت نگر، حیدرآباد

جب معمار قوم ابدی نیند سو گیا

اب گونجتا ہے بزم ملائک میں تیرا نام ۔۔ شہرت تری حدودِ بشر سے گذر گئی

۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کا دن ہے۔ سورج آہستہ آہستہ مشرق سے اُبھر رہا ہے۔ اسکی کرنیں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں واقع وکٹوریہ گیٹ کے سر بہ فلک کلس اور اسٹریچی ہال کی وسیع پیشانی سے ٹکرا ٹکرا کر ہر طرف ماحول کو منور کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ لیکن بجائے روشنی پھیلنے کے اندھیرا بڑھتا جا رہا ہے فضائیں اداس ہیں۔ در و دیوار سے غم اور مایوسی ٹپک رہی ہے۔ ابھی کچھ گھنٹے پہلے "آفتاب علم" غروب ہو چکا ہے۔ وہ آفتاب جسکی ضیا پاشیوں سے ایم اے او کالج کے بام و در برسوں تک جگمگاتے رہے تھے۔ اپنے رہائشی مکان سے کچھ فاصلہ پر اپنے رفیق دیرینہ نواب اسماعیل خاں شروانی (راقم الحروف کے دادا) کی کوٹھی (موجودہ دارالانس) میں سرسید احمد خاںؒ نے داعی اجل کو لبیک کہا دنیا نے ایسا محسوس کیا۔

اک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے

پچاس سال تک کوئی سورج ایسا طلوع نہیں ہوا تھا جس نے اس انسان کو اپنی قوم کی فکر میں مبتلا نہ پایا ہو۔ آسمان پر بکھرے ہوئے بے شمار ستاروں نے اسکی آہ و فغاں نیم شبی سنی تھی۔ وہ سوتا تھا تو قوم کے غم میں اور جاگتا تھا تو قوم کی فکر میں۔ اپنی زندگی کا ہر لمحہ ایک ہی غم میں بسر کرتا تھا کہ قوم کس طرح خواب گراں سے بیدار ہو جائے۔ تعصب اور تنگ نظری کی دلدل سے باہر نکلے۔ عزم و ہمت کے ساتھ وقت کے تقاضوں کا ساتھ دینا سیکھے۔ ایسے عظیم الشان شخص کی موت کا آج تک یقین نہیں۔ یہ خبر بد سننے والا حیران ہے اور سوچنے پر مجبور ہے کہ ایسے اولوالعزم انسان کو موت نے کس طرح زیر کیا ہوگا۔ خود موت پر کیا گذری ہو گی۔ شام کے ۴ بجے ہیں کالج میں واقع کرکٹ لان پہ سرسید کا جنازہ رکھا ہے۔ بے شمار خلقت جمع ہے۔ ہزاروں انسان جنکی آنکھیں اس صدمے سے اشکبار ہیں صف بستہ کھڑے ہیں۔ ان میں مسلمان، ہندو، عیسائی ہر مذہب کے پیرو شامل ہیں۔ یہ لوگ سب ہی غمگین نظر آتے ہیں۔ لیکن دو طرف سے زار و قطار رونے کی اور دل ہلا دینے والی آہ و بکا کی

آوازیں آرہی ہیں۔ ایک طرف وہ کالج کے طلباء ہیں جن کے مستقبل کی فکر نے اس دنیا سے رخصت ہونے والے کو تا عمر خواب راحت سے محروم رکھا تھا دوسری سمت وہ راج مزدور بڑھئی اور سنگ تراش ہیں جنکے ساتھ ۳۶-۱۸۷۵ سال تک اس شخص نے علی گڑھ کی تپتی ہوئی دوپہریں گذاری تھیں۔ عورتیں اور بچے جو دیہاتوں سے یہ جانکاہ خبر سن کر آئے ہیں۔ اپنے محبوب آقا کو آخری سلام کر رہے ہیں۔ ؎

وہ ملک کا محسن، وہ مسلمانوں کا غمخوار
سر کر کے مہم قوم کے کام آگیا آخر

نماز جنازہ پڑھی گئی اور تھوڑی ہی دیر کے بعد سر سید کا قوی ہیکل جسم مسجد کے گوشہ میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ تاریخ کا ایک دور دیکھتے ہی دیکھتے آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

ہائے بزم قوم میں اب جلوہ فرمائے گا کون؟
چاند کے مانند ہالے میں نظر آئے گا کون؟
یوں تو لاکھوں آئیں گے اس دہر میں اور جائیں گے
سید احمد سا جنوں سلال نگر آئے گا کون؟

خاموش مجمع سے سسکیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ ہر شخص ایک دوسرے کی طرف دیکھتا تھا اور گم سم تھا۔ سکتہ کا سا عالم تھا۔

سٹریچی ہال میں جلسہ تعزیت منعقد ہوتا ہے۔

علامہ شبلی نعمانی اپنی جگہ سے اٹھے۔ آہستہ آہستہ ڈائس کی جانب بڑھے۔ مجمع پر ایک نظر ڈالی اور بولے "سر سید احمد خاں اپنے پروردگار کی جوار رحمت میں چلے گئے۔ دیکھو! ہماری قومی عمارت کے ستون ہل رہے ہیں۔ میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ لیکن طاقت گویائی کہاں سے لاؤں۔ حضرات! اگر میری زندگی کا کوئی حصہ علمی یا تعلیمی قرار دیا جا سکتا ہے تو اس کا آغاز اسکی نشوونما۔ اسکی نمود اس کا جو کچھ ہوا اسی کالج سے ہوا اور یہ کالج جلوہ ہے اس عظیم المرتبت شخصیت کا جسکی شخصیت میں جادو تھا اس کی نظر میں تاثیر تھی۔ اسکی آواز میں کشش تھی۔

علامہ شبلی فرط غم سے اپنے نڈھال تھے کہ اس کے آگے کچھ نہ کہہ سکے۔ اور بیٹھ گئے۔ نواب محسن الملک نے الطاف حسین حالی کی طرف دیکھا اور کہا "آپ بھی کچھ کہیں گے!" یہ جملہ کیا تھا ایک تیر تھا جو حالی کے دل میں اتر گیا۔ آنسوؤں کی جھڑی ان کی آنکھوں سے چل رہی تھی۔ چند منٹ تک خاموش کھڑے رہے۔ گردن سے رومال کھولا اور آنکھوں پر رکھ لیا۔ اپنے اوپر قابو پاکر بولے "حضرات! دل کا کرب کہاں دکھا سکتا ہے۔ میں کیسے دکھاؤں۔ سر سید چلے

کیا رخصت ہوئے ایک برگشتہ قوم کا سرمایہ، ایک تاتار ملک کا گنج گراں مایہ، میرا مرشد، رہبر اور دوست رخصت ہوگیا۔ ہم نے اس سے قوم کی خدمت کا مفہوم سیکھا۔ دوسروں کے لئے اپنی زندگی کے عیش و آرام کو قربان کر دینے کا سبق پڑھا۔ وہ قومی خدمت کے دشوار گذار راستہ پر آگے بڑھا تو بہت سے لوگ جو اس کے ساتھ چلے تھے تھک کر پس پشت رہ گئے۔ بہت سے افتاں و خیزاں آگے بڑھے ہونٹوں پہ پپڑیاں جم گئیں۔ پیروں میں چھالے پڑ گئے۔ دم چڑھ گیا لیکن وہ اولوالعزم انسان اس طرح آگے بڑھا اور تازہ دم رہا اسکو رستہ کی تکان نے مضمحل کیا نہ ساتھیوں کے چھوٹ جانے سے اسکی ہمت ٹوٹی۔ نہ منزل کی دوری نے اس میں خوف پیدا کیا۔ اب یہ لیل و نہار دوسرا سرسید احمد خاں پیدا نہ کر سکیں گے۔ حالی کی یہ باتیں سن کر محسن الملک کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ بمشکل تمام سہارا لے کر کھڑے ہوئے اور زار و قطار رونے لگے۔ تھوڑے سے وقفہ کے بعد اپنے پر قابو پا کر گویا ہوئے "جس جگہ میں آج تقریر کرنے کھڑا ہوں یہاں سرسید مرحوم کھڑے ہوتے تھے۔ مجھے صرف ان کی ذات ہی سے محبت نہیں تھی بلکہ ۵۰ سالہ تجربہ نے یہ بات میرے دل پر نقش کر دی تھی کہ قومی درد اور بہی خواہی کو جب خدائے تعالیٰ نے ایک جسم اور شکل دینی چاہی تو سید احمد خاں اس کا نام رکھ دیا۔ خلوت و جلوت، تنہائی اور یکجائی شب و روز جب کبھی میں نے انکو دیکھا اسی حال میں دیکھا۔ میں سچ کہتا ہوں کہ جو قومی درد اور قومی محبت سرسید میں تھی اور وہ آگ جو ان کے دل میں لگی ہوئی تھی اور وہ درد جس سے ان کا دل بھرا ہوا تھا باوجود ان کے پیرو اور دوست ہونے کے ہم میں اس کا نشان بھی نہیں ہے۔ ان میں سب باتیں فطری تھیں اور ہم میں مصنوعی ہیں" اتنا کہا اور نواب محسن الملک فرط غم سے نڈھال ہوگئے۔ کچھ دیر کے لئے بیٹھ گئے۔ پھر یکایک کھڑے ہوئے جیسے سرسید کی روح نے خاموشی سے کان میں کہدیا ہو کہ "میرے ماتم کو بھی کسی تعمیری کام کی بنیاد بنانا چاہیئے"۔ بولے "حضرات! جب کوئی بڑا شخص دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے تو اسکو احسان کی نظروں سے دیکھنے والے اپنی شکر گزاری اور دلدادگی کے ثبوت میں کوئی ایسا کام کرتے ہیں جو اس محبوب کی شان کے لائق ہو۔ ان کے لئے عالیشان مقبرے بنواتے ہیں۔ ان کے نام کے خیرات خانے جاری کرتے ہیں سالانہ عرس کرتے ہیں اور بہت کچھ کرتے ہیں۔ تم جسکو پیار کرتے تھے اور جسکو اپنا مصلح اور پیشوا سمجھتے تھے وہ نہ زندگی میں اپنے لئے نذر و نیاز کا طالب تھا

اور نہ اپنی ذات کے واسطے تم سے کسی چیز کا خواہاں ہوا۔ بلکہ اپنا مال تم پر قربان کیا اور اپنی کمائی تمہارے کاموں میں لگائی یہاں تک کہ نہ اپنے مرنے کیلئے ایک جھونپڑا چھوڑا اور نہ اپنے کفن کے واسطے ایک کپڑا۔ جو کچھ تم سے لیا تھا تمہیں پر خرچ کیا اور تمہارے ہی کاموں پر لگایا اسکی تمنا نہیں تھی کہ مرنے کے بعد اسکی یادگار میں مقبرہ یا خانقاہ بنائی جائے جو کام تمہاری بھلائی کا اس نے شروع کیا تھا وہ پورا ہوا اور قومی ترقی کے اصلی وسائل یعنی تعلیم و تربیت کے سامان جمع کئے جائیں اور کالج کو یونیورسٹی کے درجہ پر پہنچایا جائے۔ سرسید اب ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن ان کا بتایا ہوا راستہ سامنے ہے اور وہ شخص اب بھی پکار رہا ہے ؎

تو اے مسافرِ شب خود چراغ بن اپنا   کر اپنی رات کو داغِ جگر سے نورانی

جو آگ سرسید نے اپنے رفقاء کے دل میں لگادی تھی اسکے شعلے ان کے بعد تیز تر ہوگئے۔ ان کے ماتمی جلسوں سے مدرستہ العلوم کو یونیورسٹی بنانے کی تحریک کا آغاز ہوا۔ محسن الملک نے ہاتھ میں کاسہ گدائی لیا۔ ان کے ساتھیوں نے گلے میں جھولیاں ڈالیں اور گھر گھر جاکر دستک دی ؎

تاکہ ہو معلوم سبکو قوم کی حالت ہے کیا
اس لئے ڈالے گلے میں جھولیاں آئے ہیں ہم
خود غرض ٹھہرائیں یا مکار ہم کو یا گدا
ذلتیں یہ کرکے سب خاطر نشاں آئے ہیں ہم
فخر سب بے جا ہیں ان کے قوم ہے جبکی ذلیل
فخر و عزت کے مٹا کر سب نشاں آئے ہیں ہم

راستہ دشوار گزار تھا اور منزل دور لیکن محسن الملک نے ہمت نہ ہاری اور فیصلہ کیا چاہے کتنے ہی مصائب کا سامنا کرنا پڑے وہ نصب العین کو نہ چھوڑیں گے اور اپنی جدوجہد کو جاری رکھیں گے یکم فروری ۱۸۹۹ء کو محسن الملک ایم اے او کالج کے سکریٹری منتخب ہوئے اور ۱۶ اکتوبر ۱۹۰۷ء تک جب انہوں نے داعی اجل کو لبیک کہا مسلسل کالج کے کام کو آگے بڑھاتے رہے۔ جب سرسید کا انتقال ہوا تھا تو کالج کی سالانہ آمدنی ۷۴ ہزار روپے تھی۔ محسن الملک نے اپنی کوشش سے اسکو [illegible] لاکھ [illegible] پہنچایا اور [illegible] سال میں کالج کے لئے ۴۰ ہزار روپیہ چندہ جمع کرلیا۔ اللہ تعالیٰ نے فصاحت اور خوش بیانی ان کو [illegible] کر رکھی تھی۔ تقریر کرتے تو گویا منہ سے پھول جھڑتے

تھے اور سامعین پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ نواب محسن الملک نے اپنی تمام صلاحیتیں کو کالج کے کام پر لگا دیا۔ ان کی کوشش سے عوام کی کالج سے متعلق غلط فہمیاں دور ہوئیں۔
شاہ افغانستان امیر حبیب اللہ خاں جب علی گڑھ تشریف لائے تو طرح طرح کی بدگمانیاں ان کے دل میں تھیں لیکن ایک دن علی گڑھ میں قیام فرمانے کے بعد امیر موصوف نے یہاں کے حالات کا جائزہ لیا تو ان کی رائے بدل گئی۔ اس کے بعد اس درسگاہ سے ان کو گہرا تعلق پیدا ہو گیا۔
ٹرسٹیوں میں اختلافات شروع ہوئے تو نواب محسن الملک نے درسگاہ کے مفاد کو سب سے مقدم رکھا اور ہر ذاتی ذلت کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔ ایک مرتبہ سرسید کے صاحبزادہ سید محمود کسی بات پر ناراض ہو گئے۔ اسٹریچی ہال میں منعقدہ جلسے میں نواب محسن الملک نے گلوگیر آواز میں تیس سالہ تعلقات کا واسطہ دیا اور سید محمود کے قدموں پر گر گئے۔
علامہ شبلی نعمانی نے سرسید کی ذہانت، دوراندیشی اور قومی جذبات سے متاثر ہو کر ایک طویل مثنوی لکھی تھی اس مثنوی کے منتخب اشعار حسب ذیل ہیں ؎

صورت سے عیاں جلال شاہی چہرہ پہ فروغ صبح گاہی
وہ ریش دراز کی سپیدی چھٹکی ہوئی چاندنی سحر کی
وہ ملک پہ جان دینے والا۔ وہ قوم کی ناؤ کھینے والا
لب پر ہے فغاں کہ اب بھی جاگو ــ اے خواب گراں کے سونے والو
تا چند رہو گے مست و سرشار ــ اٹھو کہ سحر ہوئی خبردار

سلسلہ صفحہ ۸ ا سے آگے :۔

سمجھتے تھے۔ سماجی زندگی کا کوئی پہلو اُن کی نظر سے پوشیدہ نہیں رہا تھا۔
ڈاکٹر انصاری نے ۱۰ ر مئی ۱۹۳۶ء کو داعی اجل کو لبیک کہا اور جامعہ ملیہ دہلی کے قبرستان میں مدفون ہیں۔

بڑ سے ادب کا نیا اسلوب ہے جسے اب ہمارے اُردو ادیبوں نے بھی اختیار کیا ہے۔ قرۃ العین حیدر کی کہانی ہاؤسنگ سوسائٹی اس کی سب سے بڑی مثال ہے۔ فکر تونسوی کے "پیاز کے چھلکے" شاہد صدیقی کا کالم "کوہ کن" ابراہیم جلیس کا "سو عیرہ وغیرہ" اور خوشتر گرامی کا "تیر و نشتر" ہمارے صحافتی ادب کی زرین مثالیں ہیں۔

عادل صدیقی

ڈاکٹر انصاری.....

ہندو مسلم اتحاد کے علمبردار

ڈاکٹر مختار احمد انصاری کا شمار ان محبانِ وطن میں ہوتا ہے جنھوں نے وطن عزیز کی آزادی کی داغ بیل ڈالی اور انتہائی خلوص اور ایثار سے ملک و وطن کی خاطر شب و روز محنت کی۔ سب سے بڑی بات یہ کہ انھوں نے ملک میں قومی یکجہتی کے فروغ اور ہندو مسلمانوں کے آپسی تعلقات کو انتہائی خوشگوار بنانے کے لئے پوری دیانتداری سے کام کیا۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ آج ہم نہ صرف یہ کہ ان کو بھلا بیٹھے ہیں بلکہ حد تو یہ ہے کہ ہماری نئی نسل ان ناموں سے ہرگز آشنا نہیں۔ قومی زندگی کو متوازن بنانے کے لئے ان شخصیتوں کا مطالعہ اور ان کی خدمات کا جائزہ بے حد ضروری ہے۔ ڈاکٹر انصاری صف اول کے رہنماؤں میں شمار کئے جاتے ہیں انھوں نے اپنی عمر کا بہترین حصہ ملکی خدمات میں گزارا۔ ان کی خدا ترسی، انسانیت اور قومی خدمت کے لئے لگن آج بھی ہمارے لئے مشعل راہ ہے گاندھی جی سے ان کے قریبی روابط تھے۔ گاندھی جی فرمایا کرتے تھے کہ مجھے صرف اپنی روحانی صحت کی فکر ہے رہی جسمانی صحت تو اس کے ذمہ دار ڈاکٹر انصاری، ڈاکٹر جیوراج مہتہ اور ڈاکٹر بی سی رائے ہیں گاندھی جی کہتے تھے کہ انصاری صاحب مجھے محبت و یگانگت کے ایسے رشتے میں مربوط کئے ہوئے ہیں جو سخت سے سخت کشیدگی کا متحمل ہو سکتا ہے۔

۱۹۲۷ء میں ڈاکٹر انصاری کو صدر کانگریس بنانے کی تجویز تھی۔ گاندھی جی لکھتے ہیں

"جب میں نے ڈاکٹر انصاری کا نام لیا تو ایک ساعت [illegible] صدر چن لئے گئے تو چار سال

[illegible] میں جو [illegible] مسلمان صدر ہوں گے۔ یہ میرے لئے کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ ہندو بھائی [illegible] کو صدر بنائیں کہ وہ ہندو مسلم اتحاد کے لئے اپنی گہری خواہش کا اظہار کریں۔ ڈاکٹر انصاری ان [illegible] غیر جانبدار [illegible] میں ہیں جو ہمیں دونوں [illegible] میں دستیاب ہو سکتے ہیں۔ ہندو مسلم نقطۂ نظر سے بھی ڈاکٹر انصاری کا انتخاب بہترین ثابت ہو سکتا ہے مگر ڈاکٹر انصاری اس سال صدر نہ ہو سکے۔ البتہ ۱۹۲۷ء میں مدراس میں منعقدہ کانگریس کے اجلاس میں ڈاکٹر انصاری صدر چن لئے گئے۔ اس انتخاب کے بعد گاندھی جی نے ملک کو یوں خطاب کیا:

"استقبالیہ کمیٹی نے بلا مقابلہ ملک کے ایک تجربہ کار اور منجھے ہوئے خادم کا انتخاب کیا ہے کہ وہ اس اجلاس کی صدارت کرے وہ اس منصب کا جائزہ ایک ایسے مقصد سے حاصل کر رہے ہیں جو خود انہوں نے اپنے سامنے رکھا ہے۔ ڈاکٹر انصاری ایک سرجن ہیں اور ان بہترین سرجنوں میں شمار ہوتے ہیں جو ہندوستان نے پیدا کیے چوں کہ وہ ایک سرجن ہیں انہوں نے تہیہ کر لیا ہے کہ ہندو مسلم تعلقات کی شکستگی کی مرہم پٹی کریں گے میں جانتا ہوں کہ بہت سی ریاستی کانگریس کمیٹیوں نے ڈاکٹر انصاری کے حق میں ووٹ دیئے ہیں اس امید پر کہ ان کی صدارت گہرے زخموں کو مندمل کر دے گی مگر ہم یہ فرض کر لینے کی غلطی نہ کریں کہ چوں کہ ہم نے انہیں صدر منتخب کر لیا ہے ہمارا فرض پورا ہو گیا۔ ایک مریض کا فرض محض اسی طرح پورا نہیں ہوتا کہ وہ اپنے علاج معالجے کے لئے سب سے عقلمند اور بہترین ڈاکٹر سے رجوع ہو اس سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنے ڈاکٹر کے ساتھ دل و جان سے تعاون کرے گا اور ڈاکٹر کی جو بھی ہدایتیں کا پابند رہے گا ہم مریض ہیں ڈاکٹر انصاری ہمارے سرجن ہیں۔ انہوں ہم سے طلب کیا ہے جو کام انہوں نے اپنے سر لیا ہے اس میں اگر ہم ان سے بھرپور تعاون نہیں کرتے تو غلطی ان کی نہیں ہماری ہے۔

گاندھی جی نے کہا کہ "ڈاکٹر انصاری نے خطبۂ صدارت کی خوبی ہندو مسلم اتحاد کے [illegible] سے سا انہیں معلوم تھا کہ ان سے اس خواہش کے اظہار کی توقع ہے۔ اگر کوئی فرد واحد یہ کام کر سکتا تھا تو وہ بلا شبہ انصاری ہی تھے انہوں نے قوم کی طرف سے بطور تحفہ سب سے [illegible]

قوم پر نصب العین پر اور اپنے آپ پر اعتماد تھا بلاشبہ اپنی تمنا کے حصول میں انہوں نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ قسمت نے ان کا ساتھ دیا۔

ڈاکٹر مختار احمد انصاری ۱۸۸۰ء میں اتر پردیش کی ایک بستی یوسف پور میں پیدا ہوئے۔ یہ بستی غازی پور میں ہے۔ آپ کے والد مسٹر عبدالرحمٰن ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد میں ضلع بلیا کے صدر امین تھے اور ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے دنوں میں سرسید اور اکثر دوسرے سرکاری ملازمین کی طرح انہوں نے بھی انگریزوں کا ساتھ دیا تھا لیکن ان کے بیٹوں اور عزیزوں نے آزادی کی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور انگریزوں کی وفاداری سے منہ موڑ کر وطن عزیز کی آزادی کے لئے تن من دھن سے خدمت کی۔ ان کے بیٹوں کی زندگی پر دیوبند کے مدرسہ نے بہت زیادہ اثر ڈالا۔ دیوبند کے علماء نے انگریزوں کی کھل کر مخالفت کی اور قید و بند کی زندگی کو اپنایا۔ ملک کی خدمت کو زندگی کا سب سے بڑا اور عزیز ترین سرمایہ سمجھا۔ ڈاکٹر انصاری کے بھائی حکیم عبدالوہاب انصاری اور حکیم عبدالرزاق انصاری دونوں نے دیوبند میں ہی تعلیم حاصل کی تھی اور ملازمت کی جگہ طبابت کا پیشہ اختیار کیا تھا اور ریاست حیدرآباد میں بسلسلہ ملازمت چلے گئے تھے۔ حکیم عبدالوہاب مولانا رشید احمد گنگوہی سے بیعت تھے بصارت سے محروم ہونے کی وجہ سے ان کو حکیم نابینا کے نام سے لوگوں نے جانا۔ طب کی دنیا میں ان کا وہی مقام تھا جو ڈاکٹری کی دنیا میں ڈاکٹر انصاری کا تھا۔ حکیم عبدالرزاق بھی شیخ الہند مولانا محمود حسن سے بہت قریب تھے اور سیاسی معاملات میں ان کے مشیر خاص تھے۔ شروع میں ڈاکٹر انصاری نے مذہبی تعلیم پائی مگر کچھ ہی دنوں میں ان کو مغربی تعلیم پر لگا دیا گیا۔ ڈاکٹر انصاری ذہین طالب علم تھے اور اسکول سے لے کر کالج تک ہمیشہ وظیفہ پاتے رہے۔ انہوں نے نظام کالج حیدرآباد سے سائنس میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا اور اول آئے۔ نظام کالج ان دنوں مدراس یونیورسٹی سے ملحق تھا اور مدراس میں ہی امتحان ہوتا تھا اس کے بعد نظام حیدرآباد کے وظیفے سے ڈاکٹر انصاری نے انگلستان میں اڈنبرا یونیورسٹی کے میڈیکل کالج میں داخلہ لیا۔ اس یونیورسٹی سے انہوں نے ماسٹر آف میڈیسن اور ماسٹر آف سرجری ایم ایس کی ڈگریاں حاصل کیں۔ عملی امتحانوں میں بھی وہ حسب سابق اول

[illegible]

ہندوستانی ڈاکٹر تھے جنہیں چیرنگ کراس ہسپتال میں سرجن مقرر کیا گیا اس سلسلے میں ان کی بھانجی زہرہ انصاری نے ایک واقعہ سنایا۔ انہوں نے بتایا کہ دلی آکر ڈاکٹر انصاری حکیم اجمل خاں کے ساتھ جامعہ طبیہ میں مطب کیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر انصاری اس مطب میں شعبۂ جراحت کے انچارج تھے۔ مطب پر ٹین کی چھت تھی چنانچہ ڈاکٹر انصاری کے آپریشن روم پر بھی ٹین کی چھت پڑی تھی۔ ایک بار وہ ایک مریض کا آپریشن کر رہے تھے جوں ہی ڈاکٹر انصاری نے آپریشن شروع کیا تو اچانک ایک شدید آندھی نے آسمان کو گھیر لیا یہ آندھی اتنی شدید تھی کہ اس میں ان کے کمرے کی چھت اڑ گئی اور بے پناہ ریت اندر آ گئی۔ روشنی غائب ہو گئی۔ ڈاکٹر انصاری نے سمجھ لیا کہ اب اس مریض کی خیر نہیں چنانچہ انہوں نے فوراً اسے ایک چادر اڑھا دی اور آندھی بند ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ معاون ڈاکٹر نے پوچھا کہ یہ مریض کتنی دیر بے ہوش رہ سکے گا۔ آپ نے کہا کہ کم سے کم دو گھنٹے۔ چنانچہ جب آندھی کم ہوئی تو معاون ڈاکٹر نے چادر ہٹائی۔ اس پر اتنی گرد پڑی تھی کہ ڈاکٹر انصاری نے اس چادر کو دور لے جا کر جھاڑنے کو کہا۔ ڈاکٹر صاحب کو پورا یقین تھا کہ یہ مریض ٹھیک نہ ہو سکے گا کیونکہ زخم میں گرد آنے سے اس میں مواد بڑھ جائے گا۔ اُس زمانے میں مواد کو سکھانے کے لئے اور سپٹک سے بچنے کے لئے وہ دوائیں نہیں تھیں جو آج میسر ہیں تاہم ڈاکٹر صاحب کے کرشمہ ساز ہاتھوں نے بحکم خدا اس مریض کو کچھ ہی دنوں بعد تندرست کر دیا۔

۱۹۱۹ء تک ہندوستانی سیاست سے ڈاکٹر انصاری کی عملی دلچسپی کا کوئی واضح ثبوت نہیں ملتا۔ لیکن جنگ بلقان میں انہوں نے جس طبی وفد کی رہنمائی کی اور قسطنطنیہ جانے والے طبی مشن کی سربراہی کی اس سے وہ عوامی رہنما بن گئے۔

اس سے قبل ۱۹۱۸ء میں ڈاکٹر انصاری کو دلی میں مسلم لیگ کی کانفرنس کی استقبالیہ کمیٹی کا صدر منتخب کیا گیا۔ ان دنوں مسلم لیگ پر مغربی تعلیم یافتہ مسلمانوں کا قبضہ تھا اس زمانے میں یہ کوشش کی گئی کہ کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان تعلقات میں ہم آہنگی پیدا کی جائے چنانچہ ۱۹۱۷ء میں اس کوشش کے زیر اثر ایک معاہدہ بھی طے ہوا تھا اور ہندو مسلم تعلقات میں خوشگواری لانے کی کوشش کی

گئی تھی۔ ڈاکٹر انصاری نے خلافت کے کاز کی حمایت حاصل کرنے اور اپنے ہم مذہبوں کے احساسات کی ترجمانی میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ ڈاکٹر انصاری سرکردہ ہندوؤں بالخصوص گاندھی جی کی حمایت کو تحریک خلافت کے لئے ایک انمول سرمایہ سمجھتے تھے ان کا پختہ یقین تھا کہ تحریک خلافت ہندو مسلم اتحاد میں مددگار ثابت ہوگی وہ اس موقع کو ہندو مسلم اتحاد کے لئے ایک نادر موقع جانتے تھے ۱۹۱۹ء کے بعد سے انہوں نے ہندوؤں کے ساتھ روابط بڑھانے کی ان تھک کوشش کی۔ ڈاکٹر انصاری نے ہندو مسلم تعلقات بہتر بنانے میں ایک قومی میثاق تیار کرنے کے واسطے لالہ لاجپت رائے سے تعاون کیا۔ جس کا مسودہ جنوری ۱۹۲۴ء میں منظر عام پر آیا۔ ڈاکٹر انصاری مسلمانوں کو قومی تحریک میں برادران وطن کے دوش بدوش لانے کے لئے انتہائی متحرک اور فعال انداز میں کام کرتے رہے۔

ڈاکٹر انصاری کو جدید ہندوستان کی عوامی زندگی کی تاریخ میں ایک اہم مقام حاصل ہے انہوں نے خود کو ہندوستانی قوم پرور تحریک کے لئے وقف کر دیا۔ انہوں نے اپنے ہم عصروں کی نظر میں محترم مقام حاصل کیا تیج بہادر سپرو نے ڈاکٹر انصاری کو ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا تھا۔ "ملک کی عوامی زندگی میں مشکل ہی سے کوئی شخص ہوگا جس کے لئے میرے دل میں ان سے زیادہ احترام اور اگر میں کہہ سکوں تو ذاتی طور پر زیادہ محبت ہوگی۔"

ڈاکٹر انصاری نے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس ۱۹۲۷ء میں جو کہ مدراس میں ہوا تھا کہا تھا کہ "جس سوراج کے لئے ہم برسرپیکار ہیں نہ تو ہندو راج ہوگا اور نہ ہی مسلمان راج۔ یہ ایک مشترکہ راج ہوگا ہم ہندوستان کو ایک قوم میں ڈھال سکتے ہیں جو ایسے پختہ عزم اور مضبوط ارادے کی مالک ہو کر اپنے عظیم نصب العین کے راستے میں بڑی رکاوٹ کو دور کر سکے اور دنیا کی اقوام میں اپنی مناسب جگہ حاصل کرنے کے قابل ہوں"

ایک حقیقی قائد کی طرح ڈاکٹر انصاری کی سرگرمیاں، صرف سیاست تک ہی محدود نہ تھیں وہ سیاست میں اخلاق اور سماجی اور اصلاحی کاموں اور عام انسانوں کی فلاح و بہبود کے امور کو ضروری

(بقیہ سلسلہ صفحہ ۱۴۴ پر)

انور مسعود
۲۸۷ بی عابد نگر پیٹ
حیدرآباد ۳۶

منفرد لہجہ کا شاعر جامی

۸ مارچ ۱۹۹۰ء کو حیدرآباد کے مشہور و معروف ادیب اور جدید غزل کے شاعر جناب خورشید احمد جامی کی ۲۰ ویں برسی منائی جا رہی ہے حیدرآباد کے محلہ سلطان پورہ میں رہنے والے اس فرزند نے اُردو غزل کو نہ صرف بلند مقام تک پہنچا دیا بلکہ اپنے فن کا ہمعصروں سے لوہا بھی منوا لیا تھا۔ اس موقع پر جامی صاحب کی یاد اپنے دلوں میں تازہ رکھنے کے لئے ایک مختصر سا مضمون قارئین "شاداب" کے لئے پیش ہے۔

برصغیر ہند و پاک میں غزل کو جدید لب و لہجہ اور شعری پیکریت کو نئی معنی بخشنے والے چند گنے چنے ناموں میں حضرت خورشید احمد جامی کا شمار بلا شبہ کیا جاتا ہے۔ مشاعروں سے پرہیز، سستی شہرت سے گریز اور گوشۂ تنہائی میں رہنے والے جامی صاحب کی پوری شاعری نئے علائم، نئے استعاروں اور نئی ترکیبوں سے عبارت ہے۔ ان کے کلام میں ان کے اچھوتے پن والے مزاج کو بھی بڑا دخل رہا ہے انھیں اپنے فن سے مکمل طور پر وابستگی رہی جس کے باعث ان کے فن میں نکھار ایسا آیا کہ انہیں فن کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ جامی صاحب نے جس زمانے میں آنکھیں کھولیں' اپنے اطراف میں پرانی قدروں کو پامال ہوتے اور نئی قدروں کو جگہ بناتے ! انقلابات کو تیزی کے ساتھ آتے جاتے دیکھا زندگی کی ہما ہمی نے کسی کو کسی کا روادار نہ رکھا۔ وقت کی بغاوت۔ اپنوں کا بیگانہ پن اور حالات کی بے راہ روی۔ یہ مناظر جامی صاحب کی آنکھوں کے سامنے تھے تب ہی تو وہ کہتے ہیں

حیات بچ کے نکل آئی قتل گاہوں سے
مگر جو ساتھ تھے وہ خواب سب شہید ہوئے

ہم وقت کی آنکھوں میں لئے پھرتے ہیں جاؔمی
وہ آگ جو اس دور کی پہچان بنی ہے

جس طرف مجمعِ احباب کھڑا تھا جاؔمی
ہم پہ آئے تو اُسی سمت سے پتھر آئے

آنکھوں میں لئے ایک پُر اسرار اداسی
الفاظ کے شیشوں سے کوئی جھانک رہا ہے

لے کے پھرتی ہیں آندھیاں جس کو
زندگی ہے وہ برگِ آوارہ

جاؔمی صاحب نے اپنی غزلوں میں روایتی مضامین کو نئے ڈھنگ سے رائج بھی پیش کیا بلکہ موضوعات کو وسعت بھی دی۔ مثلاً ۔ غزلوں میں حسن کے چرچے چھاپے ابھی تک
کچھ روز خیالوں میں وہ مہمان رہے تھے

غم روزگار کے بارے میں اظہار کرتے ہیں :—

بڑے عجیب ہیں یہ دردِ غم کے رشتے بھی
کہ جس کو دیکھئے اپنا دکھائی دیتا ہے

بزمِ یاراں میں ذرا بھیس بدل کر چلنا
تجھ کو پہچان نہ لے اے غمِ دوراں کوئی

جاؔمی صاحب نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بہت جلد پہچان لیا تھا اور آخر وقت تک بھی ان پر آنچ نہ آنے دی۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔ "جاؔمی مرے اشعار کا قد ناپنے والے" "وہ لوگ تھے جو ریت کے ٹیلوں پہ کھڑے تھے۔
ہم بھی تھے روشنی کتابوں کی" "کاش تم نے ہمیں پڑھا ہوتا۔
حضرت خورشید احمد جاؔمی کی ابدی آرام گاہ قبرستان متصل مسجد حسینی علم شاہ کمان گوڑہ حیدرآباد میں واقع ہے جہاں سے وہ کہہ رہے ہیں۔ جاؔمی صاحب کے تین مجموعۂ کلام رخسارِ سحر، برگِ آوارہ اور یاد کی خوشبو ہیں جو بے حد مقبول ہوئے ہیں۔
زندگی وقت کی راہوں میں بچھڑ کر جاؔمی
بن گئی ایک فسانے کا حسیں پس منظر ۔۔

سعید احمد شروانی
راحت فزا محایت نگر حیدرآباد

گولکنڈہ اور گنبدانِ قطب شاہی

شاعرِ مشرق علامہ سر محمد اقبالؔ کا منظوم خراج

علامہ اقبال جنوری ۱۹۲۸ء میں یمین السلطنت مہاراجہ سرکشن پرشاد کی خصوصی دعوت پر حیدرآباد تشریف لائے تھے دورانِ قیام علامہ موصوف نے شہر حیدرآباد کے اہم تاریخی مقامات کی سیر کی۔ گولکنڈہ قلعہ اور گنبدانِ قطب شاہی کا تفصیلی معائنہ کیا۔ شاعرِ مشرق نے جو منظوم خراجِ عقیدت سپردِ قلم کیا وہ ناظرین ماہ نامہ "شاداب" کی دلچسپی کے لئے پیش ہے۔

قلعہ گولکنڈہ

آہ جولانگاہِ عالمگیر یعنی وہ حصار
دوش پر اپنے اٹھائے سینکڑوں صدیوں کا بار
زندگی سے تھا کبھی معمور اب سنسان ہے
یہ خموشی اس کے ہنگاموں کا گورستان ہے
اپنے سکانِ کہن کی خاک کا دلدادہ ہے
کوہ کے سر پر مثالِ پاسباں استادہ ہے

گنبدانِ قطب شاہی

خوابگاہ شاہوں کی ہے یہ منزلِ حسرت فزا
دیدہ عبرت خراجِ اشکِ گلگوں کر ادا

ہے تو گورستان مگر یہ خاک گردوں پایہ ہے
آہ اک برگشتہ قسمت قوم کا سرمایہ ہے

مقبروں کی شان حیرت آفریں ہے اس قدر
جنبشِ مژگاں سے بھی چشمِ تماشا کو حذر

کیفیت ایسی ہے ناکامی کی اس تصویر میں
جو آ نہ سکتی نہیں آئینہ تحریر میں

سوتے ہیں خاموش آبادی کے ہنگاموں سے دور
مضطرب رکھتی تھی جن کو آرزوئے ناصبور

قبر کی ظلمت میں ہے ان آفتابوں کی چمک
جن کے دروازوں پہ رہتا تھا جبینِ گسترِ فلک

کیا یہی ہے ان شہنشاہوں کی عظمت کا مآل
جن کی تدبیرِ جہاں بانی سے ڈرتا تھا زوال

اشک باری کے بہانے ہیں یہ ٹوٹے بام و در
گریۂ پیہم سے بینا ہے ہماری چشمِ تر

دل ہمارے یادِ عہدِ رفتہ سے خالی نہیں
اپنے شاہوں کو یہ امت بھولنے والی نہیں

عابد صدیقی

اُردو کا صحافتی ادب

اُردو زبان کی تاریخ ہندوستان کے عظیم تہذیبی ورثہ کی تاریخ ہے تہذیب ایک وسیع مفہوم ہے جس کے اندر زندگی کے اَن گنت پہلو اور ہمارے انفرادی و اجتماعی رویوں کے تمام خدوخال اپنی پوری جلوہ سامانیوں کے ساتھ دکھائی دیتے ہیں اُردو کی تمام اصناف کی تخلیقات کا مطالعہ کیجئے تو ہمارے تہذیبی تسلسل کی مبسوط اور جامع تاریخ سے روشناس ہونے کا موقع ملتا ہے اس زبان نے زندگی سے اپنے تعلق کو ہمیشہ استوار رکھا انسانی سماج کی بدلتی ہوئی ہر کروٹ کی چاپ اُردو کی تخلیقات میں صاف سنائی دیتی ہے اس لئے انسانی اقدار کے ساتھ ساتھ یہ زبان بھی زندہ ہے اور زندہ رہے گی۔ درباروں، خانقاہوں اور بازاروں سے ہوتی ہوئی غلامی کے اندھیروں سے آزادی کی روشنی تک اور پھر قومی تعمیر نو کی سرگرمیوں کے ایک ایک منظر کو اُردو زبان نے اپنے اندر جذب کیا ہے ملک کی شاید ہی کوئی ایسی زبان ہوگی جس میں زندگی کے سارے تار و پود اتنی منظم حالت میں مل سکیں۔ اُردو نے مختلف زبانوں کے الفاظ ہی جذب نہیں کئے بلکہ کلاسیکی و جدید زبانوں کے اسلوب اور رجحانات کو بھی قبول کیا اور اتنی خوبصورتی سے انہیں جذب کیا کہ اُردو میں ڈھلنے کے بعد ان کی بیگانگی اور اجنبیت کا شائبہ تک بھی نہ ہو سکا۔ اُردو زبان پر ملک میں وقوع پذیر ہونے والی تحریکات نے ہمارے ادبی رجحانات کو نیا لہجہ، منفرد اسلوب اور گہرائی سے مالا مال کیا ہے شاعری، کہانی، ناول، تنقید، سیرت نگاری اور تاریخ نویسی میں دُنیا کے عظیم ادب کے اسٹائل اور لب و لہجہ کو اختیار کر کے اُردو کو انتہائی طاقتور اور اس کے دامن کو زیادہ کشادہ کیا گیا۔ اُردو زبان کی وسعت، پھیلاؤ اور اس کی مقبولیت کا راز یہی ہے کہ اس نے مغربی زبانوں کے

ادب اور صحافت کو نہایت عمدگی سے اپنایا ہے اور اس پیروی میں اس نے ہندوستانی تہذیب و ثقافت کی صحت مند روایات اور اپنی انفرادیت کو باقی و برقرار رکھا ہے یہ اشارہ آپ کو دنیا کی شاید چند ترقی یافتہ زبانوں میں ہی ملیں گے اردو نے جہاں دنیا کی مختلف زبانوں کے اصناف ادب سے ترقی و رہنمائی حاصل کی وہیں اردو صحافت بھی مغرب کی دین ہے اردو صحافت کی عمر تقریباً ڈیڑھ صدی کی ہے ٹیپو سلطان کی سرپرستی میں شائع ہونے والے فوجی اخبار سے لے کر آج ملک میں شائع ہونے والے سینکڑوں اخبارات تک اردو صحافت نے ہماری تاریخ، ادب، سماج اور تہذیب کو جو زندگی و تابندگی بخشی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے آج ملک میں اردو اخبارات تعداد کے لحاظ سے چوتھے نمبر پر ہیں اردو کے اس وقت لگ بھگ ۱۲۳۴ اخبارات ملک بھر سے شائع ہو رہے ہیں اور اس وقت ہندی کے بعد سب سے زیادہ اخبارات اردو میں شائع ہو رہے ہیں۔ ان اخباروں کی تعداد اشاعت ۲۰ لاکھ سے زیادہ ہے اردو اخبارات آج بھی سیاسی واقعات، تبصروں اور ترقیاتی سرگرمیوں کے علاوہ زبان و ادب کی نمایاں خدمات انجام دے رہے ہیں یہ بات ملک کی دوسری زبانوں کے بہت کم اخبارات میں ملتی ہے۔ اردو کے صحافتی ادب پر بحث کرنے سے پہلے مناسب ہوگا کہ ہم ادب اور صحافت کے نازک فرق اور ان کے رول پر غور کریں ہمبر تاشد شاد نے کہا تھا کہ پہلا ادب عالیہ صحافت ہے بعض ادبی تحریروں نے اپنے وقتی اور عارضی اثر کے باعث صحافت کا رول انجام دیا ہے اور بعض اخباری مضامین وقتی موضوع پر ہونے کے باوجود ادب عالیہ میں شمار کیے گئے ۔ "الہلال" اور "البلاغ" کے بعض مضامین اگرچہ وقتی موضوعات پر مبنی تھے لیکن ہم ان کا شمار ادب عالیہ میں کرتے ہیں ۔ ادب اور صحافت دونوں ہی ترسیل کے وسیلے ہیں، ادب میں ذاتی خیالات و افکار مشاہدے اور تجربوں کا نچوڑ ہے جبکہ صحافت سماج اور کمیونٹی کے خیالات اور قبیلے کے خیالات و تجربات کی ترجمانی کرتی ہے ادب کم حقیقت پسند، تخیل اور آئیڈیل ہوتا ہے صحافت میں حقیقت پسندی اور واقعیت پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ صحافت میں وقت اور موقع کو بنیادی اہمیت حاصل ہے جبکہ ادب وقت، زمانہ اور زماں و مکاں سے ماورا ہوتا ہے صحافتی تحریر مختصر اور جامع اور واقعات کو جوں کا توں بیان کرنے والی ہوتی ہے۔ صحافت میں کسی بھی واقعہ کا کلائمکس پہلے اور واقعہ کی تفصیلات بعد

میں دکھائی دیتی ہیں۔ ادب میں کلائمکس رفتہ رفتہ اختتامی مراحل پر رونما ہوتا ہے۔ اعلیٰ تحریروں میں دھندلاپن اور مبہم خیالات کے لئے بھی جگہ ہے پھر جذبات و احساسات کو تفصیل اور وضاحت کے ساتھ پیش کرنے کی آزادی رہتی ہے ادب لافانی اور لازوال ہو سکتا ہے لیکن اخبار کی تحریر کو لافانی نہیں کہا جا سکتا۔ ادب میں اسلوب اور ہیئت کو ترجیحی اہمیت حاصل ہے صحافت میں موضوعات کے اعتبار سے حق کی اہمیت واضح ہوتی ہے لیکن ادب میں ایک موضوع کے تحت بے شمار مضامین کا احاطہ کیا جا سکتا ہے ہمارے ملک میں ایسے کئی صحافی ہیں جنہوں نے صحافت کے علاوہ ادب میں بھی نمایاں کارنامے انجام دیئے ہیں سرسید، ابوالکلام سے خواجہ احمد عباس اور قرۃ العین حیدر تک یہ فہرست طویل ہے لیکن اہم بات جو ادب اور صحافت کے فرق کو واضح کرتی ہے وہ یہ کہ ادیب کے پیشِ نظر مخصوص قاری نہیں ہوتے لیکن ہر اخبار کو پڑھنے والا ایک خاص حلقہ ہوتا ہے صحافت اور ادب کے اس فرق کے باوجود دونوں کا ایک مشترکہ مقصد ہے اور وہ ہے ترسیل۔ ترسیل کے اظہار پیرائے الگ ہیں لیکن دونوں وسیلے انسانی تجربات، احساسات اور زندگی کی بے شمار صداقتوں کے مظہر ہیں صحافت کا بنیادی مقصد حالات سے باخبر رکھنا اور رائے عامہ کو ہموار کرنا ہے لیکن یہ کام ادب نے بھی انجام دیا ہے راست نہ سہی بالواسطہ ادب نے خاص عمل کو انجام دیا ہے یورپ میں روسو جیسے ادیب کی تحریروں نے انقلابِ فرانس کو ایک خوش آئند جہت عطا کی۔

مغربی ممالک میں گذشتہ دس بارہ برسوں سے ادب اور صحافت دوش بدوش چل رہے ہیں ان میں زبان، اسلوب اور اندازِ بیان کی بھی یکسانیت پائی جاتی ہے پہلے عہد میں ادب، صحافت واقعات کا اظہار ہے اور ادب واقعات کو خیالات میں تبدیل کرنے کا نام ہے اب صحافت میں واقعات اور خیالات یکجا ہو رہے ہیں اور ادب خیالات کے ساتھ واقعات کو پیش کر کے لوگوں کو بصیرت اور مسرت کے سامان فراہم کر رہا ہے۔

اردو میں یوں تو مولوی محمد باقر کے اردو اخبار سے ہی ہمارے صحافتی ادب کا آغاز ہوتا

ہے پھر اودھ پنچ نے اخبار کے ذریعے ایک ایسا ادب پیش کیا جو وقتی ہونے کے باوجود ادبی چاشنی سے بھرپور تھا سرشار کے فسانۂ آزاد کا جہاں ادبی مقام ہے وہاں اردو کے نقادوں نے اسے صحافتی تحریروں کا بھی نام دیا ہے آزاد کے قسط وار مضامین لکھے گئے اس دور کی معاشرت کا عکس تھے لیکن ان میں جو چیدہ چیدہ واقعات پیش کیے جاتے تھے انہیں ہم صحافتی ادب کے زمرہ میں رکھ سکتے ہیں۔

۱۹ اور بیسویں صدی کے دوران اردو ادب میں تجربات کو زیادہ حوصلہ ان شخصیتوں سے ملا جو کہ صحافت سے وابستہ رہے ہیں ان میں عبدالحلیم شرر بھی شامل ہیں جنھوں نے اپنے ماہنامہ "دلگداز" کے ذریعے اردو ادب میں کئی تجربے کئے۔ شرر اپنے ہم عصروں کے مقابلے میں زیادہ مقبول نہیں تھے لیکن انھوں نے اردو کو جو رنگ و آہنگ دیا ہے وہ ناقابل فراموش ہے صحافت کے فروغ اور اطلاعات کی مسلسل ترسیل کے باعث لوگ سماجی حقائق سے وابستہ ہوتے گئے۔ اس کے نتیجہ میں اردو ادیبوں کو اپنی تحریروں میں زیادہ حقائق کو پیش کرنے کا موقع ملا اور ان کی نگارشات حقیقت پسندانہ بن گئیں۔ صحافت کے باعث سماجی بصیرت اور سائنسی شعور کو بڑھاوا ملا اور نئے اسلوب کی داغ بیل پڑی۔

اردو کے صحافتی ادب کے باقاعدہ آغاز کا سہرا سر سید کے سر ہے سر سید ۱۸۶۹ء میں انگلستان گئے وہاں انہیں ممتاز برطانوی ادیب ایڈیسن اور اسٹیل کے جرائد ٹیٹلر اور اسپکٹیٹر TATLOR اور SPECTATOR کو دیکھنے کا موقع ملا۔ ان پرچوں کی عوامی مقبولیت اور اس کے معیار کے ساتھ ساتھ انہیں ان پرچوں کا اسٹائل بہت پسند آیا ان کے نزدیک خیال کو بنیادی اہمیت حاصل تھی اور الفاظ خیال کے ابلاغ و ترسیل کا محض ذریعہ تھے۔ سر سید نے طے کر لیا کہ وہ اس صحافتی انداز تحریر کو ادب میں رواج دیں گے تاکہ ادب مقفیٰ مسجع عبارتوں اور لفظوں کے سحر سے آزاد ہو جائے چنانچہ انھوں نے ۱۸۷۰ء میں تہذیب الاخلاق جاری کیا۔ اس پرچے کے مضامین سماجی اصلاح

[illegible]

امتنان کیا ہے کہ "میری مثال ایسے شخص کی ہے جس کے گھر آگ لگ گئی ہو اور وہ بے تحاشا مدد کے لئے چلا رہا ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسے موقعہ پر جو کچھ کہا جائے یا لکھا جائے اس میں لفاظی اور ادبی صناعی سے احتراز کیا جائے گا"۔

سرسید کا یہ اسلوب اس قدر عام ہوا کہ ان کے مخالفین نے بھی ان کے خلاف جو مضامین لکھے ان میں اسی اسلوب کو اپنایا، سرسید تہذیب اخلاق میں ادب اور صحافت کے فاصلوں کو سمیٹتے نظر آتے ہیں سرسید کے بعد ادیبوں کی ایک خاص تعداد نے اس اسلوب کو اختیار کیا جو صحافت کا اسلوب تھا۔

کلکتہ سے ابوالکلام آزاد کے "الہلال" اور "البلاغ" کو بظاہر ہم اخبارات کا نام دیتے ہیں لیکن ان کی تحریروں میں جو ادبی چاشنی اور شگفتگی ملتی ہے انہیں ادب عالیہ میں شمار کیا جاسکتا ہے مولانا ابوالکلام آزاد کے بعد نیاز فتح پوری نے "نگار" اور مولانا عبدالماجد دریاآبادی نے "صدق جدید" کے ذریعے ادب کو جو صحافتی اسلوب دیا ہے اس کی پیروی ابھی جاری ہے۔ آزادی سے پہلے ہمارے اردو اخبارات کے مضامین نے غیر معمولی ادبی خدمت انجام دی ہے۔ "ہمدرد" میں مولانا محمد علی کے مضامین "برکت کی زبان اور میکالے کا قلم بن کر ابھرے بجنور سے "مدینہ" اخبار کے علامہ بدر جلالی نے صحافت کو خیالات و جذبات کی ترسیل کی سب سے بڑی طاقت بنادیا۔ ماسٹر رامچندر کے مضامین کو ہم صحافتی ادب کا نام دے سکتے ہیں اسی طرح آج جو ہمارے سائنسی ادب کو بھی صحافتی ادب کے زمرہ میں شامل کیا جاسکتا ہے ترقی پسند تحریک نے بھی ہمارے صحافتی ادب کو نمایاں جگہ دی ہے۔

منٹو، عصمت، خواجہ احمد عباس، بیدی، کرشن چندر، سردار جعفری، عزیز احمد اور ایسے کتنے ہی ادیبوں نے وہ ادب پیش کیا جس نے اپنے وقت کو جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا اس سلسلہ میں نیا ادب سویرا اور پیام کی خدمات کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ مغرب میں آج ادب اور صحافت ہمقدم ہیں مارشل ملکوہان، سارترے، ایچ جی ویلز اور ربیکا ویسٹ کی تحریروں میں جو اسلوب ملتا ہے وہ

([illegible])

مرتبہ: نعیم الدین رضوی
114. پی (اردو ساکا) اجاسر نگر
نئی دہلی ۲۵

"کاغذی ہے پیرہن" پر مذاکرہ

اُردو کے ممتاز شاعر سید مظفر احمد ضیاؔء الدنی کے شعری مجموعے "کاغذی ہے پیرہن" پر ممتاز ادبی تنظیم "دبستان" کے زیر اہتمام بتاریخ ۲۲ فروری سنڈ ایک مذاکرہ منعقد ہوا۔ جلسے کی صدارت اور کتاب کی رسم اجرا کے فرائض پروفیسر عنوان چشتی نے انجام دیئے۔ اس جلسہ میں "دبستان" کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر سجاد سید کی دعوت پر کراچی سے بیگم ضیاؔء الدنی تشریف لائیں۔ اور انہوں نے اس جلسہ میں مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ دبستان کی یہ سادہ اور پُر وقار تقریب ادیبوں، شاعروں اور نقادوں کی ایک قوسِ قزح معلوم ہوتی تھی۔ اس میں ڈاکٹر توقیر احمد خاں، مولانا نعیم الدین رضوی، جناب کمال جعفری ایڈیٹر "مخدوم جہاں" نئی دہلی جناب عطا عابدی سب ایڈیٹر انکار ملی نئی دہلی اور جناب عمران عظیم نے "کاغذی ہے پیرہن" پر خاص طور سے اپنے اپنے مخصوص انداز میں اظہارِ خیال کیا۔ اُردو کے منفرد شاعر اور نقاد پروفیسر عنوان چشتی نے کتاب کا اجرا کرتے ہوئے فرمایا کہ " ضیاؔء الدنی اُردو کے ایک مخلص اور اہم شاعر ہیں، دردمندی، صلابت اور عالمگیر انسانی اقدار کا تصور اُن کی شخصیت کا طرۂ امتیاز ہے وہی اُن کی شاعری کا جوہر بھی ہے ضیاؔء الدنی نے اپنے رنگ افشاں جذبات اور مجروح تمناؤں سے زیادہ زندگی کے متنوع داغ، کرب و کیف اور تہہ در تہہ کیفیات کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے پروفیسر عنوان چشتی نے یہ بات زور دے کر کہی کہ ضیاؔء الدنی کی شاعری میں غم کی ایک زیریں لہر ملتی ہے جو وہ [illegible]ان کی زندگی اور شاعری پر محیط ہے۔ پہلی وجہ ہجرت کا المیہ ہے۔ انہوں نے اپنے وطنِ عزیز ہندوستان

کی سرزمین کو خیرباد کہا۔ اپنے خون کے رشتوں اور سماجی وجذباتی رشتوں سے دوری و مہجوری کے غم کو برداشت کیا دوسری وجہ نئی زمین پر آباد ہونے اور نئے معاشرے سے متصادم ہونے اور اس میں اپنی جگہ بنانے کے مسائل شامل ہیں۔ ضیاء الدین کی شاعری اسی تضاد اور تصادم کی کہانی سناتی ہے لیکن ان کا کارنامہ یہ ہے کہ شاعر نے یاسیت، مردم بیزاری، شکست خوردگی سے اپنا دامن بچا کر زندگی کے میدان میں ہمت، خلوص اور تہذیب و شرافت کو اپنی زندگی اور شاعری کا معیار بنایا ہے۔ ان کی شاعری میں ایک رنگ اسلامی افکار تہذیبی اقدار اور عالمگیر انسانی وحدت کا بھی ہے پروفیسر عنوان چشتی نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا کہ ان کی شاعری کے پس پردہ ایک بے نام چہرہ بھی نظر آتا ہے اور وہ بیگم ضیاء الدین کی شخصیت کے سوا دوسرا اور کوئی نہیں ہوسکتا۔

ڈاکٹر توقیر احمد خاں نے کہا کہ ضیاء الدین کی شاعری میں حسی پیکر تراشی کے خوبصورت مرقعے ملتے ہیں آذ ویرانے، غم، تاریکی، حیات اور خرابات وغیرہ الفاظ حسی پیکر ہیں جو ان کے قلبی درد کی عکاسی کرتے ہیں ان کے یہاں جو پیکر سوچ کے دھاروں پر رقص کرتے ہیں ان میں زیادہ تر تعداد فطری اور تہذیبی پیکروں کی ہے جو شاعر کے فطرت سے گہرے لگاؤ اور تہذیب سے شدید لگاؤ کی غمازی کرتے ہیں۔ ضیاء الدین کا غزل کی صنف میں اہم کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے قدیم اور روایتی پیکروں کو نئے تقاضوں سے ہم کنار کیا ہے اور ان سے نئے مفاہیم پیدا کیے ہیں۔

جناب کمال احمد جعفری نے کہا کہ ضیاء الدین کی غزلوں میں روایت کی پختگی اور جدت کا حسن دونوں چیزیں ملتی ہیں ان کی شاعری میں اسلوب کی تازگی اور احساس کی دھیمی آنچ محسوس ہوتی ہے کمال جعفری صاحب نے سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا کہ شاعر کو زبان و بیان پر مہارت حاصل ہے انہیں جگ بیتی کو آپ بیتی اور آپ بیتی کو جگ بیتی بنا کر پیش کرنے کا ہنر آتا ہے۔

مولانا نعیم الدین رضوی نے کہا کہ ضیاء الدین کی شاعری کا سرچشمہ بنیادی طور پر وحی الٰہی ہے وحی الٰہی کے دو پہلو ہیں۔ ایک کتاب مبین اور دوسرا حدیث مقدس۔ اس کے علاوہ انہوں نے عصری زندگی کے مظاہر اور مناظر سے بھی اپنی شاعری کا تانا بانا تیار کیا ہے۔ لیکن ان کی شاعری میں روحانی رنگ، اسلامی افکار اور تہذیبی بصیرت

کا گہرا رنگ نظر آتا ہے۔ یہ رنگ ضیاء الدّین کی حمدوں، نعتوں اور غزلوں کی ہر سطح پہ دیکھا جا سکتا ہے۔ مولانا نعیم الدین رضوی نے یہ بات زور دے کر کہی کہ ضیاء الدّین کی شاعری کا وہ حصہ خاص طور پر اہم ہے جو مذہبیت اور روحانیت سے گہرا رشتہ رکھتا ہے۔

جناب عطا عابدی نے کہا کہ ضیاء الدّین غزل کی روایت بے نہایت کی نفاستوں کے علمبردار ہیں اُن کی شاعری میں ایک طرف روایت کا حُسن اور دوسری طرف جدید تقاضوں کا اجمال نظر آتا ہے انہوں نے اپنی غزلوں میں ذات کے کرب کے علاوہ کائنات کے مسائل کو بھی جگہ دی ہے اُن کی شاعری میں قدروں کے بننے اور ٹوٹنے کا عمل صاف طور پر دکھائی دیتا ہے جس سے شاعر کے بالیدہ شعور اور شدتِ احساس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے عطا عابدی صاحب نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا کہ ضیاء الدّین کے کلام میں فنی پختگی اور قادر الکلامی کے آثار ملتے ہیں لیکن اسی کے شانہ بشانہ نیا ادبی ڈکشن بھی موجود ہے جو شاعر کے کلام کے طرز پیش کش کو دو آتشہ بنا دیتا ہے۔

عمران عظیم نے کہا کہ ضیاء الدّین کی شاعری میں قدیم اور جدید لہجے کا سنگم ہے اُن کے کلام میں ایک طرف فن کا رچاؤ اور دوسری طرف جدید اُسلوب کا رنگ دکھائی دیتا ہے یہی صورت معنوی سطح پر بھی نظر آتی ہے شاعر نے ایک طرف کلاسیکی افکار و اقدار سے استفادہ کیا ہے اور دوسری طرف اپنے عہد کی شکست و ریخت اور انسان کی پیچیدہ نفسیات کو انگیز کیا ہے۔

ڈاکٹر سجاد سید نے کہا کہ ضیاء الدّین کی شخصیت تہذیب و شرافت کے ساتھ عزم و عمل کا بہترین نمونہ ہے انہوں نے غیر یقینی ماحول میں آنکھ کھولی۔ ۱۹۴۸ء کا خونی سمندر پار کیا اور اجنبی زمین سے محبت کر کے اپنی محنت اور دیانت کا پرچم لہرا دیا۔ ڈاکٹر سجاد سید نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ ضیاء الدّین کی شخصیت میں متانت اور وجاہت کا اچھا امتزاج ہے وہ ایک جاذب نظر اور پُرکشش شخصیت کے مالک ہیں مزاجاً سنجیدگی ہے مگر بے تکلف دوستوں میں اُن کی خوش مزاجی کا جوہر کھلتا ہے کم سخن ہیں مگر جب بولتے ہیں تو مخاطب کو متاثر کرتے ہیں ضیاء الدّین کی شخصیت مشرق و مغرب کی بہترین اقدار کا جیتا جاگتا نمونہ ہے

اس جلسے میں اُردو کے بہت سے ممتاز لکھنے والے موجود تھے۔ جن میں لندن کے جناب سید محمود لیمان،

(بقیہ صفحہ ۴۴ پر)

تبصرہ نگار: محمد منظور احمد
1/732-22-4 دارالشفاء
حیدرآباد 500024

(تبصرہ)

قرآن فہمی - آسان راستہ

حصہ دوم

مرتبہ : ڈاکٹر حسن الدین احمد

جناب ڈاکٹر حسن الدین احمد حیدرآباد کے ایک ممتاز علمی گھرانہ سے تعلق رکھتے ہیں مطالعہ بچپن ہی سے ان کا محبوب مشغلہ رہا ہے قسمت نے ان کے دل میں زبان، ادب سماج اور انسانیت کی پُر خلوص خدمت کا جذبہ ودیعت کیا ہے وہ پچھلے کئی برس سے تصنیف و تالیف میں مسلسل مصروف و منہمک ہیں اُن کی متعدد تصانیف اور تالیفات شائع ہو چکی ہیں ان میں اُردو الفاظ شماری، سازِ مغرب کی دس جلدیں، سازِ مشرق کے دو حصے اُردو ترجمہ شریمد بھگوت گیتا، سوانحی تاثراتی مضامین پر مشتمل مجموعے "انجمن" اور "محفل" شامل ہیں۔ انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی سے پی ایچ ڈی بھی کیا ہے ان کے پی ایچ ڈی کے مقالہ کا عنوان تھا۔ "انگریزی شاعری کے منظوم اُردو ترجموں کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ" یہ مقالہ زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکا ہے۔

قرآن فہمی (آسان راستہ) اُن کی بے حد اہم تالیف ہے یہ کتاب موضوع سے ان کی گہری دلچسپی اور والہانہ وابستگی کا بیّن ثبوت ہے انھوں نے خلوص دل سے اس بات کی کامیاب کوشش کی ہے کہ غیر عربی داں حضرات کی قرآن مجید کے متن کے بآسانی واقفیت کے لئے سیدھے راستے کی طرف رہبری کی جائے خود جناب ڈاکٹر حسن الدین احمد کے خیال کے مطابق آسمانی کتاب قرآن مجید کے سمجھنے کے لئے اس کا براہ راست مطالعہ ضروری ہے قرآن کی تفسیر قرآن میں نہ ملے تو سنت کی طرف رجوع ہونا چاہئے کیونکہ بلا شبہ سنت قرآن کی شارح ہے اللہ تعالیٰ کے کلام کو سمجھنے کے لئے تراجم اور تفاسیر سے بھی مدد لینا چاہئے۔ یہ آسمانی کتاب بلا شبہ سرچشمۂ ہدایت ہے اور اس میں انسان کے لئے مکمل ضابطۂ حیات موجود ہے۔

کتاب "قرآن فہمی" کی تالیف کا اہم مقصد یہ ہے کہ قرآن کی تعلیمات کو ... صدق دل سے

عمل کیا جائے اور قرآن کی روح سے ذہن کو ہم آہنگ کیا جائے۔ اس طرح ڈاکٹر حسن الدین احمد کی یہ تالیف قرآن فہمی کے لئے آسان راستہ کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔

قرآن فہمی حصہ دوم، سلسلۂ مطبوعات قرآن فہمی کا پروجیکٹ نمبر ۲ ہے

(۱۸۷) صفحات پر مشتمل اس کتاب میں ان عنوانات کے تحت اہم اور بیش از معلومات مواد پیش کیا گیا ہے۔

"ابتدائی باتیں" کے زیر عنوان کتاب میں پیش کئے گئے مواد کی آسان اور سلیس زبان میں وضاحت کی گئی ہے یہ باب (۲۲) صفحات پر محیط ہے۔

قرآن مجید کی (۳۷) اصطلاحات اور ان پر وضاحتی نوٹ کے لئے (۳۲) صفحات مختص کئے گئے ہیں اس کے بعد قرآن مجید کے (۵۶) قرآنی الفاظ دیئے گئے ہیں اور ان پر وضاحتی نوٹ تحریر کیا گیا ہے جو (۳۵) صفحات پر مشتمل ہے۔

کتاب قرآن فہمی (آسان راستہ) حصہ دوم کے آخری حصہ میں قرآن مجید کے (۵۴۱) منتخب اقوال اور جواہر پارے، اردو ترجمے کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں۔

نوجوان طبقہ اگر صرف اس آخری حصے کو بھی نہایت توجہ اور گہری دلچسپی کے ساتھ حفظ کرلے اور اس حصے میں پیش کی گئی قرآن مجید کی منتخب آیات کے ترجمہ اور مطلب کو سمجھ اور ان کو اپنی عملی زندگی میں ہمیشہ پیش نظر رکھے تو وہ یقیناً فلاح دارین کا مستحق ہوگا۔ اس مطالعہ کی بدولت وہ نہ صرف اپنی زندگی میں در پیش مشکلات و مصائب کا جرأت سے مقابلہ کرسکے گا بلکہ انسانی سماج کی تشکیل بہبود و بہتر اور اس کی خدمت کے سلسلے میں روحانی مسرت محسوس کرسکے گا اور عرفانِ نفس اور حق آگاہی کی نعمتِ غیر مترقبہ کا مستحق ہوگا اس سے تہذیبِ نفس میں بھی مدد ملے گی۔

"قرآن فہمی" سمجھ کر پڑھنے والوں کے لئے ایک انمول تحفہ ہے۔

جناب ڈاکٹر حسن الدین احمد نے کچھ عرصہ قبل قرآن فہمی (آسان راستہ) کی پہلی جلد شائع کی تھی تالیف (۱۳۰) صفحات پر مشتمل ہے اس کے دو حصے ہیں پہلے حصے میں المیزہ بعض الفاظ کی فہرست

دی گئی ہے جن کی تکرار قرآن مجید میں دس اور دس سے زائد ہے ان الفاظ کے انگریزی اور اردو معنی بھی دیئے گئے ہیں۔ اس کتاب کے حصہ دوم میں (۹۷۶) اُن الفاظ کی فہرست ہے جن کی تکرار قرآن میں پانچ سے نو تک ہے یہ الفاظ بھی انگریزی اور اُردو معنوں کے ساتھ شامل اشاعت ہیں ان کے علاوہ انگریزی اور اُردو معنوں کے ساتھ (۳۹) الفاظ کی فہرست ہے جن کی تکرار قرآن مجید میں ہے اور جن سے واقفیت ضروری ہے۔

ضمیمہ کے عنوان کے تحت (۳۴۳) قرآنی اصطلاحات کی فہرست شامل اشاعت ہے قرآن مجید۔ (۹۴) نمائندہ الفاظ کی فہرست بھی قرآن فہمی حصہ اول میں شریک کی گئی ہے جن سے اسلام کے خدوخال نمایاں ہوتے ہیں۔ اس کتاب کے آخری حصے میں انگریزی اور اردو معنوں کے ساتھ (۱۹) منتخب قرآنی ضرب الامثال ہیں۔

قرآن فہمی حصہ اول کا آغاز "ابتدائی باتیں" اور کچھ اور باتیں" کے عنوانات کے تحت ہوا ہے جن "خود مولف نے کتاب کے مشمولات کا گہری نظر اور تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔ کتاب کا یہ حصہ بھی بجائے خود دلچسپ اور معلومات افزا ہے۔

قرآن فہمی (آسان راستہ) حصہ دوم کی طباعت جید پریس بلیماران دہلی میں ہوئی ہے کتابت (اُردو متن) جناب محمد عارف الدین نے کی ہے۔ قیمت پندرہ روپے ہے۔

پبلشر: وقف بیت المدینہ اور ملنے کا پتہ:۔

عزیز باغ۔ سلطان پورہ۔ حیدرآباد ۲۴...۵۰۰۔ آندھرا پردیش

بقیہ سلسلہ صفحہ ۳۱ سے آگے

محترمہ نسرین حامد نجیب آبادی، عرفان ذیشانی مظفر نگری، ماجد دیوبندی، مسعود فاروقی احمد اور صاحبین نیز پروفیسر آفاق دانش صاحب وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں "دبستان کی یہ ساف ستھری باوقار تقریب جامعہ نگر کے ادبی ماحول اور مزاج سے پوری طرح ہم آہنگ تھی۔ جس کی روشنی دیر تک اور دور تک ذہن اور دل کو منور کرتی رہے گی۔

تبصرہ

تبصرہ نگار: محمد عبدالوحید خان
ایم اے (لسانیات)، ایم اے (اردو)
ایم فل بی (عثمانیہ) پی ایچ ڈی اسکالر گلبرگہ یونیورسٹی
۲۲-۷-۲/۲۸۲ پرانی حویلی، حیدرآباد، اے پی

تصنیف: اسلام، عورت اور عصر حاضر
مصنف: ڈاکٹر رخسانہ نکہت لاری اُم ہانی

اس کتاب کی تقدس کا حرف اوّل یہ ہے کہ اس کا انتساب بنت مکانی دادی جان صاحبہ مرحومہ کے نام نامی سے ہے۔ افتتاحیہ مولانا سید ابوالحسن ندوی مدظلہ العالی، تقریظ پروفیسر عنوان چشتی صاحب اور محتسب کے فرائض پروفیسر اسلوب احمد انصاری صاحب نے انجام دیئے ہیں اس پر مستزاد پیش لفظ پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی فکر کا نتیجہ ہے۔ اصولی طور پر مصنفہ نے حرف چند تحریر کیا ہے۔ مذکور الصدر قابل قدر و معتبر ہستیوں کے رشحات قلم کے منصۂ شہود پر آتے ہی مجھ سے کم مایہ وناچیز کے حقائق تحریری تردد کے لئے میدان ہی نہیں رہا ہے چونکہ تبصرہ کے لئے اس خاکسار کو کچھ نہ کچھ ضبط تحریر کرنا ہے لہٰذا میں اتنی یاددہانی کرنا چاہتا ہوں کہ جید مذہبی شخصیت ندوی صاحب نے اس تصنیف اور تالیف اور ترتیب مضامین کے لئے یہ رقم کیا ہے کہ "پیش نظر کتاب مولفہ نے اگرچہ اپنی بہنوں کیلئے لکھی ہے لیکن اس سے ان کے مسلمان بھائی بھی مستفید ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے اور ان کی کتاب کو قبولیت سے نوازے۔"

پروفیسر اسلوب احمد انصاری صاحب نے محررہ کو توازن، سلامت روی زبان و بیان کے ایجاز و توسیل و ابلاغ لغوی و اشارتی پہلوؤں کو اجاگر کرنے پر مبارکباد دی ہے۔ آپ لکھتے ہیں کہ رخسانہ نے اعتدال میانہ روی، سوجھ بوجھ سے عورت و اسلام کا جائزہ لیا ہے۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے رخسانہ صاحبہ کے جذبہ دلی موزونی افکار و موزونی انداز بیان پر تبصرہ کیا ہے۔ روحانی و تہذیبی اقدار کو بحال کیلئے

اسلام، عورت اور عصر حاضر تصنیف دراصل رخسانہ صاحبہ نے بیان القرآن، تفہیم القرآن، تدبیر قرآن علامہ یوسف قرضاوی مدظلہ کی تحریروں سے استفادہ کرکے مرتب کی ہے ... عورت ہے مگر مرد بھی فیضیاب ہوسکتے ہیں مصنفہ کا یہ خیال اسلام کی جامد اصول کا نام نہیں بلکہ انسانی زندگی میں جاری و ساری ہونے والے چشمہ حیات کا نام ہے۔ صحیح ہے، اس کا پیام عالمی ہے۔ تیتیس (۳۳) عنوانات کے تحت خیالات قلمبند کئے گئے ہیں۔ اس کتاب کے مطالعہ ... ات

اور بالخصوص مذہبی معلومات سے مملو ہونا ضروری ہے تاکہ لذت یاب ہو سکیں "یاایھا الذین امنو کے تحت دینی تعلیم کی حقیقت بتلائی گئی ہے۔ تمام زندگی کو اللہ کی عائد کردہ حد بندیوں کے مطابق گزارنا ہی کو اصل دین بتلایا گیا ہے" یہی کتاب کی اصل ہے" مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق مومن کی تعریف کی گئی ہے۔ کتاب ملت بیضائی پھر شیرازہ بندی کسب معاش، قرآن پاک کی چند اخلاقی تعلیمات اور ہماری پستی ہم سب اپنے ماتحتوں کے متعلق جوابدہ ہیں۔ ان تمام مضامین میں قرآنی تراجم خوشگافوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ البتہ قرآن حکیم کے آئینے میں صنف نازک کی فطرت اس کے مقام کو قرآنی روشنی میں واضح کیا گیا ہے شوہر و شریک حیات کو ایک دوسرے کے لباس سے قرآنی انداز میں مخاطب کیا گیا ہے۔ سرکار دو عالم حضورؐ کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ "جو تم میں سے گھر بیٹھے گی وہ مجاہدین کے عمل کو پالیگی"۔ اس مضمون سے انصاف سے کام لیا گیا عورت و مرد کے حق و توازن کو واضح کیا گیا ہے۔ عورت کی موجودہ سماجی حیثیت مسائل عصر اور اس کا حل پیش کیا گیا ہے۔ یہی بات دہرائی گئی ہے کہ ہر عمل میں اللہ اور اسکے رسول کی خوشنودی خیال و فکر کے پیش ہے۔ تحریک اسلامی اور طالبات عالمانہ و خطیبانہ انداز کا حامل ہے۔ سب سربرا پردہ جان نکتہ معراج روحانی و جاذ معراج سے بحث کی گئی ہے۔ شب برات، رحمت کی گھٹائیں پھر سایہ فگن ہیں۔ عید پھر آئی ہے اللہ کی رحمت لیکر یہ رحمت خداوندی اور اللہ کی رحمت کا بے مثل مظاہرہ، لاکھوں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر۔ اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم۔ ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضہ کا کردار، سیدۃ نساء العلمین حضرت فاطمہؓ، حضرت عائشہ صدیقہ رضہ مکمل عورت مثالی خاتون جنت حضرت مریمؑ برگزیدہ خاتون عالم۔ دو مثالی خواتین پر یہ حقیقت تحت بالخیر ان تمام مذکورہ عنوانات و مضامین میں اقبال کا فکری و تفکری و تردد کا کمال و جمال موجود ہے۔ ہر سطر اور ہر لفظ میں اسلام و قرآن کی چھاپ اور اسلامی فکر غالب ہے۔ ناچیز کے خیال میں بجائے "اسلام عورت و عصر حاضر۔ عصر جدید" مسلم خواتین" کا عنوان اس تصنیف کے لئے بہتر ... تمام خواتین بھی اس سے بہرہ ... ہوجاتی اور اسلام سے روشناس بھی، مضامین کے مذہبی تحریری رنگ اختیار کیا گیا ہے اگر عمرانیاتی اور سماجی علوم سے متعلق تھوڑے سے رنگ کی آمیزش ہوجاتی تو بہتر تھا۔ زبان و بیان مواد سے انصاف کرتا ہے۔ مگر معمولی نوشت و

(بقیہ ملاحظہ صفحہ ۴۰ پر)

پروفیسر مدھو دنڈوتے
مرکزی وزیر خزانہ

خود کفالت کی جانب پیش رفت

میرے عبوری بجٹ پیش کرنے کی وجوہات بہت واضح ہیں میں پچھلی حکومت کے تیار کردہ بنیادی ڈھانچے کی بنیاد پر اپنا خاکہ تیار کرنا نہیں چاہتا۔ یعنی تجربات اور نئے کام شروع کئے جانے میں اس کے بعد ہی میں بجٹ پیش کرنا چاہوں گا لیکن اس سے پہلے ہم اقتصادی صورتحال کے بارے میں اہل وطن کو اعتماد میں لینا چاہیں گے یہی سبب ہے کہ ہم نے موجودہ اقتصادی صورتحال کے بارے میں ایک رپورٹ حال ہی میں تقسیم کی۔

میں ایک رائے کے بارے میں اظہار خیال کرنا چاہوں گا جس کے بارے میں مجھ سے کئی مرتبہ دریافت کیا گیا ہے ہمارے ایک ترجمان نے کہا تھا کہ حکومت کے خزانہ کے صندوق خالی ہیں یہ صورتحال بتانے کا ایک دلکش اور جاذب نظر طریقہ تھا جس سے اس کی تصویر آنکھوں کے سامنے کھینچ جائے۔ اس کو لغوی معنی میں نہیں لیا جانا چاہیئے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اقتصادی صورتحال قدرے مایوس کن ہے

اس کے ساتھ ہی یہ بیان کہ خزانہ کے صندوق خالی ہیں سچی بات کو کم کرکے بیان کرنا ہے کیونکہ خزانہ کے صندوقوں کے خالی ہونے سے بھی زیادہ برا قرضوں کا بوجھ ہے موجودہ شرحوں پر رواں مالی سال کے آخر میں کل قرضہ سو ہزار کروڑ یعنی دس کھرب روپے کا ہوگا ایسی صورتحال میں قرضہ جاتی خدمات کا تناسب کافی نمایاں ہوگا۔ ماہرین اقتصادیات کی نظر میں ۲۰ فی صد قرضہ جاتی خدمات کا تناسب خاصا محفوظ تناسب ہے لیکن جب اس سے تجاوز ہو جاتا ہے تو قرضہ کی امداد کو کم کرنے کی شروع

کی کوشش کی جاتی ہیں یہ اعلان نہیں کر رہا کہ قرضے نہیں لئے جائیں گے لیکن خصوصی اقدامات کرنے کی کوششیں کی جائیں گی۔

جس طرح ہم بتدریج زیادہ خود کفیل معیشت بنانے کے لئے کوشاں ہیں اس حد تک قرض لینے کی ضرورت قدرتی طور پر کم ہوگی اور اس سے بیرونی قرضوں میں کمی آئے گی اگر آپ مجھ سے ایک سیدھا سوال وضاحت کریں کہ کیا میں بین الاقوامی مالیاتی فنڈ اور دیگر مالی اداروں سے قرضہ لوں گا تو میں اس سوال کا واضح جواب نہیں دوں گا۔

لیکن ایک چیز پر میں زور دینا چاہوں گا وہ یہ ہے کہ ایسی صورتحال پیدا ہو جائے جس کے دباؤ کے تحت قرضے لینے کی ضرورت پڑ جائے تو ہم مالی اداروں کی ایسی شرائط قبول نہیں کریں گے جو ہماری اقتصادی اور مالی پالیسیوں کے خلاف ہوں اور ملک کے لئے باعث توہین ہوں۔ ہم اس امر کی اجازت نہیں دیں گے۔

درآمدات اور برآمدات کی پالیسی

جہاں تک درآمدات اور برآمدات کی پالیسی کا تعلق ہے یہ لائق تشویش ہے ہماری مالی اور اقتصادی پالیسیوں کا زیادہ عام طور پر اس بات پر ہوگا کہ جب درآمدات ناگزیر ہو جائیں تو درآمدات خاص خاص چیزوں تک محدود اور چیدہ چیدہ ہوں۔ درآمدات کے خاص خاص چیزوں تک محدود ہونے کے معنی یہ ہیں کہ چیدہ چیدہ اشیاء خاص خاص مواقع اور منتخب اوقات میں ہی درآمد کی جائیں۔ مثال کے طور پر جب گیہوں تیل کا معاملہ طے ہوا تھا تو سرکاری اداروں سے متعلق کمیٹی نے اتفاق رائے سے تیار کردہ اپنی رپورٹ میں واضح طور پر کہا تھا کہ تیل کی قیمتوں میں گراوٹ کے وقت زیادہ قیمت پر کیوں تیل کا معاملہ طے کرنا دانشمندانہ نہیں ہے اس لحاظ سے وقت کی اہمیت ہے۔ ہمیں اس چیز کو مدنظر رکھنا ہے تاکہ ہمارے غیر ملکی زرمبادلہ کے ذخیرے کی بربادی نہ ہو۔

بعض ایسی پیداوار کو مقصود رکھنے والی ٹکنالوجیاں ہیں جن کے لئے کل پرزے اور ساز و سامان درآمد کرنا ہوتا ہے اگر غیر ملکی زرمبادلہ کا کافی ذخیرہ نہیں ہے اور اس وجہ سے اس ساز و سامان اور متعلقہ کل پرزوں کو درآمد نہیں کیا جاتا تو سارا پیداواری عمل متاثر ہوگا اور ترقیاتی سرگرمیاں بھی متاثر ہوں گی۔ لہذا

ہمیں غیر ملکی زرمبادلہ کے ذخیرہ کی ضرورت ہے اور اس کے لئے ہمیں برآمدات بڑھانی ہوں گی تاکہ ہمارے پاس یہ ذخیرہ ہو سکے۔ لہذا بڑی بڑی مشینوں کی درآمد کا سوال بہت اہم ہے اس ضمن میں رہنما ہدایات بہت واضح ہوں گی لیکن اس کا طریقۂ کار تحکمانہ نہیں بلکہ حقیقت پسندانہ ہوگا۔

میں نے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ میں حرکت آفرینی اور خام خیالی کو خلط ملط نہیں کروں گا۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ عملی ہونا ایک چیز ہے اور خیالی باتیں کرنا دوسری چیز۔ خود کفیل معیشت کی تعمیر کی ترجیح خاص کر کثیر قومی اداروں اور مشترکہ کاموں پر زور نہیں ہونا چاہیئے۔ اس کے ساتھ ہی لینی شعبوں میں ٹکنالوجیوں کو درآمد کرنا ہے مثال کے طور پر برآمدات کے مقاصد کی تکمیل کے لئے۔ ایسے معاملوں میں جہاں کہیں بہت ضروری ہوگا ہم اس کا خیر مقدم کریں گے۔ صورتحال بہت اچھی نہیں رہی ہے۔ میں معیشت میں اعتماد اور بھروسہ کا عنصر لانا چاہتا ہوں۔ میں ملک میں اور بیرون ملک ایسا ماحول پیدا کرنا چاہوں گا جس سے سرمایہ کاری ہو اور عوام اس بات کا اندازہ لگا سکیں کہ سرمایہ کاری فائدہ مند ہوگی یا نہیں۔ اس کے لئے میں کوئی شک و شبہ پیدا نہیں کرنا چاہوں گا۔ اس کے لئے میں سرمایہ مارکٹ کے تاثرات واضح کروں گا ان کا ابتدائی رد عمل حالات کا جائزہ لینے اور انتظار کرنے کا تھا اور وہ ایسا ہر ایک کے ساتھ کرتے ہیں لیکن اس وقت صورتحال میں کافی لچک ہے اس کا کافی اچھا رد عمل رہا ہے اس کے ساتھ ہی بازار کی قوتوں پر رد عمل ظاہر کرنے میں ہماری حد بندیاں ہیں۔ ہم یہ نہیں چاہیں گے کہ عوام کے غریب ترین طبقات کو معاشی قوتوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے۔

بہت سے عوامل کی وجہ سے ہم دیکھ رہے ہیں کہ افراط زر میں اضافہ ہوا ہے بہت سے ایسے معاملے ہیں جن پر فوری توجہ کرنی ضروری ہے یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ بڑھتا ہوا خسارہ معیشت کے افراط زر کے بوجھ میں اضافہ کر رہا ہے یہ بات مکمل طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ اشیاء کی کمی سے کالابازاری کی معیشت کو فروغ ملتا ہے۔

ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ بعض ضوابط اور طریقے اور ٹیکس سے متعلق بعض پالیسیاں قدرے بوجھل ہیں یہ تاخیر کا سبب بنتی ہیں جو ترقی کی راہ میں رکاوٹوں کا باعث ہوتی ہیں اس کے علاوہ قوانین میں بعض کمیاں بدعنوانیوں کو راہ دیتی ہیں لہذا نئی سرکار کی پوری توجہ اصولی وضوابط کو سادہ بنانے پر ہونا چاہیئے۔ وہ ٹیکس کے قوانین ہوں یا لائیسنس دینے کی پالیسی ہو یا انتظامیہ کے ضوابط ہوں ان کو اس طرح سادہ بنایا جائے گا

کو سارا عمل کم بوجھل ہو جاتا ہے۔ اکثر جب قوانین بنائے جاتے ہیں تو ماہرین بیٹھ کر خامیاں تلاش کرتے ہیں تاکہ ان سے فائدہ اٹھایا جا سکے ہم ان چیزوں سے بچنا چاہیں گے۔ اس سلسلے میں کالے دھن کی معیشت کے لئے ٹھوس اقدامات کئے جائیں گے۔ ہم اس ناجائز دولت کو تلاش کریں گے اور اسے ختم کریں گے

ایک اور میدان فضول اخراجات کا ہے۔ میں اس وقت ہر چیز کو سمیٹنا نہیں چاہتا ہوں لیکن میں بڑی دلچسپی سے اندرون ملک اور بیرون ملک ہونے والے میلوں کے اخراجات دیکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان میں سے بہت سے اخراجات کی ضرورت نہیں تھی۔ میں فنون لطیفہ کے خلاف نہیں ہوں اخلاقی طور پر تنگ نظر نہیں ہوں۔ لیکن بالآخر ترجیحات متعین کی جاتی ہیں لہذا تمام فضول اخراجات میں کمی لانی ہے مثال کے طور پر اہم شخصیات کے تحفظ پر آنے والا خرچ بہت زیادہ ہے لیکن اکثر نفسیاتی پہلو بھی کام کرتے ہیں۔ قیمتوں کے معاملے میں بھی ایسا ہوتا ہے اکثر قلت پیدا ہو جاتی ہے جس سے قیمتوں میں اتار چڑھاؤ آجاتا ہے۔

پہلے دن ہم نے اعلان کیا تھا کہ ہم قیمتوں سے متعلق کمیٹی بنائیں گے اور اسباب کو دیکھیں گے قیمتوں پر قابو پانے اور ان میں کمی لانے کے لئے ٹھوس اقدامات کئے جائیں۔ یہ دیکھا گیا کہ جہاں تھوک بیوپاریوں نے بڑی مقدار میں چینی جاری کی وہاں چینی کی قیمتیں گرنے لگیں۔ یہ نفسیاتی پہلو ہیں جو مددگار ہوں گے لہذا سادگی کا ماحول بنانا ہوگا تاکہ فضول خرچی کو روکا جا سکے۔

یہ بھی دیکھا جائے گا کہ ملک میں ایسا نفسیاتی ماحول پیدا نہ ہو جس سے سرمایہ کاری کے خواہش مند افراد کے دلوں میں معیشت کی اندرونی صلاحیت کے بارے میں شکوک پیدا ہوں۔ میں یہ تاثر پیدا ہونے دینا نہیں چاہتا کہ ہماری معیشت دیوالیہ ہو گئی ہے اس کے برخلاف ہمیں اس بات کا پورا یقین ہے کہ ہم اپنی معیشت کی طاقت اور استحکام کو قائم رکھیں گے ہمیں یقین ہے کہ زیادہ خود کفالت غیر ملکی قرضے کے بوجھ کو بتدریج کم کر دے گی۔ ہمیں یقین ہے کہ سرمایہ کاری بڑھے گی۔ ہمارا طریقہ متوازن اور عملی ہو گا۔

اندرجیت لاہیری

مصنوعی سیاروں کا انقلاب

نویں دہائی بھارت میں اطلاعات کے میدان میں ایک انقلاب کی دہائی ہے نشریات، دور مواصلات اور ریموٹ سنسنگ کی معلومات حاصل کرنے کے کام میں مصنوعی سیاروں کا استعمال جو غیر ملکی جریدوں کے ذریعہ سنی سنائی بات تھی اب ایک حقیقت بن گئی ہے

۱۹۸۲ء میں ہندوستان کے قومی مصنوعی سیاروں کے پہلے سلسلے کے تحت انسیٹ I اے کے داغے جانے کے ساتھ مصنوعی سیاروں کی ٹکنالوجی کا آغاز ہوا۔ خلائی کمیشن کے چیئرمین یو آر راؤ کے مطابق یہاں دو سیارے داغنے کا منصوبہ تھا ایک جو فائدہ سے بہرہ مند ہونے کے اور دوسرا جو فاضل رہے اور بروقت ضرورت کام آسکے۔ یہ کثیر مقاصد والا مصنوعی سیارہ جسے کافی شہرت حاصل ہوئی تھی تباہی کا شکار ہو گیا اس مصنوعی سیارے سے نشریات، دور مواصلات اور موسمیات کے شعبہ میں انقلاب لانے کی توقع تھی ملک کی ضروریات پوری کرنے کے لئے ایک انٹیلیسٹ مصنوعی سیارہ استعمال میں لایا گیا۔

نشریات میں انقلاب

دوردرشن کے چیف انجینئر او۔ پی۔ کھوشو کے مطابق جس وقت بھارت انسیٹ I بی کے داغے جانے کا منتظر تھا اس سے اگلے برس ٹیلی ویژن وجود میں آیا۔ ۱۹۸۲ء میں قومی نیٹ ورک کی ابتداء ہوئی جس نے پروگرام کی تیاری کے سات مراکز کو جوڑ دیا۔ سادہ کے بجائے رنگین ٹیلی ویژن کا آغاز ہوا اور ایشیائی کھیل منعقد ہوئے اور دوردرشن پر دکھائے گئے۔ اس برس دوردرشن کو سب سے زائد یعنی ایک ہزار کروڑ روپے کی آمدنی ہوئی۔

دور درشن کے ڈائرکٹر جنرل شیوالیس شرما کا کہنا ہے کہ بعد ازاں ہم نے پیچھے کی طرف مڑکر نہیں دیکھا۔

اس سلسلے کے ایک اور مصنوعی سیارے انسیٹ I بی کے داغے جانے میں ایک برس اور لگ گیا اور اس کے فائدے پوری طور پر ملک کو ملنے لگے۔ حکومت نے اپنے پروگراموں کو 70 فی صد آبادی تک پہونچانے کا فیصلہ کر لیا۔ زیادہ طاقت والے ٹرانسمیٹروں کے ساتھ یہ چیز ممکن نہیں تھی۔ لہٰذا دور درشن نے کم طاقت ٹرانسمیٹر لگائے اور اس طرح ترسیل کی حکمت عملی میں تبدیلی آئی۔ یہ کس طرح ہوا؟ شری عشو کا کہنا ہے کہ عام طور پر کم طاقت ٹرانسمیٹروں کے لئے سول امداد اور بنیادی ڈھانچے کی ضرورت ہوتی ہے چھوٹے ٹرانسمیٹروں میں ایسی کوئی مجبوری نہیں ہوتی۔ ہم نے ایک اچھی جگہ تین چار کمرے کرائے پر لیئے بجلی کی کمی کی پریشانی بھی نہیں رہی۔ کم طاقت والے ٹرانسمیٹر کے لئے ایک کلوواٹ بجلی کی ضرورت ہوتی ہے جتنی کہ عام طور پر گھر میں ہوتی ہے اس کے برخلاف زیادہ طاقت والے ٹرانسمیٹر میں ۱۰۰ کلوواٹ بجلی صرف ہوتی ہے کم طاقت والے ٹرانسمیٹر اندرون ملک دستیاب ٹیکنیکل مہارت سے تیار کیئے جا سکتے ہیں صرف ساز و سامان ہی کی بات نہیں ہے ایشیائی کھیلوں میں جو خاکہ (بلیو پرنٹ) تیار ہوا تھا وہ ناوابستہ کانفرنس اور دولت مشترکہ کے ممالک کے سربراہوں کی کانفرنس غیر ممالک میں منعقدہ میلوں اور عالمی کرکٹ سیریز میں بہت کام آیا۔

دور درشن کے بھاری ساز و سامان کے شعبہ میں زبردست پیش رفت اور اس کے ہلکے ساز و سامان کی صلاحیتوں کو بڑھا لینے کے بعد بھارت نے صحیح معنوں میں نشریات کے اثرات محسوس کیئے۔ صبح اور سہ پہر میں بھی دور درشن پر پروگرام شروع ہوئے۔ دور درشن نے خود اپنے پروگرام یعنی دستاویزی فلمیں ٹیلی فلمیں، سیریل اور فیچر فلمیں تیار کرنی شروع کر دیں۔

دیگر شعبوں میں استعمال

مصنوعی سیاروں کی ٹکنالوجی میں جدید ترین ترقیاں دیگر شعبوں میں بھی کارآمد ثابت ہوئی ہیں موسمیات کے محکمہ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر پی سرکار کا کہنا ہے کہ نومبر ۱۹۷۷ء میں اڑیسہ کے طوفان میں ۱۰ ہزار افراد ہلاک ہو گئے تھے جبکہ ۱۹۸۴ء میں اسی طرح کے طوفان میں ۵۰۰ افراد کی موت ہوئی تھی کیونکہ مصنوعی سیارے نے وقت پر خبردار کر دیا تھا یعنی

معنوعی سیارے کی مدد سے طوفان کی اطلاع بر وقت مل گئی تھی۔ حادثہ کے بارے میں یہ وارننگ انیسٹ I معنوعی سیاروں کا مخصوص کام ہے ایک اور معنوعی سیارہ آئی آر ایس اے جو بیکانور کاسموڈروم سے داغا گیا تھا اس نے بھارت کو اس معاملے میں یورپ اور امریکہ کا ہم پلہ بنا دیا ہے اس معنوعی سیارے کو بہت سی کامیابیاں میسر آئیں۔ اس نے برہمپترا اور حالیہ سیلاب کی نگرانی کی ہے اس سیارے سے ملک کی زرعی و جغرافیائی آب و ہوا کی بنیاد پر علاقوں کی تقسیم اور زراعت و کاشتکاری کی منصوبہ بندی، جنگلات اور بنجر زمینوں کے نقشے بنانے، زمین کے نیچے پانی کی نشاندہی، ارضیاتی نقشہ سازی اور خشک سالی کی صورت میں مربوط انتظام میں مدد ملی ہے۔

معنوعی سیاروں کی ٹکنالوجی نے درحقیقت دور واقع مقامات کے درمیان مواصلات میں انقلابی تبدیلیاں پیدا کی ہیں۔ اس نے دنیا کے شہروں کو آپس میں ملا کر پوری دنیا کو ایک کر دیا ہے بھارت میں تقریباً ۶۵ فیصد دور مواصلات کا کام انیسٹ کے ذریعہ ہوتا ہے شری راؤ کا کہنا ہے کہ اس معنوعی سیارے پر ۱ کروڑ ۵۰ لاکھ روپے کی لاگت آئی ہے اس کی خدمات کو لیز پر دینے سے تین سال ہی میں اس کی لاگت وصول ہو گئی ہے حقیقت یہ ہے کہ ان معنوعی سیاروں کی خدمات کے باعث بھارت کو عوام تک پہنچنے میں بڑی مدد ملی ہے۔

ان کامیابیوں سے قطع نظر بلاشبہ ہمارے سائنسدانوں نے بہت سی ناکامیوں کا بھی سامنا کیا ہے۔ انیسٹ کا تجربہ منصوبے کے مطابق کام نہیں کر رہا۔ انیسٹ I سی کامیابی کے ساتھ داغا گیا لیکن اس میں ۱۲۰۰ واٹ بجلی کا خرچ غیر متوقع تھا۔ انیسٹ I ڈی نے اپنے مدار پر پہنچنے سے پہلے ہی مجروح ہو کر کام کرنا بند کر دیا اس کے اینٹینا پر کرین گر پڑی اور یہ راستے میں ہی رک گیا۔ اس نقصان کو دور کیا جا رہا ہے اس کے ساتھ ہی بھارتی ملائی تحقیق تنظیم نے لمبا سفر طے کر لیا ہے اس نے اس دہائی میں دوسری مرتبہ معنوعی سیارے لیز پر دیئے ہیں اور اپنے وعدوں کو پورا کیا ہے نئی دہائی میں اس سے بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔ عالمی تجربہ گاہوں میں نیا ساز و سامان تیار ہو رہا ہے اور مستقبل یقینی طور پر تابناک ہے۔

پروفیسر کامتا پرساد

پنچایتی راج

پنچایتی راج ہمارے ملک میں تین دہائیوں سے موجود ہے ۔ بلونت رائے مہتا مطالعاتی ٹیم کی سفارشات پر راجستھان اور آندھرا پردیش میں ۱۹۵۹ء میں پہلی مرتبہ ان کو قائم کیا گیا ۔ ۱۹۶۲ء میں مہاراشٹرا نے یہ نظام قائم کیا تقریباً اس زمانہ میں زیادہ تر ریاستوں نے بھی ایسا ہی کیا ۔ ان میں زیادہ تر نے تین سطحی نظام اختیار کیا ہے ۔

اگرچہ یہ ادارے بڑی شد و مد کے ساتھ قائم کئے گئے تھے لیکن ان کی افادیت اور موثر ہونے کے بارے میں اختلاف رہا ہے ۔ خاص طور پر افسر شاہی نے جس کی جڑیں گہری ہیں اور پڑھے لکھے طبقے نے ان کو شک کی نگاہ سے دیکھا جبکہ سیاسی قیادت نے انہیں اپنا سیاسی حریف سمجھا ۔

اس کے نتیجے میں زیادہ تر ریاستوں میں پنچایتی راج اداروں کو نہ ضروری اختیارات اور وسائل دیئے گئے اور نہ ہی انہیں مناسب طور پر کام کرنے دیا گیا یہاں تک کہ ان اداروں کے انتخابات بھی پابندی سے نہیں کرائے گئے ۔ اکثر یہ ادارے طویل عرصے تک معطل رہے ہیں ۔ بھارت کے آئین میں ایسا کوئی انتظام نہیں ہے جس کے تحت ریاستی سرکاروں کو ایسا کرنے سے روکا جا سکے کیونکہ آئین میں پنچایتوں کا جو ذکر ہے وہ ملک کی پالیسی کے رہنما اصولوں کے تحت آتا ہے جن کی عملی حیثیت محدود ہے ۔ لہٰذا اگر پنچایتوں کی کارکردگی اچھی نہیں ہے جیسا کہ اکثر کہا جاتا ہے تو اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ انہیں اچھی کارکردگی پیش کرنے کا موقع ہی نہیں دیا گیا ۔ پھر بھی ان کی کارکردگی نچلی سطح پر افسران کی کارگذاری سے کم نہیں ہے جن کے پاس تمام اختیارات اور وسائل ہوتے ہیں در حقیقت جی وی کے راؤ کمیشن نے اپنی رپورٹ میں کہا تھا کہ جہاں جہاں بھی پنچایتی راج ادارے ترقیاتی کاموں میں سرگرمی سے شریک رہے وہاں وہاں ترقیاتی پروگرام کا عمل درآمد یقینی طور پر بہتر رہا ہے اور فائدہ حاصل کرنے والے افراد کا انتخاب اور اسکیموں کے مرتب کرنے کا کام زیادہ اطمینان بخش رہا ہے ۔ مہاراشٹرا اور گجرات کی ریاستوں میں پنچایتوں کی کارکردگی خاص

اچھی رہی ہے۔ حالیہ برسوں میں مغربی بنگال میں جب سے ریاستی سرکار نے منصوبہ بندی اور عمل درآمد کے فیصلہ کن اختیارات پنچایتوں کو دیئے ہیں ان کی کارکردگی بہتر ہوئی ہے۔ ایک اور ریاست کرناٹک ہے۔ جہاں پنچایتی راج ادارے اہم رول ادا کر رہے ہیں۔

سماجی تبدیلی کے ایک آلہ کار کے طور پر پنچایتوں کا موثر ہونا اس بات پر منحصر ہوگا کہ انہیں مقامی ترقیاتی پروگراموں میں کس حد تک شریک کیا جاتا ہے۔ غیر مرکوز منصوبہ بندی کی کوئی اسکیم پنچایتوں کو شریک کئے بغیر بامعنی نہیں ہو سکتی اس میں شک نہیں کہ پنچایتی راج اداروں کے قانون میں منصوبہ بندی میں انکی شرکت بہت کم ہے۔ دیہی ترقی کے مربوط پروگرام اور دیہی روزگار کے قومی پروگرام میں پنچایتوں کو حال ہی میں شریک کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں ایک اہم قدم جواہر روزگار یوجنا شروع کر کے اٹھایا گیا ہے جسے پنچایتوں کے ذریعہ عملی جامہ پہنایا جائے گا۔

پنچایتوں کو زیادہ اختیارات دینے سے گریز کے لئے عدم مساوات اور خراب کارکردگی کا جواز پیش کیا جاتا ہے حالانکہ یہ بنیادی طور پر اختیارات کو غیر مرکوز نہ کرنے اور انتظامیہ کے پرانے مرکزی نظام سے علاحدہ نہ ہونے کی بدقسمتی کے باعث ہے۔ پہلے معاملے میں یہ کہا جاتا ہے کہ پنچایتوں پر دیہات کے اونچے طبقے کا غلبہ ہے جو بڑے زمینداروں پر مشتمل ہے اس لئے غریب اکثریت کا مستقبل ' ان کے ہاتھ میں محفوظ نہیں ہے۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ پنچایتوں کا فیصلہ لینے کا عمل زیادہ کارگر نہیں ہے۔ ماضی کے تجربات سے پتہ چلتا ہے کہ پنچایت کے منتخب کارکن عوامی خدمت ' کارکردگی اور ایمانداری کی بنیاد پر نہیں بلکہ ذات پات ' طبقے ' مذہب ' نسل ' خاندانی حیثیت ' دولت اور جسمانی قوت کی بنا پر منتخب ہوتے ہیں

ان دونوں دلائل میں سچائی ہو سکتی ہے لیکن نچلی سطح پر افسران میں بھی یہ خامیاں پائی جا سکتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ ان مسائل پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ ان کو کم تو یقیناً کیا جا سکتا ہے۔ عدم مساوات کے مسئلے کا حل کمزور طبقات کیلئے مناسب تعداد میں نشستیں محفوظ کر کے اور انہیں اپنے حق کے استعمال کی تربیت دیکر کیا جا سکتا ہے۔ مجوزہ آئینی ترمیم کے ذریعہ اس مسئلے کو حل کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ دیہی برادری یا گرام سبھا کا جلسہ پابندی سے منعقد کر کے لوگوں کو اس میں شریک کیا جا سکتا ہے۔ جس سے ان میں اپنے حقوق اور ذمہ داریوں کے تئیں بیداری پیدا ہوگی۔ غریب افراد جو اکثریت میں ہیں زیادہ سرگرم ہونگے۔

ایک نیا دور: جہاں تک بہتر کارکردگی کا تعلق ہے پنچایت کے کارکنوں کو ترقیاتی پروگراموں کی مناسب منصوبہ بندی اور عمل درآمد کی تربیت دیکر پنچایتوں کو بہتر بنایا جاسکتا ہے۔
اگر مقامی سطح پر پانچ سالہ منصوبہ بندی کا کام شروع ہوجائے تو اس سے ہر سال مساوی رقومات کی تقسیم کا دباؤ کم ہوجائے گا جو وسائل کے غلط استعمال کی ایک وجہ بتائی گئی ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ پنچایتوں کو منصوبہ بندی سے متعلق ماہر لوگوں کی ٹیموں مقامی معاملات کے ماہرین اور رضاکار ایجنسیوں کی مدد فراہم کی جائے تاکہ وہ اپنی کارکردگی کو بہتر بنا سکیں۔
پنچایتوں کے انتخابات باقاعدگی سے کرانے، کمیٹی کی تشکیل نو، رقومات اور اختیارات کی فراہمی و تفویض، پنچایتوں کے ارکان و کارکنان کی تربیت سے موجودہ صورت حال میں بنیادی تبدیلی پیدا ہوگی اس سے پنچایتیں زیادہ سے زیادہ گرم اور موثر بنیں گی۔ اور اس کے نتیجے میں دیہی ترقی کی رفتار تیز ہوگی اور عوام کی فلاح و بہبود میں اضافہ ہوگا۔ اس طرح دیکھا جائے تو مجوزہ آئینی تبدیلی پنچایتی راج اداروں کو مستحکم کرنے میں بہت مددگار ثابت ہوگی اور اس سے دیہی خوشحالی کے نئے دور کا آغاز ہوگا۔

بقیہ تبصرہ صفحہ ۷۸ سے آگے

فوائد سے واقف یا عامی کے لئے تحریر مشکل ہے۔ تحریریں تڑپ ہے۔ جذبہ کا غلبہ ہے اللہ کا کرم و فضل ہے کہ توشہ آخرت تیار کرلیا گیا ہے۔ مولاو آقا مالک کائنات حسن قلم سے چلے ہے کام لیتے ہیں بخشش کا سامان تیار کیا گیا ہے۔ محترمہ ڈاکٹر رخسانہ نکہت اس لحاظ سے قابل مبارکباد ہیں کہ دینی نشرواشاعت کی گرانبار ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوئی ہیں۔ کتاب کے مطالعے سے اسلام و صورت عصر حاضر سے کا حقہ معلومات بہم پہنچتی ہیں۔ کتابت بہترین ہے، عبدالباقی، امام الدین، ظفر صادق اس کے ذمہ دار ہیں۔ ناشر دین و دانش پبلیکیشنز عظیم آباد کالونی پٹنہ ۸۰۰۰۰۶ ہیں۔ مولفہ ڈاکٹر رخسانہ نکہت لاری اُم بانی مقبول لاری منزل نزد سٹی اسٹیشن لکھنو۔ ۱۸ ہیں۔ قیمت کتاب ۲۵ روپیہ گراں ہے، اگر قیمت ارزاں ہوتی تو عام قاری بھی راغب ہوتا۔ مذہبی جذبہ کا تقاضہ یہ تھا کہ قیمت کم رکھی جاتی۔ اختتامی منازل میں احقر یہ سمجھتا ہے کہ مصنفہ نے الہٰی حیات جاودانی اور حیات فانی و ناپائیدار میں رحمت و بخشش و مغفرت کا سامان اکٹھا کرلیا ہے۔

آر سی - راجیہ منی

بین الاقوامی محنت تنظیم کے ستر سال اور بھارت

بین الاقوامی محنت تنظیم کو قائم ہوئے ستر سال ہوگئے ہیں۔ یہ تنظیم اقوام متحدہ کی سب سے پرانی تنظیم ہے۔

اس تنظیم کا قیام پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ کے بعد پیرس امن کانفرنس کے ایک فیصلہ کے مطابق عمل میں آیا تھا۔ اس کا اہم مقصد روزگار کی صورت حال کے بارے میں معلومات کرنا اور ان بین الاقوامی ذرائع پر غور کرنا ہے جو روزگار کی صورت حال پر اثرانداز ہونے والے امور کے سلسلے میں مشترکہ قدم اٹھانے کے لئے ضروری ہیں۔ دوسرے الفاظ میں، اس تنظیم کا اہم کام پوری دنیا میں کارکنان کے زندگی بسر کرنے اور کام کرنے کے حالات کو بہتر بنانا ہے۔ "سماجی انصاف" یہ دو الفاظ بین الاقوامی محنت تنظیم کے اصل مقصد کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس تنظیم کو ۱۹۶۹ء میں جو اس کے قیام کا پچاسواں سال ہے، بجا طور پر نوبل امن انعام سے نوازا گیا تھا۔

بین الاقوامی محنت تنظیم نے محض ۰۰-2500 پونڈ کے بہت ہی معمولی سے بجٹ سے اپنا کام شروع کیا تھا۔ ۱۹۸۸ء میں اس کا بجٹ 1620 لاکھ امریکی ڈالر تھا جس میں اس کے تکنیکی تعاون کے پروگراموں کیلئے مزید ۱۰۰۰ لاکھ ڈالر کا اہتمام بھی کیا گیا تھا۔ اس وقت 150 ممالک اس تنظیم کے اراکین ہیں جن میں ایشیا اور بحرالکاہل کے 34 ممالک شامل ہیں۔ اپنے ڈھانچے کے لحاظ سے، یہ تنظیم دیگر بین الاقوامی تنظیموں سے مختلف ہے۔ اس کے تین اہم حصے ہیں۔ یعنی بین الاقوامی محنت کانفرنس، گورننگ باڈی اور بین الاقوامی محنت دفتر۔ اس تنظیم میں ہر ایک سطح پر حکومتیں اپنے اپنے سماجی ساتھیوں یعنی کارکنان اور آجرین کے ساتھ وابستہ ہیں۔ تنظیم کے تقریباً سبھی اہم حصوں میں ان تینوں گروپوں کی نمائندگی ہوتی ہے اور وہ اس کا کام کاج چلانے میں برابر کے

ذمہ دار ہیں۔

بین الاقوامی محنت کانفرنس کی میٹنگ ہر سال جینوا میں منعقد ہوتی ہے۔ اس کے اہم فرائض میں محنت کے بین الاقوامی معیارات اپنانا، بین الاقوامی محنت تنظیم کے بجٹ کی قطعی منظوری اور ہر تیسرے سال گورننگ باڈی کے انتخابات شامل ہیں۔ بین الاقوامی محنت دفتر اس تنظیم کا سکریٹریٹ ہے کام کاج کا صدر دفتر ہے نیز تحقیق اور اشاعت کا مرکز ہے۔ اس دفتر کی گورننگ باڈی اس تنظیم کے ایگزیکیٹیو بورڈ کی حیثیت سے کام کرتی ہے۔

بین الاقوامی محنت تنظیم (ILO) کا اہم کام پیشہ وارانہ تربیت، انتظامیہ کو بہتر بنانے اور افرادی قوت کی منصوبہ بندی کے شعبوں میں انفرادی طور پر ملکوں کو ماہرانہ صلاح مشورہ اور تکنیکی امداد فراہم کرنا ہے۔ اسکے علاوہ یہ تنظیم امداد باہمی انجمنوں اور چھوٹے پیمانہ کی صنعتوں کی ترقی و فروغ کا کام کرتی ہے نیز آجرین کی تنظیموں اور کارکنان کی تعلیم کے لئے مالی امداد بھی فراہم کرتی ہے۔

بھارت اس بین الاقوامی تنظیم کے ان ۴۲ ابتدائی اراکین میں سے ایک رکن ہے جن میں ایشیا سے ایران، جاپان، چین اور تھائی لینڈ بھی شامل ہیں۔ ۱۹۲۲ء سے بھارت اس تنظیم کی گورننگ باڈی کا ایک مستقل رکن ہے اور تنظیم نے اب تک جو صنعتی اور علاقائی کمیٹیاں قائم کی ہیں ان سب میں بھارت کی نمائندگی ہے۔ دیہی ترقیات کے بارے میں قائم کی گئی مشاورتی کمیٹی میں بھی بھارت کو نمائندگی حاصل ہے۔

بھارت اور بین الاقوامی محنت تنظیم بنی نوع انسان کے بنیادی مسائل عالمی امن اور سماجی انصاف کے بارے میں یکساں نظریہ کے حامل ہیں۔ بھارت اور اس تنظیم کے آئین کی تمہیدوں میں سماجی انصاف پر زور دیا گیا ہے۔ بھارت نے ایسی 18 اہم روایتوں کی توثیق کی ہے جن میں کام کرنے کے حالات کے مختلف پہلوؤں، خاص طور پر انسانوں کے چند بنیادی حقوق سے متعلق مختلف پہلوؤں پر زور دیا گیا ہے۔

بھارت اور بین الاقوامی محنت تنظیم بہت سے وسیع شعبوں میں خصوصاً افرادی قوت اور سماج کی ترقی و فروغ کے شعبوں میں تعاون کیا ہے۔ تنظیم کے علاقائی پراجکٹوں مثلاً روزگار کی ترقی اور فروغ کے لئے ایشیائی علاقائی ٹیم، ایشیاء اور بحرالکاہل میں ہنر کی ترقی و فروغ کا پراجکٹ، مزدوروں

سے متعلق انتظامیہ کے لئے ایشیاء اور بحرالکاہل کا پراجکٹ، ایشیاء اور بحرالکاہل کے لئے فرزدروں اور آبادی سے متعلق ٹیم جیسے پراجکٹوں میں بھارت کا تعاون بڑھتا جارہا ہے۔ تنظیم کے ان علاقائی پراجکٹوں میں بہت سے اہم اداروں کی نشاندہی بھارت میں کی گئی ہے۔

بین الاقوامی محنت تنظیم نے بھارت میں ۲۶ پروجکٹ شروع کئے ہیں جن کے لئے مجموعی طور سے ۴۳ لاکھ امریکی ڈالر مختص کئے گئے ہیں۔ ان پروجکٹوں سے سیاحت، کانوں وغیرہ جیسے گوناگوں شعبوں میں ملازم کارکنان کے حالات کو بہتر بنایا جائے گا۔ اس ٹھوس تحقیقی بنیاد پر بہت سے پروجکٹ تجویز کئے گئے جنہیں تنظیم کے متعدد مشنوں نے حکومت اور دیگر قومی مشاورتی اداروں کے اشتراک عمل سے انجام دیا ہے۔ یہ تحقیقی کام اور بین شعبہ جاتی مسائل نیز ملک کی ضروریات کے مکمل مطالعہ پر مبنی ہیں اور ملک میں سماجی اور اقتصادی ترقی و فروغ کے لئے ساتویں اور دیگر تناظری منصوبوں میں مقرر کی گئی ترجیحات کو مدنظر رکھ کر کئے گئے ہیں۔

ہوٹل کیٹرنگ اور سیاحت کے پیشوں کے تربیتی پروگرام کی جدید کاری کے بارے میں پروجکٹ کا پہلا مرحلہ دسمبر ۱۹۸۸ء میں ختم ہوا ہے۔ نیز وزارت سیاحت اور اقوام متحدہ کے ترقیاتی پروگرام کے تعاون سے دوسرا مرحلہ عملدرآمد کے مختلف مراحل میں ہے۔ بین الاقوامی محنت تنظیم اور اقوام متحدہ کے ترقیاتی پروگرام کا پراجکٹ " کانوں میں کام کرنے کے حالات کی بہتری " ۱۹۸۸ء میں شروع ہوگیا تھا اور اس پر عملدرآمد کی پیش رفت اچھی ہے۔ ایک دوسرا پراجکٹ ہے۔ خواتین کے لئے آمدنی کے مواقع پیدا کرنے کے پروگرام کی انتظامی صلاحیت کو مستحکم بنانا" اس پراجکٹ کیلئے وفاقی جمہوریہ جرمنی رقم فراہم کررہا ہے اور ایک غیر سرکاری تنظیم اس پروجکٹ پر عملدرآمد کررہی ہے۔ دیہی خواتین کے بارے میں اس تنظیم کے چار پراجکٹوں پر بھارت میں عملدرآمد کیا جارہا ہے۔ بھارت میں اور دیگر ایشیائی ممالک میں یہ سرگرمی انجام دینے کے لئے نئی دہلی میں واقع اس تنظیم کے دفتر میں خواتین کا ایک گروپ بنایا گیا ہے۔ جس میں بین الاقوامی اور بھارتی ماہرین شامل ہیں۔

بھارت دیگر ترقی پذیر ممالک میں اس تنظیم کے تکنیکی تعاون کے پروگراموں میں سرگرمی سے شرکت کرتا ہے۔ ۱۹۸۸ء میں ان پراجکٹوں میں ۳۰ سے زیادہ بھارتی ماہرین نے کام کیا ہے

بھارت کے متعدد تعلیمی اور تحقیقی ادارے اس تنظیم اور ایشیائی علاقائی تنظیموں کے مختلف پروگراموں میں حصہ لیتے ہیں جن میں سے بمبئی میں واقع محنت کا مرکزی ادارہ، دھلی میں واقع اقتصادی ترقی و ادارہ، نئی دہلی میں واقع اطلاقی افرادی قوت کے بارے میں تحقیقی ادارہ، مدراس میں واقع جدید ادارہ اور احمد آباد میں واقع گاندھی لیبر انسٹی ٹیوٹ قابل ذکر ہیں۔

بھارت اور بین الاقوامی محنت تنظیم بہت سے بین الاقوامی امور کے بارے میں یکساں رکھتے ہیں۔ دونوں ہی نسلی امتیاز کے مسئلہ کے بارے میں یکساں نظریہ کے حامل ہیں۔ جنو میں سفید فام اقلیتی حکومت تباہ کن نسلی پالیسی پر عمل کر رہی ہے۔ بھارت نے اس مسئ تنظیم کے تمام اقدامات کی حمایت کی ہے۔ بھارت نے مئی ۱۹۸۸ء میں ہرارے، زمبابوے میں منا نسلی امتیاز کے بارے میں خصوصی سہ فریقی کانفرنس کے اخراجات کے سلسلے میں کافی رقم دی ہے۔

بین الاقوامی محنت تنظیم کے ساتھ سرگرمی سے تعاون کرنے کے علاوہ، بھارت تنظیم پر اس با کے لئے بھی بہت زیادہ زور دیتا رہا ہے کہ وہ اپنی سرگرمیوں کو ان شعبوں میں بھی انجام دے جن اب تک اس نے اپنی سرگرمیاں شروع نہیں کی ہیں اور جو سماجی اعتبار سے اہمیت کے حامل ہیں ان شعبوں میں سے ایک شعبہ بہت سے ترقی پذیر اور کم ترقی یافتہ ممالک میں غیر منظم شعبے میں کام کرنے والے افراد کی ایک بڑی تعداد ہے۔ وزیر اعظم شری راجیو گاندھی نے ۱۹۸۵ء میں جینوا میں بین الاقوامی محنت کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے بین الاقوامی محنت تنظیم کی اولین توجہ دنیا کے اس شعبے پر مرکوز کرانے پر زور دیا۔ انہوں نے کہا کہ "محنت کے بارے میں قانون سازی کے شعبے میں بین الاقوامی محنت تنظیم کے رہنمایانہ کام سے یقیناً موثر نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ مزدوروں کے رہن سہن اور کام کرنے کے حالات میں نمایاں طور پر بہتری ہوئی ہے۔ مگر ہم ابھی تک صرف ان مزدوروں کے بارے میں بات چیت کر رہے ہیں جو منظم ہیں۔ جو مزدور غیر منظم ہیں ان کے بارے میں کیا کرنا ہے؟ کیونکہ ترقی پذیر ممالک میں غیر منظم کارکنان کی اکثریت ہے۔ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ترقی پذیر ممالک میں منظم مزدور کل مزدوروں کا ایک چھوٹا سا حصہ ہیں۔"

بھارت نے جو بین الاقوامی محنت تنظیم کا ایک بانی رکن ہے، مفید تعاون میں سرگرمی سے حصہ لیا ہے اس تعاون کی مدت سات دہائیوں پر محیط ہے۔ بین الاقوامی محنت تنظیم اور بھارت کو مساوی طور پر یکساں فائدہ پہنچا ہے۔

فصلوں کی بیماریاں اور اُن کے مضر اثرات

پودے انسانوں کی طرح جاندار ہیں اور وہ تمام عمل کرتے ہیں جو جانداروں کے لئے ضروری ہوتے ہیں مثلاً سانس لینا اور اپنی خوراک تیار کرنا، موسموں کی تبدیلی کا احساس ہونا، آب و ہوا کی خصوصیات کے مطابق اپنی فطرت کو تبدیل کر دینا وغیرہ ایسے بہت سے قدرتی عمل ہیں جن کی بنیاد پہ پودوں کو جاندار تسلیم کیا جا سکتا ہے جس طرح انسان اچھی غذا اور بہتر موسم میں تندرست اور صحت مند رہتا ہے ٹھیک اسی طرح پودے بھی اچھی آب و ہوا اور زرخیز زمین میں تندرست و توانا نظر آتے ہیں خوشگوار موسم میں پودے کی نشو و نما ٹھیک رہتی ہے مگر موسم کی تھوڑی سی تبدیلی پودے کی شادابی اور سرسبزی کو ختم کر دیتی ہے تیز دھوپ، بارش اور سردی سے پودے متاثر ہوتے ہیں ناموافق آب و ہوا میں ان میں سے کمی اور بے رونقی کے آثار نمایاں ہونے لگتے ہیں پودوں کے اعضا اور کمزور ہونے کی صورت میں مختلف قسم کی بیماریاں حملہ آور ہو جاتی ہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ جب فضا نمی آلود ہو اور کئی دنوں تک سورج کی روشنی پودوں کو نہ ملے اور زمین اور ہوا نم ہو تو ایسے میں فصلوں پر بیماریوں کے بڑھنے کا خدشہ رہتا ہے۔

فصلوں پر عام طور پر بیماریاں، پھپھوند، بیکٹیریا اور وائرس کی وجہ سے پھیلتی ہیں۔ مختلف بیماریوں کے جراثیم بیج کے اندر زمین اور کھیت کے نزدیک جھاڑیوں میں چھپے رہتے ہیں خراب موسم کی صورت میں یہ حملہ آور [illegible] بیکٹیریل Bacterial اور وائرل Viral بیماریاں

عموماً سبزیوں کی فصل، ٹماٹر، کدو، کھیرا، ککڑی، بیگن وغیرہ میں زیادہ لگتی ہے جب کہ دانہ والی فصلوں پر وائرس کی بیماریاں، پودے کے مختلف حصوں جیسے جڑ، تنا، پتے، پھول اور وغیرہ پر کہیں بھی لگ سکتی ہیں۔ بارش کا موسم بیماریوں کے پھیلنے کے لئے سازگار رہتا ہے یہی وجہ ہے کہ خریف کی فصلیں بیماری سے زیادہ متاثر ہوتی ہیں چنانچہ اچھی فصل اور زیادہ پیداوار اسی وقت ہے جب فصلوں کو بیماریوں سے محفوظ رکھا جائے۔ اگرچہ آج کل ایسے جدید اور ترقی یافتہ قسم کے بیج تیار کر لئے گئے ہیں جن پر بیماریوں کے اثرات کم ہوتے ہیں ساتھ ہی مختلف قسم کے جراثیم کش دواؤں کے استعمال سے بھی بیماریوں کو پھیلنے سے روکا جا سکتا ہے لیکن اس کے باوجود فصلوں پر بیماریاں ہوتی ہیں۔ بیماریوں سے فصل کی تباہی و بربادی محض کسانوں کا ہی ذاتی نقصان نہیں ہے بلکہ پیداوار قومی نشانہ بھی متاثر ہوتا ہے۔

یہاں فصلوں پر لگنے والی چند بیماریوں کا ذکر کیا گیا ہے جو حسب ذیل ہیں

جڑ سڑن :۔ اس میں پودوں کی جڑیں سڑنا اور گلنا شروع ہو جاتی ہیں یہ ایک پھپھوند والی بیماری ہے اس کے جراثیم زمین میں ایک کھیت کے آس پاس کی جھاڑیوں میں چھپے رہتے ہیں چنانچہ جب تخم ریزی کی جاتی ہے اور پودے اُگنے لگتے ہیں تو یہ جراثیم حملہ آور ہو جاتے ہیں۔ اس بیماری کے شکار پودے اچانک مرجھانے لگتے ہیں۔

ابتدائی پتیاں لال اور بھورے رنگ کی ہو کر مڑ جاتی ہیں آہستہ آہستہ ان پتیوں کا رنگ گہرا بھورا ہو جاتا ہے پتوں کا ہرا پن ختم ہو جاتا ہے اس کے علاوہ پودے کی موسلا جڑ چھوڑ کر باقی تمام جڑیں سڑ جاتی ہیں۔ اکثر یہ بیماری کم زرخیز زمین میں ہوتی ہے اس بیماری کے اثرات جوار، باجرا، مکا کپاس اور ارہر پر زیادہ ہوتے ہیں۔

علاج :۔ اس بیماری کو دور کرنے کے لئے براسیکال نام کی دوا کا ۲۰ فیصدی گھول ۲۵ لیٹر فی ہیکٹر یا ۔اگرام بیوکسٹن نام کی دوا کو ۔۔ لیٹر پانی میں گھول کر پودے کے آس پاس کی زمین پر چھڑک دینا چاہئیے۔ اگر موسم خشک ہے تو ۲۰ سے ۳۰ کلو یوریا کھاد فی ہیکٹر کی در سے ڈال کر پھر سینچائی کر دینا چاہئیے۔

ان کے علاوہ فصل کو بدل کر resistant varieties بو ہنے پر بیماری سے چھٹکارا پایا جا سکتا ہے

پتی کی چتی دار (Leaf Spot) بیماری :۔ اس بیماری کے لئے پھپھوند ذمہ دار ہے یہ بیماری کپاس، مکا، جوار، ارہر اور باجرہ کی فصل پر لگتی ہے۔ اس بیماری سے متاثرہ پودوں کی پتیوں پر چھوٹے اور گول دھبے آجاتے ہیں اور کچھ دنوں بعد یہ دھبے بڑے ہو جاتے ہیں۔ آخر میں پتیاں سوکھ کر گر جاتی ہیں۔ عام طور سے پرانی پتیوں کے نیچے پہلے دھبّے پڑ جاتے ہیں اور جب بیماری کا حملہ تیز ہو جاتا ہے تو دھبے بھورے رنگ کے ہو جاتے ہیں پھر پتیاں جھڑ جاتی ہیں۔

پھپھوند :۔ اس کی تقریباً ستائیس قسمیں ہوتی ہیں یہ گوبھی اور کپاس کی فصل پر حملہ آور ہوتی ہے اس بیماری کا اثر اس وقت زیادہ ہوتا ہے جب ان (بونڈی) پہلے سے پتی کو کاٹ کر زخمی کر چکی ہوتی ہے۔

بلیک آرم (Black Arm) اس بیماری کا حملہ کپاس کے پودے پر زیادہ ہوتا ہے یہ اپنا اثر پودے کی ابتدائی زمانے سے دکھانے لگتی ہے بلیک آرم سب سے پہلے پودوں کی ابتدائی پتیوں کو اپنا نشانہ بناتے ہیں جس پتی پر اس کا اثر ہوتا ہے اس کی نچلی سطح نم آلود ہو جاتی ہے پھر دھبے آہستہ آہستہ بڑھ کر پوری پتی پر چھا جاتے ہیں اور اس کے بعد پودے سوکھنے لگتے ہیں پتی کی نسیں بھی کالی پڑ جاتی ہیں۔ اس کا اثر صرف پتیوں پر ہی نہیں ہوتا ہے بلکہ شاخیں اور تنے پر بھی ہوتا ہے بیمار تنوں پر دراڑ پڑ جاتی ہے اور اس جگہ سے گوند نما رس نکلنے لگتا ہے۔

علاج :۔ اس بیماری سے بچنے کے لئے اسٹریپٹوسائیکلین کے ۱۔ فیصد کا گھول ایک لیٹر پانی میں ڈال کر بیج کو بونے سے دو گھنٹے تک ڈبو دیا جاتا ہے اس کے علاوہ بیلائٹاکس ۵۰ کلو یا بیو فان این ۲ سے ۳ لیٹر فی ہیکٹر کی مدد سے استعمال کرنا مفید ہوتا ہے اگر یہ ممکن نہ ہو تو ۱۵۰ لیٹر اسی کا تیل ۱۰۰ لیٹر پانی میں ملا کر چھڑکنا چاہیئے۔

لال سڑن :۔ یہ بیماری گنے کی فصل کو بہت نقصان پہنچاتی ہے اس بیماری سے گنے کی پتیاں اور تنے متاثر ہوتے ہیں بعد سے سوکھ کر پیلے ہو جاتے ہیں گنے کا اندر والا حصہ کھتی رنگ کا

ہو جاتا ہے۔ چھوٹی گٹھلی اندر پر سفید چھتے دکھائی دیتے ہیں سونگھنے پر شراب جیسی بو آتی ہے۔
تنے کی کھال سڑ جاتی ہے۔ یہ بیماری گنے کے علاوہ جوار، باجرہ اور ارہر کو بھی نقصان پہنچاتی ہے۔

علاج :- اس بیماری سے بچنے کے لئے گنے کے سیٹ (ٹکڑے) کو الکوحل اور ایریٹان کے محلول میں ۵ منٹ تک ڈبو دینا چاہئیے ۔

کنڈوا بیماری :- اس بیماری سے پودے کا رنگ کالا ہو جاتا ہے اور چاروں طرف سفید جھلی چڑھی رہتی ہے جب یہ جھلی پھٹ جاتی ہے اس کا کالا پاؤڈر چاروں طرف ادھر ادھر پھیل جاتا ہے۔
اس بیماری کے اثرات بیج میں موجود ہوتے ہیں اور گنے کی پیڑی فصل میں زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں سورج مکھی، السی اور ارہر کی فصلوں پر بھی اپنا حملہ کرتی ہے

علاج :- اس بیماری کے لئے الکوحل اور ایریٹان کا استعمال کیا جاتا ہے ۔

اُکٹھا :- جس پودے پر اُکٹھا بیماری ہوتی ہے تو اس کے اندر گٹھانوں کے پاس کا حصہ اینٹ کے رنگ کا ہو جاتا ہے۔ تنے کے چھلکے پر بھورے رنگ کے دھبے دکھائی دیتے ہیں تنا کھوکھلا ہو جاتا ہے
اُکٹھا بیماری گنا، ارہر، جوار، چنا وغیرہ میں ہوتی ہے

ارلی بلائیٹ :- اس بیماری سے آلو کی پتیوں پر گہرے بھورے اور کالے رنگ کے دھبے دکھائی دیتے ہیں
علاج :- اس بیماری کو استعمال ۸ ، کی . ۲ کلو گرام مقدار کو کسی تانبے کے مرکب والی دوا کے ساتھ ملا کر استعمال کرنے دور کیا جا سکتا ہے۔

ویلٹ :- اس بیماری سے آلو کا پودا سوکھ جاتا ہے

وائرل بیماری :- اس بیماری سے پتیاں مڑ جاتی ہیں اس بیماری کا اثر آلو، ٹماٹر پر زیادہ ہوتا ہے ان کے علاوہ الٹی نیریا بلائیٹ سفید گردار (وہائیٹ رسٹ) آ گیا (پاؤڈری ملڈیو) وغیرہ بیماری بھی لگتی ہیں ۔ ان سے پتیاں اور تنے پر سفید پاؤڈر جمع ہو جاتے ہیں۔ ان سے بچنے کے لئے کیراسان چھڑکاؤ کا استعمال کیا جاتا ہے۔ یا پھر ۲ سے ۳ کیلو کلو ڈائتھین زیڈ ۷۸ کو ۱۰۰۰ سے ۱۵۰۰ لیٹر پانی میں گھول کر فی ہیکٹر استعمال کرنا چاہئیے ۔

دھان پر بھورا دھبہ BROWN SPOT دھڑ سڑن STEM ROT

ما) BACTRIAL BLITZ بیماریاں نقصان پہونچاتی ہیں۔

علاج ان بیماریوں سے بچنے کے لئے ڈائتھان ایم ۔ ۴۵ ڈائتھان زیڈ ۷۸ بھی مفید ہوتے ہیں
ں پر کنڈوا یا گیرگی بیماری سردیوں میں جب بارش ہو جاتی ہے یا موسم ابر آلود ہوتا ہے تو اثر انداز
جاتی ہیں ایسے موسم میں گیہوں کی پتیوں پر لال، کالے اور پیلے دھبے دکھائی دیتے ہیں کبھی کبھی گیہوں
بالیاں کالی ہو جاتی ہیں اور راکھ کی طرح بن جاتی ہیں اسے اگیا بیماری کہتے ہیں۔ یہ تمام بیماریاں خطرناک
ں ۔ ان سے فصلوں کو بہت نقصان پہونچتا ہے اس لئے یہ ضروری ہے کہ اچھی پیداوار لینے کے لئے
صلوں کو ان خطرناک بیماریوں سے بچایا جائے ۔

فارم ۴ تحت ضابطہ ۸

تختہ ملکیت وغیرہ برائے ماہنامہ شاداب حیدرآباد (اے پی)

مقام اشاعت :۔ دفتر شاداب 147-5-11 ریڈ ہلز حیدرآباد (اے پی)

اوقات اشاعت :۔ ماہانہ

پرنٹر کا نام و پتہ :۔ محمد قمرالدین صابری۔ ریڈ ہلز حیدرآباد (اے پی)

قومیت :۔ ہندوستانی

پبلشر کا نام و پتہ :۔ محمد قمرالدین صابری۔ ریڈ ہلز۔ حیدرآباد (اے پی)

قومیت :۔ ہندوستانی

ایڈیٹر کا نام و پتہ :۔ محمد قمرالدین صابری۔ ریڈ ہلز۔ حیدرآباد (اے پی)

قومیت :۔ ہندوستانی

مہتمم مالک جریدہ :۔ محمد قمرالدین صابری۔ ریڈ ہلز۔ حیدرآباد (اے پی)

قومیت :۔ ہندوستانی

میں محمد قمرالدین صابری اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و اطلاع
کے مطابق بالکل درست ہیں ۔

محمد قمرالدین صابری یکم مارچ ۱۹۹۰ء

مترجم: محمد نظام الدین فاروقی راز

نوٹ :- Elizabeth Browning کی انگریزی نظم کا منظوم ترجمہ ہے جس میں قافیہ اور بحر کی پابندی کے ساتھ نظم کے متن کے مفہوم کو قائم رکھا گیا ہے۔ (مترجم)

محبّتِ جاوداں

کرو پیار مجھ سے ضرور تم میرے ہم نفس میرے ہم نشیں
مگر رہے یہ چاہ میں ہر آن تم کو دل نشیں
ہو تا تلطف و کرم تمہارا صرف پیار کے لئے
نہ اس میں کوئی غرض رہے نہ درمیاں میں کوئی شئے
نہ تمہارے پیشِ نظر رہے میرا تبسّم دلنواز
رہے جلوہ گر نہ خیال میں میری نگاہِ فتنہ ساز
وہ میرا تکلّم حسین نہ کہیں ہو باعثِ التفات
نہ وہ لطفِ ربطِ باہمی نہ وہ ندرتِ تخیلات
وہ لمحے عیش و نشاط کے جو ہیں اب بھی حاصلِ زندگی
کہ جن کی مہکتی یادوں سے ہے معطّر گلشنِ زندگی
مبادا گردشِ آسماں سے بدل ہی جائیں صبح و شام
نہ تمہارے التفات میں کہیں خود ہو تغیرِ دوام
نہ بنے یہ الفتِ حاصلہ محض ایک حسرتِ حاصلہ
کہیں عشق وفا شعار کبھی مانگتا ہے کوئی صلہ
یہ تمہاری چاہ لئے ہم نشیں بلند و معتبر رہے
نہ اشک شوئی رہے مراد نہ رحم پیشِ نظر رہے

کہ عزیب عاشق نامراد جسے ہے تمہاری وفا پہ ناز
وہ گنوا کے تمہارے پیار کو تم عشق سے بھی ہو بے نیاز
یہ چاہ تمہاری ہم نشیں رہے بے غرض رہے جاوداں
رہے ہو کے بہار بے خزاں رہے بن کے یہ بحر بیکراں

ETERNAL LOVE

If thou must love, let it be for naught
Except for love's sake only. Do not say.
"I Love her for smile - her look - her way
of speaking gently - for a trick of thought
That falls in well with mine, and certes brought.
A sense of Pleasant ease on such a day"
For these things in themselves, Beloved, may
Be changed, or change for thee - and love, so wrought
May be unwrought so, Neither love me for
Thine own dear Pity's wiping my cheeks dry.
A creature might forget to weep, Who bore
Thy comfort long, and lose thy love thereby!
But love me for love's sake, that ever more
Thou mayst love on, through love's eternity.

By: E.B. BROWNING

ڈاکٹر محمد منصور خاں منصور

غزل

لہو لہو ہے چمن لالہ زار روتے ہیں
وہ کیسے گل ہیں کہ ایسی فضا میں کھلتے ہیں

مرے شہر کی حقیقت نہ پوچھ مجھ سے اے دوست
محافظ اِس کے اُجالوں میں دن کے لوٹتے ہیں

وہ شاخ ہی رہی شاید تھی اس قدر نازک
وگرنہ کب کہیں یوں آشیاں بکھرتے ہیں

سُنا ہے آئی تھی اک دن بہار گلشن میں
ہمیں تو دیکھنے منظر خزاں کے ملتے ہیں

بچاؤ گے انہیں کب تک کے سخت پتھر سے
تمہارے آئینے بس ٹوٹنے کو ہوتے ہیں

یہ سچ ہے میں ہوں اک قطرہ بے بس و کمزور
مجھ ہی سے بحر میں طوفان بھی تو اٹھتے ہیں

میں اپنی فکر کے شعلے میں اک عمر جلتا رہا
اب آگ میرے شعور کے آتش فشاں اُگلتے ہیں

یہ شیوہ ہے کچھ نیا جنوں میں منصور ؛ خود اپنا چاک گریبان آپ سیتے ہیں

باقر باقری
نیو منزل۔ بیت المدینہ کامپلکس
۱۸ ملہ نوز العمراء۔ حیدر آباد

مکالمۂ دل

(ایک طویل نظم سے اقتباس)

جس شئے میں ہے نظامِ طبیعت کا اہتمام
تحریک ہر نفس میں وہ کرتا ہے انتظام
اوپر جگر کے رہتا ہے اک قلب دل بنام
یہ ہے رگِ حیات تو لازم ہے احترام

حاصل ہے اقتدار اسے کائنات پر
یہ حکمران جسم پہ ہے اور حیات پر

احوالِ دل سناتے ہیں دل کی زبان سے
ہوش و خرد ہوں گوش بر آواز جان سے
آتا ہے اس کو حکم فقط آسمان سے
تصدیق چاہیئے تو ملے گی قرآن سے

ہم ڈھونڈتے جسے ہیں خود اپنے وجود میں
ہے کوئی اور کارگہہ ہست و بود میں

اے دل قرار نقطۂ آغاز زندگی
اے دل نوائے رمز و فضا ساز زندگی
اے دل ہوائے حرکت و اعجاز زندگی
اے دل کہ تو ہی تو ہے فقط رازِ زندگی

پڑھیئے نمازِ دل کہ یہی قبلہ گاہ ہے
روشن ضمیر کی یہی پہلی نگاہ ہے

لوحِ جبیں پہ نقش شکن در شکن ہے تو
چشم و نظر میں فتنۂ کرن در کرن ہے تو
اک معنئ حرف سخن در سخن ہے تو
اک حاملِ وجود بطن در بطن ہے تو

تُو ہے تو ہے نہیں تو پھر امرِ خدا نہیں
مرضی تو خدا سے ہے اس سے جدا نہیں

خلوت میں رازِ خلوتِ صد انجمن ہے تو
خوابیدہ زندگی ہے فقط حُسنِ ظن ہے تو
منظورِ گفتگو ہے مگر اس کا فن ہے تو
اِس حرف میں دو تُو کا ضمیرِ سخن ہے تو

گویا زباں ہونے سے پہلے تو فہم ہے
تصدیق جس کی تُو نہ کرے وہ ہی وہم ہے

اے دل نہ تجھ میں چاہ نہ اُلفت نہ تجھ میں پیار
تو بے نیازِ ناز و ادا جبر و اختیار
بیگانۂ ہوا و ہوس صرف ہوشیار
سرگرم ہے عمل میں تو بہ حکمِ کردگار

گردش میں جب ہو تو رہے جاں جاندار
ہے گیسوئے حیات تجھ سے دم سے تابدار

میں ہوں اسیرِ گردشِ آلامِ روزگار
میرا لقب ہے قلب کی نسبت سے دلفگار
دامن حیات کا مرا اچلا ہے تار تار
میرا گناہ تیرے تغافل کا ہے شکار

تو تو دلیلِ عشق کی پہلی اساس ہے
اب بھی خدا کے بعد مجھے تجھ سے آس ہے

اس عمر میں ابھی تو میں صحرا نورد ہوں
اُن قافلوں کا ذکر ہی کیا جن کی گرد ہوں
تقدیرِ سرنوشت میں شاید میں فرد ہوں
چھو لے نسیمِ صبح تو احساسِ درد ہوں

ہوں ناتوان ایسا کہ بستر پہ دیکھیے
بس اک لکیر سی ملے گی چادر پہ دیکھیے

اے دادگاہ درد رسد گاہ انتظام
ہوش و حواس کا مرے پہنچے تجھے سلام
لکنت زباں میں آ گئی بدوران خورش طعام
پست و پناہ ضعف سے اے عزت پناہ مقام

لے اب سنبھال حال کے بے حال ہو گئے
لمحہ میں غرقِ عمرِ مہ و سال ہو گئے

زنجیر ہر نفس جو بنا ہر گلو میں ہے
احساسِ آگہی بدنِ مو بہ مو میں ہے
[illegible]

تطہیر روح فکر کی بس مشت و شو میں ہے

دے غسل روح کو یہ ابھی تو قفس میں ہے
دو بوند خون کے ہی سہی تیرے بس میں ہے

تعمیل امر کیا ہے ترغیب کا عمل
تمہیدِ زندگی میں ہے تہذیب کا عمل
عنصر کہ ہے ظہور میں ترتیب کا عمل
خودکار ہے حیات میں تخریب کا عمل

تاثیرِ لفظِ کن تو ازل سے سفر میں ہے!
تدریجِ ارتقائے فنا بھی بشر میں ہے

چکھ لے مزہ تو موت کا اک بار دل جلے
ہے زندگی کے دائمی کچھ اور مرحلے
زم زم کے بعد اور جو کوثر سے پیر دُھلے
ایسی نگاہ لا کہ رضواں کے دَر کھلے

ہے یاں نبیؐ امام پیمبر کا سامنا
کرنا تجھے ہے داورِ محشر کا سامنا

تپ دق سے جنگ

1۔ اگر آپ دو ہفتے سے زیادہ سے کھانسی میں مبتلا ہیں یا آپ تھوک یا بلغم میں خون پاتے ہیں تو آپ تپ دق کے شکار ہو سکتے ہیں۔

2۔ اپنا طبی معائنہ کرائیں خاص طور پر بلغم کا یہ معائنہ پرائمری ہیلتھ سینٹر، ڈسپنسری یا ٹی بی سینٹر میں کرا سکتے ہیں۔

3۔ تپ دق کا مکمل علاج ہو سکتا ہے بشرطیکہ ڈاکٹر کی تجویز کی ہوئی دوائیں پابندی سے مقررہ مدت تک کھائی جائیں۔

4۔ پرہیز علاج سے بہتر ہے اس لئے اپنے بچے کو بی سی جی کا ٹیکہ لگوائیں۔

سینٹرل ہیلتھ ایجوکیشن بیورو ڈی۔ جی۔ ایچ۔ ایس
[illegible] کوٹلہ روڈ، نئی دہلی 110 002

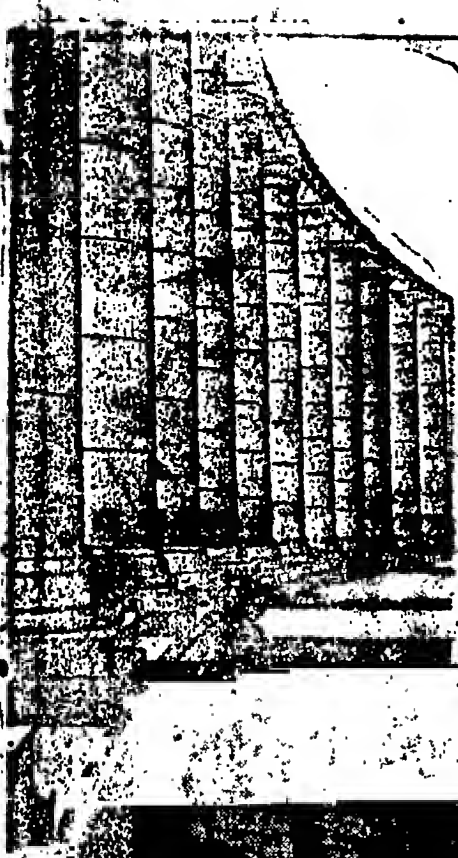

آزادی کے ستون

[illegible]

[illegible]

جیلوں اور [illegible]

کوڑوں کی تعداد میں

اپنے حق کا استعمال کیا

[illegible]

ادارۂ خلافت

آواز قوم

ماہنامہ

شاداب

حیدرآباد

جلد (   )   شمارہ (   )   سنہ ۹۰ء   حیدرآباد

مینجنگ ایڈیٹر	جائنٹ ایڈیٹر	ایڈیٹر
کلیم الدین احسن	رشید الدین	محمد قمر الدین صابری

خصوصی شمارہ نمبر ۱

بہ سلسلہ چار سو سالہ جشن تاسیس حیدرآباد

مجلسِ مشاورت

محترمہ عائشہ بیگم رباب • یوسف ناظم • ڈاکٹر محمد یوسف الدین • پروفیسر رضی الدین احمد • مینا احمد صدیقی

محمد منظور احمد منظور • محترمہ سیدہ مہر • ڈاکٹر منشاء الرحمن خاں منشاء • پروفیسر میر تقی عباسی

زرِ تعاون

خصوصی شمارہ 25/- روپے   ڈی لکس ایڈیشن 40/- روپے   عام شمارہ 6/-

	ہندوستان	خلیجی ممالک	امریکہ	انگلستان	پاکستان
سالانہ	65 روپے	200 ریال	40 ڈالر	25 پونڈ	175 پاکستانی روپے
۲ سال	120 //	360 //	70 //	45 //	300 //
تاحیات	500 روپے	3700 ریال	700 //	400 //	3000 //

(ترسیل زر کا پتہ)

ماہنامہ "شاداب" 147-5-11 ریڈ ہلز - حیدرآباد (اے پی)

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر محمد قمر الدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان سے چھپوا کر

دفتر "شاداب" 147-5-11 ریڈ ہلز حیدرآباد اے پی سے شائع کیا

فہرست

انتساب		۳
حرفِ اول		۴
مجلہ مکتبہ (نظم)	سید غلام مصطفےٰ ذہین	۷
مجلہ مکتبہ کے بانی مدیر	ڈاکٹر میمونہ فلاح الدین	۸
مولوی سید محمد	آصف قادری	۲۱
عمر یافعی	جہاندار آفسر	۲۵
افتتاحیہ (مجلہ مکتبہ کا پہلا اداریہ)	عبدالقادر سروری	۲۷
نواب نظام علیخاں کے تعلقات	میر محمود علی	۳۳
چاندنی رات اور حسین ساگر (نظم)	محمد میر خاں عزبت	۳۹
گولکنڈہ (نظم)	اعجاز علی شہرت	۴۱
شذرات (جلد ۲ شمارہ ۴)		۴۳
چارمینار کی سیر	محمد معین الدین زبیر فاروقی	۴۶
علامہ بحر العلوم شمسی	بہادر خاں (بہادر یار جنگ)	۵۵
چارمینار (نظم)	فخر حیدرآبادی	۶۴
نظام الملک آصفجاہ اول	رہبر فاروقی	۶۵
حسین ساگر	"نظارہ پرست"	۷۷
غبارِ رنگیں (غزل)	صدق جائسی	۷۹
ایشیاء کدھر	نواب بہادر یار جنگ	۸۰
فہرست ہائے مضامین مجلہ مکتبہ جلد ۱ تا ۱۱		۹۵

انتساب

اُردو کے مخلص اور نام و نمود سے بے نیاز خدمت گذاران
جناب عرشی مرحوم، علیم الدین مرحوم اور انور مرحوم
جناب محمد شریف، جناب محمد یوسف مقبول، جناب خورشید
تاجرانِ کُتب کے نام

جنھوں نے جناب محمد عبد الصمد خاں صاحب کے ساتھ تجارت نہیں کی بلکہ اُردو کتب و رسائل و مخطوطات وغیرہ فراہم اور محفوظ کر کے اُن تک پہنچائے اور اُردو ریسرچ سنٹر کی صورت پذیری کے باعث بنے۔
اور اسی ذخیرہ سے انتخاب کر کے چار سو سالہ جشنِ تاسیس حیدرآباد کے دوران "شاداب خصوصی نمبر" پیش کیے جارہے ہیں

حرفِ اول

حیدرآباد کی چار سو سالہ تاریخ میں اردو کے لئے جو کارہائے نمایاں انجام پائے۔ ان میں جامعہ عثمانیہ اور دارالترجمہ کے قیام کے بعد مجلہ مکتبہ (انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن کا ماہوار علمی رسالہ) کا اجرا خاص اہمیت کا حامل ہے

انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ کا بڑا مقصد ملک کے قابل انشاپردازوں کے منتشر مطبوعہ کارناموں کو فراہم کر کے ان کی اشاعت کرنا، قابل مصنفین کی علمی کاوشوں کو مطبوعات کی شکل میں ملک اور قوم سے روشناس کرانا اور علم دوست حضرات کو ایک جگہ جمع کر کے ایک ایسی اکاڈمی کے رشتۂ مشترک میں منسلک کرنا تھا جو اپنے مشاغل علمی کو جاری رکھ سکے چنانچہ مکتبہ نے نہ صرف ملک کے بہترین دماغوں کی پیداوار کی نشر و اشاعت میں حصہ لیا بلکہ جدید انشاپردازوں کو بھی علمی دنیا سے روشناس کرایا۔

مکتبہ ابراہیمیہ نے اپنا علمی و ادبی ترجمان "مجلہ مکتبہ" جاری کیا جس کی غرض جدید علوم و فنون کی ترویج اعلیٰ ادب لطیف کی تخلیق اور عام محققانہ مضامین کے ساتھ ساتھ دکنی لٹریچر پر تحقیقی نظر ڈالنا تھا تاکہ ملک میں ایک اعلیٰ علمی اور "اکاڈمک فضا" کے پیدا کرنے میں معاون ہو اور اپنے مولد و منشاء کے علمی و ادبی خصوصاً قدیم کارناموں کی حقیقی عظمت کو بے نقاب کرے۔ جناب محمد عبدالقادر سروری بانی "مجلہ مکتبہ" کے پہلے شمارے بابتہ خورداد ۱۳۳۷ف م اپریل ۱۹۲۸ء کے "افتتاحیہ" میں اغراض و مقاصد کا ذکر کیا ہے جسے تمام و کمال اس شمارہ میں نقل کیا گیا ہے

ماہوار "مجلہ مکتبہ" اپریل ۱۹۲۸ء میں جاری ہوا۔ ہر چھ مہینوں کی ایک جلد قرار دی گئی۔ اور مجلہ نہایت پابندی سے شائع ہوتا رہا۔ تا آنکہ شمارہ جون ۱۹۳۲ء (ج ۹ ش ۳) میں لکھا گیا کہ رسالہ کی اشاعت میں باوجود کوشش کے قدرے تعویق ہو گئی ہے۔ اگلے شمارے (ج ۹ ش ۴) میں درج ہے کہ یہ رسالہ بھی باوجود کوشش

کے دیرینہ [illegible] مشکل ہو رہا ہے۔ شاداب کی مزید مہلت کی گنجائش باقی نہیں ہے لیکن پھر ہم اس کی تلافی بااحسن وجوہ کرنا چاہتے ہیں کہ آئندہ اگست اور ستمبر کا رسالہ اکٹھا خاص نمبر کی صورت میں شائع ہوگا لیکن اس کا حجم دو نمبروں سے زیادہ ہی ہوگا۔ چنانچہ یہ مشترکہ شمارہ (۱۱۶) صفحات کا شائع کیا گیا۔

جلد ۹ اگست ستمبر ۳۲ء کے مشترکہ شمارے پر ختم ہوئی۔ مگر جلد ۱۰ کا پہلا شمارہ اکتوبر ۳۲ء میں شائع ہونے کی بجائے اپریل ۳۳ء میں شائع ہوا۔ اس طرح (۶) ماہ تک مجلّہ کی اشاعت بند رہی شاید [illegible] ہے کہ پلیگ کی وجہ سے مطبع کے ملازمین جنگلوں میں بھاگ گئے۔ بنا بریں چار مہینے تک ہم بھی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے جب مطلع صاف ہوا تو ہم نے محسوس کیا کہ ہماری زندگی کے یہ پانچ مہینے کبھی ہمیں نہیں مل سکتے۔ ناچار یہ طے کرنا پڑا کہ دسویں جلد کا شمارہ آذر ۱۳۴۲ف/ اکتوبر ۳۲ء کے بجائے خورداد ۱۳۴۲ف/ اپریل ۳۳ء سے کریں۔ اس طرح خریداروں کا بھی نقصان نہ ہوگا اور رسالے کے کارکنان کے ششماہہ آرام کا خمیازہ بھی انہیں غیر معمولی دوڑ دھوپ کی صورت میں بھگتنا نہ پڑے گا۔ جلد ۳ کا صرف ایک شمارہ ۲ ہم اردو ریسرچ سنٹر میں موجود ہے اس لئے باقی چار شمارے ادارہ ادبیات اردو کے ذخیرے دیکھے گئے۔

جلد (۱۰) کے بعد جلد (۱۱) کے صرف دو شمارے نمبر ۲ و ۳ بابتہ نومبر و دسمبر ۳۳ء اردو ریسرچ سنٹر میں موجود ہیں جلد ۱۱ کے پہلے شمارے بابتہ اکتوبر ۳۳ء کی تلاش حیدرآباد کے دوسرے ذخائر (ادارہ ادبیات اردو، اردو ہال لائبریری اور سالار جنگ لائبریری) میں کی گئی۔ دستیاب نہ ہوا نیز دسمبر ۳۳ء کے بعد کے کوئی شمارے مل نہ سکے اس طرح یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ مجلّہ کی اشاعت جلد (۱۱) شمارہ ۳ پر ختم ہو گئی یا اس کے بعد بھی جاری رہا۔

مجلّہ کی ساتویں جلد کے ختم ہونے پر ۸ جلد ۱ بابتہ اکتوبر ۳۰ء میں ڈھائی سو روپے کے پانچ انعامات حسب تفصیل ذیل [illegible] کیا گیا کہ مجلّہ کے قلمی معاونین کو سال بھر کے بہترین مضامین کے لئے دیئے جائیں گے۔

۱۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور [illegible]۔ ۵۰ روپے برائے مختصر ڈرامہ ایک ایکٹ کا ادبی اور ہندوستانی معاشرہ کے مطابق

۲۔ مولوی [illegible] ۵۰ روپے تاریخی مضمون جس کا تعلق خاص کر گولکنڈہ کی سلطنت سے متعلق

۳۔ [illegible] ۵۰ روپے تنقیدی مضمون اردو کے کسی مصنف یا شاعر پر تحقیقی اور انوکھے رنگ میں

[illegible] ۵۰ روپے تحقیقی مضمون، تاریخ اسلام سے متعلق

۵۔ میر [illegible] ۵۰ روپے افسانہ۔ حیدرآباد کی زندگی کے کسی پہلو پر۔

مجلس ادارت پر مشتمل تھی جس کے ارکان (۱) ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم (پروفیسر فلسفہ) (۲) ڈاکٹر میر ولی الدین (پروفیسر فلسفہ) (۳) مولوی ضیاء الدین انصاری (پروفیسر انجینئرنگ) پر مشتمل تھی۔

مجلہ کے پہلے ہی شمارہ میں اعلان کیا گیا کہ اس کا حجم کم سے کم چار جزو (۶۴ صفحات) ہوگا۔ قیمت سالانہ چار روپے اور محصول ڈاک پیشگی چھ ماہ کے لئے دو روپے چار آنے، فی پرچہ ۶؍ ــــ خریداری میں مزید سہولت یہ دی گئی کہ جو حضرات مکتبہ ابراہیمیہ سے ایک سال میں پچاس روپے کے مطبوعات مکتبہ یا ساٹھ روپے کی عام متفرق کتابیں یکمشت یا بدفعات نقد خرید فرمائیں گے ان کے نام رسالہ سال بھر کے لئے بلا قیمت جاری ہو سکے گا۔ نیز چھ ماہ میں (۲۵) روپے کے مطبوعات مکتبہ یا (۳۵) کی دیگر کتابیں خریدیں تو چھ ماہ کے لئے مجلہ بلا قیمت حاضر ہوگا۔ مزید رعایت یہ تھی کہ نئے رسید میں دو حضرات کے نام بھی منتقل ہو سکتی تھیں اس طرح کئی اشخاص مل کر بھی اس رعایت سے استفادہ کر سکتے تھے۔

مجلہ بابتہ مئی ۱۹۳۷ء (ج ۹ ش ۲) میں اعلان کیا گیا کہ ملک میں علم و ادب کی خدمت اور اہل ملک کے علمی و مالی فائدہ کے لئے ملک ہی کے مشترکہ سرمایہ سے بڑے پیمانہ پر تجارتی کاروبار چلانے کی غرض سے انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ محدود کی (۶) سال پہلے بنیاد ڈالی گئی۔ انجمن پانچ سال سے اپنے حصہ داروں کو سالانہ ۱۰ فیصد منافع علاوہ زکوٰۃ کے تقسیم کر رہی ہے۔ انجمن کا مجوزہ سرمایہ ایک لاکھ کے ایک ہزار حصص پر مشتمل ہے۔ ہر حصہ کی قیمت سو روپے اور ادائی بیس اقساط میں۔ اجرا شدہ سرمایہ (۵۰۰) حصے پچاس ہزار روپے۔ فروخت شدہ حصص (۴۰۰) روپے۔ انجمن کا کاروبار تین شعبوں پر مشتمل ہے:

(۱) شعبہ تجارت (۲) شعبہ اشاعت (۳) شعبہ طباعت

اس رسالہ میں تاریخ، سائنس، معاشیات، فلسفہ اور علم و ادب پر مفید اور معیاری مقالے شائع کئے جاتے۔ خصوصاً دکن کے قدیم شعراء اور دکنیات پر محققانہ مضامین درج ہوتے۔ کتابوں اور رسالوں پر تنقید و تبصرے اور جدید مطبوعات کی اطلاعیں بالالتزام شائع کی جاتیں۔ شعراء و ادباء کے علاوہ اہم شخصیات کی تصاویر بھی شائع ہوتیں۔ شعراء میں اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خان، صفی اورنگ آبادی، جوش ملیح آبادی، کیفی حیدرآبادی، اکبر وفاقانی، امجد حیدرآبادی، اختر شیرانی، عبدالمجید سالک، علی اختر ...

عبدالقدیر حسرت، سکندر علی وجد، آغا حشر کاشمیری وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

چار سو سالہ جشن حیدرآباد کے پیش نظر مجلہ کے ایسے مضامین منتخب کیے گئے ہیں جو حیدرآباد سے تعلق رکھتے ہیں۔ البتہ پورے مضامین و مندرجات کے علم کے لئے ہر شمارہ کی فہرست آخر میں شریک کردی گئی ہے۔ ▲

مجلۂ مکتبہ

از : مولانا سید غلام مصطفٰے ذہین

مجلۂ مکتبہ یہ کیا ہے ادب کا گلزارِ دلکشا ہے
نہ سیر ہو جس کی سیر سے دل وہ سیرگاہِ طرب فزا ہے

مجلۂ مکتبہ کی آمد یہ ہے کہ فصلِ بہار آئی
جو کھل گئے غنچہ ہائے خاطر تو مرغِ جاں زمزمہ سرا ہے

مدیر میں سر دری کہ ساقی یہ ہیں معارف کے میکدے کے
مجلہ ہے یا ہے شیشہ جس میں ادب کی صہبا کہاں فزا ہے

مجلہ آئینۂ معارف ہے یا ہے آئینۂ سکندر
جہانِ علم و جہانِ حکمت ہے یا یہ جامِ جہاں نما ہے

مجلہ میں وہ بھری ہے صہبا کہ نشہ بدست کن ہے جس کا
یہ دیکھنا ہے کہ بادہ خوارانِ علم کا ہوتا حال کیا ہے

شرابِ عرفاں کو پی کے اتنا تم آپ سے ہو نہ جاؤ باہر
خدا کے بندو خدا کو سمجھو کہ بندہ بندہ خدا خدا ہے

زمانہ سعدِ شہاہِ عثمان ہے علم و فن کی ترقیوں کا
یہ تا قیامت رہے سلامت تمام عالم کی یہ دعا ہے

مجلہ مخزن ہے خوبیوں کا نگارِ علم و ادب ہے گویا
ذہین یہ دعا دے سدا مبارکہ ہر ادا اس کی دلربا ہے

(مجلۂ مکتبہ جلد (۱) شمارہ (۱) اپریل ۱۹۳۲ء)

ڈاکٹر (مسز) میمونہ فلاح الدین

مجلہ مکتبہ کے بانی مدیر
پروفیسر سروری

گول متبسم چہرہ، گہرا سانولا رنگ، متناسب ڈیل ڈول، سنہرے فریم سے فکر و فن کی گہرائیوں میں جھانکتی ہوئی بڑی بڑی آنکھیں۔ (عینک ان کی شخصیت کا جزو لاینفک تھی) یہ تھے پروفیسر سروری صدر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ، جامعہ مسعود اور جامعۂ کشمیر کے میر کارواں۔ اور مکتبہ مجلہ کے بانی مدیر۔

پروفیسر عبد القادر سروری کا شمار دکن کی ان چند نامور شخصیتوں میں ہوتا ہے جنھوں نے درس و تدریس کے پیشے کے علاوہ ادبی تحقیق اور تنقید کو بھی اپنا مسلک بنایا تھا۔ دنیائے اردو ادب کا کوئی گوشہ ایسا نہیں، جس پر انھوں نے قلم برداشتہ نہ لکھا ہو۔ تحقیق ہو یا تنقید، دکنیات ہو یا لسانیات، تاریخ ادب ہو یا فنِ افسانہ نگاری، ہر صنفِ ادب میں ان کی شخصیت نمایاں نظر آتی ہے۔

پروفیسر سروری کا تعلق ایک صوفی[۱] خاندان سے تھا۔ ان کے آباد اجداد عربستان[۲] کے متوطن تھے۔ جو ہجرت کر کے کشمیر[۳] آ گئے تھے۔ حضرت سرور سلطان جو سروری صاحب کے جد امجد تھے ایک باخدا تارک الدنیا صوفی بزرگ تھے جنھوں نے اپنے رشد و ہدایات کا سلسلہ کشمیر میں جاری رکھا۔ بعد میں یہ خاندان کشمیر سے دہلی منتقل ہوا اور اورنگ زیب عالمگیر کے دور میں دہلی سے دکن نقل مقام کیا۔

حاشیہ ۳ میرے اساتذہ چند یادیں کچھ تاثرات، [illegible] جامعہ عثمانیہ سنہ ۱۹۱۸ء تا سنہ ۱۹۷۸ء

سروری صاحب کے دادا حضرت محمد جعفر علی ایک صاحب باطن بزرگ تھے جو یہاں آکر نوبت پہاڑ (حیدرآباد) پر چلہ نشین ہوئے اور مستقل طور پر یہاں سکونت اختیار کی عوام آپ کے فیوض باطنی سے بہرہ یاب ہوتے رہے، آپ عوام میں "نوبت پہاڑ والے صاحب" کے نام سے مشہور تھے آپ کی رحلت کے بعد اسی پہاڑ پر آپ کا مزار بنایا گیا۔ جہاں سینکڑوں عقیدت مند ہر سال عرس میں شریک ہوا کرتے تھے۔

سروری صاحب کے والد حاجی محمد سرور صاحب بھی نہایت ہی متشرع، پابند صوم و صلوٰۃ شخص تھے

سروری صاحب نے اپنی والدہ کے بارے میں بتایا ہے کہ ان کا تعلق دیہات سے تھا لیکن اس باوجود یہ ماننا پڑے گا کہ انھوں نے اپنے بچوں کی تربیت خوب کی۔

حاجی محمد سرور صاحب کی پہلی بیوی کا نام معلوم نہ ہوسکا۔ تاہل کے ایک سال بعد ہی وہ لاولد انتقال کر گئیں۔ دوسری بیوی امجد بیگم تھیں جن کے بطن سے محمد جعفر صاحب عزیزیہ دارالعلوم کالج بہ حیثیت استاد کارگزار تھے۔ ان کے شاگرد اپنے استاد کی طرح ہونہار تھے چنانچہ ان کے چند نامور شاگردوں میں سید محمد بادشاہ حسینی صاحب، رکن الدین احمد صاحب نائب معتمد ناظم محاسبی، حسام الدین ... ل اد نواب زین یار جنگ کا شمار ہوتا ہے) محبوب بیگم اور عبدالغفار صاحب تھے حاجی محمد سرور صاحب کی تیسری بیوی قاسم بیگم کے بطن سے ایک صاحبزادی جیلانی بیگم ہوئیں۔ چوتھی بیوی ... بیگم تھیں جن کے بطن سے فاطمہ بیگم، محبوب بیگم، غلام دستگیر صاحب، پروفیسر عبدالقادر سروری اور آصف الرحمٰن جملہ پانچ اولادیں ہوئیں۔

۱۔ پروفیسر عبدالقادر سروری مرحوم از مصطفیٰ کمال۔ صبا جون ۱۹۷۱ء

۲۔ ان کے چند خاموش خدمت گذار از رشید قریشی، سب رس، جنوری ۱۹۷۲ء

۳۔ عبدالقادر سروری، نقوش، آپ بیتی نمبر ۱۹۶۴ء از پروفیسر سروری

۴۔ انٹرویو بیہ مفہوم ڈاکٹر غلام عمر خاں (سابق صدر شعبۂ اردو، جامعہ عثمانیہ) از ... فلاح الدین

پروفیسر سروری کا نام عبدالقادر اور سروری نسبت تھی وہ اصل پروفیسر وحیدالدین سلیم مرحوم
(سابق صدر شعبۂ اردو) کے مشورے پر انھوں نے اپنے جد امجد حضرت سرور سلطان کی مناسبت سے
سروری نسبت اختیار کی تھی۔

سروری صاحب کی تاریخ پیدائش ۱۹ر اگست ۱۹۰۶ء بتلائی جاتی ہے سروری صاحب نے تسمیہ خوانی کے بعد قرآن مجید کی تعلیم مقبرہ زماں خاں شہید[1] میں حاصل کی اور فارسی اپنے علاتی بھائی محمد جعفر صاحب سے حاصل کی جو انھیں مثل اپنی اولاد کے سمجھتے تھے اس کے بعد ابتدائی تحتانوی تعلیم کے حصول کے لئے انھیں مدرسہ منصبداران میں شریک کیا گیا مدرسہ مفیدالانام[2] سے مڈل اور سٹی ہائی اسکول[3] سے میٹرک ۱۹۲۱ء میں کیا۔

جامعہ عثمانیہ سے ۱۹۲۳ء میں انٹرمیڈیٹ، ۱۹۲۵ء میں بی اے، ۱۹۲۷ء میں ایم اے اور پھر[4] ایل ایل بی کیا۔

ایم۔ اے، ایل ایل بی کرنے کے بعد وہ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے لندن جانے کے خواہاں تھے چنانچہ ایک عرصہ دراز تک ڈاکٹر زور سے ان کی خط و کتابت اس بابت چلتی رہی، جیسا کہ ڈاکٹر زور کے اس خط کے اقتباس سے ظاہر ہے۔

" اگر آپ کو یورپ آنے کا موقع ملے تو میں نے ایک اچھا مضمون سوچ رکھا ہے۔ لطیف احمد رضوی نے قاری صاحب کو لکھا ہے کہ وہ آنا چاہتے ہیں (اب نہیں، کسی وقت) کیا مضمون اختیار کریں؟ قاری صاحب نے مجھ سے پوچھا، میں نے کہا کہ میں نے سوچ رکھا ہے مگر وہ سروری صاحب کا حق ہے اگر سروری صاحب نہ آسکیں تو رضوی صاحب کو بتادوں گا۔

عــ ۱، ۲، ۳ نقوش آپ بیتی نمبر ۱۹۶۴ء از پروفیسر سروری

عــ ۴ سب رس جون ۱۹۳۹ء

حد تک سے کتاب آپ کو بھیجی ہے صرف کام تھے۔ اگر میں یہاں واپس آکر پھر
چلانے کے قابل ہو سکوں تو ضرور آپ کو بلوانے کی کوشش کروں گا۔"

"ہمارے سروری! یورپ صرف اس لیے نہ آؤ کہ یہاں سے واپس ہونے کے بعد یورپین گریڈ کی ملازمت ملے گی بلکہ اس لیے کہ زندہ قوموں کا مطالعہ کرو، زندہ رہنے کے طریقے سیکھو، کوتاہ نظری اور تاریکی کے جو پردے وہاں نظروں پر حائل ہیں انھیں دور کر سکو اور اپنے ملک میں وہ چیز پیدا کرو جو انسانیت کا مقتضا ہے ع۱"

سروری صاحب مسلسل کوشش کرتے تو شاید انھیں اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہو جاتی، کیونکہ اسی زمانے میں مولوی عبدالرحمٰن صاحب پرنسپل عثمانیہ یونیورسٹی کی سعی و سفارش پر کئی طلبہ کو سرکاری وظیفوں پر ہندوستان اور یورپ کی مختلف ریاستوں کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا جیسا کہ مولوی محمد ابراہیم صاحب چیف انجینئر نے لکھا ہے:

اس سال (۱۹۲۷ء) اسٹیٹ اسکالرشپ کمیٹی میں حسن عثمانی کو خان صاحب نے دو وظائف دلوائے، وہ یہی محمود عالم (انجینئر) میر سعادت علی اسلامی لا میں ریسرچ کے لیے اور مقبول علی کو طب کے لیے۔ ان کے علاوہ دو بڑے خوش نصیب طالب علم اسکو رام (ڈاکٹر...) اور محمد ... انگلش لٹریچر کے تھے۔ ایک ہی سال میں پانچ طالب علموں کو ... اسکالرشپ دلوانا ایک ریکارڈ تھا کیونکہ اس زمانے میں ایک آدھ اسکالرشپ بارسوخ خاندان کے ایک آدھ فرد کو دیا جاتا تھا۔

اس اثنا میں پہلے بیاج کے تین طالب علم سید حسین، میر ولی الدین اور صلاح الدین علی الترتیب علی گڑھ اور ڈھاکہ یونیورسٹی سے ایم ایس سی اور ایم اے کے امتحانوں میں

ع۱۔ خط بنام ... سروری از ڈاکٹر زور محررہ ... ۱۹۲۹ء اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز، ... ادبی ...

امتیازی ڈگریاں لے کر نکلیں ہوتے تھے۔ ان کو خان صاحب نے یونیورسٹی کے انتظامیہ سے یورپین اسکالرشپ دلا کر انگلستان بھجوایا۔

تیسری اسکالرشپ کمیٹی میں پہلے بیاچ کے ضیاء الدین انصاری اور تیسرے بیاچ کے رضی الدین صدیقی کو ..... یورپین اسکالرشپ دلوائے گئے ... ح۱

اس کے بعد ہی سروری صاحب کے دو رفقاء یعنی زور صاحب اور سید قادری کلیم اللہ حسینی کو بھی سرکاری وظائف پر لندن بھیجا گیا۔ پروفیسر سید قادری کلیم اللہ حسینی کا تعلق جامعہ عثمانیہ کے پہلے بیاچ کے فارغ التحصیل طلباء سے تھا جبکہ سروری صاحب اور زور صاحب کا تعلق جامعہ عثمانیہ کے تیسرے بیاچ سے تھا۔ محمد ابراہیم صاحب اس تعلق سے لکھتے ہیں :-

"تیسرے بیاچ کو عثمانیہ یونیورسٹی کی خاص اہمیت پیدا ہو گئی چاہیئے۔ کیونکہ اس کی اکثریت ان طلباء کی تھی جنھوں نے ذریعۂ تعلیم اردو سے میٹرک کا امتحان پاس کر کے کالج میں داخلہ لیا تھا۔ اس بیاچ کے چند قابل ذکر طلباء میں ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، پروفیسر سید محی الدین قادری زور، پروفیسر عبدالقادر سروری، ظہیر الدین احمد ... وغیرہ تھے جنھوں نے اپنے اور جامعہ کے نام روشن کیے۔" ح۲

۱۹۲۸ء سروری صاحب کی زندگی کا وہ اہم ترین سال ہے جبکہ ان کی عملی زندگی کا آغاز ہوا۔ اسی سال ان کا تقرر بہ حیثیت لکچرار فارسی اور پھر بعد میں لکچرار اردو کی حیثیت سے جامعہ میں عمل میں آیا۔ اس طرح ناموافق حالات کی وجہ سے وہ یورپ نہ جا سکے۔ لیکن تحقیقی ڈگری پی ایچ ڈی کے حصول کے لئے کوشاں رہے چنانچہ جب ڈاکٹر زور لندن سے لوٹے تو سروری صاحب نے دوستی بھائی چارگی کے پیش نظر زور صاحب کے تحت تحقیقی کام کا آغاز کیا۔ اس بات کا علم بہت کم لوگوں کو ہے۔ اس کی تصدیق بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب معتمد مجلس تحقیقات علمیہ کے

ح۲ پروفیسر عبدالرحمن خاں، ارمغان جامعہ عثمانیہ ۱۹۱۸ء تا ۱۹۴۸ء۔ از محمد ابراہیم یوسف الخیر حیدرآباد

نوٹ کے ساتھ مراسلہ مورخہ ۹ فروری ۱۳۵۷ ف بھیجا گیا ہے جو انھوں نے سروری صاحب کو لکھا تھا۔

"مجلس تحقیقات علمیہ نے آپ کی درخواست پی ایچ ڈی پر غور کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ آپ کو پی ایچ ڈی کے لئے تحقیقات کی اجازت دی جائے۔ لیکن عنوان مقالہ کے متعلق طے پایا کہ اگر آپ "دکنی اردو کا ارتقاء اور اس کا ادب" اختیار کریں تو مناسب ہوگا اس کے متعلق اپنی رائے سے مجھے بلد از جلد مطلع فرمائیے۔"

نوٹ :۔ مجلس نے آپ کے تحقیقاتی کام کی نگرانی کے لئے ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور کو نامزد کیا ہے۔ ؏۱

شاید سروری صاحب نے مقالہ کے عنوان میں کچھ رد و بدل کی درخواست کی تھی اسی لئے مولوی عبدالحق ایک اور خط میں لکھتے ہیں۔

"آپ کے عنوانِ مقالہ کے متعلق طے پایا کہ آپ کو آپ ہی کے پیش کردہ عنوان "دکنی اردو کا ارتقاء" پر کام کرنے کی اجازت دی جائے آپ کے کام کی نگرانی زور صاحب کریں گے نیز آپ کے تحقیقاتی کام کی رپورٹ ہر مہینے کے اختتام پر میرے پاس وصول ہو جانی چاہئیے تاکہ جناب نائب معین امیرِ جامعہ کے ملاحظہ میں پیش کی جا سکے۔" ؏۲

سروری صاحب نے تحقیقاتی کام کا آغاز کیا ہی تھا کہ ان کا تقرر جامعہ میسور میں صدر شعبۂ اردو، فارسی اور عربی کی حیثیت سے عمل میں آیا۔ شاید اسی لئے ان کا یہ تحقیقی کام تعطل میں پڑ گیا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ انھوں نے اس جانب توجہ ہی نہ کی بلکہ اپنے اس نئے عہدہ کا جائزہ لینے کے بعد بھی انھوں نے اپنے تحقیقاتی کام کو جاری رکھا۔ موضوع کی وسعت کے لحاظ سے انھیں لسانیات کا

؏۱ مراسلہ بنام سروری صاحب از مولوی عبدالحق صاحب معتمد مجلسِ تحقیقاتِ علمیہ (شعبۂ فنون) مورخہ یکم مہر ۱۳۴۹ف

؏۲ مراسلہ بنام سروری صاحب از مولوی عبدالحق صاحب

مطالعہ کرنا پڑا۔ قدیم برج بھاشا اور ہندی کی ہر پہلو کو سمجھنے کے لئے ان زبانوں کی قواعد بھی ان کے زیر مطالعہ رہی نیز اسی سلسلے میں سنسکرت اور مرہٹی بھی سیکھی۔ وہ کس محنت اور عرق ریزی کے ساتھ کام میں جٹے ہوئے تھے اس کا اندازہ ان کے ایک خط سے لگایا جا سکتا ہے جو انہوں نے مولوی عبدالحق کو لکھا تھا۔

" اپنے کام کی ابتدائی تحقیقات کے سلسلے میں علم لسانیات کی کتابوں کا مطالعہ کر کے میں نے تمام صوتی لسانی اور قواعدی اصطلاحات اکٹھی کی ہیں اور ان کا اردو میں ترجمہ بھی کیا ہے تاکہ مجھے آئندہ اردو لکھنے میں آسانی ہو اس کے علاوہ ہند آریائی زبانوں کے عام ارتقاء کا بھی مطالعہ کر رہا ہوں۔ اس سلسلے میں مقابلے کے لئے موجودہ ہند آریائی زبانوں کی صوتیات اور قواعد کے عام اصول اور ان کے اختلافات سے بھی واقفیت پیدا کر رہا ہوں۔ موجودہ ہندی زبان اور قدیم زبان برج بھاشا کی قواعد کا مطالعہ بھی جاری ہے اور سب سے بنیادی چیز جو میرے کام کے لئے ضروری ہے وہ سنسکرت زبان اور قواعد کی معلومات ہیں اس لئے میں سنسکرت زبان کی تعلیم حاصل کر رہا ہوں۔ قدیم اردو میں چونکہ ہند آریائی الفاظ کی بہت سی شکلیں مرہٹی سے مشترک ہیں اس لئے میں مرہٹی زبان کا بھی خاص طور پر مطالعہ کر رہا ہوں۔[1]"

سروری صاحب اور ان کے عزم دیرینہ ڈاکٹر زور متذبذب تھے کہ آیا بلا حاضری سروری صاحب کو ڈاکٹریٹ کرنے کی اجازت دی جائے گی یا نہیں؟ دونوں نے کاغذی گھوڑے دوڑائے تو مولوی عبدالحق نے بلا شرط حاضری تحقیقی کام جاری رکھنے کی انہیں ہدایت دی لیکن ساتھ ہی پابند بھی کیا کہ وہ چھٹیوں میں جامعہ عثمانیہ آتے رہیں گے۔ چنانچہ اس بابت مولوی عبدالحق نے ڈاکٹر زور کو لکھا تھا۔

" آپ نے مولوی عبدالقادر صاحب سروری کے پی ایچ ڈی کے تحقیقاتی کام کے متعلق اپنی سالانہ رپورٹ میں تحریر فرمایا تھا کہ وہ تحریراً مشورہ لیتے رہیں گے انہیں

---

[1] مراسلہ بنام مولوی عبدالحق صاحب منجانب [illegible] یکم شہریور ۱۳۴۵ ف

ہر ہفتے میں یہاں آسکتے ہیں گے کیا ان کی اس طرح کی حاضری شمار کی جاسکے گی؟ اس کے متعلق مجلس تحقیقات علمیہ نے اپنے اجلاس منعقدہ یکم بہمن ۱۳۵۲ف میں حسب ذیل فیصلہ کیا ہے:

"انھیں اس کی اجازت دی جاتی ہے، مگر نگرانی فی الحقیقت موثر ہونی چاہیئے ؏۱"

"نیز بخدمت مولوی عبدالقادر صاحب سروری مرسل و ترقیم ہے کہ براہ کرم مطلع کیا جائے کہ آپ اپنا تحقیقی مقالہ کب پیش کرنے والے ہیں ؏۲"

متذکرہ بالا مراسلہ جات کی روشنی میں یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ سروری صاحب نے یکم مہر ۱۳۴۹ف سے ۹ بہمن ۱۳۵۲ف یا اس کے کچھ بعد تک پی ایچ ڈی کا مقالہ زور صاحب کی نگرانی میں لکھنا شروع کیا تھا۔ لیکن پھر پتہ نہیں کیا وجوہ درپیش ہوئیں کہ یہ کام پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ شاید دونوں دوستوں کے درمیان نظریاتی خلیج حائل ہونی شروع ہوگئی تھی، جس کو وہ پاٹ نہ سکے۔ ساقی میخانہ کے تیور بدل گئے تھے۔ پروفیسر ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے بڑی خوبصورتی سے اس کا تجزیہ اپنے مضمون میں کیا ہے۔ لکھتی ہیں:

"سروری صاحب کی زندگی میں کچھ ایسے فرسودہ لمحے بھی آئے جب باوجود ممکنہ احتیاط کے خاندانی رشتے، انسانی محبت اور دوستی پر ان کا اعتبار دھندلا گیا تھا۔ جن لوگوں کو وہ دوستی اور محبت کا مجسمہ سمجھتے تھے، پتھر کی عارضی چادر ہٹ جانے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ معمولی انسان سے زیادہ نہیں تھے ؏۱"

سروری صاحب چاہتے تو بہ آسانی یہ تحقیقی کام پیش کرکے ڈگری حاصل کرسکتے تھے

؏۱،۲ مراسلہ بنام ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور از مولوی عبدالحق صاحب معتمد مجلس تحقیقات علمیہ (جامعہ عثمانیہ) نشان (الف / ۵۲ ف) بہمن ۱۳۵۲ف

؏۳ میرے اساتذہ، چند یادیں، کچھ تاثرات ارمغان (جشن الماس) ۱۹۱۸ء تا ۱۹۷۸ء

کہ نہ صرف دکنی اُردو کے ارتقا پر ان کی گہری نظر تھی بلکہ ان کے اکثر ادبی کارنامے ایسے
تھے کہ انھیں مختلف جامعات سے بیک وقت کئی تحقیقی ڈگریاں حاصل کر سکتی تھیں۔ دراصل کسی
چیز کی اہمیت اسی وقت تک باقی رہتی ہے جب تک کہ وہ حاصل نہیں ہو جاتی۔ بھوک ہی کی اہمیت
بھوک کے حائل ہے، انسان بھوکا ہو تو وہ کبھی سوکھی روٹی بھی کھا سکتا ہے۔ لیکن شکم سیر ہو
کے بعد جنت کے میوے بھی اس کے آگے رکھ دیئے جائیں تو مشکل ہی سے رغبت ہوگی علاوہ از
اس اثنا میں وہ اپنے کئی طلبا و طالبات کو پی ایچ ڈی کا تحقیقاتی کام کروا چکے تھے۔

سروری صاحب کی آخری طالب علمانہ مساعی اسکول آف لنگوسٹکس ڈیکن کالج پوسٹ
گریجویٹ اینڈ ریسرچ انسٹیٹیوٹ، پونا کی رہین منت ہے جہاں سے انھیں لنگوسٹکس میں
۱۸ جون ۱۹۵۵ء کو سرٹیفکیٹ بھی عطا ہوا تھا۔

سروری صاحب کو کئی زبانوں پر تبحر حاصل تھا۔ وہ مجمع البحرین، جامع کمالات شخص تھے
اُردو تو خیر ان کی مادری زبان ٹھہری لیکن انگریزی اور فارسی میں انھیں مہارت تامہ حاصل تھی نیز ہندی پر
عبور حاصل تھا۔ فرانسیسی بھی انھوں نے سیکھی تھی علاقائی زبان تلنگی میں اپنا مافی الضمیر کہنے پر
قادر تھے سنسکرت، پنجابی، برج اور مرہٹی زبانوں سے بھی کما حقہ واقفیت رکھتے تھے۔

سروری صاحب ۲۱ سال کی عمر میں رشتۂ ازدواج میں بندھ گئے تھے ان کے والد حاجی
محمد سرور صاحب نے ان کی شادی شیخ احمد صاحب جاگیردار کی دوسری صاحبزادی مہدی بیگم سے
۱۹۲۷ء میں کی۔

سروری صاحب کی پہلی شریک حیات مہدی بیگم سے استانی محترم زبیدہ کلثوم صاحبہ ایم۔اے
(عربی) (صدر شعبہ عربی دینیات ہلودیا ئیہ) ہیں ان کی شادی پروفیسر ڈاکٹر غلام عمر خاں صدر شعبۂ
اُردو جامعہ عثمانیہ سے ہوئی۔ یہ ابھی شیر خوار ہی تھیں کہ شفقت مادری سے محروم ہو گئیں۔ سروری صاحب
نے اپنی شریک حیات کی وفات کے بعد اس شیر خوار بچی کی پرورش و پرداخت کے لئے اپنے آپ کو
وقف کر دیا تھا عہد کر لیا تھا کہ عقد ثانی نہ کریں گے لیکن ان کے بڑے بھائی محمد جعفر صاحب نے ان کی

[illegible] ... نسیم النساء بیگم ... صاحب
[illegible]

بیگم سروری نے ایک ملاقات میں مجھ سے بطور خاص تذکرہ کیا تھا کہ شادی کے وقت وہ صرف میٹرک پاس تھیں مگر بعد میں سروری صاحب کے ذوق نے انھیں مجبور کیا انھوں نے تعلیم جاری رکھی اور ایک ایک جماعت [illegible] ڈگریاں ایم اے (اردو عثمانیہ) ایم اے (ہندی ناگپور) حاصل کیں۔

سروری صاحب کو معین النساء بیگم صاحبہ سے چھ اولادیں ہوئیں [illegible] لڑکی نے کم سنی میں انتقال کیا۔ [illegible] رفعت سروری [illegible] کی شادی مسعود احمد صاحب پبلک ریلیشن انجینئر [illegible] سے ہوئی۔ تیسرے صاحبزادے جنید احمد سروری بی ای (عثمانیہ) ایم ایس (امریکہ) بہ حیثیت چیف انجینئر امریکہ میں کارگزار ہیں۔ چند سال پہلے ان کی شادی ڈاکٹر یوسف الدین انصاری حال پرنسپل دکن میڈیکل کالج کی صاحبزادی ادیب انصاری سے ہوئی۔ سروری صاحب کے تیسرے صاحبزادے ڈاکٹر فضل سروری نے [illegible] ایم بی بی ایس کیا تھا اب امریکہ میں مقیم ہیں۔ چوتھے صاحبزادے [illegible] سروری نے عثمانیہ یونیورسٹی سے بی ای (میکانیکل) کیا اور اب امریکہ میں بہ حیثیت انجینئر کارگزار ہیں۔ سب سے چھوٹی نکہت سروری [illegible] نے عثمانیہ سے ایم بی بی ایس کیا [illegible] شادی ڈاکٹر [illegible] خان (مقیم امریکہ) سے ہوئی۔ [illegible] تمام [illegible]

ابتداء میں سروری صاحب کا تقرر جامعہ عثمانیہ میں بہ حیثیت منصرم مددگار پروفیسر [illegible] ۱۹۴۲ء تک کارگزار رہے۔

[illegible] ۱۹۴۲ء تا جولائی ۱۹۴۵ء [illegible] جب کہ وہ [illegible] اردو فارسی عربی اور ہندی کی حیثیت سے (۴۰۰ تا ۷۰۰ روپے) کارگزار رہے۔

ملازمت کا تیسرا دور جولائی ۱۹۴۶ء سے شروع ہوتا ہے جب کہ وہ اپنے حق [illegible] کی بنا پر

[illegible] پر جامعہ عثمانیہ [illegible]

کو انھیں پروفیسر شپ کے گریڈ (۶۰۰ تا ۱۲۰۰ روپے) پر ترقی دی گئی جہاں [illegible] تک کارگزار رہے۔

وائس چانسلر کی ایما پر وہ یہاں [illegible] پروفیسر و صدر شعبہ کی حیثیت سے [illegible] تک کارگزار رہے۔ تاآنکہ ڈاکٹر مسعود حسین خان کا تقرر بہ حیثیت پروفیسر و صدر شعبہ اردو کی حیثیت سے [illegible] ۱۹۵۰ روپے گریڈ پر ہوا۔

ملازمت کا چوتھا اور آخری دور ریاست کشمیر میں ختم ہوا جہاں [illegible] انسٹی ٹیوٹ آف [illegible] سروس [illegible] کشمیر [illegible] شعبۂ اردو اور فارسی کے پروفیسر اور صدر شعبہ کی حیثیت سے [illegible] مارچ [illegible] کو عمل میں آیا۔ جہاں وہ ۱۵ مارچ ۱۹۷۳ء یعنی اپنی تاریخ وفات تک کام کرتے رہے۔

اس طرح وہ ۴۲ سال ۳ ماہ ۴ دن مختلف مقامات پر کام کرتے رہے۔

پروفیسر سرور اوسط قد و قامت کے مالک تھے بظاہر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالنے والا ان سے کبھی متاثر نہ ہوتا لیکن رفتہ رفتہ جب اجنبیت کا یہ پردہ شناسائی سے آگاہی کی طرف بڑھتا تو ملاقاتی کو خود بخود ان کی عظمت اور بڑائی کا احساس ہوتا اور خواہ مخواہ ذہن ان سے [illegible] ہو جاتا۔ سرور صاحب کی شخصیت کا تجزیہ ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید نے بہت خوب کیا ہے رشید احمد صدیقی کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ پروفیسر سرور کا تقابل [illegible] لکھتے ہیں۔

"پہلی بار رشید صاحب کو دیکھ کر مجھے اپنے شفیق استاد سرور صاحب کی یاد آئی [illegible] سرور صاحب بھی ایک ایسی ہی شخصیت ہیں جو اپنے [illegible] کی وقعت، اپنی تحریر کی دلنوازی، گہرائی اور گیرائی سے لوگوں کو اپنا بنا لیتے اور دلوں کو فتح کر لیتے ہیں ۱؎"

۱؎ چہرہ چہرہ داستان از سلیمان اطہر جاوید

[illegible] انہوں نے [illegible] اپنا [illegible] نام ادا کرتے
تھے [illegible] مستقل سکونت کرتے [illegible] زیادہ دلی سے ہی باہر دلی والوں
کی صحبت [illegible]

انھیں اپنی صحت کا بڑا خیال تھا۔ ہمیشہ [illegible] ۶۵ برس کی عمر میں
وہ زیادہ سے زیادہ ۴۰ برس کے دکھائی دیتے تھے [illegible] ہلکی سی ورزش بھی کر لیتے۔ اگرچہ غذا
کے تعلق سے ان کا ایمان تھا [illegible] ایک [illegible] بلا ملے
لیکن کبھی سیر ہو کر [illegible] زیادہ کھانا پسند نہیں کیا۔

نانا محترم آپ [illegible] کے قائل تھے چنانچہ [illegible] میں بیگم آمنہ
انصاری کے مطابق ہمیشہ [illegible] گرم گرم کھانا پسند کرتے تھے۔

وہ صوم و صلوٰۃ کے سخت پابند تھے قرآن کی [illegible] سورتوں میں سے اکثر سورتیں انھیں یاد
تھیں اکثر تنہائی میں [illegible] کرتے [illegible] کو ناپسند کرتے تھے۔ [illegible] نادار رشتہ دار
کی مدد کرتے [illegible] محترم بیگم زبیدہ [illegible] خان نے بتایا تھا کہ

> طلبا و نادار اقربا نیز [illegible] کی فلاح و بہبود سے انھیں کافی دلچسپی تھی
> [illegible] تعلیم [illegible] ان کے [illegible] وہ بھی انھیں اپنا
> سرپرست [illegible] محسن سمجھتے تھے۔ چنانچہ [illegible] صاحب نامی طالب علم کو جو
> [illegible] ان کی پریشانی [illegible] حالی اور
> طالب علمانہ مساعی کو دیکھ کر اپنے ذاتی مکان میں بلا معاوضہ انھیں ایک کمرہ دے
> [illegible] اپنے بچوں کو پڑھاتے تھے
> انھیں دیتے رہے [illegible] صاحب کی [illegible]
> تھے [illegible] ان کے گھر سے [illegible]
> [illegible] اور [illegible] صاحب
> [illegible] بچوں کو شائستہ اطوار بنانا مقصود تھا۔
> ([illegible])

سروری صاحب [illegible] انھوں نے کبھی ان حالات کو [illegible]
محسوس ہونے دیا کہ وہ شفقت پدری سے محروم ہو گئے ہیں۔ غرض یہ کہ خواجہ [illegible] سے
ہر کس و ناکس کی بساط بھر مدد کی۔ اپنے شاگردوں کی فیسیں اپنے جیب سے ادا کیں۔ خود ایک
نوالہ کم کھایا لیکن دوسروں کو پیٹ بھر کھلایا۔ یہ وہ خوبی ہے جو ہر ایک کو

سب کو میسر نہیں نعمل تیر سے

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

اس مختصر سے مضمون میں سروری صاحب کے کارناموں کا اجمالی جائزہ لینا ممکن نہیں ۱۹۲۰ء سے ۱۹۷۱ء تک انھوں نے تقریباً ۲۱ کتابیں مختلف تنقیدی، تحقیقی موضوعات، تاریخ ادب، دکنیات، فنِ افسانہ اور لسانیات پر تصنیف و تالیف کیں۔ ذیل میں ان کتابوں کی فہرست دی جا رہی ہے۔ (۱) دنیائے افسانہ (۲) کردار اور افسانہ (۳) اردو کی ادبی تاریخ (۴) کشمیری فارسی ادب کی تاریخ (۵) سراج اور ان کی شاعری (۶) ابتدائی مثنوی کا ارتقاء (۷) جدید اردو شاعری (۸) کلیاتِ سراج (۹) پھول بن (۱۰) قصۂ بے نظیر (۱۱) مرآۃ الاسرار (۱۲) انتخابِ سخن (۱۳) سراج سخن (۱۴) مثنوی بوستانِ خیال (۱۵) حیدرآباد کی تعلیمی ترقی گزشتہ ربع صدی میں (۱۶) کشمیر میں اردو ادب [illegible] (۱۷) توضیحی فہرست اردو مخطوطات جامعہ عثمانیہ (۱۸) مہاراجہ رنبیر سنگھ اور ان کا دارالترجمہ (۱۹) بات کا بتنگڑ اور دیگر افسانے (طنز و مزاح) (۲۰) زبان اور علم زبان (۲۱) انتخابِ ظفر۔

یوسف ٹینگ نے ان کے بارے میں بالکل صحیح لکھا ہے کہ "وہ جہاں جاتے تھے فضاؤں کو دمکا دیتے تھے۔" ان کی ذات بجائے خود ایک انجمن تھی۔

سروری صاحب مکتبہ ابراہیمیہ، ادارۂ ادبیاتِ اردو، مجلس تحقیقاتِ دکن، بزمِ اردو ادب اردو، [illegible]، اردو فیسٹیول، انجمن اساتذۂ اردو کے بانی رکن اور صدر رہے [illegible] کے علاوہ

(باقی صفحہ [illegible] پر)

پروفیسر سید محمد

[illegible]

پروفیسر سید محمد حیدرآباد کی ان ممتاز شخصیتوں میں سے ایک ہیں جنہوں نے علمی، ادبی، مذہبی، ثقافتی اور تعلیمی شعبوں سے پوری تندہی کے ساتھ وابستہ رہتے ہوئے ہر خاص و عام کی خدمت کی۔ سید محمد صاحب کو بچپن ہی سے نام و نمود اور دکھاوے سے نفرت تھی اسی لئے انہیں وہ شہرت نہیں مل سکی جو ان کے ہمعصروں حتی کہ ان کے شاگردوں کو ملی۔ انھوں نے زمانہ کی ناقدر شناسی کا کبھی کوئی گلہ شکوہ نہیں کیا۔ وہ بڑے خود مستغنی انسان تھے۔

مولوی صاحب ۲۸ مارچ ۱۹۰۶ء میں حیدرآباد میں تولد ہوئے اور یہیں پلے بڑھے۔ تحتانی تعلیم مدرسہ فوقانیہ بازار گھانسی میں حاصل کی۔ کچھ عرصہ مدرسہ [illegible] میں بھی تعلیم پائی۔ پھر سٹی گرامر مڈل اسکول سے [illegible] مدارج طے کیے اور سٹی ہائی اسکول (سٹی کالج) سے ایچ ایس ایل سی کامیاب کیا۔ جامعہ عثمانیہ سے ۱۹۲۸ء میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔

مولوی صاحب مولانا [illegible] کے شاگرد خاص تھے۔ انھوں نے پروفیسر [illegible] اور پروفیسر سروری کی سرپرستی میں اعلیٰ تعلیم کی تکمیل اور تدریسی زندگی کی ابتدا کی تھی۔ سید صاحب کو شروع ہی سے ادب سے گہری دلچسپی تھی اور وہ مضامین لکھ کر مختلف رسائل اور اخبارات کو بھیجا کرتے تھے۔ جب تک وہ [illegible] سے وابستہ رہے [illegible] ترتیب [illegible] کے فرائض انجام دیتے رہے۔ مولوی صاحب نے [illegible] عربی [illegible] پر متعدد مقالوں اور نظموں کے ایک مجموعہ

[illegible] کی اشاعت عمل میں لائی تھی۔ تحقیقی مقالے، مضامین اور نظمیں [illegible] کالج میں منعقدہ جشن
"تعلیم دکن" کے موقع پر سنائے گئے تھے۔ سید صاحب نے بھی ڈاکٹر زور اور پروفیسر [illegible] کے دوش بدوش
۱۹۳۱ء میں ادارۂ ادبیات اردو کی داغ بیل ڈالنے اور اسے پروان چڑھانے میں نمایاں خدمات انجام
دیں۔ مولوی صاحب نے ادیبوں اور شاعروں کے مزاروں کے تحفظ اور ان پر کتبے نصب کرانے اور ان
کی کوششوں کی بدولت ادارۂ ادبیات اردو کو [illegible] مخطوطات کا ذخیرہ دستیاب ہو سکا۔

مولوی سید محمد صاحب کو صحافت کا بھی کافی تجربہ حاصل تھا۔ وہ مولوی سید احمد اللہ قادری مرحوم کے
ساتھ "رہبر دکن" میں ایک عرصہ تک کام کر چکے تھے۔ [illegible] اور جناب [illegible]
کے ساتھ مل کر [illegible] ایک [illegible] جس [illegible] شائع کرتے رہے۔ مولوی صاحب انجمن
طیلسانین عثمانیہ کے اولین ارکان میں شامل تھے۔ وہ اس انجمن کی مختلف کمیٹیوں جیسے ادبی کمیٹی، انتظامیہ
[illegible] وغیرہ کے [illegible] تک [illegible] رہے۔ انھوں نے اس انجمن کی جانب سے ایک
سہ ماہی رسالہ "مجلہ طیلسانین" بھی جاری کیا تھا جس میں علمی، ادبی اور معلوماتی مضامین و مقالے شائع
ہوتے تھے۔ سید صاحب نے ہی ابتداء میں انجمن کے زیر اہتمام فرزندانِ جامعہ کی تصانیف کو یکجا کرنے کا
کام انجام دیا۔ مولوی صاحب کی کوششوں سے نمائش مصنوعات ملکی کے دوران ایک علاحدہ گوشہ میں
فرزندانِ جامعہ کی علمی تصانیف اور تحقیقات کی نمائش کا انتظام [illegible]
نمائش [illegible] تھے۔ انجمن نے مصنفین کی کتابوں کے [illegible] نمائش
میں پیش کیں جن میں اردو کے علاوہ مرہٹی اور تلگو کتابیں بھی تھیں۔

سالار جنگ سوم نواب میر یوسف علی خاں کی زیر سرپرستی مجلس اشاعت دکنی مخطوطات
کا قیام عمل میں آیا تو سالار جنگ نے سید صاحب کو اس کا معتمد بنایا اور جب [illegible]
وفات کے بعد [illegible] ایک [illegible] تک [illegible] انجام دیتے رہے [illegible]
کے شائع کیں۔ مولوی صاحب کو ادبی [illegible]
[illegible]

[illegible]
کتاب [illegible] کی [illegible] ڈاکٹر [illegible] انگریزی
[illegible] بھی لکھے ہیں
[illegible] تحقیق [illegible] خصوصی
اب تک کوئی ایسا کارنامہ اُردو یا انگریزی میں موجود نہیں [illegible] کرتا
مؤلف کتاب [illegible] پر
شاید ہی کسی نے سنجیدگی سے صحت و تحقیق کے ساتھ روشنی ڈالی [illegible] ہے۔ اس
کتاب [illegible] مؤلف نے ادبیات اُردو میں تاریخی تحقیق و تدقیق کی بہت بڑی
خدمت انجام دی ہے۔[illegible]

مولوی سید محمد صاحب نے مجلس بلدیہ حیدرآباد کے ایک رکن کی حیثیت سے صحت و صفائی
کے اُمور میں شہریانِ حیدرآباد کی بھی خدمت کی۔ مولوی صاحب نے ہی شہر میں گورنمنٹ کی دکانات پر
جالی لگانے اور ہر ایک محلہ اور بستی میں بچوں کے کھیل کود کی سہولت [illegible] فراہم کرنے کی غرض سے
چلڈرنس پلے گراونڈ کے قیام کی تجاویز پیش کی تھیں۔[illegible]

مولوی صاحب کی تصنیفات اور تالیفات جن [illegible] ارباب [illegible]
(۳) [illegible] (۴) [illegible] (۵) [illegible] (۶) [illegible] (۷) [illegible]
(۸) مثنوی [illegible] (۹) [illegible] (۱۱) [illegible]
وغیرہ شامل ہیں۔

حیدرآباد کے ممتاز اطباء ڈاکٹروں اور ویدوں کی مشترکہ کوششوں سے انجمن اطبائے یونانی
کے زیرِ [illegible] مجلس حفظانِ صحت عامہ قائم کی گئی تھی جس کے صدر نواب مہدی نواز جنگ ناظم بلدیہ اور
[illegible] ڈاکٹر [illegible] نائب ناظم حفظانِ صحت عامہ [illegible] حکیم [illegible]
[illegible] یار جنگ، نواب منصب جنگ، ڈاکٹر [illegible] حکیم [illegible]
[illegible] حکیم سید احمد [illegible] حکیم [illegible] پرشاد وید ناظم ایورویدک،

[illegible] پابندی [illegible] کے مدیر حکیم [illegible] [illegible]

ہر جلسہ میں مولانا سید محمد صاحب پابندی سے شرکت کرتے تھے اور [illegible] [illegible] شائع ہونے والے [illegible] تحقیقی مقالات [illegible] ہوتا تھا ۔ اس جریدہ کے مدیر حکیم لطفی [illegible] نے لکھا ہے

" [illegible] [illegible] اہم

اس کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے "

۱۹۲۹ء میں [illegible] کرنے کے فوراً بعد نواب اعظم جنگ بہادر نے جو اس وقت [illegible] کالج کے پرنسپل تھے سٹی کالج میں بحیثیت استاد اُردو و فارسی تقرر کر دیا ۔ اس کے دوسرے سال ہی مولوی صاحب رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے ۔ مولوی صاحب کو پانچ فرزند ہیں سید سراج محمد، سید اعجاز محمد، سید منظور محمد، سید نور محمد اور سید ممتاز محمد اور پانچ صاحبزادیاں ہیں ۔

مولوی صاحب نے ہی درحقیقت حیدرآباد میں اُردو علم و ادب کے اشاعتی مراکز کی داغ بیل ڈالی تھی ان ہی کی کوششوں کا نتیجہ مکتبہ ابراہیمیہ اور مطبع ابراہیمیہ کی شکل میں ظاہر ہوا ۔ مکتبہ ابراہیمیہ کے زیر اہتمام [illegible] کی اشاعت کا آغاز ہوا ۔ مکتبہ ابراہیمیہ اور مطبع ابراہیمیہ کے برخواست ہو جانے کے بعد مولوی صاحب نے اُردو کے اشاعتی مرکز کے قیام کے لئے جدوجہد کی اور اس میں انھیں بہت کامیابی ہوئی جبکہ خود انھوں نے اپنا ایک مطبع اعجاز پرنٹنگ پریس کی شکل میں قائم کر دیا جو آج بھی تقریباً (تیس ۳۰ ، پینتیس ۳۵) برس سے بدستور اُردو کے ایک اشاعتی مرکز کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہا ہے ۔

سید محمد صاحب کا ۳۰ ؍ اگست ۱۹۶۳ء م ۲۴ ربیع الاول [illegible] کو انتقال ہوا ۔ [illegible] میں نماز جنازہ ادا کی گئی ۔ [illegible] حضرت سید شمس الدین صاحب قادری مرحوم [illegible] میں آئی ۔

(بشکریہ : [illegible] سید [illegible] صاحب [illegible])

عمر یافعی

علم و تحقیق کا جوہری

[illegible]

جناب عمر یافعی کی ہستی بلا مبالغہ [illegible] دمشق کی [illegible] ان کا نام [illegible] عربی ہونے کے باوجود انہیں [illegible] دمشق [illegible] کتب خانہ [illegible] صدر [illegible] لبنان کے [illegible] دیکھنے تعلق رکھتا [illegible] صاحب کی [illegible] کتب خانہ [illegible] تھا [illegible] کی [illegible] باقی [illegible] ہو کر یافعی مرحوم نے اس کتب خانہ کو [illegible] جب [illegible] کے [illegible] چار [illegible] کی [illegible] کہا جاتا تھا [illegible] متی [illegible] عمر یافعی [illegible] افسوس کہ [illegible] علم و تحقیق کا [illegible] بے مثال [illegible] باقی نہیں رہا اور نہ [illegible] عمر یافعی صاحب کے ساتھ [illegible] حضرت [illegible] صلاح بن [illegible] کو علمی [illegible] تھا وہ اپنے بڑے لڑکے عمر یافعی کی کتابیں اور مخطوطات سے ہمیشہ

[illegible] سالہا سال [illegible] سے اس کے باوجود عمر یافعی کے علمی [illegible] کی خوشی ہوئی۔ [illegible]

ملازمت سے وابستہ رہنے کے باوجود شب و روز تحقیقی کاموں میں مشغول رہتے تھے۔ [illegible]

غلط شہرت رہی کہ وہ مجرد رہے۔ حالانکہ وہ شادی شدہ تھے البتہ ان کے کوئی اولاد نہیں تھی یافعی

صاحب کی وفات ۱۹۶۱ء میں ہوئی جبکہ ان کی [illegible] سال سے [illegible] مرحوم کی بیوہ ابھی بقیہ حیات

اور اپنے اقربا کے ہمراہ گمانسی بازار میں رہتی [illegible] بعد حضرموت (یمن) سے حیدرآباد

آئے تھے۔

آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈمی [illegible] منتخب شائع کیا ہے اس

میں محترمہ ڈاکٹر زینت ساجدہ نے عمر یافعی کا بھی [illegible] تذکرہ کیا ہے بابائے اردو مولوی عبدالحق بھی

عمر یافعی صاحب کی علم دوستی اور تحقیق و تجسس [illegible] ادب و احترام کے ساتھ تذکرہ کرتے تھے ان

کی تصاویر "قومی زبان" پاکستان میں [illegible] شائع کی گئی تھیں۔

وہ کتابیں اور مخطوطات [illegible] اپنے [illegible] تھے ان کے [illegible]

مضامین [illegible]

[illegible] نظم و نثر کے [illegible]

جن سے [illegible] تحقیقی صلاحیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے [illegible]

(مشرقی [illegible] روڈ) پر رہتا [illegible]

[illegible] صاحب [illegible]

رکھتے تھے [illegible]

ہمیشہ استفادہ کیا کرتے تھے [illegible]

خاندان میں [illegible]

الیافعی [illegible] حسین بن محسن [illegible]

[illegible]

[illegible]

عبدالقادر سروری

افتتاحیہ

(مجلہ مکتبہ کا پہلا اداریہ)

ہندوستان میں دکن کی سرزمین ہی کو اُردو زبان کے ساتھ کچھ غیر معمولی اُنس معلوم ہوتا ہے زبان اُردو ابتدا اس کے ادب اور علوم و فنون کے اکثر شعبوں میں دکن کی طرف سے جو اضافے ہوئے ہیں وہ اہم بالشان ہیں قدیم اُردو کتابوں کے ذخیرہ [illegible] دکھنیات کا سرمایہ ایک [illegible] دکن کی عظمت [illegible] بغیر نہیں رہ سکتا ۔ ادبیات، قصص اور حکایات اور بعض علوم و فنون کی چیدہ چیدہ کتابیں جو دستیاب ہوئی ہیں ان سے دکن کی علمی دلچسپیوں کی قدامت کا صرف ایک خاکہ معلوم کیا جاسکتا ہے جو کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں ان کا تو کچھ ذکر بھی نہیں معلوم نہیں کہ خانگی کتب خانوں کے خزانوں میں مخطوطات دکن کتنے ایسے جواہر ریزے پوشیدہ ہیں جن سے علمی دنیا آج تک ناواقف ہے ظاہر ہے کہ جب تک اس امر کا تعین نہ ہوجائے، دکن کی حقیقی عظمت کبھی بے نقاب نہیں ہوسکتی۔

دکن کی اس قدیم علمی شغف کی وجہ کچھ تعجب نہیں کہ اس سرزمین کے باشندوں کی امن پسند اور علم دوست طبیعت تھی۔ لیکن قدیم زمانے سے مستقل اسلامی حکومتوں کا قائم ہوجانا اور سب سے بڑا سبب یہاں کے حکمرانوں کی علمی دلچسپیوں کا اُردو کے ساتھ وابستہ ہوجانا تاہم شاہان بیجاپور، شاہان بہمنیہ، قطب شاہیہ کی علمی اور ادبی سرپرستیاں اور خود ان کے کارنامے اُردو زبان کے پیدائشی دور کی تنہا عظیم الشان تحریکات ہیں اگر دکن کا تعلق اُردو زبان سے ہمیشہ

کے لیے منتقل ہو جاتا تو بھی اولیت کا فخر اور مباہات اس سرزمین کی عظمت جہاں عالم اور ادب میں رہتی دنیا تک قائم رکھتا۔

ایام ماضیہ میں شاہان مملکت حیدرآباد کی فیاض سرکار سے مشاہیر اردو کی جو قدر و منزلت کی جاتی تھی شاید آئندہ دور کے افسانوں کے لیے عمدہ مواد بن سکے۔ ایک افسانہ نگار محض اپنے شیریں زبان تصورات کے وسیلہ سے اعلیٰ سے اعلیٰ رتبہ تک پہنچ جاتا ہے! ان فیاضیوں کا تفصیلی ذکر ہمارے موجودہ مقصد سے دور رہے۔ ممکن ہے کہ مستقبل میں کسی [illegible] کی ذکر [illegible] کے لیے یہ اچھا موضوع ہو سکے۔ یہ تمام کارنامے اپنی اپنی حیثیت سے مہتم بالشان ہیں تاہم ان کی نمود اور نمائش کے فقدان نے ان کو مناسب عظمت تک پہنچنے سے روکا۔

ماضی تو خیر مردہ ہے حیدرآباد دکن کا موجودہ عظیم الشان اور زندہ جاوید علمی کارنامہ ہے جو اس کے سرپرست اعلیٰ کی بیدار مغزی اور اس کے موسسین کی مساعی جمیلہ کے اتحاد سے "کلیۃ علوم و فنون جامعہ عثمانیہ" کی شکل میں دنیا کے سامنے پیش ہے۔ ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو کے خیال کے مطابق جبکہ سارا ہندوستان ابھی اپنے علمی مطمح نظر کے پیچھے دوڑ رہا تھا حیدرآباد نے اس کو پا لیا۔ ممکن ہے کہ اردو کے ذریعہ تعلیم بنائے جانے کو بعض بزرگ ابھی تک ایک تجربہ تصور کر رہے ہوں لیکن پنجاب کے ایک مشہور ماہر فن تعلیم نے اپنے ایک تقریبی صدارتی خطبہ میں اس کو نہ صرف ایک کامیاب تجربہ بلکہ ایک ناقابل تردید حقیقت تسلیم کیا۔ حقیقت کے بے نقاب ہونے کے بعد بھی اگر احساس اجنبیت مایا نہ کسی کو فہم عامہ کے علی الرغم سمجھا دے تو کیا علاج "سخن شناس نہ ای دلبرا! خطا اینجاست"

جامعہ عثمانیہ کا وجود ہندوستان اور اردو زبان کے لیے اہمیت کی جو شان رکھتا ہے اس کا اب تفصیل چاہتا ہے۔ ہم نصاب تعلیم، پیداوار جامعہ اور طلبہ [illegible] کی طرف اشارہ کر سکتے ہیں [illegible] اس سے زیادہ سنتا ہو تو سر شیخ عبدالقادر [illegible] سابق وزیر تعلیم [illegible] سر تیج بہادر سپرو، سید سلیمان ندوی وغیرہ کی زبان سے سنا جا سکتا ہے۔ یہاں اردو مقام افراد کی جہت سے آزاد ہو کر ایک مکمل علمی زبان کی شکل اختیار کر چکا ہے۔

ڈاکٹر سپرو کا خیال کس قدر صحت پر مبنی ہے کہ جامعہ کے قیام سے حیدرآباد میں ایک اعلیٰ علمی فضا پیدا ہو رہی ہے قابلیت کی وہ چنگاریاں جو مرکزِ سعی کے فقدان کے باعث کچھ عرصہ تک زیرِ خاک دبی پڑی تھیں اب شعلہ زن ہوا چاہتی ہیں اور یقین ہے کہ ملک میں بھی مشعل بردارِ علم و ادب ہوں گی۔

اس میں شک نہیں کہ حیدرآباد کی علمی ترتیب اور فضا کا سب سے بڑا سرکاری سبب تو جامعہ عثمانیہ ہی ہے تاہم اس کے اطراف بہت سے معاون علمی اداروں کی ضرورت ناقابلِ نظرانداز ہے ان کے بغیر ملک کی اصلی حقیقی اور عمومی علمی فضا کا حال معلوم نہیں ہو سکتا۔ یہی ایک ایسا احساس تھا جو ہماری اس انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ کو وجود میں لانے کا باعث ہوا۔ جس کی زبان زیرِ نظر رسالہ ہے اس انجمن کے اغراض و مقاصد پروفیسر میکیلن کے قائم کردہ ادارے کی طرح ملک میں اعلیٰ علمی فضا پھیلانا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کے ذریعہ مشرقی اور مغربی علوم و فنون کے قدیم اور جدید جواہر پاروں کو اردو میں مستقل طور پر منتقل کرنے کی سعی بلیغ کی جا رہی ہے تاہم ان سرچشموں سے سیراب ہو جانے کے بعد بھی بادیہ پیمایانِ مراحلِ علم و ادب کے لئے ایک آخری مرحلہ اور باقی رہ جاتا ہے جس کے طے کرنے کے لئے ترجمہ کا واسطہ محض ناکافی ہے یہ آخری مرحلہ طبعزاد تصنیفات اور اپنے ملک کے مضامین پیدا کرنا ہے اور اگر غور سے دیکھا جائے تو یہی ترجموں کی بھی علتِ غائی ہے۔ اسی قسم کی پیداوار پر ملک اور قوم کی اصلی عظمت کا دار و مدار ہے۔ تراجم درحقیقت ان بنیادوں کے مشابہ ہیں جن پر طبعزاد مصنفات کی بڑی بڑی سربفلک اور خوبصورت عمارتیں تیار ہو کر جہانِ علم و فن کی رونق اور شہرت کا باعث بنتی ہیں انجمن مکتبہ ابراہیمیہ کا بڑا مقصد ملک کے قابل انشا پردازوں کے منتشر مطبوعہ کارناموں کو فراہم کر کے ان کی اشاعت کرنا، قابل مصنفین کی علمی کاوشوں کو مطبوعات کی شکل میں ملک اور قوم سے روشناس کرانا اور علم دوست حضرات کو ایک جگہ جمع کر کے ایک ایسی اکاڈیمی کے رشتہ مشترک میں منسلک کرنا ہے جو ملک

کے مشہور علماء پر مشتمل اور مختلف علمی شعبہ جات پر منقسم ہو اور جو اپنے میر مجلس اور میر شعبہ کے ما مشاغل علمی کو جاری رکھے۔ مکتبہ سے شائع ہونے والی کتابوں کا انتخاب بھی انہی کے تفویض؛

خدا کا شکر ہے کہ اس کی استعانت نے انجمن کی اس دیرینہ خواہش کو پورا کیا۔ مکتبہ اب نہ ملک کے بہترین دماغوں کی پیداوار کی نشر اور اشاعت میں مصروف بلکہ جدید انشا پردازوں کو بھی علمی دنیا سے روشناس کرانے میں مشغول ہے انجمن مکتبہ ابراہیمیہ نے اپنی محدود عمر کے دوران میں جو کچھ بھی کیا اس کا بیان تفصیل کا محتاج ہے تاہم اس کی مطبوعات جدیدہ پر ایک نظرِ باز گشت نامناسب نہ ہوگی۔

(۱) جواہر کلیات نظیر	(۲) مبادی فلسفہ	(۳) اُردو کے اسالیب بیان
(۴) تنقیدی مقالات	(۵) سلسلہ حمایت الحساب	(۶) معلومات دہی
(۷) رُوحِ تنقید	(۸) خیابانِ اُردو	(۹) دنیائے افسانہ
(۱۰) سلطان محمود غزنوی کی بزمِ ادب	(۱۱) تنقیدی مقابلہ (زیرِ طبع)	(۱۲) آثار الکرام عصادل
(۱۳) قاموس الاغلاط (زیرِ طبع)	(۱۴) دکن میں اُردو	(۱۵) اسوۂ حسنہ
(۱۶) جغرافیہ ریاست حیدر آباد	(۱۷) فورٹ ولیم کالج کے اربابِ قلم (زیرِ طبع)	

انجمن مکتبہ ابراہیمیہ نے اپنی بنیادوں کو زیادہ استوار کرنے کے لیئے اپنے آپ کو سرکار عالی کی انجمن ہائے امداد باہمی ملک سرکار عالی سے متعلق کر کے اپنا ایک مستقل وجود قائم کر لیا ہے مکتبہ کے اوّلین محسن مولوی مرزا مظفر بیگ صاحب نے جن آرزوؤں اور تمناؤں کو اپنے دل میں جگہ دیئے ہوئے انجمن کی بنیاد ڈالی تھی اس میں خاطر خواہ کامیابی خود موصوف کے استقلال، عزم اور ان کے اوّلین معاون مولوی غلام رسول صاحب (سٹی کالج) اور پھر مولوی عبد الحق صاحب منتظم کی کوششوں کے مستقل ارتقاء کا نتیجہ ہے جس کے لئے یہ حضرات قابلِ مبارک باد ہیں۔

مذکورۂ بالا اغراض اور مقاصد کی تکمیل کے لئے ایک علمی اور ادبی مجلّہ کا اجرا بھی عرصہ سے انجمن کے پیش نظر تھا جو اس کے علمی، ادبی اور تعلیمی مشاغل کا ترجمان ہو ملک میں ایک اعلیٰ علمی اور ادبی

فضاء علم کے پیدا کرنے میں معاون ہو اور اپنے مولد و منشاء کے علمی اور ادبی خصوصاً قدیم کارناموں کی حقیقی عظمت کو بے نقاب کر سکے۔ انجمن کتب کی اس خواہش کے عملی جامہ پہننے سے عرصہ دراز قبل جن علم دوست بزرگوں نے فراخ دلی کے ساتھ مشورے دیئے اُن کا مجلّہ مکتبہ شکر گزار ہے۔ مولوی سید غلام محی الدین صاحب قادری ایم۔اے، ایم آر۔اے۔ایس، ایف آر۔ایس۔اے کا شکریہ بھی بہر حال واجب ہے جو اس رسالے کے مؤسسین میں شامل ہیں اور جو اپنی تعلیمی مصروفیتوں کے باوجود انگلستان سے بھی مدد کا ہاتھ رسالہ کی طرف بڑھانے کے لئے ہر وقت تیار ہیں۔

انجمن کتبہ ابراہیمیہ سے رسالہ کے اجراء کے خیال کا علمی حلقوں میں جس تپاک کے ساتھ خیر مقدم اور اطمینان کے ساتھ استقبال کیا گیا انجمن کے اعتماد اور "مقبولیت علم" کا ترجمان ہے حقیقت میں جن عناصر پر عام رسالوں کی حیات و ممات کا مسئلہ منحصر رہتا ہے اُن سے "مجلّہ مکتبہ" بے نیاز ہے۔ عام طور پر یہ مشہور رہے کہ حیدرآباد کی فضاء علمی مجلّوں کی زندگی کے لئے ناموزوں ہے۔ جہاں تک ہمارا تجربہ ان معاملات میں دستیاری کرتا ہے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ صورت عموماً شخصی اور ماہواری مجلّوں کو پیش آتی ہے اور ہر جگہ پیش آتی ہے کیونکہ جب تک کسی چیز کے وجود اور عدم کا دار و مدار محض شخصی دلچسپی پر ہوگا۔ جلد یا دیر میں اس کا انجام ضرور ناکامی ہے جدت پسند انسان کی طبیعت کا یہ خاصہ ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد وہ فطرتاً ہر ایک چیز سے اُکتا جاتا ہے بس یہی مجلّہ کی موت کا پیغام ہے اس میں ماہواری مجلّہ کی خصوصیت یہ ہے کہ جب تک کہ لیتھوگرافی کی سست رفتاری اُردو مطابع کی ہمدم ہے ذرا سی رکاوٹ کبھی رسالہ کو وقت سے مہینوں پیچھے ڈال کر رہے گی۔

"مجلّہ مکتبہ" کے اجراء کی غرض و غایت ہم نے اوپر بیان کر دی ہے جدید علوم و فنون کی ترویج اعلیٰ ادب لطیف کی تخلیق اور عام محققانہ مضامین کے ساتھ ساتھ دکھنی لٹریچر پر تحقیقی نظر ڈالنا اس کے مطمح نظر ہوگا۔ ہر شعبہ کے علم و فن کے مضامین اس میں درج ہوں گے سیاسیات کے محض نظریہ اور غیر دلخراش مذہبی مضامین ناقابل اندراج نہیں

"مجلّہ مکتبہ" تمام دلچسپی لینے والے مہربانوں میں مولانا سید غلام مصطفےٰ صاحب ذہین حیدرآبادی

مولانا سید مختار احمد صاحب، مولوی سید عبدالمنعم صاحب سعیدی بی اے ایل ایل بی (عثمانیہ) مولوی سید تمکین صاحب کاظمی۔ مولوی ابو محمد عمر بن صلاح الیافعی صاحب (سابق پبلشر مجلہ انجمن ارباب اُردو سرور نگر) مولوی سید محمد صاحب قادری بی اے کی عنایت اور مشوروں کا شکریہ اپنا خاص فرض سمجھتا ہے

مجلہ مکتبہ جلد (۱) شمارہ (۱) خورداد ۱۳۳۷ ف م اپریل ۱۹۲۸ء

سلسلہ صـ ۲۰

علاوہ کئی جامعات کے اکیڈیمک کونسل و سینیٹ کے رکن اور مجلس نصاب وغیرہ کے رکن رہے نیز ساہتیہ اکیڈیمی مجلس اصطلاحات جامعہ عثمانیہ، انجمن مجلس علمیہ، جامعہ عثمانیہ اور اُردو انسائیکلوپیڈیا ادارہ ادبیات اُردو کے بھی سرگرم رکن رہے۔

سروری صاحب مکتبہ ابراہیمیہ کے نائب صدر تھے اس کے بانی مرزا مظفر بیگ اور صدر یار جنگ تھے جب کہ نائب صدر ڈاکٹر زور اور پروفیسر سروری صاحب، زور صاحب ہاشمی، نظم اور مولوی عبدالحق کی اکثر تصانیف وتالیفات، کلیات و دیوان، تاریخ ادب یہاں سے شائع ہوئیں۔ مکتبہ ابراہیمیہ کے جاری کردہ مجلہ مکتبہ کے وہ شروع سے آخر تک ایڈیٹر رہے۔ مکتبہ کے ذریعہ جامعہ عثمانیہ کے ہونہار سپوتوں کو آگے بڑھنے کا موقع ملا۔ مجلہ مکتبہ طلباء کے خیالات افکار کا آئینہ دار تھا۔ مجلہ مکتبہ کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرون ہند سے بھی اس کے بھجوائے جانے کی فرمائشیں آتی رہتی تھیں۔ چنانچہ زور صاحب نے خود لندن سے سروری صاحب کو لکھا تھا کہ اس رسالے کو لندن میں لوگ شوق سے پڑھتے ہیں لہذا اس کی ۲۵ کاپیاں بھجوائی جائیں۔ (مورخہ ۷ر ستمبر ۱۹۲۸ء از لندن)

جناب میر محمود علی ایم اے لکچرار سٹی کالج

نواب نظام علیخاں کے تعلقات انگریزوں کے ساتھ

حیدرآباد اور انگریزوں کے درمیان تعلقات کی ابتدار نواب صلابت جنگ کے زمانے سے ہوتی ہے ۔ ۱۷۵۶ء میں انگلستان اور فرانس میں جنگ چھڑ جانے کی وجہ سے انگریزی فوجیں شمالی سرکار سے فرانسیسیوں کو بیدخل کردیتی ہیں اس لئے موخرالذکر کی تائید میں صلابت جنگ اول تو مقابلہ کے لئے نکلتے ہیں لیکن مصلحت سمجھ کر کرنل فورڈ کی عرضداشت مورخہ ۱۴ مئی ۱۷۵۶ء کو منظور کرلیتے ہیں جس کے مطابق بطور جاگیر مچھلی پٹنم اور دیگر اضلاع انگریزوں کو دیئے جاتے ہیں ؎۱

آصف جاہ ثانی کی تخت نشینی کے چار سال تک انگریزوں اور سلطنت آصفیہ کے درمیان غالباً نہ تو کوئی دوستانہ تعلقات کا سلسلہ رہا اور نہ مخالفانہ ۔ البتہ ۱۷۶۵ء میں انگریزوں نے بنگال بہار اور اڑیسہ کی دیوانی کے لئے شہنشاہ دہلی سے فرمان حاصل کیا تو اسی فرمان میں انھوں نے بالا ہی بالا شاہ عالم ثانی سے شمالی سرکاروں کے متعلق بھی اجازت حاصل کرکے اس پر قبضہ کرلیا ۔ جب اس کی اطلاع حیدرآباد پہونچی تو آصف جاہ ثانی کو بہت غصہ آیا اور فوج کشی کی تیاریاں کی گئیں کہ انگریزوں کو جبراً اس علاقہ سے خارج کردیا جائے ۔ لیکن پلاسی کے فاتح ابھی ہر میدان میں کود پڑنے کے لئے تیار نہیں تھے ۔ انہوں نے دب کر سات لاکھ روپیہ سالانہ خراج اور بوقت ضرورت خراج گزار کی حیثیت سے کچھ امدادی فوج دینے کا عہد کرلیا اور ان شرائط پر

؎۱ صفحہ ۲۴۵ AITCHISON'S COLLECTION OF TREATIES ETC.-

ذالب نظام الملک نے وہ سرکاریں انہیں کے قبضہ میں رہنے دیں"[1]

مندرجہ بالا عہد نامہ ۱۲ نومبر ۱۷۶۶ء کو نواب آصف جاہ ثانی اور کمپنی کے درمیان ہوا تھا اس کی ابتدائی دفعات میں باہمی امداد دوستی و اتحاد کے عہد و پیمان کے علاوہ الور۔ سکاکول۔ راجمندری مصطفیٰ نگر اور معطفٰ نگر کی سرکاریں اس شرط پر بطور جاگیر دینے کا ذکر ہے کہ "کمپنی امدادی فوج یا اس کے معاوضہ میں (۷) لاکھ روپیہ سالانہ ادا کرے گی"

اس عہد نامہ کی دفعہ چار میں سرتعفی نگر (گنٹور) کے متعلق صاف طور پر الفاظ موجود ہیں کہ یہ سرکار نظام کے بھائی بسالت جنگ کی جاگیر ہے۔ کمپنی اس امر کا وعدہ کرتی ہے کہ بسالت جنگ کے حین حیات یا بغیر آصف جاہ ثانی کی خوشنودی کے وہ اس پر قبضہ نہیں کرے گی" (عہدنامہ ۱۷۶۹ء دفعہ ۴)۔ باایں ہمہ انگریزوں نے یہ روپیہ کئی سال تک ادا نہیں کیا اور مختلف عذرات کی بناء پر لیت و لعل کرتے رہے نیز نواب نظام الملک کی میسور سے جنگ چھڑی تو اس میں حسب معاہدہ امدادی فوج بھی نہ بھیجی"[2]

۱۷۶۸ء میں انگریزوں اور سرکار نظام کے مابین دوامی دوستی اور اتحاد کے نام سے دوسرا عہد نامہ ہوا جس میں نواب کرناٹک بھی شریک تھے۔ اس عہدنامے کی رو سے نواب آصف جاہ ثانی نے وہ تمام اسناد جو سابق صوبیداران دکن نے حیدرعلی کو عطا کئے تھے منسوخ قرار دیئے اور سات لاکھ روپیہ خراج کے عوض کرناٹک بالاگھاٹ کی دیوانی کمپنی کو عطا کی اور شمالی سرکار کی مقررہ رقم میں تخفیف کی۔ فوج امداد باہمی کی ترمیم اس طرح پر ہوئی کہ وقت ضرورت کمپنی دو بٹالین (BATTALION) فوجوں اور توپوں سے مدد کرے گی بشرطیکہ سرکار نظام اس فوج کے اخراجات ادا کرے اور کسی ایسے شخص کے خلاف اس فوج سے کام نہ لے جو انگریزوں کا حلیف ہو۔[3]

اس عہد نامہ فورٹ سینٹ جارج کی دفعہ (۷) کا خلاصہ یہ ہے کہ "شہنشاہ شاہ عالم ثانی نے کرناٹک

---

[1] تاریخ ہند مولفہ ہاشمی صاحب جلد چہارم۔ صفحہ ۱۷

[2] تاریخ ہند مولفہ ہاشمی صاحب جلد چہارم صفحہ ۱۷

[3] AITCHSON VOL IX : صفحہ ۱۳۲

گھاٹ پر نواب والاجاہ اور ان کی اولاد کی دوامًا حکومت کے لئے فرمان نافذ کیا ہے۔ اور خود سرکار م نے بھی نواب والاجاہ اور ان کی اولاد کو دکن کی ماتحتی سے سبکدوش کیا ہے۔ لہٰذا نواب آصف جاہ ثانی اس علاقہ میں مداخلت کا کوئی حق نہ ہوگا۔" (عہدنامہ سینٹ جارج دفعہ ۷) [1]

اس عہدنامہ کے بعد ۲۲ مارچ ۱۷۶۸ء کو آصف جاہ ثانی سے شہنشاہ دہلی کے فرمان کا حوالہ دے کر ہد سکھوں، مقدموں اور باشندوں کے نام اطلاع نامے بھیجے تھے کہ "پانچوں شمالی سرکاروں پر کمپنی دائمی قبضہ اور ملکیت اور ممالک کرناٹک اور بالاگھاٹ و پائیں گھاٹ کی دوامًا دیوانی کا حق کمپنی کو تفویض ہو جاتا ہے۔ لہٰذا تمھیں کمپنی کی اطاعت گزار رعایا بن کر رہنا چاہیئے۔" [2]

اس طور پر معاملات چل رہے تھے کہ ۱۷۷۹ء میں آصف جاہ ثانی کے بھائی بسالت جنگ نے حیدر علی کے ڈر سے خائف ہو کر گنٹور کو پٹہ پر انگریزوں کے حوالہ کرنے کے لئے رضامندی ظاہر کی اور انگریزوں نے حیدر علی کے حملہ سے ان کو بچانے کا وعدہ کیا تھا۔ [3]

حکومت مدراس نے بغیر آصف جاہ ثانی کی منظوری کے بسالت جنگ سے اس قسم کا عہدنامہ کر کے ترجمان ہالینڈ کو سفیر بنا کر حیدرآباد روانہ کیا تھا تاکہ آصف جاہ ثانی کو سمجھائے کہ یہ عہدنامہ فرانسیسیوں کے خطرے کی احتیاط کے لئے کیا گیا ہے اس لئے سابقہ عہدنامہ کے خلاف نہ سمجھا جائے لیکن مسٹر ہالینڈ کی سفارت ناکامیاب ثابت ہوئی اور آصف جاہ ثانی کے قہر و غضب کا باعث ہوئی جس کی وجہ سے انگریزوں کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ [4]

فی نفسہ اس قسم کا عہدنامہ ۱۷۶۸ء کے معاہدہ کی ایک عہدشکنی تھی جس کو تسلیم کرنے سے آصف جاہ ثانی نے قطعًا انکار کیا۔ اس لئے مجبورًا کلکتہ کی حکومت اعلیٰ نے اس معاہدہ کو منسوخ قرار دیا اور ضلع گنٹور

---

[1] عہدنامہ نمبر ۷ ص جلد پنجم
[2] جلد پنجم صفحہ ۱۱۵۹
[3] فٹ نوٹ صفحہ ۴۷
[4] جلد اول صفحہ ۸۹

AITCHISON. VOL V
HISTORICAL SKETCH
HOLLINGBERY

جو اس دوران میں نواب کرناٹک کو دس سال کے لیے پٹہ پر دیا گیا تھا سرکار نظام کے عہدہ داروں کو واپس کر دیا۔ [1]

اس واقعہ کے تین سال بعد ۱۷۸۲ء میں بسالت جنگ کا انتقال ہو گیا لیکن آصف جاہ ثانی نے مزید پانچ سال تک گنٹور کو انگریزوں کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔ وجہ یہ تھی کہ سابقہ عہدناموں کے مطابق جو خراج کی رقم آتی تھی اس کی بقایا انگریزوں کے ذمہ بہت زیادہ رہ گئی تھی اس سے قبل ہی مدراس کے گورنر لارڈ میکارٹنی (MACARTNEY) نے آصف جاہ ثانی کی خدمت میں ایک تفصیلی خط دوستی اور اتحاد اور آصف جاہ ثانی کی تعریف کرتے ہوئے ایک مضمون کا بھیجا تھا کہ "آئندہ سے آپ کی پیشکشی کی رقم پابندئ وقت کے ساتھ بھیجی جائے گی" [2] مگر جب حسب حال شمالی سرکاروں کی پیشکش کے متعلق کمپنی اور سرکار نظام کے تعلقات کھنچے رہے تو لارڈ کارنوالس نے بالآخر ۱۷۸۸ء میں کیپٹن جان کنوے (KENNAWAY) کو رزیڈنٹ بنا کر حیدرآباد بھیجا تاکہ کمپنی کے ذمہ جو خراج کی رقم بقایا ہے اس کا تصفیہ ہو جائے اور کمپنی کو ضلع گنٹور مل جائے۔ ضلع گنٹور کے مطالبہ کی تکمیل تو ہو گئی کیونکہ اس مطالبہ کے ساتھ گورنر جنرل نے فوجی تیاریاں کی تھیں۔ لیکن خراج کی بقایا رقم کا تصفیہ حیدرآباد میں نہ ہو سکا اس لیئے فریقین کی رضامندی سے اس معاملہ کا تصفیہ گورنر جنرل کے فیصلہ پر چھوڑ دیا گیا۔ اور آصف جاہ ثانی کی طرف سے بطور نمائندہ میر ابوالقاسم (میر عالم) کو کلکتہ بھیجا گیا [3]

گنٹور کی واپسی اور پیشکش کی ادائی کے جھگڑے بسالت جنگ کی وفات ۱۷۸۲ء سے چلے آ رہے تھے جس کا نتیجہ یہ تھا کہ سرکار نظام اور کمپنی کے تعلقات میں ایک قسم کی کشیدگی پیدا ہو گئی تھی اس معاملہ میں مسٹر گرانٹ رزیڈنٹ حیدرآباد کو ۱۷۸۴ء میں اس لیے مستعفی ہونا پڑا کہ انہوں نے دربار دکن پر بیجا دباؤ ڈالنے سے انکار کیا تھا اور اس کی جگہ مسٹر جانسن کو رزیڈنٹ بنا کر حیدرآباد بھیجا گیا تاکہ وہ دربار دکن

---

[1] جلد اول صفحہ ۸۹ HOLLINGBERY

[2] جلد اول صفحہ ۸۹ HISTORICAL SKETCH

[3] ... OUR FAITHFUL ALL ... ... HON ...

پیر دیا تو ڈال کر جلد ان معاملات کا تصفیہ کرالیں ۔ آصف جاہ ثانی نے دوران گفتگو میں یہ تحریک پیش کی تھی کہ "مناسب معاوضہ اور بطور تحفہ ایک کروڑ روپیہ لیکر شمالی سرکار اور کرناٹک کے علاقے ان کو واپس کر دیئے جائیں۔" مسٹر جانسن نے بھی اس تحریک کی پرزور تائید کی تھی مگر جب گورنر جنرل کی کونسل نے مجلس نظماء سے اس کی نسبت استفسار کیا تو انہوں نے مسٹر جانسن کو نشانۂ ملامت بنایا اور ۱۷۸۵ء میں مسٹر جانسن کو بھی اس جرم کی پاداش میں خدمت سے علیحدہ کردیا گیا۔

بالآخر بہ حیثیت سفیر جب میرعالم کلکتہ پہونچے تو تصفیہ یہ ہوا کہ سرکار نظام کی پیشکش کی رقم سرسٹھ لاکھ انچاس ہزار تین سو تینتیس روپے کمپنی کے ذمہ واجب الادا قرار پائی اور کمپنی نے سرکار نظام سے گنٹور کی سابقہ مالگزاری کا مطالبہ بسالت جنگ کی وفات ۲۵ ستمبر ۱۷۸۲ء سے اس کی واپسی کی تاریخ ستمبر ۱۷۸۸ء تک کیا جس کی مجموعی رقم اٹھاون لاکھ بتیس ہزار چھ سو سرسٹھ روپیہ پانچ آنہ قرار دی گئی۔ اول الذکر رقم سے سابق الذکر رقم کے منہا کرنے کے بعد کمپنی کے ذمہ جو رقم واجب الادا قرار پائی وہ نو لاکھ سولہ ہزار چھ سو پینسٹھ روپیہ گیارہ آنہ تھی اس طور پر میرعالم کی سفارت کامیاب ثابت ہوئی اور تمام جھگڑوں کا فیصلہ ہوگیا[1]

۷ جولائی ۱۷۸۹ء کو لارڈ کارنوالس نے نواب نظام علی خاں بہادر کی خدمت میں ایک خط بھیجا۔ اور اپنی مجبوری کا اظہار کیا کہ قانون ۱۷۸۴ء کی وجہ سے وہ کسی ریاست کے ساتھ جدید معاہدہ کرنے سے مجبور ہے اور اطمینان دلایا کہ حکومت برطانیہ کے ذمہ اس خط کی تائید ایک باقاعدہ عہدنامہ کے مساوی سمجھی جائے گی چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ ۱۵ مارچ ۱۷۹۲ء کو پارلیمنٹ میں ایک تحریک پیش ہوکر اس خط کو ایک معاہدہ کی حیثیت دی گئی۔

اس طویل خط میں لارڈ کارنوالس نے اپنی اور سرکار نظام کی دوستی اور اتحاد اور دیگر امور معاملات کا ذکر کرتے ہوئے ۱۷۶۸ء کے عہدنامہ کی دفعہ ششم کی خاص طور پر توضیح اور تشریح یہ

---

[1] OUR FAITHFUL ALLY - THE NIZAM صفحہ ۳۷

۱۷۹۰ء

بیان کی تھی کہ "جب کبھی سرکار نظام ضرورت ظاہر کریں تو فوج بھیجی جائے گی بشرطیکہ اس فوج سے کسی ایسی ریاست کے خلاف کام نہ لیا جائے جو کمپنی کی حلیف ہو" حلیفوں کے نام حسب ذیل تھے پنڈت پردھان پیشوا، راگھوجی بھونسلہ، مادھوجی سندھیا اور دوسرے مرہٹہ سردار، نواب ارکاٹ، نواب وزیر (اودھ)، راجہ ٹراونکور اور راجہ تنجور۔ اس تصریح کے بعد تعلقات کی نوعیت میں فرق ہوگیا اور اب کوئی رکاوٹ بھی نہیں رہی۔ سرکار نظام اس فوج سے ہر وقت حسب دلخواہ کام لے سکتے تھے بشرطیکہ مذکورۂ بالا ریاستوں کے خلاف اس فوج سے کام نہ لیا جائے۔ اس خط میں کارنوالس نے کمپنی کے حلیفوں کے جو نام لکھ کر آصف جاہ ثانی کے پاس بھیجے تھے اس میں ٹیپو سلطان کا نام درج نہ ہونا اور میسور کے خلاف باوجود ۱۷۸۴ء کے عہد نامہ صلح کے برقرار رہتے کے جارحانہ اتحاد قائم کرنا یہ ایسی باتیں تھیں جو ٹیپو سلطان کے لئے نہ صرف باعث اشتعال بلکہ باعث خطرہ بھی تھیں اور یہی وہ اسباب تھے جو دراصل میسور کی آئندہ جنگ کا باعث ہوئے۔ لہ

مجلہ مکتبہ جلد (۱) شمارہ (۲) بابتہ ماہ تیر ۱۳۳۷ف م مئی ۱۹۲۸ء

لہ صفحہ ۵۵، ۵۶ MALLCLM'S POLITICAL HISTORY OF INDIA VOL I

سلسلہ صفحہ ۶۹

سے اپنے جھنڈے پر اس روٹی کا گول نشان بنوایا اور پیلے رنگ کا جھنڈا نشان آصفی قرار پایا۔ چنانچہ اب تک یہی عمل درآمد ہے۔ سر افسر الملک مرحوم سابق سپہ سالار افواج آصفیہ کے زمانے میں اس میں کچھ تبدیلی کی گئی۔ اوپر اور نیچے کی طرف دو سبز پٹیاں جھنڈے کی تزئین کے لئے لگادی گئیں اور روٹی والے حصے کے بیچوں بیچ تاج آصفی کی شکل اتاری گئی ــــ

سبب

مجلہ مکتبہ جلد (۸) شمارہ (۲) بابتہ ماہ دی ۱۳۴۱ف مطابق نومبر ۱۹۳۲ء

نظم

جناب محمد خیر الحسن عزت
بی اے۔ ایچ سی ایس

چاندنی رات اور حسین ساگر

دس بجتے ہیں لو دُور سے وہ گھنٹے کی آواز آنے لگی
اور شہر کی ساری وسعت پر خاموشی شب کی چھانے لگی
گنّے کی سڑک پر لوگوں کی اب آمد و شد باقی نہ رہی
تالاب کے صدقے ہو ہو کر "لوکل" بھی اب خاموش ہوئی
آواز فقط بجلی گھر کے انجن کی دوَر سے آتی ہے
یا رستے کی خاموشی کو کوئی موٹر چیرتے جاتی ہے

شب چاردہم، بے ابر سما، خاموش فضا اور نرم ہوا
تالاب کا منظر سحر آگیں، مہتاب کا عالم ہوش رُبا
وہ چاند ہیں جن کی طلعت سے یہ کیفیت مہتاب میں ہے
اک ابنِ فلک پہ جلوہ نما اک روشن اس تالاب میں ہے

تالاب کے فرشِ بلوریں پر مہ رخوں نے دھوم مچائی ہے
کوئی رقص میں تنہا جاتی ہے کوئی سب کو چھیڑتی آتی ہے
یہ تیر رہا ہے عکس مہ یا منت کی کوئی تھالی ہے
جس میں ہے چراغ ارمانوں کا اور پھولوں کی اک ڈالی ہے
یا کوئی فرنگن زہرہ جبیں تنگ قبا و طفل نما
یہ فنتاں یہ ہے سیکھ رہی اندازِ خرامِ اسکیٹنگ کا

اے بحرِ زلال اے آبِ حیات، اے نور کے تالاب آج ترے
آئینہ میں خوبانِ فلک ہیں جلوہ اپنا دیکھ رہے
میں تجھکو سرور و فرحت میں تسنیم کہوں، کوثر لکھوں
اصرار مگر اس بحر کا ہے کہ تجھکو حسین ساگر لکھوں
کیا حسن و جمال عالم کا تیری موجوں میں تلاطم ہے
ماہ و انجم سے بھی خوشتر یہ عکس ماہ و انجم ہے
کسی اہلِ دل سے اندازہ پوچھے تیرے اس منظر کا
وہ ناپ کا پیمانہ بھی گیا تیرے حسن کو تولے گا

کچھ حاصل لطف و سرور کریں، یہ وقت ہزار غنیمت ہے
تہذیب پڑی سوتی ہے اور فطرت کا عہدِ حکومت ہے
چھپ جائیگا یہ حسنِ فضا خورشید نظر جب آئے گا
اور پھر بازارِ مکر و ریا دنیا میں گرم ہو جائے گا

(باقی ص۴۲ پر)

اعجاز علی صاحب شہرتؔ

نظم

گولکنڈہ

دیکھو او سیاح آہستہ قدم رکھنا یہاں تاجدارانِ دکھن ہیں خفتگانِ زیرِ خاک
تو بھی دو آنسو بہائے گا اگر فرزانہ ہے

ہیں یہ سب برج و فصائل شانِ رفتہ کی گواہ اور انکے گرد گہری خندقیں غار و مغاک
گنبدِ رنگیں میں اب بھی شوکتِ شاہانہ ہے

مسندِ زریں نہ قالیں ہیں نہ خادم با ادب اور ہر ویراں عمارت کا ہے حال اندوہناک
اب یہی قصرِ معلّے ہے یہی کاشانہ ہے

اب نہ درباں ہیں نہ حاجب ہیں نہ حاضر چوبدار جس کا جی چاہے چلا آئے یہاں بے بیم و باک
اب یہاں رکھا ہی کیا ہے ہر طرف ویرانہ ہے

اس بلندی پر یہ پستی کیا خدا کی شان ہے شب کو تھا لطفِ گلستاں صبح سے اڑتی ہے خاک
آج آئے کل چلے دنیا مسافر خانہ ہے

خلق کو حاصل تھی جن سے نعمتِ خوانِ خلیل آج ہیں وہ فاتحہ کے واسطے محتاج کاک
اعتبارِ دہر کیا بازیچۂ طفلانہ ہے

تیغ شاہِ کامراں مٹی میں زنگ آلود ہے　　دولت و جاہ و حشم سے ہو گیا ہے انفکاک
موت سے مغلوب جوشِ ہمتِ مردانہ ہے
بزمِ عشرت جائے عبرت ہے مگر بے فائدہ　　فکرِ دنیا میں بشر کو کس قدر ہے انہماک
کھڑی ہے موت ہنسکر آدمی دیوانہ ہے

مجلہ کِتہ　جلد (۱)　شمارہ (٦)　بابتہ ماہ آبان ۱۳۳۷ف م سپتمبر ۱۹۲۸ء

سلسلہ ۲۰

چل ہمدم! اُس کشتی گھر سے ایک کشتی میں اور سیر کریں
جا پہنچیں گھر سے پانی پر، ہو جائیں جذب اس منظر میں
تو پڑھ کوئی پُر سوز غزل جس سے دل میں فریاد آئے
اور اپنے شباب و اُلفت کے کسی افسانے کی یاد آئے
میں اپنی لَے سے ساری فضا کو نغموں سے بھر دیتا ہوں
اور سادہ سُروں کے شیون سے رقت پیدا کر دیتا ہوں

مجلہ مکتبہ　جلد (۱)　شمارہ (۲)　بابتہ ماہ تیر ۱۳۳۷ف م مئی ۱۹۲۸ء

شذرات

جلد (۲)، شمارہ (۴)

(بابتہ جنوری ۱۹۲۹ء)

اعلیٰحضرت سلطان العلوم ۲۶ رجب کو کلکتہ سے مراجعت فرمائے بلدہ ہوئے۔ اعلیٰحضرت کا سفر کلکتہ خانگی اور تفریحی تھا وہاں آپ کی خوش گوار مصروفیتوں پر مقامی اور بیرونی اخباروں سے روشنی پڑ چکی ہے اس سفر میں آپ کا ایک درخشاں کارنامہ بنگال کے مفلوک الحال لوگوں کی امداد کے لئے ایک لاکھ روپیہ کا عطیہ ہے جو گورنر صاحب بنگال کو حسب صوابدید صرف کرنے کے لئے دیا گیا۔ اعلیٰحضرت کے اس سفر سے ملک اور اہل ملک کے لئے مفید اور مہتم بالشان نتائج برآمد ہونے کی توقع ہے۔

❊

اس سال حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کا نواں اجلاس، دارالبلدہ باغ عام (ٹاؤن ہال) میں ۹ اور ۱۰ اسفندار کو منعقد ہوا۔ حاضرین کی تعداد چار سو کے قریب تھی جو اکثر و بیشتر ملک کے بہی خواہان تعلیم پرشتمل تھی۔ مولوی حبیب الرحمٰن خاں شیروانی (نواب صدریار جنگ بہادر) نے عین وقت پر صدارت قبول فرماکر بڑی آسانی پیدا کردی۔ نواب فخر یار جنگ بہادر کی افتتاحی تقریر مختصر لیکن نہایت سبق آموز، اور لائحہ عمل بننے کے قابل تھی۔ آپ نے ذہنی ارتقاء اور روحانی اعتلاء کے اسباب ایک ساتھ اختیار کرنے اور آزادی اور حریت کا دم بھرنے والوں کو نمود و نمائش سے پاک رہنے کی ضرورت پر زور دیا۔ نواب صدریار جنگ بہادر نے جس قدر قلیل عرصہ میں خطبۂ صدارت کو کامیاب بنانے کی سعی کی۔ وہ نواب صاحب کی کہنہ مشقی کی دلیل ہے۔ ابتدائی حصے میں آپ نے جامعۂ عثمانیہ کے وہ درخشاں نتائج شمار فرمائے جو ہر جامعہ کے

لئے اس قلیل عرصہ میں باعث عزت ہیں۔ کاش! ملک کے ارباب حل و عقد ان نتائج کو ضائع ہونے سے بچا کر عملی طور پر ملک و ملت کے لئے مفید بنانے کی کوشش کریں۔

مولوی سید خورشید علی صاحب معتمد کانفرنس کی روئداد بھی مختصر لیکن ضروری امور پر حاوی تھی۔ اس سے یقیناً اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ کانفرنس کی اہمیت اور اس کا وزن عملاً بڑھتا جا رہا ہے۔ اختلاف پسند طبائع انانیت کو مجموعی اور ملکی مفاد کے پیچھے ڈال کر اسی کے ذریعے ملکی نظام تعلیم کی تعمیر میں حصہ لیں اور تخریبی قوتوں کو اپنوں کے بجائے غیروں کے مقابلے میں استعمال کریں تو ہم کس قدر جلد ایک مرکز تک پہونچ سکتے ہیں۔

کانفرنس کے تینوں اجلاسوں میں چند اہم تحریکات اور مفید تقریریں پیش ہوئیں۔ مولوی محمد مرتضیٰ صاحب مرحوم اولین معتمد کی یادگار میں چندہ فراہم کیا گیا۔ تحریکات میں نواب ناظر یار جنگ بہادر کی تحریک تعلیم نسواں کا نصاب اپنی ضروریات کے مطابق مرتب کرنے کے متعلق جس قدر اہم ہے اس سے ہر شخص واقف ہے۔ بابو للت موہن مکرجی بی اے، سی ای کی تحریک ملک میں اعلیٰ اور ادنیٰ پلیٹوں کی تعلیم کی جلد سے جلد ترویج کے متعلق تھی۔ کیونکہ اسی پر ملک کی آئندہ فلاح اور بہبودی کا انحصار ہے تعلیمی کتابوں کی قیمت کے تعین کا سوال بھی جو چوتھی تحریک کی صورت میں پیش ہوا، عاجلانہ توجہ کا محتاج ہے اور حقیقت میں مصنفین اور ناشرین کی سہولت سے زیادہ متعلمین کی سہولت پیش نظر ہونی چاہئیے۔ اُمید ہے کہ ارباب حل و عقد کی نظر میں اس کی اہمیت نمایاں ہو چکی ہوگی۔

جامعۂ عثمانیہ کے ایک قدیم طالب علم مولوی سید محمود عالم صاحب نے نہایت عمدگی سے مشرق و مغرب کے تمدن کا موازنہ کیا۔ اور "خذ ما صفا و دع ما کدر" کے اصول پر عمل کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ مولوی یعقوب حسن صاحب نے بھی جو اتفاق سے اس موقع پر بلدہ ہی میں قیام فرما تھے' "ہندوستانی کلچر" پر بڑی دلچسپ اور کار آمد تقریر کی یقیناً کسی خاص تہذیب و تمدن کی اشاعت میں زبان کا بہت بڑا حصہ ہے۔ ہمارے ملک میں انگریزی تہذیب کے وہی لوگ مقلد ہیں جو انگریزی زبان کے حامی ہیں۔

ڈاکٹر سید عبد اللطیف صاحب کی تقریر کا مفید موضوع یونیورسٹی کی حقیقی تعلیم اور نظام تعلیم میں موزوں

اشخاص کی ضرورت تھا۔ جو یقیناً بڑی کاوش کا نتیجہ ہے۔ دوران تقریر میں جن مفید پہلوؤں پر ڈاکٹر صاحب نے روشنی ڈالی ہے اس کا شمار بھی یہاں ناممکن ہے۔ ہماری یہ خواہش ہے کہ کاش ہم اس مسئلہ پر نہایت سنجیدگی سے غور کرنا شروع کریں۔

اس قسم کی سنجیدہ محفلوں کے کاروبار سے حاضرین کی طبیعت عموماً اکتا جاتی ہے، ایک دو نظمیں خصوصاً جبکہ خوش الحانی کے ساتھ پڑھی جائیں، بہترین وقفہ سمجھی جاسکتی ہیں اس لئے کانفرنس کے نظام میں اس کا خاص طور سے لحاظ رکھا گیا تھا۔

ہمیں امید ہے کہ آئندہ سالوں میں، کانفرنس اپنے وجود کو پچھلے سالوں سے زیادہ مفید، ملک اور ہر دلعزیز بنانے کی کوشش کرے گی۔

٭

جنوبی ہند کے سفر مدراس اور میسور کے بعد پنجاب کے مایہ ناز شاعر ڈاکٹر سر محمد اقبال نے اپنی تشریف آوری سے حیدرآباد کو بھی زینت بخشی۔ جامعۂ عثمانیہ نے جو ہند کے ارباب علم کی قدر دانی میں امتیاز رکھتی ہے آپ کے خیالات سے ملک کو فائدہ پہونچانے کی غرض سے مدعو کیا۔ چنانچہ جامعہ کی سرپرستی میں ۱۵، ۱۶، اور ۱۷ ارجنوری کو آپ کے تین لکچر مابعد الطبیعات پر (انگریزی) میں ہوئے۔ بہت سے لوگ جو انگریزی سے ناواقف بھی تھے، صرف دیکھنے ہی کی خاطر جمع ہوتے تھے۔ پانچ روز کے معروف قیام کے بعد آپ راہی وطن ہوئے۔

محمد معین الدین رہبر فاروقی

چار مینار کی سیر

یہ عمارت قطب شاہیہ حکومت کے پانچویں تاجدار سلطان محمد قلی قطب شاہ کی یادگار ہے۔ اس کے حالات قلم بند کرنے سے قبل موجودہ شہر حیدرآباد کی کچھ مختصر سی تاریخ بتلادینی ضروری ہے۔ کیونکہ شہر کی بناء باعث وجود چارمینار ہوئی۔

شہر آباد ہونے سے قبل سب سے پہلے ایک پل رود موسیٰ پر بنایا گیا اس کی وجہ یہ بتلائی جاتی ہے کہ جب گولکنڈے میں آبادی بڑھ گئی تو اکثر لوگ اس مقام پر آکر آباد ہو گئے تھے۔ رود موسیٰ بیچ میں حائل تھی۔ آمد و رفت میں سخت تکالیف درپیش ہوتے تھے تو بادشاہ کو اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ رفاہ عام اور فائدہ انام کے لئے ایک پل اس ندی پر بنایا جائے۔ پل کی تیاری کا حکم ہوا حسب الحکم کام بھی اختتام کو پہنچا۔

لیکن مورخین نے اس پل کے وجود کے متعلق ایک اور دلچسپ واقعہ لکھا ہے جب لوگ گولکنڈے سے اٹھ کر اس مقام پر آکر آباد ہوئے تو اُن میں ایک طوائف بھی تھی جو موضع چچلم (موجودہ شاہ علی بنڈے کے قریب واقع تھا) میں سکونت پذیر تھی۔ حسن و جمال میں بے مثل تھی۔ بادشاہ (ابراہیم قطب شاہ) کا فرزند (محمد قلی) اس کے زلف سیاہ کا شکار ہو گیا۔ پوشیدہ طور پر اس کے پاس آتا تھا۔ ایک روز بارش کے زمانے میں حسب عادت یہاں آیا۔ رود موسیٰ چڑھاؤ پر تھی، پار جانا مشکل تھا۔ لیکن غلبۂ عشق

ے بے چین و بے خود ہو کر ندی میں گھوڑا ڈال دیا۔ خوش قسمتی سے پار ہو گیا۔

خفیہ نویس نے اس سانحہ ہوش ربا کی بادشاہ کے جناب میں اطلاع بھیجی۔ بادشاہ بہت پریشان ہوئے ہزادے کے صحیح و سلامت بچ نکلنے پر شکر آلہی بجا لائے اور فوراً حکم دیا کہ ایک پل بہت جلد تعمیر یا جائے۔

داروغہ عمارات حکم کے ملتے ہی فوراً پل کی تیاری میں مصروف ہوا۔ نہایت اہتمام و انتظام سے آٹھ ہینے کے عرصے میں دوسری موسم بارش تک کام تکمیل کو پہنچا۔

عرض اس پل کا بارہ گز تھا اور اس میں بائیس در رکھے گئے تھے قریب لاکھ ہون کے اس کی تیاری میں صرف ہوئے۔ تعمیر پل کے بعد چار ہزار روپے باقی رہے۔ داروغہ مذکور نے بادشاہ جہاں پناہ س کا حال کہا تو حکم ہوا کہ ان کو غربا و مساکین میں تقسیم کر دیں۔ ایک شخص نے پیشگاہ سلطان میں س پل کی تاریخ "صراط المستقیم" لکھ کر گزرانی۔ بادشاہ کو یہ تاریخ بےحد پسند آئی اور اس ے صلے میں پانچ سو اشرفیاں مرحمت کیں۔ یہ پل شہر سے مغرب کی طرف واقع ہے اور اب تک "پُل قدیم" ے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

جب ابراہیم قطب شاہ کا ۹۸۸ھ میں انتقال ہوا تو محمد قلی قطب شاہ سریر آرائے سلطنت ہوا۔ ب کیا تھا! بادشاہت اپنی ہی تھی دل کے حوصلے نکالنے میں کون حائل تھا۔ شادی کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ ہر شاہ مرزا کی دختر سے نسبت قرار پائی اور ۹۹۶ھ میں بڑے تزک و احتشام سے عقد تکمیل کو پہنچا۔ شادی کے چند دن بعد ایک روز بادشاہ دارالسلطنت گولکنڈہ سے شکار کھیلتے ہوئے قلعہ سے جانب مشرق ر کوس کے فاصلے پر پہنچے۔ موسیٰ ندی کے کنارے ایک سرسبز و شاداب قطعہ دیکھا جو بےحد پسند آیا۔ حکم دیا کہ "اس جگہ شہر آباد کیا جائے۔"

پھر کیا تھا! حکم کے ساتھ ہی منجم بلائے گئے۔ ساعت نیک کی تلاش ہوئی۔ نجومیوں نے حساب یا اور ایک زبان ہو کر تاریخ و ساعت عرض کر دی۔ اُسی مقررہ ساعت میں شہر کا سنگ بنیاد رکھا گیا بادشاہ کو طوائف سے حد درجہ محبت تھی۔ اُس کی یاد تازہ رکھنے کے لئے اُسی کے نام سے اس شہر کو موسوم

کیا۔ طوائف کا نام بھاگ متی تھا۔ اسی لئے شہر کا نام بھاگ نگر ہوا۔ محمد قاسم مورخ فرشتہ کا بیان ہے کہ ستر۷۰ سال تک شہر اسی نام سے موسوم رہا۔ اس عرصہ میں بادشاہ کی محبوبہ کا انتقال ہو چکا تھا ایک روز کا ذکر ہے کہ وہ اس نام سے شرمندہ ہوا اور حضرت علی حیدر کرار ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے نام مبارک سے منسوب کر کے "حیدرآباد" رکھا۔ تعمیر شہر کے بعد اس کا تاریخی نام "فرخندہ بنیاد" رکھا گیا۔

تاریخ دکن (جو ۱۲۸۵ھ میں مطبع نولکشور سے شائع ہوئی تھی) کے مصنف عبدالحلیم نصراللہ خان صاحب نے یہ روایت لکھی ہے کہ جب شہنشاہ اورنگ زیب نے ۱۰۹۸ھ میں گولکنڈہ کی ریاست کا خاتمہ کر کے طبقۂ قطب شاہیہ کے خاتم سلطان ابوالحسن تانا شاہ کو قید کر کے اپنے ہمراہ دولت آباد لے گیا تو روانگی سے قبل شہر حیدرآباد کو دارالجہاد سے موسوم فرمایا۔

اکثر مورخین شہر کے آباد ہونے کی یہ وجہ بھی لکھتے ہیں کہ جب شہنشاہ اکبر نے دکن پر فوج کشی کی، اکبری فوجوں نے خاندیس کی ریاست اجاڑ دی اور نظام شاہی سلطنت کا چراغ ٹمٹمانے لگا، تو اس بدامنی کے زمانے میں اکثر لوگ بے خانماں ہو کر ادھر ادھر منتشر ہو گئے اور ان میں کا بیشتر حصہ گولکنڈہ کی سلطنت میں آ کر آباد ہو گیا۔ اس سے شہر (گولکنڈے) کی آبادی میں اور اضافہ ہو گیا۔ کثرت آبادی کے باعث شہر میں بیماری پھیلی اور باشندوں کو پانی کی قلت سے سخت تکلیف ہونے لگی محمد قلی قطب شاہ کو فکر ہوئی کہ کہیں دوسری جگہ شہر آباد کیا جائے۔ اس لئے موجودہ شہر حیدرآباد کا مقام منتخب ہوا۔

الغرض شہر کی بناء چار راستوں اور چار بازاروں پر قرار پائی۔ ہر ایک بازار ایک دوسرے کا ہم شکل تھا بازار نہایت وسیع اور دکانیں بہت بلند تیار ہوئیں۔ چودہ ہزار دکانیں اور بارہ ہزار محلے خانقاہ اور مدرسے، لنگر، مہمان خانے تعمیر ہوئے۔ اکثر جگہ حمام بھی بنائے گئے اور شہر کے شمالی جانب (ایک طرف خاص جگہ مقرر ہوئی) جس میں ایوان ہائے شاہی اور قصر ہائے فلک رتبہ جہان پناہ اور خانوادہ شاہی کے لئے تعمیر ہوئے۔

دکن کے مسلمان بادشاہوں میں ایک نہ ایک بادشاہ ایسا ضرور گزرا ہے جس کو تعمیر عمارات کا غایت

درجہ شوق تھا قطب شاہیہ سلاطین میں اور حالات کے قطع نظر محمد قلی قطب شاہ کا دور تعمیر عمارات کے باعث ایک درخشندہ کارنامہ ہے۔ بادشاہ ہمیشہ اس شہر کو عروس البلاد بنانے کی فکر میں رہا کرتا تھا چنانچہ اس نے اس کار خاص کے لئے ایک معتدبہ رقم مختص کر دی تھی۔ میر ابوطالب نے جو شاہ کا خزانچی تھا بادشاہ کے حضور میں ایک روز یہ عرض پیش کی کہ "جہاں پناہ! اب تک دو کروڑ روپے سے زیادہ صرف ہو چکے ہیں۔"

عربی میں ایک ضرب المثل ہے۔ اَلنَّاسُ عَلیٰ دِیْنِ مُلُوْکِھِمْ۔ (لوگ بادشاہ کے مذہب پر ہوتے ہیں) بادشاہ کے اس شوق ذوق کو دیکھ کر رعایا، شہر امرائے دولت بھی اپنی حویلیوں، مکانوں اور باغوں وغیرہ کو آراستہ کرنے لگے۔ جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ ہر ایک اپنی عمارات کو دوسرے سے زیادہ خوبصورت بنانے میں سبقت لے جانے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شہر کی آبادی میں اور چار چاند لگ گئے۔ شہر کے اطراف چاروں سمتوں میں دس دس کوس تک سرکاری باغات و عمارات کی تعمیر ہوئی۔ چار رفیع الشان کمانیں ہر ایک گوشے میں تیار ہوئیں۔ اور ہر کمان کے محاذی راستے کشادہ تیار کیئے گئے۔ چاروں کمانوں کے بیچ میں ایک ہزار گز کا میدان چھوڑا گیا اور اس میدان کے بیچوں بیچ ایک حوض تعمیر ہوا۔ جو اب گلزار حوض کہلاتا ہے (بادشاہ جہاں پناہ ماہ محرم میں اسی حوض پر تشریف فرما ہوتے تھے اور سلطنت کی ساری فوج ملاحظۂ عالی سے گذرتی تھی)

شہر کی چاروں کمانوں میں صرف دو کو زیادہ فوقیت حاصل ہے ایک مشرقی کمان تھی، اس کا نام کالی کمان رکھا گیا۔ اس پر ایک بلند نقار خانہ تیار ہوا۔ ہر صبح و شام نقارہ بجایا جاتا تھا، ساکنان شہر کے علاوہ مضافات تک اس کی آواز ادنیٰ و اعلیٰ کو سرور بخشتی تھی دوسری تیر والی کمان جو مغرب پر واقع ہے وہ محل شاہی کا خاص دروازہ تھی۔

جب شہر کی بنا پڑ چکی تو اس کے دو سال بعد ۹۹۹ھ میں اس عمارت (چارمینار) کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ دکن کے تواریخ ناقل ہیں کہ کسی شخص نے بادشاہ کے دربار میں اس کی تاریخ تعمیر "یا حافظ" لکھ کر پیش کی۔ قطب شاہیوں کا مذہب امامیہ تھا اس لئے تیمناً و تبرکاً یہ عمارت تعزیہ (تابوت) کی شکل پر تیار کی گئی۔

بعضے مورخ بیان کرتے ہیں کہ بادشاہ اس نئے شہر کو مشہد مقدس کے نمونے پر آباد کرنا چاہتا تھا اس لئے اس نے حضرت ضامن علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام کے روضے کے عوض چار مینار تعمیر کروایا۔ ایک قول یہ بھی مشہور ہے کہ ایک مرتبہ گولکنڈہ میں وبا پھیلی ہزاروں جانیں تلف ہوگئیں کئی لوگ بے خانماں ہوگئے، لوگوں نے گھبرا کر خدا سے دعا مانگی۔ کسی نے یہ رائے دی کہ تابوت اور اور پنجہ کا جلوس نکالا جائے۔ تماموں نے اس فعل کو مقدس سمجھ کر بالاتفاق قبول کیا حسب مشورہ اس طرح کیا گیا۔ حسن اتفاق سے بیماری کا زور کم ہوگیا۔ بادشاہ نے بھی اس بلائے عظیم سے نجات پانے کی خوشی میں یادگار قائم رکھنے کے لئے گچ اور پتھر سے ایک تابوت (چار مینار) وسط شہر میں تعمیر کروایا اتفاقاً ایک قلمی نسخہ جس کا نام رسالہ قطب شاہیہ اور کیفیت تیاری بلدہ و عمارات بلدۂ تھا۔ میرے مکرم دوست مولوی عمر یافعی صاحب نے مجھے مطالعہ کے لئے عنایت فرمایا تھا۔ اس میں چار مینار کی تعمیر کا ایک نیا اور دلچسپ واقعہ لکھا ہے۔

مصنف رسالۂ مذکور بیان کرتے ہیں کہ "جب شہر میں شدت کے ساتھ وبا پھیلی اور آسمانی بلاؤں سے، جب مخلوق خدا میں ایک ہنگامہ برپا ہوگیا تو جمعرات کے روز محرم الحرام کی پہلی تاریخ سنہ ۱۰۰۰ ہجری میں شہر کے بیچوں بیچ 'بڑے حسن و عقیدت کے ساتھ ایک تعزیہ بٹھایا گیا خوش اعتقادی سے بیماری کا زور کم ہوگیا۔ اور جب بادشاہ کو اس بات کی اطلاع ملی تو سلطان نے اس تابوت کو مقدس سمجھ کر، ہمیشہ اس کی یاد تازہ رکھنے کے لئے۔ یا شاید اس عقیدے سے کہ تعزیہ کی برکت سے ہمیشہ ملک آفات و بلیات سے محفوظ و مصئون رہے گا، جہاں یہ تابوت ایستادہ کیا گیا تھا پتھر اور گچ سے اسی وضع پر چار مینار کی تیاری کا حکم دیا اور اس کے ساتھ ساتھ دو لاکھ پچاس ہزار روپے کے صرفہ سے دکانیں اور کمانیں بھی تیار کروائیں۔

اس عمارت کے چار رخ ہیں۔ اور ہر ایک رخ چاروں سمتوں کے موافق بنائے گئے ہیں چونکہ عمارت مربع ہے اس لئے اس کا ہر ایک رخ (۶۰) فیٹ چوڑا اور (۴۲) فیٹ بلند ہے وسطی عمارت چار رفیع الشان محرابوں پر کھڑی کی گئی ہے [illegible] کی بلندی ۴۲ فیٹ اور عرض [illegible]

سے ہوتے ہوئے رودِ موسیٰ کی طرف گیا ہے اور جنوب کا شاہ علی بنڈہ کی جانب، مشرقی کوٹلہ عالیجاہ اور مچھلی بندر کی طرف اور مغرب کا پل قدیم کی طرف جاتا ہے بالائی عمارت دو منزلہ ہے جس کا بیرونی رُخ خوش نما محرابوں اور قسم قسم کی گلکاریوں سے مزین ہے اور چاروں طرف چار بلند مینار کھڑے ہیں ہر مینار چار درجوں پر منقسم ہے اور ہر ایک کا ارتفاع ۸۰ فیٹ ہے اور ان میناروں کی بلندی سطح ارض سے ۱۸۰ فیٹ ہے سلہ چاروں میناروں میں سے اوپر چڑھنے کے راستے بنائے گئے ہیں اور تمام سیڑھیاں مُدور ہیں اور تقریباً ان کی کل تعداد ایک سو چونتیس ۱۳۴ ہے

بالائی عمارت کی پہلی منزل پر مدرسہ آباد تھا اور دوسری پر مسجد کے قریب خزانہ آب بنایا گیا تھا۔ جس میں تالاب جل پلی سے پانی آتا تھا اور اس خزانہ سے تمام شہر اور محلات شاہی میں پانی تقسیم ہوا کرتا تھا پہلی منزل کے اندرونی حصہ کی ہر سمت میں سات سات محرابیں ہیں اور ان کے درمیان کی محرابوں میں چاروں طرف چار گھڑیالیں نصب ہیں ان کے اندراروں کو اندرونی حصے کی طرف ایک بڑے چوبی دروازے کے ذریعے محفوظ کر دیا گیا ہے اور ایک گھڑی میں چھ برقی قمقمے لگائے گئے ہیں تاکہ رات میں بھی وقت بآسانی معلوم ہو سکے۔ ان (گھڑیوں) کو ۱۳۰۷ھ ۱۸۸۹ء میں نصب کیا گیا تھا ان کے عقب میں بہت کافی جگہ موجود ہے اور اسی مقام پر مدرسہ آباد تھا۔ اس اندرونی حصے میں سولہ مدور محرابیں بنائی گئی ہیں دوسری منزل کھلی ہوئی ہے اور اس میں ایک مسجد بنائی گئی ہے۔ اس منزل کے مشرقی حصے میں پندرہ محرابیں ہیں۔ بیچ کی محراب ایک گول گنبد نما جز ہے جو مسجد کے لئے تعمیر کی گئی تھی یہ محراب دوسری چار بڑی محرابوں پر مستحکم ہے۔ مشرقی جانب کی محراب سے مسجد میں داخل ہونے کا راستہ ہے گویا یہ محراب منبر کے علاوہ مسجد کے دروازے کا کام بھی دیتا ہے اس عمارت (چار مینار) کے اکثر فوٹو اسی رُخ سے اُتارے جاتے ہیں کیونکہ یہ گنبد عمارت میں نہایت خوش نما اور بھلا معلوم ہوتا ہے اس کے بعد مسجد کی تینوں جانب یعنی شمال، جنوب اور مشرق میں کمانوں کی مسلسل قطار ہے اور ان کمانوں کی تعداد تیس ہے (یعنی ہر ہر رُخ پر دس دس کمانیں ہیں) مسجد کا صحن نہایت کشادہ اور وسیع ہے مسجد اور اس کے صحن میں کم از کم دو سو آدمی اچھی طرح نماز ادا کر سکتے ہیں۔ اصل مسجد کی پانچ کمانیں ہیں اور اس کے اندرونی حصے میں دا

سلہ مآثر دکن میں بلندی ۱۹۰ فیٹ بتلائی گئی ہے جو دکن کی قدیم تاریخوں کے دیکھنے

طاق ہیں جو شمالاً جنوباً واقع ہیں اور چار مغرب میں ہیں۔ مسجد کے اندر گچ کا فرش کیا گیا ہے فرش پر مصلوں کے نشانات بنائے گئے ہیں۔ صرف اندرونِ مسجد اکیس ۲۱ مصلے ہیں اور مسجد کے کل سولہ ۱۶ مینار ہیں۔ یہ مسجد نہایت خوش نما اور خوبصورت بنی ہوئی ہے۔ اس میں گلکاری کا بہت بہترین اور نہایت لاجواب کام کیا گیا ہے۔

مینار کے پہلے اور دوسرے درجے میں دس دس محرابیں ہیں اور تیسرے میں بارہ ۱۲ ہیں اور چوتھے درجے میں تیرہ ہیں اور اس چوتھے درجے سے اوپر اور آٹھ محرابیں ہیں اور یہ میناروں کی بالکل آخری حد ہے یہاں سے سارے شہر اور اس کے گرد و نواح کی بستیوں کے مناظر نہایت خوش نما اور دلفریب نظر آتے ہیں جو صرف دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں ان محرابوں کے اوپر چھوٹا سا گنبد بنا ہوا ہے اور ان میناروں کے بیرونی رخوں پر ایک ایک سونے کا کلس لگا دیا گیا ہے۔ اوپر سے محلات شاہی اور دیگر امراء وغیرہ کے مکانات نظر آنے کی وجہ سے عام طور پر اس عمارت پر چڑھنے کی اجازت نہیں۔

چار مینار کی تیاری میں تین لاکھ ہون صرف ہوئے۔ (ہون اس زمانے کا ایک سکہ ہے جو ساڑھے چار روپیہ سکۂ مغلیہ کے مساوی ہوتا تھا آج کل کے حساب سے سات روپیہ سے زیادہ کا ہوتا ہے) جب سلطنت قطب شاہیہ کا آخری تاجدار سلطان ابوالحسن تانا شاہ اورنگ آرائے حکومت تھا تو تاج شاہی اور تختِ سلطنت سے بے خبر ہو کر سارا راج وزراء اور عمال ملک کے سپرد کر دیا گیا تھا؟ جس کو جو سوجھی وہ کر بیٹھا جس کا ہاتھ بنا انہوں نے خزانہ شاہی کو خوب لوٹا۔ غرض یہ کہ سلطنت میں جب ظلم و تشدد کی انتہا نہ رہی اور مخلوق خدا چیخ اٹھی اور اس کی خبر دارالسلطنت دہلی کو پہنچی تو شہنشاہ ہند بگڑ بیٹھے اور ان کو رعیت کی پامالی اور مظلومیت ایک آنکھ نہ بھائی مع لشکر جرار گولکنڈے پر چڑھائی کی اور بالآخر قلعہ گولکنڈہ کو عالمگیری فوجوں کے ہاتھوں نے سر کر لیا۔ شہنشاہ اورنگ زیب تانا شاہ کو مقید کر کے اپنے ساتھ دولت آباد لے گیا۔ بعد تسخیر گولکنڈے کی ریاست سلطنت مغلیہ کا ایک صوبہ بن گئی اور سلطنت دہلی کی طرف سے اس صوبہ کا عامل بہادر دل خان کو قرار دیا گیا۔ اسی صوبہ دار کے عہد میں چار مینار کا مغربی مینار بجلی کے صدمے سے گر پڑا تو صوبہ دار موصوف نے فوراً اس

کی نیم پنجرہ وضمانت تمام کرادی۔

۱۷۵۶ء میں فرانس کا مشہور جنرل بُوسے (BUSAY) اور اس کی فوج اس عمارت کے اطراف کے باغات میں مقیم ہوئی تھی۔

۱۲۵۸ھ / ۱۸۴۲ء میں پہلی بار نواب ناصر الدولہ بہادر غفران منزل کے عہد حکومت میں اس پر ایک لاکھ روپیہ کے صرفہ سے درستی اور استرکاری کی گئی۔ اس کے بعد پھر دوبارہ ۱۲۹۷ھ / ۱۸۸۰ء میں نواب مختار الملک سر سالار جنگ اول کے عہد وزارت میں اس کی حالت خستہ ہو رہی تھی تو سید علی خاں المخاطب بہ حیدر نواز جنگ مہتمم صفائی کے اہتمام سے قریب دو لاکھ روپیہ کے خرچ سے اس کی استرکاری کی گئی۔

۱۳۰۲ھ / ۱۸۸۴ء سے چار مینار میں کسٹی افغان پولیس کا ایک دستہ متعین کیا گیا اور ۱۳۰۴ھ / ۱۸۸۶ء میں لارڈ ڈفرن وائسرائے ہند کی تشریف آوری پر اس کو لوہے کی جالی سے محصور کردیا گیا تھا اور صرف جانب شمال آمد و رفت کے لئے ایک آہنی پھاٹک لگایا گیا جو اب تک موجود تھا۔

کچھ عرصہ قبل ماہ ڈسمبر ۱۹۲۹ء / ۱۳۴۸ھ میں جب ہز اکسیلنسی لارڈ اروِن وائسرائے و گورنر جنرل ہند تشریف فرما ہوئے تو قبل تشریف آوری شہر آراستہ اور سنوارا جانے لگا اور شوارع بلدہ کی طرح محکمۂ آرائش سرکار عالی نے چار مینار کی سڑک کو بھی کشادہ کرنے کا انتظام کیا تھا چنانچہ اس نے بغرض وسعت سڑک اس لوہے کے کٹہرے (جالی) کو نکال دیا۔

جب سے کہ شہر آراستہ و پیراستہ کیا جا رہا ہے۔ اس کا منظر نہایت ہی قابل دید ہے۔ اس عروس البلاد کی آرائش، جس وقت پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے گی تو اس وقت یہ عمارت شہر کے حسن میں اور چار چاند لگائے گی، جس کا منظر بس دیکھنے ہی سے تعلق رکھے گا۔ لیکن تاہم اب بھی دور سے ایک طرف تو عثمانیہ دواخانہ اور ہائیکورٹ وسٹی کالج اور دوسرے طرف چار مینار و مکہ مسجد اپنے عجیب و غریب منظر کے لحاظ سے بڑے ہی دلفریب و دلکش نظر آتے ہیں۔ جو دیکھنے والا کی آنکھوں کو نور اور دل کو سرور بخشتے ہیں یہ نئی عمارتیں خاندان آصفیہ کے جم مرتبہ شاہ والا قدر سلطان العلوم اعلحضرت نواب میر عثمان علی خان بہادر خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ کی بے نظیر یادگاریں ہیں جو اپنا بلاد ہندمیں جواب نہیں رکھتیں۔

ملاحظہ ہو صولت عثمانی صفحہ (۲۹) مولفہ قاضی ابوالفتح محمد امیر اللہ صاحب۔

طاق ہیں جو شمالاً جنوباً واقع ہیں اور چار مغرب میں ہیں۔ مسجد کے اندر گچ کا فرش کیا گیا ہے فرش پر مصلوں کے نشانات بنائے گئے ہیں۔ صرف اندرون مسجد اکیس ۲۱ مصلے ہیں اور مسجد کے کل سو اکر منیار ہیں۔ یہ مسجد نہایت خوش نما اور خوبصورت بنی ہوئی ہے۔ اس میں گلکاری کا بہت بہترین اور نہایت لاجواب کام کیا گیا ہے۔

منیار کے پہلے اور دوسرے درجے میں دس ۱۰ دس محرابیں ہیں اور تیسرے میں بارہ ۱۲ ہیں اور چوتھے درجے میں تیرہ ہیں اور اس چوتھے درجے سے اوپر اور آٹھ محرابیں ہیں اور یہ میناروں کی بالکل آخری حد ہے یہاں سے سارے شہر اور اس کے گرد و نواح کی بستیوں کے مناظر نہایت خوش نما اور دلفریب نظر آتے ہیں جو صرف دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں ان محرابوں کے اوپر چھوٹا سا گنبد بنا ہوا ہے اور ان میناروں کے بیرونی رخوں پر ایک ایک سونے کا کلس لگا دیا گیا ہے۔ اوپر سے محلات شاہی اور دیگر امرا وغیرہ کے مکانات نظر آنے کی وجہ سے عام طور پر اس عمارت پر چڑھنے کی اجازت نہیں۔

چار مینار کی تیاری میں تین لاکھ ہون صرف ہوئے۔ (ہون اس زمانے کا ایک سکہ ہے جو ساڑھے چار روپیہ سکہ مغلیہ کے مساوی ہوتا تھا آج کل کے حساب سے سات روپیہ سے زیادہ کا ہوتا ہے) جب سلطنت قطب شاہیہ کا آخری تاجدار سلطان ابوالحسن تانا شاہ اورنگ آرائے حکومت تھا تو تاج شاہی اور تخت سلطنت سے بے خبر ہو کر سارا راج دربار عمال ملک کے سپرد کر دیا۔ پھر کیا تھا؟ جس کو جو سوجھی وہ کر بیٹھا جس کا ہاتھ بنا انہوں نے خزانہ شاہی کو خوب لوٹا۔ غرض یہ کہ سلطنت میں جب ظلم و تشدد کی انتہا نہ رہی اور مخلوق خدا چیخ اٹھی اور اس کی خبر دارالسلطنت دہلی کو پہنچی تو شہنشاہ ہند بگڑ بیٹھے اور ان کو رعیت کی پامالی اور مظلومیت ایک آنکھ نہ بھائی مع لشکر جرار گولکنڈے پر چڑھائی کی اور بالآخر قلعہ گولکنڈہ کو عالمگیری فوجوں کے ہاتھوں نے سر کر لیا۔ شہنشاہ اورنگ زیب تانا شاہ کو مقید کر کے اپنے ساتھ دولت آباد لے گیا۔ بعد تسخیر گولکنڈے کی ریاست سلطنت مغلیہ کا ایک صوبہ بن گئی اور سلطنت دہلی کی طرف سے اس صوبہ کا عامل بہادر دل خان کو قرار دیا گیا۔ اسی صوبہ دار کے عہد میں چار مینار کا مغربی مینار بجلی کے صدمے سے گر پڑا تو صوبہ دار موصوف نے فوراً اس

کی تعمیر تعبیر وصفات سمراد کرادی۔

۱۷۵۶ء میں فرانس کا مشہور جنرل بُوسے (BUSSY) اور اس کی فوج اس عمارت کے اطراف کے باغات میں مقیم ہوئی تھی۔

۱۲۵۸ھ / ۱۸۴۲ء میں پہلی بار نواب ناصر الدولہ بہادر غفران منزل کے عہد حکومت میں اس پر ایک لاکھ روپیہ کے صرفہ سے درستی اور استر کاری کی گئی۔ اس کے بعد پھر دوبارہ ۱۲۹۷ھ / ۱۸۸۰ء میں نواب مختار الملک سر سالار جنگ اول کے عہد وزارت میں اس کی حالت خستہ ہو رہی تھی تو سید علی خاں المخاطب بہ حیدر نواز جنگ مہتمم صفائی کے اہتمام سے قریب دو لاکھ روپیہ کے خرچ سے اس کی استر کاری کی گئی۔

۱۳۰۲ھ / ۱۸۸۴ء سے چار مینار میں شتی افغان پولیس کا ایک دستہ متعین کیا گیا اور ۱۳۰۴ھ / ۱۸۸۶ء میں لارڈ ڈفرن وائسرائے ہند کی تشریف آوری پر اس کو لوہے کی جالی سے محصور کر دیا گیا تھا اور صرف جانب شمال آمد و رفت کے لئے ایک آہنی پھاٹک لگایا گیا جو اب تک موجود تھا۔

کچھ عرصہ قبل ماہ ڈسمبر ۱۹۲۹ء / ۱۳۴۸ھ میں جب ہز اکسیلنسی لارڈ ارون وائسرائے وگورنر جنرل ہند تشریف فرما ہوئے تو قبل تشریف آوری شہر آراستہ اور سنوارا جانے لگا اور شوارع بلدہ کی طرح محکمۂ آرائش سرکار عالی نے چار مینار کی سڑک کو بھی کشادہ کرنے کا انتظام کیا تھا چنانچہ اس نے بغرض وسعت سڑک اس لوہے کے کٹہرے (جالی) کو نکال دیا۔

جب سے کہ شہر آراستہ و پیراستہ کیا جا رہا ہے۔ اس کا منظر نہایت ہی قابل دید ہے۔ اس عروس البلاد کی آرائش، جس وقت پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے گی تو اس وقت یہ عمارت شہر کے حسن میں اور چار چاند لگائے گی، جس کا منظر، بس دیکھنے ہی سے تعلق رکھے گا۔ لیکن تاہم اب بھی دور سے ایک طرف عثمانیہ دواخانہ اور ہائیکورٹ وسٹی کالج اور دوسرے طرف چار مینار و مکہ مسجد اپنے عجیب و غریب منظر کے لحاظ سے بڑے ہی دلفریب و دلکش نظر آتے ہیں۔ جو دیکھنے والا کی آنکھوں کو نور اور دل کو سرور بخشتے ہیں یہ نئی عمارتیں خاندان آصفیہ کے نجم مرتبہ شاہ والا قدر سلطان العلوم اعلحضرت نواب سر میر عثمان علی خاں بہادر خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ کی بے نظیر یادگاریں ہیں جو اپنا بلاد ہند میں جواب نہیں رکھتیں۔

---

۱ ملاحظہ ہو صولت عثمانی صفحہ (۹۹) مولفہ قاضی ابو الفتح محمد امیر اللہ صاحب۔

اس عمارت پر بڑے بڑے موقعوں پر روشنی کی جاتی ہے۔ سب سے پہلے اعلیٰحضرت میر محبوب علی خاں بہادر غفران مکاں کے مبارک جشن تسمیہ خوانی میں اس پر روشنی کی گئی تھی جس وقت اکثر متبرک دنوں میں یا بڑی بڑی سرکاری تقاریب میں اس کو رنگ برنگی برقی روشنی سے سجایا جاتا ہے تو بس اس خوبصورت شہر میں یہ عمارت بقعۂ نور نظر آتی ہے اور حسن کی بہار اور خوبصورتی دیکھنے ہی سے تعلق رکھتی ہے۔

اس کی اندرونی سطح پر ایک حوض بنایا گیا ہے، جس میں رات دن، پانی بھرا رہتا ہے تاکہ متعین فوجی دستہ کو حصول آب میں آسانی ہو۔

اس عمارت کا نقشہ ہمارے چاندی اور سونے کے سکوں پر ہوا کرتا ہے جو اس کی عظمت و بزرگی پر دال ہے۔

ؤ

مجلہ مکتبہ جلد (۵) شمارہ (۶) بابتہ ماہ آبان ۱۳۴۹ف ۴ سپٹمبر ۱۹۴۰ء

سلسلہ صفحہ ۶۳

کو روشنی ملتی تھی شمع علم سے خالی ہے۔ آہ۔ شمسی آنکھ تمہارے دیکھنے کو، کان تمہاری آواز کے سننے کو اور قلب و دماغ تمہارے زبان سے نکلے ہوئے مسائل علمیہ و دینیہ کے سمجھنے کو بیقرار ہیں۔ تم اپنے وقت پر گئے مگر ہم کو بے وقت چھوڑا۔ خدا تمہارے درجات بلند کرے۔ تم کو اپنے دیدار سے سرفراز کرے اور جنتیوں میں تم اسی عزت سے رہو جس عزت سے یہاں تھے۔

تم کو زمانے نے تمہارے بعد یاد کیا ہے لیکن اب بھلا نہیں سکتا۔ تمہاری تصانیف تم کو زندہ رکھیں گی اور تم ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہو گے۔

ؤ

مجلہ مکتبہ جلد (۵) شمارہ (۶) بابتہ ماہ آبان ۱۳۴۹ف ۴ سپٹمبر ۱۹۴۰ء

نواب محمد بہادر خان خلف نواب نصیب یار جنگ بہادر

علامہ بحر العلوم شمسی

تمہید : علماء متقدمین میں ایسی مثالیں اکثر ملتی ہیں کہ انھوں نے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے سے کم درجہ اور کم علم افراد کو شہرت حاصل کرتے دیکھا۔ لیکن باوجود علم وفضل کے ان کے اپنے دل میں کبھی شہرت طلبی کا خیال پیدا نہ ہوا۔ اس بیسویں صدی عیسوی میں جس کو اشتہار بازی و شہرت طلبی کا زمانہ کہا جاسکتا ہے۔ ایسی مثال صرف علامہ بحر العلوم اشرف العلماء مولوی سید اشرف شمسی بردالله مضجعہٗ کی ذات ہی میں مل سکتی تھی۔ ہندوستان کے ان تمام اخبارات ورسائل میں جو گزشتہ ستر سال سے چھپتے اور شائع ہوتے رہے ہیں غالباً مجلۂ مکتبہ وہ پہلا رسالہ ہے جس کو علامہ مرحوم کے حالاتِ زندگی کلام اور تصانیف کا تذکرہ ملک وقوم کے سامنے پیش کرنے کا موقع ملا ہے۔

نام۔ نسب۔ بچپن ۔ سید اشرف نام تھا۔ ابو الشریف کنیت۔ شمسی تخلص فرماتے تھے۔ والد ماجد کا نام سید علی صاحب اور دادا کا نام نامی سید اشرف عرف عالم اچھا میاں صاحب تھا۔ آپ گروہ مہدویہ کے ایک مشہور دودمان سیادت "یداللّٰہی" کے چشم وچراغ تھے۔ سنہ ۱۲۸۵ھ میں پیدا ہوئے ۹ سال کی عمر تھی کہ والد بزرگوار نے انتقال فرمایا۔ اس کے بعد علامہ مرحوم نے اپنے بڑے بھائی مولانا سید محمود مرحوم ومغفور کے سایۂ عاطفت میں پرورش پائی۔

تحصیل علوم ذوقِ علم ورثہ میں ملا تھا۔ ابتدائی تعلیم برادر بزرگوار سے حاصل کی پھر حضرت

مولانا سید نصرت صاحب قبلہ اور مولانا سید داؤد صاحب قبلہ مشائخین مہدویہ سے فارسی کی تکمیل ابتدائی فرمائی۔ فطرت نے ذہن رسا عطا کیا تھا پندرہ سال کی عمر میں طغرا، ظہوری اور چار عنصر بیدل جیسی کتابیں پڑھ لیں۔

عربی کا شوق ہوا تو آپ کے برادر محترم نے اپنے استاد علامہ عباس علی خاں مرحوم کی خدمت میں حاضر کیا۔ شاگرد رشید کی غیر معمولی ذہانت و محنت نے آپ کو استاد علام خاص عنایات و الطاف کا مورد بنادیا۔ دس سال کی کوشش کے بعد ۲۵ سال کی عمر میں جب علامہ مرحوم فارغ التحصیل ہوئے تو علامہ عباس علی خاں مرحوم نے مکہ مسجد کے ایک عظیم الشان جلسہ میں دستار بندی فرمائی علامہ مرحوم کو اپنے ساتھیوں میں یہ امتیاز بخشا کہ سند حدیث میں آپ کو بحر العلوم کے خطاب سے مخاطب کیا اور سر مجلس اپنی قبا اُتار کر اپنے ہاتھوں سے علامہ مرحوم کو پہنائی۔

اس دستار بندی و سند حدیث نے علامہ مرحوم کی تشنگیٔ علم کو بجھا نہیں دیا۔ اس کے بعد علوم ریاضی کی تکمیل علامہ عبد الصمد خاں صاحب قندھاری سے فرمائی اور زمانۂ ملازمت میں حضرت سید اللہ بخش صاحب قبلہ مشائخ مہدویہ سے علم نجوم حاصل کیا۔ مولانا قاری محمد ابراہیم صاحب سے قرارت سبعہ کی تحصیل کی اور اپنے برادر بزرگوار سے علم تصوف و سلوک کی تعلیم پائی۔

علامہ مرحوم کے برادر فن شمشیر زنی اور بنوٹ میں یکتائے روزگار تھے۔ علامہ مرحوم نے ان سے اس فن کو تمام و کمال حاصل فرمایا تھا۔ اور اپنے زمانہ میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔

علامہ مرحوم کی تحصیل علم طالبان علم کے لئے درس عبرت ہے وہ جس خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ متوکل فقرا مہدویہ کا گھرانہ تھا جن کا توکل آج بھی بے نظیر ہے جنھوں نے ہمیشہ یومیہ اور وظیفہ کو عار اور جاگیر و منصب کو ننگ سمجھا اور جو ہر وقت للفقراء الذین احصروا فی سبیل اللہ کی مصداق رہے جن کے مسلک میں ذریعۂ معاش کا تعین ناجائز اور اپنے باپ اور بھائی کے سامنے بھی دست سوال دراز کرنا حرام تھا۔ دو دو روز تک کھانے کو کچھ نہ ملتا۔ پھٹے پرانے کپڑے جسم پر ہوتے۔ رات کو چراغ کے لئے تیل نہ ہوتا۔ لیکن شوق علم میں کبھی فرق نہ آتا۔ اگر کبھی ان تکالیف

نے بہت پست ہمتی کی تو بڑے بھائی کے صبر و رضا نے ہاتھ تھام لیا جن کو دیکھتے تھے کہ تیسرے دن کا فاقہ ہے اور معتقدین سے مسکرا مسکرا کر ہم کلام ہیں۔ دستار بندی کے جلسہ کے روز حیدرآباد کے چھوٹوں اور بڑوں سے مکہ مسجد بھری ہوئی ہے اور حیدرآباد کا یہ قابلِ فخر فرزند اس میں بغیر شیروانی و عمامہ کے جلسہ میں شریک ہوتا ہے جسم پر ایک پھٹا ہوا کرتا ہے اور سر پر عمامہ کی بجائے ایک دستی لپیٹی ہوئی۔ غرض یہ کہ اس حالت گدائی اور ان تکالیف و مصائب کے باوجود حضرت مرحوم نے جن علوم میں کمال حاصل کیا وہ حسب ذیل ہیں۔ حدیث، تفسیر، فقہ، اصول فقہ، اصول حدیث، معانی و بیان، صرف و نحو عروض و قافیہ، ادب عربی و فارسی، منطق و علم کلام، تاریخ و مناظرہ، ہیئت و ہندسہ، فلسفہ قدیم۔

ذریعہ معاش - ملازمت حضرت علامہ مرحوم بھی اس تذکرہ کو ناپسند فرماتے تھے اور میں بھی اس کو قلمبند کرتے ہوئے رنج و ملال محسوس کرتا ہوں کیونکہ حضرت علامہ نے فراغت تحصیل کے بعد حصول ملازمت تک اپنے جگر گوشوں اور دل کے ٹکڑوں یعنی تصانیف کو فروخت کر کے قوت لایموت کا سامان حاصل کیا۔ ایک دو مثنویاں اور علوم معقول و منقول میں کئی تصانیف جو ان کے معاصرین کے ناموں سے منسوب ہیں اگر اس خانہ خراب تنگ دستی نے ان کو مجبور نہ کیا ہوتا تو آج حضرت علامہ مرحوم کی تصانیف کے ساتھ ان کے نام گنائے جا سکتے۔

ابتدائی ملازمت علاقہ صرف خاص مبارک میں اختیار کی۔ پھر صدر محاسبی سرکار عالی میں کام کرتے رہے اور بالآخر مدرسہ دارالعلوم میں جو اس زمانہ میں علوم مشرقیہ کا کالج تھا، پروفیسر مقرر کئے گئے یہاں علامہ مرحوم کے ذمہ مولوی فاضل و کامل کی جماعتوں کی تعلیم رہی۔ جب مدرسہ دارالعلوم کلیۂ جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ دینیات میں ضم ہوا تو مولانا کی خدمات بھی وہیں منتقل ہو گئیں۔ اور یہاں ملک و اہل ملک کی ناقدر شناسی اور حضرت علامہ کی غیور و خوددار طبیعت نے جو عہدہ داران وقت کی چاپلوسی اور آستاں بوسی کو کبھی گوارا نہ کر سکی تھی نہ صرف ان کو مددگار پروفیسر کی جگہ دی بلکہ ایک ایسا مضمون فارسی جدید ان کے سپرد کیا گیا جس میں ان کو اپنے کمالات علمی کے اظہار کا بہت کم موقع تھا اور جو ان کے تلامذہ کے لئے بھی قابل التفات چیز نہ تھی۔ لیکن کبھی حضرت علامہ نے اس کی طرف سے بے توجہی نہ فرمائی۔ بلکہ اس دلچسپی

اور دلدہی سے پڑھایا کہ ان کے شاگرد ان کو کبھی نہیں بھلا سکے۔ اسی محنت، فرض شناسی، پابندی وقت اور دلدہی کا نتیجہ تھا کہ بلا درخواست مسلسل یا پانچ سال تک ان کی توسیع سرکار سے منظور ہوتی رہی اور اپنے انتقال سے صرف تین سال قبل وہ وظیفۂ حُسنِ خدمت کے ساتھ ملازمت سے سبکدوش کئے گئے۔

اشاعتِ علم

حضرت علامہ مرحوم کا مقصدِ حیات صرف ایک تھا یعنی "اشاعتِ علم" اپنی عمر کے ۲۵ سال حصولِ علم میں صرف کئے تھے باقی ۲۴ سال اس کی اشاعت میں گذارے اور اس غرض کو جو "ورثۃ الانبیاء" کا منصبِ اولین ہے حیاتِ مستعار کا ایک لمحہ ضائع کئے بغیر ادا کیا۔ جن جن علوم کی تحصیل کی تھی وہ سب مستحضر تھے۔ ان کو بلا کسی تیاری کے وہ اس طرح پڑھاتے کہ طالب علم سیر ہو جاتا۔ مولانا کا دولت کدہ طالبانِ علم کا کعبہ تھا۔ اوقاتِ مدرسہ کے سوا ہر وقت طلباء کا مجمع رہتا۔ دن اور رات کے شاید ہی چند گھنٹے مولانا کو آرام ملتا تھا۔ نمازِ فجر کے بعد ہی درس شروع ہو جاتا۔ جب مدرسہ کا وقت آتا تو کوئی ایک طالب علم کتاب ہاتھ میں لئے جھٹکہ پر سامنے کی جانب بیٹھ جاتا مدرسہ پہنچنے تک راستہ میں درس ہوتا رہتا۔ کالج میں جن فرائض کو انجام دیتے تھے وہ اشاعت علم ہی سے متعلق تھے۔ واپسی میں بھی جھٹکہ میں ایک آدھ طالب علم کا ساتھ ہوتا۔ گھر پہنچتے اور تلامذہ کو منتظر پاتے رات کو گیارہ گیارہ بجے تک اسی میں مصروف۔ مجھے یاد ہے کہ ایک صاحب جن کو کسی اور وقت میں فرصت نہ ہوتی تھی رات کو ۲ بجے حدیث پڑھنے کے لئے آتے اور مولانا کو مستعد پاتے۔ کبھی آپ نے اپنے پڑھے ہوئے علوم میں سے کسی کے پڑھانے میں تامل نہیں کیا۔ ایک مبتدی میزان و منشعب کے پڑھنے کی خواہش کرتا تو اس کو بھی پڑھا دیتے اور منتہی تلامذہ فصوص الحکم و شمس بازغہ کے درس کی درخواست کرتے تو وہ بھی رد نہ ہوتی۔ حلقہ درس میں امیر و غریب میں امتیاز نہ تھا۔ نواب کاظم علی خان فرزند نواب شوکت جنگ بہادر، نواب سردار علی خان خلف نواب سردار یار جنگ مرحوم اور نواب معین الدین خان خلف صادق جنگ مرحوم کو بھی اسی بوریہ پر بٹھا کر پڑھایا جس پر ان سے قبل ایک گدائے گوشہ نشین کا فرزند بیٹھ کر پڑھ چکا تھا۔ سر رشتۂ تعلیمات و دیگر دفاتر سرکار عالی میں جو نو عمر حیدرآبادی فاضل علوم شرقیہ ہیں۔

احصا کیا جائے تو شاید ہی کوئی ایسا نکلے گا جس کو بالواسطہ یا بلاواسطہ حضرت علامہ مرحوم کے چشمۂ فیض سے سیرابی کا موقع نہ ملا ہو۔ اپنے اور بیگانے کا کبھی خیال نہ کیا۔ سب کو شفقت اور دلچسپی سے تعلیم دی۔

اگر کوئی ذہین و محنتی طالب علم مل جاتا تو ایسے خوش ہوتے جیسے کوئی خزانہ ان کو مل گیا ہے اگر ایک دن کے لئے بھی اس کا سبق ناغہ ہوتا تو دوسرے روز حضرت علامہ کالج سے واپس ہوتے ہوئے اس کے گھر پر موجود ہو جاتے اور مزاج پرسی کے بعد وجہ غیر حاضری دریافت فرماتے۔ پابندی سبق کی نسبت نصیحت کر کے واپس تشریف لاتے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ جس نے ایک دفعہ ان سے پڑھ لیا اس نے پھر کوئی دوسرا دروازہ نہ دیکھا۔

سوائے ملازمت سرکاری اور زمانۂ ابتدائی کی دو چار خانگی ملازمتوں کے کسی کو معاوضے کر نہ پڑھایا۔ مجھے چودہ سال تک حضرت کی قدمبوسی کا شرف حاصل رہا ہے۔ حضرت قبلہ گاہی مرحوم کو تمنّا ہی رہی کہ مجھے مولانا جو درس دیتے تھے اس کے معاوضہ میں کچھ قبول فرمائیں۔ لیکن تنخواہ یا مشاہرہ تو کیا کبھی کوئی تحفہ و ہدیہ تک بھی قبول فرمانا گوارا نہ کیا۔

شاعری زبان فارسی کے پُرگو شاعر تھے۔ طبیعت بہت موزوں پائی تھی۔ ایک ایک نشست میں سو سو ڈیڑھ ڈیڑھ سو شعر لکھ دینا بڑی بات نہ تھی۔ تمام اصنافِ سخن پر قادر تھے لیکن غزل اور قصیدے زیادہ کہے ہیں کسی امیر و بادشاہ کی شان میں شعر کہنا ان کی طبع غیور کے خلاف تھا۔ اکثر قصیدے نعت یا منقبت بزرگان دین میں کہے ہیں ابتدائی کلام میں بیدلؔ کا انداز تھا آخر میں حکیمانہ اور ناصحانہ طریقہ پایا جاتا ہے۔ عربی میں بھی شعر کہتے تھے اور برجستہ کہتے تھے ان کے دواوین میں کئی عربی قصیدے موجود ہیں۔ اُردو میں پانچ دس سے زیادہ شعر نہیں۔

دو تین ضخیم جلدیں علامۂ مرحوم کے کلام سے پُر ہیں اور یہ وہ کلام ہے جو اس بیاض کے بربادب ہونے کے کئی سال بعد جس میں دس ہزار ابیات تخمیناً مُرتب ہوا اور جس کو علامہ مرحوم نے ایک امیر سے شعرا کی تنقیص سُن کر اور یہ دیکھ کر کہ اس زمانہ میں قدرِ سخن نہیں ہے باولی میں پھینک دیا تھا۔

اگرچہ آپ کا تخلص آپ کے نام سے زیادہ مشہور ہو! مگر شاعری علامہ مرحوم کا اصلی فن نہیں تھا۔ اس کو انھوں نے محض اوقات فرصت میں دل بہلانے کے لئے اختیار فرمایا تھا اور واقعہ ہے کہ جب وہ اپنے مشاغل علمیہ سے فارغ ہو جاتے یا علیل ہوتے اور کوئی کام نہ کر سکتے تو شعر گوئی کی طرف متوجہ ہوتے۔

چند قصائد متفرق طور پر اور ایک مختصر مجموعہ انتخاب قصائد شمسی کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

اخلاق و عادات علامہ مرحوم میں بہت سی اخلاقی خوبیاں جمع تھیں جس کسی نے آپ سے ایک دفعہ ملاقات کی پھر وہ آپ کا گرویدہ ہو گیا۔ صد درجہ بامروت، خلیق، نرم مزاج اور حلیم تھے خودداری اور غیرت کا یہ عالم کہ کبھی کسی کے سامنے اپنی کسی غرض کے لئے ہاتھ نہ پھیلایا۔ عہدہ داران و حکام سرکاری کی چاپلوسی و خوشامد کو ہمیشہ عار سمجھا کیئے۔ اگر کسی شاگرد نے کوئی خدمت کردی (مالی خدمت تو کبھی قبول ہی نہیں کی) تو جب تک اس کے ساتھ علاوہ تعلیم و تدریس کے کوئی اور اچھا سلوک نہ کر دیا آرام نہ لیا۔

حسن معاملہ میں بے نظیر تھے۔ اگر کسی کا قرض ہو جاتا تو اس کی ادائی تک کچھ عجیب بیقراری مولانا کو رہتی اور جب ادا کر دیتے تو شکر خدا بجا لاتے۔ ایک دفعہ مجھ سے موٹر اجازت پر منگوائی معلوم ہوا نواب کاظم علی خان صاحب سے اپنے صاحبزادہ مولوی سید اسداللہ صاحب کی پہلی شادی کے لئے کچھ قرض لیا تھا اس کی ادائی کے لئے کوہ مولا کو جاتا ہے جہاں نواب صاحب اس زمانہ میں رہتے تھے۔ میں نے موٹر بھیجی اور ایک عریضہ میں گلہ کیا کہ میرے ہوتے آپ نے اپنی ضرورت پر دوسروں سے قرض حاصل کیا۔ جواب میں تحریر فرمایا مجھے اندیشہ تھا تم روپیہ دے کر واپس نہ لو گے۔ میں جانتا تھا کہ ساڑھے چار سو کی تنخواہ ان کے یہاں بیس[۲] روز سے زیادہ کافی نہ ہوتی تھی۔ خرچ تو پچاس پچاس سو ہی کا ہے لیکن خیریت میں سب اللہ جانتا ہے اور کبھی قرضہ کی ضرورت پیش آجاتی ہے اس لئے وعدہ کر لیا کہ ایک روپیہ اگر آپ بطور قرض لے کر واپس کر دیں گے تو لے لوں گا۔ اس کے بعد سے کئی دفعہ مجھ سے قرض حاصل کیا مگر کبھی ایسا نہ ہوا کہ تنخواہ یا وظیفہ انھوں نے کالج یا خزانہ سے اٹھایا ہو

حضرت علامہ مرض الموت میں مبتلا ہوئے اور انتقال فرمایا۔ یہ حضرت مرحوم کی آخری تصنیف ہے

اہل و عیال علامۂ مرحوم نے اپنی زندگی میں اولاد کے بہت داغ اٹھائے آپ کو دو صاحبزادے اور کئی لڑکیاں ہوئیں۔ بڑے فرزند مولوی سید علی مرحوم جن کو حضرت علامہ نے بڑی محنت سے تعلیم دی تھی اور جنھوں نے نو عمری میں اپنے آپ کو باپ کی جانشینی کے قابل ثابت کر دیا تھا۔ عین اس وقت انتقال کیا جبکہ مولوی فاضل و کامل کے امتحانات میں بدرجۂ اعلیٰ کامیاب اور صاحب تصنیف ہو چکے تھے۔ ان کی تصانیف کے منجملہ "شرح دیوان زہیر" چھپ گئی ہے۔ عربی میں نہایت برجستہ شعر کہتے تھے۔ فارسی اور اردو کلام بھی بہت اچھا تھا۔ یہ داغ کچھ کم نہ تھا کہ مسلسل کئی صاحبزادیوں نے انتقال کیا۔ سب سے بڑی اور نہایت قابل صاحبزادی کا انتقال حضرت علامہ کی وفات سے صرف سات ماہ قبل ہوا تھا۔ جنھوں نے کئی چھوٹے چھوٹے بچے اپنے بعد چھوڑے۔ زمانۂ مرض الموت میں ایک دفعہ فرمایا۔ میاں جو زخم دل میں تھے وہ بیٹھے میں نکل آئے ہیں

اب صرف ایک صاحبزادہ مولوی سید اسد اللہ ان کی یادگار رہیں اور کلیہ جامعہ عثمانیہ کی جماعت بی اے میں زیر تعلیم ہیں۔ خدا ان کو سلامت رکھے اور حضرت علامۂ مرحوم کا سچا جانشین بنائے۔

علماء و کاملین کی صلبی اولاد کے ساتھ ان کی روحانی اولاد بھی قابل ذکر ہے جو ان کے نزدیک اول الذکر سے کچھ کم عزیز نہیں۔ یوں تو حضرت علامہ کے تلامذہ کی تعداد اتنی کثیر ہے کہ ان کا گنوانا محال نہیں ... تو مشکل ضرور ہے لیکن قابل ذکر حسب ذیل ہیں۔

(۱) جانشین علامۂ مرحوم جناب مولانا مولوی محمد سعادت اللہ خان صاحب ہوش مولوی فاضل و کامل، متکلم اول مددگار سپرنسپل مدرسۂ فوقانیہ عثمانیہ دار العلوم سرکار عالی

(۲) حضرت مولانا مولوی سید شہاب الدین صاحب قبلہ فرزند حضرت مولانا سید نصرت صاحب قبلہ جو اکابر مشائخین مہدویہ سے ہیں۔

(۳) حضرت مولانا سید عالم صاحب مولوی فاضل و کامل اہل چمن پٹن علاقہ میسور۔

اور بیرا قرض ادا کئے بغیر گھر گئے ہوں۔

سادگی اس بلا کی کہ اچھے کپڑے، اچھے کھانے، اچھے لباس کا کبھی خیال نہ کیا۔ جب میں نے پہلی دفعہ سبق کے لئے حاضر ہونا شروع کیا تھا تو صرف ایک بوریا پر جو اکثر جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ بیٹھ کر درس دیا کرتے تھے۔ جب باہر کے کمرے بن کر تیار ہو گئے تو ان میں ایک دری بچھا دی گئی تھی۔ اسی کمرہ کے ایک گوشے میں حضرت مولانا تشریف فرما ہیں۔ سر کے بال بکھرے ہوئے ہیں۔ قمیص کے بٹن کھلے ہوئے ہیں پاندان ایک طرف رکھا ہے اور دوسری طرف کتابوں کے انبار ایک چھوٹا سا ڈیسک جس پر ایک دوات قلم بھی ہے سامنے رکھا ہے اور حضرت مولانا مصروف درس ہیں۔

مختصر یہ کہ اپنے اخلاق و عادات کے لحاظ سے حضرت مولانا علمار متقدمین کا ایک مکمل نمونہ تھے جس کا اس زمانہ میں پھر نظر آنا دشوار ہے۔

تصانیف اشاعت علم کے عنوان سے میں نے ان صفحات پر جو کچھ لکھا وہ نامکمل ہے جب تک مولانا مرحوم کی تصانیف کا تذکرہ نہ کیا جائے صرف درس و تدریس ہی کے ذریعہ حضرت مرحوم نے اشاعت نہیں کی بلکہ اپنے بعد تمام اصناف علوم پر تقریباً ڈیڑھ سو تصانیف کا ایک بیش قیمت ذخیرہ چھوڑا جو وقت مدرسہ اور درس و تدریس کے اوقات سے بچ جاتا اس میں تصنیف و تالیف کا شغل رہتا نہ ان کو تمنا تھی نہ ان کی تقدیر نے اپنی زندگی میں ان کو اپنی تصانیف کی اشاعت سے شاد ہونے کا اور موقع دیا۔ چند چھوٹے چھوٹے رسالوں کے سوا باقی سب کتابیں اب تک طبع نہیں ہو سکیں۔ ۲۰ سال کی محنت میں قرآن مجید کی تفسیر عربی زبان میں لکھی جو کئی ضخیم جلدوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ علم نحو میں ایک (۸۰۰) صفحہ کا رسالہ لکھا جو اپنی آپ نظیر ہے جس میں ان تمام مسائل پر جو علمار متقدمین میں مختلف فیہ رہے ہیں نہایت مبسوط بحث کی ہے نیز منطق علم کلام، تصوف، قرارت، نجوم، عقائد، اصول حدیث، اصول فقہ اور علم اخلاق میں کئی بڑے تصنیف فرمائے جن کی تفصیل کا یہ مضمون متحمل نہیں ہے۔

میری درخواست پر اپنے آخری ایام حیات میں تفسیر لوامع البیان کا مقدمہ تحریر فرمانا شروع کیا تھا جس کے ساڑھے پانچ سو صفحات لکھے گئے تھے اور عبادات کا باب شروع ہوا تھا

(۴) حضرت مولانا سید مرتضیٰ صاحب:

(۵) حضرت مولانا سید نجم الدین صاحب افضل العلماء

خدا ان سب کے فیوض کو ہمیشہ جاری رکھے جو درحقیقت حضرت علامہ کے فیوض و برکات علمیہ ہیں

وفات

اواخر ماہ ذیحجہ میں ۱۳۴۸ھ میں مرض سرطان میں حضرت علامہ مبتلا ہوگئے۔ ابتدا میں یہ مرض پہچانا نہ گیا اور مختلف علاج کئے گئے لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ جب سے یہ مرض شروع ہوا تھا حضرت مرحوم کو اپنی موت کا یقین ہو گیا تھا۔ عشرۂ محرم میں اپنے عقائد کے بموجب ترک دنیا کی اور وظیفۂ حسن خدمت سے دست برداری فرمائی۔

جب مرض نے ترقی کی تو پھر میرے مجبور کرنے پر دواخانۂ عثمانیہ میں علاج کروانے پر راضی ہوئے۔ ایک خاص کمرہ لیکر اس میں رکھا گیا اور عمل جراحی ہوا۔ لیکن مرض بڑھتا ہی گیا۔ ۲۵ محرم ۱۳۴۹ھ کو مکان واپس لایا گیا اور ۲۶ محرم الحرام ۱۳۴۹ھ روز سہ شنبہ کو صبح طلوع فجر کے وقت ۶۹ سال کی عمر میں تقدیر الٰہی کو لبیک کہا۔ اِنّا للہ و اِنّا الیہ راجعون۔

اس مرض میں حضرت علامہ کی قوت برداشت کے اندازہ کا موقع ملا۔ ہوشیار ہیں اور پیٹھ زخموں سے بھری ہوتی ہے ڈاکٹر صاحب سڑے ہوئے گوشت کے ٹکڑے کتر کتر کر علیحدہ کر رہے ہیں لیکن پیشانی پر بل ہے نہ چہرے پر زردی۔ میں نے جب تسلی کے الفاظ کہے تو ارشاد ہوا کہ ہماری زندگی میں مسرت و آرام کے ایام اور مصیبت و تکلیف کے زمانہ میں سو اور دس کی نسبت ہے لیکن انسان کتنا ناشکر گذار ہے کہ دس دن کی مصیبت کے لئے سو دن کے آرام کو بھول جاتا ہے۔

غرض حضرت علامہ کئی حیثیتوں سے اپنی آپ نظیر تھے۔ اب وہ آفتاب علم کہاں جو پچاس برس سے حیدرآباد پر ضیا پاش تھا۔ وہ دریائے علم کہاں جس نے ہزاروں تشنہ کامان علم کو سیراب کیا تھا۔ اب چنچل گوڑہ کا وہ مشرقی اور سنسان کنارہ جس کی پگڈنڈی کے راستوں پر صبح و شام ہر وقت طالبان علم کتابیں بغل میں دبائے قلم ہاتھ میں لئے سر جھکائے یا ایک دوسرے سے چپکے چپکے گفتگو کرتے ہوئے گذرتے نظر آتے تھے آج ویران پڑا ہے وہ حجرہ جس کی میلی شطرنجی پر بیٹھنے سے قلب کو نور اور دماغ

(باقی صفحہ ۸۸ پر)

چار مینار

جناب ابوالافتخار فخر حیدرآبادی

ای گلستانِ دکن کے سروِ آزاد خزاں
ای قدیم آثار کی تاریخ کے روحِ رواں

رشکِ اہرامِ مصری تیرا ہر مینار ہے
تیرے آگے سرنگوں گردوں نما کہسار ہے

جب ہمالہ کا فصیلِ ہند موزوں ہے لقب
نردبانِ بامِ گردوں کیوں کہیں تجھکو نہ سب

ہے ہر اک مینار تیرا سقفِ گردوں کا ستوں
یا کہیں شاخِ سرِ گاوِ زمیں ان کو کہوں

کیا کہوں میں تجھکو تو کیا ہے تری کیا شان ہے
سرزمینِ حیدرآبادِ دکن کی جان ہے

ہیں عمارات اور بھی یوں تو دکن میں بیشمار
شان ہے کچھ اور تیری اور ہی کچھ ہے وقار

سکۂ شاہی پہ تیرا نقش کندہ ہو گیا
دل سے عظمت کا تری ہر ایک بندہ ہو گیا

دہر میں لہرا رہا ہے تیری شہرت کا نشاں
لیتے ہیں تصویریں آ آکر حسینانِ جہاں

تو ہے قلبِ شہر میں گلدستۂ بزمِ نشاط
تیرا چہرا کہہ رہا ہے گویا تیری عظمت کی بساط

قطب شاہی عہد کی عظمت کی تو تصویر ہے
دفترِ اوراقِ پارینہ کی تو تفسیر ہے

نظام الملک آصفجاہ اول

جب مسلمانوں کی فتوحات کا سیلاب عظیم مشرق و مغرب کی طرف بے انتہا بڑھا چلا جارہا تھا تو اس سے راستے ہی میں کئی شاخیں پھوٹ پڑیں۔ اس کو روکنے کے لئے اُس وقت دنیا میں کوئی ایسی قوت یا حکومت موجود نہ تھی جو سدِّ راہ ہو کر اس کی روانی اور تیزی میں تفرقہ ڈال دے۔ اس طرح وہ تبدیل ہوتے، ہوتے مشرق و مغرب کی گشت لگا کر آخر ہندوستان میں آکر تھما اور مغلیہ خاندان کی شکل اختیار کرکے صدیوں ہند کی شاہنشاہت کی۔ جس کے نام آور سلاطین کی شان و شوکت کے آگے آسمان کی بھی رفعت ہیچ تھی اور جن کی حکمرانی کا غلغلہ تمام عالم میں ایک زبردست ہیبت ڈالے ہوئے تھا۔

عروج و زوال کے اصول کے تحت، جب مغلیہ سلطنت کا آفتاب قریب غروب تھا تو اس وقت خداوند عالم نے خاکِ ہند سے ایک قائدِ اعظم، یعنی حضرت آصف جاہ اول کی ذات والا صفات کو کھڑا کرکے بندگانِ خلق کی خدمت لی۔

آپ کے حالاتِ زندگی قلم بند کرنے کے لئے ایک مستقل تصنیف کی ضرورت ہے۔ صرف یہ مضمون اُس ارادہ کا ایک موہوم سا خاکہ ہے جو ہم اس حیثیت سے اس موضوع پر قلم اٹھانا چاہتے ہیں۔

حضرت آصف جاہ اول علیہ الرحمتہ کے جدِ امجد، خواجہ عابد قلیچ خان اور والدِ ماجد شہاب الدین غازی الدین خان بہادر، فیروز جنگ اول علیہ عالمگیر کے دربار میں منصب ہفت ہزاری پر معزز و ممتاز

تھے، آپ ایک بہادر سپہ سالار اور امورِ مملکت میں ایک بہترین مدبر ہونے کے علاوہ سلوک طریقت میں بھی ایک خدا رسیدہ، درویش صاحب کمال تھے۔

علامہ میر غلام علی آزاد نے تذکرہ "خزانہ عامرہ" میں حضرت خواجہ عابدؒ کے متعلق لکھا ہے کہ "منصب ہفت ہزاری و صدارت کل سے سرفراز تھے۔ آپ سمرقند سے آئے اور شاہ جہانی عہد میں منسلک ملازمت ہو کر اجمیر و ملتان کی صوبہ داری سے سرفرازی پائی۔ شہنشاہ عالمگیر کے ساتھ دکن تشریف لائے اور محاصرۂ گولکنڈہ میں شریک رہے۔ اتفاق سے اس جنگ میں ایک گولی آپ کے دست راست پر لگی۔ جس سے شدید زخم آیا اور ہاتھ ضائع ہو گیا۔ میدان جنگ سے اپنے خیمہ میں تشریف لائے اور جراح کو ہاتھ کی مرہم پٹی کے لئے طلب فرمایا۔ جراح فوراً حاضر ہوا۔ آپ اس وقت قہوہ نوشی میں مصروف تھے۔ جراح حسب الحکم زخمی ہاتھ کی ٹوٹی ہڈیوں کو نکالتا رہا۔ اور آپ بلا تکلف دوسروں سے باتیں کرتے ہوئے قہوہ نوش فرماتے رہے عالمگیر نے فی الفور عمدۃ الملک اسد خاں کو حضرت کی مزاج پرسی کے لئے بھیجا۔ جب خانِ موصوف خیمہ میں داخل ہوئے تو اس ماجرے کو دیکھ کر دنگ ہو گئے، غرض یہ کہ زخم کاری لگا تھا۔ اس لئے تیسرے دن ۲۴ ربیع الاول ۱۰۹۸ھ کو اپنی جان ملک و مالک پر نثار کر دی۔ کیا کوئی دوسرا خاندان ایثار و وفاداری کی ایسی نادر الوجود مثال پیش کر سکتا ہے یہ حسنِ اتفاق دیکھئے کہ جس سرزمین کے لئے آپ نے اپنی جان قربان کی وہ آج ان کے مبارک جانشینوں کی بلا شرکت غیرے قبضۂ تصرف میں ہے۔ اللہ تعالیٰ اس ملکیت کو ابدالآباد تک سلامت رکھے۔ اور دشمنوں کی نظر بد سے بچائے۔

لہ خواجہ اسماعیل کے فرزند تھے جو اپنے زہد و تقویٰ اور علم و فضل کے باعث سمرقند میں نہایت ممتاز محترم مانے جاتے تھے۔ اب تاریخ میں عام طور پر عابد قلیچ خان کے نام سے مشہور ہیں خواجہ صاحب کی تاریخ پیدائش کا نہیں اپنے خاندانی ورثے یعنی علم و فضل میں کمال حاصل کیا اور سمرقند سے بخارا آگئے یہاں ابتداءً قاضی پھر شیخ الاسلام بنائے گئے [illegible] ہو کر ماوراء النہر کو ترک کر کے ہندوستان آئے ۱۰۶۷ھ میں حج کے لئے مکہ معظمہ تشریف لے گئے وہاں [illegible] دربار عالمگیری سے منسلک فرمایا۔ ۱۰۸۱ھ میں شاہنشاہ کے صدر عظم بھی بنائے گئے۔

حضرت آصف جاہ کے والد شہاب الدین خان المخاطب بہ نواب غازی الدین خاں بہادر فیروز جنگ اول شہنشاہ عالم گیر کے نہایت درجہ مورد الطاف تھے چنانچہ کئی دفعہ عالم گیر نے آپ کی جاں نثاری اور وفاداری کی تعریفیں کی ہیں۔ جس کے عالم گیری عہد کے اوراقِ تاریخ شاہد ہیں۔

ایک مرتبہ آپ کو آشوبِ چشم کا مرض لاحق ہوا۔ اس کی خبر عالم گیر کو ہوئی۔ تو آپ کے نام ایک عیادتی خط لکھ کر سعادت خان کے ہاتھ روانہ کیا جس سے اورنگ زیب کے اُنس و محبت کا اظہار ہوتا ہے۔

"من می خواستم کہ برائے عیادتِ آن دولت خواجہ بیایم ..... واز میوہ ہائے نورس انچہ ہم می رسد انگورا ست اما اطبائے یونان برائے آن عمدہ مخلصاں مزاج دان مضرمی گویند - لہذا ما ہم برخود ناگوار کردیم۔"

اور ایک مرتبہ معرکۂ بیجاپور میں عالم گیر نے آپ کو گلے لگا کر یہ کہا "حق سبحانہٗ تعالیٰ از ترددِ فیروز جنگ شرم اولادِ تیموریہ نگہ داشت آبروئے اولاد اوتا دورِ قیامت خدا نگہ دارد۔" کہتے ہیں کہ بیجاپور کے حملے میں عالم گیری فوجوں کو رسد نہ ملی جس سے فوج میں پریشانی پیدا ہوگئی، اورنگ زیب کو جب اس کی خبر ہوئی تو فیروز جنگ بہادر کو طلب کرکے فراہمی رسد اور پُر زور حملہ کا حکم دیا۔ اس دلیر سپہ سالار نے قوت و جوانمردی دکھلائی کہ دشمنوں کے پیر میدان جنگ سے اُکھڑ گئے۔ مال و دولت اور رسد کافی ہاتھ لگی۔ فتح و نصرت کے نقارے بجنے لگے جب ان کی صدا عالم گیر کے کانوں میں گونجی تو خدائے قدوس کی درگاہ میں نہایت خلوص دل سے دو رکعت نمازِ شکرانہ ادا کی اور اپنے عزیز ترین سپہ سالار کے لئے بھی دُعا کی۔

آپ نے اس طرح نیک نامی کے ساتھ زندگی بسر فرمائی۔ آخر عمر میں شاہ عالم نے گجرات کی صوبہ داری پر مامور کیا تھا اور وہیں ۱۱۲۲ھ میں بہ مقام احمد آباد داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ آپ کی میت احمد آباد سے دہلی لائی گئی اور یہاں اجمیری دروازہ کے قریب سپردِ خاک کئے گئے۔ حسب فرمائش شہنشاہ عالم گیر آپ کا عقد سعد اللہ خان کی لڑکی "سعید النساء بیگم" سے ہوا جو شاہ جہاں کے وزیر اعظم تھے جن کی ہر دل عزیزی بادشاہ کی نظر میں اس قدر تھی کہ جس وقت ان کا انتقال ہوا تو بادشاہ [illegible] روز تک [illegible] رہا [illegible] بہت سے کام کے آگے یہ مصرع پڑھتے جاتے تھے۔

" وزیر معظم ز دنیا گذشت "

اور پیچھے شاہ جہاں کی زباں پر یہ مصرع۔

" بہ ہنگام پیری عصایم شکست "

رواں تھا۔ اس مقدس باپ کی بیٹی سے وہ فرزند تولد ہوا جو اپنے عہد کا ہند میں فرد فرید تھا اور اس کے علاوہ جس کی قسمت میں دکنی آصفیہ سلطنت کی بنیاد رکھنی تھی۔ اس گوہر شب چراغ کی ولادت مسعود ربیع الثانی کی چودہ تاریخ سنہ ۱۰۸۲ھ میں ہوئی۔ فرزند دلبند کی ولادت سے ماں باپ کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی، فیروز جنگ بہادر دوڑے اور اپنے محسن آقا کے دربار میں اس مسرت کی اطلاع دی۔ معصوم نومولود کو عالم گیر نے " قمرالدین " کے نام سے موسوم کرنے کا حکم دیا اور کسی نے اسی زمانہ میں آپ کی تاریخ ولادت " نیک بخت " کہی۔ ابھی آپ نے اپنی معصوم زندگی کے چھٹے سال ہی میں قدم رکھا تھا کہ منصب سے سرفراز ہوئے۔ عالم گیر جیسی مردم شناس ہستی کے سامنے یہ مقدس صاحبزادہ پیش ہوا تو فرمایا کہ " آثار بزرگی در ناصیہ اش ہویدا۔ "

جب آپ نے بچپن سے عملی زندگی میں قدم رکھا اور انیس ۱۹ سال کی عمر کو پہنچے تو اورنگ زیب نے ۱۷۹۰ء میں جدی خطاب " چین قلیچ خان " اور صوبہ داری بیجاپور و منصب پنج ہزاری سے سربلند فرمایا۔

نواب مغفرت مآب نے دورِ عالم گیری میں متعدد خدمات انجام دیں۔ تسخیر کرناٹک میں آپ نے نہایت جاں فشانی دکھلائی۔ شاہ عالم بہادر شاہ اور اعظم شاہ کی آپس کی خانہ جنگیوں کے وقت اپنے آپ کو ان سے علیحدہ رکھا حالانکہ اس وقت آپ بحیثیت صوبہ دار بیجاپور، شہزادہ اعظم کے ماتحت تھے جنگ کے اختتام کے بعد بہادر شاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور " اودھ " کے صوبہ دار بنائے گئے۔ بہادر شاہی دربار سے 'خطاب' " خانِ دوران بہادر " عطا ہوا۔ اس وقت گورگانی خاندان کا قصرِ حکمرانی قریب انہدام تھا۔ عام اُمرا بلکہ خود اس تھمبے کے وارث انتہائی بے دردی کے ساتھ اس کے ڈھانے میں مشغول تھے۔ غرض یہ کہ تیموریہ خاندان کی عظیم الشان سلطنت انحطاط پذیر تھی۔ امرا سرکش اور باغی ہو گئے تھے دربار کی ساز بازنہ کار دوائیوں اور فرقہ بندیوں کو دیکھ کر حضرت نے صوبہ داری لکھنؤ سے کنارہ کشی اختیار فرمائی

اور ہندوستان کے جنوبی گوشے کو کنج عافیت جانا اور سرزمین دکن کو اپنے قدم میمنت لزوم سے مشرف فرماکر تقریباً پانچ سال تک یادِ الٰہی میں معروف رہے۔

جب ۱۷۱۲ء میں بہادر شاہ کا انتقال ہوا اور دلّی کی سلطنت جہاندار شاہ کے حصے میں آئی تو اس بادشاہ نے آپ کو مجبور کرکے گوشۂ تنہائی سے باہر نکالا اور ایک معزز عہدہ پر مامور کیا۔ بادشاہ کو بازاری آدمیوں کے اعزاز و برتری میں زیادہ انہماک تھا، اس لئے تمام اُمرائے سلطنت ناراض ہو گئے۔ اس عرصہ میں فرخ سیر نے حملہ کیا، آگرے کے قریب جنگ ہوئی۔ جہاندار شاہ مارا گیا اور ہندوستان کی شہنشاہیت کا تاج فرخ سیر کے سر دیکھا ہوا، تو آپ کو نہایت عزت و احترام کے ساتھ دربارِ شاہی میں طلب کر کے "خطاب نظام الملک بہادر فتح جنگ" و منصب ہفت ہزاری کے ساتھ صوبہ دارِ دکن و فوجدار کرناٹک مقرر کیا۔

۱۱۲۷ھ میں امیر الامراء سید حسین علی خان نے فرخ سیر کی ناراضی کی وجہ سے صوبہ داری دکن کا فرمان حاصل کیا اور نواب نظام الملک کو طلب کرکے مرادآباد کی فوجداری کی خدمت سپرد کی۔ تین چار سال تک آپ یہیں رہے۔ ۱۷۱۹ء میں وزیر اعظم سید عبداللہ خان کو معزول کرنے میں مدد دینے کے لئے دہلی طلب کئے گئے۔ کیونکہ بادشاہ وقت و امرا ، سادات بارہہ سے حد درجہ تنگ آچکے تھے جب آپ دہلی پہنچے تو بادشاہ کی بزدلی کے باعث یہ سازش ناکام ہو گئی پھر چندے یہیں قیام فرمایا۔ یہاں تک کہ سیدوں نے بادشاہ کو اندھا کرکے قید کر دیا اور آخر میں قتل کر ڈالا اور یکے بعد دیگرے، رفیع الدولہ و رفیع الدرجات بادشاہ بنائے گئے۔ بادشاہ گروں نے اس زمانہ میں آپ کو پٹنہ کا صوبہ دار مقرر کیا تھا جب سیدوں نے روشن اختر محمد شاہ کو بادشاہ بنایا تو شاہ موصوف نے حضرت نظام الملک کو مالوہ کی صوبہ داری عنایت فرمائی۔ کچھ دنوں بعد حسین علی نے آپ کے خلاف الزامات لگائے تو حضرت آصف جاہ نے اُن کا دنداں شکن جواب روانہ فرمایا۔ اس کے بعد حسین علی نے بادشاہ سے مالوے کی صوبہ داری بھی طلب کی تاکہ وہ دکن کا اچھی طرح انتظام کر سکے۔ اس کے معاوضہ میں آپ کو ملتان و آگرہ، الہ آباد، برہانپور کی صوبہ داری عطا کرنے کا انتظام ہوا۔ اسی دوران میں بادشاہ کے خطوط سیدوں کے استیصال کی نسبت پہنچے تو ۱۱۳۲ھ

میں مالوے سے دربار شاہی کو جانے کے عنوان سے دکن کی طرف روانہ ہو گئے۔ طالب خان سے قلعہ آسیر اور محمد انور خان قطب الدولہ سے شہر برہانپور صلح کر کے حاصل فرمایا۔ اسی سنہ میں سرزمین دکن پر حضرت مغفرت مآب کا قبضہ ایک صوبہ دار کی حیثیت سے ہو گیا۔

سیدوں کو ان حالات کا علم ہوا تو بڑے پریشان ہوئے حسین علی کا بھتیجا عالم علی خاں اس وقت صوبہ داری دکن کی نیابت پر فائز تھا۔ سب سے پہلے تیرہ ہزار سپاہ لے کر مقابلہ کے لئے نکلا۔ نواب نظام الملک نے اُسے برہان پور سے تیس ۳۰ کوس کے فاصلے پر شکست دی اور یکم اگست ۱۷۲۰ء کو عالم علی خان مارا گیا۔ اس کی فوج کے تمام بڑے بڑے افسر حضرت آصف جاہ سے مل گئے۔ ان میں مبارز خان صوبہ دار حیدرآباد بھی شامل تھا۔

ان فتوحات کی خبریں دہلی پہنچیں تو حسین علی بہت گھبرایا اور بادشاہ کو لے کر پچاس ہزار فوج کے ہمراہ دکن کی طرف روانہ ہوا تاکہ خود نواب آصف جاہ سے مقابلہ کرے جب حضرت کو اس کی خبر ہوئی تو آپ کے رفقاء کار نے حسین علی خان کے قتل کے منصوبے باندھے۔ اس معاملے میں اعتماد الدولہ امین خان (جو نواب آصف جاہ کے قریبی رشتہ دار تھے) سعادت خان، حیدر خان اور میر حیدر کاشغری شریک تھے فتح پور سیکری سے پچیس ۲۵ کوس کے فاصلے پر مقام "تورہ" میں حسین علی خان بادشاہ کے ساتھ آکر قیام پذیر ہوا جب بادشاہ سے مل کر اپنے خیمہ کی طرف جا رہا تھا تو راستے ہی میں میر حیدر کاشغری نے ایک درخواست پیش کی حسین علی اس کے پڑھنے ہی میں مصروف تھا کہ کاشغری نے نہایت سُرعت کے ساتھ تلوار کے ذریعے اُس کا کام تمام کر دیا۔

اسی اثناء میں عبداللہ خان قطب الملک وزیر اعظم آگرہ سے دہلی جا رہا تھا کہ راستے ہی میں اُسے اپنے بھائی کے قتل کی خبر ملی۔ فوراً گورنر دہلی کو حکم لکھا کہ ابراہیم بن رفیع الشان کو تخت سلطنت پر بٹھلا دے اور خود مع فوج جرار بھائی کے انتقام کے لئے کوچ کیا شاہ پور کے قریب پہنچا تھا کہ محمد شاہ کی فوج سے مقابلہ ہوا۔ فریقین میں زبردست معرکہ آرائی کے بعد عبداللہ خان زخمی ہو کر گرفتار ہوا۔ اور چند دن کے بعد انتقال کر گیا۔

سادات بارہہ کی قوت کے استیصال کے بعد محمد شاہ کی طرف سے اس کارنمایاں کے صلے میں التفات شاہانہ کا اظہار ہوا تو دکن کے انتظامات کے بعد آپ رونق بخش شاہ جہاں آباد ہوئے۔ اس عرصہ میں وزیر اعظم محمد امین خان اعتماد الدولہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ ۱۱۳۲ھ میں پیش گاہ سلطان سے صوبہ داری دکن کے علاوہ منصب وزارت عظمیٰ سے سرفراز ہوئے۔ آپ دارالسلطنت ہی میں تھے کہ گجرات میں حیدر قلی خان کی بغاوت کی اطلاع ملی۔ بغاوت فرو کرنے کے لئے دکن سے کوچ کیا۔ باغی کی تنبیہ و تادیب کر کے اپنے چچا نواب حامد خان صلابت جنگ کو نیابت صوبۂ گجرات پر مقرر فرما کر واپس لوٹے۔

نواب نظام الملک کی وزارت نے وہی شاہ جہانی اور عالمگیری زمانے کا رنگ پیدا کر دیا تھا، ادھر یہ لائق وزیر کی سرگرمی تھی تو ادھر بد قسمتی سے محمد شاہ عیش و عشرت کا دل دادہ ہو گیا۔ اُسے سلطنت کے کاروبار سرانجام کرنے بجائے شراب و کباب کا شغل تھا۔ اس خطرناک حالت میں دشمنوں نے اپنے اپنے مفاد کی خاطر سلطنت کو خوب لوٹا۔ بادشاہ اور وزیر میں بدظنی پیدا کروا دی اور محمد شاہ سے مبارز خان کو دکن کی صوبہ داری کا فرمان دلوا دیا۔ حالانکہ وہ حضرت آصف جاہ ہی کی بدولت منصب پنج ہزاری اور خطاب سے سرفراز ہوا تھا۔ جب آپ نے بادشاہ کی عیاشی اور دربار کی بُری حالت دیکھی تو محمد شاہ سے شکار کی اجازت لے کر دکن کی طرف رخ کیا۔ اُجین پہنچے تو مرہٹے ان کی آمد کی خبر سُن کر منتشر ہو گئے باغیوں اور سرکشوں کا قلع قمع کر کے دہلی واپس جانے کی فکر میں تھے کہ مبارز خان صوبہ دار حیدرآباد کی بغاوت کی اطلاع ملی۔

دکن آنے کے بعد مبارز خان کو صلح کا پیغام بھیجا۔ اس کے انکار کرنے پر بہ مقام شکر کھیڑہ (برار) فریقین کا مقابلہ ہوا۔ خوب گھمسان لڑائی کے بعد ۲۳ محرم ۱۱۳۷ھ کو مبارز خان مارا گیا۔ جملہ صوبہ جات دکن نواب آصف جاہ کے قبضۂ اقتدار میں آئے اور اسی سنہ میں نواب نظام الملک بہادر مملکت دکن پر بحیثیت خودمختار قابض و متصرف ہوئے۔ نیک دل نواب نے اس کے بیٹوں کو اپنی نگرانی میں لے لیا اور بعد میں بہت سارو پیہ پیسہ دے کر ان کی دلجوئی کی۔ اس اثنا میں خبر ملی کہ مبارز خان کا بڑا بیٹا احمد خان گولکنڈے میں محصور ہو گیا ہے۔ نظام الملک نے اسے بھی حُسن تدبیر سے رام کیا۔

اس جنگ کے اختتام کے بعد آپ انتظام مملکت میں ہمہ تن مصروف ہوئے اور مرہٹوں سے صلح کرلی ۱۱۴۹ھ میں مرہٹوں نے دہلی پر حملے کرنے شروع کر دے اور اُدھر نادرشاہ اپنے حملے کی الگ دھمکی دے رہا تھا (ان سب واقعات کا یہاں درج کرنا طولِ تعبیہ ہے۔ اس وقت محمد شاہ کی آنکھ کھلی اور گھبرایا فوراً نواب نظام الملک کو طلب کیا' آپ بلا کسی رنج وغم کے فطری جوشِ اطاعت میں دہلی روانہ ہو گئے یہاں آنے کے بعد ۱۱۵۰ھ میں محمد شاہ نے خطاب "آصف جاہ" سے ممتاز کیا۔ آپ کی تشریف آوری کی تاریخ محمد افضل نامی شاعر نے لکھی۔ رُباعی

صد شکر کہ ذاتِ دین پناہی آمد — رونقِ دہِ ملک پادشاہی آمد
تاریخ رسید نش بگوشم ہاتف — گفت' آیتِ رحمتِ الٰہی آمد
۱۱۵۱

مرہٹوں کی تادیب کے لئے بادشاہ نے اکبرآباد اور مالوہ کی صوبہ داری عنایت کرکے ان کے مقابلے کے لئے روانہ کیا نواب آصف جاہ بہادر نے بندیلہ کے راجہ کو ہمراہ رکاب لے کر بھوپال میں رونق افروزی کی۔ باجی راؤ بھی مع فوج کثیر مقابلہ کے لئے پہنچا۔ سواد بھوپال پر فریقین میں نہایت سرگرم معرکہ آرائی ہوئی لیکن نادرشاہ کے حملے کی خبر سن کر نواب صاحب صلح کرکے دہلی لوٹے۔ بادشاہ کے نااہل ہونے پر حریف کی مقاومت کے لئے مغلیہ فوج کے تین سپہ سالار مقرر ہوئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر ایک نے اپنی اپنی جدا راگ سے ساری فوج کٹا دی۔ حضرت آصف جاہ نے صورتِ حال کو سلجھانے کی بہت کوشش کی مگر جہاں کئی بگاڑنے والے تھے وہاں ایک کی سعی اور تدبیر سے کیا کام بن سکتا تھا؟ ۱۷۳۹ء میں کرنال کے قریب عظیم الشان جنگ ہوئی بادشاہ نے گھبرا کر جلد صلح کرلی۔ نادرشاہ واپس لوٹنے کی تیاری ہی میں تھا کہ برہان الملک نے اُسے دہلی جانے کی ترغیب دی اور کہا جاتا ہے کہ دہلی والوں نے خواہ مخواہ نادر کے قتل کی افواہ اُڑائی جب یہ خبر اُس کے کانوں تک پہنچی تو غصہ میں آکر فوج کو قتلِ عام کرنے کا حکم دے دیا۔ دہلی کے گلی کوچے جب خون سے رنگین ہو گئے تو عجب قیامت برپا ہو گئی۔ اس موقع پر حضرت آصف جاہ (خدائے تعالیٰ آپ کو جنتِ نعیم میں خاص جگہ دے) تلوار گلے میں لٹکائے' نادرشاہ کے روبرو حاضر ہوئے اور شہر کی حالت کی تصویر اس شعر کے ذریعے پیش کی ؎

کسی نماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کشی   مگر کہ زندہ کنی خلق راو باز کشی

تو نادرشاہ یہ کہتے ہوئے کہ "بریش سفیدت بخشیدم" قتل عام کو فی الفور روک دیا۔ نادر پر آپ کی عقلمندی اور حسن تدبیر کا اتنا گہرا اثر پڑا کہ چلتے وقت آپ سے کہا کہ

"میں نے تجھ سا آدمی ہی نہیں دیکھا، تو کو بادشاہی کے قابل ہے بجا، میں نے تجھے بادشاہ کیا، اگر کوئی تیری اطاعت سے سرتابی کرے گا تو میں اس کی کھال کھینچ ڈالوں گا۔" (جس کا خود آپ نے بھی ذکر فرمایا ہے) آپ کی غیرت و مروت نے یہ اجازت نہ دی کہ اپنے آقا کے تخت پر متمکن ہوں اس لئے سچی وفاداری کا ثبوت دیتے ہوئے اس امر کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ نادرشاہ آپ کی اس وفا شعاری کو دیکھ کر حیران ہو گیا۔ اس کے بعد بھی چار سال تک دہلی میں ہی رہ کر امور وزارت کو سرانجام فرماتے رہے۔ اس عرصہ میں دشمنوں نے دکن میں آپ کے فرزند ناصر جنگ کو باپ سے منحرف کروا دیا۔ حضرت نظام الملک نے سلطنت کو فتنہ و فساد سے پاک کرنے کے لئے بادشاہ سے رخصت حاصل کی اور ۲۰ر جمادی الاولیٰ ۱۱۵۴ھ کو ستر ہزار کے لشکر کے ساتھ دکن کی طرف کوچ کیا۔

آپ کے ہمراہ رکاب محمد ابوالخیر خان، خواجہ قلی خان، متوسل خان، جمیل بیگ خان، رحیم اللہ خان اور تسلیم خان وغیرہ بھی تھے کار آزمودہ اور باتدبیر باپ کے سامنے بیٹے کی کیا ہستی تھی، شکست کھائی اور قندھار کے قلعہ میں (جو ضلع ناندیڑ میں ہے) مقید کر دیئے گئے۔ ۱۱۵۶ھ میں کرناٹک کی جانب توجہ مبذول فرمائی کیوں کہ یہاں کا گورنر صفدر علی خان اپنے ایک سلبی بھائی مرتضیٰ خان کے ہاتھ مارا گیا تھا ملک میں بدامنی اور شورش برپا تھی، اس لئے فوج کشی کر کے امن و امان قائم کیا انورالدین خاں شہامت جنگ کو کرناٹک کی نظامت پر اور اپنے نواسے ہدایت محی الدین خان مظفر جنگ کو بالا گھاٹ کی گورنری پر مامور فرمایا۔

۱۱۶۱ھ میں احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر چڑھائی کی تو حملہ کی مدافعت کے لئے پھر دوبارہ دہلی سے آپ کی طلبی ہوئی۔ اس وقت آپ بیمار تھے اور ملک میں قحط الحالی سے رعایا پریشان تھی اس کے علاوہ آپ کا سن شریف (۸۹) سال کا بھی ہو چکا تھا، لیکن آقا کے حکم کے سامنے آپ ان سب مصیبتوں کو گوارا فرما کر دہلی کے قصد سے روانہ ہوئے۔ برہان پور میں پہنچے تھے کہ محمد شاہ کی موت اور احمد شاہ کی تخت نشینی کی

خبریں ملیں۔ وہیں سے مراسمِ تعزیت و تہنیت ادا کر کے دریائے نربدا کی طغیانی اور شدید بارش کے ایام میں دکن کی طرف لوٹے دیکھو سکہ ناندیر میں بغاوت کی اطلاع ملی تھی۔ برہان پور کے راستے ہی میں ۴ جمادی الآخر سنہ ۱۱۶۱ھ میں دنیا کے بکھیڑوں سے تنگ آکر متوجہِ بہشت ہوئے۔ آپ کی رحلت کی دو تاریخیں "خلد منزلت" اور "متوجہِ بہشت" بھی ہیں نعش کو اورنگ آباد روانہ کیا گیا جہاں حضرت برہان الدین اولیارؒ کے مزار کے بائیں جانب آپ کی تدفین عمل میں آئی۔

عجیب اتفاق ہے کہ اسی سنہ میں ہندوستان کے اور دو نام آوروں نے بھی وفات پائی، چنانچہ حضرت آزاد بلگرامیؒ نے اس سانحہ پر یہ قطعہ تاریخ لکھا ہے

سہ دُرِ مملکتِ ہند از جہان رفتند فغان حیف و سہ دُرِ یگانہ از کفِ دہر
برائے رحلتِ این ہر سہ یافتم تاریخ نماند شاہ زمان باوزیر و آصفِ دہر

کسی نے یہ مصرعۂ تاریخ بھی خوب لکھا ہے:-

"موت شاہ و وزیر و آصف جاہ"

آپ کے چھ صاحبزادے اور پانچ صاحبزادیاں تھیں جن کے نام ذیل میں درج کیے جاتے ہیں

۱) نواب فیروز جنگ ثانی (میر محمد پناہ، امیر الامرا غازی الدین خان) جو دہلی میں نواب آصف جاہ کی طرف سے نائب تھے۔

۲) نواب ناصر جنگ (میر احمد خان نظام الدولہ)

۳) نواب صلابت جنگ (میر محمد خان امیر الممالک)

۴) نواب میر نظام علی خان (اسد جنگ آصف جاہ ثانی)

۵) نواب بسالت جنگ (میر محمد شریف خان برہان الملک)

۶) نواب میر مغل علی خان (ناصر الملک ہمایوں جاہ)

۱) خیر النسار بیگم (۲) پادشاہ بیگم (۳) مکرمہ بانو بیگم (۴) خجستہ بانو بیگم عرف خان جہان بیگم صاحبہ (۵) محسنہ بیگم (۶) مہر بانو بیگم

حضرت غفران مآب نواب نظام الملک آصف جاہ ثانی علم و فضل زہد و تقویٰ میں بلند پایہ رکھتے تھے، بہترین سپہ سالار دور اندیش اور مدبر انسان تھے۔ حق تعالیٰ نے آپ کو تمام نیک صفات سے مزین فرمایا تھا۔ علمی قابلیت میں عہد عالمگیری کے امراء میں نہایت ممتاز درجہ رکھتے تھے تحریر و تقریر دونوں میں خاص ملکہ حاصل تھا عربی، ترکی، فارسی، ہندی زبانوں سے اچھی طرح واقفیت رکھتے تھے۔

فتوحات آصفیہ کے مولف کا بیان ہے کہ آپ نے ترکی زبان احمد یار خان المخاطب بہ ترکی خان سے سیکھی۔ فارسی کے خوش گو اور بلند فکر شاعر تھے شاکر تخلص اختیار فرمایا تھا، بعد میں آصف تخلص سے بھی شعر گوئی فرمائی ہے صاحب مرآۃ الصفا لکھتے ہیں کہ مرزا عبد القادر بیدل سے فارسی کلام کی اصلاح لیا کئے آپ کے دو دیوان ہیں جو طبع ہو چکے ہیں اور اب بھی حیدرآباد کے موجودہ روزناموں صبح دکن اور رہبر دکن میں اکثر آپ کا کلام اعلیحضرت بندگان عالی (خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ) کے حکم سے شائع ہوتا رہتا ہے اس لئے یہاں کلام کا نمونہ پیش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

حضرت مآب نہایت سیدھی سادی زندگی بسر فرماتے تھے صرف جشن کے موقعوں پر آپ کے دربار کی آرائش کی جاتی تھی۔ معمولی سواری پر تشریف فرما ہو کر باہر نکلتے اور سادہ لباس زیب تن فرماتے تھے۔

حضرت آصف جاہ مذہب کے بڑے پابند اور شریعت کے دلدادہ تھے یہی وجہ تھی کہ آپ نے دربار دہلی کی رنگ رلیوں اور خلاف شرع امور کو دیکھ کر گوشہ نشینی اختیار فرمائی حضرت موصوف حقوق العباد کے بڑے زبردست حامی تھے عدالت و انصاف اور رعایا کی بہبودی آپ کے خاص مقاصد تھے آخری ایام زندگی میں جو کبرسنی کا زمانہ تھا اور تقریباً پورے جنوبی ہند کے مالک ہونے کے باوجود کبھی بھی مذہب کی طرف سے غفلت نہیں برتی۔ اور اپنی (۲۰) سالہ دور حکومت میں کبھی کسی شخص کے قتل کا حکم صادر نہ فرمایا۔

آپ کے عہد میں وزرائے سلطنت اپنے اپنے کاروبار کے ذمہ دار ہوتے تھے ہر ایک ضرورت کے لئے علحدہ محکمہ قائم تھا سر رشتہ مال کے ذریعے ملک کی ضلع بندی عمل میں آئی، تعین لگان کے لئے محکمہ بندوبست کا بھی وجود عمل میں لایا گیا تھا، سر رشتہ مذہبی علحدہ قائم تھا اور ایک محکمہ بھی تھا جہاں مداخل و مخارج کا گوشوارہ مرتب کیا جاتا تھا۔ سر رشتہ آبپاشی اور تعمیرات کے ثبوت میں عہد آصفی کے تالاب اور عمارتیں شاہد

ہیں۔ چنانچہ ۱۱۴۱ھ میں شہر برہان پور کی حصار تعمیر کروائی۔ نظام آباد، فرداپور وغیرہ آباد کیا اور نیز شہر حیدر آباد کی بھی از سر نو ترمیم کروائی۔

تجارت کی گرم بازاری کے لئے امن و امان قائم فرمایا اجناس کا نرخ مقرر کرکے رعایا کی آسانیوں میں اضافہ فرمایا۔ بیمار جانوروں کے گوشت کو فروخت کرنے سے منع کیا۔ ۲ ہزار کی رقم جو تاجروں وغیرہ سے وصول ہوتی تھی اس کو بند کروا دیا۔ شہر کے نظم و نسق کے لئے ایک کوتوال کو مقرر فرمایا۔ صوبہ داروں کی مدت ملازمت دو سال یا تین سال رکھی تاکہ ان کو بغاوت و سرکشی کا موقع نہ ملے۔ دفتر تعلیمات و طبابت جو رعایا کی بہتری کے اہم جُز ہیں مذہبی اصول پر قائم کروائے۔ ہر سال رقم کی ایک کثیر تعداد مکہ معظمہ وغیرہ کو روانہ کی جاتی تھی۔ سالانہ اور دیگر مواقع پر خیرات کے لئے ایک معتد بہ رقم مختص کردی گئی تھی۔

نظام فوج بھی عمدہ اصولوں پر مبنی تھا، فوجیوں کو ہر سال رخصت ملا کرتی تھی تاکہ وہ اپنے اہل و عیال سے ملنے کے بعد تازہ دم ہو کر ملک و مالک کی خدمت کے لئے آسانی سے تیار ہو جائیں۔ ان ہی خوبیوں کے باعث حضرت آصفجاہ کی سخاوت و علم پروری، انصاف و دادرسی کا شہرہ دُور دُور تک پہنچا۔ ایران و ہندوستان اور عرب وغیرہ سے بڑے بڑے باکمال آپ کے دربار میں حاضر ہو کر اپنے اپنے مقاصد میں کامیاب ہوتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ آپ کا دربار علمائے کرام اور اولیائے عظام کا مرجع و ماویٰ بن گیا اور آپ کو بھی ان لوگوں سے خاص عقیدت تھی۔ چنانچہ جب حضرت آصف جاہ شہنشاہ دہلی سے دکن کی صوبہ داری کا فرمان لے کر روانہ ہوئے تو جاتے ہوئے لال قلعہ کے قریب حضرت شیخ کلیم اللہ جہان آبادی علیہ الرحمہ کی خدمت میں حاضر ہو کر حضرت شیخ سے طالب دعا ہوئے تو شیخ موصوف نے دعا کی اور ایک رقعہ اپنے مرید خلیفہ حضرت شاہ نظام الدین اورنگ آبادیؒ کے نام لکھا (جو حسب الحکم اپنے مرشد کے یہاں مقیم تھے) نواب نظام الملک بہادر حضرت نظام الدین اورنگ آبادیؒ سے ملے۔ مرشد کا خط دیا اور دعا چاہی، آپ اس وقت کھانا کھا رہے تھے۔ ایک روٹی پیلے کپڑے میں لپیٹ کر آپ کے حوالے کی۔ آپ اس کو لے کر روانہ ہو گئے۔ ہمیشہ اس تبرک کو اپنے ساتھ رکھتے اور جہاں جاتے فتح و نصرت سے واپس ہوتے تھے۔ حضرت آصف جاہ نے اس تبرک کو اپنے لئے نشانِ اقبال سمجھا، اس کی یاد ہمیشہ تازہ رکھنے کے

(باقی صفحہ ۳ پر)

"نظارہ پرست"

حسین ساگر

سروجنی نائیڈو کا وہ دلربائی رِک جو انہوں نے "حسین ساگر" پر لکھا ہے پڑھ کر اس کا حقیقی لطف وہی اٹھا سکتا ہے جو حسین ساگر کے پُر لطف منظر سے لطف اندوز ہو۔ جس طرح شمالی انگلستان کی جھیلیں ورڈسورتھ کے بیباک تخیل کے لئے تازیانہ جمال بنیں وہی احساس جمال فطرت حسین ساگر کے منظر نے سروجنی نائیڈو کے قلب میں پیدا کیا۔

آفتاب کی آخری کرنیں 'دامنِ شفق میں اس طرح آشکار ہیں جیسے "نغمے بیتاب ہوں تاروں سے نکلنے کے لئے" لیکن فطرت غروب ہوتے ہوئے آفتاب کو رات ختم ہونے سے پہلے سر اٹھانے کی اجازت نہ دے گی شفق کا عکس تالاب پر پڑ رہا ہے۔ گویا پانی میں آگ لگی ہوئی ہے اور سبز درختوں کا سایہ چاروں طرف پانی پر سبز سے سیاہ رنگ اختیار کر رہا ہے درختوں میں سے جا بجا جھانکتے ہوئے مکان نظر آ رہے ہیں گویا وہ انسان کی اس نقالی قدرت کی داد دے رہے ہیں اور خود اس منظر کو چار چاند لگا رہے ہیں

حسین ساگر کی نرم موجیں ایک پیہم آہستگی کے ساتھ بار بار اٹھتی ہیں اور پھر منظر کی دلفریبی میں اپنی ایک جھلک سے اضافہ کرتی ہوئی گم ہو جاتی ہیں۔

محسوس ہونے لگتا ہے کہ ہم ہندوستان میں بیٹھے ہوئے سوئٹزرلینڈ کی کسی دلربا جھیل کا لطف اٹھا رہے ہیں یہ چھوٹا سا تالاب بجائے خود انسانی حسن کاری کا ایک کمال ہے گویا انسان نے دامانِ قدرت

نے کلچینی کی اور اس سہانے گلدستے کا نام حسین ساگر رکھ دیا۔

رات کی تاریکی بڑھتی جاتی ہے چاروں طرف برقی روشنیاں جگمگانے لگتی ہیں، سکندرآباد کا کٹہ دوسری جانب سے ایک کہکشاں معلوم ہوتا ہے جو زمین پر اتر آیا ہو اور خود کٹے سے تالاب کے دوسری جانب کی عمارتیں روشنی سے بقعۂ نور معلوم ہوتی ہیں۔

روشنیاں اور پانی پر روشنیوں کا عکس...... اس فضائے نور میں معلوم ہوتا ہے کہ گویا خود ہوا میں برقی روشنیاں منعکس ہو رہی ہیں۔

دور بہت دور ریل کی سیٹی یا گڑگڑاہٹ کی آواز اس دور دراز خاموشی کو چیرتی ہوئی سنائی دیتی ہے اور یہ محسوس ہوتا ہے جیسے کسی نے خواب سے بیدار کر دیا ہو اور پھر حسین ساگر کی نورانی لہروں پر نظر پڑتی ہے جن کا غیر مسموع لیکن محسوس ترنم سرگوشیاں کرتا معلوم ہوتا ہے۔

بہت رات گزر جاتی ہے۔ آسمان پر تاروں کے جلوہ میں چاند جلوہ افروز ہوتا ہے مضراب سماکی خاموشی میں یہاں پانی میں بھی حسین ساگر کے اندر بھی ایک لرزاں، بیتاب نورانی قمر کے طلوع ہونے سے ایک ہلچل مچ جاتی ہے۔

چاند کی روشنی میں دور دراز عمارتیں زیادہ صاف، زیادہ دلفریب معلوم ہوتی ہیں۔ درختوں کی خاموشی میں بھی ایک ادا شے حسن پیدا ہو جاتی ہے پورا منظر ایک ردائے نورانی کو اوڑھ کر بالکل ایک معلوم ہونے لگتا ہے اور قدرت اپنی وحدت کو اپنی مصوری سے نمایاں کرتی ہے۔

چاند کا عکس حسین ساگر کے پانی میں دیکھ کر پہلی مرتبہ صنم پرست یونانیوں کے عقیدے پر ایمان لانا پڑتا ہے کہ چاند کی دیوی ڈائنا اپنے بلند آشیانے سے اتر کر سطح آب پر رقص کر رہی ہے اس کی کرنیں، چشم فسوں افشاں کی پلکیں بن کر دلوں کو مدہوش کر رہی ہیں۔

اب سمجھ میں آتا ہے کہ کیوں کر میر کو چاند سے ایک نورانی شکل نکل کر آتی ہوئی معلوم ہوتی تھی جس نے ان کے ادراک و حواس کو بیکار کر دیا تھا۔

ابر کا ایک ٹکڑا چاند کو اپنی آغوش میں چھپا لیتا ہے۔ منظر پر ایک لخت ایک تاریک سا پردہ

(باقی بر صفحہ ۹۴)

جناب صدق جائیسی

نظم

غبارِ رنگیں

حیدرآباد کی ایک یادگار شام

گلگشت کو نکلی ہیں حورانِ بہشتی کچھ : اِندر کے اکھاڑے کا نقشہ نظر آتا ہے

تسخیر ملائک کی حاصل ہے جسے قدرت : اُس حسن کا ہر دل پر قبضہ نظر آتا ہے

مصروفِ تماشا ہو اک سروِ خراماں بھی : بوٹا سا وہ قد کیسا زیبا نظر آتا ہے

انساں تو کجا آگے اس صبح لطافت کے : رنگِ گلِ نسریں بھی میلا نظر آتا ہے

ہر چند کہ مجمع میں بیگانہ سا ہو سب سے : ہر شخص کو لیکن وہ اپنا نظر آتا ہے

جس کی طرف اٹھتی ہیں کافر کی گھنی پلکیں : وہ نرگسِ جادو کا کشتہ نظر آتا ہے

مجلہ مکتبہ جلد (۹) شمارہ (شمارہ ۲) ماہنامہ شہر یور ۱۳۴۱ف م جولائی ۱۹۳۲ء

نواب بہادر یار جنگ

ایشیا، کدھر سفر کر رہا ہے

عنوان بالا پر ملک کے نامور رئیس اور حیدرآباد کے سب سے بڑے سماجی خدمت گزار نواب بہادر یار جنگ صدر انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ نے عربک کالج دہلی میں ۱۲ مارچ ۱۹۴۳ء کو تقریر فرمائی تھی جلسہ کا انتظام حضرت خواجہ حسن نظامی نے کیا تھا پوسٹر میں عنوان لکھا تھا "دہلی میں نیا ابن بطوطہ" جس میں نواب صاحب کی سیاحت دوستی کی طرف اشارہ ہے جلسہ کے صدر سر محمد یعقوب ممبر لے جس لیٹو اسمبلی تھے۔

تقریر ایک بہت بڑے مجمع کے سامنے ہوئی جو دہلی کے سربرآوردہ لوگوں پر مشتمل تھا تقریر ہندو، مسلمان سب میں اس قدر مقبول ہوئی کہ مسٹر چمن لال رپورٹر ہندوستان ٹائمز نے اس کی پچاس ہزار کاپیوں کی طباعت کے لئے اپنی طرف سے انتظام کرنے کی خواہش ظاہر کی ایسی پُر مغز اور تجربہ پر مبنی تقریریں بہت کم ہوتی ہیں۔ ہم مکتبہ" کے قارئین کرام کے لئے اس کو یہاں پیش کر رہے ہیں۔ اُمید ہے کہ بہت دلچسپی سے پڑھی جائے گی اس میں ترکوں کے متعلق بعض غلط نشریوں (PROPA GUNDAS) کا ازالہ کیا گیا ہے۔

(مکتبہ)

حامد تعریف اس خدائے واحد و لاشریک کو سزاوار ہے جس نے اپنی خلّاقیت کے صدقے میں انسان

ضعیف کو قوت ایجاد و اختراع فرمائی سریع السیر سواریوں کے ذریعہ زمین کی طنابیں کھینچ دے اور چند ماہ کی قلیل مدت میں ربع مسکون کا چپہ چپہ چھان دے۔

واجب الاحترام صدر اور معزز حاضرین۔ بیسویں صدی عیسوی میں جب کہ طبع اور لاسلکی کی قوتوں نے مشرق و مغرب کے ڈانڈے ملا دئے ہیں اور پلک جھپکاتے ہزاروں کوس دور کے واقعات کو معلوم کر لینا ممکن کر دیا ہے کسی ایسے سیاح سے جس نے ڈیڑھ سال قبل دنیا کے بعض حصوں کو دیکھا تھا یہ توقع کرنا کہ وہ نئی بات آپ کے سامنے پیش کر سکے گا۔ میرے خیال میں اُمید موہوم سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا زمانہ کی رفتار قرن بستم میں برق و نظر کی رفتار سے بھی زیادہ تیز ہو گئی ہے میرے دیکھے ہوئے ممالک کو ہی لیجئے کتنے ایسے ہوں گے جن میں اس ڈیڑھ سال کے عرصہ میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں ایسی تبدیلیاں واقع ہو چکی ہوں گی جن کے بعد پرانے حالات کو دہرانا آپ کا وقت ضائع کرنا ہے اور نہ میں اس وعدہ کی جرأت کر سکتا ہوں کہ کوئی نئی چیز آپ کی خدمت میں پیش کر سکوں گا۔ لیکن حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب نے (جو زمانہ کی نبض کو آپ سے اور مجھ سے زیادہ بہتر جانتے اور پہچانتے ہیں) ایک ایسا عنوان میرے لئے منتخب فرمایا ہے جس کا تعلق واقعات سے زیادہ ان کے نتائج اور میرے تاثرات و احساسات سے ہے اس لئے جو کچھ دیکھا اور ان کے ذریعہ جو کچھ سمجھا اس کو بامتثال امر حاضر خدمت کر رہا ہوں۔

میں نہیں جانتا کہ روس، چین، جاپان اور جزائر شرق الہند کے شامل نہ ہونے کے باوجود میرے تاثرات کو کس طرح سارے ایشیار سے متعلق کہا جا سکتا ہے اگر خواجہ صاحب نے بجائے "ایشیار" کے "بلاد اسلامیہ" کہا ہوتا تو زیادہ مناسب ہوتا لیکن بیسویں صدی کے ربع اول میں مشرق کے جس حصہ نے تنزل و ارتقار کے میدان میں ایشیار کی نمائندگی کی وہ یہی ممالک اسلامیہ تھے اس لئے ان کے انقلابات و نتائج حالات سے اگر ایشیار کی عام حالت پر تبصرہ کیا جائے تو کسی طرح نامناسب نہیں ہو سکتا۔

میری سیاحت کا تعلق بالکلیہ بیسویں صدی عیسوی سے ہے لیکن حال کا صحیح تصور نہیں قائم کیا جا سکتا جب تک ماضی کی مٹی ہوئی تصویر پر سرسری ہی سہی ایک نظر نہ ڈال لی جائے۔ آپس کی جنگ و جدل

اور اندرونی کشمکش و اضطراب کے باوجود جو تاریخ کے کامیاب سے کامیاب دور میں بھی پایا جاتا ہے مشرق کا آفتاب عظمت و جلال اٹھارہویں صدی عیسوی کے اواخر تک تابندگی کے ساتھ بلند رہا اور یہی وہ دورِ تنزل ہے جب کہ صدیوں کی مسلسل و کامیاب حکومت نے مشرقی سلاطین و رعایا دونوں کو عیش پرستی و آرام طلبی کا شکار بنا دیا تھا۔ ایک طرف قوتِ فیصلہ ان سے سلب ہو گئی دوسری طرف اعضاء کی کہولت و راحت طلبی نے ان کو رزم سے زیادہ بزمِ طرب کا شیدائی بنا دیا۔ تدبر و فراست ہمیشہ انہی اقوام کا سرمایہ رہے ہیں جن میں طلبِ حیات کی سرگرمی موجود رہی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان میں اکبر و عالمگیر، ایران میں عباس و اسمٰعیل صفوی اور روم میں سلیمان و سلیم کے جانشین شاہِ شطرنج اور شیرِ قالین بن کر رہ گئے اور یہی وہ دور ہے جب کہ مغرب کے تاجروں نے بازاروں سے گذر کر مشرق کے دربار میں قدم رکھا۔

ہندوستان جس کو جسدِ مشرق کا قلب کہا جا سکتا ہے دوسروں کے استقبال کے لئے تیار تھا طوائف الملوکی اور آپس کی کشمکش نے امکانات کو زیادہ قوی کیا اور یہ پہلی اور زبردست کامیابی تھی جو مشرق پر مغرب نے حاصل کی۔ دنیا کا ایک انسان بھی ہاتھ آئی ہوئی نعمتِ خداداد سے آسانی کے ساتھ دست بردار ہونے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا۔ مغرب نے بھی یہی کیا کہ ہندوستان پر اپنے قبضہ کو مستحکم و مضبوط بنانے کے کسی موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیا یوں تو مشرق کی بدبختی اپنی ناعاقبت اندیشی کی وجہ سے ہر وقت کچھ نہ کچھ سامان مغرب کی کامیابی کے لئے فراہم کرتی رہی لیکن اس کی تکمیل جنگِ عظیم کے نتائج نے کر دی۔ کیا آپ یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ سنگاپور جزائر مشرق الہند اور عدن کا تسلط اسی ہندوستان کی خاطر تھا اب عراق فلسطین اور مصر کا انتداب اسی ہندوستان کے لئے خلیج فارس اور بحرِ قلزم کا راستہ صاف کرنے کی خاطر ہے۔

ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ افغانستان، روس و انگلستان کی چکی میں دانہ بنا ہوا تھا۔ ایران میں جنوب سے بڑھنے والی فوجیں کرمان و مشہد تک اور شمال سے آنے والی جمعیتیں ہمدان و قزوین تک پہونچ چکی تھیں۔ روم کا مردِ بیمار دم واپسیں لے رہا تھا اور وحدتِ عربیہ کا شیرازہ خواب نا آشنائے تعبیر ہو چکا تھا۔

مجھے ان گذشتہ الفاظ کے ذریعہ صرف ایشیاء کے انقلابات ماضیہ کی طرف اشارہ کرنا تھا اب حال سے متعلق سنئے۔ جنگ عظیم جہاں ایشیا پر یورپ کے تسلط کی آخری کڑی تھی وہیں ایشیاء کے بخت خفتہ کی بیداری کا آلارم اور اس کے قفل محبس کے لئے ضرب شمشیر ثابت ہوئی۔ سوتے ہوئے ایشیاء نے انگڑائی لی مرتے ہوئے بیمار نے آنکھ کھولی اور جذبہ حریت خودداری حیات تازہ کی طرح چین سے ایشیائے کوچک تک اور سائبیریا کے برف پوش میدانوں سے راس کماری تک جسد ایشیاء میں سرایت کر گیا ایک ہی غلغلۂ بیداری تھا جو مصر میں زاغلول پاشا کی، شام میں امیر شکیب ارسلان کی، ترکیہ میں غازی مصطفیٰ کمال پاشاہ کی، روس میں لینن کی، اور ایران میں رضا خاں پہلوی کی زبان سے بلند ہوا۔ یہی آواز غازی امان اللہ کی زبان سے نکل کر فضائے افغانستان میں گونجنے لگی۔ اس کی صدائے بازگشت چین سے سنی گئی اور اسی جذبۂ جان نواز کو تلک و گاندھی نے ہندوستانیوں کے قلب میں پیدا کرنے کی کوشش کی۔ حیات و زندگی کی اس سعی میں وہ قومیں کامیاب ہو گئیں جو قومیت متحدہ رکھتی تھیں اور جن میں نفاق و شقاق نے انتشار و پراگندگی نہ پیدا کی تھی۔ جتنی قومیں یا جو ممالک ایشیاء اس وقت محروم استقلال و حریت ہیں ان کی ناکامی کے یوں تو بہت سے اسباب ہو سکتے ہیں مثلاً قابضین کی قوت و طاقت خود ان کی عدم صلاحیت، مواقع کی عدم موجودگی وغیرہ۔ لیکن ایک سب سے اہم اور قابل غور سبب جس کو ان کے اسباب ناکامی کا قدر مشترک کہا جا سکتا ہے وہ ان کا آپس کا تفرق و انشقاق ہے۔ ہندوستان کی خانہ جنگی آپ کے سامنے ہے مصریں وفدیوں اور شعبیوں کو متصادم ہوتا ہوا آپ نے سن ہی لیا ہے عراق میں سُنی و شیعہ کی تفریق کو وہم و اندیشہ نہ سمجھئے اور فلسطین کو دیکھیے کہ اگر وہاں کوئی آپس میں لڑنے والا نہ تھا تو اب یہود اپنی وطنیت کے جذبہ کے تحت وہاں اس کا سامان پیدا کر رہے ہیں لیکن کوئی وجہ نہیں ہے کہ یہ حالات آپ کو مایوس کر دیں۔ جنگ عظیم کی بھڑکتی اور برستی ہوئی آگ نے ایشیاء کے سوکھے جنگلوں میں احساس بیداری کی جو چنگاری پھینکی ہے وہ بجھ نہیں گئی آہستہ آہستہ سلگ رہی ہے اور ایک روز سارے

مشرق کو گرما کر رہے گی۔

حضرات! اب تک آپ نے جو کچھ سنا وہ ایشیا کا سیاسی سفر تھا آپ نے اس سے اندازہ کیا ہوگا کہ اس کی منزل سیاست معین ہے اور وہ مضبوط قدموں کے ساتھ اس کی طرف بڑھ رہا ہے لیکن کیا آپ کسی قوم یا ملک کی ترقی کے لئے صرف سیاسی ترقی یا سیاسی ہلچل کو کافی تصور فرماتے ہیں۔ میرے خیال میں تو اس زمانۂ علم وعمل میں سیاسی ترقی بھی منحصر ہے دماغی اور اقتصادی ترقی پر۔ اب غور کیجئے کہ ایشیا کا علمی و اقتصادی سفر کس حد تک اطمینان بخش ہے۔ ان میں سے ہر ایک عنوان ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے اور ایک مستقل بحث چاہتا ہے کہ اس پر گفتگو کی جائے فی الحال ایک سرسری نظر اس پر ڈالی جائے گی۔

مشرق کی تاریخ شاہد ہے کہ وہ ہمیشہ سے علم و حکمت کا گہوارہ رہا ہے۔ چند روز کے لئے اس کی کاہلی اور آرام طلبی نے اس کو سست اور مغرب کی بیداری و جوش عمل نے اوس کو زیادہ تیز قدم کر دیا تھا۔ اب ایشیا علم کی طرف توجہ کر رہا ہے اور نہ صرف اپنی کھوئی ہوئی دولت سے بلکہ دوسروں کی جمع کی ہوئی دولت سے بھی اپنے جیب و دامن بھرنے کی فکر میں ہے جہاں وہ دوسروں کے کرم کا محتاج ہے وہاں وہی سیکھنے اور معلوم کرنے پر مجبور رہتا ہے جو اس کے آقا اس کو سکھا دیں اور بتا دیں۔ لیکن جہاں اس کی مرضی اس کے افعال پر قادر ہے وہاں اس نے اپنی قومی ضروریات کے مطابق اپنے نصاب مرتب کر لئے ہیں۔ جاپان و روس کی کیوں پوچھتے ہو۔ کہہ سکتے ہو کہ انھوں نے (اپنے نقطۂ نظر سے) منزل کو پا لیا ہے ترکیہ کو لو جس کا نصاب تعلیم نہایت مکمل اور قومی ضروریات پر مبنی ہے اور جس کی کوشش فوجی قوت کے استحکام سے کہیں زیادہ ملک میں علم و حکمت پھیلانے پر صرف ہوتی ہے۔

اس زندہ قوم کی دقت پسند طبیعت نے عین اس زمانہ میں جب کہ اس کو دشمنوں سے لڑنا دوستوں سے معاہدات کرنا، گھر کو سنبھالنا اور باہر کی نگرانی کرنا تھا عربی رسم الخط کو ترک کر کے اور لاطینی رسم الخط کو اختیار کر کے اپنے لئے ایک نئے کام کا اضافہ کر لیا۔ اب ہر قسم کی نصابی کتابیں لاطینی رسم الخط اور ترکی زبان میں تیار کر لی گئی ہیں تعلیم عام اور جبری ہے۔ مخالف اسلام و مخالف

ترک پروپیگنڈا کرنے والے مشن اسکولوں پر سخت نگرانی قائم کر دی گئی ہے حربی اور بحری تعلیم کے مدارس پر خاص توجہ دی جا رہی ہے۔ ایران گو کوئی مستقل یونیورسٹی اپنے پاس نہیں رکھتا اور اب تک دو مشن یونیورسٹیاں امریکہ اور انگلستان سے آکر اس کے فرزندوں کی تربیت کر رہی تھیں لیکن اس کی وزارت معارف اپنے ملک کے لئے خود نصاب مرتب کرتی اور اپنی نگرانی میں اشاعت تعلیم کی کوشش کر رہی ہے۔ تقریباً دو سو طلباء ہر سال ایران سے یورپ جاتے اور جدید انکشافات علمی اپنے ساتھ اپنے بھائیوں کے لئے لاتے ہیں جب میں دارالسلطنت میں تھا تو خود اعلیٰحضرت رضا شاہ تبریز تشریف لے گئے تھے کہ اپنے نوعمر و جوان بخت ولیعہد کو دوسرے ایرانی طلباء کے ساتھ تعلیم کے لئے یورپ روانہ کریں اور اپنی رعایا کے لئے نمونہ پیدا کریں۔

افغانستان ایک مفلس اور غریب ملک ہے پھر بھی غازی امان اللہ خان کی مساعی نے کابل میں خاصہ علمی ذوق پیدا کر دیا۔ صرف مدرسہ حبیبیہ انگریزی زبان میں تعلیم دیا کرتا تھا۔ عہد امانی میں دو نئے دارالعلوم مکتب امانی اور مکتب امانیہ قائم ہو گئے جو المانی اور فرانسادی زبان میں تعلیم دیتے ہیں یہاں کے کامیاب طلباء کی تکمیل تعلیم کے لئے ایک طرف جرمنی اور ہالینڈ اور دوسری طرف فرانس اور سوئٹزرلینڈ سے افغانستان نے خاص معاہدے کئے ہیں۔ غازی امان اللہ خاں کا عاشق ملت دل چاہتا تھا کہ کم از کم مدت میں اپنی قوم کو پوری طرح زیور علم سے آراستہ کر دے۔ ان کی اسی کوشش نے افغانستان میں قبل از وقت تعلیم کو جبری کیا۔ اچھے اساتذہ کی فراہمی دشوار بلکہ ناممکن تھی مجبوراً لڑکے انہی ملاؤں کے سپرد کئے گئے جن کو امان اللہ خاں ملک کی ترقی کا مانع تصور کرتے تھے۔

افغانستان کے گذشتہ انقلابات کی ایک بڑی وجہ میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ قوم کی پوری ذہنی تربیت کئے بغیر ملاؤں کے ساتھ بدسلوکی نے مدارس افغانستان کو مرکز بغاوت بنا دیا تھا۔ یہ ایک نہایت تفصیل طلب موضوع ہے جس کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ گذشتہ انقلاب نے افغانستان کی علمی ترقی کو سخت نقصان پہنچایا۔ کتب خانے تلف کر دیئے گئے لیابوریٹریز (معامل سائنس) برباد کر دی گئیں۔ اور مدرسے اجاڑ دیئے گئے اور یہ صرف اس ذہنیت کے تحت ہوا کہ جوش میں

بھرے ہوئے افغانوں کے نزدیک یہی مرکز الحاد و زندقہ تھے ۔ الحمد اللہ کہ اب پھر افغانستان علمی ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہے ۔ اعلیٰحضرت نادر شاہ کی ہر قسم کی مساعی ارتقا کو میں کہہ سکتا ہوں کہ انہی بنیادوں پر قائم ہیں جو غازی امان اللہ خاں نے رکھی تھیں لیکن رفتار عاقبت اندیشانہ اور مطابق حالات ملک اختیار کی جا رہی ہے ۔

الغرض ایشیا کی علمی بیداری میں شبہ نہیں لیکن مغربی علوم نے ایشیا پر کیا اثر کیا؟ اور ایشیا نے کس حد تک خذ ما صفا و دع ما کدر کی حکمت عملی اختیار کی اس کو کچھ دیر بعد عرض کروں گا ۔

اقتصادیات ہندوستان پر مغرب کے تسلط کے قبل ہی یورپ نے اپنے تجارتی و صنعتی جال تمام ایشیا پر پھینکنے شروع کر دئیے تھے اور یہی وہ سب سے زبردست حملہ تھا جس کو ایشیا برداشت نہ کر سکا ۔ اس کی خام پیداوار تھوڑے ہی دنوں بعد اپنی شکل بدل کر اس کے خزانوں پر ڈاکہ ڈالتی تھی اس کا معیار زندگی یورپ کے موجودہ تمدن کی تقلید میں دن بدن بلند تر ہو رہا تھا ۔ اپنی معمولی سے معمولی ضرورت کی تکمیل کے لئے وہ مغرب کا دست نگر بنتا جا رہا تھا جہاں مغرب کو تسلط حاصل ہو گیا تھا وہاں اس نے اپنی حکومت و طاقت سے کام لے کر مشرق کی صنعت کو فنا اور اپنی صنعت و تجارت کو ترقی دینے کی کوشش کی ۔ اور جہاں اس کی حکومت نہیں تھی وہاں خود اس کے مال کی نفاست و پاکیزگی آرام دہی اور آسائش بخشی اہل ایشیا کے قلوب کو اپنی صنعت سے متنفر اور اس کی مصنوعات کا شیدائی بنا رہی تھی ۔ الغرض ایشیا کے سیاسی مصائب کی طرح اس کے اقتصادی مصائب کی انتہا بھی جنگ عظیم پر ہوئی ۔ اب ایشیا کے جیب خالی ہو چکے تھے اس کی تجوریوں کا روپیہ مغرب کے بنکوں کی زینت بن رہا تھا اس لئے اس میں اتنی طاقت تو تھی نہیں کہ یورپ کی صنعت کے مقابلہ میں اپنی صنعت کو پیش کرتا اور مارکٹ میں اس کے مال کے سامنے اپنا مال رکھ کر اپنے آپ کو بڑھانے کی کوشش کرتا ۔ روس اور جاپان جن کے پاس اتنی قوت تھی آج آپ ان کی طاقت کا اندازہ کر رہے ہیں کہ ایک ساری

دنیا کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کر کے صرف اپنے آپ کو درست کرنے اور آئندہ انقلاب کے لئے تیار ہونے کی فکر میں ہے اور دوسرے کی سیاسی طاقت کا راز جس نے حال میں مجلس الاقوام کی تجاویز کو ٹھکرا دیا صرف اس کی اقتصادی ترقی میں پنہاں ہے۔

جنگ عظیم نے سیاسی بیداری کی طرح ایشیا میں اقتصادی بیداری بھی پیدا کی۔ اور ایشیا کے مدبر سوچنے لگے کہ وہ پھر کس طرح یورپ کے اقتصادی طوفان کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اس وقت ان کو وہی تدبیر سوجھی جو فطرت ہر مجبور انسان کو وقت پر سمجھا دیا کرتی ہے یعنی اپنی چیز کو خواہ وہ خراب ہی کیوں نہ ہو دوسرے کی چیز پر ترجیح دینا اور اس پر قانع ہونے کی کوشش کرنا وہ بجائے اس کے کہ اپنی تہی دامنی کے باوجود یورپ کی صنعتی ترقی کا مقابلہ کرتے! انہوں نے اپنی قوم کی ذہنیت کو بدل کر اپنی چیز کو پسند کرنے اور حتی الامکان دوسروں کی مصنوعات کو ترک کرنے کا جذبہ اس کے دل میں پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ہندوستان کو اس تحریک کی ابتدا کا فخر حاصل ہے۔ لیکن دوسرے ممالک نے اس کے اس مجرب نسخہ کو اپنے امراض معاشی کے علاج کیلئے فوراً منتخب کر لیا۔ مصر میں مجھ سے مصطفےٰ نحاس پاشا جانشین زاغلول مرحوم نے فرمایا کہ ہندوستان کی تمام سیاسی تحریکات میں وہ سودیشی کی تحریک کو سب سے زیادہ پسند کرتے ہیں اور اس تحریک نے ان کے دل میں گاندھی جی کی عظمت بڑھا دی ہے چنانچہ اس وقت ان کے جسم پر جس قدر لباس میں دیکھ رہا ہوں وہ سب مصر کے تیار کئے ہوئے پارچہ کا ہے شام میں پارچہ بافی اور خصوصاً ریشمی کپڑے کی صنعت روز بروز ترقی کر رہی ہے اور مصنوعات وطنیہ کی طرف شامیوں کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔ ترکیہ نے ہر قسم کے کارخانے اپنے ملک میں جاری کر رکھے ہیں اور حتی الامکان کوشش کر رہا ہے کہ غیر ملکی مصنوعات سے چھٹکارا حاصل کرے مجھے یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی تھی کہ غازی مصطفےٰ کمال پاشا کو مصنوعات ملکی کی ترقی کا بہت خیال ہے۔ عراق اور فلسطین اپنی بساط کے موافق اس عظیم الشان تحریک سے غافل نہیں ہیں۔ ایران نے مصنوعات غیر ملکیہ پر شرح محصول اتنی بڑھا دی ہے کہ اہل ایران مصنوعات ملکی کی طرف خود بخود مائل

مجوز ہے ہیں میں حکومت ایران کی اس کوشش کو قدر سے عجلہ بازی تصور کرتا تھا کیونکہ میرے خیال میں قالین بافی کی صنعت کے سوا ایران میں دوسری صنعتیں ابھی اس قابل نہیں ہوئی ہیں کہ ملک کی حسب ضرورت سربراہی کر سکیں لیکن مجھے وزیر خارجہ اور وزیر مالیہ ایران نے اطمینان دلایا کہ ایران بہت جلد اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو جائے گا۔ افغانستان کو میں نے ہمیشہ ایک غریب ملک سے تعبیر کیا ہے اس لئے غیر ملکی مصنوعات کی طرف میلان اس کے لئے سب سے زیادہ تباہی کا سبب تھا۔ میں نے ہرات میں اعلیٰحضرت نادر شاہ غازی کا یہ فرمان دیکھا کہ عساکر اسلامیہ افغانیہ کا صیفی و شتائی (گرمی و سردی کے موسم کا) لباس ملک کا کتا اور بنا ہوا ہونا چاہیئے خواہ وہ کتنا ہی بھدا اور غیر ملکی پارچہ کے مقابلے میں کتنا ہی بدزیب کیوں نہ ہو۔ میں نے اس فرمان کے نتائج جشن نجات وطن کے موقع پر کابل میں دیکھے کہ عساکر افغانیہ جن کی تعداد ایک لاکھ سے کم نہیں ہے ملکی لباس میں ملبوس تھیں۔ اس طرح افغانستان نے نہ صرف اپنی ایک بہت بڑی دولت کو محفوظ کر لیا بلکہ مغرب کے اقتصادی تفوق پر ایک کاری ضرب لگائی عوام ہی نے نہیں خواص بلکہ سلاطین تک نے وقت کی اس اہم ترین ضرورت کو محسوس فرما لیا ہے۔

اعلیٰحضرت سلطان دکن خلداللہ ملکہٗ کا وہ ارشاد گہربار کس کو یاد نہیں جو حیدرآباد میں کاٹیج انڈسٹریل انسٹیٹیوٹ کا افتتاح فرماتے ہوئے شرف صدور لایا تھا کہ اعلیٰحضرت اور تمام ارکان خانوادۂ عالیہ آصفی گونگندہ صابن استعمال فرماتے ہیں اور توقع ظاہر فرمائی تھی کہ اہل ملک بھی مصنوعات ملک کی ترقی کی طرف توجہ کریں گے۔

الغرض اگر احساس کی بیداری اقوام کی ترقی کا پہلا زینہ ہے اور اس سے ان کے مستقبل کی درخشانی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے تو مجھے اجازت دیجئے کہ آپ کو ایشیا کی بیداری کا مژدہ سناؤں اور اس کی ترقیوں کی توقع دلاؤں۔ موانعات اس کے سامنے بہت ہیں، سرمایہ کی کمی مسلسل غلامی اور افلاس کی وجہ سے اخلاقی جرأت اور طاقت کا فقدان قوائے عمل کا اضمحلال اور سب سے بڑھ کر قوت و طاقت رکھنے والے مغرب کا مقابلہ۔ مگر میں مایوس نہیں ہوں اور یقین رکھتا ہوں کہ جلدی نہیں دیر سے سہی ایشیاء

اپنی منزل الارتقاء و عــــروج کو حاصل کر کے رہے گا۔

معزز حاضرین! اس وقت تک آپ نے جو کچھ سنا وہ آپ کے لئے خوش کن اور مسرت بخش تھا اب میں چند خطروں اور اندیشوں کو بھی جو ایشیاء کے مستقبل سے متعلق مجھے پیدا ہو گئے ہیں آپ کے سامنے رکھنے کی جرأت کرتا ہوں گذشتہ دو صدی میں یورپ نے ایشیاء پر توپ و تفنگ اور تیغ و خنجر کے ذریعہ جس قدر حملے کئے وہ اتنے مہلک نہیں ثابت ہوئے تھے جتنا اس کے زبان و قلم سے پہونچائے ہوئے زخموں نے ایشیاء کو نقصان پہونچایا۔ مغرب کے مدبر صرف شہروں، پہاڑوں، دریاؤں اور جنگلوں پر اپنے قبضہ کو اتنا اہم نہیں سمجھتے تھے جتنا آپ کے قلب و دماغ پر تصرف ان کے نزدیک اہم تھا چنانچہ مختلف ذرائع سے ایشیاء کے قلوب اور دماغ پر قبضہ کیا گیا۔ اور آج ان کے مہلک نتائج کچھ تو ظاہر ہو چکے ہیں اور دیکھنے والی آنکھیں زیادہ کی توقع کر رہی ہیں تبدیلی ذہنیت کی اس شرانگیز کوشش کا سب سے پہلا شکار فطرتاً وہ ممالک ہوئے جو یورپ سے زیادہ قریب تھے اور اب آہستہ آہستہ وہ ممالک بھی جو دور ہیں اس کوشش سے متاثر ہوتے جا رہے ہیں۔ مشرق قریب میں جو جراثیم ایشیائی دماغوں میں چھوڑے گئے وہ تین قسم کے تھے۔

(الف) یہ تخیل کہ مذہب مانع ترقی ہے

(ب) وحدت اسلامیہ کے بجائے قومیت پرستی کا تخیل اور اس کے ذریعہ آپس میں تفریق پیدا کرنا۔

(ج) اگر ان خرچ مغربی تمدن و معاشرت و بلند تر معیار زندگی کو مفلس و غریب ایشیاء کے کندھوں پر لادنا۔

مذہب مانع ترقی نہیں ہے

ابتدائے آفرینش سے آج تک روحانیت اور مذہب پرستی ایشیاء کی خصوصیات رہی ہیں اس کا ایک حصہ مغرب نے بھی اپنے ابتدائی دور میں حاصل کیا تھا لیکن عیسائیت کی بگڑی ہوئی اور مسخ شدہ صورت اس کو کبھی مطمئن نہ کر سکی وہ موجودہ عیسائیت میں اس دنیا کی ترقی زندگی کے لئے کوئی سامان نہ پاتا تو اس کو وحشت ہونے لگی اور وہ

سوچنے لگتا کہ کیا فی الحقیقت کوئی شخص مذہبی رہ کر اس دنیا میں ترقی بھی کر سکتا ہے جب اس کے سامنے
یہ تعلیم پیش کی جاتی کہ کوئی تمھارے گال پر تھپڑ مارے تو دوسرا بھی پیش کردو تو وہ غور کرتا کہ کیا یہی
اصول دربار سیاست میں استعمال کیا جاسکتا ہے اور ایک صوبہ کے چھیننے والے کی خدمت میں دوسرا
صوبہ بھی نذر کر کے اس دنیا میں زندہ رہنا ممکن ہے؟ جب اس نے موجودہ اناجیل اربعہ اور
نغمہ ہائے زبور ہی کو نہیں بلکہ توریت جیسی مفصل کتاب کو بھی جو اس وقت اس کے ہاتھ میں ہے ـ
عالم بعد الموت ہی کے لئے مخصوص پایا۔ اور عالم ناسوت کے لئے اس میں کوئی مکمل ضابطہ اس
کو نہ ملا تو اس کے مدبر دنیا کے دوسرے مکمل الہامی ضوابط پر نظر ڈالے بغیر یہ سمجھنے لگے کہ مذہب
مانع ترقی ہے اگر آپ بھی ان کی جگہ اور ان کے ماحول میں ہوتے تو شاید یہی کرتے۔ ایک طرف ان
کے مشنریز سارے ایشیا میں لاکھوں بلکہ کروڑوں روپیہ بکھیر کر تبلیغ عیسائیت میں مشغول تھے جو
ایشیائی قلوب کو مغرب کی طرف مائل کرنے والی ایک سیاسی تدبیر سے زیادہ کچھ نہ تھا اور دوسری
طرف یورپ کی درسگاہوں میں مشرقی طلباء کے دماغ لامذہبیت کی مشین میں ڈھالے جا رہے تھے
اور یورپ کو اس کے تجربے نے جو سکھایا تھا وہی اپنے مذہب اور اس کی تعلیمات سے ناواقف
مشرقیوں کو سکھایا جا رہا تھا مسلمان اس تبلیغ سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے۔ نام نہاد ضروریات
زمانہ نے بہت پہلے ہی ان کو اپنی مذہبی تعلیم سے لاپرواہ کر دیا تھا اور جب وہ یورپ جاتے تو ان
کو قطعی علم نہ ہوتا تھا کہ انکے اپنے مذہب نے ان کو کیا تعلیم دی ہے اور آیا موجودہ عیسائیت کی طرح وہ
بھی مانع ترقی ہے یا موئد ترقی۔ اور وہ نہیں جانتے تھے کہ خدائے عز و جل نے قرآن میں متعدد جگہ کیا
ارشاد فرمایا ہے۔

الم تر ان اللہ سخر لکم ما فی الارض (حج) کیا تم نے نہ دیکھا کہ خدا نے جو کچھ زمین
میں ہے سب تمھارے لیئے بنایا اور تمھارے بس میں دے دیا۔

ھو الذی خلق لکم ما فی الارض جمیعاً (بقرہ) اسی نے تمھارے لئے جو کچھ زمین میں ہے
بنایا۔ یہ تو موجودات ارضی کا ذکر تھا سنئے اور غور کیجئے۔

وسخر لکم اللیل والنھار والشمس والقمر اور تمہارے لئے دن اور رات اور چاند اور سورج کو کام میں لگایا۔

مسلمانوں نے بھلا دیا کہ ان کو اشرف المخلوقات ہی نہیں بلکہ اس دنیا کے بسنے والے سارے انسانوں کے لئے نمونہ اور مثال بنا کر پیدا کیا گیا ہے۔ کائنات ارضی ہی کی مخلوقات نہیں بلکہ ان کو بشارت دی گئی ہے کہ کائنات سماوی کی مخلوقات اور خود آسمان اِن کے لئے پیدا ہوئے ہیں اُن کو یہ جاننے کا موقع ہی نہ ملا کہ فی الحقیقت وہی خلیفتہ اللہ فی الارض ہیں۔ انہوں نے بھلا دیا کہ (لقد کرمنا بنی آدم) کی تفسیر وہی ہیں۔ انہوں نے بھاپ اور بجلی کی کرشمہ سازیوں کو تعجب کی نگاہ سے دیکھا۔ حالانکہ ان کو سکھایا گیا تھا کہ مخلوقاتِ عالم پر قبضہ و تصرف ان کی ادنیٰ صفت ہے اور اعلیٰ کوشش اس سے گذر کر خلق مخلوقات کو اپنا کر لینا ہے ؎

در دشتِ جنونِ من جبرئیل زبوں صیدے ؛ یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ

اِن کے سامنے قرآن حکیم آئینوالی ہی نہیں بلکہ اس دنیا کے لئے ایک مکمل نظام و قانون پیش کر رہا تھا لیکن ان کی نگاہِ کور اس کے لئے بند تھی ان کے روبرو قرن اول اسلامیہ کی تاریخ مسلمانوں کی حقیقی تعریف پیش کر رہی تھی اور بتا رہی تھی کہ مذہب ہی تو وہ طاقت تھی جس نے "شیر شتر و سوسمار کھانے والے عربوں کو باعثِ رشک قیصر وکسریٰ بنا دیا تھا وہ بھول گئے کہ یہی دیوانگانِ مذہب تو تھے جنھوں نے چھ سو سال تک ہسپانیہ پر، آٹھ سو برس تک ہندوستان پر اور تیرہ سو سال تک بلاد اسلامیہ عرب و عجم پر کامیاب حکمرانی کی۔ ان کو یاد نہیں رہا کہ خود یورپ کے مدبروں نے قانونِ اسلامی کو رومن لا سے زیادہ مستحکم و مضبوط مانا ہے شرابِ مغرب کے نشہ میں وہ فراموش کر گئے کہ ان کا مذہب دنیا کی ہر تحقیقات جدید اور ہر ترقی کو اپنی منزل مقصود کے لئے ابتدائی قدم بتاتا ہے اور یورپ کا جادو اُن پر چل گیا ہے لامذہبیت کے اس طوفان میں جو تمام مذاہب عالم کو یکساں متاثر کر رہا ہے یہ خیر الامم بھی چلی جا رہی ہے اور اپنی منزل سے بے خبر ہے یہ وہ خطرہ ہے جس نے مشرقِ قریب کے بلاد اسلامیہ کو گھیر لیا ہے اور اب ہندوستان

کی طرف سرعت سے بڑھ رہا ہے علمائے دین اپنی حالتوں میں مست اور اس خطرے سے بے خبر ہیں اور نوجوان اپنی عظمتِ مغرب سے چندھیائی ہوئی آنکھوں سے دیکھ کر اس شر کو اپنے لئے خیر سمجھ رہے ہیں۔ وقت ہے کہ ہم بیدار ہو جائیں اپنے دین کا قرآن مجید کی روشنی میں مطالعہ کریں اور سوچیں کہ کیا فی الحقیقت ہمارا دین بھی مانع ترقی ہے اگر نہیں ہے بلکہ موئد ارتقا ہے تو یورپ کو سُنا دیں کہ تیرا نظریہ اپنے دین کے پیش نظر درست۔ لیکن اسلام کی موجودگی میں غلط ہے۔ اگر تزکیہ نفس اور سیاست مدن کو ساتھ ساتھ رکھنا چاہتا ہے تو آ۔ دامنِ اسلام میں پناہ گیر ہو پھر دیکھ کہ مذہب ہی نے سامانِ ترقی پیدا کئے تھے اور اب بھی کر سکتا ہے۔

متحدہ قومیت اور اسلامیت متحدہ ہندوستان کو قومیتِ متحدہ کی ضرورت ہے لیکن وہاں مذہب کے نام پر ایک دوسرے سے دست و گریباں ہونے والی ذہنیت ترقی کر رہی ہے۔ یہاں کے مسلمانوں کو میں یہ مشورہ دے سکتا ہوں کہ بیرون ہند کی مسلمان جماعت سے رشتہ اخوت برقرار رکھتے ہوئے ہندوستان کا ان پر حق ہے کہ یہاں کی دوسری اقوام کے ساتھ شیر و شکر ہو جائیں اور ایک قومیت متحدہ "ہندوستانی" کے نام سے پیدا کریں۔ لیکن مشرق قریبہ میں جہاں اس کی ضرورت ہی نہیں تھی ان کو صرف ایک ہی تخیل درکار تھا اور وہ اسلامیت کا تخیل ہو سکتا تھا "انما المومنون اخوۃ" کی صدا۔ پر محبت یورپ کے کانوں میں ہمیشہ صورِ اسرافیل بن کر پہونچی اور اس نے ہر زمانہ میں یہ محسوس کیا کہ جب تک یہ یقین موجود ہے مشرق پر اس کی کامیابی محال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں اس کی درسگاہوں اور اس کے مشنریز کے ذریعہ مشرق قریب کے فرزندوں کو مذہب کے مانع ترقی ہونے کا درس ملا وہیں عرب کے دل میں عربیت اور کرد کے قلب میں کُردیت کا خیال پیدا کیا گیا۔ ترکوں کو سکھایا گیا کہ تم پہلے ترک ہو پھر مسلمان۔ یہ کیا معنی کہ سیاست میں تو اُن پر حکمرانی کرو اور تمدن و معاشرت میں غلامی۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ شریف حسین کی رابطۂ اسلامیہ کی بجائے اتحادِ عربیہ کی ناپاک کوشش نے سلطنت اسلامیہ کو پارہ پارہ کر دیا۔ جس پاسپورٹ پر آج سے دس سال قبل صرف ترکی قونصل کا ویزا' حجاز' فلسطین' مصر و شام اور عراق و ترکیہ کی سیاحت کے لئے کافی ہوتا تھا آج انہی ممالک کے داخلہ کے لئے میرے پاسپورٹ پر (۶) ویزا موجود ہیں۔ تعجب یہ ہے کہ اس قدر تباہی کے بعد بھی یہ ذہنیت برابر ترقی کر رہی ہے اور اسلامیت متحدہ کی وہ بنیاد جو تیرہ سو سال قبل رکھی گئی تھیں متزلزل

ہو رہی ہیں ساور پارہ پارہ ہو جانے والی طاقتیں یورپ کے لئے سامانِ تسلط فراہم کر رہی ہیں میرے نزدیک پہلے بھی مسلمانوں کی ترقی کا راز اجتماعیت اسلامیہ میں تھا اور آج بھی ہے۔ ولوکانو یعقلون

تقلیدِ کورانۂ مغرب

جنگِ عظیم کے ہنگامۂ رستخیز نے جب ایشیاء کو اپنی گران خوابی سے بیدار کیا تو اس کے برسوں کے سوئے ہوئے نے آنکھوں کو ملے بغیر اس سمت میں نظر ڈالی جدھر سے یہ مہیب آوازیں آ رہی تھیں اور پردۂ آتش و دخان کو چاک کر کے جب یورپ کو دیکھا تو عجیب عالمِ عظمت و جلال نظر آیا جس پر نظر پڑ جاتی تھی کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست۔ اس صدیوں کے پابہ زنجیر غلام نے اپنے آقا کے گھر کی یہ رونق دیکھی تو تمدن و تہذیب مغرب کی ترقی کے ان نتائج کو سببِ ارتقاء سمجھا۔ اور حقیقی اسباب سے قطع نظر کر کے خود بھی ظاہر میں ویسا بننے کی کوشش کی جو یورپ سالہا سال کے بعد بن سکا ہے۔ اپنی جیب کے وزن کا اندازہ کئے بغیر معیارِ زندگی کو بلند کرنے لگا اپنی مراتب حالات و سادہ معاشرت اس کو ذلیل نظر آنے لگی اور اس کی ما یحتاج کے لئے بھی ناکافی آمدنی کا بیشتر حصہ اپنے کمروں کی سجاوٹ، اپنے مکان کی آرائش اور اپنے جسم کی زینت پر صرف ہونے لگا اس کے عمل کی قوتیں اسباب ترقی کو تلاش کرنے اور حاصل کرنے کی بجائے نتائج ارتقاء تہذیب کو حاصل کرنے میں صرف ہونے لگیں۔ اس کے دو برے نتائج مترتب ہوئے۔ ایک یہ کہ دوسروں کی تقلید کرتے ہوئے مشرق اپنی چھوٹی سی چھوٹی ضرورت کے لئے انہی کا محتاج ہو گیا دوسرے آمدنی کی کمی اور اخراجات کی زیادتی نے اس کو بے انتہا مالی مشکلات کا شکار بنا دیا۔ آج وہ بظاہر مہذب ممالک مغربیہ کی سی زندگی بسر کر رہا ہے لیکن کیا ہم اس سے پوچھیں کہ اس کا دل مطمئن بھی ہے مجھے اپنی اس سیاحت کے تجربہ کی بنا پر یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ مشرق کے فیصدی پچانوے مغرب پرست فرزندوں کو میں نے قرض کی زنجیر میں گرفتار پایا۔

یہ امر مسلمات سے ہے کہ ہر تخریب اپنے بعد ایک تعمیر کی بنیاد ہوتی ہے اور ہر خرابی ایک تجربہ ناخوشگوار کے بعد سامانِ بیداری فراہم کر دیتی ہے لیکن بعض بیمار ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی نقاہت و ناتوانی کسی مزید اضافہ مرض کو برداشت نہیں کر سکتی۔ ایشیاء ایک ایسا ہی بیمار ہے اس لئے یہ کہہ دینا کہ وقت خود بخود علاج کرے گا میرے خیال میں صحیح نہیں ہے ضرورت ہے کہ ایشیائی اقوام اس خطرے کو محسوس

کریں اور جلد سے جلد آمد و خرچ میں توازن قائم کرنے اور تقلید مغرب میں خذ ما صفا و دع ما کدر کی تعمیل پر آمادہ ہو جائیں۔

حضرات! میں نے آپ کا بہت وقت لیا ہے اور نہیں جانتا کہ ایک بھی ایسی بات پیش کی ہو جو آپ کی معلومات میں اضافہ کرے۔ بہر حال خوش ہوں کہ میں نے ایک محترم کرمفرما کے حکم کی تعمیل کی اور ہندوستان کے قدیم ترین دار السلطنت میں اپنے احساسات و تاثرات سیاحت کو پیش کرنے کا موقع حاصل کیا۔ جب میں یہ سوچتا ہوں کہ میری دکھنی زبان نے اردو کی اس ٹکسال میں کیسی بدکیفی پیدا کی ہوگی تو افسوس ہوتا ہے کہ میں نے آپ کا وقت خراب کیا۔

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔

* * * * *

مجلہ مکتبہ جلد نمبر (۱۰) شمارہ (۳) مطابق امرداد ۱۳۴۲ف م ماہ جون ۱۹۳۳ء

سلسلہ ص ۷۸

پڑ جاتا ہے۔ خاموشی، خاموشی سے گزر کر ایک سناٹا چھا جاتا ہے

اب تماشائی کو ہوش آتا ہے وہ اس منظر کو خیرباد کہتا ہے لیکن اس کی آنکھوں کے سامنے وہی جنت نگاہ موجود رہتی ہے راستے میں خیال آتا ہے کہ کاش ٹرنر سا منظر کش مصور اس دلفریب منظر کو اپنے جمال آفریں موقلم سے دنیا کے سامنے پیش کر جاتا۔

لیکن اب شہر کی وسیع سڑکوں پر ان خیالات میں مصروفیت سے کیا حاصل؟

"نظارہ پرست"

مجلہ مکتبہ جلد (۹) شمارہ (۳) بابتہ ماہ امرداد ۱۳۴۱ف م جون ۱۹۳۲ء

فہرست مضامین مجلہ مکتبہ

جلد (۱) شمارہ (۱) بابتہ اپریل ۱۹۲۸ء

۱) مجلہ مکتبہ (نظم) مولانا سید غلام مصطفےٰ ذہین
۲) دعا 〃 مولانا سید حمید الدین سلیم پروفیسر ادبیات اردو کلیہ جامعہ عثمانیہ
۳) افتتاحیہ مدیر
۴) فلسفہ کا تاریخی نشوونما جناب میر حسن الدین صاحب ایم اے ایل ایل بی وکیل ہائیکورٹ
۵) کلام صفی جناب بہبود علی صاحب صفی اورنگ آبادی
۶) آٹھویں صدی ہجری کی نظم ونثر اردو کا ایک نمونہ جناب ابو محمد عمر صلاح یافعی صاحب
۷) ڈاکٹر عبد رنگل کی کاوش جناب سید محمد صاحب قادری بی اے
۸) شہید تخیل (افسانہ) جناب محمد مظہر اللہ صاحب صدیقی
۹) ایک قدیم دکھنی شہر اور اسلامی درس گاہ جناب محمود علی خاں صاحب متعلم بی اے کلیہ جامعہ عثمانیہ
۱۰) حجاب (نظم) جناب شبیر حسن صاحب جوش ملیح آبادی
۱۱) بادۂ دکن مکتبہ
۱۲) نواب بدر الدین خاں تمیز جناب تمکین کاظمی صاحب
۱۳) پھول سے جناب عبد الغفور صاحب
۱۴) جدید مطبوعات "س" اور "س" "م"
۱۵) معلومات "ف م"

جلد (۱) شمارہ (۲) مئی ۱۹۲۸ء

۱) شذرات مدیر
۲) شرح غالب علامہ محمد جلال الدین نوری مرحوم پروفیسر عربی نظام کالج
۳) نواب نظام علی خاں بہادر اور انگریزوں کے مستقل تعلقات کی ابتدا جناب میر محمود علی صاحب ایم اے (عثمانیہ) لکچرار سٹی کالج
۴) چاندنی رات اور سیمیں ساگر جناب میر یوسف خاں صاحب عزت بی اے ایچ سی ایس
۵) اشارات (نظم) 〃 ابوالمحاسن محمد محسن خاں صاحب متین
۶) شب غم (طبعزاد افسانہ) 〃 محمد مظہر اللہ صاحب صدیقی
۷) لب خاموش (نظم) 〃 محمد سید الدین صاحب شکیب متعلم کلیہ جامعہ عثمانیہ
۸) کرنل میکنزی کا مجموعہ ادبیات مشرقی 〃 ابوالحسنات سید غلام محی الدین قادری زور
۹) ہندی حسن کاری کا اثر چین اور جاپان پر 〃 عشرت حسین زبیری متعلم کلیہ جامعہ عثمانیہ
۱۰) بادۂ دکن — قصیدہ در مدح خسرو دکن نواب نظام علی خاں بہادر 〃 شیر محمد خان ایمان
۱۱) تاریخ ادبیات اردو اور اردو تحریک مدیر
۱۲) رسید کتب
۱۳) سہاگن کا راگ جناب سید عطا اکبر وفا قانی صاحب بی اے
۱۴) جدید مطبوعات اور رسالوں کے خاص نمبر "س"
۱۵) معلومات "ف - م"

سب رس خصوصی نمبر

جلد (۱) شمارہ (۳) جون ۱۹۲۸ء

۱) شذرات ۔ مدیر

۲) شعاعیں اور اشعاع۔ ڈاکٹر اے ایس سیل (مترجمہ جناب ابو الکلام فیض محمد صاحب صدیقی متعلم کلیہ جامعہ عثمانیہ)

۳) نسوانی شاعری (منطقیانہ نظر میں) جناب ابو الحرف افضل صاحب مدیر رسالہ کیف الجبر

۴) نل اور کنویں کا مناظرہ (نظم) جناب سید محمد حسینی صاحب آزاد منشی فاضل حیدرآبادی

۵) حجاز کے فرنگی سیاح (حاجی محمد عرف لیون راچیز) جناب حاجی سید علی خبیر صاحب سررشتہ انتظامی ہائیکورٹ حیدرآباد دکن

۶) پہیہ ہے (نظم) جناب حکیم بہبود علی بہاء الدین صاحب متقی اورنگ آبادی

۷) محمد حسین آزاد اور جدید شاعری جناب احمد عبد اللہ المسدوسی صاحب متعلم بی اے

۸) کیف تغزل (نظم) جناب حضرت کیفی حیدرآبادی مرحوم

۹) بھکاری (افسانہ) انتونی چیخوف (مترجمہ جناب احمد غفار صاحب)

۱۰) دل (نظم) جناب لسان القوم مولانا سید شاہ ابراہیم صاحب عفو مرحوم

۱۱) بہارستان عشق یا لیلیٰ مجنوں نامی — جناب سید محمد صاحب قادری بی اے

۱۲) جانِ مضطر (نظم) جناب ابو الکلام محمد بجاء الدین صاحب بیدر متعلم ایم بی بی ایس کلاس

۱۳) اردو جھنڈی بولی جناب محمد حمید اللہ صاحب متعلم کلیہ جامعہ عثمانیہ

۱۴) رباعیات جناب محمد علی صاحب تجلی حیدرآبادی

بادۂ دکن ۔ شیر محمد خاں ایمان

تنقید و تبصرہ "ا ع م" و "س"

معلومات "غ ۔ ر"

جلد (۱) شمارہ (۴) جولائی ۱۹۲۸ء

۱) شذرات ۔ مدیر

۲) اکبر کی زبان سے (نظم) جناب ابو الافتخار سید عبد الغفار صاحب فخر

۳) اردو شاعری اور علم عروض جناب محمد سراج الدین صاحب طالب

۴) حجاز کے فرنگی سیاح ۲ جناب الحاج سید علی خبیر صاحب سررشتہ دار انتظامی ہائیکورٹ حیدرآباد دکن

۵) تو ایسے سماں میں آ پیاری (نظم) جناب سید محمد اکبر وفا قانی بی اے

۶) میکل فیراڈے اور اس کے افادات سائنس — جناب عبد الوہاب صاحب متعلم کلیہ جامعہ عثمانیہ

۷) یورپ اور ایشیا معاشی نقطۂ نظر سے — جناب غازی الدین احمد صاحب بی اے

۸) پنہاری کا کنواں (افسانہ) جناب غلام رسول صاحب سٹی کالج

۹) بادۂ دکن (مثنوی برق تاب) شیر محمد خاں ایمان

۱۰) غزل جناب پروفیسر ظفر تاباں (راجہ کالج دہلی)

۱۱) تنقید و تبصرہ "س"

۱۲) معلومات "م ۔ ا ۔ ح"

جلد (۱) شمارہ (۵) اگست ۱۹۲۸ء

۱) شذرات ۔ مدیر
۲) کلیاتِ ولی کا دیباچہ جناب غلام معین الدین صاحب یوسفی
۳) غزل جناب مرزا علی رضا صاحب شیرازی لکچرار سٹی کالج
۴) علاماتِ وقف جناب زبیر احمد صاحب ایم اے پروفیسر عربی الٰہ آباد یونیورسٹی کالج ریسرچ اسکالر لندن
۵) اردو شاعری اور جدید عروض جناب سراج الدین صاحب طالب
۶) جیسی کرنی ویسی بھرنی (افسانہ) جناب ڈی کے رودراس
۷) باغِ دکن
مثنوی خسرو شیریں۔ مثنوی قیس ولیلیٰ — شیر محمد خاں ایمان
۸) دردِ دل (نظم) جناب میر شاہ علی صاحب نیساں
۹) لوگ (نظم) جناب صفی اورنگ آبادی
۱۰) ہندوستان کے مذاہب (الفہرست کا ایک مقالہ) جناب میر مظہر علی صاحب مولوی کامل
۱۱) غزل جنب اختر شیرانی
۱۲) تنقید و تبصرہ
عصریہ جوبلی نمبر
صوفی عید نمبر — "س"
۱۳) معلومات "ی ع"

(تصویر: حضرت ظل سبحانی اعلیٰ حضرت بندگانِ عالی متعالی)

جلد (۱) شمارہ (۶) ستمبر ۱۹۲۸ء

۱) شذرات ۔ مدیر
۲) گولکنڈہ (نظم) جناب اعجاز علی صاحب شہرت
۳) انتخابِ اقتباسات جناب محمد انتصار الدین صاحب بی اے
۴) یورپ میں ادبی نشاۃ ثانیہ اور اردو کی ترقی جناب حمید اللہ صاحب بی اے
۵) پیری (نظم) جناب شبیر حسن صاحب جوش ملیح آبادی
۶) اردو شاعری اور جدید عروض جناب سراج الدین صاحب طالب
۷) پردہ و بے پردگی (نظم) جناب محمد نظام شاہ صاحب لبیب تیموری
۸) مطرب سے خطاب (نظم) جناب سید اللہ بخش صاحب توحید ۔ بی اے
۹) بکشی (افسانہ) جناب ڈاکٹر اعظم صاحب کریوی ایڈیٹر اکبر الہ آبادی
۱۰) رباعی (عکس تحریر) جناب صفی اورنگ آبادی
۱۱) ضمیر اور اس کا دائرہ عمل مسٹر یس بی اختا حیدرآبادی
۱۲) رباعیاتِ قتیل جناب قتیل حیدرآبادی
۱۳) عرب کا ایک مسخرہ شاعر جناب مسعود عالم صاحب ندوی
۱۴) محبت انصاریہ (نظم) جناب سید ابراہیم صاحب متقی
۱۵) سخن ہائے گفتنی (نظم) جناب ابوالفاضل آزاد چاندپوری
۱۶) عربی ارقام کی اصل ہندی ہے جناب مظہر اللہ صاحب صدیقی
۱۷) باغِ دکن ۔ شیر محمد خاں ایمان
۱۸) اقوالِ زریں (ترجمہ) جناب حیش
۱۹) باقیاتِ فانی (نظم) جناب نواب امداد نواز جنگ بہادر فانی
۲۰) تنقید و تبصرہ "مس"
۲۱) معلومات "م ۔ ح"

جلد (۲) شمارہ (۱) اکتوبر ۱۹۲۸ء

مضمون	مضمون نگار	صفحہ
شذرات	مدیر	ع
عکس تحریر	مولانا سلیم مرحوم	و
نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز	جناب ابو محمد عمر صلاح خان حقی	ا
گلستاں و بوستاں کا موازنہ	تنقید جناب ابو العباس محمد حسن خان صاحب متین حیدرآبادی	
انسان اور کائنات	جناب میر غوث الدین علی	۵۴
دور افتادہ لارڈ بائرن کی ایک نظم کا ترجمہ	محشر عابدی	۵۷
حب وطن (افسانہ)	ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور ترجمہ یس بی انتا	۵۸
ٹالسٹائے اور مولانا کس	عشرت حسین زبیری	۶۴
نوحۂ غم (نظم)	ابو الافتخار سید عبد الغفار فخر	۷۲
بادۂ دکن ریختی (نظم)	مولوی عابد مرزا بیگم	۸۰
تنقیدیں	م۔ و۔ س	۸۱
فہرست مضامین مجلہ مکتبہ (جلد اول)	مینجر	۸۳

(تصویر: پروفیسر وحید الدین سلیم پانی پتی)

(تصویر: نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز)

جلد (۲) شمارہ (۲) نومبر ۱۹۲۸ء

مضمون	مضمون نگار	صفحہ
شذرات	مدیر	ب
حالی اور جدید شاعری	احمد عبد اللہ المسدوسی	۱
قصۂ ناتمام	ابوالو	۱۷
بہرام گور دکن میں	ابو الکمال سید غلام محی الدین قادری زور	۲۷
پروفیسر جمال الدین نوری	مولانا محمد جعفر	۴۶
بادۂ دکن	لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی	۵۷
احساسات (نظم)	پروفیسر ظفر تاباں	۶۲
دکھیاری بلبل	سید شبیر حسین قیس	۶۲
خیالات آزاد (نظم)	سید محمد حسین آزاد	۶۳
تنقیدیں نغمۂ راز اور شیب و شباب	س	۶۴
اشتہارات		

(تصویر: مولانا جمال الدین نوری مرحوم)

جلد (۲) شمارہ (۳) دسمبر ۱۹۲۸ء

مضمون	مضمون نگار	صفحہ
شذرات	مدیر	ب
سالگرہ ہمایونی	"	۱
کلام الملوک ملوک الکلام	اعلیٰحضرت سلطان العلوم	۴
حال اور جدید شاعری (پردہ) بسلسلہ گذشتہ	احمد عبداللہ المسدوسی	۵
خاقانی	محمد محسن خاں تمکین	۲۵
ہندوستانی کاشتکاروں کی معاشی حالت	قاضی فصیح الدین صدیقی متعلم بی اے	۳۴
سفرنامہ مصر جدید	ملا رموزی	۴۵
فکر عالیہ (نظم)	سید ابو محمد ثاقب	۶۰
حسن کار (افسانہ)	ترجمہ غلام رسول شی کاغ	۶۱
آمد شاہ (نظم)	مولوی عبدالرحمن خاں صدر کلیہ جامعہ عثمانیہ	۷۲
عمل (نظم)	نواب ضیا یار جنگ بہادر	۷۳
بادۂ دکن	لچھمی نرائن حسا و شفیق اورنگ آبادی	۷۴
تنقیدیں	"س"	۷۶
اشتہارات		۷۸

(تصویر مبارک اعلیٰحضرت سلطان العلوم نواب میر عثمان علی خان بہادر)

جلد (۲) شمارہ (۴) جنوری ۱۹۲۹ء

مضمون	مضمون نگار	صفحہ
شذرات	مدیر	ب
فریدون ملک آنجہانی	"	د
قطبی - نوذر	عبدالوہاب	۱
کھیل کی نفسیات	محمد مظہر حسین	۱۱
تحفۃ الاحسان الجزری ایک تقابلی مطالعہ	عبدالقیوم باقی	۲۷
گنبد خضرا	حاجی سید شاہ شبیر سررشتہ دار عدالت العالیہ	۴۱
عشق (نظم)	شیخ عبدالقادر وفا	۴۷
ہنگامہ چشمک (افسانہ)	شبیر حسن قیس رضوی	۴۸
بادۂ دکن	لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی	۵۶
امداد باہمی (نظم)	صفی اورنگ آبادی	۵۹
جذبات حبیب	حبیب رامپوری	۶۱
عید کی تمنا	میر شاہ حسن علی نعمیاں	۶۱
تنقید (کلیات دکن) اشتہارات	ع - ی	۶۲

(تصویر نواب سر فریدون الملک آنجہانی)

جلد (۲) شمارہ (۵) فروری ۱۹۲۹ء

مضمون	مضمون نگار	صفحہ
شذرات	مدیر	ب
حدیقۃ العالم	محمد سراج الدین طالب	۱
جواب دیا (غزل)	سید قادر حسین قادر	۶
عبرانی خط	ترجمہ مولوی کمال میر ظہور علی وکیل	۷
ماضی و حال (نظم)	عمر عبدالکریم گل	۱۵
کھیل کی نفسیات	محمد مظہر حسین	۱۷
اشارات اعجام پر ایک تفصیلی نظر	ابوالمحاسن محمد محسن خان متین	۲۱
تاثرات لطیف (نظم)	جوش حیدرآبادی	۳۲
کفارہ (افسانہ)	ترجمہ غلام رسول	۳۵
غزل	شاہ عبدالعزیز عزیز	۴۵
تھرمانیت	محمد حمید اللہ	۴۶
بادۂ کہن	یحییٰ نرائن صاحب اورنگ آبادی	۵۹
تنقیدیں	"م م" اور "س"	۶۱

تصویر: مولانا شفیق
سید اعظم علی ... حیدرآبادی

جلد (۲) شمارہ (۶) مارچ ۱۹۲۹ء

مضمون	مضمون نگار	صفحہ
شذرات	"س-م"	۲
تخیل اور جدید شاعری	احمد عبداللہ المسدوسی	۵
نتیجۂ آزادی (نظم)	سید علی شبیر صاحب شبیر	۲۴
بادۂ دکن (تشطیق)	عمر یافعی صاحب	۲۵
زنجیر غلامی (افسانہ)	ابوالمکارم نفیس محمد صدیقی	۳۲
مائدۃ الاسلام (نظم)	ابوالسخا محمد سعید باجمیل ساقی	۴۳
رباعی	ابوالاعلم امجد حیدرآبادی	۴۴
اثبات حیات	بنی الحسن شمیم	۴۵
دیوان غالب قلمی ۱۲۳۷ھ	ترجمہ سید محمد صاحب	۵۳
باقیات فانی (غزل)	احمد نواز جنگ بہادر فانی	۵۸
پردہ (نظم)	مرزا علی رضا صاحب شیرازی	۵۹
تنقید تبصرہ غالب / توہم پرست عالم	س-م	۶۰
فہرست مضامین جلد دوم		۶۳
اشتہارات		۶۵

تصاویر: مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر صدر اعظم و امیر جامعہ عثمانیہ
راجہ مرلی دھر پرشاد نواز ونت بہادر بیکنٹھ باشی

جلد (۳) شمارہ (۱) اپریل ۱۹۲۹ء

مضمون	مضمون نگار	صفحہ
شذرات		۲
سوتی ایک مغربی مقالہ نگار کی نظر میں	ابوالمحامد محمد محسن خان یقین صاحب	۵
غزل	جناب حکیم مرزا قاسم علی بیگ لشکر	۱۵
گولکنڈہ کا ایک قدیم ترین ادبی شاہکار	سید غلام محی الدین قادری زور	۱۶
رباعی	حضرت صفی اورنگ آبادی	۳۰
فریاد اشک (نظم)	جناب محمد جلال الدین اشک	۳۱
تیر بہدف	سید شبیر حسن قیس	۳۳
مشاہدات (نظم)	ابوالفضل ماہر چاند پوری	۳۴
تفقاز کے شمال کی زبانیں	محمد عبدالوہاب مسلم	۳۵
ہندی ادب اور ستمبر پر ایک نظر	جناب لالہ سیتا رام	۴۰
عزازیل کا دربار (افسانہ)	" الف لیلہ " صاحب	۴۹
افکار عفو (نظم)	مولانا سید شاہ ابراہیم عفو	۵۵
بادۂ دکن (دکنی)	جناب عمر یافعی	۵۶
تنقید و تبصرہ	ف ۔ م	۶۸
اشتہارات		

تصاویر : مولانا سید شاہ ابراہیم عفو مرحوم
سید عسکری حسن صاحب بیارسٹرایٹ لا
خان بہادر ڈاکٹر خواجہ محمد حسین صاحب

جلد (۳) شمارہ (۲ و ۳) مئی و جون ۱۹۲۹ء

مضمون	مضمون نگار	صفحہ
شذرات	مدیر	۲
علم صحت	ابوالکلام شفیع محمد صدیقی صاحب	۵
دعائے نو عید (نظم)	محمد تہنیت علی خاں بہ تدبیر	۱۹
غزل	حکیم ناظم علی بیگ لشکر	۲۰
وکیل بالجبر	سید وزیر حسن صاحب	۲۱
غزل	سید ابراہیم جلیل	۲۵
حقیقت عفو (غزل)	سید شاہ ابراہیم عفو مرحوم	۲۶
کوہستان دکشتبرہ	سید علی صاحب	۲۷
مولانا حافظ شجاع الدین	میر مظہر علی صاحب وکیل	۲۸
خیالات لطیف	سی بی اشتا صاحب	۳۷
بادۂ دکن (دکنی)	عمر یافعی صاحب	۳۸
میر عالم کی شاعری	سراج الدین طالب	۴۱
کھچڑی (افسانہ)	غلام رسول صاحب	۴۹
رنگ تغزل (غزل)	سید علی عابد صاحب	۵۸
قرض خواہ (افسانہ)	محشر عابدی صاحب	۵۹
جوابی غزل	سید قادر حسین قادر	۶۴
یورپ کی رجوع ترقی میں مسلمانوں کا حصہ	خواجہ ظہورالدین صاحب	۶۵
کلام اعظم (غزل)	ڈاکٹر اعظم کریوی صاحب	۷۲
پردہ	آسیہ بیگم جنرل سکریٹری لیڈیز کلب بھوپال	۷۳
غزل	مودود احمد آشفتہ	۸۶
ترجمہ گلدستہ بیجاپور	ع ۔ ی	۸۷
تنقیدیں	س ۔ م و س	۹۳
اشتہارات		۹۹

تصاویر : مجلد کتب خانۂ آصفیہ
و
کتب خانۂ قصر فلک نما

جلد (۳) شمارہ (۴) جولائی ۱۹۳۹ء

مضمون	مضمون نگار	صفحہ
شذرات		۲
سلطان علاء الدین حسن گنگو بہمنی	شیخ محمد احمد انصاری ایم اے ایل ایل بی	۵
رباعی	مسعود احمد تشنہ	۲۳
ترانہ ناظم (نظم)	نواب میر محمد عثمان علی خاں بہادر ناظم	۲۴
غزل	اختر حیدرآبادی	۲۵
مرزا غالب کا فارسی کلام	جناب مسعود احمد تشنہ	۲۶
خان بہادر (افسانہ)	جناب ڈاکٹر محمد اعظم کریوی	۳۴
حرب اور اس کے حیلے	ابوالمکارم محمد عبدالکریم حقانی	۳۸
خواجہ محمود گاواں کے مزار پر تصنیف شدہ ایک پھول (نظم)	جناب محمد حسین ادیب ایم اے بی آنرز	۴۹
ایک نوزائیدہ کی موت	جناب سید علی	۵۴
بادۂ کہن (دکنی اورنگ آبادی)	عمر یافعی صاحب	۵۵
جوش انتقام (افسانہ)	جناب محمد بشیر حسن قیس	۶۴
ابن نشاطی	ڈاکٹر سید غلام محی الدین قادری زور	۶۱
تنقید و تبصرہ	س۔م	۷۲

تصاویر ۔ (۱) ڈاکٹر سید غلام محی الدین قادری زور

(۲) ابن نشاطی

جلد (۳) شمارہ (۵، ۶) اگست و ستمبر ۱۹۳۹ء

مضمون	مضمون نگار	صفحہ
شذرات	مدیر	
سلطان علاء الدین حسن گنگو بہمنی	محمد احمد انصاری صاحب	۵
غزل	عشق رامپوری	۲۰
بھوت (افسانہ)	ایم اسلم صاحب	۲۱
اقبال (انفرادیات کی روشنی میں)	عزیز احمد صاحب	۲۷
غزل	جناب سید قادر حسین قادر	۳۴
نام، حلیہ اور تاریخ	جناب علامہ نثار احمد صالحی	۳۵
رباعی	جناب تحمل حیدرآبادی	۴۷
خاندان قطب شاہی کا آخری راجہ (ڈرامہ)	شیخ نورالحسن عثمانی	۴۸
اعتماد (افسانہ)	غلام رسول صاحب	۵۶
میر کی ایک اور تصنیف	جناب سید مسعود حسن رضوی ادیب	۶۹
غزل	جناب صفی اورنگ آبادی	۷۶
فن تقریر	جناب غلام الہر عثمانی	۷۸
دکھیا سہاگن (نظم)	جناب ابوالاثر فخر حیدرآبادی	۸۳
بادۂ دکن (دکنی)	عمر یافعی صاحب	
تنقید و تبصرہ	س۔م	

تصاویر:

نواب نظام علی خاں بہادر آصف جاہ ثانی والی دکن

نواب مسعود جنگ نائب امیر جامعہ علیگڑھ

جلد (۴) شمارہ (۱) اکتوبر ۱۹۲۹ء

مضمون	مضمون نگار	صفحہ
شذرات	مدیر	الف
چاند کی سیر	ابوالکلام فیض محمد صدیقی صاحب	۱
کلام بیگم	محترمہ عابدہ مرزا بیگم	۷
قبرستان کا شیطان (افسانہ)	ناصر صاحب	۸
سوانح عالم کا ایک باب	جناب محمد سراج الدین طالب	۱۳
حرارت کے نظریئے	جناب محمد عبدالوہاب	۲۶
سپیرا (افسانہ)	جناب محمد معین الدین	۴۰
عنقا (نظم)	جناب محمد نصیر الدین خاں	۴۶
ادب اور شخصیت	بشارت علی صاحب	۴۷
نیرنگ زمانہ (نظم)	ابوالضیاء محمد عبدالکریم گل صاحب	۵۱
سید مظفر علی خاں اسیر	سید محمد صاحب	۵۲
کرشمۂ قدرت (نظم)	جناب محمد اقبال صدیقی اقبال	۵۶
تیاگ (افسانہ)	ڈاکٹر رابندرناتھ ٹیگور، ترجمہ غلام رسول صاحب	۵۷
بادۂ دکن (بہجت حیدرآبادی)	عمر یافعی صاحب	۶۳
جزیرۂ موت (افسانہ)	اقبال الدین احمد صدیقی صاحب	۷۰
غزل	صفی اورنگ آبادی صاحب	۷۲
تنقیدیں	س۔م صاحب	۷۳

(تصاویر: علی عادل شاہ ثانی۔ سید مظفر علی خاں اسیر
احمد نواز جنگ بہادر فانی)

جلد (۴) شمارہ (۲) نومبر ۱۹۲۹ء

مضمون	مضمون نگار	صفحہ
شذرات	ع۔ق صاحب	۲
ناٹک نویس	بابو راؤ کاشی کر صاحب	۵
ثبوت عشق (رباعی)	میر شاہد علی نیساں صاحب	۱۴
فریب تبسم (افسانہ)	محمد محی الدین صاحب	۱۵
نقش گل (نظم)	سید علی اختر صاحب	۱۹
ہندوؤں کی فارسی زبان کی خدمات	عبدالقادر سروری صاحب	۲۰
نیو تفریح (نظم)	ابوالمحاسن محمد محسن غالب متین صاحب	۲۳
سائنس	جناب سید شاہ محمد متعلم بی اے	۲۴
رباعی	جناب سید مودود احمد تشنہ	۳۹
طوطے آتوریاں (نظم)	محمد عبدالرحمٰن خان صاحب	۴۰
بے گناہ قیدی (افسانہ)	نصر اللہ خاں صاحب	۴۲
رباعی	جناب محمد علی قتیل حیدرآبادی	۴۹
چاندنی (نظم)	جناب ابوالافتخار فخر حیدرآبادی	۵۰
ہندوستان کے تمدنی وسائل	قاضی شفیع الدین صاحب	۵۶
رباعی	جناب صدرالدین رفقی دہلوی	۵۸
کشاکش جذبات (افسانہ)	عزیز احمد صاحب	۵۹
غزل	جناب محمد عبدالحمید خاں خیالی	۶۱
تنقیدیں	س۔م صاحب	۶۲

تصاویر: سلطان قلی قطب شاہ
شفیع حیدرآبادی بیمار

جلد (نہم) شمارہ (۳) دسمبر ۱۹۲۹ء

مضمون	مضمون نگار	صفحہ
شذرات	س۔م صاحب	۲
خود اعانتی	ناصر علی بیگ صاحب	۵
پند بے سود (نظم)	صفی اورنگ آبادی صاحب	۱۹
بھکاری (افسانہ)	محمد محی الدین صاحب	۲۱
ارسطو کا سیاسی تخیل	غلام جیلانی صاحب	۲۷
غزل	جناب محمد سید باشمیل سالار حیدر آبادی	۳۸
ابوالفضل	سید عبدالعزیز صاحب	۳۹
شب برات اور آتش بازی (نظم)	ابوالضیا عمر عبدالکریم کمل حیدر آبادی صاحب	۴۲
آخری خط	قیس حیدر آبادی صاحب	۴۳
بادۂ دکن (حکیم الحکماء نواب محمد طلب خان بہادر شرر حیدر آبادی)	عمر یافعی صاحب	۴۵
محبت کا راگ	جناب قیس حیدر آبادی	۵۶
کچھ دارو مریض (افسانہ)	محمد مسعود صدیقی صاحب	۵۷
تنقید	س۔م صاحب	۶۴

(تصاویر: موسیٰ ندی حیدر آباد دکن
مندر کا رنگ محل کا اندرونی منظر

جلد (۴) شمارہ (۴) جنوری [illegible]

مضمون	مضمون نگار	صفحہ
شذرات	ع۔ یس صاحب	۲
اورنگ زیب کی دکنی مہمات	احمد عبدالحی صاحب	۵
مصحفی کا تذکرہ ہندی	عمر یافعی صاحب	۱۷
فرہاد ثانی (افسانہ)	شبیر حسن قیس صاحب	۳۳
غزل	جناب حکیم مرزا قاسم علی بیگ اخگر	۴۴
خود اعانتی (بسلسلہ گذشتہ)	مرزا ناصر علی بیگ صاحب	۴۵
سوال و جواب (غزل)	جناب سید تادر حسین قادر	۵۲
اصنام خیال (افسانہ)	عزیز احمد صاحب	۵۳
غزل	جناب ابوالشجاع محبت	۵۹
تنقیدیں	س۔م صاحب	۶۰

(تصاویر قطعہ دوم
باغ عام کا ایک خوشنما منظر

جلد (۴) شمارہ (۵) فروری ۱۹۲۶ء

مضمون	مضمون نگار	صفحہ
شذرات	مدیر	۲
شاعری اور ترجمانیٔ حیات	ابو الخلد محمد بشارت علی قریشی صاحب	۵
غزل	جناب توفیق الحسن توفیق	۱۰
محبت کی فتح (افسانہ)	جناب مسعود الرحمٰن خاں ندوی	۱۱
خود اعانتی (مسلسل)	مرزا ناصر علی بیگ صاحب	۱۷
معنیٰ کا تذکرہ ہندی	عمر یافعی صاحب	۲۹
قلم کی سرگزشت	محمد حمید اللہ صاحب	۴۵
ایثار محبت	جناب شبیر حسن قیس	۵۲
خرم سے بدتر عید	جناب قاسمی حیدرآبادی	۵۹
مشاہدات (رباعیات)	ابو الفضل صاحب، راز چاندپوری	۶۰
تنقیدیں	س۔ م صاحب	۶۱

(تصویر: ایک راگنی)

جلد (۴) شمارہ (۶) مارچ ۱۹۲۶ء

مضمون	مضمون نگار	صفحہ
شذرات	مدیر	
اسلام میں عقلیت کا عروج و زوال	میر حسن الدین صاحب	۵
جلوۂ دکن (نواب درگاہ قلی خاں کا ایک اردو قصیدہ)	عمر یافعی صاحب	۲۴
غزل	صفی اورنگ آبادی صاحب	۳۴
خود اعانتی	مرزا ناصر علی بیگ صاحب	۳۵
وجہی مرثیہ گو کی حیثیت سے	نصیر الدین ہاشمی صاحب	۴۳
برسات	احمد علی اکبر راز قاسمی صاحب	۴۷
غزل	آشنہ و آزاد انصاری صاحب	۴۸
دکھن کا پکا (ڈرامہ)	شیدا محمد صاحب	۴۹
تنقید	س۔ م صاحب	۶۱

تصاویر: خان فضل محمد خان ناظم تعلیمات
مولوی محمد حسین نائب ناظم تعلیمات

جلد (۵) شمارہ (۱) خاص اشاعت اپریل [illegible]

مضمون	مضمون نگار	صفحہ
شذرات	مدیر	۲
خدا کی باتیں خدا جانے	عزیز احمد صاحب	۵
نوائے راز (نظم)	ابوالفضل آثر چاندپوری	۱۲
دوزخ حرام	ترجمہ جناب محمد محی الدین قریشی	۱۳
محبت بنام شرافت	مرزا ناصر علی بیگ صاحب	۱۹
ارادت (نظم)	جناب علی اختر اختر	۲۲
جگنو کا رقص	ترجمہ عزیز احمد صاحب	۲۳
الفت کا انجام	انتق گسیلہ بہتاز	۲۹
اسلامی خوشبوئیں سیرہ	ہرس صاحب	۳۵
تو ہمات دیہات	مولانا عبدالقدیر حسرت	۴۱
پریم	جناب عبدالرحمٰن چغتائی آرٹسٹ	۴۲
جوتا (نظم)	حکیم وحید الدین عالی	۴۴
سحر طراز	ترجمہ افتخار الدین و میر خواجہ حسین الدین صاحب	۴۵
احسان کا معاوضہ	مرزا ناصر علی بیگ صاحب	۵۶
پہلی منظر کا ایک داغ	محمد محی الدین صاحب	۶۰
فاتح	مدیر	۶۲
بے نام و نشان	جناب ایم اسلم	[illegible]
الہام صبح (نظم)	حکیم آزاد انصاری	۹۴
دل نادر (مثنوی)	جناب ابوالافتخار قمر حیدرآبادی	۹۶
تنقیدیں	س م، و س	۹۸
فہرست مضامین جلد چہارم		۱۰۱
مطبوعات مکتبہ ابراہیمیہ		۱۰۳

تصاویر: (۱) ٹو صنیت سائے منشی پریم چند (۲) منشی سدرشن (۳) سلطان ابوالحسن تانا شاہ (۴) عنوانی (۵) خطاطی کا ایک شاہکار

جلد (۵) شمارہ (۲) مئی [illegible]

مضمون	مضمون نگار	صفحہ
شذرات	حسن صاحب	۱
خود عاشق	جناب مرزا ناصر علی بیگ	۵
عشق ہے دل کی نہیں (نظم)	مولانا عبدالقدیر حسرت	۱۹
فارسی ادب اسلامی کا ایک گمنام شاعر	جناب حسین الدین زبیر	۲۰
مرجھوا	جناب غلام رسول	۲۵
سائنس کا طریقہ تربیت	سید شاہ محمد صاحب	۳۰
نورجہاں بیگم اور جہانگیر	حسن قادری صاحب	۳۴
کیا کہیے	جناب جمیل احمد خاں کوکب شاہجہانپوری	۴۲
دکن میں مسلمانوں کے قدم	جناب محمد ذکریا مائل	۴۳
سکوتِ شب	اکبر علی صاحب	۴۷
دکن کا ایک قدیم اردو شاعر	سید امین الدین صاحب	۴۹
مانٹی کارلو	جناب جی۔ ایم خاں	۵۵
منظرِ سحر (نظم)	جناب حمید الدین قمر	۶۲
تنقیدیں	س۔ م صاحب	۶۳

تصویر: حکیم سید شمس اللہ قادری صاحب

جلد (۵) شمارہ (۳) جون سنہ ۱۹۳۰ء

مضمون	مضمون نگار	صفحہ
شذرات	مدیر	۱
ہندوستان اور اس کی زبانیں	"	۵
پریتم (افسانہ)	جناب ڈاکٹر اعظم کریوی	۱۱
سنہری ندی (افسانہ)	جناب عبدالحمید شوق	۱۹
مرگ آرزو (نظم)	مولانا عبدالقدیر حسرت	۳۴
انتظار دوست	جناب محمد معین الدین رہبر	۳۵
جذبات ماہر (رباعیات)	جناب محمد عبدالکریم ماہر	۳۷
قوم تو اراج	جناب امیر مظہر علی مروی کامل	۳۸
روپیہ کی سرگذشت	عبدالمجیب صدیقی صاحب	۴۸
ممالک محروسہ سرکار عالی میں صنعتی ترقی کا امکان	عبدالقادر مینائی	۵۳
قاآنی کا عروج	پروفیسر عبدالقوی فانی صاحب	۵۸
تنقیدیں	س ۔ م	

تصویر: مشاہیر ملکرین عالم

جلد (۵) شمارہ (۴) جولائی سنہ ۱۹۳۰ء

مضمون	مضمون نگار	صفحہ
شذرات	مدیر	۲
واجد علی شاہ	جناب سید بادشاہ حسن قادری	۵
رقص	محمد عبدالرحمن چغتائی صاحب	۱۳
غزل	نواب نثار یار جنگ بہادر مزاج	۱۴
شکسپیر کا ایک شاہکار ڈرامہ	سید اصغر حسین میکش صاحب	۱۵
اتحاد یورپ	ڈاکٹر محمد عبدالحق صاحب	۲۵
برسات کا سماں	جناب محمد عبدالرحمن آزاد صدیقی	۳۶
خطبۂ صدارت	محمد عبدالرحمن خان صاحب	۴۱
ترانۂ غم (غزل)	حکیم آزاد انصاری صاحب	۶۱
شہر پر شریف	ناکارہ حیدرآبادی	۶۲
غـزل	جمیل احمد خان کوکب شاہجہانپوری	۶۵
تنقیدیں	س ۔ م	۶۶

تصاویر:

(۱) حضرت سلطان عالم واجد علی شاہ مرحوم

(۲) مولوی فاضل ڈاکٹر میر سیادت علی خان صاحب

جلد (۵) شمارہ (۵) اگست بسنۂ ۱۹۳۰ء

مضمون	مضمون نگار	صفحہ
شذرات	مدیر	۲
شمالی ہند کی زبانوں میں ٹی الوڈی کے تلفظ کی زیادتی	کرنل گریم بیلی پروفیسر اردو لندن یونیورسٹی (ترجمہ حمید اللہ صاحب)	۵
غزل	حکیم آشنا د انصاری صاحب	۱۲
طرزی الشار آہ	جناب ابوالمعاصی محمد محسن خاں متین قاسمی صاحب	۱۳
رباعیات	حکیم صفی اورنگ آبادی صاحب	
جوہری کے بیٹا (افسانہ)	کالرد گوزی ترجمہ مرزا ناصر علی بیگ صاحب	۲۳
وہ بھی کیا دن تھے (نظم)	اعظم اللہ اظہر وکیل صاحب	۲۷
دنیا کے چند خود ساختہ انسان	مرزا ناصر علی بیگ صاحب	۲۸
جذباتِ نسیم (غزل)	جناب محمد سلطان محی الدین خاں نسیم	۳۶
انگلستان اور اسکاچستان کے قدیم تعلقات	محمد فریدالدین صاحب	۳۷
ایک تسلی (نظم)	جناب ابوالافتخار فخر	۴۱
سولھویں صدی کا ایک ہیئت داں (ٹائیکو برہے)	محمود مرزا صاحب	۴۳
خاموشی کہتے ہیں جس کو مری گویائی ہے (نظم)	جناب محمد حنیف فروغ	۵۱
دہن کا پکا (ڈرامہ مسلسل)	رشید احمد رشید صاحب	۵۲
بنرنس اپنی شاعری پر	سید شاہ محمد صاحب	۵۷
عروجِ فکر	جناب جمیل محمد خاں کوکب	۶۰
تنقید	س۔ م صاحب	۶۱

تصویر ۔ باغ عامہ کا ایک دلفریب منظر

جلد (۵) شمارہ (۶) سپٹمبر ۱۹۳۰ء

مضمون	مضمون نگار	صفحہ
شذرات	مدیر	۲
اسلام میں فلسفہ کا نشو و نما	مولوی کامل میر مظہر علی وکیل	۵
تو حید کم شدہ کا ازلی نسخہ زبان نقش قدم	علامہ نواب ضیاء یار جنگ بہادر	۱۴
عجائب خانہ ہائے میں خط نسخ و شکستہ کے نمونے	جناب محمد سردار علی مدیر تجلی	۱۵
افسردہ دلی (نظم)	جناب سید علی اختر اختر	۲۲
چار مینار کی سیر	جناب محمد حسین الدین فاروقی رہبر	۲۳
غزل	صفی اورنگ آبادی صاحب	۳۲
سرخرو (افسانہ)	فرانکو ساشٹی (ترجمہ مرزا ناصر علی بیگ صاحب)	۳۴
جذباتِ عالیہ (غزل)	جناب ابو الاعظم مولانا امجد حیدر آبادی	۳۸
ایک گڈریا اپنی محبوبہ سے	جناب امجل حیدر آبادی	۳۹
علامہ بحر العلوم شمسی	نواب محمد بہادر خان جاگیردار	۴۱
ماہیت عشق	علامہ سید اشرف علی شمسی صاحب	۵۱
علامہ شمسی کا تبحر علمی	جناب محمد سعادت اللہ خاں ہوش	۵۷
کلام شمسی	جناب سید محمد (شریک مدیر)	۷۴
ایک تعزیتی مشاعرہ		۸۴
حضرت شمسی کا طرز اصلاح	جناب سید محمود احمد آشفتہ وخفا	۹۰
تنقیدیں		۹۳

تصویر علامہ بحر العلوم سید اشرف شمسی مرحوم

مجلہ خاص نمبر

جلد (۶) شمارہ (۱) اکتوبر ۱۹۳۰ء

مضمون	مضمون نگار	صفحہ
شذرات	س۔م صاحب	۲
حضرت امجد حیدرآبادی	ظفر آغا خان حیدرآبادی	۵
طفلی (نظم)	سید علی اختر اختر صاحب	۳۸
بچارا قلی (افسانہ)	غلام رسول صاحب	۳۹
مرقع جرأت (نظم)	علی رضا ماہر صاحب	۴۸
مردوں کی سرپرستی میں عورتوں کے حقوق	جناب غلام رسول مستقیم بی اے	۴۹
تیرا مجھکاری (نظم)	پنڈت ونشی دھر ودیا النکار	۵۷
شکسپیر کا ایک شاہکار ڈرامہ	سید صغیر حسن میکش	۵۸
تنقیدیں	س۔م صاحب	

تصاویر:- ۱) حضرت امجد حیدرآبادی
۲) محمد سراج الدین صاحب مع سید لیسین علی خان صاحب

جلد (۶) شمارہ (۲) اپریل ۱۹۳۱ء

مضمون	مضمون نگار	صفحہ
شذرات ذاتی اخلاق	س۔م صاحب شہید احمد صاحب	۲ ۵
لا الٰہ الا ھو لا ھو الا ھو (نظم)	امجد حیدرآبادی	۱۳
ملک کی قیمت (افسانہ)	محمد باقر کرمانی صاحب	۱۵
رموز و نکات (رباعیات)	ابوالفضل راز چاندپوری	۲۴
غزل	جناب حبیب الدین صغیر	۲۵
شاعری	سلیمی صاحب	۲۶
تجلیات فروغ (غزل)	محمد حنیف فروغ مرحوم	۲۹
شہیدان محبت (افسانہ)	سید شبیر حسن قیس صاحب	۳۰
غزل	حکیم آزاد انصاری صاحب	۳۲
ناکام امتحان (افسانہ)	اقبال حسین خان صاحب	۳۳
تسکین قلب (نظم)	شہید احمد صاحب	۴۲
تاریخ ادب کی خصوصیات	سید شاہ محمد صاحب	۴۳
خانہ برباد (نظم)	سید علی خبیر صاحب	۴۷
دیا سلائی	جناب ناکارہ حیدرآبادی	۴۸
وفور اضطراب (غزل)	جناب جمیل احمد خان کوکب	۵۲
حکیم قاآنی	جناب عبدالقوی فانی	۵۳
غزل	جناب سید قادر محی الدین آرزو	۶۰
تنقیدیں	س۔م صاحب	۶۱
فہرست مضامین مجلہ پنجم جلد		۶۵

تصاویر: (۱) نواب بہادر یار جنگ بہادر
(۲) ابوالفضل راز چاندپوری

شاداب خصوصی نمبر

جلد (۶) شمارہ (۳) دسمبر ۱۹۳۰ء

مضمون	مضمون نگار	صفحہ
شذرات	س۔م	۲
میر تقی میر پر ایک نظر	محمد باقر کرمانی صاحب	۵
انجام غم (نظم)	سید علی اختر اختر صاحب	۱۴
گزبھر زمین (افسانہ)	جناب ایم اسلم	۱۶
رباعیات	جناب محمد عباس علی قامر	۲۱
غزل	علامہ نواب ضیا یار جنگ بہادر ضیا	۲۲
بدیسی ریل (مزاحیہ انشا)	ترجمہ غلام رسول صاحب	۲۳
زندگی (نظم)	جناب ابوالانتظار فخر حیدرآبادی	۳۴
حجاز کا ایک روسی سیاح	جناب سید علی شبیر مدظلہ العالیہ	۳۵
قند پارسی	جناب حکیم محمد حمید الدین حالی	۴۴
محبت و عشق	جناب شیخ عبدالحمید شوق	۴۵
غزل	جناب سید ضمیر الدین احمد عرش گیاوی	۵۴
ہنسی	ابوالکلام فیض محمد صدیقی صاحب	۵۵
غزل	جناب محمد جمیل احمد خاں کوکب شاہجہانپوری	۶۰
تلاش خدا	ڈاکٹر محمد عبدالحق صاحب	۶۱
تنقیدیں	س۔م صاحب	

تصاویر: (۱) جناب ایم اسلم (۲) سید علی اختر اختر صاحب
(۳) علامہ عبدالجبار خاں آصفی مرحوم
(۴) حکیم حمید الدین حالی مرحوم

ابجی علی ۲۹۰

جلد (۶) شمارہ (۴) جنوری ۱۹۳۱ء

مضمون	مضمون نگار	صفحہ
شذرات	س۔م	۲
وجدانیات اور اکابر	جناب شیخ عبدالحمید شوق	۵
غزل	علامہ نواب ضیا یار جنگ بہادر ضیا	۱۰
عمر خیام	علامہ نواب حیدر یار جنگ بہادر نظم طباطبائی	۱۱
لطف تغزل	حکیم وحید الدین حالی صاحب	۱۳
فلسفی (افسانہ)	ترجمہ۔ عزیز احمد صاحب	۱۴
غزل	جناب عبدالحمید خاں خیالی	۱۸
ذاتی اخلاق (بسلسلۂ گذشتہ)	سید محمد صاحب	۱۹
خواجہ محمود گاواں کا قتل	سید بادشاہ حسن صاحب	۲۵
پندار غلط (نظم)	سید علی اختر اختر صاحب	۳۲
واسدیو گوتیند آپیٹے	ترجمہ غلام رسول صاحب	۳۳
غزل	سید وحید اللہ قادری وحید صاحب	۴۲
سنہری سینیاں (افسانہ)	عابد مسیح صاحب	۴۳
غزل	جناب میر محرم شاہ قادر کیلانی آسید	۴۵
صنف نازک اور ادب	بتو لطیف صاحب ج۔ح متعلم عثمانیہ یونیورسٹی	۴۶
خیالی (نظم)	جناب سید بادشاہ علی نقش حیدرآبادی	۵۱
شوکت بلگرامی	جناب سید محمد (شریک مدیر)	۵۲
غزل	محمد حنیف فروغ مرحوم	۵۶
راجہ صاحب کی ہستی (مزاحیہ)	جناب ناکارہ حیدرآبادی	۵۷
تنقیدیں	س۔م	۵۸

تصاویر: (۱) عمر خیام (۲) شوکت بلگرامی
(۳) قبر محمود گاواں

جلد (۶) شمارہ (۵) فروری سنہ ۱۹۳۱ء

مضمون	مضمون نگار	صفحہ
شذرات	س م ـ ح س	۲
حیدرآباد کا ایک شاعر و مورخ	ابوالمعانی محمد محسن خاں متین	۵
سفینۂ بحر آرزو (غزل)	جناب ابوالمعانی فخر حیدرآبادی	۴۹
سراب حسرت (افسانہ)	ترجمہ عزیز احمد صاحب	۵۰
غزل	علامہ نواب ضیا یار جنگ بہادر ضیا	۵۷
یورپ اور اسلام	ڈاکٹر معید الحق صاحب	۵۸
سپاہی (نظم)	حکیم آزاد انصاری صاحب	۶۲
جیفری چاسر	سید شاہ محمد صاحب	۶۳
تسنیم وفا (غزل)	جناب جمیل الرحمٰن گرگ شاہجہانپوری	۶۸
حسن کاری کا ایک نمونہ (افسانہ)	ترجمہ ـ غلام رسول صاحب	۷۳
نوائے راز (غزل)	جناب ابوالفاضل راز چاندپوری	۷۴
اورنگ نامہ حقیری	جناب محمد عبداللہ چغتائی لکچرر اسلامیہ کالج لاہور	۷۵
تنقید	س ۔ م	۸۰

تصویر: حاجی سید علی خبیر صاحب

جلد (۶) شمارہ (۶) مارچ سنہ ۱۹۳۱ء

مضمون	مضمون نگار	صفحہ
شذرات	س ۔ م	۲
ہندی ادب پر ایک سرسری نظر	نذیر	۵
غزل	حکیم آزاد انصاری صاحب	۹
یونانی علم الاصنام کا ایک زریں ورق	ابوالمکارم فیض محمد صدیقی صاحب	۱۰
علامہ سر اقبال سے (نظم)	شیخ عبدالحمید شوق صاحب	۱۸
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا	عزیز احمد صاحب	۲۱
مشاہدات (غزل)	سہیل اختر آختر صاحب	۲۴
جبر من جہات	ابوالمحامد محمد بشارت علی قریشی صاحب	۲۵
غزل	جناب ابوالفضائل حیدرآبادی	۴۶
زریں رات	جناب قتیل حیدرآبادی	۴۷
تیرے خیالات	سید محمد حیدرآبادی صاحب	۴۹
قطعات امجد	مولانا سید احمد حسین امجد صاحب	۵۵
آخری لمحات	لیاقت علی خاں فراقی صاحب	۵۶
غزل	سید قادر حسین قادر صاحب	۷۱
تنقیدیں	س ۔ م	۷۲

جلد (۔) شمارہ (۱) اپریل ۱۹۳۱ء

مضمون	مضمون نگار	صفحہ
شذرات	مدیر	۲
اسلامی ادبیات کا اثر دانتے کی تصنیف ڈوائن کامیڈی پر	احمد عبدالدین صاحب	۵
وجدانیات (غزل)	مولانا احمد حسین امجد حیدرآبادی	۲۱
دست غیب (افسانہ)	ایم اسلم صاحب	۲۲
چار مینار (نظم)	ابوالامتیاز فخر حیدرآبادی	۲۸
دنیا کی قدیم ترین جامع	ڈاکٹر محمد عبدالحق صاحب	۳۹
مغفرت (نظم)	جوش ملیح آبادی	۴۴
مکالمہ ٹیگور اور رومن رولینڈ	صفی الدین احمد صاحب	۴۵
گیری بالڈی	محمد باقر کرمانی صاحب	۴۹
محروم تمنا	راز قاسمی حیدرآبادی	۵۹
غزل	صفی اورنگ آبادی	۶۰
مذاہب چین	میر مظہر علی صاحب وکیل	۶۱
یاد ایام	میر تقی علی صاحب	۶۵
دو بہادر (افسانہ)	شیخ محمد سرفراز علی نیازی	۶۶
فہرست جلد ششم		۷۴

تصاویر: (۱) ڈاکٹر رابندرناتھ ٹیگور

(۲) چار مینار حیدرآباد دکن۔

جلد (۷) شمارہ (۲) مئی ۱۹۳۱ء

مضمون	مضمون نگار	صفحہ
شذرات	مدیر	۴
تجربیت و عقلیت	محمد معز علی صاحب	۵
اسلامی ادبیات کا اثر ڈوائن کامیڈی پر	احمد عبداللہ صاحب	۱۱
نذر (نظم)	مولانا احمد حسین امجد حیدرآبادی	۲۹
آسمانی امتحان (افسانہ)	ترجمہ مرزا ناصر علی بیگ صاحب	۳۰
حجاز کا ایک فرضی انگریز سیاح	حاجی سید علی شبیر صاحب صدر مستظم عدالت العالیہ	۳۸
کاش میں پھول ہوتا!	شبیر حسن قیس ملیح آبادی	۵۱
نوائے راز (نظم)	ابوالفاضل راز چاندپوری	۵۲
شیر شاہ سوری	شبیر علی صاحب	۵۳
سوز فرقت (نظم)	محمد علی صاحب شہرت بلگرامی	۷۴
تنقیدیں	س م ا۔ ایم	۷۵

جلد (۷) شمارہ (۳، ۴) جون جولائی ۱۹۳۱ء

مضمون	مضمون نگار	صفحہ
شذرات	س۔م	۲
شیر شاہ سوری	جناب شبیر علی مرحوم	۵
جلوۂ رعنا (غزل)	جمیل احمد خاں کوکب شاہجہانپوری	۲۸
موجودہ ایران میں تعلیم و تربیت کا طریقہ	ابو المحاسن محمد محسن خاں متین	۲۹
بہ حضور سرور انور معظم صلعم (غزل)	مولانا احمد حسین امجد حیدرآبادی	۴۰
معلم ثانی حکیم ابو النصر فارابی	محمد ذکریا مائل	۴۱
روایت (افسانہ)	مہندر راج سکسینہ حیدرآبادی	۴۴
غزل	حکیم آزاد انصاری	۵۳
کلیہ و دمنہ	عبد المجیب صدیقی صاحب	۵۴
غزل	حضرت صفی اورنگ آبادی	۶۵
اعتراف (افسانہ)	محمد محی الدین قریشی صاحب	۶۶
غزل (فارسی)	عبد السلام ذکی حیدرآبادی	۷۲
سلطان ابن مسعود کے زمانے میں ایک انگریز کا سفر حجاز	سید علی خبیر صاحب مدد مشتغل عدالت العالیہ	۷۳
مشاہدات (نظم)	سید علی اختر اختر صاحب	۹۶
تنقیدیں	س۔م	۹۷

تصویر: نواب مرزا یار جنگ بہادر

جلد (۷) شمارہ (۵، ۶) اگست ستمبر ۱۹۳۱ء

مضمون	مضمون نگار	صفحہ
شذرات		
شیر شاہ سوری	جناب شبیر علی مرحوم	۵
غزل	حضرت صفی اورنگ آبادی	۱۶
فریب (افسانہ)	جناب محمد باقر کرمانی	۱۷
بھاگ بگو حسن سے بھاگ (نظم)	حکیم آزاد انصاری	۲۴
میر مہدی مجروح	جناب سید بادشاہ حسن حیدرآبادی	۲۷
غزل	جناب سید شبلی محمد اجلال	۴۳
افریقیہ اور الجزائر میں مسلمانوں کی فتوحات	جناب محمد ذکریا مائل	۴۴
ایک خاندان کی قبر میں (نظم) ترجمہ	سید بادشاہ علی نقش	۵۴
دعوت میں جانا (افسانہ)	جناب بینا کاملہ حیدرآبادی	۵۵
غزل	فرحت مرحوم حیدرآبادی	۶۰
خمرائے عرب	جناب محمد عبد المجیب صدیقی	۶۱
غزل	جناب مرزا اسد اللہ بیگ حیدر	۶۵
سزائے عیش (افسانہ)	جناب سرفراز علی بیخود	۶۶
کیف اضطراب (غزل)	جمیل احمد خاں کوکب شاہجہانپوری	۷۱
سترھویں صدی کا ایک ہمارا شاعر	ان سید شاہ محمد صاحب	۷۲
مرزا ایرج کا مقبرہ	جناب محمد عبد الحمید کیل کنٹر	۷۶
غزل	محمد عبد السلام ذکی (عثمانیہ)	۸۰
تنقیدیں	س۔م	۸۱

تصویر: میر مہدی مجروح مرحوم

شاداب خاص نمبر

جلد (۸) شمارہ (۱) اکتوبر ۱۹۳۶ء

مضمون	مضمون نگار	صفحہ
شذرات	مدیر	۲
شعر کی صنفیں	"	۵
شامِ ہجراں (نظم)	جناب مرزا اسد اللہ بیگ حیدر	۱۲
مذہب اور یورپ	پروفیسر ڈاکٹر عبد الحق	۱۷
غزل	حضرت صفی اورنگ آبادی	۲۱
الفائے شرط (افسانہ)	جناب ابوالولا محمد ذکریا مائل	۲۲
نشاطِ روح (غزل)	جناب جمیل احمد خاں کوکب شاہجہاں پوری	۲۷
صوتیاتی تحقیقات	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور صاحب	۲۸
بادل (نظم)	عزیز احمد عزیز صاحب	۳۵
تعطیل (ڈراما)	" "	۳۶
دال	جناب اختر حسین اختر	۴۳
جدید مطبوعات	ادارہ	۵۱
تنقیدیں { اردو شستہ قدیم / ہندی اردو مالا	"ھ" اور "ق"	۵۳

الجمال ۹۰ء

جلد (۸) شمارہ (۲) نومبر ۱۹۳۶ء

مضمون	مضمون نگار	صفحہ
شذرات	"ق"	۲
نظام الملک آصف جاہ اول	قاضی ابن مظہر رحیم فاروقی صاحب	۵
قہوہ (مثنوی) مرتبہ	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور صاحب	۱۴
انڈیا آفس میں چند دکنی دیوان	نصیر الدین ہاشمی صاحب	۱۹
طوق زریں (افسانہ)	جناب محمد اعظم	۳۱
غزل	جناب صلاح الدین احمد عروج گیاوی	۳۷
سینما	نور الہدیٰ صاحب	۳۸
غزل	جناب سید علی حسنین زیبا (ردولوی)	۴۶
سلطان غیاث الدین بہمنی	ابوالولا محمد ذکریا مائل	۴۷
جدید مطبوعات	ادارہ	۵۰
تنقیدیں { مرزا جی / البدر	"ق" و "س"	۵۲

جلد (۸) شمارہ (۳-۴) دسمبر و جنوری سنہ ۱۹۴۳ء

مضمون	مضمون نگار	صفحہ
شذرات	مدیر	۲
حاتم کی مسلسل نظمیں	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور صاحب	۵
آوارہ گرد (افسانہ)	جناب لیاقت علیخاں فراق	۱
محمود گاواں (نظم)	جناب محمد عبدالسلام ذکی	۲۲
اقبال کی شاعری کا پہلا دور	عزیز احمد صاحب	۲۵
مثنوی در تعریف تماکو محقہ	شاہ ظہور الدین حاتم	۲۷
فرانس کا ایک بڑا مصلح تعلیم	فیض محمد صدیقی	۴۲
ہنگام شباب (غزل)	عزیز احمد عزیز	۵۱
پریم کی آگ (افسانہ)	ترجمہ وشمبر ناتھ شرما	۵۲
مخمس	ضمیر الدین عرش گیاوی	۷۲
درد و سودا کی فطرت نگاری	میر حسن	۷۳
حسن رفتار (غزل)		۸۷
جدید اردو شاعری کی پیدائش کا راز	عبدالقادر سروری	۸۸
جدید مطبوعات	ادارہ	۹۳
تنقیدیں	"ع" "ش"	۹۴

جلد (۸) شمارہ (۵) سنہ ۱۹۴۴ء

مضمون	مضمون نگار	صفحہ
شذرات	مدیر	۳
تذکرہ گردیزی کے دکنی شعراء	نصیر الدین ہاشمی صاحب	۵
آہ یہ سحر (نظم)	علی حسنین زیبا صاحب	۱۷
گیسیں	سید شاہ محمد صاحب	۱۸
موت (نظم)	صاحبزادہ ڈاکٹر طاہر علیخاں مسلم صاحب	۲۶
مجرم ضمیر	جناب محمد اعظم خاں	۲۸
غزل	جناب محمد عبدالسلام ذکی	۳۴
جارج برکلے	جناب غلام گوہر علیخان	۳۵
حسیات	جناب نبی الحسن شمیم	۴۴
مشرکی قسمیں	پروفیسر عبدالقادر سروری صاحب	۴۵
جدید مطبوعات	ادارہ	۵۵
تنقیدیں، کارزار، صاعقہ	مدیر	

جلد (۸) شمارہ (۶) مارچ ۱۹۳۲ء

شذرات	مدیر	۳
درد و سوز کی عشقیہ نظمیں	میر حسن صاحب	۵
داغ گلزار (مثنوی)	جناب مرزا اسد اللہ بیگ حیدر	۸
نجات ابدی (افسانہ)	جی یم۔ خاں صاحب	۱۱
غزل	ڈاکٹر میر طاہر علیخاں مسلم صاحب	۲۴
بیس ڈو	جناب ابوالکلام فیض محمد صدیقی	۲۵
شکستِ ساغر (غزل)	عزیز احمد صاحب	۳۰
اجل (افسانہ)	جناب ایم اسلم	۳۱
محبت کا دیوتا	دانتے	۳۶
ساحلی میدان کے باشندے	احمد الدین احمد صاحب	۳۷
غزل	جناب رضی الحسن رضی	۴۲
گویا فلم کا ماضی و مستقبل	جناب ابوالاحمد ذکریا مائل	۴۳
حقائق (غزل)	جناب کوکب شاہجہانپوری	۴۹
زندگی کا بہترین زمانہ	جناب حشمت اللہ صدیقی	۵۰
جدید مطبوعات	ادارہ	۵۶
تنقیدیں۔ گناہ کی دیوار	"ع"	۵۷

جلد (۹) شمارہ (۱) اپریل ۱۹۳۲ء

مضمون	مضمون نگار	صفحہ نمبر
شذرات	مدیر	۴
پکبست	محمد عبد القادر سروری صاحب	۵
جواب (نظم)	سید علی اختر اختر صاحب	۱۲
جنت کے تین پھول (افسانہ)	اختر حسن صاحب	۱۴
عہدِ طفلی (نظم)	مرزا اسد اللہ بیگ حیدر صاحب	۲۶
سجدے	عزیز احمد صاحب	۲۷
افسانۂ دل (نظم)	جناب کوکب شاہجہانپوری	۳۲
سویرا اٹھنا	عبد السلام ذکی صاحب	۳۳
احوالِ دل (غزل)	ڈاکٹر میر اسمٰعیل مسلم صاحب	۳۵
ورڈسورتھ کا نظریۂ حیاتِ انسانی	میر حسن صاحب	۳۷
فردوسِ بریں	عبد الحلیم شرر مرحوم	۴۰
قربانی (افسانہ)	غلام رسول صاحب	۴۲
جدید مطبوعات تنقیدیں	ادارہ "م" "و "س"	۵۲
فہرست مضامین مجلہ مکتبہ جلد (۸)		

جلد (۹) شمارہ (۲) مئی ۱۹۳۲ء

مضمون	مضمون نگار	صفحہ نمبر
لسان العصر اکبر اور اُن کی شاعری	ڈاکٹر رحیم بریہانی صاحب	۵
غیر رسشہ (رباعیات)	حضرت امجد حیدرآبادی	۳۴
آصف جاہ ثانی	نصیر الدین ہاشمی صاحب	۳۶
آخری خط (افسانہ)	نقش عالمی صاحب	۴۰
غـزل	جناب عبد السلام ذکی	۵۱
داستانِ حسن	جناب کوکب شاہجہانپوری	۵۲
مردے از غیب	محمد خان صاحب	۵۳
تنقیدیں "ہمزاد" دکھنی مخطوطات	"ح"	۶۷

جلد (۹) شمارہ (۳) جون ۱۹۳۲ء

مضمون	مضمون نگار	صفحہ
شذرات	ادارہ	۴
آصفجاہ دوراں کی شاعری	عبدالقادر سروری صاحب	۵
مشاہدات راز	جناب ابوالفاضل راز چاندپوری	۱۰
گرد	سید شاہ محمد صاحب	۱۱
جزیرہ (افسانہ)	جناب محمد محبوب علی خان	۱۲
غزل	ڈاکٹر طاہر علیخان مسلم صاحب	۱۴
حسین ساگر	نظارہ پرست	۱۵
حقیقی مسرت	نقش عالی حیدرآبادی	۱۷
شاعری اور مذہب	ماہر حیدرآبادی	۲۸
رازِ محشر	جناب مرزا اسد اللہ بیگ حیدر	۳۱
ہندی ادب کے متعلق دو جدید کتابیں	ڈاکٹر میم بریسانی صاحب	۳۵
غزل	جناب بشیر احمد بشیر	۴۴
ایک امی شاعر	جناب مرزا شکور بیگ	۴۴
تنقیدیں	عزیز احمد صاحب	۵۱

تصویر: حضرت امجد حیدرآبادی

جلد (۹) شمارہ (۴) جولائی ۱۹۳۲ء

مضمون	مضمون نگار	صفحہ
شذرات	مدیر	۳
فورٹ ولیم کالج کے ارباب قلم کے متعلق	نصیر الدین ہاشمی صاحب	۵
غزل	ڈاکٹر میر طاہر علیخان مسلم صاحب	۹
طلسم زندگی (نظم)	جناب عبدالسلام ذکی	۱۰
سائنٹفک نویسی	جناب میر حسن	۱۲
نوائے راز	جناب ابوالفاضل راز چاندپوری	۱۷
شعر اور اس کی خصوصیات	علی حنین زیبا صاحب	۱۸
یہ فیصلہ تو ہو کہ دل مبتلا ہے کیا؟	سید علی رضی علی صاحب	۲۷
سوز غم (افسانہ)	محبوب علی خان صاحب	۲۸
جوہر شمشیر	جناب سرفراز علی نیوش	۳۳
غزل	ملا محمد یار جنگ بہادر نظم طباطبائی	۴۰
درد کی زندگی کا ایک ورق	غلام محمد خان صاحب	۴۱
تجارت کی سرد بازاری	نجم الدین انصاری صاحب	۴۸
محبت	جناب اختر حسن آختر	۵۲
تنقیدیں	"ع"	۵۳

جلد (۹) شمارہ (۵ و ۶) خاص اشاعت اگست ستمبر سنہ ۱۹۳۲ء

مضمون	مضمون نگار	صفحہ
شذرات	مدیر	۳
زمزمۂ انجم	حضرت علامہ اقبال	۵
لسانیات	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور صاحب	۷
ناول نگاری اور اردو زبان	محمد اعظم خان صاحب	۱۳
سرگوشیاں (رومانٹک)	عزیز احمد صاحب	۴۲
مجھے تم یاد آتے ہو	جناب شعیب احمد حزیں	۴۴
وے بخیر گذشت	جناب مرزا شکور بیگ	۴۶
جنیساز کی باتیں	حضرت احمد حسین امجد حیدرآبادی	۵۱
الم ایجاد کیسے بن گیا "پنہاں رنگ"	پروفیسر عابد علی	۵۶
اقبال کا ذوقِ آگہی	جناب علی حسنین زیبا	۵۷
غبار رنگیں	جناب صدق جائسی	۷۰
رسیدہ بود بلائے	جناب میر حسن	۷۱
غزل	مولانا حسرت موہانی صاحب	۷۴
شجاعت	جناب محمد محی الدین قریشی	۷۵
غزل	جناب محمد عبدالحی شارق	۸۴
مریضِ الفت	ترجمہ عزیز احمد صاحب	۸۵
اے دوست	جناب علی حسنین زیبا	۹۳
ناول کے پلاٹ یا خاکے	عبدالقادر سروری صاحب	۹۵

مضمون	مضمون نگار	صفحہ
باغبان	ڈاکٹر اعظم کریوی صاحب	۱۰۰
انتظار	جناب مرزا اسداللہ بیگ حیدر	۱۰۲
ظاہر اور حقیقت	سید شاہ محمد صاحب	۱۰۴
راز و نیاز	جناب کوکب شاہجہانپوری	۱۱۱
اے میرے محبوب	راز قاسمی صاحب	۱۱۳
تنقید	"س"	۱۱۴
رفیق تنہائی اور دوسرے افسانے		

جلد (۱۰) شمارہ (۱) اپریل سنہ ۱۹۳۳ء

مضمون	مضمون نگار	صفحہ
شذرات	مدیر	۳
ہندوستان اور رقاقیت	جناب بال کشن راؤ	۵
دل کی آرزو	مفتون اجمیری	۱۰
سعیدہ	راز قاسمی صاحب	۱۲
پامر کا خاندان	تمکین کاظمی صاحب	۱۷
انتقام الفت	ظفر قریشی صاحب	۲۵
قربانی	ج نقوی صاحبہ	۳۰
ان الحکم الا اللہ	امجد حیدرآبادی	۳۳
تین مجموعے	مترجمہ بی بی انشا صاحب	۳۵
عزرائیل کی ملاقات	شمس النساء بیگم	۳۷
رشید سینا یا نئی دہلی کے متعلق ایک قدیم سند شاہی	سردار علی صاحب	۴۲
ماتم قوم	مرزا اسد اللہ بیگ حید	۴۸
نوائے راز	ابو الفاضل راز چاند پوری	۴۹
بلبل اور قمری	محمود اسرائیلی صاحب	۵۰
ساوتری	سجاد حیدر صاحب	۵۱
مرجانے دو	مانی جائسی صاحب	۵۱
خمسہ	جناب آمی حیدرآبادی	۵۴
غزل	نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز	۵۵
غزل	جناب وجدی شمسی حیدرآبادی	۵۵
رباعیات	جناب جلال الدین اکبر	۵۶
تاثیر محبت	جناب ایم اسلم	۵۷

جلد (۱۰) شمارہ (۲) مئی سنہ ۱۹۳۳ء

مضمون	مضمون نگار	صفحہ
شذرات	مدیر	۳
گلکنڈہ، ہندوستان ایک مخلوط اسکی تحقیق	میر حسن صاحب	۵
لڑکی لڑکوں کی تعلیم میں ضبط موسیقی کا رول	جناب فیض محمد صدیقی	۱۷
ایک ناکامی (افسانہ)	جناب اختر حسن اختر	۲۵
غزل	نواب محمد قادر الدین خاں تمکین	۳۱
سینما اور زندگی	جناب نجم الدین انصاری	۳۲
غزل	جناب اختر حسن اختر	۳۶
کیفیات	کوکب شاہجہانپوری	۴۴
محبت کا گدیر ہے (آخری دعا۔ نظم)	جناب آشنا حیدرآبادی	۴۵
غزل	جناب روشن علی روشن مرحوم	۴۸
محسن کش	ترجمہ اجمل عرفانی صاحب	۴۹
تنقیدیں	شاہد بخش الفرقان؛ سرکار معالم دنیا کے بجھنے والے	۵۶

شاداب خاص نمبر

جلد (۱۰) شمارہ (۳) جون ۱۹۴۳ء

مضمون	مضمون نگار	صفحہ
شذرات	مدیر	ب
ایشیا کدھر سفر کر رہا ہے	نواب بہادر یار جنگ	۱
غزل	جناب سید عابد علی عابد	۱۵
موت کی فتح	جناب میر ناصر علی کامل	۱۶
کلکتہ ہندوستانی	جناب میر حسن	۱۷
طباطبائی	مدیر	۳۳
غزل	راز چاندپوری	۴۰
تخمیس برغزل غالب	مفتون اجمیری	۴۱
دل بیتاب	شہاب حیدرآبادی	۴۲
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی	راز قاسمی صاحب	۴۴
افسانہ نگاری کی غلطی	نقش عالمی صاحب	۴۹
اے ناز نین	جناب مصطفےٰ اعلیٰ گرامی	۵۲
دل کی پیاس	جناب شاہد صدیقی اکبرآبادی	۵۳
رموز خاموشی	جناب اختر حسن اختر	۵۴
غزل	مولانا آئی حیدرآبادی	۵۸
تنقیدیں	مشیر احمد صاحب و مفتون اجمیری	۵۹

جلد (۱۰) شمارہ (۴) جولائی ۱۹۴۳ء

مضمون	مضمون نگار	صفحہ
شذرات	مدیر	ب
ہندوستان پر اسلامی اثرات	جناب نصیر الدین ہاشمی	۱
روداد دل	جناب کوکب شاہجہانپوری	۷
افسانہ	سید شاہ محمد صاحب	۸
غزل	جناب عابد علی عابد	۱۳
ناوان جنگ کا مسئلہ	جناب نجم الدین انصاری	۲۴
حسن تمکین	نواب قادر الدین خاں سرمست تمکین	۳۲
جون کرافورڈ	جناب ایس۔ بی۔ استا	۳۳
وصال	راز قاسمی صاحب	۳۴
گذری ہوئی شائستگی کا ایک نمونہ	زمان درانی صاحب	۴۱
گڑیا	جناب صمد رضوی	۴۷
غزل	مولانا عبدالقدیر حسرت	۵۰
افسانہ۔ پاگل	غلام رسول صاحب	۵۱
وجدانیات	جناب سکندر علی وجد	۵۵
علی بخش	مفتون اجمیری	۶۰
تنقیدیں	میر حسن صاحب	۶۷

جلد (۱۰) شمارہ (۵) اگست ۱۹۳۳ء

مضمون	مضمون نگار	صفحہ
شذرات	مدیر	ج
راسپوٹین	جناب نجم الدین انصاری	۱
وجدانیات (نظم)	جناب سکندر علی وجد	۶
اللہ نے بچا لیا	میر حسن صاحب	۷
جنبش گل	رازنامی صاحب	۱۲
غزل	مولانا عبدالقدیر حسرت	۱۳
ریمن نوادر	ایس۔ بی۔ انتا صاحب	۱۴
غزل	نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز	۲۰
ہندوستان پر اسلامی اثرات	نصیر الدین ہاشمی صاحب	۲۱
غرورِ مستانہ (نظم)	جناب کوکب شاہجہانپوری	۲۶
میرے کردار	جناب سید عابد علی عابد	۲۷
غزل	محمد قادرالدین تمکین عالی رحمت	۳۳
سیر بیدر	جناب مرزا ناصر علی بیگ	۳۴
مغنیۂ بہار سے	آمنہ رضیہ صاحبہ	۴۷
علمی خبریں	—	۵۰
تنقیدیں	مفتون اجمیری	۵۳

جلد (۱۰) شمارہ (۶) ستمبر ۱۹۳۳ء

مضمون	مضمون نگار	صفحہ
حضرت ذہین مرحوم	ظفریاب خاں صاحب	ج
ہندوستان پر اسلامی اثرات	نصیر الدین ہاشمی صاحب	۱
نوائے راز	جناب ابوالفاضل راز چاندپوری	۸
یادِ ایامِ عشرت فانی	سید محمد احسن صاحب	۹
نالہائے نیم شبی	جناب جاذب بجلوی	۱۴
گلہریوں کو دیکھ کر	مرزا رضا علی بیگ صاحب	۱۸
گوئٹے کے مکتوباتِ محبت	مخدوم محی الدین صاحب	۱۹
نغمۂ ہند	ایس۔ بی۔ انتا صاحب	۲۵
پیغام	جناب اختر حسن اختر	۲۷
تنوع	جناب کوکب شاہجہانپوری	۳۳
اچھی بات ہمیشہ بری لگتی ہے	جناب رکن الدین قریشی	۳۴
رباعی	مرزا واجد حسین یگانہ لکھنوی	۳۷
ہے باقی	مولانا آسی صاحب	۳۸
سعدی شیرازی	محمد خاں صاحب	۳۹
پروازِ تخیل	آغا حشر کاشمیری	۴۵
ایک عجیب سفر	جناب سکندر علی وجد	۴۶
غزل	جناب مصطفیٰ علی اکبر نگرامی	۵۲
تنقیدیں		۵۴
علمی خبریں		۵۵

جلد (۱۱) شمارہ دہم مطابق نومبر ۱۹۴۳ء

مضمون	مضمون نگار	صفحہ
تشذرات	مدیر	ب
حرارت کی ماہیت	محمد عبدالکریم صاحب صدیقی	۱
وجدانیات	سکندر علی صاحب وجد	۶
یورپ کی تحریک اصلاح مذہب کی سیاست یا نظری اہمیت	سید محمد احسن صاحب	۷
غزل	جاذب صاحب جھلی	۱۶
الفاظ عہد	رشید صاحب کاظمی	۱۷
رباعیات	کشن نارائن صاحب واگھرے	۲۴
دورِ حاضر	مرزا اسد اللہ بیگ صاحب حیدر	۲۵
ایک خواب	فضل الٰہی خان صاحب	۲۶
منصوبہ	یس پی اننتا صاحب	۲۸
پرواز خیال	مرزا رضا علی بیگ صاحب	۲۹
ایک یادگار رات	شعیب احمد صاحب عباسی حزیں	۳۲
پتا کہیں حکم بن ہلال	بشیر حسن صاحب	۳۳
فی الموت حیاة	مولوی احمد حسین صاحب امجد حیدرآبادی	۳۹
والیئر	ف م۔ صدیقی	۴۰
نوائے راز	راز قاسمی صاحب	۴۴
ہیلٹ مینشن	محمد طاہر علی صاحب	۴۹
علمی خبریں	—	۵۹

جلد (۱۱) شمارہ (۳) مطابق دسمبر ۱۹۴۳ء

مضمون	مضمون نگار	صفحہ
شذرات	مدیر	ب
ژان بودین کے سیاسی نظریے	سید محمد احسن صاحب	۱
جذبات جوش	شبیر حسن خان صاحب جوش ملیح آبادی	۱۴
کروڑ پتی	راز قاسمی صاحب	۱۴
وجدانیات	سکندر علی صاحب وجد	۲۰
فصل کاٹنے والی لڑکی	اختر حسن صاحب اختر	۲۱
غزل	محمد بشیر احمد خاں صاحب بشیر	۲۳
مرزا جی	محمد سرفراز علی صاحب نوش	۲۴
غزل	کشن نارائن صاحب واگھرے ضمیر	۲۹
فدائے حریت	صاحبزادہ میر محمد علی خان صاحب آغائی	۳۰
جنوبی عربی تہذیب	سید ابوالخیر حسینی صاحب	۳۳
غزل	اختر حسن صاحب اختر	۴۲
خوشی کے آنسو	صابر حسین صاحب کوسگوی	۴۳
غزل	نقش عالمی صاحب	۵۲
صہبائے ادب	ماخوذ	۵۳
علمی خبریں	〃	۵۹
تنقیدیں	مدیر	۶۱

آپ کے کنبے میں جب بھی کوئی

پیدائش

یا

موت

ہو تو اسے مقامی اندراج دفتر میں!

درج ضرور کرائیں

یہ معاون ہوتا ہے

پیدائش کا سرٹیفکیٹ عمر کا سرٹیفکیٹ ہوتا ہے:

- اسکول میں داخلے
- نوکری حاصل کرنے
- ووٹ کے حق
- ڈرائیونگ لائسنس
- پاسپورٹ لینے کے لئے
- بیمہ پالیسی کے لئے

موت کے سرٹیفکیٹ کی ضرورت ہوتی ہے

- موروثی جائیداد
- بیمے کی رقم
- جائیداد میں حصہ حاصل کرانے کے لئے

اندراج بروقت کرانے
اور سرٹیفکیٹ بلا معاوضہ حاصل کیجئے
پیدائش اور موت کا اندراج کرانا قانوناً لازمی ہے
تاخیر سے کئے گئے رجسٹریشن بھی قابل قبول ہوں گے۔

رجسٹرار جنرل، انڈیا

ماہنامہ

شاداب

حیدرآباد

جلد (۷) شمارہ (۵) مئی سنہ ۹۰ء حیدرآباد

ایڈیٹر
محمد قمرالدین صابری

جائنٹ ایڈیٹر
رشید الدین

مینجنگ ایڈیٹر
کلیم الدین احسن

خصوصی شمارہ نمبر ۲ آصفجاہی عہد نمبر

بہ سلسلہ چار سو سالہ جشن تاسیس حیدرآباد

مجلس مشاورت

محترمہ عائشہ بیگم رباب • یوسف ناظم • ڈاکٹر محمد یوسف الدین • پروفیسر وحی الدین احمد • میرزا احمد صدیقی

محمد منظور احمد منظور • محترمہ سیدہ مہر • ڈاکٹر منشاء الرحمٰن خاں منشا • پروفیسر میر تراب علی

شرح تعاون

خصوصی شمارہ 25/- روپے ڈی لکس ایڈیشن 40/- روپے عام شمارہ 6/- روپے

	ہندوستان	خلیجی ممالک	امریکہ	انگلستان	پاکستان
سالانہ	65 روپے	200 روپے	40 ڈالر	25 پونڈ	175 پاکستانی روپے
۲ سال	120 //	360 //	70 //	45 //	300 //
تاحیات	1500 //	3700 //	700 //	400 //	3000 //

:- (ترسیل زر کا پتہ) :-

ماہنامہ شاداب 11-5-147 ریڈ ہلز۔ حیدرآباد (اے پی) انڈیا

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر محمد قمرالدین صابری نے شفیق فائن پرنٹنگ پریس چارکمان سے چھپوا کر

دفتر شاداب 11-5-147 ریڈ ہلز حیدرآباد سے شائع کیا

فہرست

انتساب		۳
ترانۂ دکن	کلام ملوک ملوک الکلام اعلیٰحضرت سلطان العلوم آصفجاہ سابع	۴
قومی ترانۂ دکن	" "	۵
آصفجاہ ہفتم کی یاد میں (نظم)	مولانا ظفر علی خاں	۶
اُردو کی راجدھانی (نظم)	محترمہ بشیر النساء بیگم بشیر	۷
حرفِ اول	ایڈیٹر	۹
فرمان روایان سلطنتِ آصفیہ (شجرہ)		۱۱
سلاطین آصفیہ کی مذہبی رواداری	راشٹرے جانکی پرشاد	۱۴
دکن میں ہندو مسلم برادرانہ تعلقات...	جناب میر لطف علی ابوالعلائی	۲۶
حیدرآباد کی آبادیاں	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور	۳۱
شہر حیدرآباد کی قدیم عمارتیں	(قدیم مخطوطہ سے)	۴۱
حضرت آصفجاہ اول کا انتظامِ مملکت	جناب محمد اسمٰعیل خاں	۵۴
حیدرآباد کی علمی سرگرمیاں آصفجاہ سادس کے عہد میں	پروفیسر عبدالقادر سروری	۷۴
احوال انتقال اعلیٰحضرت آصفجاہ سادس	(قدیم مخطوطہ سے)	۸۶
حیدرآباد کی جیبی اُردو خدمات	جناب صاحبزادہ میکش	۸۷
محی الملت والدین	جناب محمد الدین فوق	۹۳
نذرِ عقیدت	جناب واحد پریاؤ	۱۰۰
سیرتِ عثمانی	مولانا سید مناظر الحسن صاحب ہوش بلگرامی	۱۰۲
حیاتِ عثمانی	جناب یعقوب علی عرفانی ایڈیٹر سالار	[illegible]
تاریخ دکن کے لطیفے.....	مولوی عمر یافعی	[illegible]

انتساب

شہر حیدرآباد کی بنا قطب شاہی عہد میں پڑی۔ مگر یہ شہر جس دکنی تہذیب کا نمائندہ ہے اِس کا ارتقاء آصفجاہی عہد میں ہوا اِسی عہد میں یہ تہذیب نقطۂ کمال کو پہنچی۔ چنانچہ آج بھی خانوادۂ آصف جاہ کے نمائندے اس تہذیب کی علامت ہیں۔ "شاداب" کا یہ دوسرا خصوصی شمارہ "آصفجاہی عہد نمبر" اس خانوادہ کے چشم و چراغ نواب مفخم جاہ بہادر کے نام مَعنوَن کیا جاتا ہے۔

ترانۂ دکن

کلام الملوک ملوک الکلام

اعلیٰحضرت سلطان العلوم آصفجاہ سابع

الٰہی تا جہاں باشد شہنشاہِ جہاں باشی ؛ خدایت مہرباں تو بعالم مہرباں باشی

نفس تا بر ہمی آرم دعا کردن بود کارم ؛ ہمیں وردِ زباں دارم کہ دائم حکمراں باشی

کند تا زمزمہ بلبل خورد تا پیچ و خم سنبل ؛ زند تا خندہ خوش گل بہارِ بوستاں باشی

دمد تا سبزہ و ریحاں بود تا سرو در بستاں ؛ بباغِ دہر اے سلطاں نہالِ بیخزاں باشی

نظام الملک عثمان علیخاں آصف سابع
سراج دین اسلامی امیرِ مومناں ہاشی

العظمۃ للہ

قومی ترانۂ دکن

تا ابد خالقِ عالم یہ ریاست رکھے ‏ تجھکو عثماں بصد اجلال سلامت رکھے
جیسے تو فخرِ سلاطین ہے بفضلِ یزداں ‏ یوں ہی ممتاز ترا دورِ حکومت رکھے
آل و اولاد کو اللہ دے عمرِ خضری ‏ اُن سے آباد ترا خانۂ دولت رکھے
جُودِ حاتم رہے شرمندۂ احساں تیرا ‏ عدلِ کسریٰ کو خجل تیری عدالت رکھے
نغمہ زن صوتِ گلِ تر سے ہوا خواہ رہیں ‏ آکے قدموں پہ عدو فرقِ اطاعت رکھے
سب رعایا کو تری سالگرہ کی تقریب ‏ با نشاط و طرب و عیش و مسرت رکھے
بن کے ساقی ترا اقبال نظامِ سابع ‏ تجھکو صہباکشِ خمخانۂ عشرت رکھے

مولانا ظفر علی خان

آصفجاہ ہفتم کی یاد میں

دھلا نہیں ہے گل و لالہ کا غبار ابھی — برس کچھ اور بھی اے ابرِ نو بہار ابھی
بدل چکا ہے بدلتا ہے اور بدلے گا — بہت سے رنگ ہیں چرخِ ستیزہ کار ابھی
بہار سر پہ ہے اے پنجۂ جنوں پھر کیوں — کیا نہ تو نے گریباں کو تار تار ابھی
نہیں کرشمۂ ساقی کی اس میں کچھ تقصیر — کچھ اہلِ بزم جو بیٹھے ہیں ہوشیار ابھی
زمانہ جس کی تجلی سے جگمگا اٹھا — ہے جلوہ ریز وہ خورشیدِ زر نگار ابھی
محمد عربی کے جلال کا پرتو — ہے شکلِ غازیٔ اعظم سے آشکار ابھی
خدا بھی مستمع ہے اس کا کلام بھی زندہ — اساسِ سطوتِ کبریٰ ہے استوار ابھی
حیاتِ دہر شہادت کے ساتھ ملتی ہے — فنا کی رمز بقا کی ہے راز دار ابھی
دکن کے باغ میں چھائی ہوئی تھی خاموشی (خسروِ دکن) سنا ہے میں نے مگر نغمۂ ہزار ابھی
یہ کہہ رہی ہے پلٹ کر نگاہِ یار ابھی — زمانہ اور بھی بدلے گا ایک بار ابھی
خدا کا سایہ ترے سر پہ آصفِ ہفتم — کہ تو ہے ہند میں ملت کا افتخار ابھی
چھپا سکی نہ زباں تیری رازِ سوزِ دروں — ہے جس سے سینۂ اسلام داغدار ابھی
ہے یہ بھی رحمتِ پروردگارِ عالمیاں — کہ ہیں زمانہ میں تجھ جیسے تاجدار ابھی

دکن بھی دولتِ کابل کی طرح ہو آزاد
بڑھے کچھ اور بھی اسلام کا وقار ابھی

{[illegible]}

محترمہ بشیر النساء بیگم بشیر

اُردو کی راجدھانی

پھولوں کے رنگ روپ سے زینت چمن کی ہے
تاباں دُرِ خوش آب سے قسمت عدن کی ہے
ہندوستاں میں آج جو عظمت دکن کی ہے
عزت وہی ہے اپنی جو اپنے وطن کی ہے

> خوش ہوں کہ اس زمین پہ میں نے جنم لیا
> قدرت نے جس کو علم و امانت سے بھر دیا!

علم و عمل کا راغ ہے، دائم بہار ہے
آسودہ حال شہری ہیں، خوش شہر یار ہے
اپنی نظیر آپ، یہ اپنا دیار ہے
مالک! ترے کرم سے دکن کا وقار ہے

> کیوں ناز ہو نہ ملک کو اس تاجدار پر
> بدنظمیوں کا دور میں جس کے نہیں گزر

ذہنی تباہیوں سے دکن ہے بچا ہوا
اللہ کی رحمتوں سے ہے گویا بھرا ہوا
حاجت روائیوں سے دلوں میں کھبا ہوا
کُل ہند کی نگاہوں کا مرکز بنا ہوا

شاہکار

امن و اماں کے نور سے معمور ہے دکن
اور کج ادائیوں سے بہت دور ہے دکن

اہلِ دکن کو شاہ پرستی سے کام ہے
والی یہاں کا "ظلِ الٰہ" کا کلام ہے
یکتائے روزگار یہاں کا نظام ہے
پرچم پہ حکمرانی کے اللہ کا نام ہے

آزادیوں میں یاں ہے مذاہب کی پرورش
تسخیرِ روح و قلب ہے اس خاک کی کشش

اس سرزمیں نے کھولے ہیں عقدے قلوب کے
رشتے ملا دیئے ہیں شمال و جنوب کے
سارے نقوش و خدشے مٹے ہیں عیوب کے
اردو یہیں سے ابھری ہے اک بار ڈوب کے

اس دورِ کشمکش میں یہاں اطمینان ہے
باقی دکن سے عظمتِ ہندوستان ہے

ہر دم ریاضِ اردو پہ ہے یاں نئی بہار
شاہِ دکن کا فیضِ ہمایوں ہے آبیار
اس دور میں ہوا یہ زمانے پہ آشکار
اردو زباں کا آصفِ سابع ہے تاجدار

اردو کو ناز جامعۂ عثمانیہ پہ ہے
اور جامعہ کو رافتِ سلطانیہ پہ ہے

۱۹۴۴ء

(محترمہ بشیر النساء بیگم بشیر کے شعری مجموعہ "آبگینۂ شعر" مطبوعہ ۱۹۴۸ء سے)

حرف اوّل

حیدرآباد کی چار سو سالہ زندگی پہ جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ حیدرآباد کی گنگا جمنی دکنی تہذیب آصف جاہی عہد میں اپنے ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے نقطۂ عروج کو پہنچتی ہے۔ آصف جاہی عہد کی اسی خصوصی دین کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے ہم نے "شاداب" کے خصوصی شماروں میں دوسرے شمارے کو آصف جاہی عہد کیلئے مختص کیا ہے۔ اور کوشش کی ہے کہ اُس زمانے کی نمائندہ تحریروں کو پیش کرکے آصف جاہی عہد کے اس پہلو کو اُجاگر کیا جائے۔ چنانچہ راجے جانکی پرشاد نے سلاطین آصفیہ کی عدیم المثال غیر معمولی مذہبی رواداری اور بے تعصبی کا اعتراف واقعات اور اعداد و شمار کیا ساتھ کیا ہے۔ دولت آصفیہ کی گذشتہ عظمت و شوکت سے متعلق مولوی ابو الاعلیٰ مودودی کا ایک مضمون شریک اشاعت ہے گو یہ مضمون مختصر ہے مگر اس میں گذشتہ عظمت و شوکت کا ذکر کرتے ہوئے حیدرآباد کی ترقی کے لئے انہوں نے حُبِ وطن اور فکر صحیح کی تلقین کی ہے، دکن میں ہندو مسلم برادرانہ تعلقات ہماری تہذیب کی امتیازی خصوصیت ہیں، تاریخی روایات کے ساتھ ان کا ذکر مولوی میر لطف علی ابو العلائی نے کیا ہے اس تاریخی اتحاد کے اظہار بکھرے ان جھلکیوں میں پیش کیا جارہا ہے حیدرآباد کی آبادیوں کے بارے میں ڈاکٹر زورؔ کا مضمون ہے جو کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے البتہ اُردو ریسرچ سنٹر میں موجود ایک مخطوطہ سے شہر حیدرآباد کی قدیم عمارتوں کی تفصیلات شریک ہیں اس میں ایسی بیش قیمت معلومات ہیں جو کہیں اور یکجا دستیاب نہیں ہیں۔ حضرت آصف جاہ اول کے انتظام مملکت کے بارے میں ایک مضمون پیش ہے جس میں فوج کے انتظام اور آرام و آسائش کے ساتھ ساتھ رعایا کی فلاح و بہبود کے لئے امن دلانا، انصاف رسانی، راہزنوں مجرموں کو سزا، رشوت سے پرہیز کے انتظامات و نگرانی کا تفصیل سے ذکر کیا ہے اس عمل کو تمام آصفجاہی

حکمرانوں نے جاری رکھا۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ انہیں رعایا کے آرام و آسائش کا کس قدر خیال تھا اس کے ساتھ ہی علمی و ادبی سرگرمیوں کی سرپرستی بھی کی جاتی تھی۔ پروفیسر عبدالقادر سروری کا ایک مضمون آصفجاہ سادس میر محبوب علی خاں کے زمانہ میں حیدرآباد کی علمی سرگرمیوں کے بارے میں شریک اشاعت ہے نیز حیدرآباد کی جدید اردو خدمات کے بارے میں صاحبزادہ میکش کا ایک مختصر مضمون بھی آصف جاہی سلاطین کی علمی سرپرستی کی نشاندہی کرتا ہے آصفجاہ سابع کی علمی سرپرستی کا مختصر اظہار "ملک الملت والدین" سے بھی ہوتا ہے جو محمد الدین فوق ایڈیٹر "نظام" لاہور نے لکھا ہے یہ خطاب آصف جاہ سابع کو علمائے اسلام نے نومبر ۱۹۱۸ء میں پیش کیا اور عام مسلمانوں نے اخبارات و جلسوں کے ذریعہ اس پر مہر تصدیق ثبت کی اور اسی خطاب کی یادگار میں ماہنامہ "نظام" لاہور سے جاری کیا گیا۔ اعلیٰ حضرت کی ہندو رعایا بھی اظہار عقیدت میں پیچھے نہیں تھی چنانچہ بطور نمونہ جناب واسدیو راؤ بانکے لے ایڈیٹر "روزنامہ مشیر دکن" کی "نذر عقیدت" شریک اشاعت ہے۔ سیرت عثمانی پر ایک مختصر مضمون ہوش بلگرامی کا پیش ہے نیز شیخ یعقوب علی عرفانی ایڈیٹر "سالار" بمبئی کی کتاب ارمغان عرفان موسوم بہ حیات عثمانی کی تلخیص بھی شریک ہے ان مضامین سے آصف سابع کی ہمہ صفات موصوف شخصیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ جناب عمر یافعی نے عہد آصفی کی ایک "غیر تاریخی" کتاب سے تاریخ دکن کے لطیفے "روزنامہ مشیر دکن" کے سالگرہ نمبر ۵۶ ۱۳ ھ میں شائع کروائے ہیں جن سے دکن کی تہذیبی و ثقافتی زندگی ظاہر ہوتی ہے غرض زیر نظر خصوصی شمارہ نمبر ۲ میں آصفجاہی عہد کی ایک تصویر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ قارئین کو تاریخ دکن میں آصفجاہی دور کا علم ہو۔ ان خصوصی شماروں کی تیاری اور پیشکشی میں ادارۂ "شاداب" مالی اعتبار سے کافی زیر بار ہو رہا ہے۔ ان خصوصی شماروں پر زیادہ خراج کے باوجود مستقل خریداروں کو یہ شمارے بہ عام زر تعاون ہی میں سربراہ کئے جا رہے ہیں قارئین اور مستقل خریداروں سے اپیل ہے کہ وہ "شاداب" کے خریدار بنائیں اور اس طرح ادارہ سے تعاون فرمائیں کہ یہ خصوصی شمارے زیادہ بہتر انداز سے پیش کئے جا سکیں ۔ (ایڈیٹر)

فرمانروایانِ سلطنتِ آصفیہ

(مرتبہ: محمد فاضل)

نمبر شمار	نام فرمانروا	تاریخ ولادت	تاریخ جلوس	تاریخ معزولی	تاریخ وفات	مدت عمر: سال	ماہ	یوم	مدت حکومت: سال	ماہ	یوم
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰	۱۱	۱۲
۱	نواب میر قمر الدین خان چین قلیچ خان نظام الملک آصف جاہ اول مغفرت مآب	۱۴ ربیع الاول ۱۰۸۲ھ	۱۱۳۷ھ ۱۷۲۴ء	-	۴ جمادی الثانی ۱۱۶۱ھ	۷۹	۲	۱۰	۲۴	-	-
۲	نواب میر احمد خان ناصر جنگ نظام الدولہ شہید خلف دوم	۱۸ محرم ۱۱۲۴ھ	جمادی الثانی ۱۱۶۱ھ ۱۷۴۸ء	-	۱۷ محرم ۱۱۶۴ھ ۱۷۵۰ء	۳۹	۱۱	۲۹	۲	۷	۸
۳	نواب ہدایت محی الدین خان مظفر جنگ	-	۱۷ محرم ۱۱۶۴ھ ۱۷۵۰ء	-	۱۱۶۵ھ ۱۷۵۱ء	-	-	-	-	۴	-
۴	نواب سید محمد خان صلابت جنگ آصف الدولہ امیر الممالک	۱۱۳۰ھ	۲۰ ربیع الاول ۱۱۶۵ھ	۱۱۷۵ھ ذی الحجہ	۱۱۷۶ھ	۴۷	-	-	۱۱	۸	۳۶
۵	نواب میر نظام علی خان آصف جاہ ثانی غفران مآب	یکم شوال ۱۱۴۶ھ	۱۱۷۵ھ ۱۷۶۱ء	-	۱۷ ربیع الثانی ۱۲۱۸ھ ۱۸۰۳ء	۷۱	۶	۱۶	۴۲	۴	۳
۶	نواب میر اکبر علی خان سکندر جاہ آصف جاہ ثالث	یکم رجب ۱۱۸۲ھ	۱۲۱۸ھ	-	ذی قعدہ ۱۲۴۴ھ ۱۸۲۹ء	۶۲	۴	۱۶	۲۶	۶	۲۵
۷	نواب میر فرخندہ علی خان ناصر الدولہ آصف جاہ رابع غفران منزل	رمضان ۱۲۰۸ھ	۱۲۴۴ھ ۱۸۲۹ء	-	رمضان ۱۲۷۳ھ ۱۸۵۷ء	۶۴	۱۱	۲۸	۲۸	۱۰	۲
۸	نواب میر تہنیت علی خان افضل الدولہ آصف جاہ خامس مغفرت مکان	ربیع الاول ۱۲۴۳ھ	۱۲۷۳ھ ۱۸۵۷ء	-	ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ ۱۸۶۸ء	۴۲	۷	۱۳	۱۲	۱	۹
۹	نواب میر محبوب علی خان آصف جاہ سادس غفران مکان	۵ ربیع الثانی ۱۲۸۲ھ	ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ ۱۸۶۸ء	-	رمضان ۱۳۲۹ھ ۱۹۱۱ء	۴۵	۴	۲۸	۴۳	۹	۲۲
۱۰	اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خان آصف جاہ سابع	جمادی الثانی ۱۳۰۳ھ	رمضان ۱۳۲۹ھ ۱۹۱۱ء	-	فروری ۱۹۶۷ء						

(ماخوذ از بستان آصفیہ اور دیگر تواریخ دکن)

(یادگار سلور جوبلی آصف سابع جشن عثمانی)

سلاطین آصفیہ کی مذہبی رواداری

دکن آج سے نہیں بلکہ صدیوں سے اسلامی بادشاہوں کے زیر نگین رہتا چلا آیا ہے عادل شاہوں کے عدل پر کوئی حرف نہیں لاسکتا۔ بہمنیوں کی رواداری کا ثبوت اُس سلطنت کے "بہمنی" لقب سے ملتا ہے۔ اسی طرح برید شاہوں کے حُسنِ سلوک سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا اور قطب شاہی عہد حکومت میں تو "اکنا و مادنا" سیاہ اور سپید کے مالک تھے۔

دولت آصفیہ کی رواداری ابتدا ہی سے عدیم المثال رہی ہے۔ اُس کے زیر سایۂ عاطفت ہندو، مسلمان، سکھ، پارسی، عیسائی اور دوسرے مذاہب کے لوگ باہم شیر و شکر رہتے ہوئے آرام کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ آصف جاہی آئین حکومت میں مساوات کا جو برتاؤ ہے اُس کی نظیر دوسرے مقام پر نہیں مل سکتی۔ حیدرآباد میں ایک طرف تو پائگاہوں، نواب سالارجنگ بہادر اور نواب خانخاناں اور نواب فخر الملک بہادر کے خاندان امیرانہ تزک و احتشام کے ساتھ بستے ہیں اور دوسری طرف چھتریوں کے نام لیوا مہاراجہ چندولال اور مہاراجہ کشن پرشاد، برہمنوں کی مالا جپنے والے راجہ رائے رایاں اور کائستھوں کے نقش قدم پر چلنے والے راجہ شیوراج اور دوسرے کئی خاندان حیدرآباد میں مقتدر اور باسطوت زندگی گزار رہے ہیں۔

ان کے علاوہ ممالک محروسہ میں پھیلے ہوئے سمستان چھوٹی چھوٹی ریاستوں کی حیثیت رکھتے ہیں اور اُن کے والی آصف جاہی امرا میں داخل ہیں اور بڑی بڑی جاگیرات اور مناصب سے سرفراز ہیں۔ چار لاکھ ہندو امرائے عظام کے قبضے

میں (۵۸۴) گاؤں ہیں۔ جن کا رقبہ (۴،۴،۵۲) مربع میل اور آمدنی (۱۹،۶۰،۸۶۰) روپے ہے جو مسلمان ہندوؤں کے قبضے میں ان کی تعداد (۱۳) ہے۔ ان مسلمانوں میں (۸۱۲) مواضعات اور (۶۰) مزرعے ہیں۔ ان سب کا رقبہ (۲،۵۲۱) مربع میل اور آمدنی (۲۶،۷۵،۴۵۳) روپے ہے بعض انگریزوں، پارسیوں فرانسیسی نسل کے عیسائیوں اور سکھوں کو بھی پشتہا پشت سے مناصب مل رہے ہیں خاندان آصفیہ ہمیشہ سے رعایا کی مذہبی آزادی کا طرف دار رہا ہے اور کبھی کسی فرقۂ رعایا کے اداۓ مراسم و عبادات میں خلل انداز نہیں ہوا ہے خاص کر ہمارے زمانے میں اعلیٰ حضرت خسرو دکن و برار نے اپنی خاندانی روایات میں چار چاند لگا دیئے ہیں۔ آپ کے دورِ حکومت میں صدائے ناقوس بھی بلند ہوتی ہے اور اذان کی آواز بھی سنائی دیتی ہے۔ آتشکدوں میں آگ بھی دہکتی رہتی ہے اور گرجاؤں میں گھنٹوں کی آوازیں بھی گونجتی رہتی ہیں۔ غرض ہر فرقے کو مذہبی آزادی حاصل ہے۔

محکمۂ امور مذہبی کا بنیادی مقصد اور نصب العین حضرت بندگان عالی کے سایۂ عاطفت میں امن و امان کی زندگی بسر کرنے والے مختلف فرقوں اور طبقوں کی مذہبی اور روحانی ترقی کے لئے زیادہ سے زیادہ سہولتیں فراہم کرنا ہے اور یہ محکمہ اس مقصد کی تکمیل کے لئے کوشاں ہے۔ حکومت سرکار عالی کا ہرگز یہ منشاء نہیں رہا کہ وہ کسی مذہبی تقریب کو روکے بجز اس کے کہ وہ نامناسب ہو اور اس کے انجام پانے سے دوسرے مذہب والوں کے جذبات اس قدر مشتعل ہوتے ہوں کہ امن عامہ خطرے میں پڑ جاتا ہو۔ اس مسلک کے تحت ایسے قاعدے اور طریقے معین کردیئے گئے ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر اس آزادی سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

جو درخواستیں مسجدوں اور مندروں کی تعمیر کے لیے پیش کی جاتی ہیں ان کے بارے

میں درخواست گزاروں کو یہ شکایت تھی کہ مختلف مدارج طے کرنے کے باعث اس کا تصفیہ ہونے میں غیر معمولی تعویق ہوتی ہے اور بعض اوقات کئی سال لگ جاتے ہیں۔ اس شکایت کو رفع کرنے کی غرض سے محکمۂ امور مذہبی نے چاروں صوبوں کے صوبہ دار صاحبان کے پاس ایک گشتی روانہ کی جس میں ایسی درخواستوں کا جلد تصفیہ ہو جانے کے لیے نئے طریقۂ کار کی صراحت کی گئی۔ مزید سہولت کی غرض سے تحصیلداروں کو بھی وہ اختیارات عطا کیے گئے ہیں جو ایسے مقدمات فیصل کرنے کے لیے تعلقداروں کو حاصل تھے۔

خاندانِ آصف جاہی کی بے مثل، بے تعصبی اور فراخ دلی کا اندازہ مسلمہ واقعات اور اعداد و شمار سے کیا جا سکتا ہے۔ مسلمانوں کی خالص مذہبی خدمات میں برادرانِ ہنود اب بھی دخیل ہیں اور مسلمانوں کی اکثر و بیشتر مذہبی خدمات اب تک اُن میں نسلاً بعد نسلٍ بطورِ میراث چلی آ رہی ہیں۔ ممالک محروسہ سرکار عالی میں اسلامی امکنہ مساجد و مقابر اور عاشور خانے ایسے بھی ہیں جو ہندوؤں کے زیر اہتمام ہیں۔ مسلمانوں کی (۱۰۶) مذہبی معاشیں دائمی طور پر ہندوؤں کے نام ہیں جو شرعی خدمات کی انجام دہی اپنی طرف سے مسلمانوں سے کرتے ہیں۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں کہ ہنود مسلمانوں کی مذہبی اور شرعی خدمات سے مستفید ہوں۔ یہ ساری باتیں باہمی اعتماد، خلوص اور پختہ روابط و مراسم کا نتیجہ ہیں اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے دیرینہ اتحاد کی نشانی ہیں۔

ممالک محروسہ میں مسلمانوں کے مذہبی اداروں کی تعداد (۴۷۷،۱۴) ہے جن میں (۰۰۰،۴) مسجدیں ہیں۔ اس کے برخلاف ہندوؤں کے مذہبی اداروں کی تعداد (۸۵۳،۲۶) ہے جن میں (۰۰۰،۲۴) مندر ہیں۔ یہ ادارے راست دیہی عمال کی نگرانی میں ہیں جن میں سے (۱۰۳،۲۷) ہندو ہیں اور (۲۷۶،۲) مسلمان۔ مملکت حیدرآباد کے غیر مسلم مذہبی اداروں یا افراد کو محکمہ امور مذہبی کی جانب سے جو سالانہ معینہ امدادیں منظورہ ہیں اُن کی مجموعی رقم (۹۰۳،۶۱) روپے ہے نیز غیر مسلم اداروں یا افراد

کو تعلیمات، زراعت اور طبابت کے محکموں سے جو امدادیں مقرر ہیں اُن کی مجموعی رقم (۰۸۱ و ۹۷ و ۱) روپے ہے۔ غیر مسلموں کی ایک بڑی تعداد ایسی ہے جن کے نام پر میے جاری ہیں۔ ان لومیوں سے جو مصارف عائد ہوتے ہیں اُن کا سالانہ حساب (۳۰۴ و ۱۹) روپے ہے۔

ہندوؤں کو وسیع جاگیریں دی گئی ہیں تاکہ اُن کی آمدنی سے دیولوں میں پوجا پاٹ اور دوسرے مذہبی مراسم کا انتظام ہو سکے۔ اِس مقصد کے لیے (۴ ۳ ۲ ۲) گاؤں مختص ہیں جن کی سالانہ آمدنی (۳) لاکھ روپیوں سے بھی زائد ہے۔ اِس کے سوا (۵ ۵ ۳ و ۱۱) مندروں کے لیے نقد معاش اور محاصل اراضی کی شکل میں (۰۰ و ۱۱ و ۳) روپیوں کی رقم دائمی طور پر منظورہ ہے معاش یاب مندروں کی تق ۱۰ مد معاش یاب مسجدوں کے مقابلے میں (۱ ۳ ۳ و ۶) زیادہ ہے اور مندروں کو مسجدوں کے مقابلے میں کم و بیش (۰۰۰ و ۶۰) روپے زیادہ ملتے ہیں مزید برآں مندروں میں موقتی طور پر مذہبی مراسم اور تہوار منانے کے لیے سرکاری مواز نے میں متوالی سالانہ (۱۶ ۲ و ۷۶) روپے کی رقم بھی شریک ہے حکومت ایسے اشخاص مثلاً شاستریوں کی مالی امداد بھی کرتی ہے جو ہندو مذہب سے اچھی واقفیت رکھتے ہیں اور کتھاؤں وغیرہ کے ذریعہ پُران اور شاسترنہ، کی تعلیمات کی اشاعت کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو تقریباً (۰۰۰ و ۶) روپے سالانہ ملتے ہیں۔

حکومت سرکار عالی نے ہندوؤں کو (۱۵ ۳ و ۱) گاؤں غیر مشروط جاگیر کے طور پر دے رکھے ہیں۔ اُن کے سالانہ محاصل (۶ ۳ ۹ و ۹۶ و ۲۰) روپے ہیں یہ جاگیریں موروثی ہیں اِسی طرح (۱۶ ۴) اشخاص کو ماہانہ (۹۱ ۷ و ۱۶) روپے موروثی منصب کے طور پر ملتے ہیں۔ تنہا علاقۂ صرفِ خاص مبارک میں (۵۱) غیر مسلم منصبدار ہیں۔

علاقۂ دیوانی میں (۴۷، و ۸۹ و ۶)، علاقۂ صرفِ خاص مبارک میں (۱۰ ۴ و ۹۰) اور علاقۂ جاگیرات میں (۵۶ ۷ و ۳ ۴ و ۲) غیر مسلم پٹہ دار اور اجارہ دار ہیں۔ علاقۂ دیوانی

تھا (۲۰۹،۲) علاقۂ صرف خاص مبارک میں (۱۳۷) اور علاقۂ جاگیرات میں (۱۰۰۵،۱) غیر مسلم رسوم دار ہیں۔ ممالک محروسہ میں غیر مسلم دستبرداروں اور میراث داروں کی تعداد (۲۴۴۲) ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ شاہان سلف نے مسلمانوں کو اُن کی خدمات جلیلہ کے صلے میں مناصب اور جاگیرات مرحمت کیے تھے۔ مگر جب اُن میں سے کوئی منصبدار یا جاگیردار لاولد فوت ہو جاتا ہے تو اُسی کا منصب یا جاگیر بحق سرکار ضبط ہو جاتی ہے کیونکہ شرع اسلام میں تبنیت کا طریقہ تسلیم نہیں کیا جاتا۔ اب تک جتنی جاگیریں اِس طرح ضبط ہوئی ہیں اُن کے سالانہ محاصل (۳۶۳،۱۰،۳۳) روپے ہیں۔ اِس کے برخلاف جو جاگیریں یا معاشیں ہندوؤں کو دی گئی تھیں وہ اُن کے خاندانوں میں تاحال اُسی طرح جاری ہیں۔ کیونکہ ہندوؤں کے پاس تبنیت کا دستور جائز ہے اور اُن کے لاولد مرنے پر اُن کا متبنیٰ معاش کا وارث قرار پاتا ہے۔

بیرون ممالک محروسہ کے غیر مسلم اداروں کو جو معینہ امدادیں دی جاتی ہیں اُن کی مجموعی رقم (۹۲،۴۳۷) روپے ہے۔ اِس کے سوا کئی غیر مسلم ادارے حضرت اقدس و اعلیٰ کے رہین منت ہیں مسٹر ایس۔ آر۔ داس کی تعلیمی اسکیم کے لیے حضور ممدوح نے دو لاکھ روپے اور ڈاکٹر ٹیگور کی درسگاہ "وشوا بھارتی" کے لیے ایک لاکھ روپے عطا فرمائے۔ اِسی طرح مختلف اداروں کو سلطان العلوم خسرو دکن سے بڑی بڑی امدادیں ملتی رہیں اور اکثر اب تک برابر ماہانہ یا سالانہ مل رہی ہیں۔ ہندوستان کا کوئی قومی بڑا ادارہ ایسا نہیں ہے جو شاہ دکن کے دریائے کرم سے فیض یاب نہ ہو رہا ہو۔ چاہے علی گڑھ یونیورسٹی ہو چاہے بنارس یونیورسٹی۔ خواہ جامعہ ملیہ ہو یا شانتی نکیتن۔ سب یکساں طور پر آپ کے فیض سے متمتع ہو رہے ہیں۔

تاجدار دکن کے عہد زرّیں میں حیدرآباد میں جہاں اور عظیم الشان کام انجام پائے ا

متعدد اصلاحیں ہوئیں وہاں آثار قدیمہ کا محکمہ بھی قائم ہوا تاکہ ملک کی قدیم یادگاروں کی نگرانی کی جائے۔ اس محکمے نے ایلورا اور اجنتا کے مشہور غاروں کو صاف کرکے ان کے تحفظ کا بندوبست کیا، بیدر کی بہمنی اور بریدشاہی عمارتوں کو شکست و ریخت سے بچایا اور ورنگل اور بیدر، شوراپور کی مشہور ہندو عمارتوں اور دیولوں کو درست کرایا، تمام حدود مملکت کے اندر قدیم تاریخی یادگاروں کا پتہ لگایا۔ ان عمارتوں پر چھوٹے چھوٹے تاریخی مقالے لکھے، ان کے فوٹو شائع کیے اور ان کے طرز تعمیر اور مسالے کی خوبیوں پر روشنی ڈالی۔ مسلمانوں کی مذہبی عمارتوں کے تحفظ پر حکومت کا کم و بیش تریسٹھ ہزار روپیہ صرف ہوا۔ اس کے مقابلے میں ہندو تمدن کے آثار کی نگہداشت اور ان کی مرمت پر زائد از دس لاکھ روپے صرف ہوئے۔

اعلیٰ حضرت بندگان عالی نے خاندانی روایات و رواداری کو اور بھی درخشاں فرما دیا۔ وہ اس طرح کہ ہندوستان کے بعض علاقوں میں گاؤ کشی کے فسادات سے وہاں کا امن و امان متاثر ہوتا رہتا تھا۔ آپ نے ذریعہ فرمان مبارک اپنی قلمرو مملکت میں گاؤ کشی کی ممانعت فرمادی۔ یہ واقعہ عہد عثمانی کی وہ مستقل یادگار ہے جو ہندو کے دلوں پر نقش ہے۔ اور ان مٹ ہے۔

اوقاف اور دیگر امور مذہبی کے دستور کے متعلق بھی چند امور کا مختصر ذکر بے موقع نہ ہوگا۔ ہر گاؤں کا پٹیل اور پٹواری، ہر تعلقہ کا تحصیلدار، ہر ضلع کا تعلقدار اور ہر صوبے کا صوبہ دار خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان، پارسی ہو یا عیسائی علی الترتیب اپنے گاؤں، تعلقے، ضلع اور صوبے کا مذہبی افسر ہوتا ہے۔ صوبہ دار کے بعد امور مذہبی دو جداگانہ حصوں میں منقسم ہو جاتے ہیں۔ ایک شعبۂ نظم و نسق ہے اور دوسرا انفصال مقدمات و تصفیۂ تنازعات سے متعلق ہے۔ شعبۂ نظم و نسق کی نگرانی کے لیے جو عہدہ دار مقرر ہے وہ ناظم امور مذہبی کہلاتا ہے اور اس کا صدر دفتر بلدۂ حیدرآباد میں ہے اور دیگر محکموں کی طرح ایک معتمد اور صدر المہامی کے تحت ہے۔ صیغہ انفصال مقدمات کے سلسلے میں یہ امر

ظاہر ہے کہ نقدی اور اراضی کے مفادات اُن خانگی افراد کے تنازعات سے خالی نہیں ہوسکتے جو متولی، مہنت یا منتظم کی حیثیت سے کارگذار ہیں۔ اُن میں سے ہر ایک کی وفات پر اُس کی جانشینی کا تنازعہ قدرۃً پیدا ہوتا ہے۔ ان قضیوں کے تصفیے کے لیے جداگانہ عدالت قائم ہے۔ ان کے نیچے ناظم عطیات مقرر ہے جو عموماً محکمۂ مالگزاری سے لیا جاتا ہے اور اُس کو اِس قسم کے مقدمات کی سماعت کا بالکلیہ اختیار حاصل ہے۔ اِس کے فیصلوں کا مرافعہ ایک کمیٹی کے آگے پیش ہوتا ہے جو باب حکومت کے دو ارکان پر مشتمل ہے اور اگر کبھی کوئی معزز رکن باب حکومت موجود نہ ہوں تو عدالت عالیہ کے میر مجلس کو کمیٹی میں شریک کر لیا جاتا ہے۔ ان اعلیٰ عدالتی حکام کے تقرر میں اور نہ قانون کے نفاذ میں کسی ذات پات یا مذہب وملت کی بناء پر کوئی امتیاز ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ ایک مقررہ مالیت سے زیادہ کے مقدمات توثیق کے لیے اعلیٰ حضرت بندگانِ عالی کے ملاحظے میں پیش کیے جاتے ہیں۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کے ایسے اوقاف اور مشروط الخدمت جاگیرات کے مسائل جن کی مالیت لاکھوں روپے ہوتی ہے اس طریقے پر طے کیے جاتے ہیں اِس سلسلے میں اگر حضرت اقدس واعلیٰ کے متعدد فرامین مبارک کا مطالعہ کیا جائے تو یہ اچھی طرح واضح ہوگا کہ شخصی قوانین اور مذہبی عقائد کے اختلاف سے شاہ ذی جاہ کی ذات ستودہ صفات ہمیشہ بالاتر رہی۔ اِس کی تہ میں یہ اصول کارفرما ہے کہ ہمارے لائحۂ زندگی میں شخصی اعتقادات حائل نہ ہونے پائیں۔ مختلف فرامینِ مبارک نے اِس اصول کی نشو ونما اور آبیاری میں جو حصہ لیا ہے کسی اور چیز نے نہیں لیا۔ یہاں یہ واقعہ بھی ذہن نشین رہے کہ جہاں تک شخصی عقائد اور ذاتی مذہب کا تعلق ہے اعلیٰ حضرت خسرو دکن وبرار کی زندگی ایک سچے مسلم کی زندگی ہے مگر اِس کے ساتھ ہی ساتھ ایک فرمانِ مبارک میں جس کی گونج اب تک ہندوستان کے طول وعرض میں موجود ہے، ارشاد فرمایا گیا ہے کہ "بہ حیثیت رئیس میں ایک دوسرا مذہب بھی رکھتا ہوں جس کو صلح کل کے نام سے موسوم کیا

جاتا ہے کیونکہ میرے زیرِ سایہ مختلف مذاہب اور فرقے کے لوگ بستے ہیں اور اُن کے معابد کی نگہداشت میرے آئینِ سلطنت کا ایک زمانے سے وتیرہ رہا ہے۔" اسی فرمانِ مبارک میں آگے چل کر ارشاد ہوتا ہے۔

"میرا اور میرے بزرگوں کا شعار رہا ہے کہ دُنیا کے سب مذاہب کو ایک نظر سے دیکھا جائے۔" ظلِ سبحانی پھر یہ کس قدر سچ فرماتے ہیں کہ "اِس توضیح کے بعد بھی اگر کوئی کورچشم روشنی آفتاب کو نہ دیکھ سکے تو اُس کی بصارت کا قصور سمجھا جائے گا۔" آخر میں یہ فرمایا گیا ہے کہ۔ "اِس مشرب پر مجھے اور میرے بزرگوں کو ناز رہا ہے اور رہے گا۔"

اِس ایک جملے میں مملکت دکن کی قومی تاریخ موجود ہے یہ ایسا فرمانِ مبارک ہے جو تاجدار دکن کی عظمت کا خراج اپنے اور بیگانے ہر شخص سے وصول کر رہا ہے۔ کسی قوم کے مختلف اجزاء کو شیرازہ بند کرنے کے لیے یہ ایک عظیم الشان تصور ہے جو صرف سلاطین آصفیہ کا طرۂ امتیاز رہا ہے اور بالخصوص حضرت آصف جاہ سابع کا دورِ حکومت مذہبی رواداری کی ایسی مہتم بالشان مثال ہے کہ سلف میں اِس کی نظیر نہیں ملتی۔ ایسے عادل وانصاف پسند فرمانروا کا سایہ ہمیشہ قائم ودائم رہے اور اشرار کی فتنہ پردازیوں سے اُس کی رعایا اور سلطنت محفوظ ومامون رہے!

(راشٹے جانکی پرشاد کی تقریر جو لاسلکی نشرگاہ حیدرآباد (موجودہ آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد) سے نشر کی گئی تھی)

مولوی ابوالاعلیٰ صاحب مودودی

دولتِ آصفیہ کی گذشتہ عظمت و شوکت

ماضی کی یاد سے ایک سبق

ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کچھ عرصہ سے بڑی تحقیق و کاوش کے ساتھ دکن کی ایک مبسوط تاریخ لکھنے میں مصروف ہیں جو چار ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے باوجود عدیم الفرصتی کے موصوف نے سالگرہ نمبر کے لئے مختصر سا مضمون عنایت فرمایا ہے جو درج ذیل ہے

دولتِ آصفیہ کی موجودہ عظمت و شوکت کو دیکھ کر وہ لوگ جنہوں نے اس کی تاریخ کا مطالعہ نہیں کیا ہے ایسے مرعوب ہو جاتے ہیں کہ وہ اس کی گذشتہ عظمت و شوکت کا صحیح تصور نہیں کر سکتے کیونکہ جو دولت اپنے رقبہ کی وسعت، اپنی آبادی کی کثرت، اپنی آمدنی کی فراوانی، اپنی تہذیب و تمدن کی رفعت، اپنے علوم و فنون کی ترقی، اپنی سیاست و حکومت کی برتری اور سب سے زیادہ اپنے فرمانروا کی بزرگی و جلالت کے لحاظ سے آج ہندوستان کی تمام ریاستوں کی سرتاج ہے اس کے حال کی چمک دمک سے آنکھیں اس قدر خیرہ ہو جاتی ہیں کہ نگاہوں کو اس کے ماضی کی طرف بڑھنے کی جرأت ہی نہیں ہوتی۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ ہماری آنکھیں اس دولت ابد مدت کی جو کچھ شان و شوکت دیکھ رہی ہیں تاریخ کی آنکھ اس سے بہت کچھ بڑھ چڑھ کر دیکھ چکی ہے اور اس کی نظروں سے وہ وہ سماں گزرے

ہیں جن کی کیفیت کوئی سنے تو حال پر قناعت کرنا بھول جائے اور اس کا دل ان نظاروں کی شنید کے بجائے دید کے لئے لوٹنے لگے۔ آج جبکہ اس مملکت کے تاجدار کی سالگرہ کا مبارک دن ہے، میں اپنے اہل وطن کو خاص طور پر اس دور کی ایک مختصر داستان سنانی چاہتا ہوں جب دریائے تپتی سے راس کماری تک تمام دکن پر آصفجاہ کا حکم جاری تھا۔ وہ دور جس سے زیادہ ریاستیں ان کے زیر نگیں تھیں اور تمام ہندوستان کی سیاست میں دولت آصفجاہی کو مرکز ثقل کی حیثیت حاصل تھی اس وقت یہ سلطنت قدیم زمانہ کی سلطنت بہمنیہ اور سلطنت بیجانگر کے مجموعہ کے برابر تھی۔ میسور، تنجاور، ترچناپلی، کرناٹک، کرنول، ساوانور، چتلدرگ اور بدنور کے بڑے بڑے راجہ اور رئیس اس کے باجگذار تھے اور تنجاور سے کر کٹک تک تمام ساحل کارومنڈل اس کے قبضہ میں تھا اس زمانہ کے تخمینہ کے مطابق چار پانچ کروڑ نفوس اس کے زیر حکم تھے مگر آج اس رقبہ کی آبادی دس بارہ کروڑ سے کم نہیں ہے، بالفاظ دیگر اس کے زمانہ میں یہ سلطنت اتنی ہی عظیم الشان تھی جتنی کہ آج کل ریاستہائے متحدہ امریکہ ہے۔

یہ سلطنت جسے نظام الملک آصفجاہ نواب میر قمرالدین خاں بہادر نے قائم کیا تھا عالمگیر بادشاہ کی سلطنت کے چھ صوبوں سے مرکب تھی اور یہ چھ صوبے ان علاقوں پر مشتمل تھے جن کو اکبر کے عہد سے لیکر عالمگیر کے زمانہ تک سلطنت مغلیہ نے مسلسل ایک صدی کی جد وجہد کے بعد دکن کی چھ ریاستوں سے فتح کیا تھا جب تک عالمگیر زندہ رہا یہ سب صوبے الگ الگ رہے اور بادشاہ کی جانب سے ان پر جدا جدا صوبہ دار مقرر ہوتے رہے۔ پورے دکن کا ایک صوبہ دار مقرر کرنا بادشاہ کے مصالح کے خلاف تھا مگر اس کے بعد جب شاہ عالم بہادر شاہ تخت نشین ہوا تو اس نے سابق دستور کو چھوڑ کر پورے جزیرہ نمائے دکن پر ایک صوبہ دار مقرر کر دیا اور اسے ماتحت صوبہ داروں پر کامل اختیارات عطا کئے۔ یہ نیا صوبہ جو پوری سلطنت کے تیسرے حصہ کے برابر تھا، خود ایک سلطنت بن جانے کا طبعی میلان رکھتا تھا دنیا کے اسباب نے اسے اعظم کام بخش، ذوالفقار خاں اور حسین علیخاں کے سامنے ایک کر کے پیش کیا، لیکن مشیت الٰہی نے یہ قبا ایک دوسرے قامت کے لئے رکھی تھی۔

چنانچہ وہ انہی پر راس آئی اور اسے بادل ناخواستہ پہننی پڑی۔ آصف جاہ نے اپنے حسن تدبیر سے پوری سلطنت کو سنبھالنا چاہا اور جب دیکھا کہ دنیا کی کوئی قوت اسے تباہی سے نہیں بچا سکتی تو وہ اس پر قناعت کرنے کے لئے مجبور ہو گئے کہ کم از کم اس کے تیسرے حصہ ہی کو بچالیں۔ اس معاملہ میں ان کی حیثیت بالکل صلاح الدین ایوبی کی سی تھی جو مصر جانے سے جی چرا رہا تھا مگر آسمانی طاقتیں اسے کھینچکر مصر لے گئیں اور فراعنہ کی سرزمین کا مالک بناکر چھوڑا۔

آصف جاہ کی یہ نئی سلطنت جن اصولوں پر مشتمل تھی وہ باستثنائے برار و خاندیس اب بھی موجود ہیں۔ مگر ان کی وہ وسعت باقی نہیں رہی ہے جو اس زمانہ میں تھی۔ مثال کے طور پر صوبہ اورنگ آباد اس زمانہ میں (۱۲) سرکاروں (اضلاع) سے مرکب تھا جن میں (۱۴۷) محالات (تعلقے) تھے اور اس کی آمدنی ایک کروڑ ستائیس لاکھ روپیہ تھی اس کا بیشتر حصہ اب صوبہ بمبئی میں شامل ہے اسی طرح اس زمانہ کا صوبہ حیدر آباد آج کل کے میدک اور ورنگل کے صوبوں سے کئی گنا زیادہ بڑا تھا اس کے حدود تنجاور اور ترچناپلی سے لیکر گنجام تک پھیلے ہوئے تھے اور اس میں (۲۲) سرکاریں تھیں جن کے محالات کی تعداد (۱۱۴) تھی اور آمدنی چھ کروڑ ۶۰ لاکھ روپیہ تھی۔ اب اس کا بیشتر حصہ مدراس پریزیڈنسی میں شامل ہے صوبہ بیجاپور جس کا قائم مقام اب گلبرگہ ہے صوبہ حیدر آباد سے بھی بڑا تھا۔ اس کے حدود مدورا سے لیکر دھارور تک وسیع تھے جنوبی ہند کی بڑی بڑی باجگذار ریاستیں اس کے ماتحت تھیں اور اس کی آمدنی ۷ کروڑ ۸۰ لاکھ روپیہ تھی اب اس کا بڑا حصہ مدراس اور بمبئی کے صوبوں اور میسور کی ریاست میں شامل ہے یہ تینوں عظیم الشان صوبے بیدر، خاندیس اور برار کے صوبوں کے ساتھ مل کر ایک ایسی وسیع سلطنت بناتے تھے جس کی آمدنی اس زمانہ میں ۱۸ کروڑ روپیہ تھی جو تقریباً ۳۰ باجگذار ریاستوں پر بالادستی کے حقوق رکھتی تھی۔ اور جس کے وسائل و ذرائع غیر محدود تھے۔

یہاں اتنی گنجائش نہیں کہ اس عہد کے فرمانروائے دولت آصفیہ کی شان و شوکت و صولت کا حال تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے کیونکہ اس کیلئے مجھے تاریخ کے بہت سے صفحے اس جگہ منتقل کرنے پڑیں گے تاہم میں ناظرین کے تصور کو مدد دینے کے لئے چند واقعات بیان کرنا کافی سمجھتا ہوں۔

یوں تو نواب نظام الملک آصف جاہ کی تمام زندگی فوج کشی میں گزری مگر ان کی آخری فوج کشی جو ۱۷۴۳ء میں کرناٹک کے مضطرب حالات کو درست کرنے کے لئے ارکاٹ کی جانب ہوئی سب سے زیادہ شاندار تھی۔ انگریز مورخ اورم کا بیان ہے کہ اس موقع پر ان کے علاوہ ۸۰ ہزار سوار اور ۲ لاکھ پیدل فوج تھی جس کی شوکت سے تمام جنوبی ہند میں غلغلہ برپا ہو گیا گرد و نواح کے رئیس مہاراجہ اور جاگیردار فرمانروا، سلام کو حاضر ہوئے اور جو خود نہ آسکے انہوں نے نذریں پیش کرنے کے لئے وفود بھیجے۔ ان ہی وفود میں سے ایک وفد مدراس کی انگریزی پریسیڈنسی کا بھی تھا جسے دو ہفتے کی کوششوں کے بعد بارگاہ آصفی میں باریابی کا شرف حاصل ہوسکا۔ مدراس پریسیڈنسی اس زمانہ میں صرف شہر مدراس اور اس کے نواح کی مالک تھی اور اس کی حیثیت یہ تھی کہ آصف جاہ کے نوابدار ارکاٹ انور الدین خاں نے (جسے اس زمانہ کے انگریز انادیردی کا لو کہتے تھے) ایک مرتبہ فرانسیسیوں کے خلاف گورنر مدراس کی عرضداشت کو صرف اس بناء پر رد کر دیا تھا کہ انگریزی وفد نے سرکاری مراسم کے خلاف عرضداشت کے ساتھ نذر پیش نہ کی تھی۔

بیلی بغاوت رنگ لائی (کی) اصت آنتا کیا

مغفرت مآب کی رحلت کے بعد نواب نظام الدولہ ناصر جنگ کے نام احمد شاہ بادشاہ کی جانب سے صوبہ داری دکن کا فرمان برہانپور پہونچا۔ نواب نے اس فرمان کا استقبال حسن شان و تجمل سے کیا اس کی تفصیلات مورخین نے طویل کلام کے ساتھ بیان کی ہیں مختصر یہ کہ اس جلوس میں نواب کے ساتھ ۳۰ ہزار سوار، تین سو ہاتھی، ۲۰۰ سو مراتب توپ اور سینکڑوں نشان بردار اور موسیقی نواز اونٹوں اور گھوڑوں پر سوار تھے جن کا سلسلہ کئی میل تک چلا گیا تھا اس کے بعد ہی ناصر جنگ کو اپنے بھانجے مظفر جنگ کی بغاوت فرو کرنے کے لئے کرناٹک کی طرف جانا پڑا، اس مہم میں ان کے ہمرکاب جو فوج تھی اس کی تعداد مورخین نے کم از کم تین لاکھ بیان کی ہے جس کے ساتھ ۸ سو توپیں اور ۱۳ ہزار ہاتھی تھے صوبہ دار دکن کی طلب پر جو جاگیردار راجہ اور نواب فوجی خدمت بجا لانے کے لئے حاضر ہوئے تھے ان میں راجہ میسور اور کڑپہ، کرنول اور ساوانور کے نواب بھی تھے

فرانسیسی اس لشکر کی ہیبت سے میدان چھوڑ کر پانڈیچری کی طرف بھاگ گئے اور مظفر جنگ کے ساتھی انہیں ناصر جنگ کے رحم پر چھوڑ کر منہ موڑ گئے۔ بعض ہمارے بچوں کو پڑھایا جاتا ہے کہ اس جنگ میں ناصر جنگ کی حمایت پر انگریز بھی تھے، مگر یہ خود انگریز مؤرخین ہی کا بیان ہے کہ اس عظیم الشان "امدادی" فوج کی تعداد چھ سو تھی۔ ورنہ ہمارے قومی مؤرخین نے تو اس امداد کو اس قابل نہیں سمجھا کہ اس کا ذکر بھی کرتے۔ بعد میں فرانسیسیوں کو ناصر جنگ کے مقابلہ میں جو کامیابی حاصل ہوئی اور جس کا انجام ناصر جنگ کی شہادت پر ہوا وہ خود ہمارے اہل وطن کی غداری و بے وفائی کا نتیجہ تھی جو اس کے بعد سے ہر موقع پر افرنگیوں کا سب سے زیادہ مددگار ثابت ہوتی رہی۔

ناصر جنگ اور مظفر جنگ کی خانہ جنگی اور صلابت جنگ کی کمزوری کے باعث سلطنت کی قوت میں بہت کچھ انحطاط رونما ہو چکا تھا اور حدود اقتدار بھی گھٹ گئے تھے مگر اس کے باوجود آصف جاہ ثانی نواب میر نظام علی خان بہادر کے ابتدائی عہد تک فرمانروائے دکن کی طاقت کا یہ حال تھا کہ دو مرتبہ انہوں نے مرہٹہ طاقت کے قلب پونا پر کامیاب چڑھائی کی، ایک مرتبہ پونا کو خراب و برباد کیا اور شمالی سرکاروں میں انگریزوں کی مداخلت بیجا پر بگڑ کر جب انہوں نے کرناٹک کی جانب پیش قدمی کا عزم کیا تو مدراس پریذیڈنسی محض اس عزم سے اس قدر مرعوب ہوئی کہ اسے جنرل کیلوڈ کو صلح کی درخواست لیکر سلطان کے پاس بھیجنا پڑا۔ یہ فرمانروائے دکن کی قوت کے آخری مظاہرات تھے جن کا اظہار انتہائی انحطاط کے زمانہ میں بھی برسوں تک نظام اور برٹش گورنمنٹ کے سیاسی معاملات میں ظاہر ہوتا رہا۔ میر عالم کے زمانے تک برٹش انڈیا کے گورنر جنرل سے حیدرآباد کے مدار المہام کی مراسلت دوستانہ و مساویانہ طریقہ پر ہوتی تھی۔ نواب سکندر جاہ بہادر کے ابتدائی عہد تک گورنر جنرل اپنے آپ کو سرکاری تحریرات میں نیاز مند لکھتا تھا اور نظام اپنے لئے نابدولت کے الفاظ استعمال کرتے تھے۔ اس کے بہت عرصہ بعد تک ریزیڈنٹ کو دربار میں حاضری کے وقت ڈیوڑھی کے باہر سواری سے اترنا پڑتا تھا اور پھر دربار آداب کے ساتھ مجرا بجا لانا ہوتا تھا۔ نواب ناصر الدولہ بہادر کے زمانہ میں جنرل فریزر مراسم و تکلفات کی پابندی سے بہت کچھ ناک بھوں چڑھاتا نظر آتا ہے۔

یہ مبارک موقع مجھے اس سوال میں بحث کرنے کی اجازت نہیں دیتا کہ یہ حالت کن وجوہ سے ظہور پذیر ہوئی، بدلی اور نوبت کہاں تک پہونچی؟ تاہم اتنا ضرور کہوں گا کہ

با من ہر چہ کرد آں آشنا کرد۔

اسباب انقلاب باہر سے نہیں آئے، خود گھر میں پیدا ہوئے۔ ایک سلطنت کی سب سے بڑی بد قسمتی یہ ہے کہ اس کا نمک، نمک حراموں کی پرورش میں صرف ہو، اس کے کاروبار ایسے لوگ چلائیں جو ملک و مالک کے ملازم مگر خود اپنے نفس کے غلام ہوں اور اس کے جو بہی خواہ ہوں وہ خاک نشیں مگر بہتر زینت تاج و کلاہ ہوں۔ افسوس ہے کہ مسلسل ایک صدی تک اس سلطنت کا بھی یہی حال رہا۔ اس کی باگیں ایسے کار فرماؤں اور کارکنوں کے ہاتھوں میں رہیں جو سلطنت کی وفاداری و خیر خواہی سے عاری، حسن تدبیر، صحت فکر اور بصیرت سیاسی سے محروم اور اپنے شخصی اغراض پر ملک و مالک کے مفاد کو قربان کر دینے کے خوگر تھے۔ تاریخ میں ان کے کارناموں کو دیکھ کر ایک صاحب نظر بجز اس کے اور کچھ نہیں کہہ سکتا کہ اگر وہ دانا دشمن نہ تھے تو نادان دوست ضرور تھے۔ ان ہی کی بدولت وہ عظیم الشان سلطنت جو مدراس سے لیکر ایلیچپور تک اور گجرات سے لیکر احمد نگر تک پھیلی ہوئی تھی۔ گھٹتے گھٹتے موجودہ رقبہ تک پہونچ گئی۔ یہ نتیجہ ہے صرف دو چیزوں کا، ایک حب وطن کا فقدان، دوسرے فکر صحیح کی قلت۔ پس اگر حیدرآباد کے باشندوں میں پھر وہی سابقہ عظمت و شوکت دیکھنے کی تمنا ہے تو انہیں اپنے اندر ان دونوں چیزوں کو بدرجہ اتم پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ ان کے دل میں ملک کی سچی محبت اور اس کے لئے ایثار و قربانی کا حقیقی جذبہ مشتعل ہو۔ ان کی سعی و عمل کا مدار یہ مرکزی تخیل ہو کہ وہ اپنے ملک کو ترقی اور عظمت کے سب سے اعلیٰ مرتبہ پر دیکھنا چاہتے ہیں اور ان کے ہر ہر فرد کی تمام ذہنی کاوشیں اس تلاش و تجسس میں صرف ہوں کہ ان کے ملک کا مفاد کس چیز میں ہے؟ اور وہ خود کس طریقہ سے ملک کی بہتر سے بہتر خدمت انجام دے سکتا ہے؟ یہ بات پیدا ہو جائے پھر دنیا کی کوئی قوت حیدرآباد کو اس مرتبہ تک پہونچنے سے نہیں روک سکتی جس کا وہ مستحق ہے۔

(ملاحظہ ہو معارف دکن سالگرہ نمبر ۱۳۵۰ھ)

مولوی ابو المعارف میر لطف علی صاحب ابو العلائی

دکن میں ہندو مسلم برادرانہ تعلقات کا سچا فوٹو

(میں نے یہ سارا مضمون مورخ کی حیثیت سے لکھا ہے جو ایک مختصر سی تاریخی اتحاد پر مبنی ہے۔ اُمید کہ ہندو مسلم برادران اپنے بزرگوں کی قدیم روایتوں کو پیش نظر رکھ کر دوسرے خیالات کو اپنے نزدیک آنے نہ دیں گے)

ریاست حیدرآباد ابد پائیدار کو ساری دنیا میں بلحاظ رواداری و رعایا پروری جو امتیاز حاصل ہے نیز امن وچین اور مذہبی آزادیاں یہاں کی رعایا کو جو نصیب ہیں اس کی نظیر سارے عالم میں کہیں بھی نہیں مل سکتی۔ خاص کر ہمارے ظل اللہ سلطان العلوم شہریار دکن دربار خلد اللہ ملکہٗ و سلطنتہٗ کے مبارک دور عثمانی میں ملک دکن جن برکات و فیوض کا مرجع و منبع بنا ہوا ہے چار دانگ عالم میں اظہر من الشمس ہے یہاں امیر و غریب ہندو مسلم وغیرہ سب کے سب خوشحال اور مصائب زمانہ سے مصئون و مامون ہیں جس طرح ہمارے شہنشاہ دکن خلد اللہ ملکہٗ اپنی عزیز رعایا کے مال و جان کے محافظ حقیقی ہیں اسی طرح رعایائے دکن بھی خواہ وہ ہندو ہو کہ مسلمان ایک جان سے نہیں بلکہ ہزار جان سے اپنے آقائے ولی نعمت کی وفاداری اور حق نمک ادا کرنے ہمہ تن تیار ہے۔

حیدرآباد فرخندہ بنیاد کے ہندو مسلمان کی وہی مثال صادق آتی ہے کہ یہ ہر دو گویا ایک روح دو قالب ہیں اور یہ ہر دو قومیں پرچم آصفی کے سایہ میں ہمیشہ متحد و متفق رہی ہیں آج تک فرقہ وارانہ سوال تو کجا بلکہ افتراق کا شبہ تک کبھی ظاہر نہیں ہوا۔ جس طرح "مسلمان" اولی الامر منکم کے تحت اپنے ہر دلعزیز شہنشاہ کی اطاعت کو لازم سمجھتے ہیں اسی طرح ہندو بھی اپنے آقائے نامدار کی اطاعت بعقیدۂ تام

باعث افتخار سمجھتے ہیں اور آج تک بھی ہندو مسلم ہر دو آپس میں بھائی بھائی کی طرح رہے ہیں چونکہ ان دونوں کے پیش نظر ہمیشہ اپنی اپنی بقا کا خیال رہتا ہے لہذا باہمی اتحاد و اتفاق کو بلا شبہ لازم و ملزوم تصور کئے ہوئے ہیں۔ باہمی ارتباط کی یہ کیفیت کہ ان کے تقاریب میں وہ آتے ہیں اور ان کی تقاریب میں یہ شریک رہتے ہیں یہ دونوں جن جن محلوں میں مقیم ہیں برابر روزانہ صبح و شام سلام و نیاز، مزاج پرسی، لین دین کا طریقہ ان کی پشتہا پشت سے چلا آرہا ہے۔ دونوں کی طرز معاشرت ایک ہے اور یہ دونوں اس معاشرت میں ایک دوسرے کا تعلق بنے ہوئے ہیں۔ جہاں یہ دو قومیں اپنی زندگی اتحاد و اتفاق سے بسر کرتی ہوں وہاں ان سے فتنہ و فساد کی امید ہو نہیں سکتی۔ جب تک ان چھوٹے چھوٹے ملکیوں کے سچے قلوب کو بیرونی عناصر متاثر نہ کردیں۔ کیا دنیا کے ہر پردہ پر ایسی سچی مثالیں مل سکتی ہیں؟

شاہانہ رعایا پروری بلا امتیاز مذہب و ملت

مصنف صاحب نے اپنی کتاب شاہانہ ہر دلعزیزی (جو ۱۳۳۶ف میں طبع ہوئی ہے) کے پہلے حصہ میں لکھا ہے کہ:-

میں پہلے اپنے ملک کے مسلم غیر مسلم کا باہمی اتحاد و اتفاق اور آپس کی اخوت و مساوات کے کچھ واقعات عرض کرنے کی معافی چاہتا ہوں۔ ہمارے ملک میں مسلم غیر مسلم تمام اقوام آپس کے اتحاد و ارتباط کی بدولت سب بھائی بھائی ایک باپ کے دو بچے معلوم ہوتے ہیں۔ ہندوؤں کے رسوم اور تہواروں میں مسلمان اور مسلمانوں کی عیدیں، شادی بیاہ، خوشی، غمی میں ہندو بلا لحاظ قوم و ملت یکساں شریک رہتے ہیں۔ اگر ریاست آصفی ایک خوبصورت چہرہ ہے تو ہندو مسلم اس حسین چہرہ کی دو آنکھیں معلوم ہوتی ہیں اور دیگر اقوام اس خوبصورت جسم کے گویا بمنزلہ دیگر اعضاء و جوارح کے ہیں جس طرح جسم انسانی کے کسی عضو کو صدمہ پہنچے تو دوسرے اعضاء تکلیف میں مبتلا ہو جاتے ہیں، وہی حال مملکت آصفی کی رعیت کا ہے کسی ایک گروہ کو بھی صدمہ و رنج پہنچے تو تمام گروہ کو تکلیف و درد کا احساس ہونے لگتا

ہے۔ حضرت غفران مکان جنت آرامگاہ آشیاں اور نیز عالی اعلیٰحضرت ظل سبحانی بھی ہندو مسلم اقوام کو ریاست کی دو آنکھیں تصور فرماتے ہیں۔ عالی جناب راجہ راجایان مہاراجہ سرکشن پرشاد یمین السلطنت بہادر صدر اعظم باب حکومت نے ہندو مسلم اتحاد پر جو مضمون تحریر فرمایا تھا اس کا ایک حصہ بجنسہ پیش ہے۔

"مجھے خوب یاد ہے کہ حضرت غفران مکان علیہ الرحمتہ محبوب دکن نے اس فقیر کو خلعت وزارت سے سرفراز فرمایا تو اپنی مدبرانہ روشن خیالی اور شاہانہ ہمدردی عزیزی کے ساتھ اور بہت سی نصیحتوں کے یہ نصیحت بھی فرمائی کہ ہندو مسلم میری دو آنکھیں ہیں اگر ان میں سے کسی فرقہ کو نقصان پہنچا تو گویا میری آنکھ کو نقصان پہنچا۔ ملک کی ترقی و تہذیب کے لئے ان دونوں فرقوں کے اتحاد و اتفاق کو اپنی حکمرانی اور سلطنت کی قوت سمجھتا ہوں یہی پالیسی ہمارے ولی نعمت حضرت ظل سبحانی آصف جاہ سابع خلد اللہ کی ہے۔"

علاوہ ازیں دکن کے ہندو مسلم اتحاد کے باہمی برادرانہ تعلقات کی ہزاروں مثالیں موجود ہیں لیکن اس وقت چند مثالیں ہدیۂ ناظرین کی جاتی ہیں۔

۱) عرس حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز قطب دکنؒ کی گنبد (واقع گلبرگہ شریف) پر پھولوں کا چھپر عرس کے پہلے دن پہلے ایک ہندو مہاراج نہایت حسن عقیدت سے لاتے اور چڑھاتے ہیں یہ طریقہ آج کل کا نہیں بلکہ ان کی پشتہا پشت سے چلا آرہا ہے۔

۲) شاہان بہمنیہ میں سلطان احمد شاہ بہمنی کا عرس گو سرکاری طور پر ہوتا ہے مگر صندل وغیرہ ایک ہندو مہاراج اپنے گھر سے بڑے ہی تزک و شان سے لاتے اور صندل مالی کرتے ہیں۔ بلا امتیاز قوم و ملت کھانا کھلاتے ہیں۔ اس صلہ میں سُنا ہے کہ انھیں جاگیرات وغیرہ بھی عطا ہوئی ہیں۔ یہ یادگار قیامت تک باقی رہے گی اور اس کی نظیر دنیا میں کہیں نہیں ملے گی مسلمان بادشاہان بیدر (شاہان بہمنی) نے اپنے نام کے ساتھ اپنے ہندو محسن کا نام بھی جزو نام بنایا تھا موجودہ زمانہ میں اتحاد و اتفاق کی سچی تصویریں پیش ہیں۔ ملاحظہ ہوں :-

عالی جناب راجہ راجایان مہاراجا سر کشن پرشاد یمین السلطنت کی مبارک

ثانی چندولعل ہستی کو پہلے پیش کیا جاتا ہے آپ مہاراجہ چندو لال دیوان دکن بہادر کے نواسے ہیں۔ آپ کی موروثی خدمت پیشکاری ہے آپ مدار المہام وقت زمان بعد صدر اعظم وقت تھے۔ آپ خود مجسمہ اتحاد و اتفاق ہندو مسلم ہیں۔ خدا رکھے ان کی بڑی فیاض بارگاہ ہے بلا امتیاز قوم و ملت سب پر یکساں نظر رہتی ہے آپ کی فیاضی کی انتہائی تعریف یہ ہے کہ کوئی سائل اس در فیض سے محروم نہیں لوٹا۔ ہر ایک نے اپنی نیت کے موافق اس در فیض سے حاصل کیا ہے۔

اسی فیاضی کی بدولت دنیا میں ثانی چندو لال کے لقب سے مشہور ہیں۔ آپ کے حسن عقیدت کا یہ عالم ہے کہ ہر قوم خواہ وہ مسلمان ہو کہ ہندو اس سے بحیثیت خلوص پیش آتے ہیں اور اس کے حسب حوصلہ اس کے نام تنخواہیں جاری فرماتے ہیں۔ آپ کی جاگیرات میں مساجد کے متولی اور دیگر خدمات شرعیہ کو تنخواہیں مقرر ہیں۔

پھول باغ دکن میں ایک قبرستان کا نام ہے جس کو سر مہاراجہ بہادر نے بزرگان واصل اللہ کے دفن کے لئے وقف کر دیا ہے وہاں پیر داؤد علی شاہ چنانچہ سب سے پہلے دفن ہوئے ہیں بڑے اعلیٰ پیمانہ پر مزار کا چبوترہ اور مسجد بنائی گئی ہے امام موذن منجانب اسٹیٹ مقرر ہے اور ہر سال بڑی شان سے حضرت مرحوم کا عرس ہوا کرتا ہے۔

پیشکار کی ٹٹی آپ ہر سال عشرہ شریف میں ایک بہت بڑی خوشنما ٹٹی استادہ فرمایا کرتے ہیں اور کامل بارہ دن تک فاتحہ اور ہزارہا روپے خیرات فرماتے ہیں۔

نعل صاحب کی ڈھٹی نعل صاحب (ایک علم کا نام ہے) جب یہاں لائے جاتے ہیں تو آپ ڈھٹی باندھتے اور نذریں پیش فرماتے ہیں۔

ہندو صاحبزادوں کے ہندو مسلم نام آپ نے آج سے چالیس سال قبل اپنے سب سے بڑے فرزند ایک کا نام راجہ جینند پرشاد

بہادر دوسرے صاحبزادہ کا نام راجہ محبوب پرشاد بہادر رکھا تھا اور عالیہ صاحبزادے خمار کے جو جانشین مہاراجہ بہادر ہیں ان کا اصلی نام راجہ ارجن مخوم بہادر ہے لیکن عرف راجہ خواجہ پرشاد بہادر ہے ملاحظہ ہوں تصانیف سر مہاراجہ بہادر دام اقبالہٗ

مال والوں کی پتلیاں اور سہرپالی کا تعزیہ

یہاں دکن کے دوسرے راجگان کے حسن عقیدت و اتحاد و اتفاق کا خاکہ بھی پیش ہے۔

۱) راجہ شیوراج آنجہانی جو دکن کے مشہور و معروف امراء سے تھے آپ کی بھی بڑی باخیر ہستی تھی۔ آپ خود بھی اپنے بزرگوں کے قدم بہ قدم تھے۔ آپ نے بھی بلا امتیاز قوم وملت لاکھوں روپیوں کی خیرات کی تھی آپ کے پاس بھی ہر سال عشرہ شریف میں پتلیاں بٹھائی جاتی ہیں اور ایک تعزیہ (الموسوم یہ سہرپالی کا تعزیہ) آج تک بھی ہر سال بٹھایا جاتا ہے، بڑی خیر خیرات ہوا کرتی ہے۔ حضرت بی بی صاحبہ کے علم کو ڈھٹی باندی جاتی ہے معہ نذرانہ پیش کیا جاتا ہے۔

رائے رایاں کا پنجہ

راجہ رائے رایاں بہادر آنجہانی دکن میں بڑے امیر گزرے ہیں ان کے حسن عقیدت کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ ہر سال عشرہ شریف میں علم ایستادہ فرمایا کرتے تھے اس پر آج تک برابر آپ کے جانشین عمل پیرا ہیں۔ یہ علم موسوم "بہ رائے رایاں کا پنجہ" ہے

مسلمانوں کا ہندوؤں سے اتحاد عمل

امرائے پائیگاہ اور دیگر جاگیرداران وغیرہ کے علاقے میں دیولوں اور جاتراؤں کے نام معمول بڑے بڑے مہنتوں اور پوجاریوں کی تنخواہیں آج تک برابر جاری ہیں۔

ملکی ہندو مسلم اتحاد کامل کا ایک اور ثبوت

یہ کہ ہندوؤں کے مسان سے مسلمانوں کا قبرستان ملا ہوا ہے مساجد سے دیولیں اور دیولوں سے مساجد ملی ہوئی ہیں غرض کہ ملکی ہندو مسلم اتحاد کی لاکھوں مثالیں موجود ہیں اب دعا ہے کہ الٰہی آقائے عمر و دولت و اقبال ظل اللہ سلطان شہریار دکن و برار خلد اللہ ملکہٗ و سلطنتہٗ اور شاہزادگان بلند اقبال و شہزادیاں خجستہ خصال کو دائما تابان درخشندہ اور سلطنت دکن کے امراء و رعایا میں ہندو مسلم رعایا کو ظل سبحانی کے سایۂ عاطفت میں ہمیشہ اتحاد و اتفاق کے ساتھ شاد و خرم رکھ۔ آمین ثم آمین۔ (مطبوعہ ـ رہبر دکن سالگرہ نمبر رجب ۱۳۵۵ھ)

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
ایم ۔ اے پی ایچ ڈی (لندن)

حیدرآباد کی آبادیاں

حیدرآباد ایک عجیب و غریب شہر ہے ۔ اس کا چپہ چپہ اپنے اندر سیکڑوں دلکشیاں رکھتا ہے اس کی تاریخ اس کا تمدن ، اس کی معاشرت اور اس کی روایات غرض ہر چیز ذوق رکھنے اور مطالعہ کرنے والے کے لئے گوناگوں دلچسپیوں کا باعث ثابت ہوتی ہے ۔ بہت کم شہر ہوں گے جہاں طرز معاشرت میں گلی کوچوں میں ، سمتوں اور محلوں میں اور خود باشندوں میں ایسا شدید " جزر و مد " اور ایسی بلند و پست " بوقلمونی " پائی جاتی ہو ! کوئی نسل ایسی نہیں جس کے نمائندے یہاں نہ رہتے ہوں ۔ شاید ہی کوئی زبان ہو جو یہاں بولی نہ جاتی ہو ۔ یہاں کے محل اور جھونپڑیاں ، بنگلے اور باغات اور سڑکیں اور گلیاں اپنی اپنی طرز تعمیر اور اپنی اپنی تاریخی خصوصیتوں کے لحاظ سے اس شہر کو ایک " عجائب گاہ " بنا رہے ہیں ۔

جتنی اس " فرخندہ بنیاد " میں ماضی کی عظمتیں ، حال و مستقبل کی تابناکیوں اور جدت طرازیوں کے ہم پہلو ہیں شاید ہی صفحۂ ہستی کی کسی اور آبادی میں پائی جاتی ہوں !

بڑی بڑی باتوں اور اہم بانشان خصوصیتوں کا تو ذکر ہی کیا ، ہم یہاں بستی کے صرف محلوں کی آبادی ، ان کی تاریخ اور ان کے " ناموں کی سرگذشت " کی طرف یہاں کے بسنے والوں کو متوجہ کرنا چاہتے ہیں ۔ ترقی یافتہ اور آزاد ممالک میں دوسرے علوم و فنون کے ساتھ ساتھ آبادیوں

اور مقامات کے ناموں کی تاریخ کا انضباط شہر دیدہ بھی اپنے ارتقا کی مدارج کو پہنچ چکا ہے اور ضرورت ہے کہ ہم بھی ان امور میں دلچسپی لیں۔ ہر محلہ کی تاریخ معلوم کرنے اور اس کے علاوہ اس کی وجہ تسمیہ کے متعلق تحقیق و تفتیش کرنے کے سلسلے میں حاضرین نوجوان انشاپردازوں کو نہ صرف دلچسپ سے دلچسپ موضوع ہاتھ آجائیں گے بلکہ اپنے شہر اور اپنے ملک کی خدمت اور اپنی علمیت میں اضافہ کرنے کا موقع ملے گا۔

(۲)

حیدرآباد کی سمت جنوب کی طرح یہاں کے محلے بھی عجیب و غریب متضاد شکلیں پیش کرتے ہیں کسی محلہ کی عمر تین سو سال کی ہے تو کوئی صرف "تین سال کا بچہ" ہے۔ کوئی وسیع شاہراہوں اور فلک بوس عمارتوں پر مشتمل ہے تو کسی میں صرف تنگ و تاریک گلیاں اور سرنگوں مکان اور جھونپڑیاں پائی جاتی ہیں۔ کسی کے نام میں اس قدر عربی و فارسی عنصر غالب ہے کہ خدا یا تو عراق عجم کا محلہ معلوم ہوتا ہے یا ایران و افغانستان کا کوئی قریہ۔ اور کوئی نام اتنا ٹھیٹ دراوڑی ہے کہ انتہائی جنوب ہند کے کسی گاؤں کا یقین ہونے لگتا ہے اور سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک ایسے شہر میں جس کا سنگ بنیاد مسلم حکمرانوں کے ہاتھ سے رکھا گیا اور جو مسلسل کئی صدیوں سے انہی کا دارالحکومت رہتا آیا ہے اس قسم کے نام کیسے زندہ جاوید ہو گئے؟

حیدرآباد میں کتنے محلے ہیں، اور کن کن ناموں سے مشہور ہیں؟ ان کا علم یا تو دفاتر آرائش و صفائی کو حاصل ہو گا۔ یا اس شہر کے ان "اہم افراد" کو جو اس کے جزولاینفک ہیں اور "جھٹکے والے" کہلاتے ہیں، اور جنھیں اس عظیم الشان بلدہ کی جملہ چیزوں اور خصوصیتوں کا چلتا پھرتا "محیط معلومات" یا انسائیکلوپیڈیا سمجھا جا سکتا ہے۔ کوتوالی کا جوان یا صفائی کا دروغہ اگر کسی "گلی" یا "چبوترہ" یا "باولی" کا پتہ دینے میں ناکام ہو جائے (اور وہ اکثر و بیشتر ہو جاتا ہے!) تو یقین مانیے کہ سوائے "جھٹکہ والے" کے کوئی ہستی آپ کی رہبری و رہنمائی نہیں کر سکتی۔ اس کا گذر اس عظیم آبادی کے ایسے ایسے سربستہ اور درہم پیچیدہ مقامات میں ہوتا ہے جہاں تک آپ کا (اور آپ میں ہر وہ شخص شامل ہے جو اپنے تئیں حیدرآباد کے گلی کوچوں کا سب سے بڑا ماہر سمجھتا ہو) تخیل تک نہیں پہنچ

سکتا۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اگر ہمارے نوجوان اہل قلم (جنھیں لکھنے کے لئے موضوع نہیں ملتے) یا جو آئے دن ایسے ایسے مردہ، پامال، دور دراز کے اور ازکار رفتہ موضوعوں میں اپنی قوت برباد کرتے ہیں جو ان کی انشاپردازی کی ترقی اور مقبولیت کا باعث نہیں بن سکتے) محلہ والوں کے متعلق مضامین لکھنے لگیں تو نہ صرف زندہ اور دلچسپ سے دلچسپ موضوع ملتے جائیں بلکہ اس معمورہ کی موجودہ زندگی، معاشرت، روایات اور خصوصیات کے متعلق بہت اچھا مواد فراہم کردیں گے

(۳)

محلوں کے ناموں کی تحقیق و تفتیش، ان کی تدوین، اور ان کی گروہ بندی وہ امور ہیں جن کی طرف سب سے پہلے ہمیں اس کام کے سلسلہ میں متوجہ ہونا پڑے گا۔ بہت سے نام ایسے ملیں گے جو اس محلہ کی تاریخ ماضی سے چولی دامن کی طرح وابستہ ہوں گے اور جب تک اس کا پتہ نہ چلایا جائے گا ان کی حقیقت واضح نہ ہوسکے گی۔ کئی نام ایسے ہیں جو زمانہ کے امتداد اور زبان کے فطری قوانین کے مطابق اپنی شکل و شباہت میں تغیر و تبدل حاصل کرچکے ہیں اور آج اسی مسخ شدہ حالت میں رائج ہیں۔ لطف یہ ہے کہ ان بدلی ہوئی شکلوں میں سے بعض ایسی رواں اور سڈول ہوگئی ہیں کہ عہدِ حاضر کے لکھنے والے انہی کو صحیح سمجھنے لگے ہیں اور اگر آج کوئی ان کی قدیم اور اصلی شکلیں پیش کرے تو ان کا پھر سے رائج ہونا تو کجا ان کی صحت میں بھی آج کل کے لوگوں کو شبہ ہوگا۔

حیدرآباد کے محلے اپنی اپنی آبادیوں کے آغاز، زمانہ اور تاریخ کے لحاظ سے کئی گروہوں میں تقسیم کردئیے جاسکتے ہیں۔

پہلا گروہ ان قدیم ترین محلوں کا ہے جن پر شہر حیدرآباد کی ابتدائی آبادی منحصر تھی۔ ابراہیم قلی قطب شاہ (۹۵۷۔ ۹۸۸ھ) سے ابوالحسن تاناشاہ (۱۰۸۳۔۱۰۹۸ھ) کے زمانوں کے درمیانی عہد میں جو محلے آباد ہوئے۔ ان میں اکثر اس وقت تک یا تو مٹ چکے یا انھوں نے اپنی جگہ نئے محلوں کو دے دی اور بعض اگرچہ موجود ہیں لیکن نئی شکل اور نئے ناموں کے ساتھ۔ جو محلے اب تک اپنے اصلی ناموں کے ساتھ باقی ہیں ان میں سب سے قدیم "دارالشفا" ۲۔ حسینی علم ۳۔ بادشاہی عاشور خانہ اور ۴۔ کاروان ساہوان ہیں۔ ان کے بعد کے زمانے میں جو مقام آباد ہوئے ان میں سے گوشہ محل ۲۔ سلطان

شاہی اور سہ جہار محل کے نام اب تک باقی ہیں۔

زوال گولکنڈہ بلکہ بطور خاص عہد آصفیہ میں جو محلے آباد ہوئے یا قدیم محلوں کے لئے جو نئے نام رائج ہوئے ان میں نسبتاً کم تغیر و تبدل ہوا ہے اس عہد کے بعض ابتدائی نام شاہ گنج سہ کوٹہ عالیجاہ سہ سلیمان جاہ کی جاوڑی اور رہ دودھ خانہ اللہ رکھی بیگم وغیرہ اب تک موجود ہیں۔ آج سے سو ڈیڑھ سو سال کے اندر جو محلے آباد ہوئے یا جنھوں نے پرانے محلوں کی جگہ حاصل کی ان کے اصلی نام اب تک باقی ہیں مثلاً پرانی حویلی۔ افضل گنج۔ سری عنبر کا بازار۔ محبوب شاہی۔ عثمان پورہ، حمایت نگر شاہراہ عثمانی وغیرہ۔

زمانۂ تعمیر اور ناموں کی قدامت کے لحاظ سے حیدرآباد کے محلوں کی یہ ایک موٹی سی اور نامکمل تقسیم ہے کیونکہ اس مضمون میں اصل موضوع محلوں کی گروہ بندی نہیں ہے بلکہ حیدرآباد کے محلوں کی آبادی اور ان کے ناموں کے متعلق تحقیق و تفتیش کرنے اور معلومات کو قلم بند کرنے کی تحریک کا آغاز کرنا ہے۔

(۴)

حیدرآباد کے اور حیدرآباد ہی کے نہیں بلکہ ہر شہر کے محلوں کے نام کئی گروہوں پر منقسم ہو سکتے ہیں پہلے گروہ میں ان ناموں کو شامل کیا جائے گا جو کسی بادشاہ یا امیر کی یادگار کے طور پر رکھے جاتے ہیں، یا اُن کے عہدِ حکومت میں آباد ہوتے۔ یا نئی زندگی حاصل کرتے ہیں۔ اس قسم کے ناموں میں افضل گنج۔ عثمان شاہی، حمایت نگر اور شاہراہ عثمانی وغیرہ شامل ہیں۔

دوسری قسم کے نام وہ ہیں جو بنانے والے یا مالک کے نام کی مناسبت سے رکھے جاتے ہیں۔ مثلاً کمان شمس الامراء۔ کوٹلہ عالیجاہ۔ سری عنبر کا بازار۔ تالاب میر جملہ۔

تیسرے گروہ میں وہ نام شامل ہیں جو کسی خاص عمارت کے وقوع یا کسی خاص شخص کی سکونت کی نسبت سے رائج ہو جاتے ہیں۔ مثلاً دارالشفاء۔ دیوان کی ڈیوڑھی سہ معظم جاہ کی سڑک اللہ سید علی کا چبوترہ وغیرہ۔

چوتھی تقسیم ان اسماء پر مشتمل ہے جو خاص قسم کے لوگوں یا خاص پیشہ والوں کی سکونت کے لحاظ سے مشہور ہو گئے ہیں۔ مثلاً بھوئی گوڑہ ۔۔۔ کاچی گوڑہ سہ کفش بازار سہ صندلیوں کا رسالہ وغیرہ۔

بعض نام کسی خاص تاریخی واقعہ کی وجہ سے، یا اس جگہ کی کسی چیز یا خصوصیت کی نسبت سے رائج ہوتے ہیں۔ یہ ناموں کی پانچویں قسم ہے اور یہ نام اپنی سرگزشت کے لحاظ سے نسبتاً زیادہ دلچسپ ہوتے ہیں ــ مثلاً "فتح دروازہ" ۲۔ "نوبت پہاڑ" ۳۔ "چھلی کمان" ۴۔ "لال دروازہ" وغیرہ۔

اسی طرح ممکن ہے اور بھی چند قسمیں نکل سکیں، اور اگر اس تحریک میں ایک سے زیادہ آدمی دلچسپی لینے لگیں تو بہت کچھ اضافہ ہو سکتا ہے۔

اس موقع پر یہ امر واضح ہو جانا چاہیئے کہ ناموں کی گروہ بندی اتنا اہم اور دلچسپ کام نہیں ہے جتنا ان واقعات کی تلاش اور ان کا اظہار جن کی بناء پر یہ نام پیدا ہوئے اور آج تک زندہ ہیں۔ مثال کے طور پر ہم یہاں اپنے محلوں میں سے ایک دو کی آبادیوں کا تذکرہ اور ان کے ناموں کی سرگزشت پیش کرتے ہیں جس سے ہماری عہد حاضر کی آبادی کو معلوم ہوگا کہ ہمارے شہر میں کیسی کیسی تاریخی اور فسانوی دلچسپیاں موجود ہیں۔

(۵)

یوں تو حیدرآباد کے متعدد محلے، ان کی آبادیاں اور ان کے نام منتظر ہیں کہ کوئی خدا کا بندہ ان کی نسبت "جدید حیدرآباد" کو صحیح طور پر واقف کرے، اور اس محدود جگہ میں گنجائش نہیں ہے کہ ان میں سے اکثروں کی سرگزشت بیان کی جائے اس لئے فی الحال "خیریت آباد" "حسین ساگر" "ماں صاحب کا تالاب" اور "شہزادوں کی کمان" کا اجمالی تذکرہ کیا جاتا ہے۔

حیدرآباد کی جملہ آبادیوں پر آئندہ کسی اور سلسلہ میں انشاء اللہ نظر ڈالی جائے گی۔

خیریت آباد اس نام کی تاریخ گوناگوں دلچسپیوں سے مملو ہے نہ صرف اس لئے کہ "جدید حیدرآباد" اسی محلہ کے اطراف و اکناف سمٹا چلا آرہا ہے اور اس شہر کے اکثر ارباب حل و عقد اسی میں بود و باش رکھتے ہیں، بلکہ اس لئے کہ اس شہر میں اور خاص کر اسی آبادی میں بسنے والے اہل علم و فضل بھی اس آبادی کے صحیح نام یا اس کی حقیقت سے واقف نہیں ہیں آخر الذکر طبقہ میں سے بعض تو ایسے ستم ظریف بھی نکلے کہ عوام کے لفظ "خیرت آباد"

کو غلط قرار دے کر اپنے "ادیبانہ خطوط" اور زریں "مانوگرافوں" میں لفظ "خیریت آباد" درج کرنا شروع کیا، اور اپنی اس "جراٰت رندانہ" پر فخر بھی کرنے لگے کہ ہم نے ایک مسخ شدہ لفظ کو صحیح طور پر رائج کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس دولت مند آبادی کا صحیح نام خیریت آباد نہیں "خیرۃ آباد" ہے۔

اس وجہ تسمیہ کی تحقیق کے لئے ہمیں آج سے پونے چار سو سال قبل کے "ابتدائی حیدرآباد" کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے کیونکہ یہ بستی اصل میں اسی زمانہ میں بسائی گئی تھی۔

جس وقت خیریت آباد کی بنا ڈالی گئی مشہور حیدرآباد کی جگہ پر ایک چھوٹا سا موضع "چچلم" آباد تھا۔ حیدرآباد کا بانی گولکنڈہ کا جلیل القدر حکمراں سلطان محمد قلی قطب شاہ ہے اور خیریت آباد کا بانی اس کا باپ سلطان ابراہیم قطب شاہ، جو اپنی بے تعصبی اور مقامی زبان تلنگی کے علم و ادب اور شعر و شاعری کی قدردانی کی وجہ سے تلنگی شاعروں کا "ممدوح خاص" تھا۔ اسی عظیم المرتبت سلطان نے اپنی ایک لڑکی شہزادی خیرۃ النساء کی بود و باش کے لئے اس سرسبز و شاداب اور صحت مند خطہ کو پسند کیا تھا کیونکہ اس شہزادی کی صحت ٹھیک نہیں رہتی تھی اور اطباء کی رائے تھی کہ گولکنڈہ کے شاہی محلات گہری آبادیوں میں گھرے ہوئے ہیں اور شہزادی کو ایک کھلی اور خوشگوار آب و ہوا میں قیام کرنے کی ضرورت ہے۔

چنانچہ بادشاہ نے اپنے دربار کے "صدر المہام تعمیرات" ابو عبداللہ نصیر الدین حسین کو (جو بعد میں حضرت حسین شاہ ولی رح کے نام سے مشہور آفاق ہوئے اور خود بادشاہ کے داماد اور دس ہزاری فوج کے سپہ سالار تھے) حکم دیا کہ اس جگہ ایک باغ، محل، مسجد، بازار اور تالاب تعمیر کریا۔ مسجد، بازار اور تالاب تو اب تک موجود ہیں لیکن باغ اور محل دوسرے قطب شاہی باغوں اور محلات کی طرح صفحۂ ہستی سے بہت جلد فنا ہو گئے۔

حسین ساگر

جو پُر فضا تالاب آج حسین ساگر کہلاتا ہے اصل میں ایک چھوٹا سا کنٹہ تھا جو اسی مذکورہ بالا "قطب شاہی" کے دامن میں واقع

تھا۔ اور حسین کو ابراہیم قطب شاہ کے حکم سے اس وقت کے ابو عبداللہ نصیر الدین حسین اور آج کل کے "حسین شاہ ولی" نے شہزادی خیرۃ النسار کے لئے ایک وسیع منظر اور فرحت افزا تالاب کی شکل میں منتقل کیا۔ اس کا اصلی نام "ابراہیم ساگر" بادشاہ کے نام پر رکھا گیا تھا مگر دوران تعمیر میں نصیر الدین حسین انجنیر کے اہتمام کی وجہ سے حسین ساگر مشہور ہو گیا اور پھر باوجود سرکاری کوششوں کے اصل نام رائج نہ ہو سکا۔

اس تالاب کی تعمیر کے سلسلہ میں "صدر المہام تعمیرات" نصیر الدین حسین سے جو مافوق فطرت کام ظاہر ہوئے ان کی نسبت قسم قسم کے قصے اور روایتیں مشہور ہیں جن کا ذکر انشاءاللہ کسی اور موقع پر "حسین شاہ ولیؒ کی حیات" کے سلسلہ میں کیا جائے گا۔ چونکہ اس تالاب کی تعمیر ان کے ابتدائی زمانے میں ہوئی تھی اس لئے ممکن ہے کہ اسی وقت سے عوام ان کی ولایت اور کرامت کے معتقد ہونے لگے ہوں۔

شہزادی خیرۃ النسار کا جب انتقال ہوا تو بادشاہ کو بڑا ملال ہوا چنانچہ اس کے حکم سے نصیر الدین حسین (حسین شاہ ولی) نے خیرۃ آباد کی مسجد کے پہلو میں ایک گنبد تعمیر کرادی جو اب تک موجود ہے۔ اس گنبد میں شہزادی کی نعش عارضی طور پر سپرد خاک کی گئی تھی کیونکہ روایت ہے کہ بعد کو وہ کربلائے معلیٰ میں دفن کی گئی۔

اُوپر ذکر ہو چکا ہے کہ حسین شاہ ولی ابراہیم قطب شاہ کے داماد تھے لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جو شہزادی ان کو بیاہی گئی تھی وہ خیرۃ النسار تھی یا اس کی کوئی بہن۔ بہرحال یہ ظاہر ہے کہ حسین شاہ ولی نے خیرت آباد اور حسین ساگر جس ہستی کے لئے آباد کیا وہ ان کو یقیناً عزیز تر تھی اور شاید انہی کی کرامت ہو گی کہ خیرت آباد اور اس کا قرب و جوار آج تک مقبولِ خلائق ہے اور صاحبان ثروت کا مسکن، اور حسین ساگر اور اس کا ماحول بھی ہمیشہ پُر فضار اور فرحت بخش ثابت ہوتا رہا ہے۔ شہر حیدرآباد اور اس کے نواح کا کوئی تالاب اتنا آباد، خوش منظر اور بارونق نہ ہو سکا۔

گولکنڈہ کے شاہی خاندان کو یہ خطہ (خیریت آباد اور

ماں صاحب کا تالاب

حسین ساگر کا نواح) اس قدر پسند تھا کہ سلطان ابراہیم کی پوتی، محمد قلی قطب شاہ کی اکلوتی شہزادی بیٹی، خیرالنساء کی بھتیجی حیات بخشی بیگم نے اس کے قریب ایک اور باغ، بازار اور تالاب بنوایا جو اس وقت تک موجود ہیں۔

حیات بخشی بیگم کے تالاب کو "ماں صاحب کا تالاب" اس لئے کہتے ہیں کہ یہ خاتون جہاں ایک بادشاہ (محمد قلی) کی غالباً واحد لڑکی تھی اور جہاں ایک بادشاہ (محمد قطب شاہ) کی واحد ملکہ تھی ایک واحد لڑکے کی ماں بھی تھی جو بعد میں چل کر عبداللہ قطب شاہ کے لقب سے بادشاہ ہوا اور عجیب اتفاق ہے کہ یہ عجیب و غریب شہزادی اور ملکہ اپنے اکلوتے لڑکے کے عہد حکومت میں بھی عرصہ تک زندہ رہی، اور نہ صرف زندہ رہی بلکہ حکمران۔ اس کی اجازت کے بغیر خود بادشاہ کوئی کام نہیں کر سکتا تھا اور بادشاہ کی "ماں صاحبہ" کا حکم ہر معاملہ میں آخری لفظ ہوا کرتا تھا اور یہ "ماں صاحبہ" اتنی ہردلعزیز اور مقبول تھیں کہ نہ صرف بادشاہ بلکہ ملک کا بچہ بچہ ان کو اپنی ماں صاحبہ سمجھتا تھا۔ اور اسی وجہ سے یہ نام اب تک اسی شکل میں چلا آیا، البتہ عام لسانی اقتدار کے مطابق اس میں تھوڑی سی صوتی تبدیلی ہو گئی ہے۔

شیر دل کی کمان

جب کوئی شخص حیدرآباد میں "پتھر گٹی" سے چار مینار کی طرف جاتا ہے تو "سو کے حوض" سے جانب مغرب جو کمان بازار اور راستہ اس کو دکھائی دیتا ہے وہ اسی متذکرہ نام سے موسوم ہے، یہ اصل میں کمان کا نام ہے مگر جیسا عام طور پر ہوتا ہے اس کی اطراف و اکناف کی آبادی بھی اسی نام سے یاد کی جاتی ہے۔

شیر دل کی کمان، ان چار کمانوں میں سے ہے جو آج سے ساڑھے تین سو سال پہلے محمد قلی قطب شاہ کے محل کے سلسلہ میں "شاہی جلو خانہ" کے چاروں پہلوؤں کے وسط میں بنائی گئی تھیں اور اس زمانے "چہار طاق ہائے جلو خانہ شاہی" کہلاتی تھیں جو کمان آج شیر دل کی کہلاتی ہے وہ اصل میں شاہی محل کا بیرونی دروازہ تھا اور "دروازہ دولت خانہ عالی" کہلاتا تھا جس پر نہایت قیمتی پردہ پڑا رہتا

بادشاہ
تھا جو بادشاہ کا جلوس نکلتے وقت اٹھایا جاتا ۔

اس دروازہ "دولت خانہ عالی" کے بالکل مقابل مغرب کی طرف اس جگہ جہاں سے آج کل ساہوکاروں کے مکانوں اور "کمار شہر" کی طرف راستہ نکلتا ہے محل خاص کا "باب عالی" تھا جو خالص طلائی تھا اور جس کو اورنگ زیب نے فتح حیدرآباد کے بعد دہلی روانہ کر دیا تھا۔

ساڑھے تین سو سال بعد آج بھی عظیم الشان قطب شاہی "دروازۂ دولت خانہ عالی" کے آثار موجود ہیں اس کمان سے اگر آپ کبھی گزریں تو معلوم کر لیں گے کہ ایک بڑی سنگین چوکھٹ اب تک اس میں موجود ہے حالانکہ اس قسم کی چوکھٹیں یا ان کے آثار دوسری تین کمانوں میں موجود نہیں ہیں اس لئے یہ بھی نہیں کہہ سکتے کیونکہ وہ دروازوں کا کام نہیں دیتی تھیں ۔

ہمارے لئے اس موقع پر یہ بات زیادہ دلچسپ ہے کہ اس کمان کا نام "دروازہ دولت خانۂ عالی" سے بدل کر "شیرڈل کی کمان" کیسے پڑ گیا ۔ اس کی نسبت کئی طرح کی روایتیں موجود ہیں ۔ بعض کہتے ہیں کہ زوال قطب شاہیہ کے بعد لوگ قدیم شاہی محل کا دروازہ ہونے کی وجہ سے اس کو فوق فطری خصوصیات کا حامل کہنے لگے ۔ ان کا اعتقاد تھا کہ اگر کسی کو جادو کا اثر ہو جائے تو یہاں لانے سے زائل ہو جاتا ہے اس لئے اس کا نام "کمان سحر باطل" پڑ گیا اور پھر یہی لفظ ہوتے ہوتے تغیرات حاصل کر کے شیرڈل ہو گیا۔

ایک اور روایت یہ ہے کہ کوئی بزرگ اس کمان کے گوشے میں آکر ٹھیرتے تھے اور وہ جادو کے اثرات کو باطل کر دیا کرتے تھے ۔ اسی لئے لوگوں نے اس کمان ہی کا یہ نام رکھ دیا ۔

ایک تیسری روایت جو زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے لفظ شیرڈل کو شیر گل (مٹی کا شیر) کا مسخ شدہ شکل قرار دیتی ہے "شیر گل" یا "مٹی کا شیر" آج تک اس جگہ موجود ہے جہاں کسی زمانہ میں حیات بخشی بیگم کا محل تھا اور جس کے آثار انہی کی بنائی ہوئی مسجد کی صورت میں یہاں شیر گل کے قریب آج بھی موجود ہیں ۔

حیات بخشی بیگم کے اس محل کی سرگزشت ہمارے اس مضمون میں ملے گی جو "چار کمان" کے عنوان سے

"حسن کار" میں شائع ہو رہا ہے یہاں صرف اسی امر کا اظہار ضروری ہے کہ شیر ایک تو قطب شاہی سلطنت کے شاہی نشانات میں شامل تھا اور دوسرے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے لقب "شیر خدا" کی مناسبت سے شیعہ مذہب کے ظاہری لوازمات میں سمجھا جاتا تھا اس لئے ممکن ہے کہ خود حیات بخشی بیگم نے اپنے محل کے عاشور خانہ میں ایک شیر بنوایا ہو۔ جس کی یاد اب تک شیر گل کی شکل میں باقی ہے۔

غرض عوام اسی شیر گل دمٹی کے شیر) کی طرف لے جانی والی کمان کو "کمان شیر گل" کہنے لگے ہوں تو کوئی تعجب نہیں یہ بہت ممکن ہے کہ یہ لفظ باضابطہ صوتی تبدیلیوں کے تحت پہلے شیر دل بنا اور پھر شیرڑول۔ حروف "د" اور "ت" سے پہلے کی "ر" حیدرآباد میں اکثر "ڑ" بولی جاتی ہے۔ مثلاً الفاظ خردہ، مردہ، ارؔ دل یا اردلی اور کرتا کو حیدرآباد کے ان پڑھ عوام خرڑہ "مرڑدہ" اڑدل یا اڑدلی یا کرڑتا بولتے ہیں۔ یہ ایک باضابطہ اور با اصول صوتی تبدیلی ہے جو اکثر زبانوں میں پائی جاتی ہے

(مطبوعہ سالنامہ رہبر دکن ۱۹۴۳ء)

کلام بلاغت نظام اعلیٰ حضرت سلطان العلوم آصف سابع

(مطلع) مانگ کر اپنی مرادوں کو خدا سے لے لو : گوہرِ جود و کرم دستِ عطا سے لے لو
کہہ دے اتنا ہی مریضانِ محبت سے کوئی : آج تم جامِ شفا دستِ شفا سے لے لو
خونِ دل، خونِ جگر کہتا ہے چھپکا پڑ کر : سرخروئی کے لئے رنگِ حنا سے لے لو

کس طرح مرمٹے دَم گھٹ کے اسیرانِ قفس
دادِ اس کی بھی ذرا جور و جفا سے لے لو

شہر حیدرآباد کی قدیم عمارتیں

(اُردو ریسرچ سنٹر میں ایک مخطوطہ موجود ہے اس پر مولف و کاتب کے نام اور سنہ تالیف و کتابت درج نہیں ہیں مگر اس میں شہر حیدرآباد کی قدیم عمارتوں کے بارے میں بیش بہا معلومات موجود ہیں جیسے سنین تعمیر و ترمیم، اخراجات اور تعمیر کرانے والوں کی تفصیلات، چونکہ یہ معلومات کہیں اور یکجا دستیاب نہیں ہیں اس لئے قارئین شاداب کی دلچسپی کے لئے پیش ہیں)

قلعہ گولکنڈہ:۔ ہندوستان میں قلعہ چتوڑ مشہور ہے انصاف سے دیکھا جائے تو قلعہ چتوڑ گڑھ سے قلعہ گولکنڈہ کسی طرح کم نہیں اس قلعہ کے ابتدائی حالات کسی مورخ کو نہیں معلوم۔ لیکن اس قدر پتہ چلتا ہے کہ راجہ کشن داس نے اسے اینٹ اور مٹی سے بنایا تھا اور کچھ نہیں معلوم سنہ ۷۶۵ھ میں راجہ ورنگل نے درست کرکے اس مشہور عالم قلعہ کو محمد شاہ بہمنی[1] کے حوالہ کیا اُس نے اس قلعہ پر ایک مسجد تعمیر کرایا غالباً اسی زمانہ سے اس کو قلعہ محمد نگر کہتے ہیں اس کے بعد سلطان ابراہیم قطب شاہ نے قدیم حصار گرواکے جدید حصار ۸ ہزار گز کا سنگین حصار تیار کروایا ۴ سو برج معہ چبوترہ اور ۸ آہنی دیوان بنایا اور ۵۰ سے لے کر ۶۰ فٹ تک گہرا خندق کھدوایا اس وقت بھی جا بجا پانی کے ٹانکیاں موجود ہیں شاہ نے جو محل اپنے بیگمات تارا متی و پیما متی کے لئے تعمیر کرائی وہ اب تک نواح قلعہ میں موجود ہیں اور وہ رانیوں کے نام سے ہی موسوم ہیں ان سب کی تعمیر بعد نو ماہ کے سنہ ۹۸۸ھ میں ختم ہوئی اور بیس لاکھ روپیہ سکہ رائج الوقت صرف ہوتے۔ محمد قلی قطب شاہ نے اس میں ایک جامع مسجد تیار کرائی۔ بالائے کوہ ایک حصار بنوایا جو اب بالا حصار کے نام سے نامزد ہے سلطان عبداللہ قطب شاہ

---

[1] محمد شاہ بہمنی نے سنہ ۷۵۹ھ میں بیدر میں جلوس فرمایا اور سنہ ۷۷۶ھ میں انتقال کیا

شاہی دروازہ
۱۰۹۵ نے اس پہاڑی کو جو قلعہ سے بالکل ملحق ہے اس میں شامل کر لیا اور اطراف دیوار اٹھا کر اس کی تعمیر و

درستگی و آلات وحرب وضرب میں ۵ ... ۹۴ ہزار روپیہ صرف ہوا۔ نواب عابد خاں

المخاطب بہ چین قلیچ خاں خواب آصفجاہ رضوان منزل کے دادا تھے عالمگیر اول کے ہمراہ رہے ہوئے

تانا شاہ کے توپ کے گولہ کے صدمہ سے ۱۰۹۷ھ میں انتقال کیا ان کا مقبرہ اسی قلعہ کے نواح

میں موجود ہے تانا شاہ ۱۰۹۸ھ میں قید ہو کر اسی قلعہ سے گرفتار ہو کر قلعہ دولت آباد میں بھیجدیا

گیا۔ قلعہ حیدرآباد سے ۵ میل جانب غرب واقع ہے پورے قلعہ کا پیمائش پر اس کا دور تین

میل ہے اب صرف اس کے چار دروازے ہیں ایک بنجارہ دروازہ دوسرا مکہ دروازہ،

تیسرا جمال دروازہ، چوتھا فتح دروازہ۔

قلعہ سرور نگر : یہ قلعہ سلطان نگر کے نام سے بھی مشہور ہے ۱۰۳۰ھ میں سلطان محمد قطب شاہ

نے بلدہ سے ۵ میل جانب مشرق تعمیر کرنا شروع کیا لیکن بعد وفات شاہ کے فرزند عبداللہ

قطب شاہ نے اس کو نامسعود سمجھ کر تعمیر روک دی اب تک یہ ایسی ہی ناتمام حالت میں پڑا ہوا ہے

قدیم پل : ابراہیم قطب شاہ نے ۹۸۶ھ میں بصرف ۲ لاکھ ہن تیار کروایا طول ۶۰۰ گز

اور عرض ۳۵ گز اور ارتفاع ۲۴ گز، پل میں ۲۲ در نہایت ہی خوبصورت بنائے گئے۔

"صراط المستقیم" اس کی تاریخ نکلتی ہے بہت سارے طوفان کا مقابلہ کیا ہے لیکن ویسا ہی

ہے اگر کچھ صدمہ پہونچا ہے تو اس کو راجہ چندولعل نے ۱۲۳۶ھ میں درست کرایا۔ (نوٹ)

یکم رمضان ۱۳۲۶ھ روز یکشنبہ صبح کے سات بجے سے رود موسیٰ میں طغیانی شروع ہوئی اور

کئی گز بلند پانی پل پر سے بہہ گیا جس کے وجہ پل کے اطراف کی دیوار قندیل بہہ گئی سطح پل کی بجری

نکل گئی قدیم شہر تک بہتے ہوئے دیکھنے لگے۔ بیرونی دروازہ غار عمیق پڑ گئے۔

پل چادر گھاٹ : نواب ناصر الدولہ بہادر غفران منزل کے عہد میں ریذیڈنٹ حیدرآباد کی

تحریک پر ۱۲۴۶ھ میں تعمیر ہوا۔ پل کا طول ۷۰۰ فٹ عرض ۴۲ فٹ، ارتفاع ۵۰ فٹ۔ اس میں

۸ بڑی بڑی کمانیں ہیں خزانہ شاہی سے ۸۵ ... ہزار روپیہ صرف ہوا۔

(نوٹ) سنہ ۱۳۲۶ھ کے طغیانی رود موسیٰ میں اس کو سخت صدمہ پہونچا۔ دیواریں، قندیلیں بہہ گئیں صرف درمیانی ۵ کمانیں رہ گئیں ایک اس طرف کی اور دو اس طرف کی بہہ گئیں ہر دو جانب عمیق گڑھے پڑ گئے۔

پُل افضل گنج : افضل گنج کا پُل کہنہ ہے عام گزرگاہ ہے ۱۲۷۳ھ میں بعہد نواب افضل الدولہ بہادر مغفرت مکان تعمیر ہوا۔ سالار جنگ اعظم نے اس کی تعمیری نگرانی اپنے ذمہ لی۔ ۷۵۰۰۰ ہزار روپیہ خرچ ہوا اور ایک دروازہ چوبی بنوایا۔ اس کے لئے ایک دروازہ بالکل ناکافی تھا اس ضرورت کو نواب لائق علی خاں بہادر سالار جنگ ثانی نے محسوس کر کے پھاٹک کے ہر دو جانب کی دیوار سنگین تڑوا کر ہر دو جانب چھوٹے چھوٹے چوبی دروازہ بنوائے۔ ۱۳ رجب ۱۳۲۶ھ کو جب رود موسیٰ میں طغیانی ہوئی تو پل کے قریب غار پڑ گیا اور ۸ ماہ مذکور کو پل کے سیدھے جانب کی چوتھی کمان کا ایک گر گیا تا اختتام وسعت گاڑی وغیرہ کی [illegible]۔ اوائل ماہ ربیع الثانی سنہ ۱۳۲۳ھ میں دروازہ کے اوپر گھڑی کا مینار تعمیر ہونا شروع ہوا آٹھ ہزار روپیہ پر کنٹراکٹ دیا گیا۔ ۱۱ر شوال کو گھڑی مینار میں رکھی گئی جشن چہل سالہ میں ۲۴ر شوال یوم سہ شنبہ اعلیٰ حضرت بندگان عالی نے بہ نفس نفیس بوقت مغرب اس کا افتتاح فرمایا یہ گھڑی نواب آسمان جاہ بہادر کے عہد وزارت میں خریدی جا کر رکھی گئی تھی اور بیکار پڑی ہوئی تھی۔ ۱۳۲۶ھ کی طغیانی میں اس پل کو بھی صدمہ پہونچا قندیلیں اور دیواریں اکھڑ کر بہہ گئیں اور بائیں جانب افضل گنج ٹوٹ کر بہہ گئیں البتہ ہر دو کے بیچ والی کمان محفوظ رہی لیکن اس کے بعد کا حصہ بالکل شکستہ ہو گیا اور بڑا سا غار پڑ گیا۔ اور اب نصف پل بجائے سنگ بستہ ہونے کے سیمنٹ کا بنایا گیا ہے۔

پُل مسلم جنگ : اس پل کو نواب غالب الملک مرحوم جمعدار عرب اپنے ذاتی خرچ سے ۱۹ر ذی الحجہ ۱۳۱۱ھ کو تعمیر شروع کی جو ۲۱ر شوال ۱۳۱۸ھ کو ختم ہوئی۔ ۵ر محرم ۱۳۱۹ھ کو شام کے ۶ بجے اعلیٰ حضرت حضور پر نور نے اس کا افتتاح فرمایا۔ ۱۳ر رجب ۱۳۲۶ھ کو رود موسیٰ کی شدید طغیانی سے صدمہ پہونچا اور پل کسی قدر کمزور ہو گیا۔ عرض بہت کم ہے اور پائیداری کے لحاظ

سے بھی زیادہ مستحکم نہیں ہے۔

(نوٹ) ۲ آخر آبان ۱۳۱۷ف مطابق سنہ بہ نسبت پل چادرگھاٹ و پل افضل گنج کے اس کو خفیف صدمہ پہونچا یعنی دیوار اکھڑ گئی، قندیلیں بہہ گئیں جس قدر گچ تھی بہہ گئی۔ صرف اس کی تہیں باقی رہ گئی تھیں۔

چارمینار: محمد قلی قطب شاہ نے سنہ ۹۹۹ھ میں تعمیر شروع کروایا اور بتاریخ یکم محرم سنہ ۱۰۰۰ھ روز پنجشنبہ ختم ہوئی۔ "یا حافظ" اس کا مادۂ تاریخ ہے تعمیر میں ۲ لاکھ ساٹھ ہزار اور بقول بعض تین لاکھ ہن خرچ ہوئے۔ یہ عمارت مربع ہر ضلع ۱۰۰ فٹ ہے چاروں مینار کی بلندی ۱۶۰ فٹ ہے عمارت کے اوپر ایک مسجد اور ایک حوض ہے سنہ ۱۳۰۴ھ میں اس کے اطراف لوہے کا کٹہرہ لگایا گیا ۷ محرم سنہ ۱۳۰۷ھ کو چاروں جانب گھڑیاں لگائی گئیں چارمینار کے اندر حضرت محبوب سبحانی قدس سرہٗ کا چلہ ہے — تاریخ نہیں معلوم۔ اعلیٰ حضرت زیارت کو آتے۔

چار کمان اور گلزار حوض: چارمینار کے ساتھ یہ بھی سلطان محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں تعمیر ہوئیں۔ یہ کمانیں جلوخانہ شاہی کے نام سے موسوم ہیں پہلے غربی کمان دروازہ دولت خانہ عالی اور شرقی کمان نقار خانہ شاہی کے نام سے نامزد تھیں لیکن اب لوگ مچھلی کمان، کالی یا شمبھو پرشاد کی کمان، سحر باطل یا شیر دل کی کمان، چارمینار کی کمان کہتے ہیں اور وسط میں ایک بدرو حوض بھی بنایا گیا ہے اس کے اطراف چبوترہ تھا لیکن نواب وقار الامراء بہادر نے سنہ ۱۳۱۰ھ میں بوجہ تنگی راستہ توڑوا دیا۔

چار محل: سلطان ابوالحسن تاناشاہ نے سنہ ۱۰۸۳ھ میں تعمیر کرایا۔ تیاری میں ۸ لاکھ روپے صرف ہوئے ۲۷ ربیع الاول سنہ ۱۱۸۵ھ کو اس کے بارود خانہ میں آگ لگ کر تمام محل جل کر خاکستر ہو گیا اب اس کا نشان بھی نہیں ہے لیکن اس کے نام سے ایک محلہ آباد ہے وہ سنہ ۱۳۲۶ھ کی طغیانی میں بہہ کر تباہ ہو گیا۔

قدیم حویلی: سنۂ تعمیر تو معلوم نہیں ہو سکا اس قدر پتہ چلتا ہے کہ نواب نظام علی خاں بہادر غفران مکاں کے زمانے میں نواب رکن الدولہ وقار الدولہ کی جائیداد کے ساتھ یہ حویلی بھی ضبط کر لی گئی

تھی نواب غفران مآب نے اسے اپنے فرزند سکندر جاہ مغفرت منزل کے قیام کے لئے پسند فرمایا اور وہ وہاں مقیم ہوئے جب سکندر جاہ مغفرت منزل مسند نشین ہوئے تو اس کو چھوڑ کر خلوت محل میں رہنا شروع کیا اس سے تعمیر میں فرق آگیا جب سے قدیم حویلی اس کا نام ہوا۔ جلوخانہ چوکی خانہ، کمان درسعادہ کلاں، دوکانات انہی کے یادگار ہیں۔ نواب افضل الدولہ بہادر مغفرت مکان اسی میں پیدا ہوئے۔ بایں وجہ اعلیٰ حضرت اس کو بہت عزیز رکھتے ہیں اور اکثر اسی میں رہتے ہیں وسط سفر ۱۳۰۵ھ میں اس کے اندر ایک عالیشان باڑہ قائم ہوا کل اخراجات خزانہ شاہی سے دیئے گئے۔ حضور کی قیام کی یہ خاص علامت ہے اس کے اطراف کا یعنی محل کے اطراف کا مجموعہ ایک میل ہزار فیٹ اور رقبہ (۱۴۵۰۰) مربع گز ہے۔

گوشہ محل: یہ محل سلطان عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں ۱۰۸۳ھ میں تعمیر ہوا اس عالیشان عمارت ایک ہزار حجرہ تھے مکان کی بلندی کے نسبت مشہور ہے کہ آخری حصہ تک لیموں نہیں پہونچ سکتا۔ اس پر ۳۰۴۰۰۰ روپے صرف ہوئے یہ عمارت منہدم ہوگئی اب تھوڑا حصہ باقی ہے اس کا تعلق شکاری توپ خانہ ہے توپ خانہ بھی گوشہ محل کے نام سے مشہور ہے اس کے متعلق ایک حوض بھی اب تک شکستہ حالت میں باقی ہے سیتارام پیٹھ سے اس میں ایک نالہ گذرا ہے۔

فلک نما: نواب وقار الامراء بہادر نے اس پہاڑی پر جو شہر کے جانب جنوب واقع ہے تیار کروا ۱۳۰۱ھ میں اس کا سنگ بنیاد رکھا گیا اور ۱۳۰۹ھ میں تعمیر ختم ہوئی تعمیر اور آراستگی میں ۴۰ لاکھ روپیہ خرچ ہوا۔ اس کو اعلیٰ حضرت بندگان عالی نے ۱۳۱۳ھ میں ۲۰ لاکھ میں خرید فرمالیا اور ۵ بطور معافی اور ۱۳ لاکھ بعنوان قرضہ دیئے گئے۔ ۱۳۱۵ھ میں دیوان مع باغ عمدہ بیگم افسر بیگ کی نگرانی میں دیا گیا۔ میسرم کے جوان متعین ہیں دربار دہلی سے اعلیٰ حضرت جو چوبی بنگلہ ہمراہ لائے تھے وہ ۱۳۲۲ میں یہیں لاکر رکھے گئے۔ حضور کے مہمان خاص یہیں فروکش ہوتے ہیں چنانچہ ۱۳۲۳ھ میں حضور شہزادہ جارج اور دیگر وغیرہ یہیں آکر ٹھہرے۔

خلوت محل: ابتداءً اس کے معلوم نہیں ہوئی اور نہ یہ معلوم ہوا کہ کس زمانہ میں تیار ہوا

اس محل کا رقبہ (۲۹۰۰۰) مربع گز ہے۔ اس میں جلوخانہ، خلوت مبارک، رنگ محل، روشن بنگلہ* افضل محل، احباب محل، مہتاب محل، تہنیت محل، چاندبی بیگم کی حویلی، مجھلی بیگم کی حویلی بخشی بیگم کی حویلی، موتی بنگلہ، سرور بنگلہ، شادی خانہ، توشہ خانہ، چومحلہ، پنج محلہ مغربی گوشہ میں مدرسہ مبارک جس کو حویلی سلیمانجاہ بھی کہتے ہیں۔ مکان محل پیران، مکان راگ مالا۔

محل سرور نگر : یہ محل قریب احمد باڈرہ کے سنہ ۱۳۰۰ھ میں تعمیر ہونا شروع ہوا مگر اعلیٰ حضرت کی ناسازئ مزاج کی وجہ تعمیر منحوس خیال کی گئی اور ناتمام چھوڑ دیا گیا سال ۱۳۲۱ھ میں ملکہ معظمہ وکٹوریہ کی یاد میں اس کو یتیم خانہ کے لئے درست کیا گیا اس پر ۱,۸۷۰۰۰ روپئے خرچ ہوئے بعد تیاری اعلیٰ حضرت نے ۸ ذلحجہ سنہ ۱۳۲۲ھ کو اس کا افتتاح کیا۔

چندولعل بارہ دری : پہلے فتح دروازہ کے باہر نانک رام جو چندولعل کے چچا ہوتے تھے۔ ان کی ملکیت میں چھوٹا سا باغ تھا جس کو مہاراجہ چندولعل نے وسیع کیا بارہ دری کی بنیاد ڈالی تعمیر ۱۲۲۳ھ سے شروع ہو کر ۸ سال میں ختم ہوئی کل ۱۵۰۰۰۰ روپیہ خرچ ہوئے۔ باغ میں کاشت بھی ہوتی ہے سالانہ تحصیل ۱۰ ہزار کے قریب ہے مادہ تاریخ باغ ارم یا رام باغ ہے

سیف آباد محل : اس جگہ پہلے موہن لال والد بی لال سررشتہ دار اصطبل کا باغ تھا جس کو بندگان حضور نے خرید فرما کر سنہ ۱۳۰۴ھ اس کی تعمیر زیر نگرانی محبوب یار جنگ شروع کرائی ایک سال میں تعمیر ختم ہوگئی۔ نہایت عالیشان محل ہے اور حسین ساگر کے قریب ہونے سے نہایت ہی پر فضا ہے مصارف تعمیر کا پتہ نہیں چلا لیکن سالانہ اخراجات ۴۹۳۳ ہزار روپے یہاں یہ محل اب علاقہ دیوانی میں منتقل ہو گیا ہے اور اب اس میں دفتر فینانس ہے۔

ہیریڈ فیلڈ : ۷ جمادی الاول سنہ ۱۳۱۴ھ کو حضور پر نور نے نواب عماد نواز جنگ حسن عبداللہ کے مکان کو خرید فرما کے وسیع کیا اور نہایت عالیشان عمارت تعمیر کروائی۔ ایک سال میں کام ختم ہوا نام ہیریڈ فیلڈ رکھا گیا۔ یہ شرط گاہ ملک پیٹ کے قریب واقع ہے

صدرت مجلس تعمیر ۱۳۱۱ھ سے شروع ہوئی مبلغ لاکھ روپیہ اس پر خرچ ہوئے [illegible] میں

ملک معظم ایڈورڈ ہفتم شاہ انگلستان کی تاج پوشی کی خوشی میں اس کے اندر دارالمجانین قائم ہوا یہ عمارت نہایت بلند اور پُر فضا مقام پر واقع ہے دور تک نظارہ ہو سکتا ہے دارالطبع سرکاری بھی اسی میں ہے

توپ کا سانچہ : چادر گھاٹ میں رومن کیتھولک گرجا کے قریب منہدم عمارت اب بھی پائی جاتی ہے یہاں پہلے فرنگی کے بندوق توپ ڈھالے جاتے تھے اس کو ریمنڈ کا کارخانہ بھی کہتے ہیں ریمنڈ (موسی ریمو) فرانسیسی افسر نے حضور نظام علی خاں کے عہد میں تعمیر کرایا تھا۔ ریمنڈ ۲۵ مارچ ۱۷۹۸ء / ۱۲۱۳ھ کو انتقال کیا۔

آسمان گڑھ : ۱۳۰۳ھ میں نواب آسمان جاہ بہادر نے تیار کیا۔ شہر بلدہ سے جانب مشرق ایک بلند پہاڑی پر (موسی ریمو) کی قبر کے قریب واقع ہے تعمیر میں سکہ رائج الوقت ۵۰ ہزار سے زیادہ صرف ہوئے۔

مکہ مسجد : سلطان محمد قطب شاہ کی یادگار ہے سلطان نے ۱۰۲۳ھ میں سنگ بنیاد رکھتے وقت مجمع کو مخاطب کر کے کہا جس کی نماز تہجد کبھی قضا نہ ہوئی ہو وہ بنیاد میں پتھر رکھے۔ کسی نے جرات نہ کی سلطان بنفس خود سنگ بنیاد رکھا۔ تعمیر کے لئے ۲ ہزار معمار، ۲ ہزار سنگ تراش، ۴ ہزار مزدور مقرر ہوئے۔ مسجد کے اکثر حصہ میں پتھر گگن پہاڑ کا لگایا گیا ہے یہ پہاڑ حیدرآباد کے جنوب میں بلدہ سے ۸ میل کے فاصلہ پر واقع ہے مسجد کا طول ۲۱۰ فٹ اور عرض ۱۲۹ فٹ ہے بلندی مع کلس تک ۱۴۷ فٹ ہے باہر کے کانین ۵ ہیں اوپر سو سو فٹ کے اونچے دو مینار بنے ہوئے ہیں بعض کہتے ہیں کہ تیس ہزار ہُن صرف ہوئے۔ اس کا نام بیت العتیق رکھا۔ سلطان عبداللہ قطب شاہ، سلطان ابوالحسن تاناشاہ اپنے اپنے عہد میں درستی کی جانب توجہ کی اور ۸ لاکھ روپیہ تک صرف کیے۔ ابوالحسن نے اپنے عہد میں اس کا نام مکہ مسجد رکھا۔ اورنگ زیب نے اپنے زمانہ میں بھی اس کی درستی کرایا۔ بیچ کی کمان جہاں امام کھڑا ہوتا ہے پہلے کھلی تھی اس کے حکم سے چن دی گئی مسجد کے سامنے کی رخ پر بازو میں دو مینار ہیں وہ اورنگ زیب کی

یادگار ہیں دروازہ اور حوض تیار کروایا۔ تمام کام ۱۲۰۲ھ تک ختم ہو گیا۔

صحن مسجد میں نواب افضل الدولہ بہادر نے بجائے پتھر کے پتھر بچھوا دیا۔ اعلیٰ حضرت کے عہد میں جانب جنوب حوض سنگ مرمر کے منبر وعظ و تکبیر کے لئے تیار ہوئے۔ صحن مسجد میں کٹہرے بھی لگائے گئے۔ جن میں دو نفیس پھاٹک ہیں — ایک بڑی گھڑی خریدی گئی مستورات کے پردہ کے لئے جالیاں لگائی گئیں نماز جمعہ و خاص نمازوں میں ایک کمان میں یہ جالیاں لگا دیئے جاتے ہیں پرندوں سے حفاظت کے لئے جال لوہے کی لگائی گئی جس سے معلق پرندہ نہیں آسکتے۔ جھاڑ اور پردہ وسط مسجد میں جو پانچ زنجیروں سے آویزاں ہے نواب وقار الامراء بہادر نے ہدیۃً دیئے ہیں۔ صحن مسجد کے جنوب سلسلہ آصفیہ کے اکثر حکمران وغیرہ دفن ہیں۔ صحن مسجد میں آخری حصہ پر سنگ مرمر و سنگ موسیٰ کے چند تخت رکھے ہیں عوام میں یہ بات مشہور ہے کہ کوئی مسافر اور غریب الوطن اس پر بیٹھ جاوے تو پھر وہ حیدرآباد سے نہیں نکل سکتا۔ عقب مسجد میں ایک خانقاہ ہے جنوب خانقاہ میں ایک دروازہ ہے اس کا تعلق محلات شاہی سے ہے شاہی جنازہ اسی دروازہ سے لائے جاتے ہیں۔

غرباء اور مساکین کے لئے روزانہ ایک پلہ کی کھچڑی پکتی ہے

مسجد چوک : خواجہ عبداللہ خاں نے ۱۲۰۲ھ میں اس مسجد کو تعمیر کیا۔ صدی پوری ہونے کو سال باقی تھے ۱۳۲۲ھ میں سرکار عالی کی جانب سے اس کے دونوں بازو وسیع کئے گئے اور آگے کے حصہ میں بھی گنجائش نکالی گئی مسجد کے شمال میں حمام و بیت الخلاء ہیں نہایت بلند کرسی ہے۔ اس کے نیچے متعدد ملگیات ہیں جن کے کرایہ سے مسجد کی درستی ہوتی ہے دیگر اخراجات بھی اسی میں سے نکالے جاتے ہیں اس کا تعلق امور مذہبی سرکار عالی سے ہے

مسجد افضل گنج : نواب افضل الدولہ بہادر مغفرت مکان نے تعمیر کرائی ۲ ربیع الثانی ۱۲۸۳ھ کو اس کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ ماہانہ خرچ خزانہ صرفخاص سے دیا جاتا ہے مسجد میں ایک حوض ہے حسین ساگر سے بذریعہ نل آتی اس میں پانی لایا جاتا ہے خدام مسجد کی تنخواہ معاشقے، ماہ صیام و اعیاد کے لئے سالانہ تقریباً ۹۰۰۰ ہزار روپے صرفخاص سے مقرر ہیں۔

جامع مسجد: اس کے حالات واضح نہیں معلوم، اتنا معلوم ہوا ہے کہ ۱۰۰۱ھ میں سلطان قلی قطب شاہ نے تعمیر کرایا دو لاکھ روپیہ صرف ہوئے۔ حمام خانقاہ مدرسہ کی عمارتیں تھیں اب وہ موجود نہیں ہیں۔

عیدگاہ قدیم و جدید: قدیم عیدگاہ شہر سے جانب شرقی دو میل کے فاصلہ پر سلطان محمد قطب شاہ نے تعمیر کرایا وہ اب تک موجود ہے اس حیدرآباد جیسے وسیع شہر کے لئے نہ تو ایک عیدگاہ کافی ہوسکتی ہے اور نہ وہ اتنی قریب ہے اس ضرورت کو محسوس کرکے نواب سید ابوالقاسم میر عالم مدارالمہام نے اپنے تالاب میر عالم کے ساتھ ہی ۱۲۳۱ھ میں اس کو بھی تعمیر کرایا۔ اب عیدین کی نماز اسی میں ہوتی ہے

بادشاہی عاشور خانہ: ۱۰۰۳ھ میں سلطان محمد قلی قطب شاہ نے ۶۶ ہزار روپیہ کے صرف سے تعمیر کرایا۔ ۱۰۲۰ھ میں سلطان عبداللہ قطب شاہ نے اس میں چین کے کاریگر سے چینی کاری کرائی۔ ۱۱۹۹ھ سے نواب نظام علیخاں غفران مآب نے اس میں علم ایستادہ کرائے اخراجات کے لئے سالانہ ۱۲ ہزار ۰۰۰ ۱۲ روپے کی جاگیر مقرر فرمائی۔ نواب سکندر جاہ نے سالانہ دو ہزار نقد کا اور اضافہ کیا۔ نواب ناصرالدولہ غفران منزل مع محلات مبارک بغرض زیارت تشریف لائے ایک دیوانہ نے نواب صاحب پر قرابین کے فیر کا قصد کیا مگر گرفتار ہوگیا اور ہاتھی کے پاؤں سے بندھواکر مروا یا گیا۔

عاشور خانہ وقف برائے نواباں کلیان: نواب صاحبانِ کلیان نے ایک بارہ دری کے علاوہ کئی چھوٹے مکانات اور ایک مسجد تعمیر کرائی ایک عاشور خانہ بھی ہے سنہ تعمیر تختۂ چوبی پر نمایاں حرفوں میں ۱۲۰۵ھ کندہ ہے یہ جملہ عمارتیں تالاب میر جملہ کے روبرو واقع ہیں۔

حسین ساگر سلطان ابراہیم قطب شاہ کے عہد میں زیر اہتمام حسین شاہ ولی ۹۶۵ھ میں نو لاکھ ہن یا سات لاکھ روپیہ میں تیار ہوا اور مہتمم کے نام سے موسوم ہوا۔ درگاہ حسین شاہ ولی کی قبر بیچ سے ایک نالہ گذر کر اس تالاب میں گرتا ہے یہ نالہ ۱۲۷۲ھ میں سالار جنگ اعظم

نے کھدوانا شروع کیا سنہ ۱۲۷۰ء کو اس کے ذریعہ رود موسیٰ کا پانی تالاب میں جانا شروع ہوا
تیاری میں ۷۰۰۰۰ ہزار روپیہ صرف ہوا۔ ۱۲۹۹ء بکثرت بارش ہو کر کوتوالی کے ناکہ کے
قریب بند ٹوٹ گیا تو چوبی پل زیر تالاب اس وقت بنایا گیا تھا ۱۳۲۶ء کی بکثرت بارش سے
چادر کی زور سے وہ ٹوٹ گیا اب سنگ بستہ کمانیں تیار ہوئی ہیں رزیڈنسی میں جب آبرسانی
کا کام شروع ہوا اُس وقت اس تالاب سے اولاً ۱۳۰۹ء میں ٹیپو خان کی مسجد میں نل پہونچایا گیا
پھر حویلی قدیم و دارالشفا تک اس کو وسعت دی گئی اس آبرسانی کے کام کے لئے سرکار عالی کا
۲۰۰ ۱۵ ۴ روپیہ صرف ہوا۔

تالاب میر جملہ: بعہد سلطان ابوالحسن تاناشاہ میر جملہ نے سنہ ۱۰۶۰ء میں تیار کروایا یہ تالاب شہر کے گوشہ جنوب میں واقع ہے صرف بارش کا پانی اس میں جمع ہوتا ہے۔

تالاب میر عالم: یہ تالاب میر ساگر بھی کھدوایا۔ سنہ ۱۲۲۱ء میں سید ابوالقاسم میر عالم مدارالمہام نے زمین خرید کر کے ۲۲ لاکھ روپیہ میں بنوایا یہ وہ روپیہ ہے جو سرنگاپٹن پر ٹیپو سلطان کے مقابلہ میں فتح حاصل کرنے پر یہ انعام میں ملا تھا۔ اس کے کانیں یعنی بند جو کمان نما بنایا گیا ہے نہایت مستحکم ہے اس کا سلسلہ حضرت میر مومن کی پہاڑی تک ہے (۱۰۳۷۵۰۰) مکسر گز زمین پر ہے (۱۷۴۸۰۰۰۰) گیلن پانی کا اندازہ کیا گیا ہے پہلے ایک نہر کے ذریعہ حوض وال حوض میں پانی آتا تھا۔ اور وہاں کے پختہ نالیوں کے ذریعہ تقسیم ہوتا تھا اس سے پانی گندا اور بیماری کا خوف لگا رہتا تھا اس لئے سنہ ۱۳۱۴ء (سنہ ۱۸۹۷ء) میں اچھی نل کی خبر کے لئے تجویز ہوئی۔ تالاب کے قریب بڑے بڑے حوض بنائے گئے۔ اس کی تیاری میں ۱۴۷۵۰۰ روپیہ صرف ہوا تالاب میں پانی پہونچانے کے لئے کئی نالے موسیٰ ندی سے لائے گئے۔

بم: یہ بم ایک پہاڑی کے دامن میں اسی تالاب کے قریب رکن الدولہ مدارالمہام عہد نواب نظام علی خان غفراں مآب کا تعمیر کرایا ہوا ہے یہ سنہ ۱۱۸۲ء میں تیار ہوا ہے اس کا پانی اعلیٰ حضرت اور امرائے حیدرآباد استعمال کرتے ہیں بھوشیوں کے ذریعہ آتا ہے سنہ ۱۳۱۷ء میں یہ بم پختہ

بنایا گیا۔ پانی صاف کرنے کے لئے فلٹر لگایا گیا۔ سرکاری پہرہ قائم ہے۔

عملہ ساگر : یا آسمان ساگر ۱۳۰۸ھ میں تیار ہوا نواب آسمان جاہ بہادر نے بصرفہ تیار کروایا اس کے قریب ایک مکان بھی تیار کروائے اس تالاب سے شمشیر گنج اور شاہ علی بنڈہ تک نل پہونچائے گئے ہیں۔

تالاب سرور نگر : پہلے اس کو سنگ راج کا تالاب کہتے تھے مگر جب سرور افزا بائی منکوحہ نواب ارسطو جاہ منیر الملک بہادر مدار المہام نے ۱۲۰۸ھ میں سرور نگر آباد کیا یہ تالاب بھی ان ہی کے نام سے مشہور ہو گیا۔

باغ عامہ : پہلے یہاں بالکشن کا باغ تھا جس میں میوں کے سوا چند قسم کے درخت بھی تھے۔ ۱۲۸۷ھ میں اس باغ کی تیاری شروع ہوئی۔ ربیع الاول ۱۳۱۷ھ میں ایک سنگین چبوترہ بنایا گیا۔ اعلیٰ حضرت نے رعایا کے جانب سے اپنی سالگرہ مبارک میں اڈریس قبول کیا ۱۳۲۱ھ میں جبکہ دربار دہلی سے حضور نے مراجعت فرمائی اس وقت شہر کے ساہوکاروں اور رعایا کے چندہ سے اس کو وسعت دی گئی اور ٹین کا منڈوا چھایا گیا جس میں ... ہزار روپیہ صرف ہوئے ۱۳۲۳ھ میں دربار ہال کی تعمیر ختم ہوئی۔ عام چندہ سے اس پر روپیہ صرف ہوئے اس میں سنہ بہ اہتمام نواب لیاقت جنگ اول تعلقدار نمائش کھولی گئی تین ماہ تک رہی۔ ۱ر شوال ۱۳۲۳ھ کو ٹاؤن ہال کا سنگ بنیاد بھی اعلیٰ حضرت نے رکھا۔ ۱۹۰۶ء میں محل سیف آباد سے بیانڈ اسٹانڈ لاکر نصب کیا گیا صرف ان کی رنگ آمیزی اور نصب کرنے میں ... ۴ ہزار روپیہ صرف ہوا۔

باغ لنگم پلی : سلطان عبد اللہ قطب شاہ نے اس کو اپنی تفریح کے لئے تیار کرایا۔ اس پر ایک لاکھ روپیہ صرف ہوا۔ نواب سکندر جاہ نے اس میں چند عمارتیں تیار کرائیں۔ ۶ر شعبان ۱۲۷۰ھ کو نواب افضل الدولہ بہادر مغفرت مکان نے نواب سر خورشید جاہ کو یہ باغ عنایت فرمایا اس کے حوض میں تالاب سکندر آباد سے پانی آتا ہے۔ اس کی آمدنی دس ہزار کے قریب ہے۔

باغ جہاں نما: نواب شمس الامراء امیر کبیر نے ۱۲۴۳ھ میں بنوایا پہلے میدان تھا سرکار عالی نے خرید کیا گیا ۱۲۴۲ھ میں بڑا مکان اور بازار تیار ہوا تیاری اور آراستگی میں ۱۵ لاکھ کے قریب صرف ہوئے سنہ مذکور میں شمشیر گنج بھی تعمیر ہوا۔ باغ کے قریب نواب آسمان جاہ مرحوم کی باقاعدہ فوج رہتی ہے۔

بشیر باغ: ۱۲۹۷ھ میں نواب آسمان جاہ مرحوم نے حسین ساگر کے قریب حسن بن محسن فرزند معتدم جنگ (جمعدار عرب سے) ۳۲ ہزار میں ایک باغ خریدا اور ۲۰ ہزار میں اطراف کے قطعات مول لیے۔ ان تمام کی درستگی اور تعمیر عمارتوں میں ۴ لاکھ سے زیادہ صرف ہوئے اور کئی لاکھ روپیہ اس کی آرائش میں لگا اس کا نام آپ ہی نے بشیر باغ رکھا۔

فتح میدان کا گھنٹہ گھر: میدان کے متعلق یہ لکھا جاتا ہے کہ جب شہنشاہ اورنگ زیب سلطان ابوالحسن تاناشاہ پر یہاں فتح پائی تو اس کا نام فتح میدان رکھا۔ صدیوں تک ویران اور غیر آباد رہا۔ کئی سال سے اس میں باقاعدہ قواعد ہوتی رہی۔ اور میدان درست کرایا گیا کے صرفہ سے ۱۳۰۱ھ میں بالکل کام ختم کر دیا گیا میدان کے اطراف ۵۰۰ کے صرفہ سے درخت لگائے گئے۔ ۳۰ رجب ۱۳۱۱ھ کو اعلیٰ حضرت نے خود اپنے دست مبارک سے اس کا افتتاح فرمایا۔ گھنٹہ گھر کی بنیاد کا پتھر نواب ظفر جنگ بہادر وزیر افواج نے ۱۷ محرم ۱۳۲۰ھ کو رکھا اور تعمیر میں ۱۹۰۴۱ روپیہ صرف ہوا۔ جشن جوبلی میں بتاریخ ۲۲ شوال ۱۳۲۴ھ بندگان حضور نے اس کا افتتاح فرمایا۔

گھنٹہ گھر چوک: اس کے ساتھ چمن اور مارکٹ کا بھی ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے جہاں اب بازار یعنی مارکٹ ہے پہلے وہاں صاحبزادہ نواب شرف الدولہ بہادر کی حویلی اور چند دکانیں تھیں ماہانہ کرایہ ڈیڑھ سو روپیہ آتا تھا سرسالار جنگ اعظم نے شہر کی درستی اور صفائی کے زمانہ میں اسے لے لیا۔ اس کے عوض اسی قدر ماہوار کا منصب سرکاری جاری کر دیا۔ اس کی تعمیر ۱۲۹۰ھ سے شروع ہو کر ۱۲۹۳ھ میں ختم ہو چکی جہاں اب چمن ہے وہاں ایک غلیظ نالہ تھا

اور دن میں مختلف اقسام کی تجارت یہاں ہوتی تھی مارکٹ کے ساتھ ہی چمن بھی تیار ہوا۔ ہر دو پر ۵۵... روپیہ صرف ہوا۔ چمن میں جانب مشرق کرامت شاہ جمعدار صرف خاص اور اُن کی بیوی کی دو قبور ہیں۔ جمعدار صاحب کا انتقال جمادی الاول ۱۲۷۳ھ میں ہوا۔ نواب آسمان جاہ نے ضرور تاً ایک گھنٹہ گھر کی تجویز کی ۱۳۰۸ھ سے اس کا کام شروع ہوا۔ ۱۳۱۰ھ میں کام ختم ہو کر ماہ صیام میں گھڑی لگادی گئی۔

گھنٹہ گھر ریزیڈنسی: ۱۲۸۵ھ میں ہسپتال کے روبرو تعمیر ہوا۔ گھڑی نصب ہونے کی تاریخ معلوم نہیں۔ ان کے سوا شاہ پور روڈ پر بھی ایک بڑی گھڑی لگی ہوئی ہے نواب فخر الملک بہادر کی دیوڑھی پر بھی ایک بڑی گھڑی لگی ہوئی ہے اور نواب سرور الملک بہادر کی دیوڑھی واقع جھنگل گوڑہ پر بھی ایک بڑی گھڑی لگی ہوئی ہے۔

سرائے میاں مشک: یہ شخص قطب شاہی خواجہ سراؤں سے تھا اُس نے قدیم پل دکاروان سلطان کے درمیان ایک سرائے اور مسجد بنائی ہر دو کی تعمیر ۱۰۳۲ھ میں ختم ہوئی سن دروازہ پر کندہ ہے اس کا مقبرہ بھی اسی میں ہے میاں مشک نے عطاپور میں مشک محل کے نام سے ایک محل بھی تعمیر کرایا جو اب بھی موجود ہے۔

سرائے بواہیر: یہ قطب شاہوں کی تعمیرات سے ہے نواب میر نظام علیخان بہادر جب بندر سورت سے حیدرآباد آئے تو بواہیر ہی آپ کے ہمراہ تھے انہوں نے اسی جگہ قیام کیا اُس وقت سے یہ سرائے بواہیر مشہور رہے اور یہی لوگ رہتے ہیں کوئی مسافر نہیں ٹھہرتے۔

کبوتر خانہ: ۱۳۱۷ھ میں کبوتر خانہ جدید شاہی جو مکہ مسجد کے شمالی دروازہ کے مقابلہ میں واقع تھا وہ نواب سلطان نواز جنگ بہادر کے مکان کی تعمیر کے لئے توڑ دیا گیا۔

کمان شیخ فیض: بیرون یاقوت پورہ ۱۲۷۶ھ میں تعمیر ہوئی تھی اسی سال میں اس کے قریب مسجد نعل محمد بھی تیار ہوئی۔ کمان درمیان سے ترق گئی تھی مخدوش حالت تھی بایں وجہ ماہ رجب ۱۳۳۶ھ کو منہدم کر کے اسی جگہ محکمہ صفائی سے دوسری کمان تیار کرائی گئی۔

جناب محمد اسمٰعیل خاں، ایم اے

حضرت آصفجاہ اوّل کا انتظامِ مملکت

حضرت آصفجاہ اول کے انتظامِ مملکت کا خاکہ پیش کرنے سے قبل خود اس بزرگ ہستی کا مختصر حال لکھنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا جس کی فتوحات سے تاریخِ دکن کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے۔

حضرت آصف جاہ اول کا تعلق ذی رتبہ و ذی احترام خاندان سے ہے آپ کا سلسلۂ نسب جدِ پدری حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالےٰ عنہ سے جا ملتا ہے آپ کے جد بزرگوار قلیچ خان خواجہ عابد جو شہر بخارا میں منصبِ قضاوت اور عہدہ شیخ الاسلام پر مامور تھے اور عہدِ شاہ جہاں میں وارد ہندوستان ہوئے اور عہدہ ہائے جلیلہ سے سرفراز ہوئے عہدِ عالمگیر میں خدمت صدارت کل ان کے تفویض ہوئی اور بعد ازاں خطاب قلیچ خاں کے ساتھ منصب پنج ہزاری عطا ہوئی۔ ۱۶۸۶ء میں عالمگیر نے دکن پر چڑھائی کی اور قلعہ گولکنڈہ کا محاصرہ کیا اس لڑائی میں عابد خاں توپ کے گولہ کے زخم سے جاں بحق ہوئے۔ عابد خاں کے راہیِ عدم ہونے کے بعد ان کے فرزند میر شہاب الدین کارہائے نمایاں کے صلہ میں عالی رتبہ پر پہنچے اور شہنشاہ عالمگیر نے ان کی حوصلہ افزائی کی اور غازی الدین خاں کو فیروز جنگ کے خطاب سے سرفراز کیا۔

فیروز جنگ بہادر کے خلفِ ارجمند حضرت آصف جاہ اول ہیں آپ کا اصل نام میر قمر الدین خاں تھا، سالِ میلاد ۱۰۸۲ھ اور تاریخ ولادت نیک بخت ہے تقریباً بیس سال کی عمر میں مورد الطاف شاہانہ ہوئے اور خطاب چین قلیچ خان کے ساتھ بیجاپور کی حکومت سرفراز ہوئی۔ عالمگیر کے بیٹا اعظم شاہ

نے چیچ قلیچ خاں کے اعزاز و منصب میں اضافہ کیا اور خطاب خان دوران و منصب ششش ہزاری عطا کی ساتھ ہی ساتھ حکومت برہان پور پر مامور کئے گئے۔

جب بہادر شاہ تخت سلطنت پر متمکن ہوا تو خان دوران صوبہ داری اودھ اور فوجداری لکھنو سے سرفراز ہوئے۔ لیکن جب امرائے عہد کا ستارہ عروج پر دیکھا اور سلطنت میں بدنظمی پھیلنے لگی تو آپ شاہی ملازمت سے دست بردار ہوگئے اور عزلت نشینی اختیار کی۔

بہادر شاہ کے بعد جہاندار شاہ نے حکومت کی باگ ہاتھ میں لی اور خان دوران کو مجبور کیا کہ گوشہ نشینی ترک کریں مگر زمانے نے جہاندار شاہ کا ساتھ نہ دیا اور عمر نے وفا نہ کی۔ فرخ سیر نے مسند حکومت پر جلوہ گر ہوتے ہی خان دوران کو خطاب نظام الملک بہادر فتح جنگ سے سرفراز کیا اور صوبہ داری دکن و کرناٹک پر مامور کیا۔ چند سال کے بعد صوبہ داری دکن امیر الامراء حسین علیخان کے سپرد ہوئی اور نظام الملک بہادر مراد آباد کے حاکم مقرر ہوئے لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں کچھ ایسی تبدیلیاں ظہور میں آئیں کہ سلطنت کا شیرازہ درہم برہم ہوگیا اور محمد شاہ تخت دہلی پر متمکن ہوا اس تبدیلی کے ساتھ مالوہ کی حکومت نظام الملک کے تفویض ہوئی جس کو آپ نے نہایت مستعدی سے انجام دیا۔ نظام الملک بہادر کے ان سارے کارناموں کو دیکھ کر دوسرے اعیان و ارکان سلطنت کے سینے آتش رشک و حسد سے بھڑکنے لگے۔

آپ نے جب دیکھا کہ امرائے پایہ تخت کا ارکان سلطنت کے ساتھ نفاق بڑھ رہا ہے اور امیر الامراء وغیرہ کا اثر روز بروز ترقی پذیر ہے تو تسخیر دکن کی جانب توجہ کی اور دریائے نربدا عبور کرکے قلعہ امیر پر چڑھائی کی۔ قلعہ امیر اور برہان پور نہایت آسانی اور حکمت عملی سے فتح کئے امیر الامراء نے اس فتح کی خبر سنتے ہی سید دلاور خاں بخشی کو ایک لشکر جرار کے ساتھ نظام الملک بہادر کے مقابلہ کے لئے روانہ کیا۔ لیکن حکومت دکن تو خانوادہ آصفیہ سے زینت بخش ہونے کی منتظر تھی۔ دشمن کو فاش شکست ہوئی۔ اور دلاور خاں بخشی قتل ہوا ابھی اس جنگ سے نظام الملک بہادر نے فراغت نہیں پائی تھی کہ سید عالم علیخاں ہمشیرزادہ امیر الامراء اورنگ آباد سے یلغار کرتے ہوئے

حملہ آور ہوا۔ دونوں فوجوں کے درمیان سخت گھمسان لڑائی ہوئی۔ اور عالم علیخاں کو سخت ہزیمت ہوئی۔ لشکر مظفر خوشی کے شادیانے بجاتے ہوئے اورنگ آباد میں داخل ہوا۔

امیر الامرا حسن علیخاں اور قطب الملک کو بادشاہ کے مزاج میں بڑا دخل تھا۔ اور دونوں بھائی نظام الملک بہادر سے صفائی نہیں رکھتے تھے بلکہ آپ کی ترقی میں سد راہ ہوتے تھے۔ بالآخر انتشار میں دونوں بھائی قتل ہوئے۔ اور ان کے قتل کے ساتھ ان کے فتنہ و فساد کا بھی خاتمہ ہوا۔ محمد امین خاں اعتماد الدولہ منصب ہشت ہزاری ذات و ہشت ہزار سوار و خلعت وزارت سے سرفراز کئے گئے لیکن عمر نے وفا نہ کی۔ اور پہلے ہی سال عالم بقا کی راہ لی۔ جب عہدہ وزارت کا گران بوجھ اٹھانے کے قابل نہ رہا تو محمد شاہ نے اس عہدہ جلیل القدر پر نظام الملک بہادر کو مامور کیا حکومت دکن کو برقرار رکھتے ہوئے آپ نے اس خدمت کو قبول کیا اور سلطنت کو اسی شان و شوکت اور درجہ پر لانا چاہا جیسا کہ عہد شاہ جہاں اور اورنگ زیب میں اس کو درجہ امتیاز حاصل تھا۔

آپ نے حکومت دکن پر معتمد الدولہ کو اپنا قائم مقام مقرر کیا۔ اور خود دار السلطنت کی راہ لی۔ دہلی پہونچتے ہی حکومت کی گتھیاں سلجھانے کی تدابیر اختیار کیں لیکن امرا و اعیان سلطنت اپنے ذاتی اغراض و مقاصد کو آپ کی موجودگی کے سبب پورا نہیں کر سکتے تھے محمد شاہ کو آپ سے صدق دل ہی نہیں کیا بلکہ آپ کی خرابی کے درپے ہوگئے۔ اس دوران میں حیدر قلی خاں ناظم گجرات نے علم بغاوت بلند کیا۔ بادشاہ نے اس موقع کو غنیمت جان کر نظام الملک بہادر کو اس کی تادیب کے لئے مقرر کیا۔ وزارت و صوبہ داری دکن کے علاوہ صوبہ داری مالوہ و گجرات بھی آپ کے تفویض کی گئی۔ جب دربار اور بادشاہ کا یہ رنگ دیکھا تو مراد آباد جانے کے حیلہ سے بادشاہ سے رخصت حاصل کی اور دکن کا عزم کیا۔

اس اثناء میں صوبہ داری دکن پر عماد الملک بہادر مامور ہو چکے تھے۔ عماد الملک کا لشکر جرار آگے بڑھا اور نظام الملک کی فوج کے سیلاب کو روکنا چاہا ۱۱۳۷ھ میں بمقام شکر کھیڑا دونوں فوجوں کے درمیان جنگ عظیم ہوئی جس میں نظام الملک بہادر کو کامل فتح ہوئی۔ یہ جنگ دکن کی

تاریخ میں نقطۂ انقلاب ہے کیونکہ اس کے بعد ہی دکن میں اہم سیاسی تبدیلی ہوتی ہے۔ نظام الملک اورنگ آباد اور اطراف و جوانب کے علاقوں میں امن و اماں قائم کر کے حیدرآباد کی جانب روانہ ہوئے جب محمد شاہ کو آپ کے دکن پر تسلط پانے کی اطلاع ملی تو اس نے آپ کی دلجوئی اور استمالت کرنے کے لئے ۱۱۳۷ھ میں خطاب آصف جاہ اور منصب ہشت ہزاری ذات و ہشت ہزاری سوار سے سرفراز کیا جنگ شکر کھیڑا کے بعد سے آصف جاہ بہادر کی حیثیت ایک خود مختار فرمانروا کی ہو گئی لیکن آپ نے آخر وقت تک بادشاہ دہلی کی خدمات بجا لانے سے انکار نہیں کیا۔ اور ۱۱۵۰ھ میں بادشاہ کے طلب کرنے پر دہلی تشریف لے گئے۔ بادشاہ نے آپ کی آؤ بھگت کی خلعت فاخرہ عطا فرمایا اور آگرہ و مالوہ کی حکومت کے ساتھ مرہٹوں کی سرکوبی کے لئے مقرر فرمایا۔

آصف جاہ بہادر مرہٹوں کی جانب متوجہ ہوئے اور بھوپال کے اطراف و جوانب میں معرکہ آرا لڑائیاں وقوع پذیر ہوئیں۔ ابھی مرہٹوں کا قلع قمع نہیں ہوا تھا کہ نادرشاہ کی آمد کی خبر گرم ہوئی۔ آپ نے ایسے نازک وقت میں مرہٹوں سے مصالحت کرنا مناسب جانا اور خود جانب دہلی مراجعت فرما ہوئے جب دہلی میں نادرشاہ نے قتل عام شروع کیا تو وثوق کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ آصف جاہ بہادر ہی کی کوشش سے نادرشاہ نے قتل عام کو ملتوی کرنے کا حکم دیا تھا یہ وقت ایسا تھا کہ امرا و اعیان کے علاوہ بادشاہ تک بھی سخت پریشان اور ہراساں تھا۔ نادرشاہ دیگر امراء کی نسبت آصف جاہ سے نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آیا۔ خاطر و مدارات کی اور امیر الامراء کے خطاب سے سرفراز کیا۔

بعض بد اندیشوں اور کوتاہ نظروں نے آصف جاہ بہادر کو جب ان سرگرمیوں میں معروف دیکھا تو ناصر جنگ کو اپنے والد بزرگوار سے منحرف ہونے کی ترغیب دی۔ آصف جاہ بہادر دہلی سے دکن کی جانب روانہ ہوئے تو برہان پور کے قریب ناصر جنگ نے سد راہ ہونے کی سعی بلیغ کی لیکن ناصر جنگ کے لشکر نے ان کا ساتھ نہیں دیا۔ اور دل کے ارمان دل ہی میں رہ گئے۔ آصف جاہ بہادر اطراف و جوانب میں امن و امان قائم کرتے ہوئے شہر اورنگ آباد میں داخل ہوئے اور

استحکام مملکت میں مشغول ہو گئے۔

سنہ ۱۱۵۶ھ میں آصف جاہ بہادر نے تسخیر کرناٹک کا ارادہ کیا اور سب سے پہلے قلعہ ترچناپلی کا محاصرہ کیا ان دنوں یہ قلعہ مرہٹوں کے قبضہ میں تھا۔ آپ نے اس کو نہایت آسانی سے فتح کیا اس فتح کے بعد ملک ارکاٹ کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کو بھی قوم نوائط کے دست تصرف سے آزاد کیا اس ملک کی حکومت پر انور الدین خاں بہادر کو مامور کرنے کے بعد سنہ ۱۱۵۷ھ میں اورنگ آباد کو آپ نے معاودت کی۔

سنہ ۱۱۶۱ھ میں احمد شاہ ابدالی کی آمد کی خبر سرعت سے پھیلنے لگی۔ آصف جاہ بہادر سلطنت مغلیہ کی بقا کو ہمیشہ پیش نظر رکھتے تھے دارالسلطنت کی جانب بڑھے اور سواری ہمایونی مرتبت برہان پور رونق افروز ہوئی تھی کہ محمد شاہ ظفر مند ہونے کی خبر پہونچی۔ لیکن اس کے چند دن بعد ہی محمد شاہ کے انتقال کی دردناک خبر سنی گئی۔ اس اثنا میں آصفجاہ بہادر سخت علیل ہوئے اور ابھی برہان پور ہی میں مضرب خیام آصفی تھا کہ حیدرآباد سے شورش برپا ہونے کی اطلاع ملی۔ اسی حالت میں حیدرآباد کا قصد کیا۔ لیکن راستہ میں ضعف بڑھتا گیا اور آخر ۴ جمادی الثانی سنہ ۱۱۶۱ھ کو جنت کی راہ لی۔

حضرت مغفرت مآب کی ایک برگزیدہ و ممتاز ہستی تھی آپ کا مطمح نظر یہ تھا کہ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ اس کی بقا مقدم ہے اس لئے کہ کاروبار دنیا اسی سے وابستہ ہے کسی کو اس کے انہدام کے درپے نہیں ہونا چاہیئے۔ اسی خیال کو پیش نظر رکھ کر آپ جنگ و جدال میں اقدام نہیں کرتے تھے اور حتی الامکان بغیر جنگ و لڑائی کے معاملات سلجھانے کی فکر کرتے تھے۔ اگر آپ کے دشمن صلح پر آمادہ ہوتے تھے تو آپ ان سے مصالحت کر لیتے تھے سپاہ کے آرام کا ہمیشہ خیال رکھتے تھے اور کبھی کوچ کے وقت چار پانچ کروہ سے زیادہ مقام نہیں کرتے تھے سپاہ کو اپنے کبھی پیدل نہیں ہونے دیتے تھے کسی کی شکایت ہرگز روا نہیں رکھتے تھے اور ایسی شکایت پسند نہیں کرتے تھے جس سے کسی کا نقصان ہو اور اس کے کام میں خلل پڑے۔ فریب و دغا کو نہایت مذموم سمجھتے تھے اور فریب دہندہ سے سخت احتراز کرتے تھے فرماتے تھے کہ بیچارہ آدمی سراسر عاجز است اگر بخود دریافت شود حق سبحانہ تعالے

تعریف می خواہد محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سنت وشیطان معصیت وملک الموت جان وفرزندان نان۔“

قواعد وضوابط کی نہایت پابندی کرتے تھے اور جو آئین مقرر تھے ان کی خلاف ورزی پسند نہیں کرتے تھے چنانچہ چند احکام یہ تھے: “ہیچ سپاہی سپر وشمشیر با تیر وکمان بدست خدمت گار ندہد یا خود دارد وبجز جمعدار صد سوار پالکی ونقارہ وشتری ندارد۔” “وجمعداران قراولان واہل طرب را تاکید بود کہ شمشیر در دست نگیرند۔ بر پالکی وفیل این مردم را صلاح پروانگی سواری نہ بود۔ عرض ومعروض مردم بیمزاج وبے دقت را گوارا نمی کردند۔ در عرض ومعروض مبالغہ را پسند نمی کردند۔“ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہر چھوٹی چیز بھی اقرار وضوابط کے خلاف ناگوار ہوتی تھی۔

حضرت مغفرت مآب کو اپنے اقربا اور برادری کا بہت خیال تھا۔ ان کی کمزوری یا مفلسی سلطنت کے زوال کا باعث سمجھتے تھے آپ کا خیال تھا کہ مفلسی کی حالت میں ایسے لوگوں کے سازش کرنے کا زیادہ احتمال ہوتا ہے اسی خیال کو مدنظر رکھ کر اقربا کو اچھے عہدوں پر مامور کرتے تھے۔ “بر تعلقات عمدہ تا مقدور اقربا را ماموری کردند۔ ومی فرمودند اول خویش بعدہ درویش وہنگام رخصت بہ تعلقہ ہمی دو کلمہ را می گفتند کاری کنند کہ شرمندہ خدا وخلق نباشید۔“

حضرت مغفرت مآب مذہب کے سخت پابند تھے نماز نہایت خشوع وخضوع کے ساتھ پڑھتے تھے۔ علماء ومشائخ کا احترام کرتے تھے۔ ان کو معاش اور جاگیریں عطا کرتے تھے۔ سنت نبویؐ کی پیروی لازماً کرتے تھے۔ احکام شرع کا بہت پاس کرتے تھے اسلام کے سچے پیرو اور دیندار ہونے کے علاوہ کسی کے مذہب سے تعرض نہیں کرتے تھے ہر شخص کو مذہبی آزادی حاصل تھی مذہبی رسوم ادا کرنے اور تہوار وعید منانے میں جو آزادی ایک مسلمان کو حاصل تھی وہی ایک ہندو کو بھی۔ “تاکید بود مردم ہنود در رسم ایام نشاط، خود مثل ہولی ودیوالی واہل اسلام عید ومحرم زیادہ از سہ روز نکنند ومخل اگر در خانہ طبل وہنود مزاحم نمی شدند۔“ امور نظم ونسق حکومت میں ہندو مسلمان دونوں کو حصہ لینے کا یکساں موقع دیا جاتا تھا دیوانی کے اعلیٰ عہدوں پر ہندو مامور کیے جاتے تھے بلکہ ہندوؤں کو ترجیح دی جاتی تھی۔

آپ کے حکومت کا سب سے اعلیٰ عہدہ دیوانی دکن پورن چند کو عطا کیا تھا اور اس کے کام سے نہایت مطمئن تھے، فرماتے تھے کہ "پورن چند را دیوان کردہ بیفکر شدیم" و پورن چند دیوان دکن کہ کہتری است ونوبت رلم پیشکار خان سامانے است سرکار ما را رونق داد و بدیانت بسر آمد و مثل آدم بہم رسیدن دشوار است، مرہٹوں کی دلجوئی کرتے تھے اور کبھی ان سے بدسلوکی نہیں کرتے تھے چنانچہ صاحب دربار رسالہ آصفیہ لکھتا ہے کہ "وقتی مصاحبش بہ نواب مغفرت عرض کرد کہ ایں ہمہ افواج مرہٹہ نزد لشکر فیروزی دائرہ دارد و ہمہ دزد و رہزن و مفسد اند و وقت جنگ ہیچ بکار نمی آید۔ اینہا را جاگیر دادند و پرداخت اینہا کردن از چہ حکمت است اما گر فوج قاہرہ و ترتیب باید۔ نواب فرمود اگر چہ ایں معنی نصب العین است اما در فراہم داشتن اینہا در اطراف صوبہجات فوائد چند ملحوظ دارم۔ اینہا ملک را خوب آبادی کنند۔ ہمہ دہقانے و مزارع پیشہ اند قدر زراعت خوب می دانند از حفاظت اینہا مخالف یکایک دخل می یابد و آخر اراہی در ملک ما ودنی دہند جمیع مایہ فساد را ہمراہ ما بودہ سفر دور و دراز می کنند و ملک ما از مفسدہ اینہا محفوظ ماند"

عہدہ داران اور ملازمین پر حضرت مغفرت مآب کے الطاف و عنایات کا ایسا گراں بوجھ تھا کہ کوئی حلقہ اطاعت سے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھاتا تھا۔ سر کٹانا اور خون بہانے کو وہ تیار رہتے تھے آپ نے ایسی تدابیر اختیار کی تھیں اور ایسے اصول کے پابند تھے کہ ملک راہ ترقی پر گامزن تھا فرماتے تھے کہ "سبب ظہور آفات در سلطنت سلطان زماں چہار امور است (۱) بیخبری پادشاہ از نیک و بد حالات خلق خدا (۲) مرتکب بودن بشرارت علی الدوام (۳) محبت یکدیگر امراء کہ باہم از افراط درگزرد (۴) زر دادن بارازل قوم۔"

قاعدہ ہے کہ جب کوئی عہدہ دار اپنی خدمت سے معزول کیا جاتا ہے تو اس کو کوئی دوسری خدمت پر مامور نہیں کیا جاتا لیکن حضرت مغفرت مآب جب کسی عہدہ دار کو معزول کرتے تھے تو ساتھ ہی اس کو دوسری خدمت پر مامور کر دیتے تھے جو شخص جس کام کا اہل ہوتا تھا وہی کام اس کے سپرد کرتے تھے۔ اہل علم کی قدر کرتے تھے کسی عہدہ دار کو زیادہ مدت تک ایک خدمت پر نہیں رکھتے تھے اور

باری باری سے ہر ایک کو خدمات بجالانے کا موقع عطا کرتے تھے ایک ہی شخص کو دو خدمات یا تعلقات پر مامور نہیں کرتے تھے "یک کس را دو تعلقہ نمی دادند می فرمودند کہ روئے زمین حصہ ہر کدام است آسیا بنوبت می گردد و از تقسیم تعلقہ مردم بسیار روزی می یابند و توسیع رزق می شود۔ امور سلطنت میں کسی کی مداخلت یا کسی کی سفارش ناگوار خاطر ہوتی تھی رعایا اور ملازمین کے حقوق کا بہت پاس کرتے تھے عہدہ داران کو تاکید تھی کہ کسی کے حقوق زائل نہ ہوں۔ "در ایامیکہ راجہ چندر سین رواؤ رہنمائی تعلقہ دیگر مرہٹہ بجاگیری سرفرازی یافتند بہر کدام روبرو ارشاد شد جاگیر است کہ بشما دادہ ایم۔ آن آنست زر یکہ در سرکار داخل می شود بعد وضع ہمہ حقوق حقداران زمینداری و انعام مردم ائمہ داران و روزینہ داران و دیگر رسوم معمولہ قدیم و جدید است ہمارا کہ محبہ حقوق حق داران نباید بود و اصلا نالش این جماعہ مذکور در حضور نباید۔

عہدہ داروں اور ملازمین کو رشوت اور تحفہ و تحائف لینے سے منع کرتے تھے اور اگر کوئی اس حکم کے خلاف کرتا تھا تو اس کو سخت سزا دیتے تھے۔

فراستانی وجہ داران و غیرہ حضور را عرض بیگی تاکید می کرد کہ برائے عیدی بجا نہ کسے نرفتہ باشند و فرمودہ کہ نوکر ما کہ بتقریب عید گدائی کند او را از نوکری جواب است۔

حضرت مغفرت مآب جب اس دار فانی سے رخصت ہونے لگے تو آپ نے ناصر جنگ کو طلب کر کے وصایا کئے جن میں سے چند ذیل میں نقل کئے جاتے ہیں ان سے وہ اصول ظاہر ہوتے ہیں جن پر آپ خود کار بند تھے۔

(۱) بر نفس رئیس لازم است کہ سلامتی نفس دائمی از جنگ و جدل و افزائش و آبادی ملک خود خواستہ باشد باید کہ با مرہٹہ کہ زمینداران این ملک اند آشتی دارد تا مقدور از خود سر رشتہ آشتی را بہم نزند در صورت لاچاری ناچار است۔

(۲) انہدام بنی آدم کہ بنیاد او بساختہ رب العالمین است۔ البتہ تامل بکار برد قتل نفوس بشتہ گندم و جوار نیست کہ در ہر سال از کشتکار رویند مگر مجرم را بہ قاضی کہ متحمل این امر خطیر است

تفویض نماید کہ او مطابق حکم شرع شریف ہر چہ امر کند بجا آرد و از خود حکم قتل نہ کند۔

(۳) زندگانی خود در انتظام امور ممالک سفر را مقدم داند لذت منزل بقیۂ آب نواز دست نخواہد کہ حق سبحانہ تعالیٰ در کلام مجید فرمودہ است فسیروا فی الارض اشارت است از اینجا بسے سفر و انتظام ما ست در جہان گردی است اگرچہ تقاضہ بر قدر ایام جیب ہاؤنی ضرور است کہ جمیع جانداران و انسان لاعلاج درین ایام تکلیف میشود تعینات سپاہ ہم باوطان آنہا منظور باشد کہ قطع نسل نشود۔

(۴) زمین و آسمان از قدیم است و خلق خدا ہم از قدیم پس درین صورت روئے زمین را فقط حصہ خود نہ دانستہ اتلاف حق کسے نہ کند و پاس موروث ملحوظ می داشتہ باشد۔

(۵) سزاوار آنست کہ خبرگیری خاندان و مامور نمودن مردم بکارہائے لایق سرکار خود نوبت بنوبت چہ از فرقۂ اہل اسلام و چہ از فریق ہنود بتبدیل آن سال بہ سال نہایت دو سال از جملہ واجبات دانستہ می نمودہ باشند کہ دیگران محروم نمانند۔

(۶) ادنیٰ را بکار عمدہ عمدہ را بکار ادنیٰ مامور نسازد کہ نارسائی این و بے اعتنائی آں کار را بتعویق می سازد۔

(۷) بشناسد کہ بنای دولت ما بمیامن انفاس بزرگان راست چنانچہ در ابتدای تعلقہ پادشاہی صد لست بایں خاندان تعلق داشت و من تا ایں وقت کہ زمان سلطنت است توقیر و تعظیم آنہا کہ بدون آن شکر و عنایہا کار نمی آید از ہمہ امور دنیوی مقدم و بر سائر امورات اعظم دانستہ استمداد ہمت از غربا و فقرا کہ باب اللہ اند می کردم سیقت در سلام کہ سنت محمدی است بجای آوردم باید کہ ہمیں شیوہ را بر خود فرض میداشتہ باشند۔

حضرت غفران مآب کے مملکت دکن پر تسلط پانے سے قبل اس کے چھ صوبے تھے ہر صوبہ پر ایک صوبہ دار حکمراں تھا اور وہ اپنے کو بادشاہ تصور کرتا تھا جب عالمگیر نے دکن پر چڑھائی کی اور اس ملک کو فتح کیا تو علیحدہ علیحدہ صوبہ دار مقرر نہیں کیئے بلکہ ایک ہی صوبہ دار مامور کیا۔ چنانچہ تو حضرت غفران مآب نے دکن پر بحیثیت صوبہ دار حکومت کی لیکن جنگ شکر کھیڑا کے بعد صوبہ جات

دکن سلطنت مغلیہ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے اور سیاسی نقطۂ نظر سے آپ کو تخت دہلی سے کوئی تعلق نہ رہا آپ نے نظام حکومت میں کوئی اہم تبدیلی نہیں کی اور وہی انتظام و آئین برقرار رکھے جو پہلے قائم تھے طرز حکومت نہ بدلنے کی دو وجوہ تھے۔ (۱) جنگ و جدال فتنہ و فساد کے رفع کرنے تخت دہلی کے سنبھالنے اور مغلیہ سلطنت کو دوبارہ عروج پر لانے کا جوش ان امور میں آپ کو ایسے منہمک رہے کہ کسی دوسری جانب خیال کرنے کا موقعہ نہیں ملا۔ (۲) اگر آپ یکایک نظام حکومت بدل دیتے یا اس میں کوئی رد و بدل کرتے تو سلطنت کا شیرازہ درہم برہم ہو جاتا اس لیے کہ اس زمانہ میں جو طرز حکومت قائم تھا اور آئین مقرر تھے۔ لوگ اس سے آشنا تھے اگر ایک نیا انتظام ان کے سامنے پیش کیا جاتا اور اس پر عمل پیرا ہونے کے لئے مجبور کیا جاتا تو ضرور وہ ایسے انتظام سے گھبراتے ہی نہیں بلکہ آپ سے بددل ہو جاتے اور آپ کو قدم جمانے نہیں دیتے۔ البتہ جن اصول کو ایک مدبر سیاست داں اور فرمانروا کو پیش نظر رکھنا اور ان پر کاربند ہونا چاہیئے ان پر آپ عمل کرتے تھے۔ ان کا ذکر اوپر آ چکا ہے اور جن امور کو انتظام مملکت میں ملحوظ رکھنا چاہیئے ان کو آپ نے ملحوظ رکھا تھا ان کا ذکر آگے آتا ہے۔

حکومت کی کل حضرت مغفرت مآب کے ہاتھ میں تھی اور انتظام امور مملکت کے لئے حسب ذیل اعلیٰ عہدہ دار مقرر تھے۔

(۱) وزیر انتظام مالگزاری اور خزانہ سرکار اس کے تحت تھا۔

(۲) بخشی الممالک یا میر بخشی تقسیم تنخواہ افواج وغیرہ محاسبی اس کے سپرد تھا۔

(۳) خانساماں

(۴) قاضی القضات محکمہ عدالت اس کے تفویض تھا۔

(۵) صدر الصدور معاش ہائے خدمات مذہبی و مشائخ و دعا گویان وغیرہ کی نگرانی اس کے ذمہ تھی۔

(۶) محتسب رعایا کو شرعی ممنوعات سے باز رکھنا اور ان کے اخلاق کی اصلاح ان کے تفویض تھی۔

(۷) میر آتش، توپ خانہ کا صدر تھا

(۸) داروغہ ڈاک اور اخبار رسانی کا انتظام اس سے متعلق تھا

عہدہ وزارت وزیر اور دیوان دکن کوئی علیحدہ علیحدہ عہدے نہ تھے درحقیقت وزیر ہی دیوان دکن کہلاتا تھا اور دیوان ہی کالقب وزیر تھا رتبہ کے لحاظ سے حضرت مغفرت مآب کے بعد وزیر ہی کا درجہ تھا اور عہدہ داران حکومت کے فرمانروا تک پہونچنے کا ایک واسطہ تھا۔ یوں تو خزانہ سرکار اور انتظام مالگذاری اسی کے ذمہ تھا لیکن تمام امور سلطنت اسی کی وساطت رائے اور مشورے سے انجام پاتے تھے تقریبا حکومت کے کل شعبے اسی کے زیر نگرانی تھے حتی کہ بعض موقعوں پر فوجی خدمات بجا لانے اور میدان جنگ میں سپہ سالار کے فرائض اس کو انجام دینے پڑتے تھے حسب ذیل امور وزیر کے فرائض میں داخل تھے (۱) عہدہ داران مال و دیوانی وزیر کے توسط صوبجات پر مامور اور متعین کئے جاتے تھے (۲) صوبجات کے دیوان اس کے ماتحت تھے اور ان پر خاص نگرانی کی جاتی تھی۔ (۳) وزیر کی مہر اور دستخط سے احکام و اسناد جاری ہوتی تھیں حتی کہ حضور زبانی جو احکام شرف صدور لاتے تھے ان پر بھی اس کی مہر اور دستخط لازمی تھے (۴) فرمان حسب الحکم وزیر اپنے قلم سے لکھتا اور جاری کرتا تھا۔ (۵) حضور میں عطائے جاگیرات اور تنخواہ سے متعلق تجاویز وزیر پیش کرتا تھا اور ان سے متعلق احکام بھی اسی کے توسط سے جاری ہوتے تھے۔ (۶) بعض امور سلطنت میں وزیر کو رائے دینے کا اختیار حاصل نہ تھا اور اس کا یہ فریضہ تھا کہ ملاحظہ اقدس میں ان کو پیش کر دے۔ (۷) اسناد اور دفتری کاغذات ملاحظہ کے بعد دفتر دیوانی میں محفوظ کیئے جاتے تھے (۸) ہر صیغہ کے افراد جمع و خرچ اسی کے ملاحظہ میں پیش ہوتے تھے اور ان کی وہ تنقیح کرتا تھا۔ (۹) آمدنی و خرچ کا حساب و کتاب دفتر دیوانی میں تفصیل کے ساتھ رکھا جاتا تھا اور روزانہ جمع و خرچ کے کاغذات خود دیوان حضور کو ان کا خلاصہ پڑھ کر سناتا تھا۔ وزیر کے ماتحت دو دیوان تھے دیوان خالصہ اور دیوان تن یہ دونوں علیحدہ علیحدہ فرائض انجام دیتے تھے۔

اس دیوان کے توسط سے حسب ذیل عہدہ داران صوبہ جات کی

دیوانِ خالصہ : تعیناتی عمل میں آتی تھی۔

صوبیدار، فوجدار، عہدہ داران دیوانی، امین، فوطہ دار، متصدی، مشرف، خزانہ دار، امین بقایاز مینداری عہدہ دار مطالبہ وغیرہ۔

حسب ذیل امور اس کے فرائض میں داخل تھے :۔

(۱) تقرر ملازمین کے متعلق اسناد جاری کرتا تھا

(۲) اجرائی تنخواہ، تنخواہ داران کے متعلق پرگنہ جات کے نام پروانے کرتا تھا۔

(۳) مطالبات سرکار ادائی تنخواہ اہل خدمات و ادائی حق فوطہ دار کے متعلق پروانے جاری کرتا تھا

(۴) خزانہ سرکار میں ارسال رقم کے لیے پرگنہ جات کے نام احکام نافذ کرتا تھا۔

(۵) عمال وغیرہ کے امور مستفسرہ کا جواب ادا کرتا تھا

(۶) ملازمین کے متعلق جو شکایات ہوتی تھیں ان کی دریافت کرتا تھا

(۷) حسب الحکم خطوط خود لکھتا تھا۔

(۸) فرمالبیات سرکاری کی ادائی رقم کے متعلق پروانے جاری کرتا تھا۔

(۹) ادائی تنخواہ ملازمین کے لئے متصدیان خزانہ کے نام "دستک" جاری کرتا تھا۔

(۱۰) خانسامان و میر بخشی کے پاس سیاہے احکام بھیجتا تھا۔

(۱۱) آمدنی خالصہ کی تنقیح و تصحیح کرتا تھا ملازمین فوج اور ملازمین ہمراہی سرکار کی برآورد ات طلب تنخواہیں ان کے دفتر میں مرتب ہوتی تھیں۔

ان فرائض کو انجام دینے کے علاوہ عمال و ملازمین دیوانی جو رپورٹ یا اخبار ارسال کرتے تھے ان کا خلاصہ حضور میں پیش کرتا تھا اور بارگاہ اقدس میں بعض دفتری کاغذات کے خلاصے پڑھ کر سناتا تھا اور جن کاغذات کو وہ اہم نہیں سمجھتا تھا ان کو نظر انداز کر دیتا تھا۔ اکثر و بیشتر زمینداران کے حالات اور رقم عشرہ کی رپورٹ حضور میں پیش کرتا تھا۔

حسب ذیل اس کے فرائض تھے

دیوانِ تن : (۱) جاگیرداراں تنخواہ داراں وحقوق زمینداراں کے امور سے جو کاغذات متعلق ہوتے تھے ان کو حضور میں پیش کرتا تھا۔

(۲) آوارجہ پرگنہ جات۔ توجیہ جاگیرداراں اور مدارج منصبداراں کے کاغذات ملاحظۂ اقدس میں پیش کرتا تھا۔

(۳) تنخواہ۔ تنخواہ جاگیر و تنخواہ عملہ و فعلہ کے متعلق پروانہ جات اس کے توسط سے جاری ہوتے تھے۔

(۴) اسیاہہ جاگیر اور تنخواہ و معاش کے تختہ جات پر اس کے دستخط لازمی تھے۔

(۵) تنخواہ داران کے نام دستک جاری کرتا تھا اور اخراجات کے کاغذات اس کے دستخط سے مزین کیئے جاتے تھے۔

(۶) عملہ و فعلہ کی تنخواہ اس کے حکم سے ایصال کی جاتی تھی۔

(۷) منصبداران سے متعلق کاغذات بارگاہ اقدس میں منظوری کے لئے پیش کرتا تھا۔

(۸) منشی خانہ اس کے زیر نگرانی تھا اور منشی خانہ میں فرامین بموجب ارشاد عالی و ٹیلوجات "حسب الحکم" لکھے جاتے تھے۔

فرمانروائے دکن کی جانب سے صوبہ جات پر صوبہ دار مقرر تھے۔ صوبہ دار ناظم بھی کہلاتا تھا۔ صوبہ دار کے اہم فرائض یہ تھے۔ امن وامان قائم رکھنا۔ فلاح و بہبودی رعایا کے اسباب مہیا کرنا۔ وصول مالگزاری پر خاص نگرانی کرنا اور حضور کے احکام کی بسر وچشم تعمیل کرنا ہر صوبیدار کو تاکید کی جاتی تھی کہ حتی الامکان رعایا کی خوشنودی ملحوظ رکھے۔ اگر کسی پر ظلم ہوتا ہے تو ظالم کو سزا دے باقی زمیندار کو معقول سزا دے منصبداران مستحق کی حضور میں سفارش کرے اس لئے کہ حضور سفارش کا لحاظ کرتے تھے۔ مہینہ میں دو مرتبہ بذریعہ ڈاک چوکی عریضے ارسال کرے اور اپنے صوبہ کے تمام حالات کا انکشاف کرے راہزنوں اور مجرموں کو سزا دے قاضیوں اور علماء کی عزت کرے۔ فقراء کی مدد کرے اور ان کے ساتھ نیک برتاؤ کرے۔ باجگزاروں سے خراج وصول کرنے اور دارالسلطنت کو بہ کمال

حفاظت روانہ کرے۔

بلحاظ مدارج صوبہ دار کے بعد دیوان صوبہ کا رتبہ تھا دیوان دکن اس کا انتخاب کرتا تھا اور حضرت مغفرت مآب کے حکم سے اس کا تقرر عمل میں آتا تھا۔ دیوان دکن کے احکام کے بموجب اس کو عمل کرنا پڑتا تھا اس کو تاکید کی جاتی تھی کہ دیانت دار عمال اور امناء کا تقرر کرے۔ آمدنی میں اضافہ کرنے کے ذرائع اختیار کرے اور ملازمین پر کافی نگرانی رکھے اور خزانہ کی حفاظت کا معقول انتظام رکھے مالگزاری وصول کرنے والا عہدہ دار کروڑگیری یا تحصیل دار کہلاتا تھا اس کے فرائض یہ تھے کہ اپنے علاقہ کی حد تک جوان مامور کرے جو جوان سہ بندی کہلاتے ہیں اور مالگزاری وصول کرے جو الحق کی شکایت نہیں کی جاتی ہے، اس پر کوئی محصول عاید نہ کرے۔ فصل بہ فصل مالگزاری وصول کرے۔ اور فوطہ دار کے حوالہ کر دے حسب علاوہ جمع و خرچ کے کاغذات مرتب کرے اور دفتر متعلقہ میں داخل کرے اس کو تاکید کی جاتی تھی کہ رشوت لینے سے پرہیز کرے اور کاشتکاروں سے مقررہ زرلگان سے زیادہ طلب نہ کرے اگر اس حکم کی وہ خلاف ورزی کرتا تھا تو اس کو خدمت سے علیحدہ کر دیا جاتا تھا۔

امین و قانون گو یہ دونوں عہدہ دار وصول مالگزاری میں مدد دیتے تھے۔ امین کو ضابطہ قانون سے بخوبی واقف رہنا لازمی تھا اور اس کا فریضہ یہ تھا کہ بموجب قاعدہ و قانون زرلگان مشخص کرے دیہات اور قصبات کے حالات دریافت کرے اور اپنے علاقہ کا دورہ کرے۔ اراضی قابل کاشت پر خاص نگرانی رکھے کاشت کاروں کو تقاوی تقسیم کرے۔ اور تحصیلداروں کو ہدایت کرے کہ ان سے اقساط تقاوی برابر وصول کرتا رہے قانون گو وہ عہدہ دار تھا جس کو قانون و قت سے واقفیت، قواعد و ضوابط، مہارت اور اراضی کے حالات وغیرہ کو جاننا اس کا اہم فرض تھا اس کے ذمہ یہ کام تھا کہ جائیداد ہائے اراضی کے متعلق جہاں تک بھی ہو معلومات حاصل کرے۔ آمدنی رقبہ اور اقسام اراضی کے متعلق کتابچہ مرتب کرے اور بند و بست اراضی کے وقت مدد کرے اس کے ہی کاغذات مرتب و محفوظ کردہ پر تقسیم اراضی اور موازنہ کا انحصار تھا۔ دفتر دار دیسمکھ اور دیسپانڈیہ ان تینوں کا شمار اہل خدمات میں تھا اور روز مینہ دار بھی

بھی کہلاتے تھے۔ دیوانی کا حساب وکتاب ان سے متعلق تھا۔

خانساماں:۔ اخراجات سرکار و خانوادہ شاہی کا حساب وکتاب اس عہدہ دار سے متعلق تھا حسب ذیل اس کے فرائض تھے۔

(۱) عملہ و فعلیہ کی تنخواہ کی بر آوردات پیش ہونے پر ان کی منظوری صادر کرتا تھا۔

(۲) کارخانہ جات شاہی کے داروغہ تحویلدار اور امنا کا تقرر برطرفی و بحالی اس سے متعلق تھی۔

(۳) خزانہ رکاب اس کی تحویل میں تھا

(۴) کارخانہ جات شاہی کے قواعد وضوابط مرتب کرتا تھا۔

(۵) منتظمان کارخانہ جات کی شکایات اس کے پاس پیش ہوتی تھیں۔ اور وہ ان کی دریافت کرتا تھا۔

(۶) حضور میں جو نذریں پیش ہوتی تھیں اس کے پاس رکھی جاتی تھیں

(۷) باورچی خانہ، فیل خانہ، گاؤخانہ اور اصطبل وغیرہ اس کے زیر نگرانی تھے۔

(۸) خیرات اس کے توسط سے تقسیم کی جاتی تھی۔

(۹) فرمائشات سرکار کی تکمیل اس کے ذمہ تھی۔

(۱۰) ماڑی و محل شاہی وغیرہ کا انتظام اس سے متعلق تھا۔

(۱۱) جو اشیاء بطور پیش کش داخل ہوتی تھیں ان کی قیمت مشخص کرتا تھا۔

فرمائشات سرکار کی تکمیل کے لئے خانساماں کو تمام اشیاء مہیا رکھنا پڑتا تھا اور جو اشیاء از کار رفتہ ہو جاتی تھیں وہ فروخت کر دیئے جاتی تھیں۔ خانساماں کے ساتھ عہدہ دار بیوتات بھی تھا اور اس کا اہم فرض یہ تھا کہ جب کوئی منصبدار یا ملازم سرکار فوت ہو جائے اور اس کا کوئی وارث نہ ہو یا وارث ہو اور جائیداد کو سنبھالنے کے قابل نہ ہو تو اس کی جائیداد وغیرہ سب سرکار میں ضبط کر لیتا تھا تاکہ جائیداد محفوظ رہے اور سرکاری محصول وغیرہ برابر ادا ہوتے رہیں۔ بخشی الممالک یا میر بخشی ۔۔ فوج کی تنخواہ بخشی کے توسط سے تقسیم کی جاتی تھی تمام بخشیوں

کا صدر میر بخشی یا بخشی الممالک کہلاتا تھا۔ سلطنت بنیاد لشکر و سپاہ پر قائم ہیں۔ سلطنت آصفیہ کے ہر عہدہ دار کو لازم تھا کہ زمرۂ فوج میں اپنا نام درج کرائے اور بلحاظ رتبہ منصب صدی یا ہزاری ذات و سوار سے وہ سرفراز کیا جاتا تھا جس سے اس کی تنخواہ مقرر کرنا مقصود ہوتا تھا۔ لیکن اس پہ واجب نہ تھا کہ جس قدر سواروں سے وہ سرفراز کیا جاتا تھا ان کو اسی تعداد میں رکھے ایسے عہدہ دار منصبدار کہلاتے تھے عہدہ داران دیوانی، قاضی، داروغہ، ہرکارے اور اعلیٰ ملازمین بھی مناصب سے سرفراز کئے جاتے تھے اور ان کا شمار بھی زمرۂ فوج میں کیا جاتا تھا بلحاظ منصب ان کے درجے متعین کیے جاتے تھے اور ان کی تنخواہ بھی بخشی اور میر بخشی کے توسط سے تقسیم کی جاتی تھی۔ اعلیٰ درجہ کے منصبدار دو قسم کے تھے (۱) وہ منصبدار جن کے علاقہ کے سپاہیوں اور سواروں وغیرہ کی ادائی تنخواہ میں سرکار یا پرگنہ جات ان کے تفویض کئے جاتے تھے (۲) وہ منصبدار جن کو جاگیریں عطا کی جاتی تھیں اور شرط یہ ہوتی کہ جنگ لڑائی یا فتور کے وقت سرکار کی مدد کے لئے فوج تیار رکھیں ان سے کم درجہ کے منصبداروں کی تنخواہ خزانہ سرکار سے ایصال کی جاتی تھی۔

منصبداران کے علاوہ دکن کے ہر قلعہ پر ایک قلعہ دار مقرر تھا اور حفاظت قلعہ کے لئے فوج متعین تھی۔ عموماً قلعہ دار اور فوج کی تنخواہ میں جاگیریں عطا کی جاتی تھیں یا علاقے تفویض کر دیئے جاتے تھے قلعہ جات دکن اور قلعہ داران کے متعلق حضرت مغفرت مآب فرماتے تھے کہ قلعہ جات دکن مخصوص برائے نگہداشت خزانہ اطراف و گزاشت ناموس در وقت صعب، و حفاظت مواشی دیہات است معاذ اللہ رئیس بدان و طن ساز د گویا از جمیع ریاست درست بر داشتہ قلعہ نشین است۔

میر آتش۔ توپ خانہ ایک خاص عہدہ دار کے تحت تھا ہر صوبہ اور میدان جنگ کے لئے توپ خانہ کا انتظام ایک خاص عہدہ دار کے ذمہ تھا اور انتظامیہ میں جس عہدہ دار کے ذمہ توپ خانہ تھا وہ میر آتش کہلاتا تھا۔

صیغۂ عدالت۔ انصاف تصفیہ حقوق اور سزائے مجرم کا دار و مدار قاضی و مفتی پر تھا۔ دار السلطنت کا قاضی۔ قاضی القضاۃ کہلاتا تھا۔ ہر شہر اور بڑے بڑے قصبہ میں قاضی القضاۃ اپنی جانب سے ایک قاضی مامور کرتا تھا۔ فوجداری اور دیوانی کے مقدمات قاضی کی کچہری میں رجوع کئے

تشا بلهی ۶۰ ص: ۹۰

سکئے جاتے تھے اور احکام شرع کے بموجب قاضی ان کے فیصلے صادر کرتا تھا۔ مقدمات کے فیصل کرنے کا یہ طریقہ تھا کہ جو مقدمہ پیش ہوتے ہیں قاضی مفتی سے مشورہ کرتا تھا اور مفتی احکام شرع کے بموجب اس مقدمہ کی حد تک رہبری کرتا تھا اور نوعیتِ جرم کے لحاظ سے حکم یا دفعہ کا حوالہ دیتا تھا اس حکم یا دفعہ کے مطابق قاضی سزا کا حکم صادر کرتا تھا کسی شہر یا پرگنہ کے قاضی کو کسی مقدمہ میں مشکلات درپیش ہوتی تھیں تو وہ قاضی القضاۃ سے رائے طلب کرتا تھا۔ قاضیوں کو سرکار سے سخت تاکید تھی کہ نفرت و قناعت اپنا نصب العین قرار دیں۔ دیانت اور غیر جانب داری سے مقدمہ کا فیصلہ صادر کریں اہل مقدمہ کے روبرو مقدمہ کی سماعت کریں انصاف کو کبھی ہاتھ سے جانے نہ دیں رشوت اور تحفہ وغیرہ کے لینے سے احتراز کریں اور اس خوبی سے فیصلہ صادر کریں کہ اُن پر کوئی نکتہ چینی نہ کرے۔

قاضی کو اقتدار حاصل تھا کہ فریق مقدمہ خواہ امیر ہو خواہ مفلس جس کو چاہے اپنے روبرو حاضر ہونے کا حکم دے کسی کی تخصیص نہ تھی اور نہ کوئی مستثنیٰ تھا۔ حضرت مغفرت مآب خاص مقدمات کی سماعت فرماتے تھے اور سزا کے احکام جاری کرتے تھے۔

حفظ عامہ اور امن و امان قائم رکھنے کے لئے ہر صوبہ اور حصۂ صوبہ کے مناسب مقامات پر فوجدار مامور تھے اس کا اہم فرض یہ تھا کہ باغیوں کی سرکوبی کرے اور رہزن و بدمعاش کی سرزنش کرے۔ حسب ذیل اسکے فرائض تھے۔

۱) ہنگامہ و فساد کے فرو کرنے کے لیے ہر وقت سپاہیاں ہمراہی کے ساتھ تیار رہے۔
۲) ہر وقت انصاف سے کام لے
۳) قانون گو وغیرہ سے مقامی حالات دریافت کرے اور سرکش زمینداروں کو راستہ پر لائے۔
۴) بہی خواہانِ سلطنت سے ہمیشہ نیک برتاؤ کرے۔
۵) وقائع نویس۔ سوانح نگار اور ہرکاروں سے میل جول رکھے۔
۶) تھانہ دار مامور کرے اور ان کو تاکید کرے کہ اپنے فرائض حسن و خوبی سے انجام دیں اور رشوت سے پرہیز کریں۔

۷) راستوں کی حفاظت کرے

۸) دیہات وغیرہ سے تحریری شکایات یا رپورٹ وصول ہونے پر موقع واردات پر پہنچے۔

کوتوال:- دارالسلطنت اور بڑے بڑے شہروں میں کوتوال مقرر تھے کوتوال کا اہم فرض یہ تھا کہ رعایا کی بہبودی اور ان کی حفاظت پیش نظر رکھے۔ جیل کا انتظام بھی اس کے سپرد تھا اس کے فرائض یہ تھے کہ جب کوئی مجرم گرفتار کیا جائے تو اس کو قاضی کے پاس پیش کرے اور قاضی جو بھی سزا دے اس کے حکم کی تعمیل کرے شہر کے حالات سے ہمیشہ باخبر رہے اور اس کام کے لئے شہر کے ہر محلہ میں پہرہ دار اور پیادہ مقرر کرے اور ان کو حکم دے کہ رات کے وقت گشت لگائیں اور خفیہ طور پر حالات معلوم کریں ان کے علاوہ خاکروب جو گھروں کی صفائی کرتے تھے ان سے ہر گھر کی خبر پوچھے۔ شب کے وقت ہوشیار جوانوں کا مناسب مقامات پر پہرہ مقرر کرے اور ان کو تاکید کرے کہ رہزن بدمعاش یا جس کسی پر شبہ ہو اس کو گرفتار کرلیں میلہ و تماشا کے مقام پر خفیہ جوان مقرر کرے تاکہ وہ لوگوں کے مال وجان کی حفاظت کرتے رہیں۔ رقاص، بدکار، زناکار اور شراب خانہ پر خاص نگرانی رکھے اور ان سے مچلکے لے اگر کوئی خلاف ورزی کرے تو اس کو جرمانہ کرے۔ مکانات کی گنتی اور مردم شماری کرے جب کوئی اجنبی شہر میں نظر آئے تو اس کی رہائش کا انتظام کرے۔ اہل حرفہ سے ضمانت لے۔ اگر وہ ضمانت دینے سے انکار کرے تو اس کو شہر کے باہر اتار دے۔ بازارات میں غلہ واجناس کا نرخ مقرر کرے اور چودہریوں کو تاکید کرے کہ کسی دکاندار کو نرخ مقررہ سے کم کوئی چیز فروخت کرنے نہ دے۔

محتسب۔ دارالسلطنت اور بڑے بڑے شہروں میں محتسب مامور تھے ان کا فرض یہ تھا کہ عوام الناس کو احکام شرع سے واقف کریں۔ وعظ و مواعظت کریں۔ قرآن پاک کی تعلیم دیں اور ان کو دیندار بنانے کی تدابیر اختیار کریں۔ نماز، روزہ کے احکام سنائیں اور ان کے فوائد بیان کریں۔

صدارت۔ علماء و مشائخ اور فقراء کو سرکار سے جو معاش عطا ہوتی تھی اس کی نگرانی صدر کے ذمہ تھی۔ دارالسلطنت میں جو صدر رہتا وہ صدر الصدور یا صدر کل کہلاتا تھا اور اس کی جانب سے صوبہ جات پر صدر مامور کئے جاتے تھے۔ معاش کی نگرانی کے علاوہ اس کا فرض یہ تھا کہ اس امر کی

نقیب کی… ہے کہ آیا مشائخ وغیرہ کو جو معاش عطا کی جاتی ہے آیا اس کا مستحق ہے یا نہیں عطائے معاش کے لئے اس کے توسط سے حضور میں معروضے پیش ہوتے تھے شرف منظوری پانے کے بعد اس کی مہر اور دستخط سے اسناد جاری ہوتی تھیں۔ حضرت مغفرت مآب عہدۂ صدارت کا بہت احترام کرتے تھے قاعدہ تھا کہ جب آپ برآمد ہوتے تھے تو پہلا کاغذ جو ملاحظہ میں پیش ہوتا تھا وہ صدارت سے تعلق رکھتا تھا اس کے بعد دیوان دکنی وغیرہ کے کاغذات پیش ہوتے تھے ملاحظہ کرتے وقت فرماتے تھے کہ "اول کارِ آقا بعد ازاں کارِ خود۔"

اخبار نویس و سوانح نگار وغیرہ ۔ یہ عہدہ دار بڑے بڑے شہروں اور آبادی کے لحاظ پرگنہ جات وغیرہ پر مامور تھے ان کا کام یہ تھا کہ وہاں کے حالات اور واقعات لکھ کر حضور میں ارسال کریں۔

وقائع نویس یا اخبار نویس وہ تھا جو حضور میں متواتر اور مسلسل خبریں بھیجتا تھا شہروں کے علاوہ لشکر کے ہمراہ بھی ایک وقائع نویس ہوتا تھا اور لشکر کے حالات لکھ کر حضور میں روانہ کرتا تھا۔

سوانح نگار وہ تھا جو اہم واقعات کے متعلق حضور میں خبریں ارسال کرتا تھا۔ سوانح نگار خفیہ پولیس کہلاتا تھا اس کے ذمہ یہ کام تھا کہ ہر عہدہ دار کے متعلق حضور میں خفیہ طور پر خبریں بھیجتا تھا ہرکارہ وہ تھا جو زبانی خبریں پہونچاتا تھا۔ حضرت مغفرت مآب ہرکارے پر بہت اعتماد کرتے تھے اور تاکید تھی کسی وقت بھی ہرکارہ خبر لائے فوراً حضور میں پیش کیا جائے چنانچہ ایسا ہی عمل ہوتا تھا دارالسلطنت میں ہرکاروں کی زبانی جو کچھ اخبار نویس کو خبریں معلوم ہوتی تھیں ان کا خلاصہ لکھ کر حضور کے ملاحظہ میں پیش کرتا تھا۔

صوبہ جات وغیرہ کے اخبار بذریعہ داروغہ ڈاک دارالسلطنت کو وصول ہوتے تھے داروغہ ڈاک ان کو دیوان کی خدمت میں اور دیوان حضور کے ملاحظہ میں پیش کر دیتا تھا۔

جب حضرت مغفرت مآب کے انتظام مملکت پر گہری نظر ڈالی جاتی ہے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اول سے لے کر آخر تک ملک اور رعایا کے مفاد پر وہ مبنی تھا۔ حضرت مغفرت مآب کے پیش نظر ہر وقت ملک کی ترقی رہتی ایک مدبر حکمران کو جن خوبیوں سے متصف ہونا چاہیئے آپ میں وہ تمام و کمال

موجود تھیں۔ اگر آپ میں وہ خوبیاں موجود نہ ہوتیں تو ممکن تھا کہ دکن جیسی وسیع سلطنت آپ کے ہاتھوں سے نکل جاتی۔ حکومت کا مادہ آپ کی فطرت میں ودیعت کیا گیا تھا اور آپ حکومت کرنے پیدا ہوئے تھے آپ مدبر ہی نہیں تھے بلکہ آپ میں وہ ستودہ صفات بھی پائی جاتی تھیں جو ایک سپہ سالار میں ہونی چاہئیے۔ مرہٹے بہادر اور جواں مرد سمجھے جاتے تھے لیکن آپ سے وہ بھی گھبراتے تھے۔

حضرت مغفرت مآب نے ایک خود مختار سلطنت کی بنیاد ڈالی تھی اور اس کی بقا آپ کا مطمح نظر تھا امور مملکت کا انتظام اس مطمح نظر کے مطابق سانچے میں ڈھالا گیا تھا۔ آپ کے حسن انتظام کا یہ اثر مرتب ہوا ہے کہ جس سلطنت کی بناء آپ کے دست مبارک سے ہوئی تھی آج ہندوستان ہی نہیں بلکہ دنیا میں اپنا نظیر نہیں رکھتی۔ اور ایک بڑی اسلامی حکومت ہونے کا اس کو شرف حاصل ہے۔

*

نوٹ، اس مضمون کے لکھنے میں حسب ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ہے۔ (۱) مآثر نظامی۔ (۲) دربار سلاطین آصفیہ (۳) تزک آصفیہ (۴) گلزار آصفیہ (۵) خزانہ رسول خوانی (۶) سوانح دکن (۷) آئین اکبری (۸) مرآۃ احمدی (۹) مغل ڈمنسٹریشن (رہنمائے صبح دکن سالگرہ نمبر ۱۳۵۱ء)

(باقی سلسلہ صفحہ ۱۳۷ سے آگے)

● گیارہ ہزار تین سو چھپن مناد رکے نام تین لاکھ دس ہزار نو سو چھیالیس روپے چھ آنے تین پائی بطور معاش نقدی و محاصل اراضی علی الدوام مقرر ہیں بہ نسبت مساجد کے (۶۳۳۱) مناد رزیادہ معاش یاب ہیں اور انسٹھ ہزار چھ سو اناسی روپے دو آنے تین پائی بہ نسبت مساجد کے مناد رکو زیادہ مقرر ہیں

علاقہ صرف خاص مبارک میں ۸۵ معاش یابان مذہبی اور علاقہ جاگیرات میں (۳۰۴) معاش یابان مذہبی غیر مسلم ہیں اس کے علاوہ علاقہ صرف خاص مبارک میں (۷۹۷۲) افاد اور علاقہ جاگیرات میں (۲۳۴۹۰) افاد ارغیر مسلم پاتے ہیں۔ (خلاصہ کتاب مسالمت عثمانی مولفہ محمد عبدالوہاب عندلیب)

پروفیسر عبدالقادر سروری

حیدرآباد کی علمی سرگرمیاں

آصفجاہ سادس نواب میر محبوب علیخاں غفران مکاں کے عہد میں

آصفجاہ سادس نواب میر محبوب علیخاں غفران مکاں کا عہدِ حکومت ۱۸۶۹ء سے لے کر ۱۹۱۱ء تک رہا۔ تین سال کی عمر میں آپ تخت نشین ہوئے اور بیالیس سال کی پُرامن اور شاندار حکومت کے بعد ۴۶ سال کی عمر میں آپ کا انتقال ہوا۔

ہندوستان کے لئے یہ زمانہ عام طور پر اور خصوصاً حیدرآباد کے لئے امن و امان اور خوش حالی کا تھا ہند کے سیاسی مطلع پر سے ۱۸۵۷ء کے انقلاب آفریں طوفان گزرے ہوئے گیارہ سال کا عرصہ ہو چکا تھا اس زمانہ کا سکون درحقیقت اسی طوفان کے بعد کا نتیجہ تھا اس بڑے قومی حادثے کے بعد ہندوستان کی کمر ایسی بیٹھی کہ کسی خانہ جنگی کے لئے کھڑا ہونا ناممکن ہو گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ اہلِ ہند کو کسی بیرونی دخل در معقول کا مقابلہ کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہوئی۔ اس لئے ہندوستان کی رہی سہی خواہش جنگ و جدل اب جا چکی تھی برما میں جو ایک چھوٹی سی جنگ ہوئی اس کا اثر افواج ہی تک محدود رہا۔ خوف تھا تو صرف یہ کہ انگریز حاکموں کو جو کسی بیرونی قوت خصوصاً روس کے حملے کے خوف سے خوش تھے

حکومت دہلی کی سیاسی قوت تو اورنگ زیب کے انتقال کے بعد ہی ٹوٹ چکی تھی علم و ادب کے مرکز کا جو ایک امتیاز اس کو حاصل تھا وہ تدریجاً، نادر شاہ اور مرہٹوں کے حملوں کی انتشار آفرینی کی وجہ سے خود ہی کھسکنے لگا تھا۔ اس پر فیض آباد اور لکھنؤ کے نشو و نما نے رہا سہا، سب گھسیٹ لیا۔

غدر کے پہلے پہلے شمالی ہند کا آخری علم دوست، دربار لکھنؤ تباہ ہو چکا تھا اور وہاں کے اہل علم و فضل شاعر و ادیب، ہندوستان کے چھوٹے چھوٹے درباروں میں جا رہے تھے کہ غدر کے ہنگامے نے دہلی کے ساتھ لکھنؤ کی قسمت کا بھی آخری فیصلہ سنا دیا۔ لکھنؤ کے آخری بادشاہ واجد علی شاہ اختر غدر کے بعد بھی تیس سال تک زندہ رہے اور مٹیا برج (کلکتہ) میں صرف ان کے دربار کے متوسل شاعروں اور عالموں کو ان کی زندگی تک سایہ ملا۔ ۱۸۸۷ء میں شاہ کے انتقال کے ساتھ ہی یہ آس بھی جاتی رہی۔ لیکن پانچ چھ سو سال کی ہندالمانی شائستگی نے علم و فن ادب و شعر کا جو سرمایہ چھوڑا تھا وہ آسانی سے مٹنے والا نہ تھا اس کے حامل تباہ اور پریشان ہو کر ہندوستان کی تمام عالم اور شاعر یہاں چلے آئے لیکن ۱۸۷۱ء میں نواب کلب علی خاں کی علم دوستی کی بدولت دہلی اور لکھنؤ کے تقریباً تمام ادیب شاعر یہاں چلے آئے لیکن ۱۸۸۷ء میں نواب کے انتقال نے یہ سہارا بھی چھین لیا۔ اہل علم اپنی متاع سمیٹ سمیٹ کر یہاں سے بھی چل کھڑے ہونے پر مجبور ہو گئے۔ داغ کے جیسے چند خوش قسمتوں پر آسمان مہربان تھا۔ ہندوستان کے سارے درباروں کا چکر کاٹتے ہوئے یہ حیدرآباد پہنچ گئے۔ لیکن امیر کے جیسے بہت سے اہل علم فکر معاش کی پریشانیوں سے آخر دم تک خلاصی نہ پا سکے۔

حیدرآباد نے مغل شہنشاہیت کے علاوہ بیجاپور اور گولکنڈے کے دکنی درباروں کے حقیقی وارث کی حیثیت سے علم و فن کی سرپرستی اور ہندوستانی ادب کی قدر افزائی کی روایات کو ہمیشہ برقرار رکھا۔ یہ سلسلہ آصفجاہ اول نواب میر قمرالدین خاں سے چلتا ہے۔ نواب خود شعر و سخن کا ایک پاکیزہ مذاق رکھتے تھے۔ ان کے زمانے ہی میں دکن کی اجڑی ہوئی سلطنتوں کے تمام بچے کچھے شاعر اور عالم حیدرآباد آ گئے تھے۔ غدر سے پہلے کی لامرکزیت نے حیدرآباد کے حکمرانوں کو بیشتر سیاسی مہموں اور فوجی کارروائیوں میں مصروف رکھا۔ عاشق علی خاں ایماؔ، محمد مرتضیٰ بیدیؔ، عارف الدین خاں عاجزؔ، مہر علی مہرؔ، مرزا اعظم اختیارؔ، فضلی شاہ، احمد یار خاں یارؔ، خواجہ عبدالمنعم خاں قدرؔ، سوہن لعل مہتابؔ، لالہ لچھمی نارائن شفیقؔ، اورنگ آبادی شاہ تجلیؔ، شاہ میرؔ، مہاراجہ چندو لال شاداںؔ، حضرت کیفؔ، حضرت شاہ خاموشؔ، محمد صدیق قیسؔ، صفاؔ، مہ لقابائی چنداؔ، بدرالدین خاں لائقؔ (نواب سکندر جاہ کے میر سامان)

رائے بالا پرشاد رعد، مولانا طوفی، ملا وآھدی، محمد غیاث جبین، جیسے باکمال شاعروں اور عالموں سے یہ دربار کبھی خالی نہیں رہا۔

حیدرآباد کو حکمی علوم اور شعر وادب سے خاص لگاؤ اس طرح پیدا ہو گیا تھا کہ اس سے کچھ ہی عرصہ پہلے دکن کے امراء میں بعض نہایت روشن خیال اور علم دوست امیر پیدا ہو گئے۔ نواب ناصرالدولہ کے زمانہ میں مسندِ وزارت پر مہاراجہ چندولال شاداں جیسے علم و فضل کے قدردان وزیر متمکن تھے۔ شاداں خود فارسی اور اردو کے اچھے شاعر تھے۔ اس لئے انھیں شعر و سخن کا بے حد ذوق تھا۔ اسی علمی شغف نے مہاراجہ کو مجبور کیا کہ وہ ذوق کے استاد شاہ نصیر کو لکھنؤ سے حیدرآباد کھینچ کر بلائیں۔ شاہ نصیر کے قیام کے زمانہ میں بیسیوں مشاعرے ہوئے اور سینکڑوں لوگوں نے شاہ نصیر کی شاگردی کا شرف حاصل کیا۔ اسی زمانہ میں دکن کے مشہور امیر کبیر نواب شمس الامراء ثانی نواب محمد فخرالدین خاں (امیر پائیگاہ) کو حکمی علوم کا ذوق ہوا جس کی تکمیل کے لئے آپ نے ریاضی، طبیعات، کیمسٹری، ہیئت، جرثقیل، فلسفہ، علم الافلاک کی کتابیں انگریزی سے ترجمہ کرائیں۔ یہ چھ رسالوں کا مجموعہ "ستہ شمسیہ" (۱۲۵۳ھ) کے نام سے مشہور ہے۔ اردو میں جدید علمی علوم کی ترویج کی یہ اولین کوشش تھی ان میں اصلاح سازی کی دقتوں پر جس خوبی سے قابو حاصل کیا گیا ہے آج بھی قابل تقلید ہے۔

غرض آصفجاہ سادس کے عہد میں حیدرآباد علم وفن خصوصاً شعر وسخن کے چرچوں سے پُر تھا۔ سیاسی امن وامان اور معاشی فراغت جو قوموں کے لئے اس طرح کی زندگی میں سب سے بڑے معاون ثابت ہوئے ہیں، حیدرآباد میں بدرجۂ اتم موجود تھے۔ اندرونی اور بیرونی کوئی غیر معمولی ہلچل اس زمانہ میں واقع نہیں ہوئی صرف رود موسیٰ کی طغیانی کا ایک حادثہ تھا جس میں حیدرآباد کو ناقابل تلافی علمی نقصان پہونچا۔ یعنی علوم کہ قدیم دکنی شعر وادب کی کتنی گرانمایہ کتابیں اس حادثہ کی نذر ہو گئیں۔ تاہم حضرت غفران مکان کی ذاتی دلو دہش نے ملی نقصانات کی بہت کچھ تلافی کردی۔

غدر کے زمانہ میں بھی حیدرآباد، نواب افضل الدولہ کی پیش بینی اور مشہور با تدبیر وزیر نواب میر تراب علی خاں، سرسالار جنگ اول کے حسن انتظام کی بدولت ہر قسم کے ہیجانات سے محفوظ رہا۔

لیکن شمالی ہندوستان کے لئے اس واقعہ کے اثرات بے حد انقلاب آفریں ثابت ہوئے۔ قدیم بساط حکومت کے الٹنے کے ساتھ ہی ایک نئے اور اجنبی نظام کی بنیاد پڑنی ضروری تھی۔ ہندوستان میں ایسے افراد کی کمی نہیں تھی جو اتنی عظیم الشان سلطنت کا کروفر دیکھ چکے تھے سیاسی بساط کے الٹ جانے کی وجہ سے قدیم شائستگی کی موت کا جو پیغام آیا تھا اس سے ان کے قلوب کچھ کم متاثر نہیں تھے اس پر قومی غلامی کا احساس اور کچھ انگریز حاکموں کی مسلمانوں کی طرف شبہ کی نظریں' ایسے امور تھے کہ ہر احساس والے کے دل پر کاری ضرب لگا رہے تھے سلطنت کی تباہی کے بعد سے اگلے علوم وفنون کا بھی خدا ہی حافظ نظر آ رہا تھا۔

یہی امور تھے جنھوں نے دہلی کے اجڑے کھنڈروں اور "آثار الصنادید" سے غیر متوقع طور پر چند غیر معمولی حساس ہستیوں کا ایک مجمع پیدا کر دیا۔ جس کے قائد قابل احترام سر سید احمد خاں تھے۔ سر سید کی جماعت قومی اصلاح کی ایسی عظیم الشان تحریک لے کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی کہ فطرتاً اس سے علم وفن اور شعر وادب کی کئی شاخیں پھوٹ نکلیں۔ اس قابل احترام جماعت کے آخری فرد کے پیوند زمین ہونے سے پہلے پہلے بہت سی تحریکیں بار آور ہو چکی تھیں۔ ادھر ہماری قوم ایک نئی شاہراہ پر کھڑی نظر آ رہی تھی لیکن ۱۸۵۷ء کی اکھاڑ پچھاڑ سے بھی حیدر آباد براہ راست متاثر نہیں ہوا۔ اس لئے یہاں یہ تحریک انقلاب کی صورت میں رونما نہیں ہوئی۔ بلکہ یہاں اس نے ایک تدریجی ارتقاء کی شکل اختیار کی۔ اس کا سہرا یقیناً دُور اندیش بادشاہِ وقت اور باتدبیر وزیر کے سر رہے۔

آصف جاہ سادس کے عہد تک ریاست کا نظم ونسق قدیم مغلیہ اساس پر مبنی تھا ریاست کے چاروں طرف جب نئے نظام کا رواج ہوا تو ریاست کو ماحول کے ساتھ ہم آہنگی اور ہندوستانی نظم کے ساتھ یکسانیت کے خیال نے اپنے نسقی نظام کو بھی بدلنے پر مجبور کیا۔ لیکن یہ کام اس نے تدریج کیا اور اس کا آغاز اسی عہد سے ہوتا ہے اسی لئے یہ عہد جدید حیدر آباد کا سنگ بنیاد ہے۔

غرض اس طرح نواب میر محبوب علی خاں کو پہلے پہل نئے نظم ونسق کو سلطنت میں رائج کرنا پڑا۔

اصلاحات جدید تعمیر میں نواب میر تراب علی خاں سر سالار جنگ اول کی آہنی پسندی اور فراست سے بڑی مدد ملی۔ نئی اصلاحات کو مملکت میں جگہ دینے کے لئے حکومت نے سر رشتوں کی ہیئت میں بتدریج تبدیلیاں شروع کی اور اصلاحات کو نافذ کرنے کے لئے دو کام کئے۔ ایک طرف تو اہل ملک کو یورپ یا ہندوستان کے محکمہ جات میں بھیج کر کام سکھایا۔ دوسرے ہندوستان کے سربرآوردہ عہدہ داروں کو حکومت ہند سے اپنے پاس مستعار لیا، یا ان کا تقرر اپنے پاس براہ راست کرلیا۔ کیونکہ شمالی ہندوستان کے عہدہ دار اس وقت سے پہلے سے جدید انگریزی نظم و نسق سے کافی طور پر واقف ہو چکے تھے اس طرح تھوڑے عرصہ میں سلطنت کے اکثر محکموں میں تبدیلیاں کرلی جاسکیں۔

اس عہد میں ملکی ترقیوں کا ذکر کرتے ہوئے نجم الغنی مولف "تاریخ حیدرآباد" لکھتے ہیں۔

"مہمات ریاست اور امور حکومت کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جہاں نواب میر محبوب علیخاں کے عہد میں مناسب اصلاحیں نہ ہوئی ہوں۔ تعلیمات، طب، فوج، پولیس، تعمیرات عامہ غرض وہ تمام خصوصیات جو آج کل مہذب سلطنت کے لئے ضروری ہیں۔ ریاست حیدرآباد میں مکمل صورت میں موجود ہو گئے۔" سلہ (سلہ صفحہ ۵۶۱)

فوج اور پولیس میں نئی اصلاحیں ہوئیں، فوج کو کرنل افسرالملک جیسے زبردست سپاہی اور مدبر کی قیادت نصیب ہوئی۔ تعمیرات عامہ کا محکمہ قائم ہوا۔ ذرائع آمدنی کی تنظیم عمل میں آئی اور محکمہ عدالت کی اصلاح برطانی ہند کے طریقہ پر کی گئی۔ ان امور سے ہمیں یہاں تفصیل سے بحث کرنی نہیں ہے علمیت کا جو سنگ بنیاد اس عہد میں رکھا گیا ہے صرف اسی سے ہم یہاں کسی قدر تفصیل کے ساتھ بحث کرنا چاہتے ہیں

حیدرآباد میں قدیم نظامیہ طرز کی تعلیم عرصہ سے رائج تھی۔ کئی مدرسے اور مکتب قائم تھے جس کے تعلیم یافتہ خاص قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے لیکن اس عہد میں علمی اور نظری فنی اور سادہ بی، دونوں طرز کی جدید تعلیم کی ابتدا ہوئی۔

فنی تعلیم کے لئے انجنیری اور طب کے وہ مدرسے قائم ہوئے جو چند سال پہلے جامعہ عثمانیہ کے

فنی کالجوں کے قائم ہونے تک ملک میں فنی تعلیم کی ترویج کا واحد ذریعہ بنے ہوئے تھے۔ ریاست کے فنی محکموں کے لئے فارغ التحصیل لوگوں کی ایک قابل قدر تعداد انہی مدرسوں سے فراہم ہوتی تھی۔ کل ہی کا ذکر ہے کہ نام پلی کے اسٹیشن کے روبرو مدرسۂ انجینئری مسٹر مکرجی کی صدارت میں اس فن کے طلباء کی تربیت میں ہمہ تن مصروف تھا اور دوسری طرف خیریت آباد میں طب کا وہ ادارہ قائم اور میجر فرحت علی کے نفیس ضبط کے تحت کارگزار تھا جو سالہا سال تک ملک اور اہل ملک کے سخت ترین دردوں کا درماں بنا رہا۔ دکن کے دور دراز مقامات سے اس فن کے طلباء اس مدرسہ میں عمل بالید کی مشق کے خیال سے آکر شریک ہوتے تھے
انگریزی کی اعلیٰ تعلیم اور سائنس کی ابتدا نظام کالج کی تشکیل سے ہوئی۔ جو اپنے انگریز پرنسپلوں کی سخت نگرانی میں ملک کے لئے شائستہ اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کا قابل لحاظ سرمایہ فراہم کرتا رہا۔ پروفیسر عبدالرحمن خان جو حیدرآباد میں سائنٹفک تعلیم کی ترویج اور ترقی کے سلسلہ میں کبھی فراموش نہیں کئے جا سکتے برسوں اس کالج کے سربراہ اور دوسرے کئی اور محکموں کے ناظم رہے۔

مظاہرات کے مطالعے اور تحقیقات کی عملی تعلیم کے لئے بیگم پیٹھ میں رصدگاہ نظامیہ قائم ہوئی جو آج بھی ہندوستان کی بہترین رصدگاہوں میں شمار ہوتی ہے بالآخر ایک اہم تر ادارے کا ذکر اور باقی ہے مشرقی علوم اور السنہ کی تعلیم کے لئے دارالعلوم کا مدرسہ اور کالج قائم ہوا جس کے تعلیم یافتہ درحقیقت آج تک بھی ملک کو علم و ادب اور علمی فنون کی روشنی سے منور کر رہے ہیں۔ ادبی، علمی، صحافتی شعبوں کے لئے حال تک بھی یہی دارالعلوم کارگزار فراہم کیا کرتا تھا یہ مدرسہ گو اب ایک جدید اور وسیع تر ادارے میں ضم ہو کر اپنی انفرادیت اور حیات مستعار ختم کر چکا ہے لیکن اس کے فارغ التحصیل جیسے مولانا عبدالقدیر حسرت (صدر شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ) مولانا جمال الدین ندوی مرحوم پروفیسر نظام کالج، پروفیسر غلام نبی فہیم ادب طفلی کے موجد مرحوم غلام مصطفےٰ ذہین، قدیم صحیفہ نگار مولوی اکبر علی اور تعلیمی خدمتگزار مولوی محمد مرتضیٰ مرحوم سکریٹری حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس، عربی زبان کے ادیب مولانا محمد جعفر اور ملک کے مایۂ ناز شاعر سید رضی الدین حسن کیفی، جیسی برگزیدہ ہستیاں اس مشرقی کالج کی آغوش میں تربیت پاکر نکلی ہیں۔

"شاداب"

اس کے علاوہ قدیم درس نظامیہ کا علمبردار مدرسہ نظامیہ (شبلی گنج) تھا۔ جس کے بانی، نواب فضیلت جنگ مولانا انوار اللہ خاں مرحوم صدر الصدور امور مذہبی کی خدمات کی یاد ہمارے ذہنوں میں آج تک زندہ ہے۔

مذہبی علوم کی جو خدمات اس سرزمین نے ادب کے عہد زریں میں کی ہیں، وہ ناقابل محو ہیں۔ لیکن گزشتہ صدی کے آخری زمانے میں بھی مولانا غوثی، مصنف، "تفسیر غوثی"، ملا حامدی، صاحب "تفسیر حامدی"، مولوی محمد عثمان مبین مصنف "لازم الاسلام" کے علاوہ صاحب "تاریخ رشید الدین خانی" اور "تاریخ خورشید جاہی" جیسے صاحب ذوق اہل قلم کی کمی نہیں تھی لیکن شعر و سخن کے چرچوں سے حیدرآباد کبھی خالی نہیں رہا۔ گولکنڈہ اور بیجاپور کے زریں عہد ادب سے لیکر اس وقت تک ہر زمانے میں بیسیوں قابل قدر شاعر پیدا ہوتے رہے۔ زیر بحث دور کے قریب ایک طرف حضرت فیض کے شاگرد سینکڑوں کی تعداد میں موجود تھے تو دوسری طرف حضرت بیکس کے تلامذہ کی بھی کمی نہیں تھی۔ حال تک بھی حضرت [illegible] کے مزار پر مشاعرے کی وہ محفلیں منعقد ہوتی تھیں جن میں ملک کے تمام سربرآوردہ شعراء جمع ہو کر اپنی سخن سنجیوں کی داد دیتے۔ ان دلچسپ صحبتوں کی تصویر کسی قابل مصور کے موقلم کی محتاج ہے۔ مہاراجہ شاد بھی اکثر ان مشاعروں میں شرکت فرما چکے ہیں۔ اس عہد سے پہلے شیر محمد خاں ایمان اور محمد صدیق قیس دکن میں شعر و سخن کے بڑے مسلم الثبوت اساتذہ گزرے ہیں۔ ایمان کے کمال فن کے تمام معاصرین معترف تھے۔ عورتوں میں مہ لقا بائی چندا کا دیوان انگلستان کے کتب خانے میں اب بھی نہایت حفاظت کے ساتھ رکھا ہوا ہے۔ ۱

ریاست کے مشہور وزیر مہاراجہ چندو لال شاداں کا نام بھی شعر و سخن کے سرپرستوں کی پہلی صف میں آتا ہے آپ خود بھی اچھے شاعر تھے اور دار السلطنت کو ہندوستان کے بہترین شعراء سے بھر دینا چاہتے تھے مشہور استاد شاہ نصیر آپ ہی کی طلب پر حیدرآباد تشریف لائے تھے۔ غدر کے زمانے کے سرپرست شعر و سخن نواب کلب علی خان والی رامپور کے انتقال کے کچھ عرصہ بعد جب داغ دہلوی حیدرآباد آ گئے اور حضور غفران مکان نے ان سے مشورہ کرنا شروع کیا تو "الناس علی دین ملوکہم" کے مصداق شعر و سخن کا خاص

شاد و ابن ۱۹۰۵ء

ذوق ملک کے طول و عرض میں پھیل گیا۔ اس زمانہ میں شعر و سخن کا ذوق اعلیٰ طبقوں کے لوازم حیات میں داخل ہو گیا تھا۔ داغ کے اثر نے ان کی طرز کے بعض اچھے شاعر دکن میں پیدا کیے خود حضرت غفران مکان کے کلام پر داغ کا نمایاں اثر ہے۔ کیفی جو آئندہ زمانہ میں دکن کے سب سے بڑے شاعر بننے والے تھے پہلے پہل میکش کی روش پر چلتے رہے جن سے انھیں تلمذ حاصل تھا بعد میں وہ بھی داغ کے دبستان کی طرف مائل ہو گئے تھے لیکن یہ رجحان صرف اسالیب کی حد تک رہا۔ کچھ تو تخلص کی مناسبت سے اور کچھ میکش کی پیروی کی بدولت رندانہ آخر تک ان کی غزل کے مخصوص تصاویر میں رہا اور کسی زمانے میں بھی یہ رجحان طبع نہ بدل سکا۔

داغ کے دبستان کے دوسرے شاعر نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز ہیں جو آج تک بھی اس خاص طرز کو نہایت کامیابی کے ساتھ نباہ رہے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ داغ کی اس عالمگیر شہرت اور ان کی طرز کی مقبولیت میں اس قدردانی کو بھی بہت دخل ہے جو حضرت آصف کے دربار میں ہوئی۔ مسٹر رام بابو سکسینہ مولف "تاریخ ادبیات اردو" اس قدردانی کے متعلق لکھتے ہیں۔

" حیدرآباد میں داغ دنیوی خوش حالی کے معراج کمال پر پہونچ چکے تھے۔ اردو کے کسی دوسرے شاعر کی یہ قدر و منزلت ہوئی اور نہ کسی نے یہ انعام اکرام پائے۔" لے (لے "ہسٹری آف اردو لٹریچر" صفحہ ۱۸۲ سنہ ۱۹۲۷ء رام نارائن لال ، الہ آباد)

داغ کی کامیابی نے ہندوستان بھر میں ان کے سینکڑوں مقلد پیدا کر دیئے تھے۔ چنانچہ عصر حاضر کے سب سے بڑے شاعر اقبال بھی ابتدائی زمانے میں داغ کے انوکھے انداز سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

دکن کے اکثر شاعر داغ کی ہمنوائی کا دم بھرنے لگے تھے لیکن جلال الدین توفیق ہی ایک ایسے شاعر ہیں جو داغ کے اس عالمگیر اثر اور ان کی مقبولِ عام طرز سے متاثر نہ ہوئے۔ وہ عزلت پسند اور صوفی منش انسان تھے اور ان کی شاعری ان کی زندگی کا آئینہ رہی۔ صوفیانہ

عکہ بیچیوں میں درد کے بعد ان کے پلے کا شاعر کوئی نہیں ہوا۔

اس میں شک نہیں کہ حضرت شاد، آصف سے تلمذ رکھتے ہیں لیکن آپ کی اضطراب طبیعت اور ارتقار پذیر ذہنیت نے آپ کو کسی ایک طرز پر تمام و کمال حصر کرنے سے باز رکھا۔ داغ اور آصف کے معرکتہ الارا مشاعروں میں آپ نے شرکت کی ہے اب بھی جبکہ حیات کی کشمکش نے شعر و سخن کے ذوق سے طبیعتوں کو مردہ بنا رکھا ہے شاد کا دربار جدید اور قدیم دونوں طرز کے شعراء کا مرکز اور مامن بنا ہوا ہے۔ راجہ گردھاری پرشاد باقی، دکن کے امراء میں خاص رتبہ کے شاعر ہیں۔ باقی کی رباعیات کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس طبقہ کے ایک اور شاعر لقمان الدولہ دل ہیں۔ باقی شاعروں میں ڈاکٹر احمد حسین مائل، محمد عبدالحی بازغ میر نوازش علی لمعہ اور سید ابراہیم عفو کا ذکر بھی ناگزیر ہے جن کے رشحات سے موجودہ دور سے پہلے تک دکن کے تمام ادبی رسائل مستفید ہوتے رہے۔

داغ کی افسانہ نما کامیابی نے ان کے معاصر اور اردو کے سربر آوردہ نعت نگار شاعر امیر مینائی کو بھی یہاں کھینچا۔ لیکن داغ کی خوش نصیبی ہر ایک کے حصے کی بات نہ تھی یہاں آنے کے چند سال بعد ہی آپ کا انتقال ہو گیا۔ لیکن آپ کی ناکامی آپ کے شاگرد داور آپ کے فرزند کے لئے زینہ ثابت ہوئی۔ چنانچہ اول الذکر آج ریاست کے ایک جلیل القدر عہدہ پر سرفراز ہیں اور آخر الذکر امور مذہبی کی نظامت جیسے ذمہ دار عہدہ کو سنبھال رہے ہیں۔

شعر و سخن کے اس اجمالی تذکرہ کو ختم کرنے سے پہلے نظم طباطبائی اور ضامن کنتوری کا بھی ذکر ضروری ہے نظم "مٹیا برج" کے زوال کے بعد دکن کے افق پر طلوع ہوئے اور ذوق سخن کی قابل اعتنا خدمات انجام دیں۔ داغ کے انتقال پر نظم اور ضامن ہی صف اول کے شاعر رہ گئے تھے۔

جس طرح قدیم طرز کی شاعری کا آخری مامن حضرت غفران مکان کا دربار تھا اسی طرح جدید طرز کی شاعری سے بھی پہلے پہل یہی عہد روشناس ہوا۔ کیفی کی سعی نے ان کی زندگی ہی میں علی خبیر اور عہد طفولیت کے بانی غلام مصطفےٰ ذہین اور اردو کے سب سے بڑے رباعی گو شاعر

امجد جیسے قابل قدر شعراء کی ایک مبارک نسل دکن میں پیدا کر دی تھی۔

اردو کے چند بہترین مورخ اور تذکرہ نویس بھی حیدرآباد نے اسی زمانہ میں پیدا کئے۔ اسی طرح لاہور کے بک ڈپو اور دہلی کی سائنٹفک سوسائٹی کے تقریباً ساتھ ہی ساتھ یہاں فنی ادب کی طرف بھی توجہ کی گئی۔ مرزا مہدی خاں کوکب اردو کے اولین فنی مصنفین میں سے ہیں۔

لیکن شعر و سخن کی سرگرمیوں اور علم و ادب کی سرپرستیوں سے زیادہ اہم دربار آصفی کا کارنامہ علی گڑھ کی اصلاحی تحریکات کی امداد ہے۔ جدید تعلیم کی اشاعت کے لئے علی گڑھ کالج کے قیام میں حکومت کی طرف سے جو شاہانہ امداد دی گئی تھی اس سے کالج کی بنیادوں کو استوار کرنے میں خاطر خواہ مدد ملی۔ اس کے علاوہ اس جماعت کے اراکین کی فرداً فرداً بھی مدد کی گئی۔ انھیں بڑی بڑی ملازمتیں دی گئیں اور وظیفے مقرر کئے گئے جس کی بدولت یہ گروہ فکر معاش سے بڑی حد تک مطمئن ہو گیا تھا اس تحریک کے بانی مبانی آنریبل سرسید احمد خاں اپنی گوناگوں مصروفیتوں کے سبب ملازمت کے سلسلہ میں حیدرآباد میں قیام پذیر نہ ہو سکے۔ تاہم انھیں جب کبھی مالی یا اخلاقی مدد کی ضرورت ہوئی ریاست کی طرف سے نہایت فراخ دلی کے ساتھ ان کا ہاتھ بٹایا گیا۔ علی گڑھ میں بیٹھکر یہ اپنے حلقے کے کارکنوں کو منتخب کر کے حیدرآباد بھیجتے رہے۔ چراغ علی۔ مہدی علی۔ مشتاق حسین جو سرسید احمد خاں کے دست و بازو تھے، ریاست کے بڑے سے بڑے عہدوں پر عرصہ تک فائز رہے۔

اس تحریک کے ادبی کارکنوں میں سے حالی بھی سرسید کی طرح یہاں مستقل طور پر قیام پذیر نہ ہو سکے لیکن ان کی معاشی فکروں کو وظیفہ کے ذریعہ ہمیشہ کے لئے دور کر دیا گیا اور وہ اطمینان کے ساتھ شعر و شاعری کی اصلاح میں منہمک رہے۔ شبلی دائرۃ المعارف کے ناظم کی حیثیت سے عرصہ تک یہاں رہے۔ حافظ نذیر احمد کو تعلقداری کی اہم خدمت دی گئی تھی۔ اردو زبان کی واحد مستند لغت "فرہنگِ آصفیہ" جیسا کہ نام سے ظاہر ہے خانوادۂ آصفی کے اس ساتویں بادشاہ کے نام سے منسوب ہے اس کے مصنف مولوی سید احمد دہلوی کو اس کام کے لئے ریاست سے وظیفہ مقرر تھا۔

مذکورہ بالا بلند گوں کے علاوہ سید علی بلگرامی اور مولوی عزیز مرزا، مختلف ذمہ دارانہ عہدوں

پر فائز رہے۔ مشہور افسانہ نگار سرشار بھی یہاں رہ چکے ہیں۔ جدید اردو ناول کے بانی اور تاریخ اسلام کے مستند مورخ مولانا عبدالحلیم شرر بھی ملازمت کے سلسلہ میں کئی دفعہ یہاں آئے۔ یہاں سے واپس جانے کے بعد بھی طرح طرح سے ان کی مدد کی جاتی رہی۔ ان کی تاریخ اسلام، حیدرآباد کی امداد ہی سے لکھی گئی۔

اس طرح اس عہد میں ہندوستان کے تقریباً تمام سربرآوردہ شاعروں اور ادیبوں کا کسی نہ کسی طرح ریاست سے تعلق رہا۔ ان برگزیدہ تعلقات نے عہدِ آصفجاہ سادس میں دارالسلطنت کو ہندوستان بھر میں نہ صرف قابل رشک بنادیا تھا بلکہ یہاں کی علمی مصروفیتوں میں ایک غیر معمولی چہل پہل پیدا کردی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حکومت حیدرآباد اکناف ہند کے کسی قابل اعتناء عالم اور ادیب کو دارالسلطنت سے باہر نہ رہنے دے گی۔

صحافت اور معیاری رسائل کے معیار میں بھی خاطر خواہ ترقی ہوئی۔ رسالہ "حسن" جو حسن بن عبداللہ کی ادارت میں دارالسلطنت سے شائع ہوتا تھا اپنے بلند پایہ مضامین اور لاثانی مضمون نگاروں کی وجہ سے دنیائے صحافت میں اس عہد کی یاد ہمیشہ تازہ رکھے گا۔ اس کے مضمون نگاروں کی خدمت میں ایک اشرفی کا ہدیہ پیش کیا جاتا تھا۔ یہ سرسید کے مشہور جریدے "تہذیب الاخلاق" کا معاصر اور سر عبدالقادر کے رسالے "مخزن" کا ہم پایہ تھا۔ مولوی عبدالحق صاحب معتمد انجمن ترقی اردو کا پہلا رسالہ "افسر" بھی اسی عہد کی پیداوار ہے۔ اس کے علاوہ "صحیفہ" اور "دبدبۂ آصفی" "ادیب" "معلم نسواں" "محبوب الکلام" "دکن ریویو" "افادہ" "ذخیرہ" اس عہد کی صحافتی مصروفیتوں کے اچھے نمونے ہیں۔ یہ صرف معیاری رسالوں کی فہرست تھی۔ معمولی رسالے بیسیوں کی تعداد میں شائع ہوتے تھے۔ فنی رسالے جیسے میڈیکل جرنل، "فنون" وغیرہ جو اس زمانے میں شائع ہو رہے تھے ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ علمی رجحانات علمی اور فنی ادب کی طرف بھی ہونے لگے تھے۔ "معلم نسواں" اردو کا پہلا رسالہ ہے جس کے مدنظر صنف لطیف کی تربیت اور اصلاح تھی۔

رسالوں کے علاوہ بیس کے قریب اخبار نکلتے تھے جن میں چند جیسے "سفیر دکن" "ہزار داستان"

"مشیر دکن" روزنامہ تھے اور باقی ہفتہ وار۔ ہفتہ وار اخباروں میں "دکن پنچ" "اخبار آصفی" "معلم شفیق" "محبوب گزٹ" "جلوۂ محبوب" "ملک وملت" "دکنی" معیار کے لحاظ سے اپنے معاصرین میں کسی سے کم نہیں تھے یہی گوناگوں واقعات ہیں جنکی وجہ سے عہد آصف جاہ سادس کو ایک غیر معمولی امتیاز حاصل ہوگیا ہے۔ اس علمی چہل پہل کا تمامتر دارومدار حضرت غفران مکان کے علمی ذوق وادبی شغف پر تھا یہ کہنا مبالغہ نہیں ہے کہ علم وادب کی جدید اصلاحی تحریکات کو کامیاب بنانے میں بہت بڑا حصہ حیدرآباد کا ہے اس عہد کی علمی وادبی تاریخ کے لئے حیدرآباد کی یہ مساعی زریں ورق ثابت ہونگی۔

(مطبوعہ سالنامہ "رہبر دکن" حیدرآباد بابتہ سنہ ۱۳۴۳ فصلی سنہ ۱۳۵۲ ہجری م سنہ ۱۹۳۳ عیسوی)

"کبیر رنگ" سے اقتباس
از زبیر رضوی

کہت مسافر، اَترؔ کا جو شہروں شہروں گھوما
دلی دیکھی، بمبئی دیکھی، کلکتہ بھی دیکھا
بندھیاچل کی گود میں لیکن دکن دیس اک ایسا
جو آیا اک بار یہاں وہ اپنے دیس نہ لوٹا

★

ہم سے پوچھو دکن دیس کی چھیلاؤں کا حال
رنگ روپ سانولے، نین باورے، مستوں کی سی چال
شعر کہیں، افسانے لکھیں، راگ، رنگ، سُر، تال
جس کو من کا میت بنالیں کر دیں مالا مال

احوال انتقال اعلیٰحضرت آصفجاہ سادس

اعلیٰحضرت نواب محبوب علی خاں بہادر راحت آرام گاہ ۵ تباریخ سہر رمضان ۱۳۲۹ھ م ۲۲ مہر ۱۳۲۰ف بروز سہ شنبہ آپ کا انتقال ایوانِ فلک نما میں دن کے ۱۲ بجے ہوا وہاں سے بہ سواری موٹر چوملہ میں لائی گئی اور ۱۱ بجے بوقت شب متصل مقبرہ نواب ناصر الدولہ صحن مکہ مسجد میں مدفون ہوئے۔ بروز انتقال بوقت ۵ ساعت منادی نواب عثمان علی خاں بہادر کے نام کی کوتوال نے روبرو چار مینار دی اور پھر ۱۲ دروازہ شہر پر منادی دی گئی۔ بروز پنجشنبہ مکہ مسجد میں ۱۱ بجے فاتحہ سیوم ہوئی اور ٹھیک ۵ بجے بہ حویلی منجھلی بیگم دربار تعزیت منعقد ہوا اعلیٰحضرت کنگ کوٹھی سے بسواری چوکڑہ تشریف لائے۔ حیدرآباد و سکندرآباد کی تمام دوکانات زیارت کی شام تک بند رہے۔ تار کے ذریعہ کیفیت معلوم ہوئی کہ بمبئی۔ مدراس کلکتہ، دہلی، شملہ وغیرہ میں بھی دوکانیں بند ہو گئی تھیں۔ اور علیگڈھ کالج میں بہت بڑا جلسہ فاتحہ خوانی ہوا۔ اور بلدہ میں سیتارام باغ میں تمام اہل ہنود ساہوان بلدہ و سکندرآباد تین یوم تک اپنے وید شاستر کے بموجب فاتحہ پڑھا کیے اور بتاریخ م سنہ تین یا چار بجے باغ مذکور سے مکہ مسجد تک تمام سمیتن وید پڑھتے ہوئے قبر پر آئے اور چادر گل کے ساتھ طلائی و نقرئی پھول کی چادر چڑھائی۔

(اُردو ریسرچ سنٹر کے ایک قدیم مخطوطہ سے)

جناب صاحبزادہ میکش

حیدرآباد کی جدید اردو خدمات

ادب ایک کسوٹی ہے جس پر کسی قوم کی عظمت جانچی جاسکتی ہے، ذہنی نشو ونما، تہذیبی ترقی اور تمدنی ارتقا کے عکس، اسی آئینہ میں نظر آتے ہیں۔ اس لئے زندہ قوموں نے اس کی اہمیت کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ ادب انقلاب پیدا کرتا ہے اور انقلاب ادب۔ جس قوم میں انقلابی روح نہ ہو وہ ذہنی انقلاب پیدا نہیں کرسکتی اور ذہنی انقلاب کے بغیر معیاری ادب کی تخلیق بھی نہیں ہوسکتی۔ خیال، عمل کا پہلا زینہ ہے اور خیال کا ترجمان ادب۔ اس لئے جس طرح بلندئ خیال کے وسعتِ نظر اور ذہنی آزادی چاہیئے۔ اسی طرح عملی قوت کے لئے معیاری ادب درکار ہے۔ الغرض خیال اور عمل کی ہم آہنگی ادب کے بغیر ناممکن ہے۔

اُردو زبان وادب نے دکن میں جو ارتقائی منزلیں طے کی ہیں اس کا تذکرہ ایک مسلسل تاریخ ہے۔ قطب شاہی عہد سے لے کر آج تک اس کی چہل پہل بڑھتی ہی گئی۔ یہ حقیقت اب کوئی راز نہیں ہے کہ اردو نثر اور نظم کے ابتدائی کارناموں میں دکنی اپنا عظیم الشان حصہ رکھتا ہے۔ اردو قدیم، دکن میں اردو، یورپ میں دکنی مخطوطات اور اردو شہ پارے جیسی مستند کتابیں اس کے ثبوت میں پیش کی جاسکتی ہیں۔ یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ یہ زبان شروع سے لے کر آج تک شاہانہ سرپرستیوں میں نشو ونما پاتی رہی ہے۔ حیدرآباد کا بانی محمد قلی قطب شاہ بھی ایک بلند پایہ شاعر اور اردو کے انشا پردازوں اور شاعروں کا قدردان تھا اور حیدرآباد کے موجودہ فرمانروا اعلیٰ حضرت

سلطان العلوم خلد اللہ ملکہ کی ذات گرامی تو ان خصوصیات کے لحاظ سے بہت ہی ارفع و اعلیٰ ہے

دکن کے اُردو مخطوطات اور مطبوعات سہ ہر زمانہ پر حاوی ہیں۔ افسوس ہے کہ وہ مختلف کتب خانوں میں بکھری پڑی ہیں اور ان کی کوئی مکمل فہرست اب تک موجود نہیں۔ اگر ادارۂ ادبیات اُردو، دکنی کتابوں کا کتب خانہ قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا تو ممکن ہے کہ اس کی تلافی ہو جائے۔ موجودہ حالات میں یہ مقام مسرت ہے کہ نواب سالار جنگ بہادر اپنے کتب خانہ کے قدیم دکنی مخطوطات کو شائع کر رہے ہیں اور اس کے لئے ایک مجلس تشکیل دی گئی ہے اس مجلس کے صدر مولوی سید محمد اعظم صاحب، نائب صدر ڈاکٹر زور، معتمد مولوی سید محمد صاحب، نائب معتمد مولوی میر سعادت علی خان صاحب رضوی اور اراکین مولوی مرزا حسین علیخاں صاحب، پروفیسر عبد القادر صاحب سروری اور پروفیسر عبد المجید صاحب صدیقی ہیں۔ اس مجلس نے اب تک کئی قابل قدر کتابیں مرتب اور طبع کر دی ہیں جن میں سلطان محمد قلی بانی حیدرآباد کا دیوان جس کی ضخامت تقریباً ایک ہزار صفحات ہے کلیات عبداللہ قطب شاہ، نصرتی کی کتابیں گلشن عشق اور علی نامہ، غواصی کی سیف الملوک و بدیع الجمال اور طوطی نامہ، شاہ برہان الدین جانم کا ارشاد نامہ اور سکھ سہیلا، ضعیفی کا قصۂ ابو شحمہ انصاری، عبد احمد کا ابراہیم نامہ اور مثنویات شاہ سراج اورنگ آبادی قابل ذکر ہیں۔ اس سے قبل بھی بعض قدیم کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان تمام کے مطالعہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ قدیم زمانہ میں بھی جب کہ فارسی کے کافی اثرات موجود تھے، اُردو کی نشو و نما اور ترقی دکن کے مخلص خدمت گزاروں کی رہین منت رہی ہے۔

قطب شاہیوں کے زوال اور دکن پر مغلیہ تسلط کے بعد فارسی کا غلبہ یقینی تھا لیکن اس طوفان میں بھی ولی اور سراج جن کے اطراف اُردو کے بعض اچھے شعراء موجود تھے۔ اُردو کا سفینہ کھیتے رہے۔ مایوسیوں کے گرداب اس سفینہ کو ڈبو دیتے اگر نواب ارسطو جاہ، اعلیٰ حضرت سکندر جاہ، مہاراجہ چندو لال نواب شمس الامراء جیسی جوہر شناس ہستیاں اس نازک وقت میں اس کا لنگر نہ تھام لیتیں۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ دکن کی علمی سرگرمیاں ہر سو سال کے اختتام پر عہد آفریں رہی ہیں۔ گویا ہر سو سال کے بعد ایک بہار آئی۔ چمن رنگین ہوا جو پھول کھل گئے تھے وہ مہکتے رہے اور پھر ایک عرصہ کے لئے چمن کی چہل پہل ختم ہو گئی

ختم ہوگئی۔ فیض کے زمانہ کو سو سال ہوئے کہ پھر ایک بہار شروع ہوئی۔ یہ بہار 'بہار جاوداں' ہے جس کو خزاں کا کوئی اندیشہ نہیں۔ غفران مکان کے عہد سے اس بہار رنگ و بو کے آثار شروع ہوئے اور مبارک عہد سلطان العلوم کی گذشتہ ربع صدی میں اس میں نمو پیدا کی۔ ایسی نمو جو مضبوط بنیادوں پر قائم ہے اور جس کا مستقبل خوش آئند ہے۔

اعلیٰ حضرت سلطان العلوم نے اپنی تخت نشینی کے بعد ہی علمی تحریکات کی حوصلہ افزائی فرمانی شروع کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کام کرنے والوں کی رگوں میں خون عمل موجزن ہوگیا۔ ہم جب عہد عثمانی کے ابتدائی زمانہ کا ذکر کرتے ہیں تو ہمیں دنیا کے اس بڑے انقلاب کو پیش نظر رکھنا چاہیئے جو جنگ عظیم نے پیدا کیا ادھر یورپ میں اس جنگ کی وجہ سے ہراسانی پھیلی ہوئی تھی اور ادھر حیدرآباد پرسکون طریقے سے ان کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ یہی وہ زمانہ تھا جبکہ حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کا پہلا جلسہ منعقد ہوا تھا چنانچہ اس کے صدر رائٹ آنریبل سر اکبر حیدری نے فرمایا کہ " یہ بہت نازک اور پُر خطر وقت ہے یورپ میں ایک خونریز جنگ ہو رہی ہے جس سے ایک عالم میں ماتم بپا ہے' ہزاروں' لاکھوں' بندگانِ خدا بے وجہ و بے گناہ قتل کیئے جا رہے ہیں اور ساری دنیا میں ایک تشویش اور ہنگامہ مچا ہے لیکن اس تاریکی میں صرف ایک جھلک نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ ہم نے بہ حیثیت رعایا کے اپنے فرض کو بہ کمال خوبی انجام دیا اور اس سے بڑھ کر یہ کہ ہمارے آقائے ولی نعمت اعلیٰ حضرت حضور انور خلد اللہ ملکہٗ نے اپنی پُر خلوص دوستی کا حق ادا کیا جو انھیں آبائے کرام سے ارثاً ملا ہے۔ ہمیں خدائے ذوالجلال پر پورا بھروسہ ہے کہ وہ حق کا ساتھ دے گا اور جبر و استبداد کو پائمال کرے گا۔ اس لئے یہاں نہ بدامنی ہے اور نہ بے چینی۔ بلکہ پورا اطمینان ہے اور اس اطمینان کی ایک دلیل یہ ہے کہ آج ہم اس نیک کام کو شروع کرنے والے ہیں اور تعلیمی مجلس کا آغاز کرنے کو ہیں جس سے ہمارے ملک کی فلاح اور ہماری امیدیں وابستہ ہیں۔

اگرچہ حیدرآباد پر اس جنگ کا کوئی راست اثر نہیں پڑا لیکن اس کی وجہ سے رفتہ رفتہ ہر جہتی رجحانات میں تبدیلی ہونے لگی۔ تمام دنیا میں نئی نئی تحریکات کے ساتھ ادب کی تخلیقی سرگرمیوں میں بھی حیرت انگیز

تغیر ہوا اور اس طرح اردو ادب میں بھی عصری عنصر پیدا ہونے لگا۔ اس کے دھارے زلف و شانے کی الجھنوں سے نکل کر فطرت اور زندگی کی وادیوں میں لہرانے لگے اور مشاہدہ و نظر نے خیال و تصور کو افسانہ بنا دیا۔

مبارک عہدِ عثمانیہ کی گزشتہ ربع صدی کا جب ہم علمی و ادبی نقطۂ نظر سے مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں دو دور نظر آتے ہیں۔ قیام جامعہ سے پہلے کا زمانہ اور قیام جامعہ کے بعد کا زمانہ۔ اعلیٰ حضرت سلطان العلوم خلد اللہ ملکہٗ کے اعلیٰ ذوق، اردو سے محبت اور علمی سرپرستیوں نے قیام جامعہ سے پہلے ہی خدمت گزاران ملک کو علمی خدمات کے لئے آمادہ کر دیا تھا۔ گویا قیام جامعہ کے لئے ایک ماحول تیار ہو رہا تھا جو اردو میں علمی و فنی صلاحیتیں اور لسانی وسعتیں پیدا کرے۔ اس دور میں مترجمین دارالعلوم کی خدمات نمایاں نظر آتی ہیں۔ انجمن طلبائے قدیم دارالعلوم اور حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس جیسے ادارے اس دور میں علمی اجتماعیت کے لئے قائم ہوئے جنھوں نے اپنے بلند مقاصد لیئے ہوئے ایک علمی فضا پیدا کی۔

جامعہ عثمانیہ کا قیام بلاشبہ ایک نیا علمی تجربہ تھا جو عملی طور پر شروع ہوا لیکن اس کی تحریک حیدرآباد کے لئے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ کئی دفعہ اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کا مسئلہ زیر بحث آیا لیکن وقت کی رَو اسے بہالے گئی۔ لیکن اس تحریک میں ایجوکیشنل کانفرنس کی وجہ سے بڑی قوت پیدا ہوئی اور اس کے ذریعہ سے مستحکم بنیادوں پر ایک صحت بخش عزم کے ساتھ کوشش شروع ہوئی۔ ایجوکیشنل کانفرنس کے پہلے ہی اجلاس میں یہ تحریک پیش ہوئی کہ "یہ کانفرنس کو اردو میں علوم و فنون کے تراجم و تصانیف کی اشاعت کی ضرورت سے پورا اتفاق ہے اور اس کے لئے یہ جلسہ سرکار عالی کی مزید توجہ کا طالب اور مستدعی ہے کہ محکمہ سررشتہ علوم و فنون کے اخراجات سے سالانہ بارہ ہزار بہترین علمی تراجم و تصانیف اردو پر انعامات مرحمت کرنے کے لئے منظور فرمائے جائیں۔"

اس طرح اس کانفرنس نے یہ امر واضح کر دیا کہ اردو میں علوم و فنون منتقل کرنے کا ایک عام رجحان پایا جاتا ہے چنانچہ سرکاری طور پر جامعہ عثمانیہ کی تشکیل سے پہلے ۱۳۳۶ھ میں سررشتہ تالیف و ترجمہ قائم کر دیا گیا جس نے اب تک جنوبی اور شرقی زبانوں کی تقریباً ۔۔۔ علمی و فنی کتابیں

اردو میں منتقل کر لی ہیں۔

اس کے ایک سال بعد ہی ۱۳۳۶ھ میں اعلیٰحضرت سلطان العلوم کے ملاحظہ میں قیام جامعہ کی اجازت کے لئے عرض داشت پیش کی گئی اس کو شرف منظوری بخشتے ہوئے اعلیٰحضرت نے فرمایا کہ "اس یونیورسٹی کا اصل اصول یہ ہونا چاہئے کہ اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ ہماری زبان اردو قرار دیا جائے" اس طرح ہمارے ہر دلعزیز نائب معین امیر جامعہ کے قول کے مطابق "علم جو نامانوس زبانوں میں مقید تھا اس سرزمین پر آزاد کیا گیا۔"

جامعۂ عثمانیہ کی تاسیس سے اردو نے بہت جلد ترقی یافتہ زبانوں کی صف میں جگہ حاصل کر لی۔ نصابی ضروریات اور ذہنی رجحانات کے باعث اس کی وجہ سے علوم وفنون اور عصری مسائل سے متعلق سینکڑوں کتابیں شائع ہوئیں۔ فرزندان عثمانیہ اور ان کے اثر سے ملک کے عام انشاء پرداز اردو کی ترقی میں زیادہ قوت کے ساتھ مصروف ہو گئے چنانچہ جامعہ کو قائم ہو کر ابھی بیس سال ہی ہوئے ہیں کہ اردو میں کئی سو کتابوں کا اضافہ ہو گیا۔

انفرادی کوششوں کے علاوہ اس عہد میں اجتماعی عملیت کے ذریعہ سے بھی اردو کی خدمت کی جا رہی ہے چنانچہ اس خصوص میں ادارۂ ادبیاتِ اردو امتیازی حیثیت رکھتا ہے جامعۂ عثمانیہ کو قائم ہوئے تقریباً پندرہ سال ہو چکے تھے۔ اس کے فرزند اپنے علمی ولولوں کے لئے ایک میدان عمل کے متلاشی تھے ایسے وقت ادارۂ ادبیاتِ اردو کے مؤسسین نے اپنی وقت شناسی اور ایثار سے ۱۹۳۱ء میں یہ ادارہ تشکیل دیا۔ سات سال کے اس قلیل عرصہ میں اس ادارہ نے تقریباً پچیس کتابیں شائع کیں اور، اپنے لئے ایک مستقل لائحہ عمل رکھتا ہے اس ادارہ کے سرپرست اعلیٰ ہز ہائی نس شہزادۂ برار، سرپرست رائٹ آنریبل سر اکبر حیدری، نواب سالار جنگ بہادر، راجہ راجونت شاہراج بہادر، صدر نواب مہدی یار جنگ بہادر اور معتمد عمومی ڈاکٹر زور ہیں ان سب کے اعلیٰ علمی ذوق کا ثبوت وقتاً فوقتاً ملتا رہتا ہے۔ توقع ہے کہ یہ ادارہ ان ہی صحت بخش بنیادوں پر ترقی کی منزلیں طے کرتا رہے گا جو اس نے اپنے لئے متعین کر لی ہیں۔

شادابؔ تھی ۹۹۰

یومِ ولی کے موقعہ پر سٹی کالج میں اُردو کے ان قدیم قلمی نسخوں کی شاندار نمائش کی گئی تھی جو آج سے کئی سو سال پہلے کی پیداوار ہیں۔ اس کے بعد جشن سیمیں کے موقع پر باغ عامہ میں بھی دارالترجمہ و تالیف کی کتابوں کے ساتھ عثمانین کی مطبوعات کی نمائش کی گئی تھی اور ہر سال انجمن طیلسانین کی سالانہ کانفرنس کے موقع پر عثمانین کی تصنیفات و تالیفات سے نمائش کے ذریعہ سے اہل ملک کو واقف کرایا جاتا ہے لیکن اب تک کوئی ایسی نمائش نہیں کی گئی جس میں حیدرآباد کی تمام مطبوعات ایکجا جمع کی گئی ہوں۔ یہ ایک دقت طلب کام ہے تاہم ادارۂ ادبیات اُردو ان تمام کو جمع کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ چنانچہ اس کی جمع کردہ مطبوعات دکن میں سے صرف قیام جامعہ کے بعد کی تقریباً تین سو سے زیادہ مطبوعات کی نمائش ادارہ کے سالانہ جلسہ اور ایجوکیشنل کانفرنس کے حالیہ اجلاس میں کی گئی اور صرف ان کتابوں کی ایک ببلیوگرافی رائٹ آنریبل سر اکبر حیدری کی فرمائش پر ادارہ کی طرف سے زیر ترتیب ہے اس سلسلہ میں جب تک تمام علم دوستوں کا تعاون حاصل نہ ہو، کامیابی ناممکن ہے۔ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ ہر وہ کتاب جو حیدرآباد میں چھپتی ہو ہماری نظر سے گزرے یا ہم اُسے حاصل کر لیں۔ البتہ جو کتابیں ہماری نظر سے گزریں یا جن کے متعلق ہمیں علم تھا وہی ہم فراہم کر سکے اور بعض ایسی بھی ہیں جو باوجود کوشش کے نہ مل سکیں۔ اس ذخیرہ میں دارالترجمہ اور انجمن ترقی اُردو کی کتابیں بھی نہیں ہیں اور نہ وہ کتابیں جو مدارس کی نصابی ضروریات کو ملحوظ رکھ کر لکھی گئی ہیں۔

۱۹۳۶ء

(مطبوعہ یادگار نمبر دکن سالگرہ نمبر ۱۳۵۵ ہجری)

عطیہ سلطنت آصفیہ

بہ سمستانات (۸۷۲) مواضعات رقبہ ۵۲۱ مربع میل محاصل ۴۵۲۵۰ ۲۶,۷۷ روپے

برامرائے غیر مسلم (۵۸۴) " " ۴۴۵۲ " " " ۱۶,۹۰,۸۶۰/- "

(رسالہ اعظم ہفتہ وار - بہمن ۱۳۳۶ ف سے)

محمد الدین فوق

ایڈیٹر نظام لاہور

محی الملت والدین

(رسالہ نظام لاہور فروری ۱۹۱۹ء میں اعلیٰ حضرت حضور نظام دکن کے قومی خطاب "محی الملت والدین" کی یادگار میں جاری کیا گیا۔ جلد ۱ شمارہ ۱ میں خان بہادر مرزا سلطان احمد نے ابتدائی نوٹ میں لکھا کہ "رسالہ نظام اعلیٰ حضرت نظام دکن کے نام پر شائع ہوتا ہے یہ ایک یادگار ہے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ اُس ذات ستودہ صفات کی علمی رنگ میں ایک زندہ اور ادبی بنیاد قائم کی جائے جو باعتبار اپنی خوبیوں۔ بزرگی سطوت اور علم پرستی کے اس وقت ہندوستان میں ایک ایسی ذاتِ حمیدہ صفات ہے جس پر ہندوستان کو بجا فخر ہے۔ نظام دکن کے نام سے نظام کا جاری ہونا اس امر کی برہان ہے کہ ملک اور قوم کے دلوں پر اُس کا کیسا اثر ہے۔ سلاطین اور شاہانِ قوم کا علمی رنگ میں نام لیا جانا ایک یادگار ہی نہیں بلکہ ایک یمن اور برکت ہے۔ فیض نظام دکن، نظام قومی اور نظام ملی کے واسطے ایک یزدانی برکت اور روحانی عطیہ ہے۔

خواجہ حسن نظامی دہلوی نے "اسم نظام" کی تاثیرات مختصر بیان کرتے ہوئے لکھا کہ "مسلمانوں کی قدیم و جدید تاریخ شاہد ہے کہ لفظ نظام جن ناموں کا جزو تھا انھوں نے بڑے بڑے نمایاں کام قوم و ملک کے انجام دیئے ہیں اور اسلامی تاریخ میں یہ لفظ فیضانِ علمی کا مترادف ہو گیا ہے" اس کے بعد نظام الملک طوسی، نظامیہ یونیورسٹی بغداد، درسِ نظامیہ، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء محبوبِ الٰہی کا ذکر

کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "مملکت دکن کے فرمانروا افراد کا امتیازی لقب "نظام" ہے وہ بھی خدمت علوم میں اپنے نام کی تاثیرات کے مطابق کام کرتے ہیں خصوصاً موجودہ نظام کو علم اور اہل علم کے ساتھ ایک عشق کی سی حالت میسر ہے اور وہ اس قدر اشاعتِ علم کی اعانت کر رہے ہیں کہ شاید آئندہ زمانہ میں ان کا نام بغداد کی نظامیہ یونیورسٹی سے بھی بڑھ جائے گا۔"

" نظام" لاہور کے ایڈیٹر محمد الدین فوق نے قومی خطاب " محی الملت والدین" پر جو ادارتی نوٹ لکھا ہے وہ ذیل میں پیش ہے ۔)

اعلیٰحضرت نظام الملک آصف جاہ میر عثمان علی خاں بہادر فرمانروائے دکن خلد اللہ ملکہ کی با موقع قومی فیاضیوں ۔ ملی ہمدردیوں ۔ عام اہلِ اسلام کے بہبود سے تعلق خاص ۔ علوم مشرقی و مغربی کی سرپرستیوں ۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام ۔ مذہبی پابندیوں اور اسلامی سرگرمیوں کی وجہ سے جمہور مسلمانانِ ہند نے عام اس سے کہ وہ علمائے نامدار ہیں ۔ جنھوں نے اعلیٰحضرت کی مذہبی سرگرمیوں سے متاثر ہو کر اور من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ پر عمل کر کے قومی خطاب حضور کے پیش کیا ہے یا عامۃ الناس ہیں جنھوں نے بذریعہ اسلامی اخبارات و رسائل صدق دل سے اس خطاب کی تائید کی ہے جو قومی خطاب " محی الملت والدین" حضور نظام عالی مقام کی نذر کیا ہے وہ کوئی نئی بات اور نئی رسم نہیں ہے ۔ نیک دل ۔ رعایا پرور ۔ علم دوست اور حبِ قومی سے سرشار ہستیاں اس قسم کے قومی خطاب اس سے قبل بھی حاصل کرتی رہی ہیں ۔ بلکہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے بھی اپنی قوم قریش کی طرف سے الامین کا خطاب حاصل کیا جیسا کہ سطور آئندہ سے معلوم ہوگا علمائے ہند کے تمامی مرکز لکھنؤ (ندوۃ العلماء بفرنگی محل) اور دیوبند ہیں ۔ ان سب نے متفق ہو کر اس خطاب کو حضور کے لئے پسند کیا اور اعلیٰحضرت نے اپنی قوم کے اس عطیہ کو فراخدلی اور خوشی کے ساتھ قبول فرمایا ۔

خطاب بخشی کی رسم قوم کی طرف سے ہو یا بادشاہ کی طرف سے زمانہ سلف سے جاری ہے ہم چند تاریخی مثالیں ذیل میں پیش کرتے ہیں ۔ جن سے معلوم ہوگا کہ علمائے عظام جمہور انام اور

فقہائے کرام اپنی بے نیازی سے سرکار سے بعض بادشاہانِ وقت کو خطاب دیتے رہے ہیں اور ان خطابوں کو خوشی اور عزت کے ساتھ قبول کیا جاتا رہا ہے۔

دنیائے اسلام میں جمہور کی طرف سے پہلا خطاب "الامین" ہے جو اس چمکتے ہوئے آفتاب کو ملا ہے جس پر خدا کی رحمت سایہ کیئے ہوئے تھی۔ جس نے اپنے خلق و امانت اللہ کفایت شعاری و پاکیزہ روی کی بدولت حضرت خدیجہ جیسی مالدار عورت کو جس سے اکثر سرداران قریش نکاح کے خواستگار تھے۔ آپ کے ساتھ عقد کرنے پر مجبور کر دیا۔ یہ وہ پاک وجود ہے جس کا نام محمد (روحی فداہ) ہے جس نے غلاموں پر پدرانہ شفقت کرنے کا دنیا میں سب سے پہلا عملی سبق دیا۔ عالم شباب بڑا نازک زمانہ ہوتا ہے۔ آپ نے اسی زمانہ میں اپنے حسنات و محامد سے ایک عالم کو اپنا شیفتہ بنالیا۔ خصوصاً آپ کی دیانت و امانت اور صدق و صفا کی وجہ سے آپ کی قوم نے آپ کو ایسا خطاب عطا کیا۔ جو اس وقت تک کسی کو نہیں ملا تھا۔ یہ خطاب "الامین" تھا اور ایسا اعلیٰ اور قابل قدر تھا کہ قوم کے ہر فرد نے ہم آواز ہو کر دیا تھا۔

حضرت ابوبکرؓ خلیفہ اول رسولِ خدا کے عاشق صادق تھے۔ ایک بار جب کفار کے مقابلہ کے لئے جب مسلمانوں کے ایثار کا امتحان ہوا تو حضرت عثمان غنیؓ اپنی آدھی جائیداد لے آئے۔ حضرت ابوبکرؓ نے ساری جائیداد رسول کریمؐ کے حضور میں لا رکھی۔ ۱۲ھ نبوی میں آنحضرتؐ کو معراج ہوئی۔ ابوجہل وغیرہ نے تکذیب و استہزا کی۔ لیکن سب سے اول حضرت ابوبکرؓ تھے جنھوں نے سنتے ہی تصدیق کی۔ اسی زمانہ میں آپ کے عشق صادق کی وجہ سے آپ کو خطاب "صدیق" عنایت ہوا۔

حضرت عمرؓ کی قبولیت اسلام نے تاریخ اسلام میں ایک نیا دور پیدا کر دیا تھا۔ یہ واقعہ سنہ نبوی کے چھٹے سال کا ہے۔ اس وقت دنیا کے کل مسلمانوں کی تعداد ۴۰۔۵۰ سے زیادہ نہ تھی اور وہ اپنے فرائض مذہبی علانیہ ادا کرنے سے قاصر تھے۔ حضرت عمرؓ نے ایمان لانے کے ساتھ ہی مسلمانوں کی اس قلیل جماعت میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔ اور کہا کہ خدا کی وحدانیت کا ذکر۔ حق و صداقت کی باتیں اونہا اس طرح ڈر ڈر کر اور چوری چھپے۔ چنانچہ نہ صرف اپنا اسلام علانیہ ظاہر کیا بلکہ مسلمانوں

کی جماعت کے ساتھ کعبہ میں جا کر (جہاں مسلمانوں کا داخلہ بڑا مشکل تھا) نماز ادا کی۔ اسی دن سے آپ "فاروق" یعنی فرق پیدا کرنے والے کیونکہ آپ نے کافروں اور مسلمانوں میں اسلام کے علانیہ اظہار سے فرق پیدا کر دیا تھا کے نام سے پکارے جانے لگے۔ اور آخر میں فاروق اعظم ہو گئے۔ اب یہ خطاب جو قوم نے آپ کو دیا تھا آپ کے نام کا جزو خاص ہو گیا ہے بلکہ مولانا شبلی نے تو اسی نام "الفاروق" سے آپ کی سوانحعمری لکھی ہے۔

اُس زمانہ میں افسران فوج کو امیر کے نام سے پکارا جاتے تھے حضرت عمر فاروق رض کے زمانہ میں سعد بن وقاص رض حاکم عراق تھے۔ مسلمان اُن سے خوش تھے۔ اور اپنی خوشی اور احسانمندی کا اظہار انہوں نے اس طرح کیا کہ اُن کو امیر کی جگہ امیر المومنین کا خطاب دیا۔ کوفہ سے جو صوبہ عراق کے ماتحت تھا دو آدمی لبید بن ربیعہ اور عدی ابن حاتم مدینہ میں آئے۔ اور چونکہ اُن کی زبانوں پر امیر المومنین کا لفظ چڑھا ہوا تھا۔ انہوں نے اطلاع کراتے وقت یہی الفاظ کہے کہ "امیر المومنین" کو ہمارے آنے کی اطلاع کر دو۔ عمرو بن العاص نے اطلاع کی۔ اور یہی خطاب استعمال کیا۔ حضرت عمر رض کو یہ خطاب پسند آیا۔ عام مسلمانوں نے بھی اس کو فال نیک سمجھا اور یہ لفظ خاص خلیفہ کے لئے وقف ہو گیا۔ چنانچہ اسی تاریخ سے یہ خطاب شہرت پذیر ہے۔

اُس زمانہ سے لے کر خلفائے بنی اُمیہ اور خلفائے عباسیہ کے بادشاہ القائم بامر اللہ[1] تک کئی قسم کے خطابات لوگوں کو بادشاہوں اور افراد ملک نیز قوم اور جمہور کی طرف سے ملتے ہیں لیکن تفصیل میں جانے سے مضمون کے بہت طویل ہو جانے کا اندیشہ ہے اس لئے صرف وہی خطابات درج کئے جاتے ہیں جن کی نسبت لفظ "دین" کے ساتھ ہے جو بادشاہوں نے بنا بر اظہار خوشنودی مزاج اپنے وزراء یا اور لوگوں کو دیئے ہیں یا قوم نے اپنی خوشی سے بادشاہوں یا اور لوگوں کو ان کی خدمات حسنہ کے صلہ میں اپنی سرکار سے عطا فرمائے ہیں۔

المعتضد باللہ[2] کے زمانہ میں جب اُس نے ابو شجاع محمد بن حسن کو اپنا وزیر بنایا۔ اور جو

---

[1] خلیفہ بغداد حکومت ۴۲۲ھ تا ۴۶۷ھ

[2] حکومت ۲۷۹ھ تا ۲۸۹ھ

"شاداب" سال تقریباً (۳۷۶ھ) میں ابن الحسن نے اپنی خوش تدبیری سے قحط کو رفع کر دیا تو اس کو "ظہیر الملۃ" کا خطاب دیا۔ تاریخ الخلفا کا مصنف علامہ جلال الدین سیوطی لکھتا ہے۔ میرے خیال میں یہ سب سے پہلا خطاب ہے جس میں دین کی طرف نسبت کی گئی ہے۔

۴۸۵ھ میں جب سلطان ملک شاہ کا انتقال ہو گیا تو خلیفہ بغداد المقتدی بامر اللہ نے اس کے بیٹے کو باپ کی جگہ سلطان تسلیم کیا اور "ناصر الدنیا والدین" کا خطاب عطا کیا۔

خلیفہ[1] المستظہر باللہ کے زمانہ میں جب سلطان ملک شاہ کے دوسرے بیٹے نے اپنے بھائی پر حملہ کر کے اس کو مغلوب کر لیا تو خلیفہ نے خلعت سلطانی کے علاوہ "غیاث الدنیا والدین" کا خطاب بھی عطا کیا۔ نظام الملک طوسی کو نیشاپور میں علماء و فضلا نے "قوام الدین" کا خطاب دیا تھا۔

المسترشد باللہ نے اپنے عہد حکومت (۵۱۲ھ تا ۵۲۹ھ) میں بھی اکثر خطاب عطا کیے ہیں۔ ابوبکر شاشی بغداد میں ایک بہت بڑا فقیہہ گذرا ہے جس نے خلیفہ المسترشد کے زمانہ میں فقہ کی ایک بے نظیر کتاب تصنیف کر کے "عمدۃ الدنیا والدین" کا خطاب حاصل کیا۔

خلافت بغداد یوں تو کئی سالوں سے کمزور ہو رہی تھی مگر تاتاری غارتگروں نے بسرکردگی ہلاکو خان خلیفہ مستعصم (۶۴۰ھ سے ۶۵۶ھ) عراق و بغداد کو تباہ کر کے خلافت عباسیہ کے پرخچے اڑا دیے۔ تین سال یعنی ۶۵۶ھ سے ۶۵۹ھ تک تخت خلافت، بغیر کسی مستقل خلیفہ کے خالی پڑا رہا اسی عرصہ میں فوج مصر کا سپہ سالار رکن الدولہ بیبرس امراء کے اتفاق سے ۱۶ ذیقعدہ ۶۵۸ھ بہ لقب الملک الظاہر تخت پر بیٹھ گیا اور ابن الزبیر کو "زین الملۃ والدین" کا خطاب دے کر اپنا وزیر بنایا۔

ہندوستان میں اورنگ زیب[2] عالمگیر پہلا بادشاہ ہے جس نے اپنے نام کے ساتھ "محی الدین" کا لقب اختیار کیا۔ یہ واقعہ ۲۴ رمضان ۱۰۶۹ھ کا ہے جبکہ اس نے اپنے جلوس کے سال دوم

---

[1] حکومت ۴۸۷ھ تا ۵۱۲ھ

[2] پیدائش ۱۰۲۸ھ جلوس ۱۰۶۸ھ وفات ۱۱۱۸ھ عمر ۹۱ سال تیرہ یوم مدت سلطنت پچاس سال دو ماہ ۲۷ یوم

میں سکہ و خطبہ اور لقب اختیار کیا تھا اور منبر پر خطیب نے اُس کے نام کے ساتھ محی الدین کے الفاظ پڑھے جن پر تمام علماء و صلحا نے اتفاق ظاہر کیا۔

افغانستان میں خطاب بخشی کا سلسلہ خلیفہ[1] القادر باللہ خلیفہ بغداد کے زمانہ سے شروع ہوا۔ اُس نے سلطان محمود غزنوی کو امین السلطنت یمین الدولہ کا خطاب دیا اور سلطان مسعود اس کے بیٹے اور شاہی خاندان کے کئی شہزادوں کو خطاب بخشے تھے۔ لیکن وہ خطاب صرف خلیفہ بغداد کی طرف سے تھے۔ جمہور کی طرف سے نہیں تھے۔ اس لئے ہم تخت افغانستان کے اُس بادشاہ کا ذکر کرتے ہیں جس نے ۱۸۸۰ء میں بعض تائید ایزدی سے تخت کابل پر جلوس کیا۔ اس کا نام امیر عبدالرحمن[2] خان تھا۔ جب یہ تخت پر بیٹھا ہے تو سارے ملک میں شورش برپا تھی۔ کامل امن و آسائش اور فلاح و بہبود رعایا اور احیائے دین حقہ کے صلہ میں تمام قوم نے اس کو ضیاء الملت والدین کا خطاب دیا۔ امیر عبدالرحمن خان نے قوم کے عطاکردہ خطاب کو رحمت الٰہی تصور کیا اور دنیا کے تمام خطابات فاخرہ پر اس کو ترجیح دی۔ کابل میں ایک خاص جشن کیا۔ چنانچہ ۲۵ مئی ۱۸۹۶ء کو عین دربار میں ملا صاحب نے اپنے ہاتھ سے ایک تمغہ قوم کی طرف سے پیش کیا اور ضیاء الملت والدین کے خطاب کا اعلان کیا۔ امیر نے نیا سکہ مضروب کرنے کا حکم دیا۔ جس کی ایک طرف مسجد کابل اور دوسری طرف "ضیاء الملت والدین امیر عبدالرحمن خان" کے الفاظ تھے۔ امیر عبدالرحمن خان کے بعد ان کے جانشین موجودہ امیر افغانستان ہز مجسٹی امیر حبیب اللہ خان کو بھی جمیع علمائے افغانستان اور قوم افغان نے "سراج الملت والدین" کا خطاب دیا ہے۔

وہ خطابات جن کی نسبت "فضیلت" کے ساتھ ہے دنیائے اسلام میں آج تک بہت کم لوگوں کو مل سکے ہیں جن میں اہل علم بھی ہیں اور اہل ملک بھی۔ ہمارے اعلیٰ حضرت حضور نظام جن کی بے نظیر فیاضات کی قومی اور انفرادی مثالیں ہندوستان میں مشرق سے مغرب اور اہل شمال سے جنوب تک [illegible]

---

[1] اس نے ۳۸۱ھ سے ۴۲۲ھ تک بغداد میں خلافت کی ہے

[2] پیدائش ۱۸۴۴ء جلوس ۱۸۸۰ء وفات ۱۹۰۱ء

سکتی ہیں۔ اس وقت سب سے آخری تعبیر ہیں، جن کو قوم نے سلطان العلوم کے لقب سے اشاعت
تہذیب و تعلیم کے صلہ میں ایک ایسا خطاب دیا ہے جس کی نسبت مذہب و ملت دونوں کے لحاظ سے ہے
یعنی محی الملت والدین اور اس خطاب کی یادگار اعلیٰ حضرت حضور نظام دکن کی علم نوازیوں کے علمی
اعتراف میں یہ رسالہ نظام کہ اس کو اعلیٰ حضرت ہی کے اسم گرامی کے ساتھ نسبت خاص ہے جاری کیا
جاتا ہے۔ؔ

ؔ علمائے اسلام نے بہ تقریب انعقاد ندوۃ العلماء نومبر ۱۹۱۸ء میں یہ خطاب حضور نظام خلد اللہ ملکہ کی خدمت میں
پیش کیا اور جمہور مسلمانوں نے پہلے اخبارات اور مختلف جلسوں کے ذریعے اس کی تائید کی اور آخر دسمبر ۱۹۱۸ء
کے جلسہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ سورت نے اس خطاب پر مبارکباد ارسال کرنے کا رزولیوشن
پاس کر کے اس پر تصدیق لگادی۔
(مطبوعہ "نظام" لاہور فروری ۱۹۱۹ء)

قطعہ

سلطان العلوم تاجدارِ دکن آصف سابع

ا

مصلحت تھی یہی حضرت کے یہاں آنے میں
تیرگی تا نہ رہے دہر کے کاشانے میں
جب ہوا ہند عرب جلوہ نما اے عثمان
سرنگوں بت ہوئے سجدہ ہوئے بت خانے میں

واسدیوراؤ
مالک و ایڈیٹر شہر دکن

نذرِ عقیدت

آج ہمارے ظل اللہ اور محبوب خلایق بادشاہ اعلیٰ حضرت قدر قدرت، سکندر شوکت، دارا حشمت فریدوں منزلت ہز اگزالٹیڈ ہائینس مظفر الملک والممالک نظام الملک آصفجاہ آصف سابع تاجدار دکن خلد اللہ ملکہ وسلطنتہ کی ۳ ۵ ویں سالگرہ کا یوم سعید ہے۔ ملک کے گوشہ گوشہ میں مسرت و انبساط کی لہر دوڑ رہی ہے اور رعایا کے دل اپنے عزیز ترین بادشاہ کے جذبۂ وفاداری سے اُچھل رہے ہیں، حق تو یہ ہے کہ آج کا دن دکن میں بہ منزلہ عید کے ہوتا ہے کیوں نہ ہو یہ اس مجمع الصفات اقبال مند ذات گرامی کی سالگرہ کا دن ہے جس کی بارگاہ میں سطوت عظمت جاہ و جلال دست بستہ کھڑے رہتے ہیں جو نیکوکار، خیر مجسم، جہاں پرور، پیکر اخلاق اور پیکر خلایق ہے سچ تو یہ ہے کہ سلاطین سابق کی خوبیاں ایک ایک کر کے ذات شاہانہ میں جمع ہو گئی ہیں۔ ملک کی ہمہ جہتی ترقی امن و چین رعایا کی آسودگی یہ سب ذات ہمایونی کا صدقہ ہے ورنہ اس وقت دیگر ممالک میں جو انتشار پھیلا ہوا ہے وہ پوشیدہ نہیں ہے۔

قدرت نے ہم کو ایسا جامع اوصاف بادشاہ عطا فرمایا ہے جس کا مبارک عہد حکومت ہمارے لئے ایک نعمت اور باعث خیر و برکت ہے اس عہد میمنت نے سارے ملک میں حیات اجتماعی کی ایک روح پھونک دی ہے اور ملک کا ذرہ ذرہ تہذیب و شائستگی اور علم و ترقی کا گہوارہ بن رہا ہے۔ جہاں نہایت عمدہ طریقہ پر قومیت کا تخیل پرورش پا رہا ہے اور ہم زندگی اور ترقی کی منزلیں اپنے فرض شناس تاجدار کے زیر قیادت بڑے شوق اور خوشی کے ساتھ طے کرتے چلے جا رہے ہیں۔

اس مبارک و مسعود موقع پر جو مسرت و بہجت کی ایک دنیا اپنے اندر لئے ہوئے ہے -

ملک و مالک کا یہ قدیم ترین خادم (اخبار مشیر دکن) بھی

بصد ادب حضور پُر نور کی خدمت میں محبت و عقیدت کا یہ ناچیز ہدیہ پیش کرنے کی عزت

حاصل کرتا ہے اور دعا کرتا ہے کہ خداوند کریم

حضور اقدس کی عمر و اقبال میں روز افزوں ترقی عطا فرمائے اور حضور کا سایہ ہما پایہ ہمارے

سروں پر عرصہ دراز تک قائم رکھے۔ آمین

وفا کیش دولت آصفیہ

واسدیو راؤ (مالک ایڈیٹر روزنامہ مشیر دکن)

(مطبوعہ سالگرہ نمبر روزنامہ مشیر دکن رجب سنہ ۱۳۵۶ھ)

حیدرآباد میں ہوائی ڈاک

۴ جنوری سنہ ۱۹۳۵ء سے حیدرآباد میں جاری ہو گئی ہوائی ڈاک کراچی سے جو طیارہ ہر جمعہ کی صبح کے ساڑھے چھ بجے نکلیگا وہ شام کے چھ بجکر دس منٹ پر حیدرآباد سندھ و بمبئی سے ہوتے ہوئے حیدرآباد پہونچے گا شنبہ کی صبح ساڑھے چھ بجے حیدرآباد سے مدراس روانہ ہو جائے گا جہاں صبح کے نو بجکر ۵۵ منٹ پر یعنے صرف تین گھنٹہ (۵) منٹ میں جا پہونچے گا اسی طرح دوسرا طیارہ کراچی سے دوشنبہ کی صبح حیدرآباد اسی روز شام پہونچے گا دوسری صبح مدراس روانہ ہو جائیگا مدراس سے جمعہ اور دوشنبہ کو جانب حیدرآباد ایک ایک طیارہ آئے گا اور حیدرآباد میں شب گزاری کے بعد روانہ کراچی ہو جایا کرے گا ہوائی ڈاک سے بھیجے جانے والے خطوط کے لئے ہر جمعہ اور دوشنبہ کی شام کے ساڑھے پانچ بجے صرف پندرہ منٹ کے لئے دریچہ کھولا جائے گا اور امپیریل پوسٹ آفس میں یہ خطوط قبول کئے جائیں گے اور سواری ڈاک سے آئے خطوط کی تقسیم سہ شنبہ و سہ شنبہ کی صبح میں خطوط رسانوں سے عمل میں آیا کریگی۔ جن ڈاکخانوں کے ذریعہ خطوط بھیجے جاسکتے ہیں وہ ہیں حیدرآباد دکن، بیگم پیٹ، بلارم، الرگوڑہ، سکندرآباد، ملکپیری کے پوسٹ آفس ہیں دوسرے ڈاکخانہ یا صندوق خطوط اندازی ہوائی خطوط کے ارسال کے مجاز نہیں ہیں۔ رجسٹرڈ خطوط کو جمعہ اور دوشنبہ کے دن معمولی اوقات میں رجسٹر کرایا جا سکتا ہے دیگر امور ڈاکخانہ سے دریافت کر لیے جائیں۔ (حیدری جنتری ۱۳۵۴ھ سے)

مولانا سید ناظر الحسن صاحب ہوش بلگرامی

سیرتِ عثمانی

حیاتِ انسانی کی تاریخ پر غور کرنے والے جانتے ہیں کہ کائنات کے موجودہ تمدن و تہذیب کا نظام ہزارہا سال کی تدریجی ترقی کا نتیجہ ہے ابتدا میں جب انسان نے حیوانیت کی کچھ حدیں توڑنی شروع کیں اور ربط و تعلق سے آشنا کیا [illegible] کھلے میدانوں میں وحشت و بہیمیت کی زندگی گزارنے کی بجائے منظم آبادیاں قائم [illegible] تو پہلے پہل اس [illegible] ناموزوں دماغ نے باہمی نزاعات اور آپس کی ناخوشگواریوں کو دور کرنے پر توجہ [illegible] جہات [illegible] کے جو بیچ و خم آج حیاتِ بشری کے شریک غالب ہیں وہ ابتدائے آفرینش کے معصوم [illegible] سے ہی انسان کی فطرت میں کارفرما تھے اس لئے اس کی ضرورت ہوئی کہ ایک ایسے دماغ کا انتخاب کیا جائے جو انسانیت کی سطح کو ناہمواریوں سے بچا سکے اور غیر سنجیدہ احساسات کو عقلِ سلیم کی حدوں سے آگے نہ بڑھنے دے، یہی پیغمبروں کی بعثت کا راز ہے اور یہی حکماء و عقلاء کی تخلیق کا بنیادی سبب ہے جنھوں نے انسان کو روحانی ارتقاء کی حقیقتیں سمجھائیں جنھوں نے سیرت و کردار کے گُر سکھلائے، جنھوں نے سرداری اور حکمرانی کی داغ بیل ڈالی اور جنھوں نے انسان کو نیکی اور خوشی اخلاق کی حدوں میں رکھا۔

جس شخصیت کو سردار یا حکمراں تسلیم کیا جاتا تھا وہ ایسی ہوتی تھی جس میں احکام و انتظام کی خصوصیات عقل و علم کے احساسات اور تدبیر و تعمیر کے ارادات عام انسانوں کے مقابلہ میں پائندہ اور قوی تر پائے جاتے [illegible] جیسے جیسے تہذیب و تمدن کے دائرے پھیلتے گئے نظامِ عالم کے حدود بھی وسیع تر ہوتے گئے [illegible]

رفتہ رفتہ اس نظام نے ایک مستقل صورت اختیار کرلی اور ایک داعی کی شخصیت کو ماننے اور ایک رہبر کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے پر انسانیت کو مجبور ہونا پڑا۔

عہدِ گزشتہ کی تاریخ حکمرانی آپ کو بتائے گی کہ نوعِ انسان کے وہی ارباب دولت دنیا میں حیاتِ ابدی پا سکے ہیں جنھوں نے اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کیا، جنھوں نے اپنے ممالک کی علمی اور اخلاقی سطح کو ہموار کیا، جنھوں نے خود اپنی سیرت سے ایک عالم کو نیکی اور اخلاق کا عملی درس دیا، ایسے لوگ ہر قوم اور ہر ملک میں ہوتے آئے ہیں اور فطرت کی یہ عالمگیر فیاضی ہر خشک و تر کو سیراب کرتی رہی ہے۔ یاد بخیر! اسلامی حکومتوں کے وہ عالی فطرت حکمراں ابھی دنیا کے حافظہ سے محو نہیں ہوئے ہیں جنھوں نے قرطبہ و بغداد کی جیسی درسگاہیں قائم کیں، جنھوں نے جامعہ ازہر سے دریائے نیل کے شناور پیدا کئے، جنھوں نے آتش کدوں کو ٹھنڈا کیا، جنھوں نے اباصوفیہ کی آرزوئے توحید پوری کی، جنھوں نے بحرِ ظلمات میں گھوڑے دوڑا دئیے، جنھوں نے غلاموں کے سر پہ تاج رکھا، جنھوں نے گنگا جل کو آبِ زم زم سے ملا دیا۔ جنھوں نے گلہ بانوں کو دنیا کا راہی بنایا، جنھوں نے دنیا کے بعید تر گوشوں سے بھی تاریکیوں کے پردے اٹھا دئیے، جنھوں نے یورپ کو تہذیب کے آئین سکھلائے۔ جنھوں نے ایشیا کو جینے کے ڈھنگ بتلائے اور جنھوں نے افریقہ میں اپنی سطوت کے ڈنکے بجوائے اور اپنی بادیہ پیمائی سے ہندوستان ایسے خطہ کو بھی نہ معلوم کہاں سے کہاں بنا دیا۔ اسلام نے جو نظامِ تمدن دنیا کو دیا تھا اس میں احساسِ فرض کو پہلی جگہ دی گئی ہے اور اسی لئے ایسے حکمران جو اسلامی تعلیمات کو اپنا نصب العین بنا کر اپنے فرائض ادا کرتے رہے ہیں ان کی مبارک زندگیاں پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ،

ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

تاریخ انھیں بھلا نہیں سکتی۔ موت ان پر قابو پا نہیں سکتی اور گردشِ زمانہ انھیں مٹا نہیں سکتی، لیکن تاریخ اقوام و ملل کا ہر ورق بتاتا ہے کہ اقبال کا ابر گہربار کسی قوم پر مسلسل نہیں برستا، مسلمان بھی زمانے کے اس مستقل آئین سے محفوظ نہ رہ سکے اور دورِ آخر میں عنانِ سلطنت ایسے ہاتھوں میں چلی گئی جو نہ سیاست کے ماہر تھے اور نہ ملک کی ترقی کے راز جانتے تھے نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے اپنے صدیوں کی سطوت و جلالت کو لہو و نشاط میں گم کر دیا، عرب کے ایمان والے، عراق میں خون بہانے والے، ترک کے بہادر، اسپین کے غازی، ایران کے

...کے مجاہد اور ہندوستان کے مردانِ کارزار اب کہاں ہیں، زمانہ کا ورق الٹ چکا، ہواؤں کا رُخ بدل چکا، نہ بابر کی فتحمندی رہی، نہ اکبر کی وسیع المشربی، نہ جہانگیر کی زنجیرِ عدل گستری رہی اور نہ عالمگیر کی مذہبی عالی خیالی ع

نہ اب وہ زمیں ہے نہ وہ آسماں ہے

لیکن اسی کے ساتھ اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ فطرت اپنی طرف سے نوعِ انسان کی تعمیر و ترقی میں کبھی بخل سے کام نہیں لیتی۔ اور جب دنیا جہل و باطل کی تاریکیوں میں گم ہو جاتی ہے تو پھر کسی کو خلعتِ حیات سے آراستہ کر دیا جاتا ہے تاکہ وہ بگڑے ہوئے آئینِ حیات کو بدل دے اور بکھرے ہوئے اجزائے ہستی کو مرتب کر دے، جادہ اعتدال سے نکلی ہوئی عیش و عشرت کو بھٹکے ہوئے دماغوں سے نکال دے اور نیند کی ماتی دنیا کو از سرِ نو بیدار کر دے۔ سرزمینِ ہند مدت سے کسی ایسی ہی ہستی کی محتاج تھی جو اس کے کھوئے ہوئے عہد کو زندہ کر دے اور جو اس کی مرجھائی ہوئی فضاء کو تازگی بخش دے، فطرت نے آخر اس بے چینی کا احساس کیا اور اُفقِ دکن سے اعلیٰحضرت میر عثمان علیخاں بہادر خلد اللہ ملکہٗ کا آفتابِ اقبال طلوع ہوا، جن کی سیرت کی بلندی اور عقل و فراست کی ہمہ گیری نہ صرف دکن اور اہلِ دکن کے لئے لائقِ فخر بن گئی بلکہ اس کا غلغلہ دنیا کے اس سرے سے اُس سرے تک پہنچ کر رہا، بہتیرے بھی گزرے اور عادل شاہی، بہمنیوں نے حکومت کی اور قطب شاہیوں نے بھی لیکن اُن کو بخت و اتفاق سے جو زمانہ ملا تھا۔ اُس سے عہدِ حاضر کا مقابلہ کیجئے اور پھر سوچئے کہ کیا ہے؟ جو سلسلۂ آصفجاہی کے اقبال مند بادشاہ کی علمی برتری فراست و دانائی کی ہمسری کر سکے۔

جن لوگوں نے اعلیٰحضرت کی سیرتِ شاہانہ کا مطالعہ غور و فکر سے کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ میں اپنے اس ادعا میں کس قدر حق بجانب ہوں مگر کیا آپ نے کبھی اس کے اسباب پر بھی غور کیا ہے کہ سطوت و عظمت اور جاہ و جلال قدرت کسی کو بلا وجہ سونپ دیتی ہے، یقین کیجئے کہ یہ نام و نمود اُس نیکی و نکوکاری، اُس دانشمندی اور ہوشیاری اور اُس علم و خبرداری کا نتیجہ ہے جو عہدِ حاضر میں حضرت اقدس و اعلیٰ کی ذات کے لئے مخصوص ہیں۔

میں آج کی صحبت میں حضرت بندگانِ عالی کے بعض روزمرہ کے مشاغل بھی ظاہر کرنا چاہتا ہوں جن پر عام نظریں نہیں پڑتی ہیں اور دکھلانا چاہتا ہوں کہ باوجود اس سطوتِ شاہانہ کے حضرت اقدس و اعلیٰ کی سادہ زندگی، فرض شناسی، باخبری و نکوکاری کا کیسا مکمل نمونہ ہے اور قدرت نے کیسے کیسے اوصافِ حمیدہ اور خصائل

برگزیدہ حضرت پیرو مرشد کی ذات گرامی میں جمع کر دیئے ہیں۔ باور کیجئے کہ سیرت شاہانہ پر جس قدر غور کرتا ہوں اسی قدر مجھ پر اپنی گمہنانہ روش کے نقائص ظاہر ہوتے جاتے ہیں اور میں نہ جانے کتنی مرتبہ اپنے اخلاق وعادات پر نفرین کرتا ہوں کاش ہم سب حضرت برادران ملک بھی اپنے آقا کے اسوۂ عالی پر چلنے کی توفیق حاصل کریں اور اسی کو اپنے لئے مشعل ہدایت بنائیں۔

دستگیریاں

آپ جانتے ہیں کہ نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرون ممالک میں بھی حضرت اقدس واعلیٰ کا فیض عام معروف دستگیری ہے جہاں تک میں نے غور کیا ہے مدرسوں، خانقاہوں، معابد ومساجد، بزرگان مذہب اور اہل علم کے لئے جس قدر وظائف بلا امتیاز مذہب وملت عہد عثمانی میں عطا ہوئے ہیں وہ کسی زمانہ ماضی میں نہیں ہوئے ہاں شاذ کوئی ایسا ہو جو آستانۂ عثمانی سے محروم رہا ہو۔ جس کسی کے علم وفضل کی بلندی اور اخلاق وعادات کی برتری نگاہ سلطانی میں کھپی وہ کسی نہ کسی قسم کا صلہ پا کر رہا۔ کسی کے نام وظیفہ جاری فرما دیا گیا، کسی کو ملازمت دے دی گئی۔ غرض وہ کیا گیا جو ایک بیدار فطرت کا احساس کر سکتا تھا۔ اس کے ساتھ کفایت شعاری کے بھی عاقبت اندیشانہ اصول کو پیش نظر رکھا اور اس لئے سلطان زمانہ کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں کے لحاظ سے ابنائے ملک مسرفانہ حماقتوں میں گرفتار نہ ہو جائیں اور انہیں اطمینان سے جینے کا موقع ملے۔ کفایت شعارانہ زندگی نہ صرف حسن ہے بلکہ زندگی کا اولین اصول ہے جس کو عقلاء جزو ضروری سمجھتے ہیں۔

اخلاق سلطانی

میری ناچیز زبان ان اخلاق شاہانہ کو کیا بیان کر سکے گی جنہیں فطرت نے انسانی ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے۔ اور جو تمام تر عہد اول کی اسلامی محبت وہمدردی کا ایک عملی ثبوت ہے، بیکر اخلاق بادشاہ کسی کو دھوپ میں کھڑا رہنا گوارا نہیں فرماتے، برساتی پانی میں کسی کے بھیگنے کو جائز نہیں رکھتے، ملازمین میں سے اگر کوئی بیمار ہوتا ہے تو اسے فوراً آرام لینے کی اجازت مرحمت فرماتے ہیں اور خدمت گزاروں کے ایک ہجوم کے ہوتے ہوئے (جو بت بنا کھڑا رہتا ہے) سلطان دکن اپنی معمولی ضرورتوں کی تکمیل خود فرماتے ہیں، کاغذات کی رسید دست مبارک سے تحریر فرمائی جاتی ہے یہاں تک کہ لفافوں کو گوند سے خود بند فرماتے ہیں۔ بار بار کرسی سے اٹھنے کی زحمت کا ذرا بھی خیال نہیں فرمایا جاتا، پاکیزگی

اند طہارت کا اس قدر لحاظ ہے کہ دست مبارک بار بار دھو لیئے جاتے ہیں۔

تیمار داریاں اور بزرگ و خورد کا پاس

شہزادگان بلند اقبال میں سے خدانا کردہ کسی کی طبیعت ناساز ہو تو تیمار داری نا شتا آئی سے فرمائی جاتی ہے اور اس طرح فرمائی جاتی ہے کہ اپنی راحت و آرام کی بھی مطلق پروا نہیں ہوتی، دوا کا انتظام، غذا کی فراہمی غرض ہر چیز شاہانہ حکم وہدایت کے ماتحت کی جاتی ہے، اولاد کی تمام ضرورتیں، محلات کی تمام خواہشیں سب "حکم نگاہ" سے پوری ہوتی رہتی ہیں اور کوئی ایسی جنبش نہیں ہے جس کی اطلاع پیشگاہ اقدس میں نہ ہوتی ہو اسی طرح چھوٹوں کا لحاظ اور بڑوں کا احترام اس طرح کیا جاتا ہے کہ اسلامی آداب کی شائستگی تاریخ کے اوراق میں بے چین نظر آتی ہے، والدۂ معظمہ کے ادب و لحاظ میں خسرو ذیجاہ ایک مسلمان سعادت مند بیٹے کی طرح سادہ لباس میں جلوہ گر رہتے ہیں جب والدۂ معظمہ کا سامنا ہوتا ہے تو ناممکن ہے کہ ماں کی عظمت کو جاننے والے خسرو عالم پناہ آں سے سبقت کرنے کی جسارت فرمائیں یقین کیجئے کہ اکیسویں صدی کے اس سرکش زمانہ میں پاس و لحاظ کی یہ صورت معمولی گھرانوں میں بھی نظر نہیں آتی۔

مذہب کا احترام

کبھی پاؤں پر پاؤں رکھ کر مذہبی تذکرہ نہیں فرمایا جاتا، اسمائے محمودہ اور اسمائے حسنٰی اس وقت زبان پر نہیں آسکتے جب سگریٹ نوش فرمایا جا رہا ہو، مذہب کے شیدائی بادشاہ ہمیشہ اُن موقعوں پر مودب ہو جاتے ہیں جب بزرگان دین کے اسمائے مبارک زبان پر آتے ہیں یا خدا اور رسولؐ کا تذکرہ کیا جاتا ہے، آپ جانتے ہیں کہ اسلامی تہذیب کے یہ آداب دنیا میں اب مفقود ہیں میری نظر میں تو کوئی ایسا نہیں ہے جو ان خصائل حمیدہ کا اس خلوص نیت سے پابند ہو اور ان پر اس سختی کے ساتھ عمل کرتا ہو۔

خاصہ

خدام سلطانی صبح کو بیداری کے بعد نہایت مختصر ناشتہ فرماتے ہیں اور حسب معمول دوپہر اور شام کو خاصہ تناول فرمایا جاتا ہے جس کی مقدار اس قدر قلیل ہوتی ہے کہ شاید پانچ سال کی عمر کے بچے بھی اس سے زیادہ کھاتے ہوں گے میں نے بعض کتابوں میں پڑھا تھا کہ

بڑے بڑے عالی دماغ انسان اور اہل اللہ کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ وہ دماغ کو تازہ رکھنے اور ذکر و شغل میں مصروف رہنے کے لئے غذا صرف اسی قدر استعمال کرتے تھے جس سے پیٹ کی فطری بے چینی دور ہو جائے، حفظانِ صحت کے اصول بھی اسی کے مؤید ہیں، کسی فارسی شاعر کا یہ شعر بھی مشہور ہے کہ ؎

خوردن برائے زیستن و ذکر کردن است ٭ تو معتقد کہ زیستن از بہر خوردن است

لیکن صرف یہ پڑھا اور سنا تھا میں نے تو کسی کو بھی نہ دیکھا کہ غذا میں "برائے زیستن و ذکر کردن است" پر عمل ہو، میں نے تو سبھی کو "زیستن از بہر خوردن است" کی عامیانہ کیفیات میں گرفتار پایا، اعلیٰحضرت بندگانِ عالی کہ وہ صرف "برائے زیستن و ذکر کردن است" کے فلسفہ پر بلاناغہ عامل ہیں۔ دسترخوانِ شاہی پر طرح طرح کی شریفانہ نعمتیں چنی ہوتی ہیں، میں نے دیکھا کہ حضرت بندگانِ عالی اُن کو صرف بطور ذائقہ چکھ لیتے ہیں اور جس قدر خاصہ ہوتا ہے وہ وابستگانِ دولت میں تقسیم ہو جایا کرتا ہے، کسی دن کسی کو اس طرح شاہانہ عنایات کا اظہار ہوتا رہتا ہے۔ غذائیں بالعموم بہت سادہ ہوتی ہیں جن کی تیاری میں حفظانِ صحت کے طبی اصولوں کا پورا پورا لحاظ رکھا جاتا ہے، مرچ برائے نام اور ترشی صرف اتنی ہوتی ہے کہ مشکل سے محسوس کی جا سکتی ہے لیکن اس سادگی کے باوجود ہر چیز ایسی لطافت اور نفاست کے ساتھ تیار کی جاتی ہے کہ ایک مرتبہ ان کے ذائقہ سے آشنا ہو کر زبان مدتوں تک چٹخارے لیتی رہتی ہے پراٹھوں پر ریشمی رومال کا شبہ ہوتا ہے اور بالائی تو اس قدر لطیف تر ہوتی ہے کہ بدیدہ انسان تو اسی کو کھا کر جان دے سکتا ہے اور یہ کہہ سکتا ہے کہ ایسی لذیذ موت کہاں نصیب ہو سکتی ہے، بیضاوی پتوں کی شکل کے کباب ایسے لذیذ و خستہ ہوتے ہیں جن کی تعریف قلم کی ناواقف زبان کیا کر سکتی ہے، غرض ہر غذا اپنی خصوصیاتِ خاصہ کے لحاظ منفرد ہوتی ہے معمولاً تو سگریٹ نوش فرماتے ہیں لیکن خاصہ کے بعد حقہ نوش فرمایا جاتا ہے، کافی ا چاء سے رغبت کافی ہے، غرض حضرت جہاں پناہی کا ہر عمل ایک ایسا درس ہے جسے دیکھ کر انسان اپنی عقل اور ذہنی خامیوں کو "دور باش" کہہ سکتا ہے۔

کاروبارِ سلطنت

بیداری اور ناشتہ کے بعد دس بجے تک خدامانِ بارگاہ کو شرف باریابی عطا ہوتا ہے اُن کے جو قلم قریب خاص سے متعلقہ کشادہ لکھ

کھیلتی رہتی ہیں، ملاقاتوں کی تفریحی گفتگو کے دوران میں بھی ایسے حکیمانہ اور ادیبانہ نکتے ارشاد فرمائے جاتے ہیں کہ بے ساختہ استقلال ذہنی کی داد دینی پڑتی ہے سرکاری معاملات میں بڑے سے بڑا انگریزی یا اُردو مسودہ برداشتہ قلم تحریر فرمایا جاتا ہے دفتر پیشی سے جو کاغذات ۵ بجے تک پیش ہوتے رہتے ہیں وہ آج کے کل پر نہیں رکھے جاتے بلکہ اُس وقت بلا کسی ادنیٰ فکر و تامل کے ہر عقدہ کی حقیقت کو سمجھ کر تجویز فرمادی جاتی ہے اور ایک سرسری نظر معقدہ کی جزئیات تک سے واقف کرادیتی ہے، ۵ بجے کے بعد سواری مبارک علیا حضرت والدۂ معظمہ کے قصر کی طرف روانہ ہو جاتی ہے جہاں سے گھنٹہ آدھ گھنٹہ کے اندر مراجعت فرمائی کے بعد ۱۰ بجے شب تک دماغ سلطانی ملکی نظم و نسق اور معمولی کاروبار کی تکمیل میں مصروف رہتا ہے۔

سیاسی دماغ

کون نہیں جانتا کہ حکومت آصفیہ میں سیاسیات کا ایک مکمل محکمہ قائم ہے لیکن اوس کی گتھیاں سوائے ناخن سلطانی کے اور کون سلجھا سکتا ہے بڑے بڑے اہم اور سنجیدہ ملکی اور خارجی مسائل میں حضرت اقدس و اعلیٰ کی صائب رائے مشعل ہدایت کا کام دیتی ہے اور شعبہ کے ارباب حل و عقد بندگانعالی سے مشورہ کے بعد ہی اپنے فرائض کے بار سے سبکدوش ہوسکتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ سیاسی مسائل میں روشن دماغی کا یہ عالم ہے کہ اکثر اوقات ادنیٰ غور و فکر سے اُس کی تہ پر پہنچ جاتے ہیں اور نتیجہ ہاتھ باندھ کر مودبانہ سامنے کھڑا ہو جاتا ہے اور پھر لطف یہ ہے کہ ایسا کوئی پہلو فکر عالی سے نہیں چھوٹتا جس کسی مسئلہ سے کوئی دور کا تعلق بھی ہو۔

یہ ہے نہایت مختصر روئداد بندگانعالی کے روزانہ مشاغل کی جنھیں میر الکرید حافظہ محفوظ رکھ سکا آپ نے دیکھا کہ بیداری کے بعد سے تا استراحت کوئی لمحہ ایسا نہیں ہے جس میں ذات شاہانہ کسی نہ کسی کام میں مصروف نہ رہتی ہو اور پھر سادگی کا یہ عالم ہے کہ نشست میں ایک کرسی پر رونق افروزی ہوتی ہے نہ وہاں میز ہے اور نہ کوئی اور سامان آرائش! قرون اولیٰ کی سادگی درو دیوار سے ظاہر ہوتی ہے، اسی کرسی پر بیٹھے بیٹھے امور سیاست کی گتھیاں سلجھائی جاتی ہیں۔ حقائق و معارف کے دریا بہائے جاتے ہیں علم و اخلاق کی شرح کی جاتی ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ آدمی کو انسان بننے کی توفیق عطا کی جاتی ہے۔

ناممکن ہے کہ بارگاہ سلطانی میں کسی کو شرف باریابی عطا ہو اور وہ اپنے دل پر اخلاق خسروی کا ایک یادگار نقش لے کر واپس نہ ہو، علم و فضل کا اشتہ کرنے نہ جائے، ہر شخص کو اس کے مرتبہ، وجاہت، اور علم و فضل کے لحاظ سے شرف ہمکلامی بخشا جاتا ہے، اگرچہ اکثر کو اس فرصت ... رنگ ... تاریخ ... کار کیا جاتا ہے تو ... رسیدہ اشخاص کو عاقبت کی ابدی زندگی کے اسرار بتائے جاتے ہیں۔ باخبری کا یہ عالم ہے کہ جس طرح محل شاہی کے ہر گوشہ کی حالت طبع عالی پر ظاہر ہوتی ہے، کون بیمار ہے کون اچھا ہے کس کو کس چیز کی ضرورت ہے، کہاں کس قسم کی دوا جانی چاہئے۔ کیسی غذا درکار ہے۔ غرض پورا انتظام ذات شاہانہ کی ہدایت اور رہنمائی میں ہوتا ہے، بالکل اسی طرح شہر کے چپہ چپہ کا حال حضرت بندگانعالی کو معلوم ہے شہر کے اشراف و اعیان کی حالت، ان کے مزاج کی رفتار، ان کا طریقہ معیشت نگاہ سلطانی سے پنہاں نہیں ہے ارباب اقتدار اور اراکین سلطنت کے استعداد فکر علمی لیاقت اور سلیقہ کاروبار سے بھی حضرت جہاں پناہ باخبر ہیں

یوں تو حضرت بندگانعالی کا دردمند دل اپنے حدود سلطنت میں بسنے والے ہر انسان کا دکھ محسوس فرماتا ہے لیکن امراء و اراکین سلطنت کے یہاں جب کوئی حادثہ پیش آتا ہے تو ذات شاہانہ حد درجہ ملول ہو جاتی ہے۔ اور اس خانوادہ شاہی کی روایات قدیم کے خلاف شرع اسلامی کے لحاظ سے میت میں شرکت سے بھی تامل نہیں فرمایا جاتا اور قدم دو قدم نہیں بلکہ میلوں پیدل چلے جاتے ہیں۔ پسماندگان کی تشفی جس انتہائی ہمدردی سے کی جاتی ہے اس سے ان کے آنسو خشک ہو جاتے ہیں، دل قابو میں آجاتا ہے اور یاس امید ہو جاتی ہے، اسی طرح شادیوں کے موقعوں پر بھی اہل شادی کی مسرت و شادمانی کو دوبالا فرمادیا جاتا ہے۔ یہ ہیں آپ کے امیر المسلمین کے اخلاق جن پر جتنا بھی ناز کیا جائے کم ہے۔

مذہبی رواداری کے اعتبار سے خسرو دکن کا مرتبہ اس قدر بلند ہے کہ عہد حاضر میں اس کی مثال دنیا کا کوئی حکمران خاندان پیش نہیں کر سکتا، عیسائی ہوں یا مسلمان، ہندو ہوں یا پارسی سب کو یکساں نظر سے دیکھا جاتا ہے اور سب کی حاجتیں پوری کی جاتی ہیں بارہا ... اپنے عقائد کی یہ پابندی ہے کہ محفل عزا میں شہید مظلوم کی صف ماتم میں محزون و مغموم نظر آتے ہیں اور محفل میلاد میں اپنے پیغمبر برحق کی ولادت باسعادت کی خوشیاں منانے میں سب سے پیش پیش ہوتے ہیں، مساجد میں نماز کے لئے سربسجدہ

ہو کر کس طرح اپنی عبودیت کا اظہار فرماتے ہیں کہ بادشاہ تو ایک طرف کوئی ادنیٰ بندہ بھی طاعت کا حق کس طرح ادا نہ کر سکے گا۔

انسانی ہمدردی کا یہ عالم ہے کہ عفو و کرم کے بحر مواج کے سامنے عتاب و عطاب کی ناتواں لہریں ہمیشہ سسکتی نظر آتی ہیں، ملازمین اور خدام کی بے راہ روی پر ہلکا سا عتاب بھی ہوتا ہے لیکن صرف ان کی اصلاح اور احتیاط کے جذبات کو چھونے کے لئے۔ تخریب یا تباہی کا خیال ضمیر منیر میں کبھی آتا ہی نہیں، حضور پرنور اقدس و اعلیٰ کا خالص اسلامی شعار ناخوشی کے بعد عفو کے بہانے ڈھونڈھتا ہے کسی اور بادشاہ کی سیرت بھی ایسی نظر آتی ہے جس میں طنطنۂ خسروی کے ساتھ ایسا فقر و استغنا بھی ہو۔ جس میں دبدبہ سلطانی کے دوش بدوش یہ اخلاق و انکسار بھی ہو، جس میں باوجود تخت شاہی پر جلوہ افروز ہونے کے انسانیت کا اس درجہ احترام بھی ہو۔ دنیا مامون کی عالمانہ شخصیت کا تذکرہ کرتی ہے کاش وہ دیکھ سکے کہ خسرو دکن کی عالی سیرت علم و عقل کے کس مرتبہ پر فائز ہے! زمانہ اکبر کی رواداریوں کا گیت گاتا ہے کاش اسے معلوم ہو کہ عہدِ حاضر میں اکبر کے جانشین کی صفات کس بلند نقطے پر قائم ہیں۔

میں تو یہ کہوں گا اور بہ بانگ دہل کہوں گا کہ عہدِ گذشتہ کے تمام بادشاہوں کے فضائل اعلیٰحضرت میر عثمان علیخان خسرو دکن کی ذات گرامی میں جمع کر دیئے گئے ہیں۔ میرے دوستو! سنو اور کان لگا کر سنو کہ تمہارا بادشاہ، تمہارا بادشاہ ہی نہیں رحم و کرم کا مجسمہ اور اخلاق و ہمدردی کا پیکر بھی ہے، علم و فضل کی دیوی اس کے آستانے کو بوسہ دیتی ہے اور میدانِ سیاست میں اس کی یکہ تازی بڑے بڑے حریفوں کے حواسوں میں ابتری پیدا کر دیتی ہے وہ اگر نثر میں فیضی دوراں ہے تو نظم میں عرفی و نظیری کا ہم پایہ ہیں۔ بلکہ ان کے لئے بھی قابل رشک و نفسِ امارہ کی گرفت سے آزاد اور عیش فانی کی فضولیوں سے دور، مذہبیات کے مجتہد اور رواداری کے بادشاہ ہیں۔ کیا پوچھنا اس دولت ابد مدت کا اور کیا کہنا اس خوش نصیب ملک کا جسکو ایسا حکمران نصیب ہے۔ آؤ اب دعا اور میرے ساتھ اپنے بادشاہ کی عمر و اقبال کی دعا کے لئے ہاتھ اٹھاؤ اور اپنے بادشاہ کی مبارک زندگی کی تقلید سے اپنے افعال و کردار کی اصلاح کرو۔ اس سے تم زندگی کا مقصد حاصل کر سکو گے اور اپنے اطوار کا ایک مٹنے والا نقش صفحۂ کائنات پر چھوڑ سکو گے ـــ ـــ (یادگار مطبوعہ مسعود جوبلی آصف سابع)

یعقوب علی عرفانی
ایڈیٹر سالار بمبئی

حیاتِ عثمانی

"ارمغانِ عرفانی" موسوم بہ "حیاتِ عثمانی" جلد اول،

شیخ یعقوب علی عرفانی ایڈیٹر سالار بمبئی و سیاحِ یورپ و بلادِ اسلامیہ نے مرتب کی جو بہ تقریبِ جشن سیمیں اعلیٰ حضرت آصفجاہِ ہفتم شائع ہوئی۔ مرتب نے "عرض حال" میں بتایا کہ انہوں نے جب یورپ اور بلادِ اسلامیہ کی سیاحت کی تو دونوں جگہ اس سلطنت اور بادشاہ سے متعلق لوگوں کو غلط فہمی میں پایا۔ تبھی انہوں نے عزم کیا کہ سلطانِ دکن کی ایک قلمی تصویر پیش کریں گے۔

۱۹۳۳ء میں انہوں نے یہاں کے صیغۂ سیاسیات کو توجہ دلائی کہ ایک "پبلسٹی بیورو" قائم کریں۔ نواب سر نظامت جنگ نے اس خصوص میں دلچسپی لی مگر ان کے عہدِ وزارت سیاسیہ میں یہ تجویز بر شئے کار نہ آسکی۔ اور اس مقصد سے مرتب نے بمبئی سے اخبار "سالار" جاری کیا اور "حیاتِ عثمانی" کے لئے مواد فراہم کرنے کے لئے اپنی کوشش کا آغاز کیا۔ دو بزرگوں نے مرتب کی حوصلہ افزائی کی۔ ایک نواب ذوالقدر جنگ بہادر، دوسرے ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ۔ خواجہ حسن نظامی نے اپنے اخبارات سے مواد مہیا کرنے میں مدد دی۔ ایڈیٹر رہبرِ دکن نے رہبرِ دکن کے فائیل فراہم کئے۔ مرتب نے دوسرے جرائد صبحِ دکن اور نظام گزٹ کے سالناموں سے بھی استفادہ کیا۔ اور مولانا ہوش بلگرامی کے مضامین سے

بھی بیش قیمت مدد حاصل کی۔
مرتب نے اس کتاب کو مشہور علم نواز، بے ریا انسان، ہر شخص کے دلی خیر خواہ، دولت آصفیہ کے مسلم جاں نثار و وفادار سر یمین السلطنت کے نام سے منسوب کیا اور آخر میں لکھا کہ ختم کرنے سے پہلے انہیں ایک اور گرامی قدر وجود کا شکریہ ادا کرنا ہے وہ حسب سے پہلے انہی کا تذکرہ کرتے لیکن موخر اس لئے کیا کہ آخری بات قارئین کرام کے ذہن میں رہے۔ اس تالیف کی تحریک میں خان بہادر احمد علاؤ الدین کی اس محبت و اخلاص کو بہت بڑا دخل ہے جو انہیں آصفجاہ ہفتم سے ہے۔ انہوں نے ہی سب سے اول اس تالیف کے لئے ہر ممکن مدد دے کر اس کام کو شروع کرنے کا حوصلہ دلایا، ان کی علمی فیاضیاں اور خواہ عام کے کاموں میں شرکت کا جذبہ کسی اظہار کا محتاج نہیں وہ سالار کے بھی ہمیشہ معاون رہے ہیں شہزادگان عالی تبار کی شادیوں کی تقریب پر سالار کا ایک خاص نمبر انہوں نے ہزاروں کی تعداد میں اپنے خرچ سے شائع کرایا۔ اور یہ کام بھی انہی کی ابتدائی تحریک اور اعانت اول سے عملی صورت اختیار کر سکا۔

مرتب نے حیات عثمانی کی پہلی جلد کے تین حصے کئے۔ حصہ اول میں دولت آصفیہ کی اجمالی تاریخ، دوسرے حصہ میں آصفجاہ ہفتم کی سوانح حیات، تیسرے حصہ میں سیرت و شمائل کا مختصر بیان۔ اس کی تلخیص قارئین شاداب کی نذر ہے۔

حصہ اول میں بتایا ہے کہ آصفی خاندان باپ کی طرف سے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ تک اور ماں کی طرف سے آنحضرت سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم تک جاتا ہے۔ اس

خاندان میں علماء واتقیا کا سلسلہ دائمی چلا آتا ہے اور اسے ہمیشہ سے حکومتِ ظاہری و باطنی سے حصہ ملتا رہا۔ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ اس خاندان کے اجداد میں ہیں۔ عبدالرحمن شیخ عزیزاں نہایت متورع اور متقی بزرگ تھے۔ عوام ہی نہیں سلاطین بھی ان سے حصول برکات کے لئے حاضر ہوتے عبداللہ خاں والی بخارا (۹۶۴ھ ۹۹۱ھ) والی سمرقند کی فوجی قوت سے ڈر کر شیخ کی دعا کے لئے اس طرح حاضر ہوا کہ گلے میں رسی بندھی ہوئی اور اس کا سرا سوار کے ہاتھ میں تھا۔ شیخ اس نظارے کو دیکھکر بیحد متاثر ہوئے۔ عبداللہ خاں کو اپنی چادر اوڑھائی، گھوڑے پر سوار کرایا اور دعا کا لشکر ساتھ کر دیا۔ عبدالرحمن شیخ کے پوتے عالم شیخ سمرقند کے علماء متبحر میں سے تھے۔ ان کے بیٹے حضرت خواجہ اسمٰعیل اپنے زمانے کے ایک ممتاز عالم اور مشہور زاہد تھے۔ ان کا شمار اولیاء اللہ میں ہوتا تھا اور مشکلات و مہمات عظیمہ میں ان کی دعاؤں سے فیض حاصل کیا جاتا تھا۔

خواجہ اسمٰعیل کے بیٹے خواجہ عابد نے سمرقند کو چھوڑا اور بخارا چلے آئے اولاً قاضی مقرر ہوئے پھر شیخ الاسلام کے عہدہ پر ممتاز ہوئے اور اپنے لئے بخارا کے میدان ترقی کو تنگ پاکر عہد شاہجہانی کے آخری ایام ۱۶۵۸ء میں دہلی کا رخ کیا۔ نہایت عزت واحترام کے ساتھ دربار شاہی میں لئے گئے۔ عالمگیر کو بھی خواجہ عابد کے علم وفضل، دیانت کیشی اور وفاداری پر اسی طرح اعتماد تھا جس طرح شاہجہاں کو، چنانچہ ۱۶۶۰ء میں عالمگیر کے وزراء میں لئے گئے۔ ۱۶۶۶ء میں اجمیر کے صوبہ دار ہوئے اور ۱۶۷۵ء میں ملتان کے گورنر

بنا دئے گئے۔ خواجہ عابد صرف عالم و فاضل ہی نہ تھے بلکہ بہترین سپاہی، کمانڈر، جج، گورنر اور مدبر بھی تھے، جو خدمت ان کے سپرد ہوتی، نہایت عمدگی سے ادا کرتے۔ ۱۶۷۴ء میں حج بیت اللہ کے لئے مکہ گئے جب واپس آئے تو عالمگیر نے آپ کو "قلیچ خاں" کا خطاب دیا۔ ۱۶۸۱ء میں اپنا وزیر اعظم مقرر کیا اور ۱۶۸۲ء میں شہزادہ اعظم کے ساتھ دکن بھجوایا۔ ۱۶۸۷ء میں گولکنڈہ کے محاصرہ میں ایک دستہ کی کمان کر رہے تھے کہ قلعہ سے ایک گولہ آکر گرا اور نواب عابد قلی خاں کا دایاں بازو اڑ گیا، زخم نہایت مہلک ثابت ہوا اور گولکنڈہ کے قریب ہی انہیں سپردِ خاک کیا گیا۔

خواجہ عابد قلی خاں پہلے تنہا ہندوستان آئے۔ ۱۶۶۸ء میں خاندان کے لوگوں کو بلا لیا۔ ان میں ممتاز باپ کا جانباز بیٹا میر شہاب الدین بھی تھا۔ انہیں نمایاں فوجی خدمات کے اعتراف میں پہلے "خان" پھر "غازی الدین" اور اس کے بعد "فیروز جنگ" کا خطاب ملا۔ معرکہ گولکنڈہ میں باپ کے ساتھ خود بھی زخمی ہوئے۔ صحتیاب ہونے پر عالمگیر نے باپ کے امتیازات بیٹے کو عطا کئے۔ نیز سلطنت کا سب سے بڑا منصب ہفت ہزاری بھی عطا کیا۔ فیروز جنگ کو جو کچھ ملتا شاہی اور ملکی خدمت میں صرف کر دیتے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ان کی فوج اپنے ساز و سامان اور نظم و ضبط کے لحاظ سے بہترین فوج تھی۔ ۱۷۰۱ء میں عالمگیر نے ان کی فوج کا معائنہ کیا۔ بیحد خوش ہوئے اور شہزادہ بیدار بخت کو لکھا کہ اگرچہ تمہیں فیروز جنگ سے دگنی تنخواہ ملتی ہے مگر فیروز جنگ کی فوج تمہاری فوج سے تعداد میں بھی زیادہ ہے اور ساز و سامان بھی بہت اعلیٰ ہے۔

فیروز جنگ ۱۷۰۵ء میں صوبہ دار
مقرر ہوئے۔ عالمگیر کے انتقال تک
اسی خدمت پر رہے۔ جانشینی کی جنگ
میں پہلے شہزادہ اعظم سے جا ملے
پھر کسی بات پر ناراض ہو کر چلے آئے
اور کسی کا ساتھ نہ دیا۔ شہزادہ معظم
کامیاب ہو کر بہادر شاہ کے نام سے
تخت نشین ہوئے۔ انہوں نے
۱۷۰۸ء میں فیروز جنگ کو گجرات
کا صوبہ دار مقرر کر دیا۔ آخر وقت
تک اسی خدمت پر رہے۔ ۱۷۱۰ء
میں احمد آباد میں انتقال ہوا۔ اور
دہلی میں اجمیری دروازہ کے قریب
اپنے بنائے ہوئے مقبرہ میں مدفون
ہوئے۔ فیروز جنگ کی جراءت و
دلیری تو ضرب المثل تھی مگر اس
کے ساتھ ہی وہ بڑے منتظم، مدبر
اور معاملہ فہم تھے۔ عالمگیر جیسے
بلند نظر بادشاہ کو ان کی ذات پر
بیحد اعتماد تھا۔ ہر نازک مہم انہی کے سپرد
کی جاتی، مشہور مورخ خافی خان لکھتا ہے
کہ "امارت و مناصب کی بلند ترین چوٹیوں
پر پہونچ کر بھی نواب فیروز جنگ کی
خوش اخلاقی میں کوئی فرق نہیں آیا۔
آپ جس سے بات کرتے اتنی نرمی و
محبت سے کرتے کہ وہ حیران رہ جاتا تھا"

شاہجہاں کے مشہور وزیر اعظم
نواب سعد اللہ خاں بہادر نے ۱۶۷۱ء
کے آغاز میں نواب فیروز جنگ سے
اپنی صاحبزادی سعید النساء بیگم کی
شادی کر دی، اسی سال کے آخر میں
ان کے بطن سے ایک بیٹا پیدا ہوا
جس کا نام خود عالمگیر نے میر قمر الدین
رکھا۔ اور جس نے آصف جاہ اول کے
نام سے دولت آصفیہ کی بنیاد رکھی

آصف جاہ اول ایک ہی
وقت میں بہت بڑے عالم اور
وسیع النظر فاضل تھے، ساتھ ہی و
ایک شب زندہ دار اور عبادت گذار
زاہد تھے۔ وہ ایک جری بہادر

سپہ سالار اور کشور کشا جرنیل تھے ساتھ ہی بہت بڑے مدبر اور سیاستداں تھے اور ریاضیات و معقولیات سے حصۂ وافر رکھتے تھے، غرض وہ ایک مجموعۂ کمالات تھے۔

جب پیدا ہوئے، باپ اور دادا کا ستارہ اوج پر تھا۔ نانا کی رفعت و شوکت بھی بے نظیر تھی۔ عالمگیر کی فراست و فکر نے ان کے چہرہ پر آثارِ عظمت کو نمایاں دیکھا۔ ۱۶۹۰ء میں انیس سال کی عمر میں چین قلیچ خاں کا جدی خطاب عطا کیا۔ ۱۷۰۱ء میں کرناٹک کے فوجدار مقرر ہوئے ۱۷۰۲ء میں بیجاپور کی صوبہ داری عطا ہوئی ۱۷۰۴ء میں قلعۂ بیدر کی تسخیر پر ایک مرصع تلوار جواہرات سے مرصع زین کے ساتھ ایک اعلیٰ نسل کا گھوڑا اور پنج ہزاری منصب عطا فرمایا۔ ۱۷۰۷ء میں عالمگیر کا احمد نگر میں انتقال ہوا۔ جنازہ اورنگ آباد لایا گیا۔ چین قلیچ خاں میت کے ساتھ اورنگ آباد آئے اور خلد آباد میں اپنے ہاتھ سے دفن کر دیا۔

اپنے والد فیروز جنگ کے ساتھ تخت نشینی کی جنگ میں شہزادہ اعظم کا ساتھ دیا۔ شہزادہ معظم نے چین قلیچ خاں کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ان کا منصب شش ہزاری کر دیا اور خان دوراں کا خطاب دے کر برہان پور کی صوبہ داری عطا کی، مگر تھوڑے ہی عرصہ بعد کسی وجہ سے باپ بیٹا دونوں ناراض ہو گئے پھر دونوں شہزادوں میں جنگ ہوئی باپ بیٹے نے کسی کا ساتھ نہ دیا۔ تقدیر نے شہزادہ معظم کو کامیاب کر کے شہنشاہ بنا دیا جو بہادر شاہ کے لقب سے ہندوستان کا بادشاہ بن گیا اور چین قلیچ خاں کی وفاداری، شجاعت، فرزانگی اور اخلاص کا اعتراف کرتے ہوئے ان کے ساتھ بہادر دوں

کا سا معاملہ کیا۔ ان کے خطابات کو
قائم رکھا۔ اور اودھ کی صوبہ داری
اور لکھنؤ کی فوجداری عطا کردی۔
چین قلیچ خاں نے حالات پر تدبر
سے نظر کی اور مملکت سے علیحدگی اختیار
کرتے ہوئے بہ طیب خاطر سب کچھ
چھوڑ کر گوشہ نشین ہو گئے۔ علماء و
فضلا کی صحبت رہتی۔ علمی مذاکرے
ہوتے، مطالعہ کتب کی خوشگوار
مصروفیت ہوتی یا بیشتر وقت
عبادت و شب بیداری میں گذرتا۔
۱۷۱۲ء میں بہادر شاہ کا انتقال
ہو گیا۔ جہاندار شاہ تخت نشین ہوا
اور انہیں کنج عافیت سے نکال کر
میدان سیاست میں لا کھڑا کیا۔ مگر
جہاندار شاہ کی سفلہ نوازی رنگ لائی۔
فرخ سیر سے جنگ میں جہاندار شاہ
مارا گیا اور فرخ سیر بادشاہ بن گیا۔
چین قلیچ خاں شاہی فوج کے میمنہ کے
کمانڈر تھے۔ فرخ سیر نے انہیں
"نظام الملک" کا خطاب عطا کیا اور دکن
کا صوبہ دار اور کرناٹک کا فوجدار مقرر
کر کے دکن بھیج دیا۔ بادشاہ گر سید
برادران سید عبداللہ اور سید حسین علی خاں
نے بھی اسے غنیمت جانا کہ چین قلیچ خاں
دکن کی بدنظمیوں میں پھنس جائیں
مگر انہوں نے ایک سال کے اندر اپنی
حسن تدبیر سے دکن کے انتظامات
کو درست کر دیا۔ بادشاہ گر سیدوں
کو یہ کامیابی پسند نہ آئی اور دکن
کی بجائے مراد آباد کی صوبہ داری
انہیں تفویض کی گئی۔ نظام الملک
یہاں بھی تین چار سال تک امن و
کامیابی کے ساتھ صوبہ دار رہے مگر
بادشاہ گر سیدوں کا اقتدار اور
سازشی سرگرمیاں اتنی بڑھیں کہ
خود دربار کو ان کے قلع قمع کرنے کا
فکر ہوا اور ۱۷۲۰ء میں نظام الملک
کو اس فتنہ کو ختم کرنے دہلی بلایا گیا۔
مگر بادشاہ کی بے ہمتی اور بزدلی سے

یہ تجویز ناکام رہی ۔ بادشاہ کو اولاً اندھا پھر قید کرکے مارڈالا پھر رفیع الدولہ اور رفیع الدرجات بادشاہ بنائے گئے اور بالآخر روشن اختر کو محمد شاہ کے لقب سے بادشاہ بنادیا گیا۔ نظام الملک کو مالوہ کا صوبہ دار بنادیا گیا۔ سید حسین دکن کے صوبہ دار تھے ۔ نظام الملک مکتوبات شاہی کی بناء پر آگرہ کی طرف بڑھے مگر کسی وجہ سے اپنی فوج کو لے کر برہان پور کی طرف لوٹ گئے ۔ پہلے دلاور علی خاں اور عالم علی خاں سے مقابلے ہوئے اور وہ دونوں مارے گئے۔ سید حسین علی خاں بادشاہ کو ساتھ لیے پچاس ہزار فوج کے ساتھ نظام الملک کے خاتمہ کے لئے دکن پر حملہ آور ہوئے ۔ فتح پور سیکری سے آگے تورہ کی منزل میں بادشاہ سے ملاقات کرکے اپنے خیمہ کی طرف آرہے تھے کہ میر حیدر کاشغری نے تلوار کے ایک ہی وار میں انہیں ختم کردیا ۔ سید عبداللہ خاں وزیر اعظم کو بھائی کے قتل کی اطلاع ملی تو سلطان ابراہیم بن رفیع الشان کو بادشاہ بنالیا گیا اور سید عبداللہ بھائی کے انتقام کے لئے نکلے ۔ شاہی فوج سے مقابلہ کے بعد گرفتار ہوئے اور چند ہی روز میں صدمہ سے فوت ہوگئے ۔ اس طرح سید برادران کا خاتمہ ہوا ۔ محمد شاہ جانتا تھا کہ نظام الملک کی جوانمردی، اخلاص اور صائب تدبیری ہی سے سید برادران کا اقتدار ختم ہوا ۔ بادشاہ نے ان کی صوبہ داری دکن و مالوہ کو بحال رکھا اور وزیر سلطنت بھی بنادیا نظام الملک نے اصلاح مملکت کے لئے بادشاہ کو مفید مشورے دیئے لیکن دوسرے امرائے مخالفانہ باتیں کہہ کر بادشاہ کو نظام الملک سے بدظن کردیا ۔ اسی لئے دکن میں فتنوں نے سر اٹھایا تو انہیں دکن آنا پڑا ۔ بادشاہ نے دکن کی ان جدید خدمات کا اعتراف کیا اور نشان پسندیدگی کے طور پر ایک ہاتھی بھیجا، جواہرات عطا کئے اور آصفجاہ کا خطاب دیا ۔ مگر درباری

سازشوں اور حاسدانہ عداوتوں نے یہ بھی کیا کہ مالوہ اور گجرات کے صوبے واپس لے لئے۔

ہندوستان کا قصرِ حکومت متزلزل ہو چکا تھا، دربار کی بدعنوانیوں اور اندرونی سازشوں نے ایک طرف ہندوستان میں امن کی فضا کو جنگ سے بدل دیا تھا دوسری طرف نادر شاہ نے موقع کو غنیمت سمجھ کر ہندوستان پر حملہ کر دیا۔ ہر چند آصف جاہ نے حالات پر قابو پانے کی کوشش کی اور دولتِ تیموریہ کی گرتی ہوئی دیواروں کو سنبھالنا چاہا مگر زلزلہ ایسا شدید تھا کہ اگر وہ ایک طرف سنبھالا دیتے تھے تو دوسری طرف سے آفت برپا ہو جاتی تھی۔ نادری حملہ کی خبروں کو نری گپ سمجھنے والے تن آسان اور عیاش امیر میدانِ جنگ میں ہمت ہار کر بیٹھ گئے اور اتنا ہی غنیمت ہوا کہ شکست کو صلح سے تبدیل کر لیا۔ بادشاہ نے صلح کر لی، نادر شاہ تاوانِ جنگ لے کر واپس جانے والا تھا کہ برہان الملک نے ملک کے ساتھ غداری کی اور قہرِ خداوندی نادر شاہ کی صورت میں نمودار ہوا، اور اس نے دہلی کے فاسقوں، فاجروں اور جفاکار غداروں کا قتلِ عام کے ذریعہ صفایا کر ڈالا۔ کچھ شک نہیں کہ بہت سے لوگ بے قصور عام رعایا کے افراد بھی ہلاک ہوئے مگر جب عذابِ الٰہی آتا تو پھر تخصیص نہیں کی جاتی۔ اس عہد کے لوگوں نے بھی اسے عذابِ الٰہی سمجھا اور یہ شعر زبان زدِ عوام ہو گیا۔

دیدۂ عبرت کشا و قدرتِ حق را ببیں
شامتِ اعمالِ ما صورتِ نادر گرفت

دہلی میں کشت و خون کی ندیاں جاری تھیں اور غضبِ الٰہی کے فرشتے نادری سپاہیوں کی صورت میں نازل ہو رہے تھے۔ اس وقت کسی میں ہمت اور حوصلہ نہ تھا کہ اس مصیبت کو دور کر سکے اور نادر شاہ کے سامنے جا کر اسے اس

قتل وغارت سے روکنے کے لیے ایسے وقت آصفجاہ سامنے آئے۔ نادر شاہ غضب مجسم جو بیٹھا ہوا تھا، آصفجاہ اپنی زندگی کی قربانی کا یقین کر کے گلے میں تلوار حائل کئے نادر شاہ کے سامنے گئے اور نہایت جرأت کے ساتھ یہ شعر پڑھا:

"کسی نماند کہ او را بہ تیغ ناز کشتی
مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشتی"

نادر شاہ پر آصفجاہی سفارش کا اتنا اثر ہوا کہ فوراً قتلِ عام بند کر دیا اور محبت کے لہجہ میں کہا۔ "یہ ریش سفیدت بخشیدم"

آصفجاہ کی قدر و منزلت نادر شاہ کے دل میں اس قدر تھی کہ وہ چاہتا تھا انہیں دہلی کا بادشاہ بنا دے مگر آصفجاہ تختِ دہلی کے اس قدر مخلص اور وفادار تھے کہ اس پیشکش کو قبول نہ کیا۔ نادر شاہ واپس گیا۔ آصفجاہ دکن واپس ہوئے اور یہاں کی طوائف الملوکی دور کر کے اندرونی انتظام میں مصروف تھے کہ ۱۷۴۸ء میں احمد شاہ ابدالی کے حملہ کی خبر ملی، وزیر سلطنت اسی جنگ میں مارے گئے۔ ابدالی نے آصفجاہ کو منصب وزارت پیش کیا مگر انہوں نے اس وقت بھی اسے قبول کرنے سے انکار کیا۔ برہان پور میں ۹ ذی الحجہ کو اپنے مالک حقیقی سے جا ملے اور خلد آباد شریف میں سید برہان الدین کے روضہ میں آپ دفن ہوئے۔

آصفجاہ اول نے اپنی وفات سے چند ساعت پہلے ایک وصیت نامہ لکھا جو نواب ناصر جنگ کے نام تھا۔ اس وصیت نامہ سے آصفجاہ کی سیر و شمائل اور ان کے تدبر و فراست پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ وصیت ایسے وقت لکھی گئی جب آپ اس دنیا اور اس کی ساری شوکتوں اور عظمتوں کو چھوڑ رہے تھے اس لئے یہ ہر قسم کے تکلف اور تصنع سے پاک ہے۔ مرتب "حیات عثمانی" نے اس وصیت کے چند مضمون کو درج کیا ہے جو ایک دستور العمل دوامی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ اقتباسات نقل کئے جاتے ہیں۔

ابنی آدم کے ساتھ نرمی انسان اللہ کا پیدا کیا ہوا ہے۔ اسکی تباہی میں تامل سے کام لیا جائے۔ مجرم کو قاضی کے حوالے کرے، قاضی شرع کے مطابق فیصلہ کرے، رئیس اسے نافذ کر دے اور اپنی طرف سے کسی کے قتل کا حکم نہ دے۔

۲۔ مملکت کا دورہ آئین مملکت نظم و نسق اور اپنی زندگی کو سفر پر موقوف رکھے۔ نئے قیام، نئی آب و ہوا اور سایہ و چشمہ کو کبھی ہاتھ سے نہ دے۔ اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتا ہے۔ سیروا فی الارض۔ ہاں چھاونیوں میں چند دن کی اقامت ضروری ہے کیونکہ سفر میں تمام جاندار تھک جاتے ہیں۔ سپاہیوں کو ان کے وطن کے قریب متعین کرنا چاہیئے تاکہ دور جانے کے باعث وہ اپنے فرائض زوجیت ادا کرنے سے محروم نہ ہو جائیں۔

۳۔ خلقِ خدا کی خدمت مخلوقات کے کاموں کا رئیس کی ذات سے متعلق ہونا محض اللہ تعالیٰ کا فضل ہے ادائے فرض و واجب کے بعد اپنے وقت کو نظم امور متعلقہ میں تقسیم کر دے۔ کسی وقت بیکار نہ بیٹھے، رات دن خلق خدا کی خبر گیری کرتا رہے۔

۴۔ بزرگوں کی عزت جاننا چاہیئے کہ ہماری سلطنت بزرگوں کے انفاس پاک کی برکت کا نتیجہ ہے۔ میں نے دعا کرنے والوں کی عزت و توقیر کو تمام امور سلطنت پر مقدم رکھا ہے۔ ہمیشہ غربا و فقرا سے جو رحمت خداوندی کا دروازہ ہیں استمداد کرتا تھا۔ رئیس کو اسی طریق پر عمل پیرا رہنا چاہیئے۔

۵۔ حق تلفی نہ کی جائے زمین آسمان اور مخلوقات پہلے سے چلے آرہے ہیں اس لئے روئے زمین کو صرف اپنا حصہ سمجھ کر کسی کی حق تلفی نہ کی جائے۔

۶۔ نظم و نسق تاریخ سے واضح ہے کہ ملک دکن چھ صوبوں پر مشتمل ہے ہر صوبہ میں مستقل بادشاہ تھے۔ چنانچہ اس ملک میں لاکھوں سپاہی اپنا پیٹ پالتے تھے۔ حضرت عالمگیر کے عہد سے یہ ساری سرزمین ایک شخص سے متعلق ہوگئی۔ رفتہ رفتہ حق سبحانہ نے اپنے کرم سے مجھ گنہگار کو عطا فرمائی اور مجھے اپنی خلقت پر مقدم بنا دیا۔ اس وقت تک مخلوق خدا کی پاسبانی قدر دانی کرتا رہا۔ ضروری ہے کہ میرے بعد ہر خاندان کی خبر گیری کی جائے۔ ان کے افراد کو باری باری سرکاری کاموں پر مامور کیا جائے۔ خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، عہدہ دار سال بہ سال بدلنے چاہئیں۔ ایسا نہ ہو کہ دائمی تقرر سے دوسرے محروم ہو جائیں۔

۷۔ بھائیوں سے حسن سلوک چھوٹے بھائیوں کو اپنے بیٹے سمجھو۔ ان کی تربیت و پرورش لطف و محبت سے کرو تاکہ وہ غمخوار بنے رہیں۔

۸۔ رذیلوں سے بچو غمازوں کی باتیں نہ سنو، رذیلوں اور عامیوں کو اپنی محفل میں جگہ مت دو۔ اس سے سلطنت کے وقار اور رعب کو نقصان پہونچتا ہے۔ اور کمینے دربار میں رسائی کے گھمنڈ پر دوسروں کو ایذا پہونچانے کے درپے ہو جاتے ہیں۔

۹۔ کمالِ ایثار ایران کا قہرمان بادشاہ نادرشاہ جب دہلی پہونچا تو ایک روز اس نے اپنی عنایت سے ہندوستان کی حکومت مجھے دینے سے متعلق ذکر کیا۔ میں نے فی الفور عرض کیا ہم لوگ آبا و اجداد سے بادشاہ کے نوکر چلے آتے ہیں۔ آپ کی تجویز کی وجہ سے نمک حرام بن جاؤں گا۔ بادشاہ مجھے بدعہد اور قول و قرار کا جھوٹا قرار دیں گے۔ چونکہ نادرشاہ سخن سنج اور معنی آفرین طبیعت رکھتا تھا۔ میرے جواب سے بہت خوش ہوا اور میری تعریف کی۔

۱۰۔ صلح کوشی! جنگ میں حتی الامکان اقدام نہ کرو جس حد تک ممکن ہو لڑائی جھگڑے کو روکنے کی کوشش کرو۔ فریقِ ثانی پیش قدمی کرے تو حق کو اپنی جانب جان کر ناچار قدم اٹھایا جائے۔

۱۱۔ دعائے خیر اب جاؤ۔ اپنے کارخانہ کے لوگوں کو کام پر لگاؤ، اب دو تین گھنٹے سے زیادہ وقتِ حیات باقی نہیں ہے۔ میں نے تمہیں خدا کے حوالے کیا، وہ تمہیں ہدایت دے۔ ہر حال میں تمہارا معین و مددگار رہو۔ اور اپنی عنایت کا سایہ تمہارے سر پر ہمیشہ رکھے۔ آمین۔

اس آخری وصیت یا دستور العمل کا ذکر لالہ منشا رام پیشکار مولف رسالہ دربار آصفیہ مرتبہ ۱۱۷۵ھ/ ... میں کیا ہے کہ پیشکار موصوف حضرت آصفجاہ اول کی نزع کے وقت تھے۔ اور ان کو شش کر بیٹل ـــ نوٹ کرتے گئے۔ اس دستور العم

ظاہر ہے کہ انہیں اللہ تعالیٰ پر کس قدر بھروسہ اور توکل تھا، مخلوقِ خدا کی بھلائی اور خیر خواہی کس قدر مطلوب تھی اور عدل و انصاف کا مقام کس قدر بلند تھا۔

مرتبِ "حیاتِ عثمانی" نے آصفجاہان دوم تا ششم کا اجمالی تذکرہ کرنے کے بعد کتاب کے دوسرے حصہ میں حضرت آصفجاہِ ہفتم کے سوانحِ حیات کے واقعات کو جمع کر دیا ہے کیونکہ عہدِ عثمانی اپنی گوناگوں خصوصیات کے لحاظ سے دولتِ آصفیہ کی تاریخ میں ممتاز ہے۔ اس شاندار عہد میں مختلف قسم کی اصلاحات و ترقیات کا سلسلہ ہر رنگ میں نمایاں نظر آتا ہے۔ الغرض آصفجاہِ ہفتم حیدرآباد جدید کے بانی ہیں۔

اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خاں آصفجاہ ہفتم ۲۹ رجمادی الثانی سنہ ۱۳۰۳ھ م ۵ راپریل ۱۸۸۶ء بروز سہ شنبہ بوقت ۹ بجے شب حویلی قدیم میں پیدا ہوئے، آپ سب سے پہلے صاحبزادے نہ تھے بلکہ آپ سے پہلے دو صاحبزادیاں اور ایک صاحبزادہ میر فاروق علی خاں بہادر پیدا ہوچکے تھے۔ میر فاروق علی خاں جو ۲۶ ربیع الاول سنہ ۱۳۰۱ھ کو پیدا ہوئے تھے یکم ذی قعدہ سنہ ۱۳۰۲ھ کو انتقال کر گئے۔ گویا اس طرح مشیت نے آپ کو بطور آصفجاہ منتخب کرلیا۔

۳ ذی قعدہ سنہ ۱۳۰۷ھ بروز یکشنبہ عشرت محل میں مولوی نور الحسن کے ذریعہ آپ کی رسم بسم اللہ ادا ہوئی۔ اور عفراں مکاں نے عربی و فارسی کی تعلیم کے لئے مولوی انوار اللہ خاں (بانی جامعہ نظامیہ) علامہ سید علی شوستری اور نواب عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی کو اتالیق مقرر کیا۔ ۶ ربیع الثانی سنہ ۱۳۲۷ھ کو انگریزی تعلیم کے لئے مسٹر بی ایجرٹن کا تقرر کیا گیا، مشرقی طریقۂ تعلیم سے عربی زبان میں اتنی مہارت حاصل کی کہ

عربی علم نزدا ستہ انشا پردازی پر قادر ہوئے۔
فارسی نثر و نظم دونوں میں کمال حاصل
کیا، انگریزی میں بے تکلف کلام کرنے
اور بلا تکان لکھنے میں عبور پیدا کیا اور
اردو زبان میں تو اپنے اسلوب تحریر و
انداز بیان کے موجد ہیں ۔

حضرت غفران مکاں نے
آپ کی تعلیم و تربیت کے ساتھ آپ کا
علحدہ قیام بھی ضروری سمجھا تا کہ
آزاد فضا میں قوت فکر و استعداد حکمرانی
میں وسعت پیدا ہو۔ لہذا آپ کی سکونت
کے لئے کنگ کوٹھی پسند کی گئی۔ کنگ کوٹھی
دراصل عہدوی پٹھانوں کے جمعدار
نواب کمال خاں، کمال یار جنگ کی
ملکیت تھی۔ اس کوٹھی کی تعمیر کے وقت
وہ صرف کمال خاں تھے (دیکھیے ذی قعدہ
۱۳۲۲ھ کو تقریب دربار جشن سالگرہ
خان بہادر اور کمال یار جنگ کا
خطاب عطا ہوا اور ۲۷ ذی الحجہ
۱۳۲۳ھ کو انتقال ہوا) کوٹھی کے
تمام شیشہ جات و سامان آرائش پر
K.K لکھا ہوا تھا جو کمال خاں کے نا
کو ظاہر کرتا تھا۔ جب کوٹھی حضرت غفران مکاں
نے خرید کر لی تو اس کے ساز و سامان کو تلف
نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اور اس لفظ K.
کا حل بھی مقصود تھا۔ اس لئے کنگ کوٹھی
نام تجویز ہوا۔ اور ولیعہد دولت آصفیہ
یکم صفر ۱۳۱۸ھ کو کنگ کوٹھی میں
قیام کے لئے تشریف لائے ۔

حضرت غفران مکاں نے اپنے
جانشین کی تعلیمی اخلاقی اور فوجی تعلیم
تربیت کے ساتھ انہیں امور سلطنت
مہمات ملک داری سے واقفیت کا
انتظام فرمایا۔ حضرت غفران مکاں
کے ملکی اور سیاسی سفروں میں اپنے
کو ساتھ رکھتے تاکہ مشاہدہ سے خود
لئے ایک عملی راہ پیدا کریں۔ نیز ہر
سکریٹری آپ کی خدمت میں کاغذ
پیش کرتے تاکہ انتظامی امور سے
آپ کو واقفیت ہو ۔

حضرت غفراں مکاں کی چہل سالہ جوبلی یا جشن سالگرہ ۱۸ شوال سنہ ۱۳۲۳ھ کی تقریب نماز جمعہ سے شروع ہوئی اس جشن میں ذات شاہانہ کے ساتھ ولیعہد کی ذات بھی خصوصی امتیاز کا مرکز بنی رہی ۔ اس موقع پر بھی حضرت غفراں مکاں نے اپنے طرز عمل سے ایک عجیب اور موثر سبق دولت آصفیہ کے ہونے والے سلطان کو دیا یہ شعائر اللہ کی تنظیم کا سبق تھا۔ یہ اعلان کر دیا گیا تھا کہ جب حضرت غفراں مکاں مسجد میں داخل ہوں، آداب مسجد کے مد نظر انہیں صرف السلام علیکم کہا جائے۔ حضرت آصفجاہ ہفتم نے اس سبق کو عملاً ہمیشہ اپنی زندگی میں دہرایا۔

۱۹ صفر سنہ ۱۳۲۴ھ کو ایڈن گارڈن میں سلطان باپ نے اپنے بیٹے کا عقد مرشد زادہ جہانگیر پادشاہ کی صاحبزادی سے کر دیا۔ ۸ محرم سنہ ۱۳۲۵ھ بروز پنجشنبہ آپ کے پہلا صاحبزادہ پیدا ہوا۔ جن کا نام نواب میر حمایت علی خاں اعظم جاہ بہادر رکھا گیا۔ ۱۵ ذی قعدہ سنہ ۱۳۲۵ھ بروز شنبہ دوسرے صاحبزادے نواب میر شجاعت علی خاں معظم جاہ بہادر کی ولادت ہوئی۔

۴ رمضان سنہ ۱۳۲۹ھ کو صرف چند دن کی علالت کے بعد حضرت غفراں مکاں نے کلمہ طیبہ کا ورد کرتے ہوئے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ اسی دن حضرت آصفجاہ ہفتم کی مسند نشینی کا اعلان کیا گیا۔ ۵ رمضان سنہ ۲۹ھ م ۳۰ اگست سنہ ۱۹۱۱ء حویلی منجھلی بیگم میں دربار تعزیت منعقد ہوا جہاں ریذیڈنٹ نے پرسہ دیا اور آصفجاہ ہفتم نے جواباً کہا کہ حتی الامکان اپنے والد محترم کے نقش قدم پر چل کر اپنی رعایا اور ملک کو فائدہ پہونچائیں گے۔ ۷ رمضان سنہ ۲۹ھ م یکم ستمبر سنہ ۱۹۱۱ء بروز جمعہ چار بجے آپ کی مسند نشینی کا دربار چومحلہ میں منعقد ہوا۔ ۱۴ رمضان سنہ ۲۹ھ کو

اعلیٰ حضرت کی سواری کا جلوس

حویلی قدیم سے روانہ ہوا اور چار مینار سے ہوتا ہوا چو محلہ پہونچا۔ سر یمین السلطنت مہاراجہ کشن پرشاد بہادر کو یہ اعزاز حاصل تھا کہ اعلیٰ حضرت کی خواصی میں مورچل لئے حاضر تھے۔ جلوس سے قبل اعلیٰ حضرت نے مہاراجہ بہادر کو جواہرات دایک کنٹھہ مروارید ایک گھڑی طلائی مع زنجیر طلائی مرصع کار اور دو عدد انگشتری جواہر نگار) سرفراز فرمائے۔ اعلیٰ حضرت کے ہاتھی کے عقب میں کرنل افسر الملک کا ہاتھی تھا اور اس کے بعد ۳۵ ہاتھی سجے سجائے شریک جلوس تھے۔ جن پر مستقی اور مجاز عمائد سوار تھے' امراء ۔ بہ سواری اسپ شریک جلوس تھے' دربار میں تمام امراء' جاگیرداروں' منصبداروں اور جمعداروں نے نذریں پیش کیں' نیز بلا امتیاز و تخصیص ہر قوم کے مختلف لوگوں کے نام بارہ ہزار سالانہ کے یومئے جاری کئے گئے۔

مسند نشینی کے بعد سب سے پہلا کام

عوام کو طاعون سے بچانے کیلئے انسدادی تدابیر اختیار کرنا تھا۔ ۹ ستمبر ۱۹۱۱ء کو ناظم طبابت کو پلیگ کمشنر مقرر کیا گیا اور انہوں نے سیگریگیشن کیمپ قائم کر کے متاثرہ رقبے کے گھروں کو خالی کرانا شروع کیا۔ پرانے رسم و رواج کے پابند جہلاء کو یہ تجویز پسند نہ آئی۔ لودھے واڑ اور دھول پیٹ کے لوگوں نے اس انتظام سے ناراض ہو کر بلوہ کر دیا۔ چار ہزار کے قریب آدمیوں کا مجمع اکٹھا ہو کر کنگ کوٹھی فریاد لے کر چلا گیا۔ آپ نے کسی گھبراہٹ کا اظہار کئے بغیر رعایا کی تسلی کے سامان کئے۔ رفتہ رفتہ لوگ اس انتظام کی خوبی سے واقف ہوئے اور کسی قسم کی بدنظمی کے بغیر انتظام عمل میں آیا۔

آخر ذی قعدہ ۱۳۲۹ھ کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے لئے پانچ لاکھ کا گرانقدر عطیہ دیا جو آپ کی علم نوازی کا مظہر ہے۔ سال حج بدل کے لئے پانچ ہزار روپے

عنایت فرمائے کہ امورِ سلطنت کی نگہداشت کی وجہ سے حج کو نہ جاسکتے تھے اس لئے شعائرِ اسلام کے احترام میں حجِ بدل کا اہتمام کیا۔

پائیگاہوں میں انتظامی اصلاحات کے لئے سر رائن ایجرٹن کو انسپکٹر جنرل پائیگاہ مقرر کیا گیا اور پائیگاہوں کا انتظام کُلّی طور پر ان کے سپرد کر کے متعدد کمیشن قائم کئے گئے اور ان تمام کمیشنوں کی رپورٹوں کے پیشِ نظر اعلیٰ حضرت نے ایک تاریخی تفصیلی فرمان جاری فرمایا۔ جس میں نہ صرف تینوں پائیگاہوں کے امراء اور حصہ داروں کے حقوق کا تصفیہ کیا گیا بلکہ پائیگاہوں اور صرفِ خاص اور دیوانی کے مابین مسائل کو بھی سلجھایا گیا۔

۲۵ر جمادی الثانی ۱۳۳۰ھ چو محلہ میں عید نوروز کا دربار منعقد ہوا اس میں اعلیٰ حضرت نے اپنے بعض افسران اور راجہ صاحب گدوال اور راجہ صاحب ونپرتی کو بیٹھنے کی اجازت دی اس سے ان کا اعزاز بڑھا۔

اوائل ۱۳۳۲ھ میں ایک سازش کا علم ہوا۔ زیر ۲۳ ربیع الثانی ۳۲ھ یہ کر فرمان جاری کیا کہ "میری ریاست اور میرے مدار المہام (مہاراجہ کشن پرشاد بہادر) کے خلاف حمی الدولہ بہادر نے جو اشتراک کی جس کا ثبوت مجھے ملا، انہوں نے اس کا اعتراف بھی کیا، اس کی سزا میں حمی الدولہ بہادر خدمات صدر الصدوری، ناظمِ امورِ مذہبی سے معطل کئے گئے، ان کے تمام خطابات منسوخ کئے گئے ان کا دیوڑھی میں آنا بھی موقوف کیا گیا۔ یہ حکم جریدہ میں اطلاع کے لئے شائع کیا جائے تا کہ دوسروں کو عبرت ہو۔"

اس اقدام سے اہلکاروں کو بروقت تنبیہ ہوگئی کہ ان کا حکمران آنکھیں بند کر کے مصروفِ عشرت نہیں بلکہ اپنے فرائض ملک داری کو پوری سرگرمی اور کھلی آنکھ سے انجام دے رہا ہے۔ اس

واقعہ نے احتساب عثمانی کا سکہ بٹھادیا اس عتاب کا مقصد محض اصلاح تھی۔ چنانچہ ۳۱ رمضان ۱۳۲۵ھ کو ان کا خطاب ان کو واپس دیدیا گیا اور عفو شاہی کا نمونہ بھی نمایاں ہوگیا۔

سالگرہ کی رسم قدیم سے چلی آتی ہے۔ شروع میں سالگرہ دربار بڑے اہتمام اور شان سے ہوتے تھے۔ آصفجاہ ہفتم نے ان میں سادگی اور اختصار کو رواج دیا۔ ان تقریبوں میں ارتقائی اور اسلامی رنگ پیدا ہوا۔ سابق میں بادشاہ اپنے وقت کے بادشاہ ہوتے تھے لیکن اعلیٰ حضرت نے وقت کی پوری پابندی شروع کی۔ اور سالگرہ کی تقریب کو ایک مستقل تقریب عید بنا دیا جس میں عوام بھی حصہ لینے لگے۔

سالگرہ کے جلسہ میں رقص و سرود کی محفلیں بھی گرم ہوتے لگیں، اعلیٰ حضرت نے اس نقص کی اصلاح کے لئے فوراً جریدہ م ۱۹ اسفندار ۱۳۴۱ف شائع کیا کہ :-

"میں دیکھ رہا ہوں کہ ہر سال میری سالگرہ کی خوشی میں رعایا چندہ جمع کرکے خوشیاں مناتی ہے۔ اس کا صرف بیجا ہوتا ہے اس کا مصرف ایسا ہونا چاہئے جس سے ایک طرف غریبوں کو فائدہ پہونچے اور دوسری طرف پبلک پر اچھا اثر ہو لہٰذا آئندہ سے جہاں کہیں اس قسم کا چندہ جمع ہو اس سے غریبوں کو کپڑا اور غلہ دیا جاوے اور وظائف تعلیمی جاری کئے جادیں یا بہ حصول اجازت کوئی رفاہ عام کا کام کیا جاوے۔ بہرحال ایٹ ہوم یا رقص و سرود کے جلسے یک قلم موقوف رہیں، جس سے بہ عوض فائدے کے اس کا اثر سوسائٹی اور پبلک پر بُرا پڑتا ہے۔"

اس حکم نے خوشی و خرمی کا فلسفہ بدل دیا۔ لہو و لعب و رقص و سرود کی محفلوں کو علمی مذاق سے تبدیل کردیا

چندہ کے جمع و خرچ کی بدعنوانیاں بھی یک قلم دور ہو گئیں۔

سالگرہ وغیرہ کے سلسلہ میں نذر پیش کرنے کا سلسلہ بہت قدیم سے چلا آرہا ہے۔ آصفجاہ ہفتم کے عہد میں اس کا سلسلہ کسی قدر وسیع ہوا۔ یہ کوئی جبری اور قہری امر نہ تھا۔ البتہ اضلاع کے عہدہ داروں نے اس میں کسی قدر غلو کیا تو اعلیٰ حضرت نے اس کی اصلاح کے لئے فرمان مورخہ ۱۶ تیر ۱۳۳۴ف جاری کیا کہ

"میری سالگرہ کے موقع پر منجانب رعایا جو نذور پیش ہوتے ہیں اس کی وجہ سے ہر سال کچھ نہ کچھ بدعنوانی تھوڑی بہت پیدا ہوتی ہے لہٰذا میں حکم دیتا ہوں کہ آئندہ سال سے یہ طریقہ قطعاً موقوف رہے۔ البتہ جب کبھی میں ممالک محروسہ کے کسی مقام پر جاؤں تو صرف ضلع، صوبہ یا تعلقہ کے عہدہ دار و سربرآوردہ اشخاص مقامی نذور بالمشافہ پیش کر سکتے ہیں۔ اور اس حد تک کچھ قباحت نہیں ہے۔ میرے اس حکم سے تمام سابقہ فرامین کی جو کہ خاص اس باب میں جاری ہوئے تھے (...) تنسیخ ہو گئی ہے اور آئندہ جو شخص اس کی خلاف ورزی کریگا وہ بعد تحقیقات سرکار کے ہاں جوابدہ ہوگا۔ آخر میں، میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ میری رعایا نے زمانہ سابقہ سے اپنے مَلک و مالکہ کے ساتھ خیرخواہی وفاداری کا جو ثبوت دیا ہے وہ ہر طرح قابل ستائش ہے۔"

سالگرہ کا آغاز ہمیشہ دوگانہ شکر گذاری سے ہوتا۔ اعلیٰ حضرت سب سے پہلے مسجد میں اپنے مولیٰ کے حضور نذر عبودیت پیش کرتے اس کے بعد ہی دوسری تقریبات شروع ہوتیں۔ سنہ ۱۳۳۱ھ ہی میں حیدرآباد میں پہلی ہڑتال ہوئی۔ اس تجری پرکہ تاجران

پارچہ غلط کاغذات پیش کر کے سرکاری محصول غبن کر جاتے ہیں' افسران کروڑ گیری نے ۲ر شوال کو تاجران پارچہ کے گذشتہ دس سال کے بہی کھاتے ضبط کر لیے۔ اس پر تاجران نے باہم اتفاق کر کے ہڑتال کر دی' تاجران غلہ نے بھی ان کا ساتھ دیا اور اپنی دوکانیں بند کر دیں۔ سر اکبر حیدری جو اس وقت معتمد عدالت و کوتوالی تھے' دوکانداروں کو سمجھایا مگر وہ نہ مانے۔ معاملہ کے تمام پہلوؤں پر غور کر کے طے کیا گیا کہ محکمۂ کروڑ گیری کو صرف ۱۳۳۰ف کے کھاتوں کی تنقیح کی اجازت ہے اور یہ کہ [illegible] بند کر دیے جائیں چنانچہ یہ ہنگامہ فرو ہوا اور ۵ر شوال کو دوکانیں کھول دی گئیں۔

دولت آصفیہ ہمیشہ سے علمی فیاضیوں اور علمی سرپرستیوں میں ممتاز و شہرۂ آفاق رہی ہے۔ اعلیٰ حضرت آصفجاہ ہفتم کا عہد تو اس سلسلہ میں بے نظیر ہے مصنفین کو یک مشت یا ماہانہ امداد' بعض کتب کے متعدد نسخے خرید کر مدد' تعلیم گاہوں اور مدارس کے نام گرانقدر امداد' یہ سلسلہ نہ صرف حیدرآباد سے باہر' بلکہ ہندوستان سے باہر بھی وسیع ہوا۔

باب حکومت کے قیام کے بارے میں ۲۱ر نومبر ۱۹۱۹ء کو جو دربار افتتاح باب حکومت منعقد ہوا اس کے متعلق جریدہ میں ارشاد فرمایا کہ

آج کا دربار ایک ایسے امر کو نمایاں کرنے کی غرض سے منعقد کیا گیا ہے۔ اس مملکت کی تاریخ میں مہتم بالشان واقعہ ہے۔ اس مملکت کا قدیم طریق حکمرانی ذاتی حکمرانی رہا ہے جس کا انصرام بذریعۂ دیوان ہوتا۔ یہ استثنائے چند قابل قدر افراد کے وزرائے سلف نے آقا کی حکومت میں ضعف پیدا کیا اور فلاح عامہ میں نقصان پیدا کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ حضرت غفران

ان نقائص کو محسوس کر کے ۱۸۹۲ء میں "قانونچہ مبارک" نافذ فرمایا۔ اور قواعد قانونچہ بھی شائع فرمائے۔ مابدولت نے مسائل انتظام مملکت کا بہ نظرِ غائر ملاحظہ کیا اور نقائص کو دور کرنے انتظام کا بارِ گراں خود برداشت کرنا قبول فرمایا۔ پانچ سال کے خاص ذاتی تجربہ نے ظاہر کر دیا کہ موجودہ انتظام میں تبدیلی کی ضرورت ہے، ممالک کے تجربہ نے ثابت کر دیا کہ جو حکومت کونسل کے ذریعہ عمل میں آئے وہ ایک عہدہ دار کی حکومت سے ہر آئینہ بہتر ہے۔ نظر برآں مابدولت نے بذریعہ فرمان امروزہ ایک اگزیکٹیو کونسل (یعنی باب حکومت) قائم فرمایا ہے جو ایک صدر اعظم، سات ارکان معمولی اور ایک رکن اختصاصی (جن سے کوئی صیغہ متعلق نہ ہوگا) سے مرکب ہوگی۔ انتخاب ارکان میں نہایت احتیاط سے کام لیا گیا اور ایسے اشخاص مقرر کئے گئے جن کا تجربہ اور قابلیت مسلّم ہے جیسے صدر اعظم سر علی امام ہیں جو تعارف کے محتاج نہیں کیونکہ برٹش انڈیا میں ان کے کارنامے سب پر روشن ہیں۔

اشاعت تعلیم، ذرائع معیشت کی ترقی، تجارت و صنعت و حرفت کی ترغیب، حفظانِ صحت کے جدید اصول پیدا کرنے کی تدابیر، ذرائع آمد و رفت کا قیام اور ان کی توسیع اور ایسے ہی بہت سارے مسائل ابھی تصفیہ طلب ہیں۔ مابدولت اپنے تمام امراء عہدہ داران اور عزیز رعایا کو اس جدید انتظام کی طرف متوجہ و مائل کر کے متوقع ہیں کہ وہ سب اپنی ارادت اور عقیدت سے اس کو کامیاب بنانے کی کوشش کریں۔

عہد عثمانی کا ایک اور بے نظیر کارنامہ عدالتی اور عاملانہ اختیارات کو الگ کرنا ہے۔ ۲۹ شعبان ۱۳۳۹ھ ۸ مئی ۱۹۲۱ء کے فرمان کے ذریعہ عدالتی اور مالی اقدامات کے لئے جداگانہ محکمے

قرار دیئے اور ہائیکورٹ کی تنظیم کر کے
شاہی اختیارات عدلیہ کے سپرد فرمائے
عہد عثمانی کا ایک اور عظیم کارنامہ
۲۶ ذی الحجہ ۱۳۳۶ھ کو جامعہ عثمانیہ
کا قیام ہے جہاں اردو ذریعہ تعلیم
قرار دینے کے ساتھ طلباء کی اخلاقی تربیت
اور تمام سائنٹیفک مضامین کا شوق
دلانا بھی مطمح نظر قرار دیا۔ ساتھ ہی
اس کی کامیابی اور اغراض و مقاصد کی
تکمیل کیلئے ایک دارالترجمہ قائم کیا جس
میں سینکڑوں علمی اور فنی کتابوں کا ترجمہ
کیا گیا۔

عہد عثمانی کا ایک اور حیرت انگیز
کارنامہ اردو نستعلیق ٹائپ کی ایجاد ہے
اور نتیجتاً طباعت اور صحافت کے
زریں دور کا آغاز نہایت شاندار ہے۔

عہد عثمانی کے دوسرے کارناموں
میں محکمہ آثار قدیمہ کا قیام اور اجنتا
ایلورہ اور پوری مملکت کے آثار قدیمہ کا
تحفظ، نظام اسٹیٹ ریلوے اور سڑکوں
کے جال کے ذریعہ مواصلات کا وسیع انتظام
پبلک آسائش، آرام اور مفاد کیلئے عمارتوں
کی تعمیر، سٹی کالج، عثمانیہ ہسپتال، یونانی
صدر شفاخانہ اور طبی کالج، کتب خانہ
آصفیہ، باغ عامہ کی عمارتیں، صلح سرائے،
شہر کی سڑکیں، پانی کی سربراہی، ڈرینج
کا انتظام وغیرہ، صنعت و حرفت و
زراعت میں عظیم الشان ترقیاں،
عثمان ساگر، حمایت ساگر، نظام ساگر،
اور متعدد بندوں اور نہروں کی تعمیر،
ٹپہ اور سکہ کی اصلاحات، ان تمام
اصلاحات و ترقیات کا سرچشمہ ذات شاہانہ
تھی جن کی نظر انتخاب قابل اور ممتاز
اصحاب پر پڑی اور ان کی کوششوں سے
یہ کارنامے انجام پائے۔

حیات عثمانی کے تیسرے حصہ
"سیرۃ عثمانی" کے شروع میں مرتب نے
مصور فطرت خواجہ حسن نظامی کی سلطان دکن کی
کی قلمی تصویر کو پیش کیا ہے جسے
یہاں تمام و کمال نقل کیا جاتا ہے۔

"میر عثمان علی.....
سولی بھی نہیں جانتا" (حسن نظامی)
اس کے بعد مرتب نے سلطان دکن کے
مذہب کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کی
دو صورتیں ہیں۔ اول ان کا مذہب
بحیثیت بادشاہ، دوم بحیثیت
میر عثمان علی خاں۔ سلطانِ دکن
بہ حیثیت بادشاہ، کسی مذہب کا پابند
نہیں، وہ اپنی رعایا کے مختلف فرقوں
اور عقیدوں سے قطع نظر اپنی رعایا
کو اپنے مذہبی عقائد میں پوری آزادی
ہے۔ اور ضروری سمجھتا ہے کہ ان کے
عقائد و معابد کا احترام کیا جائے کہ یہ
اس کی رعایا کی پیاری چیز ہے۔ چنانچہ
جریدہ غیر معمولی م ۱۳ جمادی الثانی
۱۳۵۲ھ میں آپ نے اعلان فرمایا کہ
"میرا خاندانی مذہب و ذاتی
عقائد جو کچھ ہیں ان کی توضیح کی اس جگہ
چنداں ضرورت نہیں ہے کہ وہ عام آشکار
ہیں مگر اس کے قطع نظر بہ حیثیت رئیس
میں ایک دوسرا مذہب بھی رکھتا ہوں جس کو
صلح کل کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے
میرا اور میرے بزرگوں کا یہ شعار رہا ہے
کہ دنیا کے سب مذاہب کو ایک نظر سے
دیکھا جائے۔ سب کے ساتھ شیر و شکر
کا برتاؤ کر کے نیک نامی حاصل کی جائے۔
الحاصل میں اپنے آپ کو لامذہب خیال
کرتا ہوں۔ یعنی وہ لامذہب نہیں جس کو
دہریت کا لقب دیا جاتا ہے بلکہ وہ لا
جس میں الّا بھی شریک ہے۔ اس
مشرب پر مجھے اور میرے بزرگوں کو ناز
رہا ہے اور آئندہ رہے گا اور مجھے امید
ہے کہ اس کی تتبع میری اولاد بھی کرے گی"
میر عثمان علی خاں اپنی ذاتی
اور انفرادی حیثیت سے جس مذہب و
عقیدہ کے پابند ہیں وہ وہی مذہب ہے
جو نسلاً بعد نسلاً آپ کو صدیقی ورثہ
میں ملا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
سے محبت و عقیدت اتباع و جاں نثاری
اور مدح و ثنا ان کا شیوہ ہے۔ نعتیہ کلام

اتنا ہے کہ ایک مبسوط دیوان مرتب ہو جائے سیرتِ نبوی کی اشاعت میں شبلی نعمانی کی مالی اعانت، مدینۂ طیبہ میں برقی روشنی کا انتظام، قرآنِ مجید سے محبت و عشق، اشاعت کلام پاک کے لئے جوش، مختلف زبانوں مثلاً گجراتی، گورمکھی اور انگریزی میں تراجم کا انتظام، اسلامی اداروں کی سرپرستی، صحابۂ کرام ائمہ اہل بیت و آلِ اطہار سے محبت، بزرگانِ دین سے عقیدت سب پر ظاہر ہے۔

اعلیٰ حضرت کی رواداری کا یہ عالم ہے کہ آپ کی نظر میں ہندو، مسلمان کا تفرقہ بالکل مٹ جاتا ہے۔ اور آپ اس تفرقہ کو سننا بھی پسند نہیں کرتے۔ اخبار اورینٹ لکھنؤ کے ایڈیٹر نے اپنی ۵ر دسمبر ۱۹۲۵ء کی اشاعت میں دہلی میں اعلیٰ حضرت سے ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب انہوں نے ریاست کی ہندو رعایا کا ذکر کیا تو اعلیٰ حضرت نے فرمایا:

"مجھ کو مذہبی امتیاز کی گفتگو سے سخت نفرت ہے۔ میرے لئے رعایا میں نہ کوئی ہندو ہے نہ مسلمان ہے۔ ہندو، مسلمان دونوں میرے بچے ہیں۔ مجھ کو ان سے الفت ہے۔ مجھے اس روز بڑا فخر ہوگا جب میری رعایا حکومت خود اختیاری کے قابل ہو جائے گی۔ میں اپنی رعایا کی ترقی کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ذمہ دار اور جوابدہ ہوں۔"

ریاست کے ہندوؤں کو بھی اپنے بادشاہ سے بے پناہ عقیدت اور محبت تھی۔ ۱۹۳۲ء کے وسط میں، حیدرآباد کے سربرآوردہ سنتوز اور سناتنی رہنماؤں کا وفد اعلیٰ حضرت سے ملا اور بتایا کہ ریاست کے امن اور وقار کے خلاف سیاسی تحریک سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ سری کرشن اور رام کے ماننے والے ہیں اور

حکومت کے شکر گزار ہیں کہ ان کے مندروں اور عبادت گاہوں کے لئے ریاست سے جاگیریں دی گئی ہیں اور اچھا سلوک کیا گیا ہے۔ ایک مشہور اخبار نویس اور سناتن دھرم کے ممتاز رہنما پنڈت راج نرائن دہلوی نے سناتن دھرم سبھا کے دوسرے سالانہ جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "جب میں حیدر آباد کی طرف روانہ ہوا تو اخبارات کی اطلاعات کی بنا پر میرا خیال تھا کہ ریاست میں مندروں کی حالت قابل اعتراض ہے اور حکومت کی مطلق توجہ مندروں کی طرف نہیں۔ میں نے یہاں آکر تحقیقات کی تو یہ معلوم کرکے بے حد مسرت ہوئی کہ ہندو اخبارات کا بیان سراسر گمراہ کن اور جانبداری پر مبنی تھا۔ یہاں کے تمام مندروں اور معبدوں کو حکومت کی طرف سے مالی امداد کافی مل رہی ہے۔ اور مسلم معابد کی نسبت ہندوؤں کے مندر تعداد میں بہت زیادہ ہیں۔"

خاندان آصفیہ ہمیشہ سے رعایا کی مذہبی آزادی کا طرفدار رہا ہے اور کبھی کسی فرقہ رعایا کی ادائی مراسم و عبادات میں خلل انداز نہیں ہوا ہے۔

بہت سے کائستھ، چھتری، برہمن، تلنگے، مرہٹے، ریڈی وغیرہ آصفجاہی امرا میں شامل ہیں۔ اور بڑی بڑی جاگیرات سمستان اور مناصب کے مالک ہیں۔ اس فہرست میں بعض نام انگریزوں یا پارسیوں یا فرانسیسی نسل کے عیسائیوں اور سکھوں کے بھی ملتے ہیں جو پشتہا پشت سے مناصب پا رہے ہیں۔

مملکت آصفیہ کی بے تعصبی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ غیر مسلم ادارات مذہبی جن میں مندر، دھرم سالے، گوشالے جاترا، رتھوں کے جلوس، دیو کے جلوس، پروہت، نجومی، برہمن، بھکشا، استھان گرو کی مدد معاش، کتھا کہنے والے، گرجا، آتش کدے، گردوارے شامل ہیں تعداد میں تقریباً (۱۲) ہزار ہیں جن کا سرکار سے

تنخواہ، یومیہ، معمول، انعام وغیرہ مقرر ہے، برخلاف اس کے مسلم ادارے جن میں مساجد، عاشورخانے، درگاہیں خانقاہیں، مذہبی مکاتب، قاضی، مفتی پیر وغیرہ ہیں، تعداد میں کل نو پانچ ہزار ہیں جن کو سرکار سے تنخواہ، یومیہ یا انعام ملتا ہے۔

آخر میں مُرتّب نے لکھا ہے۔

"میں جانتا ہوں آنے والے مورخ اور تذکرہ نویس اس سلطان کی سیر و سوانح پر بڑی بڑی تالیفات شائع کریں گے۔ مگر میں نے اپنی طاقت کے موافق اس مفید اور ضروری کام کی بنیاد رکھ دی ہے۔ الناس علیٰ دین ملوکھم۔ اس نکتۂ خیال سے میں نے آصفجاہ ہفتم کے شمائل و اخلاق بیان کر دیئے ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس تالیف کے مفید نتائج پیدا کرے"

سلطنت آصفیہ کی بے تعصبی کی چند مثالیں

- دو سو چونتیس (۲۳۴) گاؤں، ایک سو ستر ہندوؤں کو بطور جاگیر مرحمت ہوئے ہیں جن کا حاصل سالانہ تین لاکھ ایک ہزار آٹھ سو چھہتر روپے پندرہ آنے پانچ پائی ہے یہ جاگیریں اس شرط سے دی گئی ہیں کہ ان کی آمدنی سے دیولوں میں پوجا پاٹ اور دوسرے تمام مراسم مذہبی کا انتظام ہو۔
- اس کے بالمقابل دو سو سترہ (۲۱۷) گاؤں ایک سو پانچ مسلمانوں کو بشرط خدمات مذہبی بطور جاگیر کامل (اللہ لاکھ ۱،۰۷ ہزار ... سو) عطا ہوئے۔

(باقی ص ۱۸ پر)

جناب ظہیر ہاشمی صاحب
([illegible])

تاریخ دکن کے لطیفے
عہدِ آصفی میں
ایک غیر تاریخی کتاب سے

"نواب سر سالار جنگ اعظم کے عہدِ وزارت (۱۲۷۰ھ تا ۱۳۰۰ھ) کی ایک ممتاز وطنی شخصیت منشی محمد صدیع حقانی مخاطب نواب صدیق یار جنگ (وفات ۱۳۲۲ھ) معتمد دفتر ملکی کی تھی۔ جسے سر سالار جنگ کے سفر لندن (۱۲۹۳ھ) میں دو مہینے تک ہم سفر رہنے کا اتفاق ہوا۔ یہ سراپا علم و عمل کے پتلے لندن کے کتب خانے اور کتب فروشوں کے پاس کی نادر کتابوں کو بکتی ہوئی دیکھ کر بے چین سے ہو گئے۔ اور سر سالار جنگ سے عرض کی۔ تو نواب صاحب ممدوح نے نہایت خندہ جبینی کے ساتھ اس قسم کی نادر کتابوں کو خرید لینے کی اجازت مرحمت فرمادی۔

صدیق یار جنگ، مسٹر رستم جی معتمد تعمیرات دکن (جنھوں نے ان دنوں اپنی شریک زندگی کی وجہ سے لندن میں سکونت اختیار کر رکھی تھی) اور نواب مقدم جنگ بہادر (عبداللہ بن علی) کے ساتھ کتب فروش کی دکان پر گئے دیکھا کہ ہزاروں کتابیں عمدہ، خوش خط، مذہب اور نہایت قیمتی موجود ہیں قرآن مجید، کے قلمی اور مطبوعہ نسخے "دواوین" تاریخ و دیگر علوم کی چند انگریزی کتابیں "بہ رشد پسند" آنو بہادر سر سالار جنگ منتخب کر لیں۔

مقدم جنگ نے بھی اپنے لئے عربی کی بعض قلمی کتابیں جغرافیہ اور تاریخ سے متعلق منتخب خریدیں اسی سلسلے میں صدیق یار جنگ نے بھی شیخ احمد شہاب الدین قلیوبی" کی کتاب "نوادر" پسند کی اور اپنے پاس رکھ لی۔ لیکن مقدم جنگ نے اس کتاب کو صدیق یار جنگ کے سامنے سے اٹھا لیا اور اپنی پسندیدہ کتابوں کی قیمت کے ساتھ ساتھ اس کی بھی قیمت سات شلنگ یعنی ساڑھے تین روپے سکہ حیدرآباد

کتب فروش کو دے دی۔ تو صدیق یار جنگ نے خیال کیا کہ شاید یہ کتاب بھی نواب مقدم جنگ بہادر کو پسند آگئی ہے اس لیے انہوں نے اپنے ذوق و شوق کا اظہار نہیں کیا۔ اپنی قیامگاہ پھر واپس آئے جو کتابیں "بہ شرط پسند" لائی تھیں ان کو نواب سر سالار جنگ کے ملاحظہ میں پیش کیا۔ نواب صاحب ممدوح کے جو کتابیں پسند آئیں۔ وہ خریدلی گئیں۔ صدیق یار جنگ نے اس موقع پر یہ واقعہ بھی عرض کر دیا کہ کتب فروش کے ہاں قرآن مجید کے بہت سارے نسخے ہیں ان کو ملازمین بڑی بے احتیاطی کے ساتھ اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر کو لے جاتے ہیں اور وہ اس کا خیال تک نہیں کرتے کہ ان کا احترام کیا ہے؟

یہ سنتے ہی سر سالار جنگ کی اسلامی حمیت جوش میں آئی اور حکم دیا کہ جس قدر بھی قرآن مجید کے نسخے کتب فروش کے پاس موجود ہوں وہ سب کے سب ہدیہ کر لیے جائیں۔ چنانچہ جتنے بھی قرآن مجید کے قلمی و مطبوعہ نسخے تھے وہ سارے کے سارے کتب فروش سے لے لیے گئے۔

مقدم جنگ نے دوسرے دن "کتاب نوادر" کو جابر چاوش نامی کے ہاتھ نواب صدیق یار جنگ بہادر کے پاس بھجوایا کہ یہ میری جانب سے تحفہ ہے قبول فرمائیے! بلا قیمت اس کے لینے سے انہوں نے انکار کیا۔ اُدھر سے اصرار ہوتا رہا۔ بالآخر "تحفہ" کو قبول کر لینا پڑا۔

صدیق یار جنگ نے مقدم جنگ کے متعلق یہ لکھا ہے کہ :-

" یہ بڑے کشادہ دست اور معدن مروت تھے اکثر و بیشتر دیکھا گیا کہ جب کوئی حاجت مند ان کے سامنے آتا تو یہ خوامتں کے آگے بڑی شرمندگی کے ساتھ بیٹھتے اور اس کی حاجت ضروری کو پورا کر دیتے۔ دولت آصفیہ کے عہدہ داروں میں یہ منتخب روزگار تھے۔ افسوس ہے کہ ایسی فیاض ہستی لندن کے سفر کی واپسی کے بعد چھٹی محرم ۱۲۹۴ھ کو اس دنیائے فانی سے چل بسی "

ان کی وفات کی تاریخ بھی عربی میں خود ہی کہی ہے جس کے مادہ کا مصرع یہ ہے:-

" دخل المحسن فی الفردوس "

تمہید مختصر، اصل واقعہ سنیے! صدیق یار جنگ کو کتاب "نوادر" جامع فوائد دینی و دنیوی اور حاوی مقاصد صوری و معنوی نظر آنے کے علاوہ بہ عنوان "تحفہ" ملی تھی اس لئے رات اور دن تنہائی کی رفیق شفیق رہی۔ عربی سے فارسی میں انہوں نے اس کا ترجمہ کر ڈالا۔ مولانا علی عباس نے ترجمہ کی "نظر ثانی" کرائی "مطالب غریبہ" (۱۲۹۹ء) کے تاریخی نام سے دار الطبع سرکار عالی (حیدرآباد دکن) میں مرزا زین العابدین کے اہتمام سے ۱۳۰۰ ہجری میں یہ ترجمہ چھپا۔ مترجم نے ترجمہ کے ساتھ ساتھ بعض مقامات پر مفید حواشی بھی لکھے۔ اصل ترجمہ (۶۴۸) صفحے کی رائل تقطیع پر پھیلا ہوا ہے (۶۴۹) صفحہ سے۔

"ضمیمہ علیٰ حکایات القلیوبی علیہ الرحمۃ" شروع ہو کر (۷۰۸) صفحات پر ختم ہو جاتا ہے یہ ضمیمہ "لطائف و ظرائف" کا ہے جس کو مترجم کے والد بزرگوار (مولوی غلام مصطفیٰ حقانی مرحوم) اتالیق نواب روشن الدولہ) نے مدون کیا تھا۔ اس میں (۹۴) لطیفے ہیں صدیق یار جنگ نے اپنی جانب سے (۶) لطیفوں کا اضافہ کر کے انھیں "صد لطائف" بنا دیئے ہیں۔

ان ہی صد لطائف میں سے عہد آصفی تک کے کسی نہ کسی تاریخی پہلو جن لطائف کا تعلق ہے اب انھیں اردو کے جامہ میں ملاحظہ کیجئے۔

- ایک مرتبہ حضرت آصف جاہ اول نے ایک شخص سے یہ دریافت فرمایا کہ

(کیا تم) کچھ پڑھے ہو؟

اُس نے عرض کی کہ:۔ (جی ہاں) تھوڑا سا بہت"

پھر فرمایا کہ:۔

(اس) "تھوڑے بہت" کے کیا معنے؟

(اُس نے) جواب دیا کہ:

"قابلوں سے کم اور جاہلوں سے زیادہ!"

آپ نے اس جواب کو بے حد پسند فرما کر اُسے حسب حیثیت سرفراز۔

۹۰۶ ● گلشن آباد میدک کے ایک مشائخ بشیر پادشاہ نانی اپنے زمانے میں بہت مشہور و معروف تھے۔ ایک وقت غفراں مآب نواب نظام الدولہ میر نظام علی خاں (آصف جاہ ثانی ۱۲۱۸ھ) نے انھیں دعوت دی تو انھوں نے جواب میں عرض کی کہ:

"رؤسا پر لازم ہے کہ فقراء کو اپنے گھر بلائیں۔ اور فقراء پر یہ واجب ہے کہ اغنیاء کے مکان پر نہ جائیں۔ پس آپ اپنی سنت ادا کر چکے اور فقیر نے اپنی سنت ادا کی ــــ"

● مولوی محمد حیدر مرحوم لکھنوی، حیدرآباد دکن تشریف لائے غلام صاحب خطیب مکہ مسجد (متوفی ۱۲۵۱ھ) جو بڑے لطیفہ گو تھے ملاقات کے موقع پر مولوی صاحب سے کہنے لگے کہ

"اب ہمارا شہر "حیدر آباد" ہوا۔"

مولوی صاحب اس لطیفے سے نہایت محظوظ ہوئے۔

● تیغ جنگ اور سہراب جنگ میں باہمی طور پر بڑا مذاق تھا کسی موقع پر ایک بہت بڑے "انگریز بہادر" حضور پرنور میں تشریف لائے تھے۔ سہراب جنگ سے پوچھا کہ

"تیغ جنگ یہی ہیں:"

سہراب جنگ نے کہا کہ "(جی ہاں) تیغ زن" یہی ہیں۔

تیغ جنگ نے کہا کہ:

"یہ ان کا "حسن ظن" ہے:"

● ایک دن حضرت آصف جاہ ثانی کا جلوس نکلا حسب دستور فقراء و مساکین کو "ادھیلی۔ پاؤلی" کی خیرات فرما رہے تھے، اعظم الامرا (ارسطو جاہ) دیوان دکن خصوصی میں بیٹھے ہوئے تھے راؤ گوند کشن بھی ہاتھی پر سوار ہو کر "فیل خاصہ" کے برابر چل رہے تھے چوں کہ پیشوا ایان پونہ

ثبت داب
محلوں کے وقت "خیرات" نہیں کرتے بلکہ اسے معیوب سمجھتے ہیں۔ (اس لئے) اعظم الامراء نے راؤ
گوبند کشن سے کہا کہ :۔

"خیرات" میں بڑی خیر و برکت ہے جس ریاست میں "خیرات" نہ ہو وہاں کیا خیر و برکت ہو سکتی ہے؟"

راؤ گوبند کشن نے کہا کہ :۔

"خیرات" محتاجوں اور فقراء کے لئے ہے جس ملک میں کہ محتاج و فقراء نہ ہوں۔ وہاں "خیرات" کس شخص کو دی جائے۔؟"

● رفعت الملک مرحوم (۱۲) بلند و بالا، قوی ہیکل اور خوش خوراک امیر تھے سوئے اتفاق سے بیمار پڑے۔ چند دنوں پرہیز کیا مزاج رو بہ اصلاح ہوا۔ طبیب معالج سے کہا کہ :۔

"پرہیز سے تنگ آگیا ہوں تھوڑا سا میٹھا کھانے کی اجازت دیجئے۔"

طبیب نے تو پہلے ممانعت کی لیکن بعد کو بیمار کے اصرار پر آدھا لڈو کھانے کی اجازت دی رفعت الملک مرحوم نے ملازم کو حکم دیا کہ :۔

"حلوائی کی دکان پر جا کر ڈیڑھ سیر کا ایک لڈو تیار کرائے !"

ملازم لڈو تیار کرا کے لایا۔ رفعت الملک نے ملازم سے کہا کہ :۔

"اس لڈو کے دو حصے کرے۔"

ملازم نے لڈو کو توڑا تو ایک حصہ بڑا اور ایک چھوٹا ہو گیا۔ وہ ڈرنے لگا رفعت الملک نے "ڈرنے کی ضرورت نہیں وہ بڑا حصہ لاؤ۔"

ملازم نے بڑے حصہ کو پیش کیا تو آپ نے نوش جاں فرما لیا۔ دوسرے دن طبیب معالج تشریف لائے دیکھا کہ قارورہ رنگین ہو گیا۔ اور نبض میں بھی حدت سی پیدا ہو گئی تو کہا کہ شاید پرہیز میں احتیاط نہیں کی گئی؟

رفعت الملک نے کہا: آدھے لڈو سے زیادہ کوئی اور چیز میں نے ہرگز نہیں کھائی!

آدھا لڈو آپ کے لئے اٹھا رکھا ہے۔

ملازم سے کہا کہ وہ آدھا لڈو اٹھا لا:

حکیم صاحب اس چھوٹے آدھے لڈو کے حصے کو دیکھ کر حیران سے رہ گئے!

● شمس الامرا امیر کبیر (وفات ۱۲۸۰ھ) کی سرکار میں ایک مسخرہ تھا۔ ایک موقع پر بڑی منت وسماجت کے ساتھ علماء و فضلاء کی خدمت میں عرض کی کہ:

غلام بھی بزرگوں کی دعوت کرنی چاہتا ہے غریب خانے پر قدم رنجہ فرمائیں تو یہ خادم آپ حضرات کا ہاتھ دھلائے گا۔"

سبھوں نے کہا کہ" ہم نہایت خوشی کے ساتھ حاضر ہوں گے:"

روز مقررہ پر سب دعوتی ایک ایک کرکے جمع ہوئے۔ آپ (یعنی مسخرہ صاحب) گھر سے باہر نکلے، ہر ایک کی خوشامد و چاپلوسی کی اور بڑے امتیاز کے ساتھ ہر ایک کا ہاتھ دھلا کر اندر چلے گئے۔ سب اس انتظار میں کہ کھانا اب آتا ہی ہوگا۔ دسترخوان بچھے گا، وغیرہ۔ پوری ایک گھڑی گذر گئی۔ دسترخوان ہی بچھا اور نہ کھانا آنے کے کچھ آثار نظر آئے دعوتیوں کی آنتیں "قل ھو اللہ احد" پڑھنے لگیں۔ بالآخر سبھوں نے تنگ آکر اندر کہلوا بھجوایا کہ: "ہاتھ تو دھو چکے! کھانا کہاں ہے"!

مسخرے نے جواب بھجوایا کہ:

"ہاتھ دھلانے کی دعوت تھی نہ یہ کہ کھانا کھلانے کی:"

اس پر سب ہنس پڑے اور اپنے اپنے گھر واپس ہو گئے۔

● مہاراجہ چندو لعل شاداں متوفی ۱۲۶۱ھ دیوان دکن کے عہد میں بہت سے شعرائے یہاں جمع ہو گئے تھے مہاراجہ کے محل میں ہر رات ان کی محفل جما کرتی تھی، ایک دن مہاراجہ نے حافظ مشتاق دہلوی (استاد حضرت فیض) سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ:

"شعراء کی فوج میں تو آپ "فیل" ہیں!"

مئی ۱۹۰۶ء

• شادی بیاہ
جناب مشتاق نے فی الفور جواب دیا کہ

"(جی ہاں) سب کے مہاراج (یہی) کفیل ہیں۔"

● ایک دفعہ سہراب جنگ کی تیغ جنگ کے پاس دعوت تھی جب کھانا سامنے آیا تو اُس پر تورہ پوش کے طور پر ایک کپڑا (دسترخوان) ڈھکا ہوا تھا جو بہت ہی میلا کچیلا تھا۔

سہراب جنگ نے کہا کہ :۔

"معلوم ہوتا ہے کہ اِس دسترخوان نے کبھی دھوبن کے گھر کی صورت نہیں دیکھی؟"

اتفاق سے کسی موقع پر سہراب جنگ کے ہاں تیغ جنگ کی دعوت تھی۔ جب دسترخوان بچھایا گیا تو وہ نہایت پاکیزہ اور صاف ستھرا سفید تھا۔ تیغ جنگ نے کہا کہ :۔

"(غالباً) اِس دسترخوان نے کبھی کھانے کی صورت نہیں دیکھی؟"

نسیم دکن

(مطبوعہ: روزنامہ مشیر دکن۔ سالگرہ نمبر رجب ۱۳۵۶ھ)

حیدرآباد میں ہندو ملازم سرکار

ممالک محروسہ سرکار عالی کے ہندو باشندے وسیع ذرائع معاش رکھتے ہیں۔ تجارت زراعت۔ صنعت و حرفت ان کا موروثی پیشہ ہے اس لئے وہ ملازمت کے لئے کم تیار ہوتے ہیں جلد اول کے صفحات ۹۳۷ تا ۹۳۹ پر تختہ انتخاب پیرو بشنر تحصیلدار درج ہے اس کے ملاحظہ سے روشن ہوگا کہ ۱۳۲۳ف میں (۶۹) ہندوؤں نے درخواستیں پیش کیں ان میں سے (۷) کا انتخاب ہوا اس کے بالمقابل (۱۹۵) مسلمانوں نے درخواستیں دیں ان میں سے (۱۴) کا انتخاب ہوا۔ ۱۳۲۶ف میں (۵۰) ہندو درخواست گزاروں میں سے (۸) کا انتخاب ہوا اور (۷۷) مسلمان درخواست گذاروں میں سے صرف (۴) کا۔۔۔ (خلاصۂ کتاب مسالمت عثمانی مولفہ محمد عبدالوہاب عندلیب سے)

ماہنامہ

شاداب

حیدرآباد

جلد (۷) شمارہ (۶) جون ۱۹۹۰ء حیدرآباد

ایڈیٹر	جائنٹ ایڈیٹر	مینیجنگ ایڈیٹر
محمد قمرالدین صابری	رشید الدین	کلیم الدین احسن

مجلسِ مشاورت

محترمہ عائشہ بیگم شاداب ۔ یوسف ناظم ۔ ڈاکٹر محمد یوسف الدین ۔ پروفیسر رضی الدین احمد ۔ حیدرآباد

محمد منظور احمد منظور ۔ محترمہ سیدہ مہر ۔ ڈاکٹر منشاء الرحمٰن خاں منشار ۔ پروفیسر شہاب ؟

ـــ:(زرِ تعاون):ـــ

فی شمارہ 6/ روپے

ہندوستان	خلیجی ممالک	امریکہ	انگلستان	پاکستان
سالانہ 65 روپے	200 روپے	40 ڈالر	25 پونڈ	175 پاکستانی روپے
دوسال 120 "	360 "	70 ڈالر	45 پونڈ	300 پاکستانی روپے
تاحیات 1500 "	3700 "	700 ڈالر	400 پونڈ	3000 پاکستانی روپے

ـــ: ترسیلِ زر کا پتہ :ـــ

ماہنامہ "شاداب" 147 - 5 - 11 ریڈ ہلز ۔ حیدرآباد (اے پی) انڈیا

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر محمد قمرالدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان سے چھپوا کر دفتر شاداب 147-5-11 ریڈ ہلز حیدرآباد اے پی سے شائع کیا۔

فہرست

حرف اول		۳
خلافتِ اسلامیہ	سید شاہ معین الدین محمد محمد الحسینی	۴
احوال علی عادل شاہ ثانی (ترجمہ گلدستۂ بیجاپور)	مجلہ مکتبہ سے ماخوذ	۱۰
میر کا شیوۂ گفتار	نکہت جہاں	۱۷
سفر، اردو شاعری کا ایک استعارہ	محمد شجاعت علی راشد	۲۴
مدّوجزر (تبصرہ)	رشید الدین	۳۵
ایک نظم	عزیز قیسی	۳۷
آندھرا صحافت آزادی کے بعد	جی ڈی چندن	۳۸
حرفِ تابندہ	محمد عبدالوحید خاں	۴۵
ہارمونس	ڈاکٹر بھگت وتسلم	۴۸
ٹیلی پیتھی	عارف خورشید	۵۳
غزل	سید سجاد	۵۶
تو رہے اور میں رہوں	مولانا عبدالقدیر حسرت	۵۷
کھچڑا (آٹھ شاعروں کی مرکب نظم)	وحیدہ نسیم	۵۸
حیدرآباد (منظوم مشاعرہ مرکب)	عزیز بھارتی وغیرہ	۶۰
خندلیات	عقل عباسی، کلیم ضیاء	۶۴

حرفِ اول

شہر حیدرآباد نے اپنی زندگی کے چار سو سال پورے کر لیئے ہیں۔ اس شہر کی بنیاد ہی محبت، خلوص، یک جہتی، ہم آہنگی، رواداری، اور امن و شانتی پر قائم ہے شہر کی بنیاد کے ساتھ ہی ایک مشترک اور ہم آہنگ تہذیب کی بنیاد پڑی جو قطب شاہی اور آصفجاہی دونوں ادوار میں ارتقائی منازل طئے کرتے ہوئے آج ایک ایسا عظیم سایہ دار درخت بن چکی ہے جس کے سائے تلے سبھی لوگ بھائی چارگی اور صلح و سلامتی کے ساتھ زندگی گذار رہے ہیں اور نفاق و اختلاف کی بادِ سموم سے آج بھی محفوظ ہیں۔ اہلِ حیدرآباد نے ۴۰۰ سالہ جشنِ تاسیس منانا طئے کیا، عوام اور حکومت سبھی ساتھ ہو لیئے۔ "شاداب" نے بھی اپنا حصہ ادا کرتے ہوئے خصوصی شماروں کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا۔ یہ خصوصی شمارے اردو ریسرچ سنٹر حیدرآباد کے ذخیرے سے نایاب تحریروں کی بازیافت پر مبنی ہیں۔ چنانچہ پہلا خصوصی شمارہ "مجلہ مکتبہ" حیدرآباد کے جملہ شماروں کے انتخاب پر مشتمل ہے اردو کا یہ ادبی اور تاریخی مجلّہ قیامِ جامعہ عثمانیہ کے بعد ہی امداد باہمی کی بنیادوں پر قائم کردہ ادارے نے جاری کیا اور سبھی اردو والوں کا اجتماعی تعاون اس مجلّہ کو حاصل رہا۔ اس شمارے میں ایسی تخلیقات شریک کی گئی ہیں جو شہر حیدرآباد کی رنگارنگ تہذیب اور مذہبی رواداری کو ظاہر کرتی ہیں۔ دوسرا خصوصی شمارہ آصفجاہی عہد نمبر ہے جس میں سلاطین آصفیہ کی مذہبی رواداری، دکن میں ہندو مسلم تعلقات، رعایا کی فلاح و بہبود کے لئے فراہم کردہ حضرت آصفجاہ اول کا انتظام مملکت، حیدرآباد کی اردو خدمات اور علمی سرگرمیوں کی صراحت موجود ہے نیز آصفجاہ سابع کی حیات و سیرت وغیرہ کے بارے میں

(سلسلہ صفحہ ۱۶)

ب ر ب
سید شاہ مصطفیٰ الدین محمد محمد الحسینی حقی
چندولال بارہ دری۔ حیدرآباد

خلافتِ اسلامیہ

عالمِ اسلام کا اہم ترین مسئلہ اور اس کا حل

(یہ مقالہ روزنامہ رہنمائے دکن مورخہ ۹ ستمبر اور ۱۶ ستمبر ۱۹۶۸ء میں طبع ہوا۔ یہ مسئلہ آج بھی اتنا ہی اہم ہے اور اہلِ فکر و عمل کے لئے مقالہ میں راہِ عمل تجویز کی گئی ہے اس لئے دوبارہ شائع کیا جا رہا ہے)

۱۹۱۹ء سے ترکی میں جو باقاعدہ ہنگامے شروع ہوئے تھے ان کا سلسلہ ۱۹۲۴ء تک جاری رہا۔ یوں تو آغاز ۱۹۲۳ء ہی میں سلاطین عثمانی کی حکومت کے قیام کا اعلان کر دیا گیا لیکن جمہوریہ ترکیہ کے باضابطہ قیام کا اعلان ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۳ء کو ہوا۔ اس اعلان کے پندرہ منٹ بعد مصطفیٰ کمال پاشا صدرِ جمہوریہ منتخب ہوئے۔ ایک سو ایک توپوں کی سلامی سر ہوئی۔ اور معاً بعد "عثمانی" کی جگہ "ترکی" نے لے لی۔ دستوری اعتبار سے ۳ مارچ ۱۹۲۴ء کو خلافتِ عثمانیہ ختم ہوئی اور ۴ مارچ کو عثمانی خاندان ترکی سے جلاوطن کر دیا گیا۔ اس طرح مصطفیٰ کمال پاشا ترکی کے مردِ بیمار کے لئے مسیحا اور ملتِ اسلامیہ کی حیاتِ اجتماعی کے لئے ملک الموت ثابت ہوئے۔

وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر دشمنانِ اسلام کی ان خفیہ و علانیہ سازشوں کا شکار ہو گئے جو اسلامی خلافت کے خاتمہ کے لئے یہود و نصاریٰ کی جانب سے عوامی و حکومتی سطح پر منظم کی گئی تھیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے ایک مستحکم اور عالمگیر خلافت کی بجائے محدود جمہوریہ ترکی کو

ترجیح دی۔ خلافتِ عثمانیہ کو ختم کرنے کے بعد ایک جدید مضبوط خلافت قائم کرتے اور خود اپنی خلافت کو منوانے کے لئے مصروفِ عمل ہو جاتے تو سمجھا جاتا کہ تاریخ اپنے واقعات دہرا رہی ہے معاویہؓ بن ابو سفیانؓ نے بھی سیدنا امام حسن علیہ السلام سے خلافت کا منشور و عطیہ حاصل کیا تھا۔

اسلامی خلافت کی بجائے ترکی جمہوریت کا قیام وطنیت و قومیت اور دین و سیاست کی تقسیم کے سوا اور کیا تھا؟ سلطنت برطانیہ نے اس انقلاب میں جو حصہ لیا اس کا اظہار مولانا ابو الکلام آزاد نے ۹ر فروری ۱۹۲۲ء کو چیف پریسیڈنسی مجسٹریٹ کلکتہ کی عدالت میں ان الفاظ میں کیا تھا۔

"وہ اسلامی خلافت کی پامالی سے باز نہیں آتی اور اپنے تمام وعدوں کو توڑنے میں کوئی عیب نہیں سمجھتی۔"

بیت المقدس یہودیوں کے قبضہ میں

آج کی مہذب و متمدن دنیا میں اس قوم کے تعلق سے جس کی تعداد ۱۳ ملین سے متجاوز ہے، کیا ہو رہا ہے؟ بیت المقدس پر یہودیوں کا قبضہ کوئی معمولی واقعہ نہیں۔ یہ سارے عالم اسلام کیلئے ایک چیلنج ہے۔ آج پوری قوم میں ایک بھی صلاح الدین ایوبی نہیں جنھوں نے انگلستان اور اس کے شیردل بادشاہ کو ہمیشہ کے لئے مقاماتِ مقدسۂ اسلام کے احترام کا عبرتناک سبق پڑھایا تھا معرکہ ہائے ہلال و صلیب کی یاد ابھی لاکھوں دلوں میں تازہ ہے۔

مملکت اسرائیل کے تعلق سے مبصرین کا اظہار حق سُن لیجئے کہتے ہیں۔

"پہلی عالمگیر جنگ کے بعد جب سلطنت عثمانیہ کے حصے بخرے کئے گئے تو انگریزوں کے شاطر ذہن میں ایک باقاعدہ منصوبہ موجود تھا جس کی رو سے عالم اسلام کے قلب میں ایک ایسی یہودی مملکت کے قیام کی تجویز تھی جو ایک طرف تو مشرق وسطیٰ میں مغربی سامراجی طاقتوں کے لئے مضبوط اڈہ کا کام دے سکے اور دوسری طرف عالم عرب میں سامراجی استحصال کے خلاف بیداری کی لہر کا مقابلہ کرنے میں ممد و معاون ہو سکے تازہ ترین صورتِ حال نے [illegible] کر دیا ہے کہ فلسطین کا انتقاب مغربی طاقتوں

نشاداب

کے مفاد پرست عناصر اور مذہبی اجارہ داروں کے عین مطابق تھا۔

مرکزیت و اجتماعیت کے ملک الموت اس سنگین صورتحال کے مقابلہ میں عربوں کی جو طاقتیں دکھائی دیتی ہیں ان کی رہنما مصر کی ایک قومی شخصیت جمال عبدالناصر۔ ترکی کے مصطفیٰ کمال کی طرح مصر کے مرد بیمار کے لئے مسیحا اور ملتِ اسلامیہ کی حیاتِ اجتماعی کے لئے ملک الموت۔

پھر وہی وطنیت و اسلامیت اور پھر وہی دین و سیاست کی مفارقت! کمال اتاترک کے ہاتھوں خلافت کا خاتمہ اور جمال ابو العرب کے باعث بیت المقدس کا سانحہ! نہ صرف بیت المقدس بلکہ دیگر مقاماتِ مقدسہ اور عالم اسلام کے لئے ایک مستقل خطرہ موجود ہے یہ خطرہ متحدہ عرب جمہوریہ، اتحاد عرب، عرب ریاستوں اور عرب قوموں کی کسی تنظیم سے دور نہ ہوگا جس کا مشاہدہ و تجربہ کیا جا چکا ہے۔

رومن کیتھولک اسٹیٹ: کلیسائی نظام کی ریاست ویٹیکن شہر روم میں واقع ہے اس میں قصر ویٹیکن، عجائب خانے، آرٹ گیلری، باغات، کتب خانے، ریڈیو اسٹیشن (جس کے ذریعہ تیس سے زبانوں میں نشریات ہوتی ہیں) رصدگاہ، مختصر ریلوے سسٹم اور (۲۵) سے زائد زبانوں میں طباعت کی سہولتوں کے ساتھ پریس موجود ہے۔

مملکت ویٹیکن کی اپنی سفارتی سروس بھی ہے۔ مختلف ممالک میں ہز ہولینس پوپ کی نمائندگی ناظم الامور کے درجہ کے (۳۵) اور سفیر کے درجہ کے (۲۵) عہدہ دار کرتے ہیں۔ اِن کے علاوہ دُنیا کے مختلف علاقوں میں (۹۸) مذہبی نمائندے بھی مقرر ہیں جو امور مذہبی کے سربراہ اور نگراں ہیں۔

ہندوستان اور ویٹیکن کے روابط: ۱۹۴۸ء سے ہندوستان اور ویٹیکن کے مابین سفارتی تعلق پیدا ہوا۔ نئی دہلی میں پاپائے روم کے سفارت خانہ کی جو عمارت ہے اس کی پیشانی پر کلیسا کی علامت امتیازی کے علاوہ صلیب کے نشانات بھی ظاہر کئے گئے ہیں۔

ایک عیسائی مضمون نگار کا بیان ہے۔

"کہنا چاہئے کہ بین الاقوامی امن اور صلح وغیرہ کے نقطۂ نظر سے پاپائیت ایک

عظیم الشان قوت ہے جیسا کہ (۴۹) ممالک نے اپنے نمائندے ویٹیکن میں متعین کر رکھے ہیں۔ ان نمائندوں میں سفرا اور وزرا بھی ہیں اور ناظم الامور بھی۔

یہ اس قوم کی مذہبی مملکت کا ذکر ہے جس نے خلافتِ اسلامیہ کے خاتمہ کے لئے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی اور جس کی مساعی و تدابیر سے خود مسلمانوں میں خلافت کے مخالفین کی ایک جماعت منظم ہو گئی اور کمال اتاترک نے اسلام کے عظیم المرتبت "منبر عالی" کو بند کر دیا۔

پس چہ باید کرد؟ صحیح فکر و عمل کے لئے یہ فرمانِ الٰہی کافی ہے۔

"کیا مسلمانوں کے لئے اب بھی وہ وقت نہیں آیا کہ اُن کے دل اللہ اور اس کے احکام کے آگے جھک جائیں اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جنہیں کتاب دی گئی تھی (یعنی یہود و نصاریٰ) لیکن جب ایک طویل مدت گذر گئی تو ان کے دل سخت ہو گئے اور حق و صداقت کے قبول کرنے کی صلاحیت باقی نہ رہی۔" (۵۷ - ۱۶)

مسلم حکمران وطنیت اور حدودِ جغرافیہ میں محبوس اور مقید ہیں۔ ہوسِ اقتدار، تقلیدِ مغرب اور ڈپلومیسی سے انہیں فرصت نہیں ملتی۔ واشنگٹن، لندن، پیرس اور ماسکو کی پُر فریب اور تباہ کن سیاست انہیں دین و ملت سے بے نیاز کر چکی ہے۔ ویٹیکن کی مسیحی اور فلسطین کی یہودی حکومت انہیں دکھائی نہیں دیتی۔ نام نہاد متحدہ عرب جمہوریہ کے اقتدار پرست اور ناپسندیدہ صدر ابھی تک عرب شوکت کے خواب دیکھ رہے ہیں۔

خلافت کی عصری تنظیم : حالاتِ حاضرہ میں خلافت کو ایک ہی شخصیت میں ہمیشہ کے لئے مرکوز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بات اصولِ جمہوریت کے منافی قرار دی جائے گی۔ مسئلہ کے ہر پہلو پر محتاط غور و فکر کے بعد جو عملی صورت ممکن نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ "ادارہ اقوام متحدہ" کے اصولوں پر "ادارہ خلافتِ اسلامیہ" کی تشکیل عمل میں لائی جائے جو ستر کروڑ مسلمانوں کے نمائندوں پر مشتمل ہو۔ آبادی کی اساس پر مندوبین کا انتخاب عمل میں آئے جس کی وجہ سے نہ صرف مسلم ملکوں کے نمائندے بلکہ ان ملک کے مسلمانوں کے نمائندے بھی منتخب ہوں گے جہاں وہ صرف رعایا اور شہری ہیں۔ ادارہ کا

مستقر بنتو اسلامیہ کا مرکز وہ ارضِ حجاز بھی ہو سکتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے حرمین الشریفین اور اماکنِ حج کے امتیازات عطا فرمائے ہیں۔ اس ادارہ کے مندوبین اور نمائندوں کی مناسب تعداد متعین کی جا سکتی ہے مگر غیر ضروری اختلافات سے بچنے کے لئے یہ تعداد حتی الامکان محدود مختصر ہونی چاہیئے یہ نمائندے ایک معینہ میعاد میقات (مثلاً پانچ سال) کے لئے اپنے صدر کا انتخاب کریں گے جو لازماً آزاد، خود مختار، خود کفیل اور مذہبی و قومی جذبات رکھنے والا حکمران ہوگا۔ یہی صدر خلیفۃ المسلمین تسلیم کئے جائیں گے۔ مندوبین اور نمائندے وہ لوگ ہوں گے جو فریضۂ حج ادا کرنے کے لئے مکہ معظمہ میں جمع ہوں۔ اس طرح خلافت کی مجلس شوریٰ میں رائے دہی کے لئے مندوبین کی رہائش کوئی اہم مسئلہ نہیں بنے گی۔

امورِ خلافت میں مدد دینے کے لئے ایک مجلس شوریٰ کا تعاون بھی حاصل رہے گا جو اس حکمران کی اپنی ریاستی حکومت کی کابینہ سے جداگانہ جماعت ہوگی۔ انشاء اللہ المستعان امتِ محمدی گمراہی پر جمع نہ ہوگی۔

"ادارہ خلافتِ اسلامیہ" قضاۃ و عدالت کے علاوہ مالیاتی، انتخابی، تنظیمی، مواصلاتی، تشریعی، تنقیدی، سفارتی، تجارتی، عسکری، احتسابی، تعزیری اور ایسے دیگر اہم شعبوں پر مشتمل ہوگا۔ مالیہ کا نظم بیت المال کے ذریعہ کیا جائے گا۔ اسلامیہ پر عطایا اور زرِ اعانت کی فراہمی کی ذمہ داری رہے گی دیگر ممالک کے مسلمان زکوٰۃ، صدقات، خیرات کے علاوہ عطایا اور زرِ شرکت کی رقوم مقامی مجالس خلافت یا قابلِ اعتماد جماعتوں کے ذریعہ مرکزی ادارہ کو روانہ کریں گے۔ ان کاموں کی نگرانی خلیفۃ المسلمین کے سفراء، معتمدین اور ناظم الامور کے تفویض رہے گی۔

سطور بالا میں خلافت کے تعلق سے صرف ایک خاکہ دیا گیا ہے ترتیب و تدوین کے بعد مسودہ دستور انشاء اللہ متعاقب پیش کیا جائے گا۔

اس امر کا اظہار مناسب ہوگا کہ اس تجویز کے مطابق خلافت کی تشکیل و قیام عمل میں آئے تو ویٹیکن کے مسیحی اور فلسطین کے یہودی مراکز سے زیادہ مکمل، مؤثر اور مستحکم باشان مرکزِ اسلام ہوگا۔ اس طرح

خلیفۃ المسلمین کا موقف پیشوائے عیسائیت اور رہنمائے یہودیت کے مقابلہ میں زیادہ مستحکم و مکرم ثابت ہوگا۔ مسلمانوں کی صلاح وفلاح اور عروج وارتقاء تک رسائی کے فرائض سے لے کر دُنیا کی بڑی بڑی قوموں اور حکومتوں سے معاملات و معاہدات تک ہر موقع پر خلافتِ اسلامیہ کی شان و شوکت اور عظمت وجلال کے مظاہرے انشاءاللہ دیدنی ہوں گے۔

تنظیم وتربیت کے فرائض: مجلس احیائے خلافت اسلامیہ کے ذریعہ افرادِ اُمت کی تنظیم وتربیت کی خاموش مساعی جاری ہیں۔ ان مساعی کو تیز تر کرنے کی ضرورت ہے جو اہلِ فکرونظر کی رہنمائی اور اہلِ ثروت کے تعاون کے بغیر ممکن نہیں۔ مجلس کے ساتھ ہر قسم کا اشتراکِ عمل مسلمانوں کی بے دینی، بے عملی اور انتشار وادبار کے خاتمہ کا باعث بنے گا اور وہ "کنتم خیر امۃ" کے صحیح مخاطب قرار پائیں گے۔ شعورِ قومی وحیاتِ اجتماعی کے ساتھ تغیر کی ضرورت ہے اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ اپنے آپ میں تغیر نہ پیدا کرے۔ یعنی علم صحیح وعملِ صالح کے صراطِ مستقیم پر گامزن نہ ہو۔

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ط

عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث
مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے

بقیہ سلسلہ صفحہ ۳

ایسے مضامین شریکِ اشاعت ہیں جو آصفی عہد خصوصاً آصف سابع کی اہم خصوصیات کو اجاگر کرتے ہیں۔

سال حال آندھرا پردیش کے ساحلی علاقوں میں طوفان باد و باراں نے ایسی تباہی مچائی کہ سابق میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ ملک کے تمام وسائل اس نقصان کی پابجائی اور زندگی کی دوبارہ تعمیر میں لگے ہوئے ہیں اس وجہ سے ہمارے شہر کا جشنِ تاسیس ملتوی کر دیا گیا ہے گو ایک سے زائد شمارے زیر ترتیب ہیں۔ "شاداب" نے بھی اپنے خصوصی نمبروں کا سلسلہ ملتوی کیا ہے تاکہ یہ سلسلہ کب سے شروع کیا جائے۔ اس بارے میں قارئین شاداب کے مشوروں

(احوالِ علی عادل شاہ ثانی)

ترجمہ گلدستۂ بیجاپور

خواجہ میر احمد علی خاں احمد نے نواب دلیر خاں بہادر، دلیر جنگ حاکم ملہٹہ شاہ نور (بیجاپور) دکن کی فرمائش پر ۱۲۸۲ھ میں گلدستۂ بیجاپور کے نام سے فارسی زبان میں شاہان عادل شاہی (۸۹۵ھ تا ۱۰۹۷ھ) کی تاریخ لکھی تھی۔ مخطوطہ گلدستۂ بیجاپور زیر طبع ہونے کے باوجود کمیاب ہے۔ دلیر جنگ کے خلف الصدق نواب اعظم خان نے ۱۳۰۶ھ میں خود مؤلف سے اس کا اردو ترجمہ کرایا۔ اس کے چھپنے کا کوئی سال معلوم نہ ہو سکا اور یہ ایک کمیاب چیز ہے عادل شاہیوں میں علی عادل شاہ ثانی کا زمانہ ہر اعتبار سے قابل قدر سمجھا جاتا ہے اس میں عادل شاہی اردو شعراء کا دور میں ایک نمایاں خصوصیت رکھتا ہے مثلاً نصرتی اور ہاشمی اسی دور کی یادگار ہیں نصرتی اور ہاشمی کے علاوہ آتشی، مرزا مقیم اور دولت شاہ نے فارسی کے ساتھ ہندی و دکنی میں بھی کچھ لکھا ہے ہاشمی کا ریختی کے ساتھ یوسف زلیخا کا قصہ بھی بعض کتابوں میں پیش کرنے کا موقع تھا لیکن علی عادل شاہ ثانی کے حال میں جہاں ہاشمی کا ذکر آیا ہے وہاں اس کی احسن القصص اور منہاجات نادرہ تصانیف کا بھی ذکر کیا گیا ہے جس کا انکشاف قدیم اردو دکن میں اردو جیسی مستند تالیفات [illegible] ترجمہ محمود بیجاپوری کی ترتیب سلاطین کے عہد وار ہے اور ہر ایک بادشاہ کا مجلس کے نام سے موسوم کیا گیا ہے بعض تاریخی اختلافات بھی ہیں جن سے یہاں بحث نہیں۔ اس وقت ہم ترجمہ گلدستۂ بیجاپور میں سے علی عادل شاہ ثانی کا حال مترجم کی زبان سے نقل کر رہے ہیں (ر۔ی)

مجلس ساتویں ذکر میں علی عادل شاہ ثانی بن سلطان محمد عادل شاہ انار اللہ برہانہ کے

ظاہر ہوتا ہے کہ علیحضرت ملک پناہ جہاں بانی بادشاہ بیگم صاحبہ دختر پادشاہ جم جاہ قطب شاہ زوجہ جنت مکانی فردوس آشیان سلطان محمد عادل شاہ نور اللہ مرقدہ علی عادل شاہ کو خورد سالی سے پرورش کرنے سعی وافر مبذول رکھکر جمیع فضائل سے آراستہ کی تھی بعد از رحلت سلطان محمد عادل شاہ کے اعیان و ارکان اور حضوریوں کو جمع کرواکے وقت نیک اور ساعت سعید اختیار کر تاریخ چھبیسویں [26] ماہ محرم روز سہ شنبہ ۱۰۶۶ھ ایکہزار سیٹھ سن ہجری مطابق ۱۶۵۶ء سولہ سو چھپن عیسوی میں کہ عمر علی عادل شاہ کی انیس [19] سال کی تھی دار السلطنت بیجاپور میں تخت سلطنت پر جلوس فرمائے شبیہ اس بادشاہ گیتی پناہ کی واسطے ملاحظہ ناظرین کی منقوش ہوئی لہ اور قطعہ تاریخ جلوس علی عادل شاہ ثانی کا یہ ہے:—

بہر سالِ جلوس شاہ دکھن　　　گفت ہاتف سحر بصوت جلی
نعمت آخر درین سخن حرفے　　　جانشین محمد است علی
۱۰۶۷

اور عبد النبی تاریخ میں اس جلوس کے یہ مصرعہ کہا ؎

نوبت شاہی رسید بعد محمد علی　　　–　　　اور محمد قلی یہ قطعہ کہا ؎

منت ایزد کہ بر تخت [1067] خلافت جلوہ گر　　　آفتابے کز طلوعش گشت عالم منجلی
درمیان شہریاران افتخار اور افزود　　　زانکہ شد ہمچوں علی ملک محمد را ولی
سال تاریخ جلوسش خواستم از عقل کل　　　گفت امیر المومنین بعد از محمد شد علی
۱۰۶۷

علی عادل شاہ ثانی بادشاہ رنگین مزاج تھا اور اکثر اشعار آبدار و مضامین تازہ بہار طبع رنگین سے اس کی تراوش ہوتے تھے اور شاعران لطیفہ گو کی بزم ملک تاثیر میں اس کے قدر تمام تھی اور شعر گویان تازہ خیال بادشاہ نکتہ سنج کے دربار فیض بار میں حاضر رہا کرتے تھے چنانچہ میاں نصرتی کہ خیالات رنگین واشعار تازہ مضامین اس کے مقبول خاص و عام کے ہیں اور شعرائے زمان میں ملک الشعرا سے مشہور ہے؛ طبعزاد سے اپنی کتاب گلشن عشق اور علی نامہ نام سے اس شہریار عالی وقار کے تصنیف کیا ہے جو کوئی نسخہ

لہ اصل کتاب میں [illegible] ہے

ہندی میں اس طرح اور تازہ مضمون سے نہیں بنا ہوگا۔ دوسرے عمدہ اکابران و سر استاد زمانی سید نور اللہ خلف استاد العلماء حضرت سید محمد ظہور باوجود تحصیلات علوم معقول و منقول کے حقیقت سے اہل سخن کے بھی کماحقہ آگہی رکھتے تھے اور اشعار آبدار بھی گاہ گاہ فرمایا کرتے تھے جو نتائج طبع سے ان کے تاریخ عادل شاہی ہے زبان فارسی سے تاریخ اس شہریار علی تبار کی لکھے ہیں۔ تیسرے حکیم آتشی کہ فکر بلند اس کی در تبہ سخن طارم اعلیٰ کی تھی۔ چوتھا مرزا مقیم کہ معنی طرازی و لفظ پردازی میں عدیل و سہیم نہیں رکھتا تھا۔ پانچواں دولت شاہ جو اورنگ نشین کشور سخنوری کا تھا اور ملا نصرتی شاعر ہندی گو تھا و شاہ نور اللہ و مرزا مقیم و مرزا دولت شاہ و حکیم آتشی اکثر فارسی گو تھے اور ہندی شعر بھی کہتے تھے اور سوائے انھوں کے بہت شعراء فارسی گو اور ہندی بھی تھے۔ چنانچہ ایک ان میں سے ہاشمی تھا کہ احسن القصص کو زبان ہندی سے شعر پردازی کرکے داد سخن کا دیا ہے اور رسالہ نجات نامہ بھی نتائج طبع سے اس کے ہے اور عبداللطیف عبدالغنی اکثر قصائد بفصاحت و بلاغت تمام زبان فارسی سے کہے ہیں۔ الغرض اسی شہریار عالی تبار کے عصر میں بیجاپور معمور تھا۔ اور شعراء و فضلا و زہاد و صلحا و اولیاء و جمیع اہل فنون بارگاہ سلطنت میں اس کے حاضر تھے اور وزراء و امراء و مقربان سلطنت سے اس کے خان محمد و سید ابوالحسن مکونہ۔ و رندولہ خان و بہلول خان و عبدالمحمد ارسطوئے زمان و ملا محمد و افضل خان و محمد یعقوب و عزیز خان و ملک اعتبار و ملک آقا خسرو و عبداللہ خان و ہیبت خان و ناصر محمد و یوسف خان و داؤد خان و ملک حبشی و محمد علی و خانی ملک و سیدی الماس و شہ نواز خان و میر نعمت اللہ و فرزند خان و کمال خان و سیدی جوہر و صلابت خان و مغل شاہ و شاہو جے راجہ و مینا جی بھونسلے و بتریرا راؤ۔ [illegible] اور قضات و علماء سے سید علی محمد و قاضی حبیب اللہ و شاہ نور اللہ و ابراہیم خان و شاہ ابوالمعانی اور سنہ ۱۰۶۷ ایک ہزار سڑسٹھ ہجری مطابق سنہ ۱۶۵۶ء سولہ سو چھپن عیسوی میں کہ سنہ جلوس اس شہریار کا ہے سرعزیز خان محمد تھا اور اسی سنہ میں علی عادل شاہ ثانی حسینی محل بنا فرمایا اور سنہ ۱۰۶۸ ایک ہزار اڑسٹھ ہجری مطابق سنہ ۱۶۵۷ء سولہ سو ستاون عیسوی میں خان محمد وزیر کو قتل کروایا۔ تاریخ اس کے قتل کی ہے۔ ستم خان محمد شہید الیغا داغا یا ابد۔ اور اسی سنہ میں ایک مسجد بنا گیا اور سنہ ۱۰۶۹ ایک ہزار انہتر

۱۰۶۸

ہجری مطابق ۱۶۵۵ء سولہ سو پچپن عیسوی میں علی عادل شاہ میر بانی کر کے تمام بیجاپور کے لوگوں کو کھانا کھلایا۔ اور اسی سنہ میں عبدالمجید کو وزارت کی خلعت عطا کیا۔ تاریخ اس کی یہ ہے۔ دائیں سر نوشتی عبد الحق ہست ۱۰۶۹۔ اور اسی سنہ میں حصار بیجاپور کے برجیں تیار کروایا۔ پھر اسی سنہ مذکور میں ملک الماس کو سرلشکر کیا۔ اور جینجاور کے قلعہ پر قابض و متصرف ہوا تاریخ اس کی یہ ہے صاحب عالم سلامت وہی جینجاور آیا اور سنہ ۱۰۷۰ ایکہزار ستر ہجری مطابق سنہ ۱۶۵۹ء سولہ سو انسٹھ عیسوی میں علی محل تیار کیا تاریخ اس کی یہ ہے۔ علی محل ز مینو گشت۔ ۱۰۷۰ اور علی عادل شاہ ثانی اسی سنہ مذکور میں سفر گودہ اور محمد بندر کا کیا اور اسی سنہ میں افضل خاں مارا گیا تاریخ اس کے قتل کی یہ ہے زجان افضل حیف اور سنہ ۱۰۷۱ ایکہزار ہجری مطابق ۱۶۶۰ سولہ سو ساٹھ عیسوی میں علی عادل شاہ ثانی چیکلہ اور ٹورگل پر سواری کیا اور اسی سنہ میں جوہر کو خطاب صلابت خانی دے کر سیوا کے مقابلہ پر کہ اس نے قلعہ پرنالے کا دغا سے لیا تھا روانہ کیا۔ جوہر مذکور نے لشکر جرار اور ساز و سامان جنگی لے کر بڑی محنت و جانبازی کیا لیکن اس سے اس قلعہ پر قابض نہ ہوا آخرالامر بادشاہ خود متوجہ اس مہم کا ہو کر قلعہ پرنالہ کا لیا۔ تاریخ اس کے فتح کی یہ ہے کہ قلعہ پنالہ دیکھے سیوا سے عادل شد اور نصرتی کہا سو تاریخ یہ ہے۔ علی نے پل میں پنالہ لیا صلابت سوں۔ ۱۰۷۱
اور سنہ ۱۰۷۲ ایکہزار بہتر ہجری مطابق سنہ ۱۶۶۱ سولہ سو یکسٹھ عیسوی میں جوہر صلابت خاں علی عادل شاہ ثانی سے بغاوت بادشاہ اس کو تنبیہ پہنچا کر سر اس کا کاٹا۔ تاریخ اس کی یہ ہے۔ بمردآں جوہر از مہابت عادل ۱۰۷۲ اور تاریخ جوہر صلابت خاں مارا جانے کی میاں نصرتی کہا سو یہ ہے باغی ہوا موا ۱۰۷۲ اور سنہ ۱۰۷۳ ایکہزار تریاہتر ہجری مطابق سنہ ۱۶۶۲ سولہ سو باسٹھ عیسوی میں تیسری تاریخ رجب کے علی عادل شاہ ثانی رونق بخش سواد بنکاپور و بکھیری و بدنور ہو کر تاریخ اٹھیس ماہ جمادالاول سنہ ۱۰۷۴ ایکہزار چوہتر ہجری مطابق سنہ ۱۶۶۳ سولہ سو ترسٹھ عیسوی کو مراجعت فرما کر داخل پایہ تخت بیجاپور کے ہوا۔ اور وہی سنہ میں شاہ پیٹھ کے آباد کی بنا ڈالی اور علی عادل شاہ ثانی کو ایک فرزند اور ایک دختر تھی فرزند کا نام سکندر عادل شاہ اور دختر کا نام بادشاہ بی بی تھا اور سنہ ۱۰۸۳ ایکہزار تراسی ہجری مطابق سنہ ۱۶۷۲ سولہ سو بہتر عیسوی میں علی عادل شاہ ثانی بمرض فالج کے بیمار ہوا۔ حقیقت اس کی یوں ہے کہ بادشاہ ادویات حارامساک کے استعمال فرما کر حرا

سے اود بات کے آب سرد پیا تھا اور وقت اول شب کے جو چوتھی ربیع الاول کی تھی۔ واسطے استقبال مظفر
خاں کے خدیجہ پور تک سواری کرکے راستے میں ہوا زدگی سے گرانی بدن کی ہو کر بجلدی تمام مراجعت کیا جبکہ
دولت خانہ میں داخل ہوا تھا طعام کے وقت پر اسی تاریخ کو مفلوج ہو کر دو دن و رات بے ہوش اور
مطلق بے حرکت رہا دوسرے روز تھوڑا کچھ ہوش میں آیا آدھا بدن بے حس ہوا تھا عبدالمحمد خواص خاں
واسطے دیکھنے بادشاہ کے جا کر پھر اپنے گھروں کو آئے۔ مظفر خاں و مرزا یوسف خاں و علی محب خاں و
دھرا پنت دبیر اتنے لوگ قرب تمام پا کر انہیں خلوت سرائے خاص ہوتے تھے اور دروازے
تمام بنگلہ کا آمد و رفت کے لئے دریچے کھلے رکھے تھے اور بادشاہ کا معالجہ کرنے میں مشغول تھے حکیم شمشاد
اور دوسرے اطباء بھی معالجہ کرتے تھے بادشاہ تین روز بیہوش مطلق رہا چوتھے روز تھوڑا ہوش میں آیا اگرچہ
صحت کلی نہیں ہوئی اور مرض روز بروز افزوں تر تھا ایسی حالت میں بھی حکمرانی کرتا تھا اور عبدالمحمد تین چار
بار واسطے دیکھنے بادشاہ کے آتا تھا اور خواص خاں ایک روز دو روز کو آمد و رفت رکھتا تھا اور حضوریان و خدام لوگ
جب بادشاہ یاد فرماتا تھا حاضر ہوتے تھے اور دیانت راؤ عبدالمحمد کے جانب سے سابق کے دستور موافق حضور
میں بادشاہ کے آمد و رفت رکھتا تھا اور عبدالمحمد مستقل تھا کسی کو چوں و چرا کا مجال نہ تھا اور بادشاہ کے دم حیات
تک کچھ خلل ارکان سلطنت میں راہ نہیں پایا۔ اور دیانت راؤ ظاہر و باطن میں عبدالمحمد سے رابطہ رکھتا
تھا اور مرزا یوسف خاں خواص خاں کے جانب تھا اور دھرا جی پنت عبدالمحمد و دیانت راؤ کا دشمن تھا واسطے
سلامتی اپنے مظفر خاں کے استحکام کے لئے سعی بلیغ کرتا تھا اور بادشاہ جانتا تھا کہ خواص خاں اور مظفر خاں یہ
دونوں حوصلہ کامرانی و حفظ سلطنت کا نہیں رکھتے تھے اور عبدالمحمد بارہ سال سے کاروبار امور ریاست کا
کر کے واقف امور جہانبانی کا ہوا تھا۔ شاہجی بھونسلہ و عبدالکریم بہلول خاں اور دوسرے امرا عبدالمحمد کے
محکوم تھے بادشاہ کو یہ منظور تھا کہ شہزادہ والا تبار کو سپرد اس کے کر کے سلطنت بادشاہی اختیار میں اس کے
دیوے تا کہ خود زندہ ہی اس کو مستقل کرے لیکن عبدالمحمد یوں تصور کیا تھا کہ سلطنت عادل شاہیہ اگر میں حوالہ
کروں تو عنقریب یہاں ہلا جاؤں گا اور یہاں بھی اس کی مانع ہو کر قسم دی حتی کہ یہ کام اختیار مت کرا [illegible]
[illegible]۔ ایک روز بادشاہ عبدالمحمد کو فرمایا کہ میں جانتا ہوں اس مرض سے رہائی کم [illegible]

عمل ہند یک سیاہی اور سیواجی جو دشمن تھا اور طلب سے جدا جانے۔ بعد از میرے کیا صورت ہوئے اور کس طور کا شغل ہو
آگے آوے بہتر یہی ہے کہ روبرو میرے شاہزادہ کو سریر خلافت پر اجلاس کر کے سلطنت کی بندوبستی کا
اختیار اپنے ہاتھ میں لے اور ملک بادشاہی کی حفاظت کر تاکہ بعد از میرے کسی کو تجھ سے مجال منازعت کا نہ
رہے۔ عبدالمحمد یہ بات قبول نہ کر کے عذر کیا دیانت راؤ اور کتنے خیر خواہان سلطنت بہت طور سے
خاطرداری اس کی کر کے کہے کہ بادشاہ چاہتا ہے کہ شہزادے کو تیرے سپرد کر کے اپنے روبرو تجھ کو مستقل کرے کچھ
اندیشہ اپنے خاطر میں نہ لا اور اپنے آپ کو اس کام سے باز مت رکھ کہ معاملہ برہم ہو جاوے گا۔ لیکن اس نے نہ مانا
یہ بات خاطر پر بادشاہ کے نہایت گراں ہوئی لیکن اپنے حال میں حیران تھا کچھ چارہ نہیں چلا اور عبدالمحمد کا
اقبال رو بہ زوال تھا بہت سے امور ریاست خلاف مصلحت کے کرتا تھا چنانچہ خود بخود اقرار کیا۔ خواص خاں
شاہزادہ کو تخت خلافت پر اجلاس کر کے دارالخلافت میں انتظام امور سلطنت میں رہے اور اپنے کو لشکر
دے کر قلعہ شاہ درگ و گجگرہ کی حفاظت سپرد رکھے اور قلعہ مرج و پرنالہ جو عبدالکریم بہلول خاں کی تحویل تھا شل
کے مقابلہ پر چھوڑ رہے۔ اور مظفر خاں بدنوری جانب سیواجی کے منہ پر رہے۔ اور سب امرا خواص خاں کے حکم میں
رہ کر جو کر خواص خاں فرماوے وہ بجا لاوے۔ خواص خاں اس بات کو غنیمت جان کر قبول کیا اور آپس میں
عہد و پیماں قسم کھا کر مضبوط کیے کہ بعد از بادشاہ کے دوسرے روز اپنے عہد کو وفا کرے۔ پھر رفتہ رفتہ مرض بادشاہ
کا غالب ہوا اور قوی جسمانی حرکت سے باز رہا۔ اس وقت ہر کوئی اپنی تدبیر میں مصروف ہوئے چنانچہ دیانت راؤ
خواص خاں سے موافقت کیا اور دھرباجی مظفر خان سے آمیزش کر کے اس کی استحکامی میں وافر کرتا تھا لیکن
عبدالمحمد و دیانت راؤ مظفر خان کو قوت پکڑنے نہیں دیتے تھے اور بادشاہ کو کچھ نوع سکھا کر اس کو حضور
سے نکال کر موافق التماس کے بہ ہند کو روانہ کیے۔ اس عرصے میں بادشاہ کی بیماری پھر عود کی دھرباجی بادشاہ کو
باور دلا کر مظفر خاں کو بادواڑے سے واپس طلب کیا۔ اس نے لشکر اپنا بادواڑیں چھوڑ کر شبا شب اپنے کو
حضور میں پہنچا کر بادشاہ کی خدمت عالی میں حاضر ہوا۔ اور خواص خاں بموجب معمول کے سپاہ لوگ ہمراہ
اپنے لے کر اندر آیا کرتا تھا۔ اس کو منع کیا کہ سپاہ لوگ ہمراہ نہ لے آوے اور تنہا آمد و رفت رکھے اس لئے درمیان
میں اس کے اور خواص خاں کے ناخوشی پیدا ہوئی۔ مظفر خان ملک منصور کے ہمراہ عبدالمحمد کو کچھ خفیہ کہلا بھیجا عبدالمحمد

جواب دیا کہ خواص خاں عہدہ وزارت پر ہے اور باپ اُس کا اس خدمت میں جاں نثاری کیا ہے اچھا کہ خواص خاں مناسب جانے کرے تم اور ہم اُس کے محکوم رہ کر سجدہ فرما ہے۔ بجملا کہ یہ مرزا یوسف خاں بادشاہ کے شروع بیماری سے دم آخریں تک یک لحظہ خدمت سے جدا نہیں ہوا تھا اور ہر ایک نوع سے موافقت کر کے خیرخواہی میں خواص خاں کی تھا اور بادشاہ وفات پانے کے بعد پندرہ روز آگے عالم بے ہوشی میں تھا مرزا یوسف خاں دانائی اور آہستگی سے معاملات ملکی خواص خاں سے رجوع کر کے حکم پر اُس کے عمل کرتا تھا جبکہ بادشاہ رحلت فرمانے کا وقت قریب پہنچا خواص خاں محلات شاہی میں آکر مرزا یوسف خاں کی صلاح و تدبیر سے ضبط و نسق دربار اور قلعہ کے اندر کا کیا اور علی عادل شاہ ثانی پانچ طاس کے وقت یکشنبہ کے روز تیرہویں تاریخ کو ماہ شعبان کے ۱۰۸۳ھ ایکہزار تراسی ہجری مطابق ۱۶۷۲ء سولہ سو بہتر عیسوی میں تخت تابوت کو سلطنت پر اختیار کیا۔ قاضی نور اللہ و شاہ ابراہیم و علی محب خاں و میر نعمت اللہ اور ملک [illegible] اور علماء و فضلاء تجہیز و تکفین کر کے شہ پیٹ میں جو گنبد نیم کلہ کہ اُن کی تعمیر کی ہوئی تھی اس میں مدفون کئے اور عمر اس کی پینتیس سال تھی اور سولہ برس سات مہینے سلطنت کیا تاریخ اس کی رحلت کی یہ ہے قطعہ

بادشاہ دیں پناہ خسرو عادل علی — تخت نشیں چناں گشت ز تخت جہاں
جان و دل مومناں ز آتش ہجرش بسوخت — در دہن مرد و زن شعلہ صفت شد زباں
سالِ وفاتش اویس گفت ز الہام غیب — بادشاہ دیں علی کرد وطن در جناں
۱۰۸۳

[illegible] جلد (۳۴) شمارہ (۳-۲) بابتہ ماہ تیر و امرداد ۱۳۳۸ف م مئی و جون ۱۹۲۹ء

× × × × × × × ×

★ جواب طلب امور کے لئے جوابی لفافہ کا آنا ضروری ہے
★ "شاداب" آپ کا اپنا رسالہ ہے اس کی توسیع میں حصہ لیجئے
★ قلمکار حضرات صرف غیر مطبوعہ تحقیقات ہی روانہ کریں

نکہت جہاں ایم۔ اے۔ (اردو)

میر کا شیوۂ گفتار

شعر میرے بھی ہیں پُردرد ولیکن حسرت
میر کا شیوۂ گفتار کہاں سے لاؤں؟

شیوۂ گفتار سے کیا مراد ہے غور کیا جائے تو اس مختصر سی ترتیب میں جہانِ معنی آباد ہے اور میر کے فن اور اسلوب کا ایک ایک پہلو مکمل طور سے نظر آتا ہے۔

گفتار میں ایک بات کرنے والا ہوگا وہ کبھی ساری دنیا کو مخاطب کرے گا کبھی اپنے کسی ہمدرد و غمگسار کو مخاطب کرے گا کبھی محبوب سے گفتگو ہوگی کبھی محبوب حقیقی سے ہمکلام ہوگا اور ایک منزل وہ ہوگی جہاں خودکلامی نظر آئے گی۔

گفتگو کے انداز میں جس سے گفتگو کی جا رہی ہے اس کے مرتبے اور منصب کو بھی پیش نظر رکھنا پڑتا ہے اور ہر جگہ لہجہ کی تبدیلی گفتگو کرنے والے کے شیوۂ گفتار کا تعین کرتی ہے شیوۂ گفتار میں چاہے وہ خودکلامی ہو یا محبوب حقیقی سے گفتگو اس میں ایک ڈرامائی کیفیت پائی جاتی ہے اور میر کی شاعری کا جوہر اعظم یہی ڈرامائی کیفیت ہے ڈراما میں حرکت ہوتی ہے اور ارسطو کے الفاظ میں حسن جامد کو متحرک کرنے کا نام ہے میر مجرد تصورات کو اپنے شیوۂ گفتار سے متحرک بنا دیتے ہیں اور یہ تحرک دراصل ان کی شخصیت کا ایک جزو ہے۔

کسی کا شیوۂ گفتار اس کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے میر کی شخصیت بھی واقعات کی تیز آنچ میں تپی اور نکھری ہوئی شخصیت ہے شخصیت کے اجزا میں ان کا غم ذات بھی شامل ہے کبھی اکبرآباد سے رخصت ہوتے [illegible] پر حسرت سے نظر ڈالے۔ کبھی دنیا کے غم کبھی وہ چاندنی صورت

جو شکل آنکھوں میں نظر آتی تھی اور جس تک پہنچنا چاند کی کرنوں کو گرفت میں لینے کے مترادف تھا، اعزہ کی بے وفائیاں، رشتہ داروں کی بے مہری، سخت حالات، یتیمی کا داغ اور عمر بھر کی [illegible] کوچے جو اوراقِ مصور تھے جہاں ہر شکل کی تصویر نظر آتی تھی وہی دِلّی وہ نگر دکھائی دی جو سو مرتبہ لوٹا گیا۔ خواجہ احمد فاروقی کے لفظوں میں ایک جوئے خون [illegible] کے سر سے گذر گئی اور وہ اسی قلزمِ خون کے شناور تھے فطرت سے ایک دُکھا ہوا دل لے کر آئے تھے حالات نے اسی دل کی آگ کو ہمیشہ روشن رکھا۔

یاروئے یار رو گیا، اپنی تو یوں ہی گذری
کیا ذکر ہم صفیراں، یارانِ شادماں کا

اس لیے ان کی شاعری میں آنسو بھی ہیں اور غم بھی۔ لیکن یہ غم کسی بے بسی یا کسی مجبوری کے احساس کے تحت نہیں یہ غم ان کی شخصیت کا جزو ہے اور ایسا جزو ہے جہاں غمِ ذات غمِ کائنات میں ڈھل جاتا ہے اور آنسو کے قطرہ میں زندگی کے دجلہ و فرات کی لہریں دکھائی دیتی ہیں اس لیے ان کے شیوۂ گفتار پر غور کرتے ہوئے ان کی شخصیت کے اس پہلو کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

شاعری اظہارِ ذات ہو یا انکشافِ ذات یا عرفانِ ذات بہرحال وہ ذات کے محور پر گھومتی ہے اور میر کی ذات بہ صفاتِ غم سے عبارت ہے اور یہ غم دراصل عشق کی دین ہے۔

شیوۂ گفتار موضوع کا مطالعہ کرتا ہے جس کے شیوۂ گفتار پر غور کیا جا رہا ہے اس کا موضوع کیا ہے؟ تو میرے خیال میں میر کے موضوعات میں سب سے اہم موضوع عشق ہے عشق کا درد ہی مجبوری غم سے عبارت ہے اور عشق کا یہ موضوع انھیں وراثت میں ملا تھا چنانچہ فرماتے ہیں ؎

عشق ہی عشق ہے جہاں دیکھو
سارے عالم میں بھر رہا ہے عشق

میر تو تخلیقِ کائنات کا سبب بھی محبت کو قرار دیتے ہیں ؎

محبت نے ظلمت سے کاڑھا ہے نور

نہ ہوتی محبت نہ ہوتا ظہور

عشق و محبت ایک کیفیت کا نام ہے جو دل پر گزر جاتی ہے یہ کیفیت انسانی داخلی جذبات سے تعلق رکھتی ہے اس میں کبھی کبھی اظہار کی گنجائش بھی نہیں ہوتی ایک آہ کے ساتھ سب رخصت ہو جاتا ہے ایک شکوہ کے ساتھ ہوش جاتا رہتا ہے اس میں پتہ ہی نہیں چلتا کہ جو دھواں سا اٹھ رہا ہے وہ دل سے اٹھ رہا ہے یا جان سے اٹھ رہا ہے بس ایک آگ ہے جس میں سارا وجود پگھلا جا رہا ہے عشق کی منزلیں یہ ہیں کہ میر نے اسے خاک سے منزل قدس تک پہنچا دیا ہے

عشق وہ ہے کہ جو تھے خلوتیٔ منزلِ قدس

وہ بھی رسوائے سر کوچہ و بازار ہوئے

اور ایک منزل وہ آئی جب محبت تسلیم و رضا کی منزل پر پہنچی اس منزل پر جہاں تلواروں کی چھاؤں میں سجدۂ تسلیم و محبت ادا کیا۔ میر نے کہا ہے

زیر شمشیر ستم میر تڑپنا کیسا

سر بھی تسلیم محبت میں ہلایا نہ گیا

یہ محبت کی وہ منزل ہے جس منزل میں ازلی و ابدی و سرمدی تصورات ہیں یہاں عشق قربانی کا نام ہے عشق انسان کو سربلند کرتا ہے چاہے یہ سربلندی اسے نوک نیزہ پر ہی کیوں نہ حاصل ہو اس لیے یہاں میر کا شیوۂ گفتار بدلا ہوا دکھائی دیتا ہے یہاں اس طرف اشارہ ہے کہ انسان کا اعلیٰ شرف و مقصد یہ ہے کہ تسلیم و محبت میں شمشیر ستم بھی اور خلوتی منزل قدس ہونے کے باوجود کوچہ و بازار کی رسوائی بھی برداشت کرے۔ میر کا شیوۂ گفتار یہاں عزم و ہمت و حوصلہ بخشتا ہے اور یہ سکھاتا ہے کہ رضائے محبوب کی خاطر جان جیسی حقیر شئے کا نذرانہ کیا معنی رکھتا ہے سر کٹ جائے گا تو بھی اظہار محبت ہوتا ہی رہے گا ہے

وا اس سے سر عرفاں تو یو کو کہ ہی مر جائے
ہم علق بریدہ سے ہی تقریر کریں گے

یہ حیثیت کی وہ سمجھائی ہوئی دنیا ہے جہاں زیرِ شمشیر ستم سر نہیں جھکتا۔ خلوص بمنزل قدس رسوا ہوتا ہے اور جہاں علق بریدہ سے تقریر کی جاتی ہے غم یہاں بھی درد کا احساس یہاں بھی ہے وہ تڑپ بھی ہے اور سوز و گداز بھی ہے جو زوج کے مضطرب تاروں سے نغمۂ شہادت بن جاتی ہے لیکن یہاں انسانی تاریخ کے پس منظر میں انسان کی عظمت کا احساس دلانے والا شعور گفتار بھی ہے۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی "تنقیدی زاویئے" میں لکھتے ہیں:۔

"میرنے عشق کا حقیقی تصور پیش کیا ہے اور اس سے مراد ہے طریقت کے راستہ سے ذاتِ باری تک رسائی۔ میر کے نزدیک یہی انسان کا نصب العین ہونا چاہیئے کیونکہ کائنات کی ہر چیز اس راہ پہ گامزن ہے ہر شے اسی عشق سے سرشار ہے۔"

میر کے شیوۂ گفتار کا یہی رخ اس وقت اور واضح ہوتا ہے جب وہ انسانی عظمت کا احساس دلاتے ہیں وہ انسان کے شاعر ہیں۔ غالب نے کہا۔

ع آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

میر بہت پہلے "آدمیوں" کو مخاطب کرکے یہ بتا چکے ہیں ؎

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

ایک منزل وہ آجاتی ہے جب انسانی عظمت کا احساس میر کو یہ احساس دلاتا ہے کہ انسان سوز و ساز درد و داغ، جستجو و آرزو کا نام ہے اس کے اور خالق کائنات کے درمیان یہی وجۂ امتیاز ہے اسی لیئے کہتے ہیں ؎

سراپا آرزو ہونے نے بندہ کر دیا ہم کو
وگرنہ ہم خدا تھے گر دلِ بے مدعا ہوتے

کبھی خود کلامی کی منزل سے آگے بڑھ کر احساسِ ذات اُبھرتا ہے اور پیمانہ چھلک جاتا ہے عشق یہ یاد دلاتا ہے کہ وہ ہم ہیں اور ہم وہ ہیں سارے عالم میں ایک ہی وجود ہے تو یہ بھی کہہ اُٹھتے ہیں

اپنے سوائے کس کو موجود جانتے ہیں
ہم آپ ہی کو اپنا مسجود جانتے ہیں

دوسرے مصرعہ میں لفظ "آپ" رکھ کر اپنے شیوۂ گفتار پر انفرادیت کی مہر ثبت کر دی ہے یہاں لفظ آپ دراصل اللہ تعالیٰ سے گفتگو ہے۔ صرف تو ہی ہمارا مسجود ہے تجھ کو ہی سجدہ کرتے ہیں حالانکہ پہلے مصرعہ سے یہ شک گزرتا ہے کہ "آپ ہی کو" سے اپنے آپ کا بھی اشارہ ہے یہ میر کے شیوۂ گفتار کا ایک رخ ہے دوسرا رخ وہ ہے جہاں وہ عشقِ مجازی کا بیان کرتے ہیں یہاں میر کا لہجہ بالکل بدل جاتا ہے وہ ایک عام آدمی معلوم ہوتے ہیں اور یہاں پہنچ کر احساس ہوتا ہے کہ خواص ان کے شعر کیوں پسند کرتے ہیں اور عوام سے انھیں کیوں گفتگو ہے

شعر میرے ہیں گو خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

عوام سے گفتگو کا مقصد عوام کے جذبات کا اظہار ہے جس طرح سب محسوس کرتے ہیں میر ان ہی محسوسات کو اپنے الفاظ کے پیکر میں ڈھال کر اس طرح پیش کرتے ہیں کہ خود ان ہی کے لفظوں میں

سن جو بولا کہا کہ یہ آواز
کسی خانہ خراب کی سی ہے

ایک آواز کی شناخت ہی لیے ہے کہ دنیا کے جتنے خانہ خراب ہیں ان سب کا درد اس کی آواز میں سمٹ آیا ہے وہ سب کو اپنے شعری تجربات، اپنی وارداتِ قلب سناتا رہتا ہے کبھی جی بھر کے رونا چاہتا ہے لیکن پاسِ ناموس روک دیتا ہے تو یہ کہہ اٹھتے ہیں

پاسِ ناموسِ عشق تھا ورنہ
کتنے آنسو پلک تک آئے تھے

اس میں ان کا شیوۂ گفتار جھلکتا ہے بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ صرف غم کو پی جانے کا تذکرہ ہے لیکن درحقیقت یہ بتانا مقصود ہے کہ وہ عشق ہی کیا جس کی کوئی ناموس نہ ہو آنسو اگر ڈھلک گئے تو رازِ عشق افشا ہو جائے گا اور اگر رازِ افشا ہو گیا تو یہ رسوائی ہے۔

عشق کا یہ تصور آگے بڑھ کر سماجی مسائل سے ہم آہنگ ہوتا ہے اور غمِ جاناں کے ساتھ غمِ دوراں کا احساس پیدا ہوتا ہے سب سے پہلے غالب کے یہاں اس قسم کا احساس ہوتا ہے ؎

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

حسرت، جگر، فراق کے یہاں اس کے اثرات زیادہ گہرے نہیں ہیں لیکن ان کے بعد آنے والے غزل گو شعراء میں اس رجحان کا اثر بہت نمایاں ہے فیض، مجاز، جذبی اور تقریباً تمام نوجوان شعراء کی غزلیں اس رجحان کی آئینہ دار ہیں ؎

بڑی مشکل ہے دنیا کا سنورنا
تری زلفوں کا [illegible] پیچ و خم نہیں ہے — مجاز

کر رہا تھا غمِ جہاں کا حساب
آج تم یاد بے حساب آئے — فیض

پہنچے گور کنارے ہم
بس غمِ دوراں ہارے ہم — ناصر کاظمی

اس گہرے سماجی شعور نے غزل کو سیاسی، سماجی اور تہذیبی [illegible] ان

مسائل کی ترجمانی ایک اجتماعی اور انفرادی نقطہ نظر سے کی گئی ہے۔

دیکھ رفتار انقلاب فراقؔ!
کتنی آہستہ اور کتنی تیز

اب تو [illegible] میں روشنی کر دو
اب تو جو بستیاں ہے لوٹ لئے — احسان دانش

اس محفل کیف و مستی میں اس انجمن عرفانی میں
سب جام بکف بیٹھے ہی رہے ہم پی بھی گئے چھلکا بھی گئے — مجاز

یوں بہار آئی ہے امسال کہ گلشن میں صبا
پوچھتی ہے گزر اس بار کروں یا نہ کروں — فیض

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا — مجروح

کیا خبر خاک ہی سے کوئی کرن پھوٹ پڑے
ذوق آوارگیٔ دشت و بیاباں ہی سہی — ناصر کاظمی

ان اشعار میں زندگی اور اس کی کشمکش کو سمجھنے کا خیال ہے ایک نئے نظام کے قیام کی تمنا ہے نئے نظام کے قیام سے قبل افراد کو جن حالات سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے اس کا اظہار بھی ہے غرض اس میں وہ سب کچھ موجود ہے جس سے آج انسانیت دوچار ہے اس میں وہ تمام رجحانات نظر آتے ہیں جو موجودہ دور کی زندگی میں موجود ہیں زندگی کے ایک ایک پہلو کو اس نے اپنے دامن میں سمویا ہے اس طرح کہ وہ زندگی کا صحیح آئینہ معلوم ہوتی ہے۔

بقول اصغر:

اصغرؔ غزل میں چاہیے وہ موجِ زندگی
جو حسن ہے بتوں میں، جو مستی شراب میں

محمد شجاعت علی راشد
ریسرچ اسکالر

"سفر" اردو شاعری کا ایک خوبصورت استعارہ

جس طرح انسانی تخیل ہر پل نت نئی چیزوں کی تخلیق کرتا رہتا ہے۔ اسی طرح انسانی تاریخ بھی ہر لمحہ سفر کرتی رہتی ہے۔ ہر تخلیق انسان کے خوابوں اور اُس کی اُمنگوں کا اظہار ہوتی ہے یہی تخلیق اُس کی ذہنی و ذوقی تسکین کا باعث بھی بنتی ہے یعنی اگر کوئی مصور یا قلمکار ہے اور کوئی آرکیٹکٹ ہے تو ان تینوں کی سوچ کے دائرے بھی ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہوں گے یعنی ان تینوں کا ذہنی سفر اس لحاظ سے بھی ایک دوسرے سے جدا ہوگا کہ مصور رنگوں کی دُنیا میں گم۔ قلمکار لفظوں کی دنیا میں اور آرکیٹکٹ تعمیری اشیاء کے بھاؤ تول کے سلسلہ میں درکار معلومات کے لئے اپنا ذہنی سفر طے کرے گا۔ مثلاً جب ایک مصور کسی رنگ کو دیکھتا ہے تو دانستہ یا نادانستہ اُس کے ذہنی سفر کا آغاز ہو جاتا ہے اور وہ ہمیشہ پیش نظر رنگ کو اپنی کسی تصویر میں بھرنے سے متعلق تمام اُمور کو قطعیت دے دیتا ہے کسی رنگ کو دیکھ کر مصور کا اس طرح سے سوچنا اور پھر اُس کو عملی شکل دینا بھی ایک سفر کہلائے گا۔ یہی طرح جب کوئی شاعر ناول یا افسانہ نگار یا پھر انشاء پرداز کسی لطیف جذبہ، واقعہ یا خیال کو لفظی پیکر عطا کرتا ہے تو جس لمحہ سے وہ خیال اُس کے ذہن میں آتا ہے اور اُس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لئے وہ جن جن مراحل سے گذرتا رہے گا وہ بھی ایک سفر ہی ہے۔ بالکل اسی طرح جب کوئی آرکیٹکٹ کسی عمارت کی تعمیر کا کام انجام دیتا ہے تو سب سے پہلے اُس کے ذہن میں ایک پلان یا ایک منصوبہ موجود ہوتا ہے اور جب وہ اُس منصوبہ کو حقیقی شکل عطا کرتا ہے تو اُس کا یہ عمل بھی ایک سفر ہی

قرار دیا جائے گا اور جب اسی سفر سے گذر کر وہ "تاج محل" جیسی عظیم عمارت تعمیر کرتا ہے تو اُس کا یہ ذہنی سفر نہ صرف اُس کی اپنی ذات بلکہ تاریخِ انسانیت کے لئے ایک نا قابلِ فراموش سفر ثابت ہوگا۔ اپنی بات کو مزید آگے بڑھانے سے قبل اس بات کی وضاحت کرتا چلوں کہ اردو غزل میں اب اجتماعی و شعوری استعارہ کا کام بھی دیتا ہے اور اردو غزل ہی وہ واحد صنفِ ادب ہے جو اپنے استعاروں کے ذریعہ کسی بھی شئے کو پیکر میں ڈھال کر ہمارے سامنے کسی فلم کی طرح متحرک بنا کر پیش کرتی ہے جب ہم اردو شاعری کے ایک استعارہ "سفر" پر بحث کر رہے ہیں تو سب سے پہلے ہماری نظر اُس سفر پر پہنچتی ہے جو میری دانست میں وحدت میں کثرت کا تصور پیش کرتا ہے دنیائے انسانیت کی تاریخ کا کوئی بھی سفر اس سفر سے عظیم ہوا ہے اور نہ روزِ محشر تک ہو سکتا ہے جو سفر حضرت امام حسینؑ نے اپنے اکثر جانثاروں کے ساتھ مدینہ سے شروع کیا تھا اور کربلا پر اس سفر کا بظاہر اختتام ہوتا ہے اس با عظمت سفر کو دنیائے اسلام ہی نہیں بلکہ دنیائے انسانیت کی تاریخ بھی نہیں بھلا سکتی۔ کیونکہ یہی وہ سفر ہے جس میں انسانیت کا ماضی، حال اور مستقبل اپنی پوری صداقتوں کے ساتھ موجود تھا۔

چونکہ انسانی تاریخ بھی اپنے آغاز سے آج تک ایک ہی محور کے گرد گھوم رہی ہے اور اُس کا گھومنا اس بات کی علامت ہے کہ وہ بھی سفر میں ہے اور اس سفر میں چونکہ انسانی ذہن بھی شریک ہے لہٰذا وہ بھی ہر وقت کوئی نہ کوئی پیکر تراشتا ہی رہتا ہے اور اُس وقت جبکہ یہ ذہن کسی شاعر کا ہو تو وہ یقیناً اپنی لامحدود فکر کے سہارے ایک الگ ہی دُنیا آباد کرے اور یہ دنیا اُسی وقت آباد ہو سکتی ہے جب وہ اس سفر کو طے کرے اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسانی تاریخ کے سفر اور شاعر کے ذہنی سفر میں کیونکر تعلق قائم ہو سکتا ہے؟ تو اس بات کو ہم افلاطون کے الفاظ میں اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ "شاعر نقل کی نقل پیش کرتا ہے"۔ لیکن اس سلسلے میں افلاطون کے خیال سے اتفاق کرتے ہوئے ارسطو کے اس نظریہ سے بھی پوری طرح متفق ہوں جس میں شاعری (MIMESIS) کے حدود سے نکال کر (KATH AR SIS)

منزل تک پہنچا سکے ہمیں یہ بتایا ہے کہ شاعری صرف وہی پیش نہیں کرتی [illegible]
بلکہ وہ بھی پیش کرتی ہے جو کچھ ہو سکتا ہے۔" بعد میں یہی بڑا کچھ ہو جاتا ہے"

مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں اگر ہم یہ کہیں تو مبالغہ نہیں ہوگا کہ ہر تخلیق کا خواہ اُس کا تعلق قلم سے ہو یا اوزار سے ہر وقت شعری، سماجی یا جمالیاتی سفر میں رواں دواں رہتی ہے۔ اس سفر میں اُس کا ظاہری وجود ہی نہیں بلکہ اُس کا روحانی وجود بھی اپنی تمام تر خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ موجود رہتا ہے۔ اس تناظر میں اس لفظ "سفر" کی معنویت، وسعت اور جامعیت کا جائزہ کیا جائے تو ہمیں اندازہ ہوگا کہ اس ایک لفظ کے پس منظر اور پیش منظر میں ایک دنیا ہے اور اس دنیا سے انسان کی وابستگی عارضی بھی ہے اور ابدی بھی۔ مثلاً ہم کسی حسین نظارے سے لطف اندوز ہو رہے ہیں کہ اچانک ہماری آنکھوں کے سامنے ایک ہوائی جہاز حادثہ کا شکار ہو جاتا ہے اور اس حادثہ میں سیکڑوں جانیں تلف ہو جاتی ہیں تو ایسے وقت ہمیں نظارہ سے لطف اندوز ہونے کا تاثر عارضی ثابت ہوگا اور ہوائی جہاز کا حادثہ ایک ابدی تاثر بن کر ہمارے ذہن پر نقش ہو جائے گا اسی طرح جب ہم تناظر میں دیکھتے ہیں تو ہماری تحریک کے پس پردہ جو محرکات ہوتے ہیں اس کی وجہ تو تخلیق کار بتاتا ہے جو ہمیں کسی بھی تخلیق کے پس منظر پیش منظر اور تناظر کے ساتھ ہے۔ اچھا تخلیق کار جو شعری اقدار اور ہماری تہذیبی روایات کے آئینہ میں ایک منہ بولتی تصویر کی صورت میں اپنی تخلیق کو پیش کرتا ہے تو قاری بھی پوری طرح اس تخلیق کے ساتھ اپنا رشتہ قائم کر لیتا ہے خصوصاً شاعر کے لئے شدتِ احساس کا ماحول پیدا کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے کیونکہ وہ ایک احساس کو الفاظ کے سانچوں میں ڈھال کر پیش کرتا ہے جذبات اور احساسات کی تہذیب و تربیت سے ہی قاری دلالت رہتا ہے اس لیے شاعر تشبیہات کے بجائے استعارے سے کام لیتا ہے۔ شاعر کی بات کو خیال کو جس میں جب کبھی استعارہ کوئی ترکیب یا کوئی علامت مشکل نظر آتی ہے تو ہمیں وضاحت کی ضرورت ہوتی اور جب یہ صورت "سفر" کی وسعت میں نظر آتی ہے [illegible]

محور قصور ہوتا ہے اور یہی تصورِ زندگی کی علامت کہلاتا ہے۔ دراصل علامتوں اور استعاروں کے استعمال کرنے میں بھی ہمارے ذہن کو بہت بڑا دخل ہوتا ہے۔ اس لیے جس کی ذ[ہنی] سطح جس قدر بلند ہوتی ہے اس کے یہاں استعارے اور الفاظ کا معیار بھی اسی قدر بلند اور جس کی ذہنی سطح جس قدر پست ہوگی اس کے یہاں ان کا معیار اسی قدر پست ہوگا۔ اسے اس طرح بھی کہا جا سکتا ہے کہ شاعر جن کرداروں سے جذباتی وابستگی اور عقیدت رکھتا ہے انھیں اپنے الفاظ کے پیکر میں لانے کے لئے اپنی ذہنی، فکر کو مجتمع بھی کر سکتا ہے اور اسے وسعت بھی عطا کرتا ہے اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں، انسان خواہ اس کا تعلق زندگی کے کسی شعبہ سے کیوں نہ ہو، شاعر بلا تخصیص مذہب و جنس عالم انسانیت کی زندگی کے داخلی وخارجی ر[و] کی داستانوں کو الفاظ کے سانچوں میں ڈھال کر اس انداز سے پیش کرتا ہے کہ وحدت میں کثرت پنہاں نظر آتی ہے۔

اس بحث کو یہیں چھوڑ کر اب ہم اصل موضوع کی طرف واپس لوٹتے ہیں یعنی اردو شاعری میں استعارہ "سفر" کی ہمارے شعراء نے کس کس طرح سے توضیح کی ہے لیکن اس سے پہلے ایک وضاحت بھی ضروری ہے کہ یہ سفر محض انسانی زندگی کے لئے ہی نہیں، بلکہ اس کا اطلاق ہر جاندار شئے پر بھی کیا جا سکتا ہے کیونکہ جانور بھی سفر کرتے ہیں اور "مہاجر پرندے" تو بہت زیادہ مشہور ہیں۔ ان کا یہ سفر بھی کسی نہ کسی مقصد کے لیے ہی ہوتا۔ یہ سفر انسان ہو کہ جانور کبھی کبھی تو تنہا کرتا ہے اور کبھی کارواں کے ہمراہ، لیکن پھر بھ[ی] تنہا رہتا ہے اور اسی سفر کے دوران اقبال جیسے عظیم المرتبت شاعر کو بھی اپنی تنہائی کا شد[ت] کے ساتھ احساس ہے۔ شاید اسی لیے وہ کہتے ہیں ؎

راہِ محبت میں ہے کون کسی کا رفیق
ساتھ مرے رہ گئی ایک مری آرزو

یہاں لفظ "آرزو" شاعر کی تشنگی کا اظہار کرتا ہوا نظر آتا ہے جو زندگی کے تیرہ۔

حسرت پہ اس مسافرِ بے کس کی رو ئیے
جو تھک گیا ہو بیٹھ کے منزل کے سامنے

اور جب کوئی مسافر اپنی منزل سے بھٹک جاتا ہے تب شاد عظیم آبادی کی نظر اس مسافر پر پڑتی ہے تو وہ اسے اپنا سفر جاری رکھنے کی تلقین ان الفاظ میں کرتے ہیں ؎

لاکھوں ہی مسافر چلتے ہیں منزل پہ پہنچتے ہیں دو ایک
اے اہلِ زمانہ قدر کرو، نایاب نہ ہوں کمیاب ہیں ہم

لیکن اسی مسافر پر جب شاعرِ مشرق علامہ اقبال نظر ڈالتے ہیں تو کہہ اٹھتے ہیں ؎

بس ایک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

کبھی کبھی تو یہ سفر بادلِ نخواستہ بھی طے کرنا پڑتا ہے اور یہ مرحلہ اس وقت اور بھی دشوار ہو جاتا ہے جب مسافر کو اپنے وطنِ عزیز کو الوداع کہنا پڑتا ہے کیونکہ ایک مسافر اپنے وطن کا محافظ بھی ہو سکتا ہے اور جب وہ رختِ سفر باندھ لیتا ہے تو یہاں استعارہ سفر کا استعمال مسافر کی محرومی کو ظاہر کرنے کے لئے واجد علی شاہ اختر اس طرح کرتے ہیں ؎

در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
خوش رہو اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

یا پھر کسی کے ہاں اس طرح کے جذبات بھی ملتے ہیں ؎

سیر کی خوب چنے پھول بہت شاد رہے
باغباں جاتے ہیں گلشن تیرا آباد رہے

مندرجہ بالا دونوں شعر میں شاعر نے مسافر کی محرومی کے ساتھ ساتھ اس کے اندر زندگی کے آثار کو بھی معدوم کر دیا ہے لیکن جب آتش اس سفر کا ذکر کرتے ہیں تو ان کے ہاں استعارہ سفر کا استعمال ایک مقصد اور ایک منزل پر پہنچنے کے لئے کیا گیا ہے ؎

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے

یعنی اگر ہم کسی کام کو کرنے کا قطعی ارادہ کر لیں تو پھر کوئی بھی طاقت ہمیں اس عمل سے باز نہیں رکھ سکتی بالکل پھر زندگی کے اس سفر کے لئے جب کوئی چل پڑتا ہے تو یہ نہیں سوچتا کہ وہ راستے کی صعوبتوں کو برداشت کر سکے گا بھی کہ نہیں؟ اور ایک ایسا ہی سفر عشق کا بھی ہوتا ہے جہاں انسان کسی کی شوخی اور شرارت سے اس قدر متاثر ہو جاتا ہے کہ دانستہ یا نادانستہ اس سفر کے لئے نکل پڑتا ہے جہاں بظاہر تو کوئی منزل دکھائی نہیں دیتی لیکن اس سفر کا مسافر ہر قدم پر ایک نئی منزل کا تصور لیے ہوئے آگے ہی بڑھتا رہتا ہے عشق کے سفر پر گامزن ایک ایسے ہی مسافر کی تصویر ولی نے اس طرح پیش کی ہے ؎

عشق کی راہ کے مسافر کوں
ہر قدم تجھ گلی میں منزل ہے

لیکن بسا اوقات یہ مسافر دو گام چل کر ہی ہمت ہار بیٹھتا ہے اس کی ایک اہم وجہ تو انسان کی وہ نفسانی خواہش ہے جو اسے ہر لمحہ عیش پسندی کے لئے مائل کرتی رہتی ہے اور ایسے وقت مسافر کی بے چارگی و کم علمی کی کیفیت کا اظہار غالب نے یوں کیا ہے ؎

سفرِ عشق میں کی ضعف نے راحت طلبی
ہر قدم سائے کو میں اپنا شبستان سمجھا

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس سفر میں انسان ہر لمحہ ایک نئے درد اور ایک نئی کسک سے آشنا ہوتا جاتا ہے لیکن اس سفر کو ترک کرنا یا واپس لوٹ جانا اس کے اپنے بس میں نہیں ہے کیونکہ اس سفر کا انتخاب تو وہ خود اپنی مرضی سے کرتا ہے لہٰذا ایک نامعلوم منزل کی طرف ہی چلا جاتا ہے۔ اسی حالت کو شاد عظیم آبادی نے اس طرح بیان کیا ہے ؎

سفر ضرور ہے اور عذر کی مجال نہیں
مزہ تو یہ ہے نہ منزل نہ راستہ معلوم

منزل اور راستے سے عدم واقفیت کے باوجود بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر مسافر کو اس سفر میں اس بات کا یقین رہتا ہے کہ اگر وہ منزل پہ پہنچ بھی جائے تو بھی وہ منزل اُس کے حق میں ایک عارضی منزل ہی ثابت ہوگی چنانچہ وہ اپنے سفر کے خاتمہ سے بے نیاز ہو کر آگے بڑھتا رہتا ہے اور جب اسے یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ وہ منزل پر پہنچ گیا ہے تو وہ اپنی اُس منزل کو راہ کا تعین کرنے والا نشان سمجھ کر آگے بڑھتا جاتا ہے اور مسافر کے اسی عزم محکم کو فانی نے اس طرح بیان کیا ہے ؎

وہ مسافر ہوں جو ہو ختم سفر سے بے نیاز
میری ہر منزل نشانِ راہ ہے منزل نہیں

لیکن اس سفر میں بے خبری اور غفلت کو درست نہیں سمجھتے کیونکہ اُن کے خیال میں منزل کا تعین ہی عین مشرط ہے کسی بھی مسافر کے لئے شاید اسی لئے وہ بے خبر مسافر کو خبردار کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

اے بے خبر تو آپ سے غافل نہ بیٹھ رہ
جوں شعلہ یاں سفر ہے ہمیشہ وطن کے بیچ

یعنی جب سفر ہوگا تو اُس میں توقف بھی ضرور ہوگا لیکن یہ وقفہ اتنا طویل بھی نہ ہو جائے کہ مسافر یہ کہنے پر مجبور ہو ؎

دیکھئے واماندگی اب کیا دکھائے
قافلہ یاروں کا سفر کر گیا

لیکن کسی بھی مسافر کے کارواں سے بھٹک جانے کی ذمہ داری بڑی حد تک میر کارواں پر عائد ہوتی ہے۔ شاید اسی لئے اقبالؔ، میر کارواں میں ان خوبیوں کو ناگزیر قرار دیتے ہیں ؎

نگہ بلند سخن دلنواز جاں پُرسوز
یہی ہے رخت سفر میر کارواں کیلئے

لیکن اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ میر کارواں کی دانشمندی اور مسافر کی چالاکی کے باوجود بھی سارا مال و اسباب لُٹ جاتا ہے ؎

آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت
اسباب لُٹا راہ میں یاں ہر سفری کا

یہاں اسباب کا لُٹنا علامت ہے انسان کی جائیز و ناجائیز خواہشات کے ادھورے رہ جانے کی۔ کیونکہ زندگی کے اس سفر کو سرائیوں کا سفر بھی تو کہا گیا ہے جہاں ہر قدم پر انسان کو ایک نئے سراب سے گذرنا پڑتا ہے لیکن یہ جانتے ہوئے بھی ہر مسافر ڈھیر سارے مال و اسباب کے ساتھ ہی اس سفر کو اختیار کرتا ہے۔ اور اس کا نتیجہ بہر حال اس مسافر کے لُٹ جانے یا پھر دھوکہ کھانے کے بعد ہی برآمد ہوگا چنانچہ ذوقؔ نے ایسے ہی ایک مسافر کے بارے میں کہا ہے۔ ؎

کیوں اتنا گراں بار ہے جو رختِ سفر ہے
اے راہروِ ملکِ عدم اُٹھ نہیں سکتا

یہاں ذوقؔ نے استعارہ "سفر" کو انتہائی بنا کر پیش ہے۔ انہوں نے اس سفر کے مسافروں کو یعنی دنیا سے اسلام کے سپوتوں کو اس بات کی تلقین کی ہے کہ وہ صراط مستقیم کو ہی اختیار کریں تاکہ گناہوں کے بوجھ سے جھکنا نہ پڑے۔ دوسری طرف وہ اُن باتوں کی طرف بھی اشارہ کر رہے ہیں کہ مسافر صرف وہ نہیں ہوتا جو صرف مادی وجود یا مال و اسباب کے ساتھ سفر کر رہا ہو۔ بلکہ مسافر وہ بھی ہے جو روحانی سفر پہ ہو۔ یعنی ذوقؔ نے اس استعارہ میں کئی مفاہیم بیان کئے ہیں اس کا ایک مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انسان حتی المقدور اپنے آپ کو گناہوں سے آلودہ ہونے سے بچاتا رہے تاکہ جب وہ آخرت کا رختِ سفر باندھے تو گناہوں کے بوجھ سے اُسے جھکنا نہ پڑے اور جب کوئی اس بوجھ کو اٹھانے کے قابل نہیں رہ جاتا تو اُس مسافر کی دلی کیفیت کا کیا حال ہوگا اُس کا اندازہ تو ہر دردمند لگا ہی سکتا ہے، لیکن اس مرحلہ پہ مسافر کے دل سے نکلنے والی آہ کا بیان

اس طرح بھی ہو سکتا ہے۔

دل سے نکل کے آہ تلاشِ اثر میں ہے
منزل کی جستجو ہے مسافر سفر میں ہے

مسافر کی یہ جستجو جب کارگر ہو جاتی ہے یعنی وہ اپنی منزلِ مقصود کو پا لیتا ہے تو ایسے میں اس مسافر کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہیں رہتا لیکن اقبال جیسا عظیم شاعر بھی اس مقام کو منزل ماننے سے انکار کر دیتا ہے اور منزل پہ پہنچ کر بھی منزل کو یوں مخاطب کر بیٹھتا ہے

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر

لیکن ناصر کاظمی انتظار کے اس سفر میں اپنے آپ کو زحمتِ سفر سے بچائے رکھنے کے لئے یادوں کی چادر اوڑھ لینے کو ترجیح دیتے ہیں اور ان کے اس سفر میں خیالِ یار کی چادر کلیدی رول ادا کرتی نظر آتی ہے جو وطن سے دور بھی مسافر کے لئے کسی سایہ دار شجر سے کم نہیں ہے شاید اسی لیے وہ کہتے ہیں۔

یوں کس طرح کٹے گا کڑی دھوپ کا سفر
سر پر خیالِ یار کی چادر ہی لے چلیں

لیکن اس خیالی سفر کی کہیں منزل ہے اور نہ ہی اسے کسی لمحہ قرار آ سکتا ہے کیونکہ سفر نام ہے "زندگی کے متحرک رہنے کا" اور جس وقت تک زندگی متحرک رہے گی یا جب تک یہ سانسوں کا سفر جاری ہے اس وقت تک لفظ "سفر" سے کسی کو بھی فرار حاصل نہیں ہو سکتا اور پھر یہ انسان کی سوچ اسی محور کے گرد گھوم پھر کر لوٹ جاتی ہے کہ "زندگی کا یہ سفر" کبھی نہ ختم ہونے والا سفر ہے۔

طوفان کے متاثرین کی باز آبادکاری میں مدد کیجئے
چیف منسٹرس ریلیف فنڈ میں عطیات دیجئے

رشید الدین (تبصرہ)

مدّوجزر (افسانوں اور انشائیوں کا مجموعہ)

مصنف: ثریا صولت حسین

ہر چند تقسیم ہند کے بعد اردو ہندوستان میں بہت سے مسائل سے دوچار ہے لیکن ایک خوش آئند بات یہ ہے کہ اس میں تصنیف و تالیف کا کام مسلسل جاری ہے۔ حال ہی میں لاہور میں ہندوستانی کتابوں کی نمائش منعقد ہوئی تھی اس میں اردو کی بھی خاصی تعداد موجود تھی اور اہل پاکستان کو تعجب ہوا تھا کہ ہندوستان میں اب بھی اردو کتابیں چھپ رہی ہیں۔ یہی حال اردو رسائل کا بھی ہے ہندوستان کا دامن تقسیم ہند کے بعد کبھی اردو رسائل سے خالی نہیں رہا۔ اردو رسائل نکلتے اور بند ہوتے رہتے ہیں۔ یہ سلسلہ جاری ہے لیکن تعطل نہیں پایا۔ اب یہی دیکھئے کہ پانچ سال سے زیادہ عرصہ ہوگیا ہے کہ حیدرآباد سے رسالہ "شاداب" نکل رہا ہے اس کی باقاعدہ اشاعت کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ماہنامہ آئندہ بھی اسی پابندی سے نکلتا رہے گا۔

میں یہاں اصل میں بات ایک نئی کتاب کی کرنے جارہا ہوں جس کا نام ہے "مدّوجزر" یہ ثریا صولت حسین کے افسانوں اور انشائیوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں ان کے ۱۵ افسانے اور ۵ انشائیے شامل ہیں۔ ایک افسانہ "مدّوجزر" کے عنوان پر ہی اس کتاب کا نام رکھا گیا ہے۔ اس طرح زیر نظر تصنیف میں ان کی کل ۲۰ تخلیقات شامل ہیں۔

ثریا صولت حسین کا سسرال ناگپور ہے جبکہ میکہ حیدرآباد۔ ذرا اور دور جائیے تو ان کا سلسلہ لکھنؤ سے جا ملتا ہے وہ امیر مینائی کی پڑنواسی ہیں جن کا شمار اردو کے اساتذہ سخن میں

ہوتا ہے ان کے والد فصیح الزماں صدیقی پیشہ کے اعتبار سے وکیل تھے لکھنؤ میں کچھ عرصہ وکالت کی اور پھر ناگپور چلے آئے۔ ثریا صاحبہ کی پیدائش ناگپور ہی میں ہوئی پھر ان کے ایام طفولیت میں ہی ان کے والد حیدرآباد منتقل ہو گئے اور پھر یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ لیکن ثریا صولت حسین کی قسمت میں تو مستقلاً ناگپور لکھا ہوا تھا چنانچہ وہاں کی نامی گرامی علمی و ادبی شخصیت سید احمد حسین خطیب کے پوتے سید صولت حسین سے بیاہی گئیں جو ان دنوں ناگپور میں جج کے عہدہ پر فائز ہیں۔ اس طرح ثریا صدیقی ثریا صولت حسین ہو گئیں۔

ثریا صولت حسین کو شروع ہی سے علمی اور ثقافتی ماحول ملا۔ تعلیم اور مطالعہ کا شوق انھیں بچپن سے تھا۔ چنانچہ شادی کے بعد بھی یہ شوق کم نہیں ہوا اور انھوں نے ناگپور یونیورسٹی سے اُردو میں امتیاز کے ساتھ ایم اے کر کے اسے پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ وہ نثر بھی لکھتی ہیں اور شاعری بھی کرتی ہیں۔ نثر میں ان کا میدان افسانہ اور انشائیہ ہے زیر نظر کتاب ان کے افسانوں اور انشائیوں کا مجموعہ ہے جسے مہاراشٹرا اُردو اکیڈیمی کا ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔

" مد و جزر " میں ان کے جملہ ۱۵ افسانے شامل ہیں۔ ان افسانوں کے علاوہ اس کتاب میں ان کے ۵ انشائیے بھی شامل ہیں۔ بہتر ہوتا کہ ثریا صاحبہ افسانوں کا مجموعہ الگ شائع کرتیں اور انشائیوں کا الگ۔ ایک علاحدہ کتاب کے لئے ۱۵ افسانے کافی تھے البتہ انشائیوں میں اور پانچ سات کا اضافہ کر کے انھیں الگ سے کتابی صورت میں آسانی سے شائع کیا جا سکتا تھا اس طرح الگ سے ان کی ایک انشائیہ نگار کے طور پر پہچان میں سہولت ہوتی۔

ثریا صولت حسین کے افسانے زیادہ تر گھریلو ماحول اور وہ بھی متوسط طبقہ کے اطراف گھومتے ہیں۔ چونکہ وہ ایک عورت ہیں اس لئے ظاہر ہے عورت اور خصوصاً نچلے طبقہ کی عورت ان کا خاص موضوع ہے ان کے افسانوں میں بقول مشتاق الرحمٰن مشتاق۔ "اصلاح کا پہلو نمایاں ہوتا ہے" بعض افسانوں کے عنوانات ہی سے آپ کو پتہ چل جائے گا کہ یہ عورت کے گرد گھومتے ہیں جیسے بیگم، سوکھی ندی، کالا برقعہ، سونا بائی وغیرہ۔

ثریا صولت حسین کی زبان شگفتہ اور تحریر نوک پلک سے درست ہوتی ہے ۔ اگر وہ موضوع کے انتخاب میں مزید احتیاط برتیں اور زیادہ غور و فکر سے کام لیں تو وہ ایک اچھی افسانہ نگار بن سکتی ہیں۔ اردو افسانہ آج بہت آگے نکل چکا ہے نئے لکھنے والوں کو اس کا ساتھ دینا ہوگا ہم آئندہ ان سے مزید اچھے افسانوں کی توقع رکھتے ہیں انشائیوں میں بھی ان کے پاس موضوع کا تنوع نہیں ۔ وہ ہلکے پھلکے موضوعات کا انتخاب کرتی ہیں تاہم ایک انشائیہ "یور آنر" جو انھوں نے اپنے شوہر نامدار کے بارے میں لکھا ہے جو خیر سے جج ہیں' اچھا ہے

کتاب کا گیٹ اپ ، کاغذ، کتابت اور طباعت اچھی ہے اس لحاظ سے قیمت ۱۵ روپے کچھ زیادہ نہیں ۔ کتاب مجلد ہے اور ۱۴۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ مہاراشٹرا اردو اکیڈیمی کے مالی تعاون سے شائع ہوئی ہے کتاب میں مصنفہ کی ایک بڑی سی تصویر بھی ہے جس سے شائستگی جھلکتی ہے ۔اردو والوں کو اس کتاب کو زیادہ سے زیادہ خرید کر یا کم از کم پڑھ کر مصنفہ کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیئے جو ایک گھریلو خاتون کی ذمہ داریاں نبھاتے ہوئے محض اپنے ذوق کی تسکین کے لئے لکھ رہی ہیں۔

کتاب حسب ذیل پتہ سے حاصل کی جا سکتی ہے بنگلہ نمبر ۳۲/۲ ۔ سیول لائنس ۔ ناگپور ۔ ۱

عزیز قیسی (بمبئی)

ایک نظم

غم گرچہ ہیں بے شمار سہنے کیلئے
دریا بھی ہیں صد ہزار بہنے کیلئے
اک پل کی شکست خواب کافی ہے مگر
عالم بیابان اداس رہنے کے لئے
بے صدمہ کا منہ تک رہے ہیں پیاسے

صحرا صحرا بلک رہے ہیں پیاسے
دریا دریا چھلک رہا ہے پانی
ساحل ساحل سسک رہے ہیں پیاسے
چپ چاپ رہ غم سے گزرنے والو
ہر جبر پہ صبر اختیار کرنے والو
ایک پل سہی۔ کانپ جائے دست قاتل
چیخو سسک سسک کے مرنے والو

جی۔ڈی۔چندن

اردو صحافت آزادی کے بعد

اُردو صحافت کے سفر کی کہانی کانٹے کو پار کرنے کی کہانی ہے۔ ابھی یہ پیدا بھی نہیں ہوئی تھی کہ ہندوستان میں اس کے خاندان کے بڑے ارکان یعنی انگریزی جریدوں کو سنسر شپ۔ ڈاک کی سہولتوں سے محرومی ملک سے اخراج اور ہتک عزت کے قانون کی سزائیں جھیلنا پڑیں۔ پھر ۱۸۲۲ء میں اس کی پیدائش کے ایک ہی سال بعد ۱۸۲۳ء میں حکومت نے ایک آرڈیننس جاری کیا جس کے تحت لائیسنس حاصل کیے بغیر کوئی کتاب یا اخبار شائع کرنا یا چھاپہ خانہ لگانا منع کر دیا گیا۔ ۱۸۲۲ء میں مدراس پریزیڈنسی کے گورنر ٹامس منرو نے کہا تھا کہ "ہم نے اپنی سلطنت کی بنیادیں جن اصولوں پر استوار کی ہیں ان کی رو سے رعایا کو اخباروں کی آزادی نہ تو کبھی دی گئی اور نہ کبھی دی جائے گی۔"

اس کے بعد ۱۸۲۳ء سے ۱۹۳۵ء تک برطانوی حکومت نے ایک درجن سے زیادہ ایسے آرڈیننس اور قوانین نافذ کیے جن کا مقصد ملک کے صحافیوں کے قلم کو پابند کرنا اور ان کے اخبارات پر نگرانی اور محاسبہ کرنا تھا اگر فرنگی حکومت کا بس چلتا تو وہ ہندوستان میں دیسی صحافت کی قوت اور ہستی کبھی پنپنے ہی نہ دیتی۔ لیکن یہ ہمارے حریت پرست اور جانباز صحافیوں کی باطنی ہمت اور طاقت تھی کہ جان ومال کے نقصانات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے انہوں نے سوا سو سال تک اس خارزار میں مسلسل آبلہ پائی کی اور ہندوستان کی آزادی کی تحریک

کو کامیاب بنایا۔ اُردو صحافت کے اس قافلے میں ہر فرقہ کے صحافی تھے۔

اس اشتراکِ عمل کی بدولت اگست ۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہوا۔ لیکن یہ آزادی اپنے ساتھ ملک کی تقسیم بھی لائی جس نے دوسری چیزوں کی طرح اُردو صحافت کو بھی دو حصوں میں بانٹ دیا۔ ایک اندازے کے مطابق اُس وقت ہندوستان میں اُردو کے ۵۴۸ اخبار تھے جن میں تقریباً چالیس اُس حصے سے نکلتے تھے جو پاکستان میں شامل ہوا۔ تقسیم کے بعد دہلی، لکھنؤ، حیدرآباد، بمبئی، پٹنہ اور کلکتہ جیسے اُردو مرکزوں سے کئی صحافی پاکستان چلے گئے۔ اور پاکستان کے کچھ ممتاز اخباروں کے ناشرین ہندوستان آگئے۔ ان میں سے پرتاپ، ملاپ، ویر بھارت، پارس اور بیسویں صدی شامل تھے۔ ان میں سے پرتاپ، ملاپ نے دہلی کے علاوہ جالندھر سے بھی اپنے ایڈیشن جاری کیے جو ہندوستان کی اُردو صحافت میں ایک نئی چیز تھی۔

لیکن ہندوستان کی اُردو صحافت کے لئے یہ ایک نازک مرحلہ تھا کیونکہ تقسیم سے تعداد کے علاوہ اس کا حوصلہ بھی متاثر ہوا تھا۔ اُردو تقسیم کی سیاست کی مخالفت یا موافقت میں بہت سرگرم رہی تھی اور اس کی صفوں میں تقسیم سے قبل اور اس کے فوراً بعد ہونے والے ہولناک فسادات کے مختلف پہلوؤں پر بحث و تکرار ہوتی رہی۔

نئی مرکزی حکومت نے اختیارات سنبھالتے ہی ۱۹۴۸ء میں صحافتی قوانین کا جائزہ لینے اور آئین ساز اسمبلی کے وضع کردہ بنیادی حقوق کی روشنی میں ان کی جانچ کرنے کے لیے ایک تحقیقاتی کمیٹی قائم کی جس کی سفارش پر برطانوی راج کے متعدد سخت گیر قوانین منسوخ کر دیئے گئے۔ ۱۹۴۸ء اور ۱۹۴۹ء میں پنجاب، مغربی بنگال، اتر پردیش، آندھرا پردیش، بہار اور جموں و کشمیر سے اُردو کے تقریباً ایک درجن نئے روزنامے شروع ہوئے۔

جنوری ۱۹۵۰ء میں جمہوریہ ہند کا نیا آئین نافذ ہوا جس میں نئے ہندوستان کے لئے سیکولر مسلک اختیار کیا گیا اور یہ اعلان کیا گیا کہ ہر شہری کے لئے خیال، اظہار، عقیدے، مذہب اور عبادت کی آزادی ہوگی۔ اُردو ملک کی چودہ بڑی زبانوں کی فہرست

"مقالہ"

میں شامل ہوئی۔ اخباروں کی تعداد میں معتد بہ اضافہ ہوا۔ حکومت ہند کے پریس انفارمیشن بیورو کے گائیڈ مطبوعہ جنوری ۱۹۵۱ء کے مطابق ۱۹۵۰ء کے اختتام پر ہندوستان کے اردو اخباروں کی مجموعی تعداد ۶۴۶ تھی جن میں ۱۲۶ روزنامے، ۲۸۴ ہفت روزہ، ۱۸۱ ماہنامے اور ۵۵ دیگر جرائد تھے اردو اخبارات و جرائد کی تعداد ہندی (۱۰۴۸) اور انگریزی (۹۱۱) کے بعد تیسرے نمبر پر تھی۔

ملک کی صحافت کا جامع جائزہ لینے اور اس کے حالات کار کی اصلاح اور بہتری پر رپورٹ تیار کرنے کے لئے ستمبر ۱۹۵۲ء میں پہلا پریس کمیشن قائم ہوا۔ اس کمیشن نے محسوس کیا کہ ملکی صحافت کے بارے میں کوئی بھی تحقیق اور تشخیص کرنے کے لئے اولین ضرورت یہ ہے کہ اس کے بارے میں قابل اعتماد اعداد و شمار اور ان سے متعلقہ جملہ کوائف حاصل ہوں۔ چنانچہ اس کی سفارشات پر سب سے پہلے پریس رجسٹرار کا نیا دفتر قائم کیا گیا۔

اس دفتر کی پورے سال کی تحقیق کی پہلی رپورٹ ۱۹۵۷ء میں شائع ہوئی جو خود کمیشن کے مطابق نئے ہندوستان کے اخباروں کی بنیادی اطلاعات کے متعلق "پہلی مکمل اور مصدقہ" رپورٹ تھی۔ اس بااختیار کمیشن کے اس نظریئے کے پیش نظر یہ عین مناسب ہے کہ ملک کی صحافت کی ترقی کا جائزہ لینے کے لئے ۱۹۵۷ء کو بنیادی سال تصور کیا جائے۔

اس رپورٹ کے مطابق اُس وقت ملک کے اُردو اخباروں کی کُل تعداد ۵۱۳ تھی۔ ان میں ۵۹ روزنامے، بارہ سہ روزہ، دو سو ہفت روزہ، ۴۲ پندرہ روزہ، ۱۸۹ ماہنامے، چھ سہ ماہی اور پانچ دیگر تھے۔ ان کا مجموعی سرکولیشن (اشاعت) ساڑھے ۸۴ ہزار تھا جو ۲۹۲ اخباروں کی طرف سے مہیا کردہ معلومات پر مرتب کیا گیا تھا۔ باقی ۲۲۱ نے متعلقہ معلومات فراہم نہیں کی تھیں۔

اس کے بعد اردو اخباروں کی تعداد اور اشاعت رو بہ اضافہ رہی ہیں۔ اس اضافے کی رفتار کا اندازہ مندرجہ ذیل گوشوارے سے کیا جا سکتا ہے جس میں پانچ پانچ سال کے وقفے کے اعداد دیئے گئے ہیں۔

سال	تعداد اخبارات	سرکولیشن (اشاعت)
۱۹۶۲ء	۶۹۲	۱۲ لاکھ ۵۵ ہزار
۱۹۶۷ء	۸۶۴	۱۳ لاکھ ۵۸ ہزار
۱۹۷۲ء	۹۲۹	۱۵ لاکھ ۴۴ ہزار
۱۹۷۷ء	۱۰۴۷	۱۵ لاکھ ۸۱ ہزار
۱۹۸۲ء	۱۳۳۰	۲۲ لاکھ ۶۹ ہزار

پریس رجسٹرار کی تازہ ترین سالانہ رپورٹ ۱۹۸۴ء کی ہے جس میں ۱۹۸۳ء کی معلومات درج ہیں۔ اس کے مطابق ملک میں اُردو کے کُل اخباروں کی تعداد ۱۳۷۸ اور سرکولیشن ۲۵ لاکھ ۳۶ ہزار ہے۔ ان اعداد وشمار کا ۱۹۵۷ء سے موازنہ سے پتہ چلتا ہے کہ اُردو اخباروں کی تعداد اور اشاعت دونوں میں تقریباً تین تین گنا اضافہ ہوا ہے۔

اس اضافے کا دوسرا اہم پہلو مختلف ریاستوں میں اُردو صحافت کی پیشرفت ہے مندرجہ ذیل گوشوارے میں اس پیشرفت کو ۱۹۵۷ء کے اعداد کے سیاق میں پیش کیا گیا ہے۔

ریاست	تعداد اخبارات ۱۹۵۷ء	تعداد اخبارات ۱۹۸۳ء	سرکولیشن (اشاعت) ۱۹۵۷ء	سرکولیشن (اشاعت) ۱۹۸۳ء
آندھرا پردیش	۲۷	۲۶۶	۱۶۲۹۲	۳۵۳۰۰۰
بہار	۱۳	۹۱	۱۲۷۱۳	۳۱۵۰۰۰
کرناٹک	۱۱	۴۷	۱۸۷۴۵	۱۶۷۰۰۰
مدھیہ پردیش	۱۱	۱۲	۲۰۹۱	۲۱۰۰۰
مہاراشٹرا	۳۷	۱۳۴	۳۵۷۹۷	۴۲۰۰۰
تمل ناڈو	۶	۹	اعداد دستیاب نہیں	۱۵۰۰۰
اترپردیش	۱۳۱	۲۶۴	۴۲۰۰۰	۲۷۲۰۰۰

مغربی بنگال	۱۴	۵۶	تعداد دستیاب نہیں	۲۱۱۰۰۰
دھلی	۱۳۲	۲۲۹	۴۲۳۰۰۰	۵۶۹۰۰۰
پنجاب	۳۰	۱۰۴	۹۷۷۰۸	۱۷۸۰۰۰
ہریانہ	*	۱۹	*	۸۰۰۰
ہماچل پردیش	*	۲	*	دستیاب نہیں
چنڈی گڑھ	*	۴	*	۱۱۰۰۰

یکم نومبر ۱۹۶۶ء کو پنجاب کی تنظیم نو کی بنا پر ہریانہ، ہماچل اور چنڈی گڑھ کے علاقے الگ اکائیوں کے طور پر وجود میں آئے۔ ان کے ۱۹۵۷ء کے اعداد و شمار دستیاب نہیں ہیں۔

راجستھان اور اڑیسہ میں ۱۹۵۷ء میں اردو کے کوئی اخبار نہیں تھے لیکن ۱۹۸۴ء کی رپورٹ کے مطابق وہاں بھی اردو کے اخبار ہیں۔ راجستھان میں اردو کے دس اخبار ہیں اور ان کا مجموعی سرکولیشن بارہ ہزار ہے۔ اڑیسہ میں اردو کا ایک اخبار ہے اور اس کا سرکولیشن ایک ہزار ہے۔

پریس رجسٹرار کو ریاست جموں کشمیر کے اخباروں سے متعلق اعداد و شمار ۱۹۶۵ء سے حاصل ہونا شروع ہوئے۔ ۱۹۶۵ء میں وہاں اردو کے کل ۴۲ اخبار تھے جن کا مجموعی سرکولیشن ۴۲ ہزار تھا۔ ۱۹۸۳ء میں وہاں اردو کے کل ۱۲۸ اخبار تھے جن کا مجموعی سرکولیشن ایک لاکھ دس ہزار تھا۔

مندرجہ بالا کوائف کے تجزیہ سے ظاہر ہے کہ ۱۹۵۷ء سے ۱۹۸۳ء تک آتے آتے یوں تو تقریباً ہر ریاست کے اردو اخباروں کی تعداد اور اشاعت میں اضافہ ہوا لیکن چند ریاستوں میں اضافہ نہایت خوش کن رہا ہے مثلاً آندھرا پردیش کے اخباروں کی تعداد میں تقریباً دس گنا اور سرکولیشن میں ۱۲ گنا سے زیادہ، بہار کے اخباروں کی تعداد میں سات گنا اور سرکولیشن میں ۲۴ گنا سے زیادہ، کرناٹک کے اخباروں کے میزان میں چار گنا سے زیادہ اور سرکولیشن میں تقریباً نو گنا۔ مہاراشٹرا کے اخباروں کی تعداد میں ساڑھے تین گنا اور سرکولیشن میں تقریباً پانچ گنا۔

اتر پردیش کے اخباروں کی تعداد میں دوگنا اور سرکولیشن میں تین گنا اضافہ ہوا۔ اسی طرح جموں و کشمیر میں ۱۹۶۵ء کی بہ نسبت ۱۹۸۳ء میں اُردو اخباروں کی تعداد میں تین گنا اور سرکولیشن میں ڈھائی گنا سے زیادہ اضافہ ہوا ہے۔ اس ریاست کا اُردو پریس اپنی تعداد اور اشاعت کے اعتبار سے ریاست کی دوسری تمام زبانوں کی صحافت پر غالب ہے۔

اس ہمہ گیر ترقی کے باوجود اُردو صحافت کو اقتصادی اور سماجی طور پر ابھی وہ مرتبہ نہیں ملا جس کی یہ مستحق ہے۔ اسے قارئین اور مشتہرین دونوں کی کمی کا سامنا رہتا ہے۔ اس کی وجہ اگر ایک طرف اُردو زبان کی تعلیم کی سہولتوں میں کمی کی وجہ سے پیدا ہونے والی اُردو کے نئے قارئین کی قلت ہے تو دوسری طرف اُردو داں طبقے کے ذوق خرید کا حجاب بھی ہے۔

اُردو اخباروں کے سرکولیشن کا ۲۵ لاکھ کے آس پاس رہنا کوئی اطمینان بخش صورت نہیں۔ ظاہر ہے کہ دیگر تدبیروں کے علاوہ اُردو اخباروں کی تقسیم، فروخت اور قبولیت بڑھانے کے لئے ان کی ظاہری اور باطنی کشش کو بڑھانے کی بھی ضرورت ہے ۱۹۸۳ء میں صرف ۱۷۵ اُردو اخباروں نے اپنے متعلق معلومات فراہم کی تھیں جن کے مطابق اُردو کے بیش تر اخبار چھوٹے زمرے میں ہیں یعنی ان کی اشاعت ۱۵ ہزار سے کم ہے۔ ۸۳ء ۱۹ کے اعداد و شمار کے مطابق ۱۱۴۸ اخباروں میں سے صرف دو اخبار بڑے زمرے میں ہیں یعنی ان کی اشاعت ۵۰ ہزار سے زیادہ ہے اور بیس اخبار متوسط زمرے میں ہیں یعنی ان کی اشاعت ۱۵ ہزار اور ۵۰ ہزار کے درمیان _ ہے۔ ان کے علاوہ ۸۰۷ اخباروں نے اپنے سرکولیشن کے اعداد و شمار مہیا نہیں کئے لیکن ایسے اخبار ہمیشہ چھوٹے اخبار ہی ہوتے ہیں اور ان کی اشاعت اکثر و بیشتر دو ہزار سے بھی کم ہوتی ہے۔

دس پندرہ سال پہلے تک شمالی ہند کے چند روزناموں کا سرکولیشن پورے ملک کی صحافت پر چھایا ہوا تھا لیکن اب جنوبی، مغربی اور مشرقی ہند کے بعض اُردو روزنامے جن کا موجودہ عروج آزادی کی دین ہے سرکولیشن کے متوسط زمرے میں پہنچ چکے ہیں۔ یہ اخبار

فوٹو آف سیٹ پر چھپتے ہیں اور ان میں سے اکثر کے پاس اپنے چھاپے خانے ہیں اور ہر اخبار کم از کم کسی قومی نیوز ایجنسی کی سروس کا خریدار ہے۔ اس کے علاوہ ان کے اپنے نامہ نگار، فوٹو گرافر، اداریہ نگار اور کالم نگار ہیں۔ کئی روزنامے ایک ساتھ مختلف ریاستوں کے تین تین شہروں سے چھپتے ہیں۔ کئی روزنامے اب غیر ممالک بالخصوص خلیجی ممالک میں برآمد ہوتے ہیں اور اردو کے کئی رسالے بالخصوص بعض فلمی رسالے غیر ممالک میں اچھی مارکٹ بنا چکے ہیں۔ اپنی خامیوں کے باوجود، اردو صحافت آج بھی ملک کی سولہ بڑی زبانوں کے نقشے میں چوتھے نمبر پر ہے اور اردو اخبارات و رسالے ملک کی ۱۴ چودہ ریاستوں اور دو یونین علاقوں سے شائع ہوتے ہیں۔ اسے ملک کی ان پانچ زبانوں میں شامل ہونے کا شرف حاصل ہے جن کے اخباروں کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ ہے۔ اپنے روزناموں اور ہفت روزوں کے اعتبار سے یہ پورے ملک کے پریس میں ہندی کے بعد دوسرے نمبر پر ہے۔ یہ ملک کی ان ممتاز زبانوں میں بھی شامل ہے جن کے پاس ایک سو سے زیادہ روزنامے ہیں۔

چنانچہ اردو صحافت آج عوامی معاملات میں ایک خاص اثر و رسوخ رکھتی ہے اور ملک کی سب سے بڑی اقلیت کے خیالات اور مسائل کی ترجمان تصور کی جاتی ہے اور سرکاری اور نجی حلقے دونوں اس کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

مسئلہ صرف یہی رہتا ہے کہ اردو صحافت نے مجموعی طور پر جدید تقاضوں اور ضرورتوں کے مطابق اپنی تکنیکی اور کاروباری تنظیم نہیں کی۔ اس کا سفر ابھی جاری ہے۔ دراصل کسی بھی باصلاحیت اور پیامبر صحافت کا سفر کبھی ختم نہیں ہوتا۔ اردو صحافت کا نیا سفر اس کی تنظیم نو میں ہے۔ اس کے لئے یہ ضروری ہوگا کہ اس کے نظم و عمل میں قدامت پسندی، جذباتیت اور محدودیت کے سائے داخل نہ ہوں بلکہ اس کے لئے قومی آئین کے رہبرانہ اصولوں سے روشنی حاصل کی جائے۔

محمد عبدالوحید خان ایم اے۔ ایل ایل بی (عثمانیہ)
ریسرچ اسکالر گلبرگہ یونیورسٹی۔

حرفِ تابندہ

انسانی حیات کا یہ خاصہ ہے کہ وہ مقتضائے فطرت کے عین مطابق ناروا اور نامناسب سلوک اور رویہ کے خلاف اُٹھ کھڑا ہوتا ہے تھوڑی سی مخالفت، اعتراض، تنقید اور غیر مناسب بات کے لئے بدلہ اور مقابلہ اس کے پیش نظر ہوتا ہے اسی امر کو ماہرین نفسیات اور انسانی فطرت کا گہرا اور عمیق مطالعہ کرنے والوں نے بدلہ لینے، مدافعت کرنے اور بدلہ کی آگ سے ملقب کیا ہے اس قسم کا رویۂ اظہار، ردعمل دراصل وقتی، موقتی اور جذباتی ہوتا ہے

انسان کا اپنا انفرادی ذہنی ماحول اور اس میں صبر و تحمل اور برداشت کی قوت اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ وہ کس حد تک مقابلہ اور حالات کا سامنا کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے عام طور پر اس حقیقت کا مشاہدہ کیا گیا ہے انسان اپنی تعریف و توصیف، مداح سرائی، ہمت افزائی اور مثبت خیالات کے اظہار سے مسرت و انبساط کے دریا میں غرق ہو جاتا ہے اگر اس کی سعی و کاوش، کارناموں، کردار و رویہ کو سراہا جائے تو وہ خوشی سے جھوم اٹھتا ہے، تنقید، ہمت شکنی، روک ٹوک اور برملا اظہار حال پر وہ بے حد بیدل خاطر و ملول ہو جاتا ہے اس فانی دنیا میں ہر کس و ناکس اس تمنا میں مبتلا ہے کہ اس کے ہر عمل کی تعریف و توصیف کی جائیگی مگر علم سماجیات کے ماہرین کے نقاط نظر سے انسان کا اصلی جوہر، قابلیت اور اس میں ودیعت شدہ صلاحیتیں کڑی تنقیدوں کے سایہ میں پروان چڑھتی ہیں۔

تمام مذاہب کی اخلاقی تعلیمات کا لب لباب یہ ہے کہ ناشائستہ سلوک اور مخالفانہ

نوٹو آف سیٹ پر چھپتے ہیں اور ان میں سے اکثر کے پاس اپنے چھاپے خانے ہیں اور ہر اخبار کم از کم کسی تو می نیوز ایجنسی کی سروس کا خریدار ہے۔ اس کے علاوہ ان کے اپنے نامہ نگار، فوٹو گرافر، اداریہ نگار اور کالم نگار ہیں۔ کئی روزنامے ایک ساتھ مختلف ریاستوں کے تین تین شہروں سے چھپتے ہیں۔ کئی روزنامے اب غیر ممالک بالخصوص خلیجی ممالک میں برآمد ہوتے ہیں اور اُردو کے کئی رسالے بالخصوص بعض فلمی رسالے غیر ممالک میں اچھی مارکٹ بنا چکے ہیں۔ اپنی خامیوں کے باوجود، اُردو صحافت آج بھی ملک کی سولہ بڑی زبانوں کے نقشے میں چوتھے نمبر پر ہے اور اُردو اخبار اور رسالے ملک کی ۱۴ چودہ ریاستوں اور دو یونین علاقوں سے شائع ہوتے ہیں۔ اسے ملک کی ان پانچ زبانوں میں شامل ہونے کا شرف حاصل ہے جن کے اخباروں کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ ہے۔ اپنے روز ناموں اور ہفت روزوں کے اعتبار سے یہ پورے ملک کے پریس میں ہندی کے بعد دوسرے نمبر پر ہے۔ یہ ملک کی ان ممتاز زبانوں میں بھی شامل ہے جن کے پاس ایک سو سے زیادہ روزنامے ہیں۔

چنانچہ اُردو صحافت آج عوامی معاملات میں ایک خاص اثر و رسوخ رکھتی ہے اور ملک کی سب سے بڑی اقلیت کے خیالات اور مسائل کی ترجمان تصور کی جاتی ہے اور سرکاری اور نجی حلقے دونوں اس کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

مسئلہ صرف یہی رہتا ہے کہ اُردو صحافت نے مجموعی طور پر جدید تقاضوں اور ضرورتوں کے مطابق اپنی ٹکنیکی اور کاروباری تنظیم نہیں کی۔ اس کا سفر ابھی جاری ہے دراصل کسی بھی باصلاحیت اور پیرا مند صحافت کا سفر کبھی ختم نہیں ہوتا۔ اُردو صحافت کا نیا سفر اس کی تنظیم نو میں ہے اس کے لئے یہ ضروری ہوگا کہ اس کے نظم و عمل میں قدامت پسندی، جذباتیت اور محدودیت کے سائے داخل نہ ہوں بلکہ اس کے لئے قومی آئین کے رہبرانہ اصولوں سے روشنی حاصل کی جائے ▲

محمد عبدالوحید خاں ایم لے۔ ایل ایل بی (عثمانیہ)
ریسرچ اسکالر گلبرگہ یونیورسٹی۔

حرفِ تابندہ

انسانی حیات کا یہ خاصہ ہے کہ وہ مقتضائے فطرت کے عین مطابق ناروا اور نامناسب سلوک اور رویہ کے خلاف اٹھ کھڑا ہوتا ہے تھوڑی سی مخالفت، اعتراض، تنقید اور غیر مناسب بات کے لئے بدلہ اور مقابلہ اُس کے پیش نظر ہوتا ہے اسی امر کو ماہرینِ نفسیات اور انسانی فطرت کا گہرا اور عمیق مطالعہ کرنے والوں نے بدلہ لینے، مدافعت کرنے اور بدلہ کی آگ سے ملقب کیا ہے اس قسم کا رویۂ اظہار، ردعمل دراصل وقتی، موقتی اور جذباتی ہوتا ہے

انسان کا اپنا انفرادی و ذہنی ماحول اور اس میں صبر و تحمل اور برداشت کی قوت اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ وہ کس حد تک مقابلہ اور حالات کا سامنا کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے عام طور پر اس حقیقت کا مشاہدہ کیا گیا ہے انسان اپنی تعریف و توصیف، مدح سرائی، ہمت افزائی اور مثبت خیالات کے اظہار سے مسرت و انبساط کے دریا میں غرق ہو جاتا ہے اگر اُس کی سعی و کاوش، کارناموں، کردار و رویہ کو سراہا جائے تو وہ خوشی سے جھوم اٹھتا ہے، تنقید، ہمت شکنی، روک ٹوک اور برملا اظہارِ حال پر وہ بے حد بیحد خاطر و ملول ہو جاتا ہے اس فانی دنیا میں ہر کس و ناکس اس تمنا میں مبتلا ہے کہ اُس کے ہر عمل کی تعریف و توصیف کی جائےگی مگر علم سماجیات کے ماہرین کے نقاط نظر سے انسان کا اصلی جوہر، قابلیت اور اس میں ودیعت شدہ صلاحیتیں کڑی تنقیدوں کے سایہ میں پروان چڑھتی ہیں۔

تمام مذاہب کی اخلاقی تعلیمات کا لب لباب یہ ہے کہ ناشائستہ سلوک اور مخالفانہ

عمل کو برداشت کر لیا جائے، کھلے دل و ذہن سے اور تنگ نظری سے ہٹ کے صبر و سکون کے دامن کو تھام کر برے عمل کے مقابلے میں اچھے عمل اور احسن طریقے سے مخالفین کو موید اور ساتھی بنا لیا جائے۔ اگر کوئی بدخواہی، بُرائی اور ایذا رسانی پر آمادہ ہو جائے تو اسی برائی کے بدلے میں اچھائی کرنے سے شدید سے شدید دشمن بھی دوست بن جاتا ہے عفو و درگذر کی تعلیم تمام مذاہب اور اخلاقیات میں موجود ہے۔ اس دنیائے رنگ و بو میں اپنی انا کی تسکین، اپنی بات کو منوانے کا انداز اور ادا اور ہٹ دھرمی بہت خطرناک گل کھلاتی ہے۔ برائی کا بدلہ برائی وقتی ازالہ اور تشفی اور اطمینان کا باعث ہو سکتا ہو تو ہو مگر اس سے بہتر یہ ہے کہ معافی اور درگذر سے کام لے کر بات کو ٹال دیا جائے۔ ورنہ ہمارے اس انسانی معاشرہ میں بدلہ در بدلہ کا چکر چل پڑے گا۔ بعض اعصابی مریض اور انتہا پسند افراد بلا رو رعایت موقع اور حالات کے نشیب و فراز کا اندازہ کئے بغیر بلا تامل اور مصلحتوں کی پروا کئے بغیر آسانی سے تنقید یں کرتے ہیں، اعتراضات کی دنیا بسا دیتے ہیں انہیں اس کا قطعی اندازہ نہیں ہوتا کہ دیگر اشخاص پر کیسے اثرات مرتب ہوں گے اور لوگ کیسے چراغ پا ہو جائیں گے۔ بہتر صورت یہ ہے کہ صبر و تحمل سے دوسروں کے نقاط نظر کو کہا جائے۔ مناسب یہ ہے کہ بُرائی کا بدلہ بُرائی نہ ہو ایک قوت و طاقت ہے جو ماورائی ہے انسانی حیات کے ہر لمحے اور لمحے کو گرفت کر رہی ہے وہ اس کی طالب ہے کہ کسی برائی کو معاف کر دیا جائے تو اس کا ثواب اس کا ذمہ ہے کوئی اگر برائی کرے اور بدخواہ بن جائے تو ہمیں اس سے نیکی کرنی چاہیئے اور عفو و درگذر سے حالات کو سلجھانا چاہیئے۔ بدلہ لینے سے معاف کر دینا زیادہ بہتر ہے۔

-۲-

انسان کی کامیابی کا واحد راز اس کی مستقل مزاجی اور دلجمعی ہے کسی عاقل اور دانا کا قول ہے کہ مستقل مزاجی کی دولت بڑی دولت ہے انسان ایسے عمل پر فوراً مستعد، آمادہ اور کمربستہ ہو جاتا ہے جو منفعت بخش، سود مند اور فائدہ رساں ہو مگر مرور زمانہ، استقلال اور

تساہل، کام چوری اور طبیعت کی اکتاہٹ کے باعث وہ اس کام کی تکمیل سے قاصر رہتا ہے اس دنیا میں ہر کس و ناکس متنوع، جداگانہ صلاحیتوں سے متصف ہو کر پیدا ہوتا ہے انسانوں کی جبلتیں مختلف ہوتی ہیں انسان اپنے ہی مقتضائے طبیعت کے مطابق کام کرتے ہیں۔ مگر مستقل مزاجی کے فقدان اور سہل انگاری کے باعث مقصد، مطمح نظر اور منزل سے دور ہو جاتے ہیں اگر انسانی حیات ان لوازمات کا شکار ہو جائے تو کام ٹھپ ہو جاتے ہیں اور کام کی مسدودی انحطاط اور زوال کی پہلی منزل ہے کسی کام کے آغاز میں شد و مد، زور و شور اس کی تشبیہ مناسب تو ہوا کرتی ہے مگر کام اور اس کی تکمیل میں ہمہ تن کوشش انہماک ہونا چاہیئے ہر لمحہ اور ہر لحظہ انسان کو اپنے مفوضہ اور تفویض کردہ کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے کوشاں رہنا چاہیئے۔

کسی ذی فہم نے کہا ہے کہ صبر و سکون اور مستقل مزاجی اور اپنے مقصد کے حصول کی دھن پہاڑوں کو کھود دیتی ہے ملک روم ایک دن میں تعمیر نہیں کیا گیا ہے" یہ اس حقیقت کا مصداق ہے کہ عرق ریزی، مشقت، خون پسینہ ایک کرنا دراصل میدان جیت لینے کے مترادف ہے اسی موقع پر انسانی نفسیات اس امر کو واشگاف کرتی ہے کہ انسانوں کو کسی کام کا بیڑا اٹھانے سے پہلے اپنے دم خم اور طاقت و قوت اور صلاحیت کا ادراک ہونا چاہیئے۔ بے دھڑک اور بغیر منصوبہ بندی کے کسی کام کا آغاز ناکامی سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔

مصائب اور آلام دقتیں، دشواریاں، مصیبتیں ہر کام میں پیش آتی ہیں مگر خوبصورتی اور توازن سے اس کا مقابلہ کیا جائے ناکامیوں میں حقیقی اسباب و علل کو تلاش کرنا چاہیئے۔ انسانوں کو اس بات پر اپنی توجہ کو مرکوز و مبذول کر دینا چاہیئے کہ وہ ہر کام کر سکتے ہیں کام کرنے سے کام آتا ہے اگر ابتدائی درجات اور شروعات کے مرحلہ پر یہ سمجھ لیا جائے کہ ہم سے یہ کام نہ ہوگا تو اس کا حتمی اور قطعی نتیجہ یہ برآمد ہوگا کہ اس کام کی تکمیل سے ہم قاصر رہیں گے۔ تند ہی، شادی مستقل مزاجی، بے تھکان، لگاتار کام کرنے سے انسان اپنی منزل مقصود کو پا لیتا

(سلسلہ صفحہ ۵۲ پر)

کے بھگت وتسل راؤ

نیو نلہ کنٹہ۔ حیدرآباد ۲۴

ہارمونس

سماج میں بعض اوقات ہم عجیب سماں دیکھ پاتے ہیں کوئی بچہ معقول عمر آنے کے بعد بھی کروٹیں لے پاتا ہے چل نہیں سکتا۔ بعض اوقات بالغ عمر آنے کے بعد بھی لڑکی یا لڑکے میں تبدیلیاں رونما ہو نہیں پاتیں۔ کسی کا بونا یا دیو ہیکل ہونا بھی ہمارے سماج میں روزمرہ کا مشاہدہ ہے موٹاپا یا نہایت ہی ناتواں دُبلا ہونا بھی چند افراد میں دیکھا گیا ہے یہ تمام کیفیتیں انسان میں غیر نالی غدود کے اخراجات میں کمی و بیشی کی وجہ سے ہے ان کیمیائی اشیاء کو جو پیچیدہ مرکبات پر مشتمل ہیں ہارمونس کہتے ہیں۔ انہیں انڈوکرینس بھی کہتے ہیں غیر نالی غدود کو ڈکٹ لس گلانڈس یا ہارمونل گلانڈس یا انڈوکرین گلانڈس کہتے ہیں۔ بچہ کا نمو ہونا رحم میں، تولد ہونا، ولادت کے بعد بڑھنا، بالغ ہونا، اعضاء کے افعال بحسن طور پر انجام دینا ان غیر نالی غدود کے اخراجات پر مبنی ہیں۔ اس میں محور ہٹتا آجائے تو زندگی دوبھر ہو جاتی ہے۔ مرض کی پہچان مشکل ہو جاتی ہے ہارمونل علاج بھی لابدی ہو پاتی ہے یہ احاطہ سائنس کافی ترقی کر چکا ہے اسے انڈوکرائنولوجی کہتے ہیں اور اس شعبہ کے ماہر کو انڈوکرنولوجسٹ کہتے ہیں۔ ہر بڑے دواخانہ میں اس شعبہ کا ماہر علاج معالجہ کے لئے مقرر کیا جاتا ہے اور مریض ان کے مفید مشوروں سے مستفید ہوتے رہتے ہیں۔

فقریٰ جانداروں میں غیر نالی غدود کے کئی اقسام ہیں۔ انسان بھی ایک فقریٰ نوع ہے اس کے جسم میں بھی پیٹیوٹری، تھیرائیڈ، آئی لٹ آف لنگر ہانس، اڈرینل، گوناڈس نامی ہارمونل گلانڈس (غیر نالی غدود) ہیں یہ غدود اخراجات راست خون میں داخل کردیتے ہیں اسی لئے انہیں

واسپ

پرسین کہتے ہیں۔ ان کے برخلاف اکثر [illegible] تا جگر ایک نالی کے ذریعہ غذائی نالی

مائع کا اخراج کرپاتا ہے۔

پیٹوٹری غدود انسان کے دماغ کے بطن [illegible] وسط میں پایا جاتا ہے یہ ایک غدود امرت

سر کے تین حصے ہیں ایک سامنے اور [illegible] اور وسطی حصہ۔ یہ تینوں حصے شگافوں

سند ہوتے ہیں جسم کے کئی افعال اس کے [illegible] ہیں اینٹی ریئر پیٹیوٹری سے کئی کیمیائی

ات خون میں داخل ہو جاتی ہیں۔ مثلاً [illegible] ہیں سے بچہ بڑھنا شروع کردیتا ہے پروٹین

تعاملات میں تیزی دیکھی جا سکتی ہے اگر اس کی [illegible] کمی ہو جائے تو انسان "بونا" رہ جاتا ہے

مقدار میں اضافہ ہو جائے تو دیو ہیکل ہو جاتا ہے سوچنے کی صلاحیت میں فرق آ جاتا ہے پیپہ

مانند پیٹ، سر ایک دم موٹا، ہاتھ پیر لانبے، لانبے جبڑے اور کھردری جلد سوماٹوٹراپن

اضافہ کی علامات ہیں۔ تھیروٹراپن کی وجہ سے تھیرائیڈ کے فعل میں تیزی پیدا ہوتی ہے نمو کے

اس کی ضرورت ہے اڈرینو کارٹیکوٹراپن سے اڈرینل کارٹکس متاثر ہو جاتا ہے

نکرموٹیلراپن انسولین کے اخراج کو قابو میں رکھا جاتا ہے گوناڈوٹراپن کی وجہ سے حمل میں

ارگی پیدا ہوتی ہے لیوٹینائزنگ ہارمونس کی وجہ سے تولیدی غدود کے کام میں مدد ملتی ہے۔

رولاکٹن کی وجہ سے ماں میں حمل کے دوران [illegible] غدود میں تبدیلیاں ہوتی ہیں وسطی

پٹوٹیٹری کے احاطہ سے انٹرمیڈین ہارمون خارج ہوتے ہیں جس سے جلد میں رنگ کی برقراری

در پرورش ہوتی ہے اسے کروماٹوٹراپک ہارمون بھی کہتے ہیں۔ پچھلے حصہ پیٹیوٹری سے

آکزی ٹاسین خارج ہوتا ہے۔ زچگی ہونے کے بعد بچہ کو ماں سے دودھ ملنے میں ہاتھ بٹاتا ہے

پستانوی غدود کو کام کرنے میں یہ مائع ہاتھ بٹاتی ہے۔ واسوپریسین سے جسم میں پانی کے

اخراج کو معتدل حالت میں رکھنے میں مدد ملتی ہے ورنہ ذیابطیس کی شکایت پیدا ہو جاتی ہے

انسان کے حلق کے آزو بازو میں ایک جوڑا تھیرائیڈ کے غدود واقع ہوتے ہیں۔ ان سے

تھیراکسن کا اخراج ہوتا ہے۔ غذا میں آیوڈین کی موزوں مقدار لینے سے اس کے فعل میں ہموارگی

کے بھگت وتسل راؤ

نیو نلہ کنٹہ ۔ حیدرآباد ۴۴

ہارمونس

سماج میں بعض اوقات ہم عجیب سماں دیکھ پاتے ہیں کوئی بچہ معقول عمر آنے کے بعد بھی کروٹیں لے پاتا ہے چل نہیں سکتا۔ بعض اوقات بالغ عمر آنے کے بعد بھی لڑکی یا لڑکے میں تبدیلیاں رونما ہو نہیں پاتیں۔ کسی کا بونا یا دیو ہیکل ہونا بھی ہمارے سماج میں روزمرہ کا مشاہدہ ہے موٹاپا یا نہایت ہی ناتواں دُبلا ہونا بھی چند افراد میں دیکھا گیا ہے یہ تمام کیفیتیں انسان میں غیرمانی غدود کے اخراجات میں کمی و بیشی کی وجہ سے ہے ان کیمیائی اشیاء کو جو پیچیدہ مرکبات پر مشتمل ہیں۔ ہارمونس کہتے ہیں۔ انہیں انڈوکرینس بھی کہتے ہیں غیرمانی غدود کو ڈکٹ لس گلانڈس یا ہارمونل گلانڈس یا انڈوکرین گلانڈس کہتے ہیں۔ بچہ کا نمو ہونا رحم میں، تولد ہونا، ولادت کے بعد بڑھنا، بالغ ہونا، اعضاء کے افعال بہ طور پر انجام دینا ان غیرمانی غدود کے اخراجات پر مبنی ہیں۔ اس میں ہموار بہاؤ نا آجائے تو زندگی دوبھر ہو جاتی ہے۔ مرض کی پہچان مشکل ہو جاتی ہے ہارمونل علاج بھی لابتی ہو پاتی ہے یہ احاطہ سائنس کافی ترقی کر چکا ہے اسے انڈوکرائنولوجی کہتے ہیں اور اس شعبہ کے ماہر کو انڈوکرنولوجسٹ کہتے ہیں۔ ہر بڑے دواخانہ میں اس شعبہ کا ماہر علاج معالجہ کے لئے مقرر کیا جاتا ہے اور مریض ان کے مفید مشوروں سے مستفید ہوتے رہتے ہیں۔

فقریہ جانداروں میں غیرمانی غدود کے کئی اقسام ہیں۔ انسان بھی ایک فقریہ نوع ہے اس کے جسم میں بھی پیچوٹری، تھیرائیڈ، آئس لٹ آف لنگرہاسن، اڈرینل، گوناڈس نامی ہارمونل گلانڈس (غیرمانی غدود) ہیں یہ غدود اخراجات راست خون میں داخل کر دیتے ہیں اسی لئے انہیں

داست
رسیں کہتے ہیں۔ ان کے برخلاف [illegible] جگر ایک نالی کے ذریعہ غذائی نالی

میں کا اخراج کرتا ہے۔

پیٹوٹری غدود انسان کے دماغ کے بطن [illegible] وسط میں پایا جاتا ہے یہ ایک غدود امرت
سر کے تین حصے ہیں ایک سامنے اور [illegible] اور وسطی حصہ۔ یہ تینوں حصے شگافوں
سند ہوتے ہیں جسم کے کئی افعال اس کے [illegible] ہیں اینٹی ریئر پیٹیوٹری سے کئی کیمیائی
ت خون میں داخل ہو جاتی ہیں۔ مثلاً [illegible] جن سے بچہ بڑھنا شروع کر دیتا ہے پروٹین
معاملات میں تیزی دیکھی جا سکتی ہے اگر اس [illegible] کمی ہو جائے تو انسان "بونا" رہ جاتا ہے
مقدار میں اضافہ ہو جائے تو دیو ہیکل ہو جاتا ہے سوچنے کی صلاحیت میں فرق آ جاتا ہے جیسے
مانند پیٹ، سر ایک دم موٹا، ہاتھ پیر لانبے، لانبے جبڑے اور کھردری جلد سوما ٹوٹراپن
اضافہ کی علامات ہیں۔ تھیروٹراپن کی وجہ سے تھیرائیڈ کے فعل میں تیزی پیدا ہوتی ہے نمو کے
اس کی ضرورت ہے اڈرینو کارٹیکوٹراپن سے ایڈرینل کارٹکس متاثر ہو جاتا ہے
کرموٹیلراپن انسولین کے اخراج کو قابو میں رکھا جاتا ہے گونا ڈوٹراپن کی وجہ سے حمل میں
وارگی پیدا ہوتی ہے لیوٹینزنگ ہارمونس کی وجہ سے تولیدی غدود کے کام میں مدد ملتی ہے۔
رولاکٹن کی وجہ سے ماں میں حمل کے دوران [illegible] غدود میں تبدیلیاں ہوتی ہیں وسطی
پٹوٹیری کے احاطہ سے انٹرمیڈین ہارمون خارج ہوتے ہیں جس سے جلد میں رنگ کی برقراری
در پرورش ہوتی ہے اسے کروماٹوٹراپک ہارمون بھی کہتے ہیں۔ پچھلے حصہ پیٹیوٹری سے
آکزی ٹاسین خارج ہوتا ہے۔ زچگی ہونے کے بعد بچہ کو ماں سے دودھ ملنے میں ہاتھ بٹاتا ہے۔
پستانوی غدود کو کام کرنے میں یہ ہاتھ بٹاتی ہے۔ واسوپریسین سے جسم میں پانی کے
اخراج کو معتدل حالت میں رکھنے میں مدد ملتی ہے ورنہ ذیابطیس کی شکایت پیدا ہو جاتی ہے

انسان کے حلق کے آزو بازو میں ایک جوڑا تھیرائیڈ کے غدود واقع ہوتے ہیں۔ ان سے
تھیراکسن کا اخراج ہوتا ہے۔ غذا میں آیوڈین کی موزوں مقدار لینے سے اس کے فعل میں ہمواری

ہوتی ہے۔ تھیرائکسن میں آیوڈین ہوتا ہے۔ اس کے دو افعال ہیں ایک فعل تو آکسیجن کو جذب کرنا دوسرا نمو کی رفتار میں باضابطگی پیدا کرنا۔ یہ دونوں پیچیدہ افعال ہیں۔ تھیرائکسن کی کمی سے کریٹینزم کی بیماری ہو جاتی ہے بالغ ہو نہیں پاتا۔ کم سن ہی رہ پاتا ہے دماغی افعال میں تیزی دیکھی نہیں جاسکتی۔ بڑوں میں اس کی کمی سے گائیٹر (گھیگھا) حلق پر آجاتا ہے۔ سمندری غذا کے استعمال سے مریض اس مرض سے چھٹکارا پاسکتا ہے تھیرائکسن کی مقدار زیادہ ہو جائے تو اس حالت کو ہائپر تھیرائیڈزم کہتے ہیں۔ مریض میں ہیبت زیادہ ہوتی ہے پریشان سا نظر آتا ہے اعصابی کمزوری ہوتی ہے۔ دُبلا بھی ہو جاتا ہے۔

چار چھوٹے بیضوی غدود تھیرائیڈ کے نچلے حصہ سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ انہیں پاراتھیرائیڈ کہتے ہیں ان سے پاراتھرمون نکلتا ہے جو ہڈیوں میں کیلشیم کی مقدار کو قابو میں رکھ پاتا ہے تھیمس غدود سے نمو میں مدد ملتی ہے بچوں میں یہ غدود لابنا ہوتا ہے بالغ ہونے کی کیفیت تک یہ رہ جاتا ہے بعد میں اس کی جسامت میں کمی ہوتی ہے۔

پنکریاس میں لانگر ہانس کے جزیرے ہوتے ہیں ان سے انسولین ہارمون نکل پاتا ہے اس کی وجہ سے خون میں گلوکوز کا تناسب ایک خاص حالت میں رہ پاتا ہے توانائی کی تیاری میں مدد ملتی ہے گلوکاگان ہارمون کی وجہ سے جگر میں گلائیکوجن محفوظ رہ پاتا ہے اگر ان میں اس کیمیائی مادہ کی کمی ہو جائے تو خون میں گلوکوز کی مقدار میں زیادتی دکھی ہوتی ہے گردے زیادہ مقدار کو فاضلہ کے طور پر بکثرت نکال باہر کر پاتے ہیں اس سے تھکان محسوس کر پاتا ہے مریض۔ کھانے سے پہلے دوا کا استعمال ضروری ہے پروٹین کی مقدار زیادہ لینا لازم ہے کلی چاولوں کے استعمال میں کمی برتنی چاہیے۔ ذیابطیس کے مریض کو ابتدائی حالت میں گولیوں کے استعمال (ہارمون کے نسبت) سے فائدہ ہوتا ہے اس کی شکایت زیادہ ہو جائے تو انجکشن ہارمون کا دینا ضروری ہو جاتا ہے دنیا میں ذیابطیس کے مریضوں کی تعداد آئے دن زیادہ ہو رہی ہے۔ ان کا ادارہ بھی ہے مشوروں کو حاصل کرنے کے لیے ڈیابیٹولجسٹ کے پاس جانا پڑتا ہے۔ پیشاب میں شکر کی مقدار پہچان سے ڈائبیٹک ٹیبل

کو جانچنے سے کرسکتے ہیں۔ ذیابیطس کے مریض میں شکر کا تناسب اگر ایک دم گر جائے تو غشی طاری
ہوجاتی ہے زیادہ بھی ہو جائے تو پریشانی کی حالت دیکھی جاسکتی ہے اس مرض کی روک تھام کی کئی
تدابیر کے ہر ملک میں چرچے کیے جا رہے ہیں۔

اڈرینل غدود گردوں کے پاس واقع ہوتے ہیں اس غدود کے اوپری حصہ کو کارٹکس اور اندرونی
حصہ کو میڈولا کہتے ہیں۔ کارٹکس سے کارٹی سان، الڈوسٹران، اڈرینوسٹران ہارمونس کا اخراج
ہوتا ہے پروٹین کو کاربوہیڈریٹس میں تبدیل کرنے کے لئے سوڈیم اور پوٹاسیم کے تعاملات میں
نر خصوصیات کے نمو کے لئے بالترتیب یہ ہارمونس کام آتے ہیں میڈولا سے نکلے ہوئے ریپی نفرین
ہنگامی حالت میں انسان کو خاص مدد فراہم کرتا ہے ہوا رگی کے لئے۔ مثلاً غصہ کو قابو میں رکھنا، رنج
کو آپے سے باہر نہ ہونے دینا، مصیبت کے موقع پر توازن نہ کھونا وغیرہ۔ نون ریپی نفرین کی مدد سے
انسان میں خون کا دباؤ اعتدال پر رہ جاتا ہے بلڈ پریشر میں تبدیلی اسی ہارمون کی کمی و زیادتی کی
وجہ سے بھی ہے۔

گوناڈس یا تولیدی عضووں سے بھی ہارمونس کا اخراج ہوتا ہے نر تولیدی غدود سے ٹسٹوسٹران
ہارمون کا اخراج ہوتا ہے جس کی وجہ سے مردانگی کی خصوصیات نمودار ہوتی ہیں۔ بیضو دانی سے ایسٹروجن
پروجیسٹران ہارمونس کی وجہ سے نسوانی خصوصیات میں اضافہ ہو پاتا ہے کوریانک گوناڈوٹراپن کی وجہ
سے حمل میں ترقی دیکھی جاسکتی ہے ریلاکسین کی وجہ سے حاملہ عورت کو زچگی ہو جانے میں مدد
مل پاتی ہے۔ عورتوں میں کبھی کبھی اولاد کا نہ ہونا ان ہارمونس کی کمی یا بالکل اخراج نہ ہونے کی
وجہ سے بھی ہے مردوں میں بھی ہارمون کی کمی کی وجہ سے منوی جرثوموں میں ناتوانی دیکھی جاسکتی ہے۔
اس حالت میں منوی جرثومہ بیضہ کو بارور نہیں کر پاتا ہے۔

مندرجہ بالا غدود کے علاوہ غذائی نالی کے کئی حصوں سے بھی اخراجات ہوتے ہیں مثلاً
معدہ سے گیسٹرین، ڈیوڈینم سے سیکریٹین جو پتہ کے رس میں تیزی پیدا کرپاتا ہے اس طرح سے جسم
کے نمو کو برقرار رکھنے کے لئے، اچھے ہاضمہ کے لئے، نمو کے لئے، تولید کے لئے، اعصاب کے بچا

افعال کے لئے، وقتِ مقررہ پر بالغ پن کے لئے مصیبتوں کو جھیلنے کے لئے، خوشیوں کے اظہار کے لئے ہارمونس کا موزوں مقدار میں جسم میں ضروری ہے جو خون میں داخل ہو پاتے ہیں ایک طرح سے انسان میں چند کیفیتوں کا اظہار ان ہارمونس پر ہی مشتمل ہے۔ مثلاً غصہ میں آجانا، طیش میں آنا، ایک دم رو پڑنا۔ خوشی میں پھولا نہ سمانا، زور سے ڈانٹ ڈپٹ کرنا، غصہ کو پی لینا، ہنسی خوشی سے جواب دینا وغیرہ۔ کھیل کے میدان میں دوڑ بازی میں، کرکٹ ہاکی کے کھیل میں تماشائیوں کی چیخ پکار کے باوجود ضبط کے ساتھ کھیلنا بھی ہارمونس کی وجہ سے بھی ہے۔

کمال اس بات میں ہے کہ یہ ہارمونس بذاتِ خود خارج ہوتی رہتی ہیں۔ ان پر کسی خاص نظام کا روک ٹوک نہیں۔ ابتداء سے آخر تک یعنی پیدائش سے موت تک بلاناغہ کام کرتے چلے جاتے ہیں یہ غدود بذاتِ خود وہ مالک ہیں صرف روح کا ہی ان پر قبضہ ہے یعنی ملک کا ہی اولین حکم حاصل کرتے ہی کام شروع کر دیتے ہیں اور انسان کی خدمت میں مصروف رہ جاتے ہیں۔ موت کا سایہ جب انسان پر پڑتا ہے تو تھم جانے کے سوا چارہ ہی کیا ہے مستقل طور پر کام رک جاتا ہے اور ناگہانی موت کے منہ میں انسان چلا جاتا ہے۔

قصہ مختصر یہ کہ احساسات کی تکمیل، پیش کش بھی ہارمونس کی وجہ سے ہے ہم تعامل میں ہمواری جسم میں برقرار رکھنے کے لئے ہارمون ضروری ہے ورنہ جسم میں رد و بدل واقع ہو سکتا ہے

(سلسلہ صفحہ ۲۷ سے آگے)

ہے جو تاریخ انسانی جماعت نے اب تک رقم کی ہے وہ اس کی نشاندہی کرتی ہے کہ مستقل مزاجی، تندہی سے دھن کے پکے افراد اور اشخاص نے حقیقی کامیابیاں حاصل کی ہیں ناقابل تسخیر پہاڑوں کی چوٹیاں بھی انسانی عزم و ارادہ مستقل مزاجی کے مقابلے میں سر جھکا دیتی ہیں۔

(بشکریہ آل انڈیا ریڈیو۔ حیدرآباد)

افسانہ

عابد خورشید
MIDC ایریا، چکل تھانہ، اورنگ آباد

پیلی بیتی

ہرے بھرے گاؤں میں وہ منظروں کے گھاؤ محسوس کر رہا تھا۔ اس نے سوچا کچھ دن پہلے جو آگ جلی تھی ان منظروں کو کیوں نہ چاٹ سکی۔ آگ تو صرف جلاتی ہے پھر یہ منظر کیسے بچے رہے؟ اس کا جی چاہا وہ ان ہاتھوں کو ڈھونڈ نکالے، ان سے کہے انھیں تم نے کیوں چھوڑ دیا ہے؟ اور کیوں؟ یہ تو دلوں کو زندہ کرتے ہیں۔ انھیں دیکھ کر مردہ دل پھر سے زندہ ہو اٹھتے ہیں۔ پھر زندہ رہنے کا سامان کیوں کر بچا —؟

اس کی نظریں منظروں سے ہٹ کر گاؤں کے ان گھروں پر دوڑنے لگیں جو کچھ دن پہلے جلے تھے۔ آگ تو کچھ بجھ چکی تھی۔ دھواں بیٹھ چکا تھا۔ مگر... اسے ایسا لگا دھواں تو اب بھی اٹھ رہا ہے اسے دیکھنے والا کون ہے؟ کتنے دل کتنے چہرے ہیں جن کے اطراف یہ دھواں ہی دھواں ہے۔ اسے دیکھنے کی تاب ہے؟

نگاہوں میں اداسی اور اس چھا رہی ہیں۔

ہم نے تو کبھی آگ نہیں لگائی۔ ہماری آنکھیں روشنیاں دیتی ہیں پھر یہ کیسی آگ تھی اور کہاں سے آئی تھی۔ جس نے جلایا بھی، خاک بھی اڑائی.... اور... بجھ بھی گئی۔ یہ دھواں جو دکھائی نہیں دیتا مگر اٹھ رہا ہے اس میں زندگی کا ہر یقین ماند پڑ گیا ہے اب کوئی راستہ ڈھونڈے تو کیوں کر —؟ جلے ہوئے گھروں کے اوپر سے دکھائی دیتے منظر نگاہ کو اپنی طرف کھینچ رہے تھے جلے ہوئے منظر نگاہوں کے سامنے بھی تھے اور نگاہوں کے اندر بھی۔

نگاہوں کے اندر چھپے منظروں کے گھاؤ کسے دکھائی دیتے ہیں۔؟

کل جب فساد سے جلے گاؤں والوں کے لئے چندہ جمع کرنے والے اس کے گھر پہنچے تھا اس نے محسوس کیا تھا کہ ان میں سے کسی نگاہ میں بہتے ہوئے خون کی کوئی نشانی تھی اور نہ جلتی ہوئی آگ کا چھوڑا ہوا دھواں۔ ان کے سروں پر آسمان بالکل صاف تھا۔

کوئی چیخ —— ؟

کوئی گھاؤ —— ؟

کوئی تپتے ہوئے شعلے کا اونچا سرا — ؟

گھروں کی چھتوں سے اُبلتا ہوا دھواں — ؟

دُکھ کے دریا پیچھے تھے اور آگے نہ دامن تر تھے اور نہ بھیگی بھیگی آواز —

اس نے انکار کر دیا۔ ان کے افسوس اور حیرت سے پھیلے چہروں کے نقوش نظر انداز کر کے وہ اپنے کمرے میں چلا آیا۔

وہ خود کوئی فرشتہ نہیں ہے۔ اس نے بھی دل ہی دل میں کتنے گھر جلائے تھے اور کتنے سینوں پر وار کیے تھے۔ مگر نہ کبھی کوئی آواز ابھری نہ خون بہتا نظر آیا اور نہ ہی کسی نے دھواں اُٹھتے دیکھا۔

چندہ جمع کرنے والوں کے چہرے اس کی نگاہ کے سامنے ابھرے۔

وہ کروڑپتی ضرور تھا اور کبھی کبھی اس کے اندر فرشتوں کے پر بھی پھڑپھڑاتے تھے مگر آج چندہ جمع کرنے والوں کے چہرے دیکھ کر اس نے اس پھڑپھڑاہٹ کو اپنے اندر پھیلنے نہیں دیا۔ یہ کیسی انہونی بات تھی۔ ایسے کیا ہوا تھا۔ اس وقت — ؟ اس نے اپنے دل کی آواز کو پکڑنا چاہا تو اس کے دل میں پیروں کی سوئی ہوئی آہٹ پھڑپھڑانے لگی۔

جب اس کی چمکیلی کار دھواں اُڑاتی سڑکوں سے ہوتی ہوئی گاؤں میں پہنچی تو منظر نگاہ کے سامنے تھے اور جلے گھروں کی خاک اور کالا ہونٹ یعنی اُٹھتا ہوا دھواں۔ اس نے مجھے اپنے ساتھ لیا۔ اسے اپنے ساتھ ایک بوڑھے بیکس آدمی کی ضرورت تھی جو اس کی رہبری کر سکے۔ وہ میری رہبری

شاداب
[illegible] گردش کا بٹوارہ رقومات تقسیم کرنے لگا۔ لوگوں کے جلے ہوئے چہروں پر میں نے دریاؤں کو بہتے ہوئے دیکھا۔ دھواں بیٹھ رہا ہے منظر پھر ایک بار پہچانے لگے مگر اس کے ساتھ چلتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ ایک آگ اب میرے دل میں سر اٹھانے لگی ہے۔

میں نے سوچا میری ساری ڈگریاں، ساری قابلیت، سفارش اور رشوت کے بغیر بے کار ہے اگر فساد کی آگ میرے گھر تک پہنچتی تو کس قدر اچھا ہوتا۔

میرا گھر کیوں محفوظ رہا — ؟ اس آگ نے میرے گھر کا راستہ کیوں نہیں ڈھونڈا؟ وہ میرے اندر سلگتی آگ جسے بے خبر گاؤں کی گلیوں میں پھرتا رہا۔

اس کے سر پر فرشتوں نے اپنے پر پھیلا رکھے تھے۔ اس کی نگاہ کیمرے کی آنکھ کی طرح دور ایک ٹوٹے پھوٹے مکان کے سامنے ایک اونچے درخت کے نیچے کھڑی دوشیزہ پر رک گئی وہ اس کے قریب جاکر کھڑا ہو گیا۔ دوشیزہ نے نگاہ اٹھا کر ایک پل کے لئے اس کی طرف دیکھا اور نظریں جھکا لیں۔ اس ایک پل میں، میں نے اس کی نظروں کی خاموش داستانوں کی آواز سنی۔ سرد ہوائیں اور آسمان پر آمڈ آنے والے بادلوں کی پرواہ کیے بغیر وہ اس کے بالکل قریب جاکر کھڑا ہو گیا۔ کچھ بولنا ہی چاہتا تھا کہ ایک ساتھ چلتے بوڑھے نے جس کی جوان بیٹیوں کو اس کی [illegible] کے سامنے جلا دیا گیا تھا۔ کہا۔

"صاحب جی! اس کی عزت لوٹی گئی ہے۔"

اس کی آواز میں تھرتھراہٹ تھی۔ میں اس بوڑھے کو اچھی طرح پہچانتا تھا وہ بوڑھا اپنی بہو کی عزت لٹنے کے بعد اسے خودکشی سے نہیں بچا سکا تھا۔ اس لڑکی کو خودکشی سے بچانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اسے لگا جیسے ایک بار پھر گرم ہوائیں چلنے لگی ہیں اور آسمان آگ برسا رہا ہے۔ پھر اس نے ہرے بھرے لہلہاتے کھیتوں کی طرف دیکھا جو مذہب کے نام پہ [illegible] کے لہو سے سینچے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔ مجھے بوڑھے کے چہرے پر بے بسی کی لکیریں صاف [illegible] کی بات سن کر وہ آگے بڑھا اور کچھ جیسے اس نے لڑکی کو دینا چاہا لڑکی۔

"شاداب"
اپنی آنکھوں سے ٹپکتی داستان [illegible] اس کی طرف یوں دیکھا جیسے پوچھ رہی ہو
کیا یہ میری عصمت کی قیمت [illegible] رہی تھی اس نے اپنے پاس بیٹھے
[illegible]ان کی آواز سُنی۔

پھر — چاہتی کیا ہو تم —؟ [illegible]

تیز ہواؤں کی گذرتی آواز [illegible] کی زبان سمجھنا کس قدر مشکل ہے — ؟

وہ کچھ دیر رک کر میری طرف [illegible]

"تم — تم اس لڑکی سے شا[illegible] میں تمھیں پچاس ہزار دوں گا۔"

مجھے یوں لگا۔ جیسے میرے [illegible] اچانک آگ بھڑکنے لگی ہو۔ تلواریں —
نیزے۔ کلہاڑیاں چمک رہی ہوں۔

"تم چاہو تو اسے اپنے لئے گھوڑے جوڑے کی رقم بھی سمجھ سکتے ہو"
اُس نے جواب دیا۔

مجھے لگا اب میں ساری زندگی فساد کی زد میں رہوں گا۔

غزل

ڈاکٹر سجاد سید (ایم اے بی ایس ایم اے ایم بی ڈاکٹریٹ)
سی۔۲ محل مہر اینیو، جامعہ نگر اوکھلا۔ نئی دہلی

لبِ خاموش سے اظہارِ تمنا چاہیں ✤ جذبۂ شوق کا وہ ایسا تماشا چاہیں
میں تو زندانِ خرد سے ہوا کب کا آزاد ✤ آپ رہ لیں جو ابھی قید میں رہنا چاہیں
وہ جو رہتے ہیں ہر اک بزم کی رونق بن کر ✤ یوں بھی دیکھا ہے کہ تنہائی میں رونا چاہیں
کرکے مصلوب مجھے مجھ سے جھیلنے والے ✤ ہائے مجھ سے ہی وہ اعجازِ مسیحا چاہیں
ایک ہم تھے کہ کہانی سے بہل جاتے تھے ✤ آج کے بچے حقیقت کو پرکھنا چاہیں
بزمِ یاراں میں بھی رہتے ہیں اکیلے ہم [illegible] ✤ بزمِ خوباں میں بھی چہرا کوئی تکنا چاہیں
جھنڈے کے سائے تڑپ کے [illegible] اب ✤ اُس پہ چلتے ہیں کہ ہم دل کا [illegible] چاہیں

مولانا عبدالقدیر صاحب حسرتؔ
صدر شعبۂ دینیات کلیہ جامعہ عثمانیہ

تو رہے اور میں رہوں

(مولانا عربی اور فارسی کے بڑے عالم اور عربی کے تمام علوم متداولہ پر حاوی نظر رکھتے ہیں۔ اُردو نظم میں بھی آپ کا ایک خاص رنگ ہے جو تغزل سے بالکل مختلف اور فلسفیانہ ہے۔ آپ نے غالب کی بحروں میں بیشتر کلام موزوں کیا ہے دونوں کو مقابل رکھ کر دیکھنے سے آپ کی بلند آہنگی کا گہرا اثر قاری کے دل پر ہوتا ہے آپ کی غزلوں کا ایک مجموعہ اس سے پہلے شائع ہو چکا ہے۔ لیکن اس سے بہت زیادہ غیر مطبوعہ کلام باقی ہے)

درد تو لاعلاج بن اور شبِ غم دراز ہو ۔ میں رہوں اور بیکسی کوئی نہ چارہ ساز ہو
سینہ میں دل کباب ہو، آنکھوں میں سیل آب ہو ۔ نغمہ طرب فزا نہ ہو نغمہ فسانہ ساز ہو
تیرِ نگاہِ بے پناہ، خنجرِ غمزہ دل شگاف ۔ مجمعِ عاشقاں میں آ مشقِ فسونِ ناز ہو
یوں مری عمر ہو تمام، اس کے سوا ہے نہ کام ۔ سنگِ درِ حبیب ہو، میرا سرِ نیاز ہو
اتنی پلا مجھے شراب، ہوش و حواس ہوں خراب ۔ فتح ہو بابِ بیخودی، فاش ہر ایک راز ہو
محوِ جمال ہوں اس کا مجھ کو کسی سے کیا غرض ۔ تو رہے اور میں رہوں، ناز ہو اور نیاز ہو

وحیدہ نسیم (عثمانیہ)

([illegible] حیدرآباد)
مورخہ ۱۴ جنوری ۱۹۴۶ء

کھچڑا

(آٹھ زبانوں کی ایک مرکب نظم)

"اِکرَا سُورُدُو" ذرا جاپاں نظر کُن سوئے ساحلہا
کہ جنگ آساں نمود اوّل ولے افتاد مشکلہا

فحمیند الی میدان ملایا جو ہوا ہے تو "بکاز آف دَیتھ" ہم پُنچی جہازاں تِسکورا لیڈو
شنیدم آل اوور ریڈیو سے یہ خبر پھیلی کہ بحرِ ہند کا ہم نے اُتارا ہے یہی فوٹو

"اِکرَا سُورُدُو" ذرا جاپاں نظر کُن سوئے ساحلہا
کہ جنگ آساں نمود اوّل ولے افتاد مشکلہا

"یُو ہَیو ڈَن نوٹس آف مِسٹیکس" لیکن کیا ہوا ستم "مَلا سانگٹ کٹے تاہیں تلا ہتیار پا ہیجے"
"ہمیں آلاتِ جنگ دارم" تمہاری نذر کر دیتے تجھے برقِ اداد یتے تجھے تیرِ نظر دیتے

"اِکرَا سُورُدُو" ذرا جاپاں نظر کُن سوئے ساحلہا
کہ جنگ آساں نمود اوّل ولے افتاد مشکلہا

حزیمت تھینک یُو کی در بر نوکر نمی ماند حجابِ نو مریضاں در برِ دکتر نمی ماند
شکستِ فاشِ برقش در برِ ہٹلر نمی ماند اگر ماند شبے ماند شبے دیگر نمی ماند

"اِکرَا سُورُدُو" ذرا جاپاں نظر کُن سوئے ساحلہا
کہ جنگ آساں نمود اوّل ولے افتاد مشکلہا

"قل اعوذ برب الناس ملک الناس الٰہ الناس" [illegible]

ذرا جنگی فتح سے خوب ہی بچی گئی تھی آس | یہ اتنی جتنی امیدیاں سی او سب گرنڈا شو یاس

"اکرڈ سورڈو" ذرا جاپان نظر کن سو کساحلہا
کہ جنگ آساں نمود اوّل ولے افتاد مشکلہا

اگرآں ترکِ جاپانی بدست آرد دلِ ما را | بر گمگو گندش بخشم چرا بلوچی و بر مارا
"ڈریسنگ" زخمِ دل کا کبھی دی گو میں نے سر مارا | کہ "آئنٹمنٹ" کی حاجت نہیں زخمِ تمنّا را

"اکرڈ سورڈو" ذرا جاپان نظر کن سوکساحلہا
کہ جنگ آساں نمود اوّل ولے افتاد مشکلہا

"پرنس آف ویلز" گو غرقاب شد لیکن نہ گھبرائی | "ٹرجو" "کٹوین" اٹھ کے کہ تو ہم سے بجنگ آئی
مگر اب تو تری حالت بہت ہی ہو پ لس پائی | "بہاش امیڈ یدا" کر کرکے تیری خوب رسوائی

"اکرڈ سورڈو" ذرا جاپاں نظر کن سوکساحلہا
کہ جنگ آساں نمود اوّل ولے افتاد مشکلہا

یہ تجانت ہو لڑا ٹن ماں یہ ہمرے تو کا کو ہیں | رجیا مان کر تجھو ہیں لڑا فن مان یہ گھس جبتیں
جو گولہ ایک تجھو بیجے پوت ہمرے گھر بھیجیں | ہٹیوں کی سی ان کی چال ہے میداں میں کا کڑ ہیں

"اکرڈ سورڈو" ذرا جاپاں نظر کن سوکساحلہا
کہ جنگ آساں نمود اوّل ولے افتاد مشکلہا

ملایا میں ہزاروں کٹ گئے ٹنٹ دونٹ پی ہو ای | شنیدم تم باذن اللہ تو گفتی بہ مسلمہا
نسیم دلحزیں گریہ مکن بر حالِ زارِ خود | برائے کشتی تو ساختند امواج ساحلہا

۱ے تھنگی ۔ اِدھر دیکھو   ۲ے تنگی ۔ ہم اچھے جہاز نہ لا سکے۔
۳ے مرہٹی ۔ مجھ کیں نہ بتلا کہ ہتیاری مرمت ہے   ۴ے ڈاکٹر کا مشورہ
۵ے جاپانی مارا مینا کو خوب ہی یادی تھی آس ۔ مگر اب جتنی امیدیں تھیں وہ سب گرنڈ انغو ۔ یاس
۶ے گرفتار ۔ تم بہت خراب ہو گئے ہو   ۷ے تال ۔ ہم نے تم کو خوب پیٹا   ۸ے پنجابی زبان

عزیز بھارتی
صدر مرکز ادب، حیدرآباد

(منظوماتی مشاعرہ مرکز ادب حیدرآباد
منعقدہ ۱۰ مارچ ۱۹۷۹ء)

حیدرآباد

فخرِ ہندوستاں حیدرآباد ہے
اصل میں آسماں حیدرآباد ہے
اس نگر کو بسایا قطب شاہ نے
پیار سے پھر سجایا قطب شاہ نے
اپنی رعیّت کا دل موہنے کے لئے
رات کو دن بنایا قطب شاہ نے
عدل کا اک نشاں حیدرآباد ہے
فخرِ ہندوستاں حیدرآباد ہے
اس کی تہذیب کا معترف ہے جہاں
عجز و اخلاص کی ہے یہی کہکشاں
بولیوں میں دکن کی ہے مصری گھلی
کتنی شیریں ہے مخلص ہے اس کی زباں
پیار کی داستاں حیدرآباد ہے
فخرِ ہندوستاں حیدرآباد ہے
لوک گیتوں کی خوشبو فضاؤں میں ہے
جھنڈیوں کی کھنک ان ہواؤں میں ہے
پنگھٹوں کا تصور ہے اب تک جواں
گاگروں کی چمک ان گھٹاؤں میں ہے
پیار کا اک سماں حیدرآباد ہے
فخرِ ہندوستاں حیدرآباد ہے
اس کے ماٹے میں کتنے ہی سپنے پلے
کتنے دیپک وفاؤں کے اس میں جلے
پیار کی کتنی کلیاں کھلیں اس جگہ
کتنے بھنورے یہاں پر بنے منچلے
ہر کسی کی اماں حیدرآباد ہے
فخرِ ہندوستاں حیدرآباد ہے
حیدرآباد قائم رہے تا ابد
اس کی اونچائیوں کی نہ ہو کوئی حد
اے خدا اس کو محفوظ رکھیو سدا
اس کو چھونے نہ پائے کوئی نظرِ بد
پیار کا گلستاں حیدرآباد ہے
فخرِ ہندوستاں حیدرآباد ہے

"شاداب"
باقر [illegible]
شاگرد [illegible] حیدرآباد

حیدرآباد

کیا کہیں اور کوئی ایسا گلستاں ہوگا
گل و بلبل میں رواداری کا پیماں ہوگا
حیدرآباد ہے انسانوں کا دل والوں کا شہر
کوئی اس بزم میں ہندو نہ مسلماں ہوگا
یہ شہر میرا ملکِ سلیماں سے کم نہیں
یہ شہر میرا مرکزِ حسن و جمال ہے
اس شہر کی ہے رسمِ رفاقت کی زندگی
یہ شہرِ آرزو ہے محمد قلی کا شہر
نغمے کا شعر و علم کا زندہ دلی کا شہر
کھنڈروں میں بھی ہے یہاں رونقِ بہار
کتنی ہی مشکلیں ہوں نہیں کوئی سوگوار
ہم لوگ وہ ہیں جو غمِ دوراں میں ہیں مگن
ہم لوگ وہ ہیں چاک گریباں بھی ہیں لگن
دولت نہ ہم خم ہو سلے دل کے امیر ہیں
شاہوں کو جن پہ رشک ہو ایسے فقیر ہیں

یہ شہر حیدرآباد حسیں ہے طاہرہ دلکش
اس کے نام سے ہے عزتِ ہندوستاں باقی

جون ۹۰ء
کلیم قریشی
شاعر طو تخیل
حیدرآباد

حیدرآباد

حیدرآباد جو اک امن کا گہوارہ ہے
گولکنڈہ کی زمیں ہند کا شہ پارہ ہے
ہم نئے دور کو ماضی سے ملا ڈالیں گے
حیدرآباد کی "تاریخ" سنا ڈالیں گے
حیدرآباد کی تہذیب کے سکے ہوں گے
جو بڑی قدر سے ہر دور میں چلتے ہوں گے
حیدرآباد میں "ہر جنسِ وفا" ملتی ہے
خاک سے لپٹی ہوئی "بوئے حنا" ملتی ہے
"چارمینار" جو آپس میں ہیں بھائی بھائی
کوئی ہندو، کوئی مسلم، کوئی سکھ عیسائی
امجد و زور و تقی باقی مرحوم اٹھے
طالب و وجد اٹھے، مخدوم و مکش اٹھے
شاد سے شاذ تلک ایسے بھی شاعر گذرے
مایۂ نازِ وطن، وقت کے ماہر گذرے
شہرِ ارمان و فا ان کے یہ مشہور ہوا
مختلف دین کے "لوگوں" سے یہ معمور ہوا
حیدرآباد پہ اللہ کی رحمت برسے
تا قیامت یہاں اخلاص کی نعمت برسے

نظمیں

مومن خاں شوق
معتمد عمومی مرکزِ ادب۔ حیدرآباد

شہرِ حیدرآباد

بانکپن ہے، آن ہے شہرِ دکن
شاعری کی شان ہے شہرِ دکن
باہمی اخلاص کا مظہر ہے یہ
پیار کا عنوان ہے شہرِ دکن

*

چارمینار حسن کی دولت ہے
جامعۂ عثمانیہ سے شہرت ہے
گولکنڈے کی عظمتیں ہیں جواں
سارے بھارت میں اس کی عزت ہے

*

شہر اپنا قلی قطبؔ کا چمن
اس کی مٹی میں ایک سوندھا پن
ہر قدم، زندگی، خلوص، وفا
کس قدر دل نشین ہے یہ آنگن

محمود شریف محمود
شریک معتمد مرکزِ ادب حیدرآباد

حیدرآبادِ دکن

اے قلی کی آرزو، اے حیدرآبادِ دکن
تجھ کو قدرت نے ہے بخشا اک انوکھا بانکپن
تیری مٹی میں بسی ہے پیار کی مشکِ ختن
چار سو برسوں سے جس پر لہلہاتا ہے چمن
فکر و فن کے اُن ستاروں نے لیا تجھ پر جنم
محوِ حیرت جن کی تابانی پہ ہے نیلا گگن
تُو نے علم و آگہی کی یوں بکھیری ہے مہک
دُور تک جیسے مہکتا ہے کوئی کیوڑے کا بن
تُو نے پائی ہے وراثت میں قلی سے شاعری
اے ادب کے پاسباں اے مرکزِ شعر و سخن
مشرقی تہذیب کے جوہر نمایاں تجھ میں ہیں
فخرِ ہندوستان ہے تُو اے نازشِ ارضِ دکن
یا خدا مقبول ہو محمودؔ کی یہ التجا
امن کے اس چاند پر پڑنے نہیں پائے گہن

ابوالفاروق شعور

حیدرآباد

حیدرآباد کی تاسیس کی بنیاد ہے یہ
یعنی اخلاص کی بنیاد پہ آباد ہے یہ
ہندو مسلم کو دو آنکھوں کی طرح دیکھا گیا
ایک انساں کی طرح سب کو یہاں سمجھا گیا
حکمرانوں میں رعایا میں خدا ترسی تھی
الفت و پیار کی تصویر ہر اک بستی تھی
بات تھی کل کی الگ آج کی ہے بات الگ
جبکہ ہے شہر الگ دن ہے نہ تو رات الگ
آج کی طرح گرانی نہ پریشانی تھی
چیز بنیادی ضرورت کی ہر اک سستی تھی
مادی طور پہ کی خوب ترقی ہم نے
دیپ کی جائے چکاچوند ہے اب برقی سے
شہر تو شہر ہیں آباد ہوئے ہیں صحرا
یہ الگ بات ہے برباد ہوئے ہیں صحرا
دیکھنے کو تو ہر اک شئے کی فراوانی ہے
چیزیں مہنگی ہیں مگر جان کی ارزانی ہے

محمد شریف محمود

قلی قطب کا شہر

یہ محبت کا نشیمن، یہ قلی کا شہر ہے
ہے رواداری کا گلشن، یہ قلی کا شہر ہے
آشتی کا ہے یہ مامن یہ قلی کا شہر ہے
امن کی راحت کا مسکن یہ قلی کا شہر ہے

آج نیرنگیٔ دنیا سے چمک ہے ہر سو
لیکن اخلاق کا فقدان تنک ہے ہر سو
جہل سے آج دکن میں جو ہے نفرت کا چلن
علم کے شہر میں کم ہو گیا الفت کا چلن
اب بھی چاہیں جو بدلنا تو بدل سکتے ہیں
اب بھی چاہیں جو سنبھلنا تو سنبھل سکتے ہیں
یادِ ماضی کے جھروکوں سے ضیا پانا ہے
حال و مستقبلِ انسان کو چمکانا ہے
مختلف رنگ کے پھولوں سے ہو تزئینِ چمن
چار سو سالہ منانا ہے ہمیں جشنِ دکن
اے شعور آؤ کریں عہد رواداری کا
مل کے سب ختم کریں زور جفاکاری کا

غزلیں

عطا عابدی

جس پیڑ پہ آتے ہوں ثمر کم بہت ہی کم
رکھتے ہیں لوگ اس پہ نظر کم بہت ہی کم

ماضی کی شاخیں، پیار کی خوشبو، وفا کے پھول
آتی ہیں یاد اب بھی مگر کم بہت ہی کم

وہ میری خبر لینے کو ہیں مُصر ہو اللہ
جو رکھتے ہیں خود اپنی خبر کم بہت ہی کم

منزل کے فیصلے سے بس خائف ہوں اے عطاؔ
ہے پاس میرے رختِ سفر کم بہت ہی کم

کلیم ضیاء

اسماعیل یوسف کالج۔ جوگیشوری (ایسٹ) بمبئی ٦٠

اشکوں کے بدلے ہونٹوں پہ غنچے کھلائیے
غم خود پناہ مانگ لے یوں مُسکرائیے

دُنیا کو اپنے ظرف کی عظمت بتائیے
احسان کیجئے تو زباں پر نہ لائیے

ظلمات کے وجود کو دل سے مٹائیے
اِن بستیوں میں پیار کے دیپک جلائیے

میں بے غرض ہوں ساغر و مینائے حُسن سے
میری نظر کے سامنے ساغر نہ لائیے

دَرد اور جنوں، ہیں عشق کی معراج کے نقوش
کس کو تباہ کیجئے؟ کس کو بچائیے

نظمِ حیات جہدِ مسلسل کا نام ہے
قسمت کے سامنے نہ کبھی سر جھکائیے

جس راستے سے آئیں خوشی کے قدم ضیاؔ
اُس راستے پہ ذوقِ نظر کو بچھائیے۔

Rs 6/-

ماھنامہ

شاداب

حیدرآباد

جلد (۷) شمارہ (۷) جولائی سنہ ۱۹۹۰ء حیدرآباد

ایڈیٹر
محمد قمرالدین صابری

جائنٹ ایڈیٹر
رشید الدین

مینجنگ ایڈیٹر
کلیم الدین احسن

مجلسِ مشاورت

محترمہ عائشہ بیگم رباب - یوسف ناظم - ڈاکٹر محمد یوسف الدین - پروفیسر رضی الدین احمد - منیر احمد صدیقی
محمد منظور احمد منظور - محترمہ سیدہ مہر - ڈاکٹر مسناء الرحمن خاں آشنار - پروفیسر میر تراب علی

زرِ تعاون

	ہندوستان	خلیجی ممالک	امریکہ	انگلستان	پاکستان
سالانہ	65 روپے	200 روپے انڈین	40 ڈالر	25 پونڈ	175 پاکستانی روپے
۲ سال	120 "	360 " "	70 "	45 "	300 "
تاحیات	1500 "	3500 " "	700 "	400 "	3000 "

(ترسیلِ زر کا پتہ)

ماہنامہ "شاداب" 147-5-11 ریڈ ہلز - حیدرآباد (اے پی)

فون نمبر 229161

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر محمد قمرالدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان سے چھپوا کر دفتر شاداب 147-5-11 ریڈ ہلز حیدرآباد (اے پی) سے شائع کیا۔

فہرست

★ نغمۂ مسلم مطلقہ	محمد عبدالستار	۳
★ کینیا میں اسلام اور مسلمان	ترجمہ ۔ افضال احمد قاسمی	۸
★ بلغاریہ میں مسلمان	آر ۔ این ۔ اے	۱۶
★ عربی ادب کی اہمیت اور ضرورت	مولانا محمد اعزاز علی	۱۸
★ عبدالماجد دریا آبادی	مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی	۲۱
★ اکبر الہ آبادی	مس سہا مسعود / نعیم الدین رضوی	۲۷
★ مولانا حسرت موہانی کی زندگی اور شاعری	ڈاکٹر فرمان فتح پوری	۳۳
★ مقابلہ کے امتحانوں کی تیاری	سید حامد	۴۰
★ ہندوستانی سیاست میں ذات بحیثیت حرکیاتی عوامل	سید شہاب الدین	۴۷
★ چار سو سالہ جشن حیدرآباد پر شاداب کی خصوصی اشاعت	ڈاکٹر مجید بیدار	۵۶
★ منقبت حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز"	ڈاکٹر عتیق الرحمٰن خاں انتشار	۵۹
★ سلامت کہ جو ترا ساقیا	شفیق فاطمہ شعریٰ	۶۰
★ غزلیں	شجاع الدین شاہد / حنیف رحیم	۶۴

ریاست کے سیلاب زدگان کی امداد کے لئے

چیف منسٹرس ریلیف فنڈ میں دل کھول کر چندہ دیجئے

محمد عبدالستار
سیشن جج ریٹائرڈ، آندھرا پردیش

نفقہ مسلم مطلقہ
اور
ہائی کورٹ آندھرا پردیش کے اجلاس کاملہ کا فیصلہ مورخہ ۵ مارچ ۹۰ء

مسلم مطلقہ کا ایک سیدھا سادہ مسئلہ ۱۹۷۳ء میں ضابطہ فوجداری ہند کی دفعہ ۱۲۵ کی ترمیم کی وجہ سے نہ صرف غیر شرعی صورت اختیار کر لیا بلکہ کئی ایک پیچیدگیوں اور الجھنوں کا موجب بھی بن گیا اس لیے کہ اس ترمیم کی رو سے مطلقہ عورت کو بھی زوجہ کے زمرہ میں شریک کر لیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم مطلقہ جو اب تک مستثنیٰ تھی عدت گزر جانے کے بعد بھی اپنے سابق شوہر سے نفقہ پانے کی مستحق قرار دی گئی۔ مسلمانوں کی نمائندگی کی بنا پر ۱۹۷۴ء میں دفعہ ۱۲۷ ضابطہ فوجداری ہند میں ایک ترمیم لائی گئی جس کی رو سے اگر سابق شوہر عدت کی مدت کے بعد معاہدہ نکاح سے پیدا شدہ وجوہ کی تکمیل کر دے تو مجسٹریٹ کسی تولیت مابعد پر ادائی نفقہ کے تنسیخ کا حکم دے سکے گا۔ یہ ترمیم خود بھی اشک شوئی سے زیادہ نہ تھی۔ کیونکہ عدت کی مدت کے بعد ادائی نفقہ کا جواز خود پرسنل لا کے منافی تھا۔ طلاق کے بعد شوہر ایک شخص اجنبی ہو جاتا ہے کسی اجنبی سے مسلم مطلقہ کا نفقہ حاصل کرنا شرعاً ناجائز تھا۔ اس ترمیم سے عام مسلمان مطمئن نہیں تھے۔ اسی ضمن میں بالآخر ۱۹۸۵ء میں سپریم کورٹ نے شاہ بانو کے مشہور و معرکۃ الآرا مقدمہ میں دفعہ ۱۲۵ ضابطہ فوجداری کی رو سے مسلم مطلقہ کو سابق شوہر سے عدت کی مدت کے بعد بھی نفقہ پانے کا استحقاق قرآنی احکام کے عین مطابق ہونا قرار دیا۔ اس طرح سپریم کورٹ جو ملک کی اعلیٰ ترین عدالت ہے اس

کے جواز پر اپنی مہر ثبت کردی اور یہ قانون ملک بن گیا ظاہر ہے کہ اس فیصلے سے مسلم پرسنل لاء پر ایک ضرب کاری لگی۔ عام مسلمانوں کے شدید مطالبے اور سخت احتجاج کے نتیجے کے طور پر حکومت ہند نے پارلیمنٹ سے ایک جدید قانون منظور و نافذ کروایا جس کو قانون اخواتین تحفظ حقوق عندالطلاق بابتہ ۱۹۸۶ء کے نام سے موسوم کیا گیا۔ اس جدید قانون کی رو سے مطلقہ اپنے سابق شوہر سے صرف عدت کی مدت ہی کی حد تک نفقہ پانے کی مستحق قرار دی گئی۔ ہندوستان کے بعض ہائیکورٹس نے اس قانون کی غیر صحیح تعبیر کرتے ہوئے عدت کی مدت کے حق کو جائز قرار دیا۔ چنانچہ گجرات، کیرالا ہائیکورٹس اور جسٹس بھاسکر راؤ آندھرا پردیش نے ایک مقدمہ (ALT 19 P ۱۲۰۷) میں یہ قرار دیا کہ مسلم مطلقہ دفعہ (۳) ضمن (۱)(الف) ایکٹ ۱۹۸۶ء کے تحت اپنے سابقہ شوہر سے نہ صرف عدت کی مدت تک بلکہ اس کے بعد بھی معقول اور مناسب ازوقہ پانے کی مستحق ہے۔ البتہ پٹنہ ہائیکورٹ نے یہ مقدمہ محمد یونس بنام فنکانی (پٹنہ لا جرنل صفحہ ۲۴۱ بابتہ ۱۹۸۷ء) میں مسلم مطلقہ عدت کی مدت کے بعد کسی صورت میں نفقہ پانے کی قطعی مستحق نہ ہونا قرار دیا۔ اس قسم کے اختلافی فیصلوں نے مسلم مطلقہ کے حق نفقہ کے مسئلہ کو غیر یقینی بنا دیا۔ آندھرا پردیش ہائیکورٹ کا ایک اجلاس کاملہ جو جسٹس سردار علی خاں، جسٹس راما جلو نائیڈو اور جسٹس بھاسکر راؤ پر مشتمل تھا۔ بمقدمہ عظمت علی خاں بنام قمر بانو وغیرہ (۸۹/۳۵۸ - C.R.C. NO) فیصلہ دیا ہے وہ اپنی نوعیت میں غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے اس اجلاس میں جسٹس بھاسکر راؤ کی شمولیت تقاضائے انصاف کے منافی تھی ایسے فاضل جج کو اپنے طور پر اخلاقی بنیاد پر شرکت سے احتراز کرنا چاہیئے تھا۔ اس لئے کہ ایسی نوعیت کے ایک مقدمہ (اے ایل ٹی ۱۹۸۹ء ص ۲۷۵) میں انہوں نے یہ قرار دیا تھا کہ جدید ایکٹ کی رو سے مسلم مطلقہ عدت کی مدت کے بعد بھی وہ اپنی سابقہ رائے پر قائم رہے اور اپنا ایک علیحدہ اختلافی نوٹ تحریر کیا۔ اجلاس کاملہ کا فیصلہ جسٹس سردار علی خاں نے لکھا جس سے جسٹس راما جلو نائیڈو نے بالکلیہ اتفاق کیا جس کی بناء پر اجلاس کاملہ کا اکثریتی فیصلہ قابل نفاذ قرار دیا گیا۔ اس اجلاس کاملہ نے جن تین نکات پر اپنی توجہ مرکوز

تے ہوئے جو فیصلہ دیا وہ درج ذیل کیا جاتا ہے۔

(۱) آیا مسلم مطلقہ ایکٹ ۱۹۸۶ء کے نفاذ کے بعد بھی اپنے سابق شوہر سے دفعہ ۱۲۵ ضابطہ فوجداری کے تحت نفقہ پانے کی مستحق ہوگی۔

(۲) آیا نفقہ جس کا تذکرہ ایکٹ ۱۹۸۶ء کے دفعہ (۳) ضمن (۱) (الف۔ B) میں کیا گیا ہے رف عدت کی مدت تک ہی محدود ہے۔ آئندہ (بعد ختم مدت عدت) بھی وہ معقول اور مناسب وقہ پانے کی مستحق رہے گی؟

(۳) آیا حقوق مسلم مطلقہ ایکٹ ۱۹۸۶ء کے نفاذ کے بعد بھی نفقہ مطلقہ کے سلسلے میں دفعات ۱۲۵ تا ۱۲۸ ضابطہ فوجداری ہند نافذ العمل رہیں گے اور وہ تمام مقدمات جو عدالتوں میں زیر دوران ان کے تصفیہ کا کیا طریقہ کار ہوگا؟ جسٹس سردار علی خاں نے امور مندرجہ بالا کی یکسوئی کے سلسلے فتاوا عالمگیری۔ ہدایہ۔ پریوی کونسل۔ سپریم کورٹ اور دیگر ہائی کورٹس کے فیصلوں اور مستند قانونی بوں کے حوالوں کی روشنی میں سیر حاصل مباحث کے بعد نہایت جامع بسیط اور مدلل فیصلہ لکھا۔ اس لے کا تفصیلی طور پر اس نوعیت کے مضمون میں احاطہ کرنا ممکن نہیں۔ اس لئے اس فیصلے کے اہم ماخال اور مضمرات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گا۔

یہ فیصلہ نہ صرف شریعت کی پذیرائی کا طالب ہے بلکہ ملک کی تمام عدالتوں کے لئے مشعل راہ بی بن سکتا ہے جہاں تک سوال (۱) کے جواب کا تعلق ہے فاضل جج نے اپنی رائے کا اظہار کیا کہ خواہ شیعہ ہو کہ سنی کوئی اختلاف رائے نہیں ہے کہ مسلم مطلقہ صرف عدت کی مدت کے حد تک ہی اپنے سابقہ شوہر سے نفقہ پانے کی مستحق ہے اور حقوق مسلم مطلقہ ایکٹ ۱۹۸۶ء بھی اسی اصول کو پیش کرتا ہے کہ سابقہ شوہر کی ذمہ داری مطلقہ کے ادائیگی نفقہ صرف عدت کی مدت تک محدود ہے فاضل جج ایکٹ ۱۹۸۶ء کی دفعات کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے شاہ بانو کے مقدمہ میں سپریم کورٹ کا فیصلہ گجرات، کیرالا اور پٹنہ ہائیکورٹس کے فیصلوں کی روشنی میں واضح طور پر یہ قرار دیا کہ ایکٹ ۱۹۸۶ء نے مسلم مطلقہ

ہند کے تحت اپنے سابقہ شوہر سے نفقہ پانے کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ جہاں تک سوال نمبر (۲) کا تعلق ہے کہ فاضل جج نے نہایت ماہرانہ انداز میں اس کا تجزیہ کیا کہ نفقہ (مناسب اور معقول نفقہ) یہ دونوں علیحدہ علیحدہ معنوں کے حامل نہیں ہیں بلکہ یہ دونوں ہم معنی ہیں اور ان کا اطلاق عدت کی مدت ہی تک محدود ہونے کو واضح کرتے ہیں اور خود سپریم کورٹ نے سورہ البقرہ کی آیت (۲۴۱) متاع اور متاع بالمعروف یعنی نفقہ اور معقول اور مناسب نفقہ کو ہم معنی تسلیم کیا ہے۔ گجرات، کیرالا ہائیکورٹس نے اور خود جسٹس بھاسکر راؤ نے ان دونوں الفاظ کے علیحدہ علیحدہ معنی قرار دیتے ہوئے مسلم مطلقہ کی دفعہ (۳) ضمن (۱) (الف) ایکٹ ۱۹۸۶ء کے تحت عدت کی مدت کے بعد بھی نفقہ پانے کے فیصلوں سے اختلاف کرتے ہوئے ان کو غیر درست قرار دیا ہے اور یہ واضح کیا کہ مسلم پرسنل لا کے رو سے مطلقہ کو عدت کی مدت کے بعد سابقہ شوہر کی جانب سے ادائی نفقہ کی ذمہ داری عائد کرنا جدید ایکٹ کے غرض و معنی کو کالعدم کر دینے کے مترادف قرار دیا مزید اس امر کا اظہار کیا کہ یہ قانون جدید شاہ بانو کے مقدمہ میں سپریم کورٹ کے فیصلے کو بے اثر کرنے کے لئے بنایا گیا تھا کہ اس کو تقویت بخشنے کے لئے۔ اگر فی الوقتی جدید ایکٹ کے نفاذ کے بعد بھی سابقہ شوہر پر نفقہ کے ادائی کی ذمہ داری عائد کرنا اس ایکٹ کے نفاذ کے قطعی منافی اور متاثر ہوگا اور جدید قانون کی غرض و معنی فوت ہو کر رہ جائے گی۔ مزید یہ کہ فاضل جج نے تمام قانون کی مستند کتابوں، پریوی کونسل اور ہائیکورٹس کے فیصلوں کی روشنی میں تفصیلی جائزہ لیتے، یہ مسلمہ اور مفصلہ اصول طے شدہ قرار دیا کہ "وید"، بائیبل اور قرآن جیسی مقدس کتابوں اور ان کی آیات کی تاویلات اور تشریحات عدالتوں کو اپنے طور پر نہیں کرنی چاہیئے بلکہ متعلقہ مذاہب کے مستند مفسرین اور مجتہدین کی مسلمہ تاویلات اور تشریحات جنہیں مستند علماء کی کتابوں میں لکھ دیا گیا ہے۔ عدالتوں کو ان مسلمہ تاویلات و تشریحات کی بنیاد پر فیصلہ کرنا چاہیئے۔ آخر میں فاضل جج نے ان تمام مسلمہ اور متعلقہ اصولوں کی روشنی میں دفعہ (۳) ضمن (۱) (الف) ایکٹ ۱۹۸۶ء کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے یہ قرار دیا کہ نفقہ معقول اور مناسب نفقہ کی فراہمی ایک ہی معنی کے حامل ہیں اور ان کے ادائی کی ذمہ داری سابق شوہر پر عدت کی مدت تک ہی محدود ہے اور عدت کے مدت کے بعد مسلم مطلقہ کو نفقہ کی ادائی کی ذمہ داری سابق شوہر پر عائد کرنا غیر

ہے اور نہ مناسب۔ جہاں تک تیسرے سوال کے جواب کا تعلق ہے فاضل جج نے اپنے فیصلہ میں بہت ہی
معقول اور مدلل وجوہ کا اظہار کرتے ہوئے یہ قرار دیا کہ جدید ایکٹ ۱۹۸۶ء کے نفاذ کے بعد دفعات
۱۲۵ تا ۱۲۸ ضابطہ فوجداری ہند کا اطلاق مسلم مطلقہ کے نفقہ کے مسئلہ پر نہیں ہو سکتا بجز اس کے کہ خود
فریقین جدید قانون کی دفعہ (۵) کے تحت بذریعہ حلف نامہ ان دفعات کے تحت تصفیہ کی خواہش نہ کریں
ماحصل اس فیصلہ کا لب ولباب یہ ہے کہ جدید ایکٹ ۱۹۸۶ء کے نفاذ کے بعد مسلم مطلقہ نہ دفعہ ۱۲۵
ضابطہ فوجداری ہند کے تحت دعویٰ کر سکتی ہے اور قانون مذکور کے دفعہ (۳) ضمن (۱) (الف) کے تحت عدت
مدت کے بعد نفقہ یا مناسب یا معقول معاوضہ پانے کا حق رکھتی ہے مزید یہ کہ فاضل ججوں نے یہ بھی
طے فرمایا کہ ایکٹ ۱۹۸۶ء کے تحت اس کے نفاذ کے بعد دفعات ۱۲۵ تا ۱۲۸ ضابطہ فوجداری ہند مسلم
مطلقہ کے نفقہ کے متعلق سے ناقابل نفاذ قرار پاتے ہیں بجز اس کے کہ فریقین خود دفعہ ۵ قانون جدید کے تحت
ان دفعات کے تحت اطلاق کی خواہش نہ کریں۔ مسلم پرسنل لا کی تاریخ میں یہ ایک عہد ساز فیصلہ ہے یہ فیصلہ اپنی
نوعیت میں کافی اہمیت وافادیت اور نہایت دوررس نتائج کا حامل ہے۔ یہ فیصلہ نہ صرف مسلم مطلقہ سے
متعلق اختلافی فیصلوں کی وجہ سے جو غیر یقینی صورت پیدا ہو گئی تھی اس کا ازالہ کرتا ہے بلکہ عدالتوں کو ایک
بھولا سبق یاد دلاتا ہے۔ اس لئے کہ یہ فیصلہ ان اصولوں کی طرف رہنمائی کرتا ہے کہ عدالتوں کو فقہی اور
مذہبی کتابوں کی آیات کی خود ساختہ بنیاد بنا کر تاویل نہیں کرنی چاہیئے بلکہ مستند و مجتہدین کی تاویلات و
تشریحات جو مستند کتابوں میں لکھی ہوئی ہیں ان کو اپنے فیصلوں کی بنیاد بنانا چاہیئے۔ میری ناچیز دانست
میں شاہ بانو کے مشہور و معروف مقدمہ میں سپریم کورٹ کے سامنے ان اصولوں اور نکتوں کو پیش کیا جاتا
تو اس فیصلہ کی نوعیت کچھ اور ہی ہوتی۔ اس فیصلہ کی اہمیت بالخصوص یوں بھی بڑھ جاتی ہے کہ سپریم کورٹ
میں کوئی ۶ رٹ کی درخواستیں مسماۃ [illegible] اور دیگر خواتین و اشخاص کی جانب سے دائر کر رکھی ہوئی
ہیں جن میں مسلم پرسنل لا اور خود قرآنی آیات کو چیلنج کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ مختلف مقدمات میں اس امر کا قوی احتمال
ہے کہ کہیں غلط اور غیر صحیح تاویلات و تشریحات کر کے مسلم پرسنل لا کی بنیادیں ہلا دی جائیں۔ ان [illegible]
کو روکنے کے لئے یہ فیصلہ ایک [illegible] کا کام کر سکتا ہے۔ [illegible] کے لئے [illegible]

(باقی صفحہ پر)

بدر رشاد الدوحی
عربی سے ترجمہ: انظار احمد قاسمی

کینیا میں اسلام اور مسلمان

کینیا مشرقی افریقہ کا ایک ملک ہے جو ۱۳۸۳ ہجری مطابق ۱۹۶۳ء میں آزاد ہوا۔ آزادی ملنے کے دوسرے سال اس کے جمہوری مملکت ہونے کا اعلان کیا گیا۔ ۱۳۰۵ھ موافق ۱۸۸۸ء میں مشرقی افریقہ کی تقسیم پر انعہ جرمن معاہدہ پر دستخط کے بعد برطانیہ نے آل سعید کی حکومت کا خاتمہ کر کے کینیا اور صومالی کے بڑے حصہ پر اقتدار قائم کر لیا جبکہ ادھر جرمن نے جنوبی حصہ یعنی تنگا نیقا (موجودہ تنزانیہ) پر قبضہ جما لیا۔

مغربی افریقہ میں برطانوی کمپنی کے پس پردہ برطانوی اقتدار کا خفیہ آغاز ہوا جو اس تاریخ سے پہلے ہی اپنا کام شروع کر چکی تھی مشرقی افریقہ کے جائز حکمران سلطان زنجبار کے ساتھ معاہدہ سے برطانوی کمپنی کی کوششیں نتیجہ خیز ثابت ہوئیں ۱۳۰۵ھ بموجب ۱۸۸۷ء میں ایک معاہدہ ہوا جس کی رو سے برطانوی کمپنی کو سلطان زنجبار کو اپنی آمدنی کا معین فیصد منافع ادا کرنا ضروری قرار دیا گیا۔

برطانیہ اور جرمن سامراج کے درمیان اثر و رسوخ والے علاقے متعین کر لئے گئے۔ اور دونوں کے مابین شمالی شہر بتھانی جو بحر ہند کے ساحل سے ملا ہوا ہے سے شہر شیراتی۔ جو بحیرہ توریا پر آباد ہے تک امتیازی لکیر کھینچ دی گئی بشمول صومال مذکورہ خط فاصل تک کے واقع علاقے میں برطانوی کمپنی کام کرنے لگی۔ اس کے بعد کمپنی حکومت برطانیہ کے حق میں حکومت سے سبکدوش ہو گئی۔ اس طرح سے سامراجیت کا انتہا یعنی مشرقی افریقہ میں برطانوی سامراج کا

نظام قائم ہوا۔ اور اس وقت سے آزادی ملنے تک کینیا پر برطانیہ کی سامراجیت برقرار رہی۔
کینیا براعظم افریقہ کے شمال میں ہے اس کے بیچ سے خط استوا گذرتا ہے اس کے شمال میں ایتھوپیا، شمال مشرقی میں صومال، جنوب میں تنزانیہ، مغرب میں یوگینڈا اور مشرق میں بحر ہند ہے کینیا کا رقبہ تقریباً ۲۴۳۶۷۰ کلو میٹر مربع ہے جو ساحلی جزیروں سے شروع ہوتا ہے یہاں سرسبز جنگلات پیدا ہوتے ہیں اس کے بعد ساحلی میدان شمال سے لے کر جنوب تک پھیلا ہوا ہے اور اندر دور تک چلا گیا ہے جو کینیا کے زیادہ تر رقبے پر مشتمل ہے۔

جمہوریہ کینیا کی آبادی ۳۲۷۰۰۰۰ کے قریب قریب ہے اس کا دارالحکومت نیروبی ہے جس کی آبادی پانچ لاکھ کے لگ بھگ ہے نیروبی کے بعد دوسرا شہر ممباسہ ہے اور اس کی آبادی پون لاکھ سے زیادہ ہے بھرتا کورو اور کیسومو ایسے شہر ہیں، مالندی کینیا کے زیر اثر حکومت ہے کینیا کی کل آبادی ۱۰۳۲۷۰۰۰ تک پہنچ گئی ہے ان میں بھاری اکثریت افریقی افراد قوم کی ہے جو کم و بیش ۱۱۲۰۰۰ اور ۱۵ کی تعداد میں ہیں ان افریقی عناصر کی ترکیب میں مختلف قبائل النیلیۃ النیا نتویا الحامیین شامل ہیں اور تقریباً چالیس قبائل سے مل کر اس کی تعمیر ہوئی ہے جن میں سب سے نمایاں قبیلہ الکیکویو ہے جن کی تعداد بیس لاکھ کے قریب پہونچتی ہے اس کے علاوہ چند اور ممتاز قبائل کے نام یہ ہیں والود، والکامبا، والکیس، وامیرو، والترکانا والتاندی اور الماسائی چالیس ہزار کے قریب عرب، ایشیا برادری کے لوگ آباد ہیں۔ ہندوستانی، پاکستانی اور ایرانی بھی ہیں ایشیائی باشندے ساٹھ ہزار کے قریب ہیں یورپی برادری کے لوگ چالیس ہزار ہیں۔

مشرقی کینیا کے دور دراز میں "الجلا" اور صومالی آبادی ہے عرب بلاک ممباسا، مالندی
۲ باشا اور مولا ایسے شہروں میں ساحلی پٹی پر رہائش پذیر ہے ایشیائی افراد تجارت پیشہ ہیں اور اس غرض سے کینیا میں ان کی آمد و رفت ہوتی ہے جو اسلامی دعوت کے لئے سود مند ہے۔
کا اشتکاری کینیا کی معیشت زندگی میں مشترک کا درجہ رکھتی ہے آدمی سے زیادہ آبادی

کاشتکار ہے۔ کاشتکاری کا سارا انحصار نہر اور بارش کے پانی پر ہے۔ ثقافتی پیداوار کی کھیتی ہوتی ہے نیز کافی چائے، گنا، روئی اور سیسل کی کاشت ہوتی ہے بجلی کے چند پراجکٹ کے سنگ بنیاد رکھنے کے بعد کھیتی کی ترقی شروع ہو گئی ہے۔

اسلام کی آمد: اس خطے میں اسلام کی آمد پہلی صدی ہجری کی آخری دہائی ایک انوکھے ڈھنگ سے شروع ہوئی اور یہ عجب کی بات ہے کہ چند عرب ملاح جہاز رانوں نے مشرقی افریقہ کے ساحل پر وقتاً فوقتاً اپنے تجارتی مراکز بنائے پھر جب آخری اموی دور میں اختلافات عام ہو گئے تو اس ساحل کی طرف آبادی ہجرتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ۷۷ء تک ہجرتوں کی خبروں کا تذکرہ ملتا ہے استاد مستشرق نے شیخ فرج بن حمد البا قری کی کتاب "اخبار لامو" کی دریافت کے بعد اس پر روشنی ڈالی ہے شیخ فرج نے اس کتاب میں اس شہر اور ساحل کی طرف ہوتے والی اسلامی انتقال آبادی کا ذکر کیا ہے شہر لامو، ممباسا سے شمال کی طرف کینی ساحل پر آباد ہے، پہلی انتقال مکانی، شام کے مسلمانوں کی جب ان کے اور حجاج بن یوسف کے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے۔ دوسرا نقل وطن، اہل عمان نے کیا جن میں سلیمان اور سعید بھی شامل تھے جو عباد الجلندی کے چشم و چراغ تھے، عبدالملک بن مروان سے اختلاف کے بعد انہوں نے ترک وطن کیا اور اس طرح سے لامو میں۔ جو شہر ممباسا کے شمال میں ہے اسلامی حکومت معرض ظہور میں آئی۔

اس کے بعد بر الزنج۔ جس کو عرب مشرقی افریقہ کے ساحل کو کہتے ہیں کی طرف دوسری ہجرت ہوئی یہ نقل مکانی سالاھ مطابق ۷۲۹ء میں ہوئی اور تارکین وطن شہر شنیا یا میں جاکر آباد ہو گئے اور ایک نئی اسلامی حکومت قائم ہو گئی۔

سن ۸۰ھ مطابق سن ۹۱۲ء میں "الاحساء" سے "بر الزنج" کی طرف انتقال مکانی ہوئی تارکین وطن نے یہاں چند شہر بسائے جن میں بحر یحیٰ، "پطا"، "انزیا" اور اوزی و شاکہ کا نام آتا ہے مالہ [illegible] کے دو شہر [illegible] کے [illegible] کے قریب [illegible] شیراز سے بھی ہجرتیں ہوئیں جن کا تذکرہ [illegible]

الزبیری الدکتور جابر نے اپنی کتاب "اسلامی تاریخ کلوا" میں کہا ہے اس بارے میں تارکین وطن نے
کئی ایک اسلامی شہر مشرقی افریقہ کے ساحل پر بسائے جن میں "کاسو" اور "کلوا" کا نام آتا ہے
اس دور کی تعمیر شدہ ایک مسجد کے آثار اب بھی موجود ہیں اس طرح سے ہجرتوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا
رہا۔ چنانچہ بنو نبہان نے عمان سے شہر پاتا کی طرف نقل وطن کیا جو کینیا میں شہر لامو کے شمال میں واقع
ہے یہ ہجرت سنہ [illegible]ھ بمطابق سنہ ۱۲۳۳ء میں ہوئی۔ اور مشرقی افریقہ میں بنو نبہان کی حکومت بنی اس
طرح سے مشرقی افریقہ یا بر الزنج کے ساحلوں پر اسلامی حکومتیں قائم ہوئیں۔ افریقی، شیرازی
اور عرب مسلمانوں کی مخلوط آبادی کو سواحلیوں کے نام سے جانا جاتا ہے اس کے بعد ہی سواحلی زبان وجود
میں آئی اور عربی زبان سے اس کے قواعد بنائے گئے ــــ یہ قدرتی بات تھی کہ تجارت میں مسلمانوں کی
دوڑ دھوپ سے اسلامی دعوت مشرقی افریقہ کے ساحل سے لیکر کینیا کے اندرون تک پھیل جائے۔
سولہویں صدی عیسوی میں عرب حکومتوں کو صلیبی جنگ کا سامنا کرنا پڑا۔ پرتگالیوں سے راس
الرجاء الصالح کے دریافت کے بعد یہ صلیبی جنگ لڑی۔ اسلام کے خلاف لڑی جانے والی اس
جنگ میں اہالی حبشہ نے پرتگالیوں کا ساتھ دیا۔ پرتگالیوں نے "زیلع" شہر کو تباہ و برباد کر دیا۔
"بربرہ" پر حملہ آور ہوئے اور خونریز جنگ ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ انھوں نے لامو اور پاتا جیسے شہروں
کو نذر آتش کر دیا۔ بوڑھے، بچے اور عورتوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ یہ مذکورہ بالا تینوں
شہر کینیا کے شہر ہیں آبادیں مشرقی افریقہ میں پرتگالیوں نے صلیبی جنگ لڑی جو دو صدیوں تک
جاری رہی۔ آل ابوسعید کی قیادت میں عمانیوں نے جزیرہ نمائے عرب کے ساحل سے پرتگالیوں
کو نکال باہر کیا۔ اس کے بعد عمانی قوت افریقہ کے ساحل پر مضبوط ہو گئی یہاں تک کہ عمانیوں نے
پرتگالیوں کے اقتدار اور اثر و رسوخ کا مشرقی افریقہ سے خاتمہ کر دیا اور پھر اس ساحل پر اسلامی حکومت
کی گرفت مضبوط ہو گئی اور اس کی طرف بہت سی ہجرتیں ہوئیں اور مشرقی افریقہ اور جزیرہ نمائے
عرب کے مابین ثقافتی تعلقات کی ابتداء ہوئی جن پر دین کا چھاپ تھا عرب اسلامی شہروں میں
تبلیغی وفود روانہ کیے گئے۔ مشرقی افریقہ کے فرزندگان اسلامی اصول اور تعلیمات حاصل کر

اپنے اپنے وطن واپس آئے اور قبائل میں پہونچے۔ افریقہ کے ساحل پر لامو، ممباسا اور ٹانگا ایسے اسلامی شہر معرض وجود میں آئے جو اسلامی دعوت کی اشاعت کے مرکز بنے۔ یہ فطری بات تھی کہ اسلام ساحل سے میدانی علاقوں کے اندرون تک پھیل جائے۔ چنانچہ کینیا، تنجانیقا، موزامبیق، یوگنڈا اور زائرے کے اندرون تک اسلام پہونچا۔ اندرون علاقہ اور ساحل کے درمیان تجارت کو خوب عروج حاصل ہوا اور تجارت کے ساتھ ساتھ اسلام مشرقی افریقہ میں بھی پھیلنے لگا۔ کینیا کے اندرون میں کیتو، سابی اور ممباس ایسے تجارتی مراکز قائم ہوئے جبکہ ادھر تنجانیقا میں تابورہ اور اجیجی ایسے مراکز بنے۔ عرب اور سواحلیوں نے اندرونی منطقے میں کینیا کو استحکام امن کے مراکز بنائے اور ایک دوسرے طریقے سے اسلام کینیا میں پہونچا جہاں صومالی قبائل اس کے سہارا بنے۔ چنانچہ صومالیوں کے واسطے سے شمالی کینیا تک اسلام کی رسائی ہوئی اور وہاں کے مقیم قبائل کے درمیان اسلام پھیلا۔ اشاعت اسلام کے بعد زنجبار سے مشرقی افریقہ کے اندرون تک آل سعید کی اسلامی حکومت کا اثر و رسوخ دراز ہوگیا۔

اس طرح مشرقی افریقہ کے ساحل میں اسلام کی اشاعت ہوئی اور اس کے اندرون تک اسلام پہونچا۔ یہاں تک کہ "الکنغو" (موجودہ زائرے) تک اس کی رسائی ہوئی۔ جب انگریز جرمن سامراج اس خطہ پر اپنا اقتدار قائم کر چکے تو اس سے اسلامی دعوت کی اشاعت کی راہ میں رکاوٹ پیدا ہوئی۔ عیسائی تبلیغی وفود کی ہمت افزائی کی گئی۔ لہذا یہ فطری امر تھا کہ مسلمان عیسائی استعمار کے اقتدار کا مقابلہ کریں۔ چنانچہ کینیا میں بغاوتیں پھوٹ پڑیں جن میں ۱۸۹۰ء میں وٹیو اور ۱۸۹۵ء میں المازوری میں بغاوتیں ہوئیں اور اس طرح کینیا کے ساحل میں بغاوتیں پھیل گئیں۔

موجودہ مسلمان: کینیا کی موجودہ آبادی میں مسلم باشندگان کا تناسب ۳۵ فیصد ہے جو باشا، لامو، مالندی، ممباسا ایسے ساحلی شہروں نیز اندرون کینیا، نیروبی اور ان کے مضافات میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اسی طرح صومالی اور بوران ایسے سرحدات سے متصل کئی قبائل ہیں۔ آبادی میں ہندوستانی، پاکستانی اور ایرانی مسلم لوگ کے علاوہ ہیں۔ اسلام اپنا اثر اور [illegible]

ایسے افریقی برادری میں پھیل رہا ہے جو کینیا میں سب سے بھاری اکثریت میں آباد ہیں۔ اسی طرح سومالی افراد قوم میں اسلام کی اشاعت ہو رہی ہے جو مشرقی کینیا کے شمال میں سکونت پذیر ہیں۔

اسلامی ادارے: کینیا میں مسلمانوں کے پچاس سے زائد ادارے اور انجمنیں قائم ہیں۔ ان میں چند انجمنوں کے نام حسب ذیل ہیں۔ (۱) الجمعیۃ الخیریۃ الاسلامیہ (۲) الاتحاد الوطنی للمسلمین (۳) جمعیۃ الشبان المسلمین فی نیروبی (۴) جمعیۃ الاخوۃ الاسلامیہ (۶) الجمعیۃ الصومالیہ ۔ متذکرہ بالا تمام انجمنیں "المجلس الاعلیٰ لمسلمی کینیا" کے زیر نگرانی ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان اداروں اور انجمنوں کی کوششیں متحد ہوں، سامراجی حکومت کی وجہ سے ثقافتی اور اقتصادی میدانوں میں مسلمانوں کے لئے مشکلات پیدا ہو گئیں تھیں۔ اور اس کی وجہ سے کینیا میں اسلامی تعلیم کا زور ماند پڑ گیا، عیسائی تبلیغی مشنریوں کے تبلیغی مقابلہ کو للکارنے کے لئے جوش و خروش چاہیئے۔ وہ پیدا نہیں ہو سکا۔ کینیا کی آدھی آبادی اب بھی بت پرست ہے اس لئے اسلامی دعوت کی اشاعت کا میدان کینیا میں کشادہ ہے۔

تعلیم:۔ یورپی سامراج کے تسلط سے پہلے مشرقی آفریقہ کے خطے میں اسلامی تعلیم کا چلن تھا اور خالص اسلامی تعلیم دی جاتی تھی جو دو مراحل میں منقسم تھے ابتدائی مرحلے میں مسلمان بچوں کو قرآن کریم کی تعلیم مکاتب میں دی جاتی تھی اور اس کا ذریعہ عربی زبان ہوتی دوسرے مرحلے میں اعلیٰ تعلیم دی جاتی جس میں فقہ، حدیث اور تفسیر کی پڑھائی شامل تھی اس کے لئے مساجد کو درس گاہ کے طور پہ استعمال میں لیا جاتا تھا جہاں اسباق کے حلقے لگتے تھے۔

جب برطانیہ نے کینیا پر قبضہ جما لیا تو پھر روایتی تعلیم کا نظریہ بدلنے لگا۔ سامراجی حکام، مشنری درس گاہ کے پڑھے لکھے طلبا کو سرکاری ملازمتوں پہ بحال کرنے لگے اور دلیل میں یہ بات پیش کی جاتی کہ انہوں نے کچھ یورپی تعلیم حاصل کی ہے ادھر مسلمانوں نے اپنے بچوں کو مشنری درس گاہوں میں داخل کرانے سے انکار کر دیا اور دینی درس گاہ کے نصاب تعلیم میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں لائے۔ لہذا سرکاری ملازمتیں غیر مسلموں کے لئے مختص ہو کر رہ گئیں اس طرح سے مشنری درس گاہ کے طلبا اقتدار پہ آنے لگے

عیسائی مشنریاں تعلیم کی نگراں بنی رہیں۔

۱۹۶۱ء کے بعد جب وزارت تعلیم برسر اقتدار جماعت کو تفویض کر دی گئی اس کے باوجود ان کی طرف سے مسلم بچوں کو اس نوعیت کی تعلیم کی طرف لانے کی کوششیں بہت کم ہو پائیں۔ دوسری طرف مسلمان سرکاری درسگاہوں کا مقاطعہ کرتے رہے جس کی وجہ سے اسلامی علوم اور عربی زبان سرکاری درسگاہوں کے نصاب تعلیم میں شامل نہ ہو سکی اور نہ حکومت وقت کو اس سے کوئی دلچسپی رہی کہ دینی درسگاہوں کے نصاب تعلیم میں تبدیلی لائے اور مسلمانوں سے بھی یہ نہ ہو سکا کہ دینی علوم اور عربی زبان سرکاری درسگاہوں کے نصاب تعلیم میں شامل کرائیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان عصری علوم اور اقتدار سے محروم ہو گئے۔ اس بگڑی صورتحال کی درستی کے لئے ضرورت اس بات کی تھی کہ اصلاحی تحریکات وجود میں آئیں چنانچہ جس طرح اسلامی دنیا کے مختلف گوشوں سے جمال الدین افغانی، شیخ محمد عبدہ اور رشید رضا ایسے متعدد اصلاح کار شخصیتیں ابھریں وہیں کینیا میں شیخ الامین بن علی المازروی کی شخصیت نمودار ہوئی۔ جنھوں نے عربی اور سواحلی دونوں زبانوں میں جریدہ نکالنا شروع کیا۔ یہ جریدہ کینیا میں مختلف میدانوں میں مسلمانوں کے اصلاح احوال کے سلسلے میں کی جانے والی کوششوں کا ترجمان رہا۔ شیخ الامین نے مسلمانوں سے اس بات کی اپیل کی کہ وہ اپنے بچوں کو دینی اور دنیوی تعلیم کے لئے غیر سرکاری درسگاہیں تعمیر کریں اور اتحاد و یکجہتی پیدا کریں۔ انہوں نے مسلمانوں کے اندر یہ شعور پیدا کیا کہ وہ اپنے آپ کو اسلامی دنیا کا ایک حصہ تصور کریں۔ اسلام کا یہ داعی سخت ترین حالات میں کام کرتا رہا ادھر عیسائیوں کی تبلیغی سرگرمی اور مشنری ملکاروں کی وجہ سے ان کی تحریک کی راہ میں رکاوٹیں پیدا ہوتی رہیں جو مسلمانوں کی آپسی گروہ بندی اور لامرکزیت کی وجہ سے بھی ایسا ہوا۔ لیکن شیخ الامین کی قیادت میں چلنے والی یہ تحریک اس کے باوجود اپنے صحیح سمت گامزن رہی۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد مسلمانوں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ "معہد ممباسہ الاسلامی" کے نام سے ایک تعلیمی ادارہ قائم کیا جائے جو اعلیٰ اسلامی درسگاہوں کی تعمیر کے لئے نمونہ اور کینیا میں اسلامی دانشگاہ کے قیام کے لئے بنیاد ثابت ہو لیکن بدقسمتی کہئے کہ اس منصوبہ میں غیر مسلموں کی مداخلت سے یہ ادارہ

اپنے مقصد سے منحرف ہوگیا اور اس نے بالآخر تمام عناصر کے لئے اپنے تعلیمی ادارے کھول دیئے جو اسلامی ادارہ کی بجائے فنی ادارہ میں بدل گیا اور اعلیٰ اسلامی تعلیم کی تحصیل کا منصوبہ خاک میں مل گیا۔ اس طرح سے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کی راہ مسدود کرنے میں عیسائی سازشیں کامیاب ہوگئیں تاکہ عیسائی تہذیب کی جڑیں کینیا کی سرزمین میں گہری کی جاسکیں۔ مشرقی افریقہ کے مسلمان برابر اس بات کی منصوبہ بندی کر رہے ہیں کہ عصری اور اسلامی علوم کے امتزاج سے مناسب تعلیم کا مسلمانوں کے لئے بندوبست کیا جائے چنانچہ انہوں نے شہر "شیلو" میں ایک عربی مدرسہ کی بنیاد رکھی جہاں بیس سالوں سے عربی زبان اور دینی علوم کی پڑھائی ہوتی ہے اور اس کا سلسلہ انہیں کی کوششوں سے کینیا کے مختلف گوشوں میں چالیس کے قریب اس کی شاخ درسگاہیں وجود میں آچکی ہیں لیکن ضرورت اس کی ہے کہ نصاب تعلیم میں تبدیلی لائی جائے اور ادارہ کا مالی تعاون کیا جائے۔

نیروبی میں اسلامی ادارے — ۱۳۸۳ھ مطابق ۱۹۶۳ء میں چند صاحب ایمان لوگوں کی کوششوں سے "المؤسسۃ الاسلامیہ فی نیروبی" کا قیام عمل میں آیا۔ اس کی سرگرمیاں مختلف محاذوں پر جاری ہیں۔ خطبات اور کتابوں کی اشاعت سے اسلامی دعوت نشر، نصاب تعلیم کی ترتیب اور عصری دینی درسگاہوں کے قیام سے تعلیم و تربیت کا کام انجام دیا جا رہا ہے تعلیم و تربیت کی غرض سے کئی ایک "دار تحفیظ القرآن" تعمیر کئے گئے۔ فی الحال منصوبہ یہ ہے کہ "مجمع تعلیمی فی نیروبی" کا قیام ہو جس میں ابتدائی ثانوی درسگاہ، ثانوی دینی ادارہ اور نرسری گاہ، لڑکیوں کی تعلیم کے لئے مدرسۃ البنات، شفاخانے، اساتذہ کا تربیتی ادارہ اور مرکز التفلاح للدعوۃ الاسلامیہ فی نیروبی کی تعمیرات شامل ہیں اس کے علاوہ کینیا کے گوشوں میں کئی ایک اسلامی مراکز کے قیام کا منصوبہ ہے۔ (التضامن الاسلامی رجب ۱۴۱۰ھ)

(سلسلہ ص ... سے آگے)

ہوگا۔ تاریخ ہمیں کبھی معاف نہیں کرسکے گی۔ اگر یہ سماجی تبدیلیاں ہمارے اہل وطن کو اقتدار عدم مساوات کی حالت میں چھوڑ دیں جہاں ایک استبداد دوسرے کے لئے ایک اجارہ داری، دوسرے کے لئے اور ایک حکمران گروہ دوسرے حکمران گروہ کے لئے ستم ظریفی کرتا ہے۔

آر۔ این۔ اے

بلغاریہ میں مسلمان

رابطہ عالم اسلامی کے سکریٹری جنرل ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف کی دعوت پر بلغاریہ کے مفتی اعظم شیخ ندیم حافظ ابراہیم نے گزشتہ دنوں سعودی عرب کا دورہ کیا اور رابطہ کے اعلیٰ ذمہ داروں سے ملاقات کی۔ ملاقات کے دوران مفتی موصوف نے بلغاریہ میں حالیہ انقلاب کے بعد پیدا ہونے والی صورتحال پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ اب وہاں کے مسلمانوں کی صورتحال اطمینان بخش ہے اور لگتا ہے کہ عقیدہ اور دین سے متعلق ان کے مصائب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ ملک میں ایک ہزار مسجدیں مسلمانوں کے لئے کھول دی گئی ہیں اور میں نے ائمہ مساجد کو ہدایات جاری کی ہیں کہ وہ مسجدوں میں دینی مکاتب اور حفظ قرآن کے مدرسے قائم کریں۔ یہ ہدایات بلغاری مسلمانوں میں پائے جانے والے عام رجحان کے پیش نظر جاری کی گئی ہیں۔

انہوں نے رابطہ عالم اسلامی کے ذمہ داروں کو بلغاریہ کی نئی حکومت کی جانب سے پاس ہونے والی اس قرارداد کے مضمون سے بھی آگاہ کیا جو مارچ کے اواخر میں نافذ کی گئی ہے اور جس کی رو سے مسلمانوں کو مذہبی رسومات کی ادائیگی، مسجدوں میں نماز پڑھنے، دینی مدارس قائم کرنے اور اسلامی نام رکھنے کا حق تسلیم کیا گیا ہے انہوں نے کہا کہ بلغاریہ کے مسلمان سابقہ حکومت کے عہد میں جن مصائب سے دوچار ہوئے ہیں وہ انشاء اللہ کبھی نہیں آئیں گے۔ انہوں نے بتایا کہ ... فیا میں ایک دینی مدرسہ اور سنٹر قائم کرنے کا منصوبہ جلد نافذ کیا جائے گا جس کی شاخیں ملک کے مختلف حصوں میں قائم کی جائیں گی۔ یہ مدرسہ سردست ابتدائی اسلامی تعلیم کے لئے قائم ہوگا اور

پڑ ں میں مرحلہ وار اعلی اسلامی تعلیم کے شعبے قائم کئے جائیں گے۔

مفتی موصوف نے بتایا کہ اس وقت بلغاریہ کے مسلمانوں کو جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ اسلامی اور دینی علوم کی تعلیم کا بندوبست ہے انہوں نے بتایا کہ ان کا دارالافتاء ملک میں اسلامی مدارس کے قیام کا ایک جامع منصوبہ تیار کر رہا ہے۔ اس موقع پر انہوں نے عالم اسلامی کے فضلاء اور اسلامی تنظیموں کے نمائندوں سے اپیل کی کہ وہ بلغاریہ کے مسلمانوں کے لئے وقت نکالیں کیونکہ سابقہ حکومت کے عہد میں مسلسل چالیس سال کی پابندی کے باعث وہاں دینی معلموں اور اساتذہ کی قابل افسوس حد تک کمی ہے۔

انہوں نے کہا کہ مجھے توقع ہے کہ رابطہ عالم اسلام بلغاریہ کے دینی علوم حاصل کرنے والے طلباء کے لئے وظائف جاری کرے گا جس سے ان کی حوصلہ افزائی ہوگی۔ انہوں نے رابطہ کے اس دینی اور علمی تعاون و امداد کا شکریہ ادا کیا جو اس نے حال ہی میں کیا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ رابطہ نے بلغاریہ کے مسلمانوں کو قرآن کریم کے پانچ ہزار نسخے، دس ہزار عم کے پارے اور ترکی زبان میں ترجمہ شدہ قرآن کریم کے ایک ہزار نسخے اور ترکی زبان میں دینی کتابوں کا ہدیہ پیش کیا ہے۔ انہوں نے وضاحت کی کہ اب تک بلغاریہ سے چار پانچ سے زیادہ افراد حج کے لئے نہیں آپاتے تھے مگر آئندہ حج کے دوران تقریباً تیس آدمی فریضہ حج ادا کریں گے اور آئندہ سالوں میں یہ تعداد بڑھتی جائے گی انہوں نے مزید بتایا کہ رابطہ عالم اسلامی نے اپنے خرچ پر بلغاریہ کے کچھ مسلمانوں کو حج کی دعوت دینے کا خیال ظاہر کیا ہے۔

انہوں نے بتایا کہ آئندہ سالوں میں ان شاء اللہ بلغاریہ کے مسلمانوں کی اقتصادی حالت میں بھی بہتری آئے گی کیونکہ حکومت نے مسلمانوں کو ذاتی ملکیت اور تجارتی سرگرمیوں میں بھی حصہ لینے کی اجازت دے دی ہے۔ سابقہ حکومت کے عہد میں مسلمان اس حق سے محروم تھے۔

اس موقع پر مفتی بلغاریہ نے مسجدوں کے لئے امداد اور قالینوں کی فراہمی کے لئے رابطہ عالم اسلامی کا بھی شکریہ ادا کیا جنہوں نے ان کی حقوق کی بازیابی کے لئے کوششیں کی تھیں ▬▬

مولانا محمد اعزاز علی
استاذ فقہ و ادب دارالعلوم دیوبند
ترجمہ ۔ محمد نعیم اختر

عربی ادب کی اہمیت اور ضرورت

بلاشبہ اسلامی علوم کے خزانے ضائع ہو گئے، اس کے گنجینے خالی ہو گئے۔ اب کیا رہا اس کے نیچے کچھ نقوش اور اس کی داستانِ پارینہ ادبی علوم کا قصہ کیا سنایا جائے۔ اس کا تو ایسا جنازہ بھائیوں نے نکالا کہ شعرائے اس پہ مرثیے پڑھے اور رنجور دلوں نے اس پر آنسو بہائے۔ ہندوستانی مسلمانوں کے پاس آج صرف ادب کا نام ہے ٹھیک اسی طرح جیسے صدیوں پہلے قوم عاد و ثمود کی تباہی کے بعد ان کے مکانات مٹ گئے اور نشان ہی نشان رہ گیا۔ آج مدارس کے طلبا پر ایک نظر ڈالیے، اپنی عمر کا عزیز ترین حصہ معقولات اور منقولات کی درسی کتابوں کے پڑھنے میں صرف کر دیتے ہیں اور اس کے بعد مسند درس پر بیٹھتے ہیں لیکن انھیں کیونکر فائدہ ہو سکتا ہے۔ زندگی کے بیش قیمت اوقات تو صرف و نحو جیسے علوم کے حصول میں صرف کر دیتے ہیں اور اس کے لیے مشقوں کی پر پیچ اور دشوار گذار وادیوں سے گذرتے ہیں۔ صرف و نحو کی بیشتر کتابیں قرآن کی طرح حفظ کر لیتے ہیں لیکن صرف و نحو کا مقصد انھیں حاصل نہیں ہوتا۔ ان دونوں فنون کا مقصد تو یہ تھا کہ ان کا پڑھنے والا عربی کلمات کے اشتقاق سے واقف ہو، جملوں کی ترکیبیں جانتا ہو، صحیح عربی بولنے پر قادر ہو اور اپنے مافی الضمیر کو اچھے اسلوب و آہنگ سے دوسروں تک منتقل کر سکتا ہو لیکن جب یہ فوائد حاصل نہ ہوئے تو بہ حقیقت گویا صرف و نحو پڑھا ہی نہیں، کسی بھی چیز کا حصول اس وقت سمجھا جاتا ہے جب اس کا مقصود و منتہا پا لیا جائے۔

ان تمام میسر سامانوں کے بعد بھی مقصد کے اندر بے سر و سامانی کی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ

صرف و نحو کی کتابیں پڑھنے کے بعد معقولات اور فقہ و اصول کی تعلیم میں مشغول ہو جاتے ہیں اور زبان کی تعلیم سے بالکل ہی غافل ہو کر اسے پس پشت ڈال دیتے ہیں مدارسِ اسلامیہ ہند کا ایک جائزہ لیجئے دیکھیں گے کہ فلاسفہ و فقہا اور محدثین کے بہترین بہترین جملے وہ سنائیں گے لیکن خود کم از کم ایک جملہ بھی ایسا نہیں بول پائیں گے جن سے ان کے خیالات کا صحیح علم ہو سکے۔ اس میدان میں بالکل گونگے ہوتے ہیں، وہ جملے جو فقہا و محدثین کے نقل کرتے ہیں وہ بھی اساتذہ سے اپنی زبان میں سنے سنائے ہوتے ہیں ورنہ عربی ادب سے محرومی نے کہاں ان کو اس لائق باقی رکھا ہوتا ہے کہ ان سلاطین امت فقہا و محدثین کے مراد و مفہوم کو بھی سمجھ سکیں۔ بعض تو ایسے بھی خوش فہم اور دھوکہ کھائے ہوئے دیکھے جاتے ہیں جنھیں یہ زعم ہونے لگتا ہے کہ وہ اسلامی علوم کے سمندر میں اتر کر معانی کے گوہر نکال لائیں گے، ایسے ہی خوش فہموں کو عربی شاعر نے مخاطب بنایا ہے کہتا ہے۔

جهلت ولا تدری بأنک جاهل
ومن لی بأن تدری بأنک لا تدری

ترجمہ: جانتے نہیں، پر اس کی بھی خبر نہیں کہ نہیں جانتے ہو
کوئی تو ہو جو یہ جانتا ہو کہ وہ نہیں جانتا

خدا اور اس کے رسول ﷺ دونوں کا کلام "عربی مبین" میں ہے حدیث و قرآن کا سمجھنا اسی وقت ممکن ہو سکے گا جب عربوں کے محاورات ان کے ضرب الامثال وغیرہ سے واقفیت ہو۔ استنباط احکام جس کا دوسرا نام فقہ ہے۔ قرآن و حدیث کے ساتھ اس کا وہی مرتبہ و درجہ ہے جو افعال کے اندر پوشیدہ ضمائر کا ہوتا ہے۔

مذکورہ تفصیل سے یہ بات کھل کر ثابت ہو گئی کہ تمام دینی علوم کی کنجی ادب ہے، ادب کے بغیر سارے قفل بند ہیں جسے ادب کا کوئی حصہ نہیں ملا اسے دینی علوم کا کوئی حصہ نہیں ملا۔ سب سے بڑھ کر تعجب کی بات اور مضحکہ خیز امر تو یہ ہے کہ ادب سے سراسر ناواقف اور محروم ہونے کے باوجود بعض یہ کہتے ہیں کہ درسی کتابوں کی تعلیم حاصل کر لینے کے بعد علم ادب نہایت آسان ہو جاتا ہے، میں قسم

لہٰذا کہتا ہوں کہ یہ اندازِ فکر کھلی ہوئی جہالت اور حماقت ہے اس کا اندازہ یوں بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اس سے کسی طالبِ علم کا مطلب پوچھا جائے جو سخت بد اخلاقی ادب کے مطالعہ سے معمولی اسلامی تعلقات رکھتا ہو، وہ کیا بیکار جائیں گے اور شرم سے سر جھک جائے گا۔ اس کے بعد بھی یہ کہنا کہ عربی ادب نہایت آسان چیز ہے کیسی ہے وہ یہ تو نہیں چاہیے کہ خود تو گمراہ ہوئے ہیں دوسروں کو بھی گمراہ کر دیں۔

آخری درجہ شرم اور شناعت کی بات ہے کہ آج عیسائی مذہب کے پیرو ادب عربی کے علوم کی ترویج میں کوشاں ہیں نہایت فصیح عربی بولتے ہیں اور عربی زبان پر ایسی ہی قدرت رکھتے ہیں جیسی انگریزی زبان پر، عربی کے اہلِ قلم اور اچھے مقررین ان میں پائے جاتے ہیں لیکن ہمارے مسلمان ادیب ہی نہیں بلکہ ہمارے مدارس کے مدرسین و اساتذہ کا حال یہ ہے کہ صحیح عربی تک بولنے پر قادر نہیں کس قدر حیرت کی بات ہے کہ انگریزی اسکول کے چھوٹے چھوٹے بچے ایسی روانی اور عمدگی سے انگریزی بولتے ہیں کہ ان پر اہلِ زبان ہونے کا دھوکہ ہونے لگتا ہے لیکن ہمارے لڑکے عربی کی اعلیٰ سے اعلیٰ ڈگریاں حاصل کر لینے کے بعد بھی اپنے خیالات کے اظہار کی بھی قدرت نہیں رکھتے یہ مقامِ حیرت ہی نہیں بلکہ عقل و دانش رکھنے والوں کے لئے گنجینۂ عبرت ہے۔

یہ بات نظر میں رکھنا ضروری ہے کہ ادب کی مثال ایسی ہے جیسی ایک تیز تلوار اگر تلوار بے وقوف اور پاگلوں کے ہاتھ آ گئی تو خود اپنا ہی کام تمام کر لیں گے اور دوسروں کو بھی ختم کر دیں گے لیکن اس کے برعکس اگر مجاہدین و فدایانِ اسلام کے ہاتھوں کی زینت بنی تو وہ اس سے جوہر دکھا کر اللہ کے کلمہ کو بلند کریں گے۔ یہی حال ادب کا ہے اگر گندے اور خبیث طبیعت کے لوگوں نے ادب سیکھا تو وہ سوسائٹی شرفاء پر کیچڑ اچھالنے خواتین اور معزز لوگوں پر حملے کرنے اور آوارہ گردی کی ترغیب دینے کے لئے اسے استعمال کریں گے لیکن اگر پاک طبیعت و پاک نفس لوگوں نے علم ادب حاصل کیا تو وہ قرآن و حدیث کے معانی میں ڈوب کر ایسے خزانے نکالیں گے جن کا انکار دوسروں کے لئے ممکن نہ ہوگا اور دوسروں کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہوں گے۔ آخر میں اللہ تعالیٰ سے یہ دعا ہے کہ علم کو [illegible] میں رد [illegible] ہمارا [illegible] آمین۔

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی

عبدالماجد دریابادی

(مولانا عبدالماجد دریابادی سمینار منعقدہ ۱۹، ۲۰ مارچ ۱۹۹۰ء بمقام لکھنؤ کا
خطبۂ صدارت)

حضرات! مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم سے متعلق اس علمی مجلس کی تنظیم و انعقاد پر میں اُتر پردیش اُردو اکاڈمی کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اور شکریہ بھی ادا کرتا ہوں۔ مولانا مرحوم ہمارے خطۂ اودھ کے باکمال اور نامور فرزند تھے۔ انھوں نے اپنے فکری و فنی کمالات اور ادبی و علمی کارناموں سے نہ صرف یہ کہ اودھ کا نام روشن کیا بلکہ فکر و فن کو نئی جہتوں اور نئی قدروں سے روشناس کرایا اور علم و فضل کی نئی مثال قائم کی، اس عظیم اور نابغۂ روزگار شخصیت کی یاد منانا ہم سب کے ذمہ ایک واجب الاداء قرض تھا اور آج اُتر پردیش اُردو اکاڈمی کی جانب سے یہ تقریب منائی جا رہی ہے تو مجھے اپنی ایک دلی خواہش پوری ہوتی نظر آ رہی ہے۔

اس باوقار علمی تقریب کی صدارت کا شرف مجھ کمزور و ناتواں کو بخشا گیا ہے اس کے لئے میں آپ سب حضرات کا شکر گزار ہوں شاید اس کی وجہ مولانا دریابادی مرحوم کے ساتھ میرے طویل طالب علمانہ اور نیازمندانہ تعلقات ہیں جو نصف صدی کے عرصہ پر پھیلے ہوئے ہیں ۱۹۲۵ء میں "سچ" کے ذریعہ پہلی بار میں مولانا کے نام نامی سے واقف ہوا، لیکن باقاعدہ تعارف ۱۹۲۶ء یا ۱۹۲۸ء میں حاصل ہوا، مولانا اس وقت کہنہ مشق انشاء پرداز، معروف ادیب فلسفی اور مفکر تھے اور میں ۱۲، ۱۳، ۱۴ سال کی عمر کا طالب علم، پھر بھی مولانا نے مجھے جس طرح

اور بھائی صاحب کے تعلق سے بزرگانہ شفقت کے ساتھ ملے، اسی وقت سے مولانا کے ساتھ بزرگانہ اور مشفقانہ اور میرے نیاز مندانہ تعلقات میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔ مولانا دریابادی تصوف و سلوک کے تھپیڑوں سے نکلنے کے بعد مولانا حسین احمد مدنی کے ساتھ تعلق قائم کیا اور وہ جب بھی لکھنؤ تشریف لاتے تو میرے برادر بزرگ ڈاکٹر سید عبد العلی کے پاس قیام فرماتے۔ مولانا دریابادی اپنے شیخ سے ملنے آتے تو اس طرح مجھے بھی ملنے کا موقع ملتا۔ وہ علامہ شبلی اور ندوہ کے دوسرے زعماء اول کے ساتھ خصوصی تعلق اور ندوہ کے مقاصد سے ذہنی و فکری ہم آہنگی کی بنا پر "اعزازی ندوی" تسلیم کئے گئے۔ بعد میں ندوہ کا انتظامیہ کے رکن ہوئے۔ دار المصنفین کی مجلس کے صدر رہے، ان مجلسوں میں مولانا کے ساتھ راقم سطور کو بھی شرکت کا شرف حاصل ہوتا رہا اور مولانا کی محبت و شفقت میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔ دار العلوم ندوۃ العلماء میں کلاس تفسیر کی خدمت میرے سپرد ہوئی تو مشکلات قرآن کے حل میں نے مولانا کو خطوط لکھے اور زبانی بھی سوالات کئے۔ ان کے ذاتی کتب خانہ سے بھی فائدہ اٹھایا، اسی طرح اپنی بعض تصنیفات میں بھی مولانا سے مدد لی اور مولانا نے ہر موقع پر جواب شافی سے میری مدد کی اور بعد میں تو ایسا معمول ہو گیا تھا کہ جو چیز بھی ان کے مطالعہ میں آتی اور میرے مفید مطلب نظر آتی، از خود بکمال شفقت تراشہ یا کتاب میرے پاس بھیج دیتے یا گرامی ناموں میں اس کا تذکرہ کر دیتے۔ مولانا کے یہ خطوط تقریباً سب میرے پاس محفوظ ہیں جو نہ صرف تفسیر کے طالب علموں کے لئے بلکہ عام اہل ذوق کے لئے بھی بڑی افادیت رکھتے ہیں اور پھر آخر میں وصیت کی کہ اگر ان کے انتقال کے وقت موجود رہوں تو جنازہ کی نماز میں ہی پڑھاؤں۔ ۶ جنوری ۱۹۷۷ء کو یہ ناگوار و دلخراش فریضہ بھی ادا کرنا اور علم و فضل کا یہ کوہ گراں دو گز زمین کے اندر چھپ گیا۔ عجباً لاربع اذرع فی خمسۃ فی جو فیھا جبل اشم کبیر۔

حضرات! مولانا دریابادی متنوع صلاحیتوں اور گوناگوں کمالات کا بے بہا گنجینہ تھے اور ایک کامیاب صحافی تھے، صاحب طرز انشاء پرداز تھے۔ بالغ نظر فلسفی اور مفکر تھے، سراپا اخلاص

مد بیں مصلح تھے، شعر و سخن کے رمز شناس ناقد تھے با کمال مفسر قرآن تھے، صاحب حال صوفی تھے یہ سارے فضائل و کمالات ان کی شخصیت میں جمع تھے، وہ صحیح معنی میں ایک عبقری شخص تھے

انسانی علوم اور خاص طور سے نفسیات کی ترقیوں کے باوجود ابھی تک عبقریت کے اصول کی مکمل نقاب کشائی نہیں ہوسکی ہے، علمائے نفسیات کسی فیصلہ کن نتیجہ تک نہیں پہنچ سکے ہیں کہ عبقریت کی تکوین و تکمیل میں وہبی صلاحیتوں کا اثر کس حد تک ہوتا ہے اور ذاتی جد و جہد اور اکتساب کا عمل دخل کہاں تک ؟ لیکن مولانا عبد الماجد دریابادی کی زندگی کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی شخصیت کی تشکیل میں ذوقِ لطیف، طبع بلند اور ذہن رسا جیسی وہبی صلاحیتوں کے ساتھ ان کی ذاتی محنت و شغف اور لگن کا بھی بڑا اہم حصہ رہا ہے پڑھنے اور زیادہ سے زیادہ پڑھنے کا شوق ان کو بچپن سے تھا۔ انھوں نے خود لکھا ہے۔ "جو کتاب بھی ہاتھ لگے پڑھ ڈالنے کا مرض تھا۔" اور جسے یہ مرض لگ جائے اس کو چھوڑتا کب ہے ؟ ع

اس کو چھٹی نہ ملے جس کو سبق یاد ہوا

جوں جوں عمر بڑھتی گئی، مولانا ذوقِ مطالعہ بڑھتا گیا۔ آرام اور تفریح کے اوقات بھی اسی کے نذر ہو گئے۔ بلکہ نوشت و خواند ہی راحتِ دل و جاں بن گئے، اور جب حضرت تھانوی سے تعلق ہوا تو وہاں سے محض سلوک روحانی حاصل کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ زندگی کے آداب بھی سیکھے۔ وقت کی پابندی اور اصول پسندی حضرت تھانوی کا امتیاز تھی۔ مولانا دریابادی کے یہاں ان کے مرشد کا یہ رنگ بھی نکھرا۔ انضباطِ اوقات اور تنظیم کار کا جیسا نمونہ مولانا دریابادی کے یہاں دیکھا، مشکل سے کہیں اور نظر آیا اور ان کے اتنے مختلف النوع بلکہ متضاد کاموں کو خوش اسلوبی و کامیابی کے ساتھ انجام دینے کا راز یہی ہے

مولانا دریابادی نے بہت کچھ لکھا اور جو کچھ بھی لکھا، بہت خوب لکھا "سچ" اور "صدق" کی کچی باتیں ہوں یا خلافت کا نفرنس اور ندوہ کے اجلاسوں کے خطبے یا سفر حجاز کے مشاہدات،

گرہ کشائیاں یا تفسیر قرآن اور شریعت کے اسرار و رموز، ہر جگہ وہ ادیب نظر آتے ہیں خوش ذوق اور صاحب الطرز ادیب۔ انھوں نے جس موضوع پر بھی لکھا اس میں ان کے طرز تحریر کی ساری خوبیاں ہیں۔ اس کا پورا بانکپن اور اس کی پوری رنگینی موجود ہے۔ ایک فطری ادیب اور صاحب قلم کی خوبی یہی ہے کہ موضوع کتنا ہی سادہ، سنجیدہ اور خشک یا قدس ہو وہ اپنے قلم کی جولانی، خیال کی رعنائی اور طرز ادا کی دل آویزی کو روک نہیں سکتا۔ اس کا قلم گل کاری و گل فشانی سے باز نہیں رہتا اور یہی راز ہے کہ اب تک ان کے اسلوب اور لطف بیان کے جویا ہیں۔ یہ ہماری ہر کم تحریریں۔ ذوق و شوق سے پڑھ لیتے ہیں اور گرانی محسوس نہیں کرتے۔

مولانا کے اسلوب نگارش کا کیا کہنا۔ اس کی لطافت و نزاکت۔ اس کی لذت و حلاوت کا بیان مشکل ہے۔ وہ تو بس محسوس کرنے اور محظوظ ہونے کی چیز ہے۔ وہ اپنے اسلوب نگارش کے بانی بھی تھے اور خاتم بھی۔ وہ چھوٹے چھوٹے جملے اور مختصر الفاظ کے کوزے میں حقائق و معارف کے سمندر کو دیتے اور الفاظ کا انتخاب اور دروبست ایسا جیسے معری نگینے جڑے ہوں یا موتی رول رہے ہوں، سادہ اور بے تکلف عبارت میں محاوروں کی رنگینی، استعارے اور تشبیہیں اور برجستہ ساختہ کچھ قافیے یا ضلع جگت کا استعمال ان کا ایسا کمال تھا جس کی مثال کسی دوسری جگہ مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔ زبان کے معاملے میں ان پر گرفت تقریباً محال ہے اور زبان و بیان کی گرفت پہلی کبھی ان کا ایک فقرہ ایک مقدمہ کا، اور ایک شذرہ پورے باب کا کام کر جاتا۔ کبھی کبھی پرانے شاعر کے مصرعے کو ڈھال ڈھال کر پورا کام کر جاتے اور وہ مصرعہ سب کچھ کہہ دیتا۔ اس طرح یہاں کی ادبیات کے ذخیرہ بلند ہیج نظر آتے انتقال ذہنی اور ان کے حسن انتخاب کی بے اختیار داد دینی پڑتی ہے کہ وہ مصرعے کہاں سے لائے اور کس طرح ان کو نگینے کی طرح جڑ دیا۔

مولانا کی زبان دانی اور صحافتی الکلامی کے جلوے ادبی انداز کی تحریروں میں اور زیادہ درخشاں و تابناک نظر آتے ہیں یہ ایسا نازک موضوع ہے کہ اس میں وہی ادیب و صاحب قلم کامیاب ہو سکتا ہے جو صحیح معنوں میں زبان کا نکتہ شناس اور مزاج داں ہو۔ الفاظ کے وزن اور ان کے پوشیدہ

بلاشبہ باریک اور تلوار سے تیز دھار اور اس کی کاٹ سے اچھی طرح واقف ہو ورنہ اس فن میں ذرا سی بھی بے اعتدالی طنز کو ہجو میں بدل دیتی ہے یا پھکڑ پن تک پہنچا دیتی ہے۔ مولانا دریابادی اس بحر کے شناور اور اس میدان کے شہسوار تھے۔ ان کے طنز کی کاٹ اللہ کی پناہ! شکار تڑپ کے رہ جاتا اور اس سے نہ اٹھاتے بنتی نہ رکھتے لیکن کوئی تحریر یا کوئی جملہ بھی وقار و معیار اور ثقاہت سے گرا ہوا نہیں ہوتا۔

مولانا کی طنزیات کا نشانہ مختلف اوقات میں مختلف افراد بھی ہوئے لیکن اس طرح کی تحریروں میں ایک بڑے حصہ کا موضوع مغربی تہذیب اور اس کے مختلف مظاہر ہوا کرتے تھے جسے وہ "یاجوجی تہذیب" یا "دجالی فتنہ" کہا کرتے تھے۔ مولانا شک و ارتیاب کے طوفان بداماں سمندر سے ہو کر اور ایجاد و انکار کی تیز و تند موجوں کے تھپیڑوں سے لڑ کر ساحل امان اور وادی ایمان و یقین تک پہنچے تھے اور اسلام اس کی تعلیمات، تاریخ اور شخصیات کے بارے میں کسی قدر حساس بھی تھے دنیا کے کسی گوشہ میں کہیں بھی شریعت اسلامی یا ذات نبوی کے بارے میں کوئی توہین آمیز بات شائع ہوتی تو مولانا تلملا اٹھتے۔ فوراً نوٹس لیتے۔ اس وقت ان کا قلم شمشیر جوہر دار فتنہ کش باز بن جاتا۔ علم و تحقیق کے نام پر مستشرقین کی دسیسہ کاریاں اور ترقی و تمدن کے نام پر مغربی تہذیب کی فتنہ سامانیوں کا "کچا چٹھا" کھول کر رکھ دینا وہ اپنا مذہبی فریضہ سمجھتے تھے۔

وہ انگلستان اور ہندوستان سے نکلنے والے پرچوں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر تہذیب مغرب سے ایسے حقائق اعداد و شمار اور اس کی انسانیت دشمنی کی مثالیں پیش کرتے کہ ان چمکتے نگوں کی بیرونی ملمع کی حقیقت سامنے آ جاتی اور ان سے مرعوبیت کافور ہو جاتی۔ "سچ" اور "صدق" کا شاید ہی کوئی شمارہ ان حقائق سے خالی جاتا۔ جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں کے ذہنوں سے مغرب کی مرعوبیت کے خاتمہ اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گفتگو کی جرأت پیدا کرنے میں مولانا دریابادی مرحوم کا بڑا اہم کردار رہا ہے۔

حضرات! مختصر وقت میں مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم کے تمام اوصاف و کمالات اور ان کی

شخصیت کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالنا ممکن نہیں اور اس وقت شاید اس کی ضرورت بھی نہیں کیونکہ اس سیمینار کی اگلی نشستوں میں مولانا پر متعدد علمی، تحقیقی مقالے پیش کیے جائیں گے یہاں میں ماہنامہ فروغ اُردو کے ماجد نمبر کے لئے لکھے گئے اپنے ہی مقالے کا ایک ٹکڑا پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

"اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ اپنے زمانہ کے نادر روزگار اور صاحب کمال شخصیتوں میں تھے ایک ادیب و صاحب قلم کی حیثیت سے بھی قرآن کے ایک مفسر و خادم کے لحاظ سے بھی قدیم و جدید کے ایک جامع عالم کے طور پر بھی اور اپنے وقت اور صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے اور فائدہ پہنچانے والے انسان کی حیثیت سے بھی ایک کہنہ مشق صحافی اور ایک صاحب طرز باقدر طنز نگار کی بناء پر بھی وہ ہر طرح قابل قدر اور اعزاز کے مستحق ہیں۔ (ماہنامہ' فروغ اُردو" ماجد نمبر ص ۳۱) انھیں الفاظ پر میں اپنی گفتگو ختم کرتا ہوں۔

بقیہ سلسلہ صفحہ سے آگے . .

ہے لیکن دوسری ریاستوں کی عدالتوں کے لئے بھی یہ مشعل راہ کا کام کر سکتا ہے قطع نظر اس کے دفعہ ۹ ضابطہ دیوانی ہند کے حوالے سے یہ بحث سپریم کورٹ میں زیر دوران مقدمات میں کی جانی از بس ضروری ہے کہ کسی آسمانی صحیفہ یا کتاب کے متن کو عدالتیں اپنے راست تاویل کے ذریعے فیصلے نہیں کرنے چاہیئے بلکہ ان آسمانی کتابوں کو اپنے فیصلے کی بنیاد بنانی چاہیئے۔

میں مسلمانوں کی تمام تنظیموں اور بالخصوص مسلم پرسنل لا بورڈ سے اُمید کرتا ہوں کہ وہ اس فیصلے کی کافی تشہیر کریں تاکہ نہ صرف اختلافی فیصلوں کی وجہ مسلم مطلقہ کے نفقہ کے مسئلہ میں جو غیر یقینی حالت پیدا ہوگئی تھی اس کا ازالہ ہو سکے بلکہ ان تنظیموں اور پرسنل لا بورڈ کو چاہیئے کہ سپریم کورٹ میں زیر دوران مقدمات میں موثر پیروی کا انتظام کریں تاکہ قرآنی آیات کی غیر صحیح تاویلات کی وجہ سے مسلم پرسنل لا کی ہئیت کذائی و شکل کے بدل جانے کے احتمال کو دور کیا جا سکے۔

مس صبا مسعود
اور
فہیم الدین رضوی

اکبر الہ آبادی

مشرقی تہذیب کی اعلیٰ قدروں کے علمبردار

اُردو کے ممتاز شاعر اور ادیب مولانا اسماعیل میرٹھی نے ۱۹۰۹ء میں اسماعیل نیشنل گرلس پی۔جی کالج میرٹھ قائم کیا تھا اُس وقت سے آج تک یہ کالج تعلیم و تہذیب کا سرچشمہ اور اخلاق و ادب کا گہوارہ ہے۔اس کالج میں اُردو زبان و ادب کی ایم اے تک باقاعدہ تعلیم کا انتظام ہے اور ڈاکٹر ثریا رضوی اِس کی سربراہ کے فرائض انجام دے رہی ہیں۔ اِس شعبے کے دوسرے اہم اساتذہ میں مسز ضمیم زہرا' مس صبا مسعود اور مس عظمیٰ مسعود شامل ہیں ڈاکٹر ثریا رضوی اور مس صبا مسعود نے ۲۱ر مارچ ۱۹۹۰ء کو اس کالج میں "اکبر الہ آبادی اور اُن کا عہد" موضوع پر ایک عظیم الشان سیمینار کا انعقاد کیا جس میں ملک کے ممتاز دانشوروں نقادوں اور ادیبوں نے اکبر کے فکر و فن' حیات اور عہد پر بصیرت افروز مقالے پڑھے۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت میرٹھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب پی سی گپتا نے کی۔ اس اجلاس کا افتتاح ممتاز سائنس داں اور جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے وائس چانسلر جناب ڈاکٹر سید ظہور قاسم نے کیا۔ اور اس افتتاحی اجلاس میں اُردو کے ممتاز شاعر اور ادیب پروفیسر عنوان چشتی نے اکبر کے فکر و فن پر کلیدی خطبہ پیش کیا۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے اُردو کے ممتاز صحافی اور افسانہ نگار جناب کلام حیدری (گیا۔ بہار) نے شرکت کی۔

ڈاکٹر ثریا رضوی نے شعبے کی سینئر لکچرر مس صبا مسعود سے فرمائش کی کہ وہ افتتاحی اجلاس کی نظامت کے فرائض انجام دیں۔ مس صبا مسعود نے بڑے وقار اور دلکش انداز میں جلسے

کا استقبال کرتے ہوئے شعبہ کی ایک اور لیکچرر مس منظلی مسعود سے کہا کہ وہ ڈائس پر جلوہ افروز تمام مہمانوں کا پھولوں سے خیر مقدم کریں۔ چنانچہ منظلی مسعود نے باری باری ڈاکٹر سید ظہور قاسم (وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی) ڈاکٹر پی سی گپتا (وائس چانسلر میرٹھ یونیورسٹی) پروفیسر عنوان چشتی (جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی) جناب کلام حیدری (گیا) شری دو فود شرما (صدر استقبالیہ کمیٹی اسماعیل کالج) پدم شری حکیم سیف الدین (میرٹھ) کا پھولوں سے استقبال کیا اس کے بعد دوسرے مندوبین میں اُردو کی ممتاز گیت نگار محترمہ سیدہ عنوان چشتی (نئی دہلی) مولانا نعیم الدین رضوی (نئی دہلی) خالد حسین خاں (میرٹھ) محمد جعفر ہاشمی (میرٹھ) اور صادقہ ذکی کا خیر مقدم کیا۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ اسماعیل کالج کی طالبات نے پنڈال کو بڑے سلیقے سے سجایا تھا اور مہمانوں کے جلوس پر قدم قدم پہ پھولوں کی بارش کر کے اُن کو ڈائس تک لے جایا گیا تھا۔ میرٹھ اور باہر کے تمام مندوبین نے محترمہ ثریا رضوی اور صبا مسعود کی انتظامی صلاحیتوں، سلیقہ اور ذوق کو سراہا اور کہا کہ میرٹھ کی تاریخ میں اس سے زیادہ خوبصورت اور اثر آفریں سیمنار منعقد نہیں ہوا۔

افتتاحی اجلاس میں اسماعیل کالج کی صدر شعبۂ اُردو ڈاکٹر ثریا رضوی نے مختصر مگر جامع اور دلکش انداز میں اسماعیل پی جی کالج کا تعارف کرایا اور مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ موصوفہ نے کہا کہ یہ کالج اپنی نمودِ اوّل سے آج تک علم و ادب کے میدان میں منارۂ نور کی حیثیت رکھتا ہے موصوفہ نے کہا کہ مجھے اور میرے رفقارکار اور طالبات کو اس بات پر فخر ہے کہ اس سیمنار کی صدارت جناب پی سی گپتا وائس چانسلر میرٹھ یونیورسٹی فرما رہے ہیں اور اس کا افتتاح جناب سید ظہور قاسم وائس چانسلر جامعہ ملیہ نئی دہلی فرمائیں گے موصوفہ نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا کہ سید ظہور قاسم صاحب ہمارے ملک کے ایک بے مثال سائنس داں اور دانشور ہیں اور اپنی بے مثال خدمات کی بدولت ایک امتیازی حیثیت رکھتے ہیں موصوفہ نے پروفیسر عنوان چشتی کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ موصوف نے تحقیق

شاعری اور تصوف کے میدان میں دقیع اور غیر معمولی کارنامے انجام دیئے ہیں۔ کلام حیدر صاحب کے بارے میں کہا کہ انھوں نے صحافت افسانے کے میدان میں اپنی خدمات کا لوہا منوا لیا ہے۔ مسٹر ی پی سی گپتا وائس چانسلر میرٹھ یونیورسٹی کا خیر مقدم کرتے ہوئے جناب نوتم اید ویکیٹ نے کہا کہ گپتا جی خرجہ کالج اور میرٹھ یونیورسٹی دونوں کے انتظام کا کام بڑی کامیابی سے چلا رہے ہیں اور موصوف علمی دنیا میں بہت نیک نام ہیں سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے ڈاکٹر سید ظہور قاسم صاحب نے فرمایا کہ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ ثریا رضوی صاحبہ نے اکبر الہ آبادی کے فکر و فن کی معنویت کو جدید دور کے تناظر میں تلاش کرنے کے لئے اس عظیم الشان سیمینار کا انعقاد کیا ہے۔ موصوف نے اکبر الہ آبادی کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے اُن کی سیاسی سماجی تہذیبی اور ثقافتی بصیرت پر روشنی ڈالی۔ موصوف نے کہا کہ جدید دور میں اکبر کے کلام کی معنویت از سر نو جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ ناظم جلسہ مسعود صاحب نے پروفیسر عنوان چشتی کو کلیدی خطبہ ارشاد فرمانے کے لیے دعوت دی۔ پروفیسر عنوان چشتی نے اکبر الہ آبادی کے عہد، زندگی اور شاعری کی تثلیث کا تعین کرکے کہا کہ اکبر الہ آبادی اپنے دور کی سچی آواز تھے۔ پروفیسر عنوان چشتی نے اکبر الہ آبادی کے فکر و فن کا تجزیہ کرتے ہوئے خاص طور پر اکبر کے تصورِ تعلیم نسواں اور اُن کے جذبۂ حب الوطنی کا خاص طور پر جائزہ لیا۔ پروفیسر عنوان چشتی کا کہنا تھا کہ جو لوگ اکبر الہ آبادی کو محض سر سید تحریک کا مخالف یا قدامت پسند بنا کر پیش کرتے ہیں وہ اکبر کے دور کے تقاضوں اور اکبر کے بنیادی نقطۂ نظر کے ساتھ انصاف نہیں کرتے۔ اکبر مشروط طور پر تعلیم نسواں کے قائل تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ لڑکیاں جدید تعلیم ضرور حاصل کریں لیکن مشرقی تہذیب اور اسلامی اقدار پر اپنے ایمان کو تازہ رکھیں۔ وہ اُس تعلیم کے مخالف تھے جو ان کو آدم کی اولاد نہیں بلکہ بندر کی اولاد ثابت کرکے انسان کو اشرف المخلوق سے زیادہ جنگلی جانور کی صفات سے متصف کر دیتی ہے۔ پروفیسر عنوان چشتی نے اکبر کے جذبۂ حبّ الوطنی کا جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ اکبر ہندو مسلم اتحاد کے علمبردار تھے۔ وہ ہر قوم کا تشخص برقرار رکھتے ہوئے ایک

عظیم ہندوستانی قومیت کی تعمیر اور تشکیل کا تصور پیش کرتے تھے۔ پروفیسر عنوان چشتی نے یہ بات زور دے کر کہی کہ اکبر نے اپنے کلام میں اس بات کو بار بار پیش کیا ہے کہ اگر اکبر مجبوراً گورنمنٹ کے ملازم نہ ہوتے تو وہ بھی گاندھی کی گوپیوں میں شامل ہوتے۔ جناب کلام حیدری نے کہا کہ ہر شاعر کے یہاں کچھ بنیادی تصورات اور خیالات ہوتے ہیں جو اس شاعر کے یہاں فریکوینسی کی صورت میں نظر آتے ہیں۔ ہمیں اکبر کی شاعری میں اس فریکوینسی کو تلاش کرنا چاہیئے۔
کلام حیدری نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا کہ بہت کم لوگوں کو یہ بات معلوم ہے کہ اکبر الہ آبادی کی پیدائش میرے وطن گیا کے ایک گاؤں میں ہوئی تھی اس طرح میرا اور اکبر کا ایک خاص رشتہ ہے شری ونود شرما نے کہا کہ میں اردو اور شعبۂ اردو کے لئے جو کچھ کر سکتا ہوں کرتا رہوں گا۔ حکیم سیف الدین صاحب نے فرمایا کہ میرٹھ کی تاریخ میں آج تک اس سیمینار سے زیادہ بہتر کوئی سیمینار نہیں ہوا ہے۔ صدر جلسہ جناب پی بی گپتا وائس چانسلر میرٹھ یونیورسٹی نے کہا کہ مجھے افسوس ہے کہ گھٹیا سیاست تعلیمی اداروں کا مقدر بنتی جا رہی ہے انہوں نے اس بات پر تشویش ظاہر کی کہ اگر تعلیم کا Criminalization ہو گیا تو کیا ہوگا؟
انھوں نے اسماعیل گرلس کالج کی صدر شعبۂ اردو ثریا رضوی، اسٹاف اور طالبات کو "اکبر الہ آبادی اور ان کا عہد" سیمینار منعقد کرنے پر مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ اس طرح کے کاموں سے علمی فضا بنتی ہے میں اس سلسلہ میں آئندہ بھی ہر ممکن مدد کرتا رہوں گا۔
افتتاحی اجلاس کے بعد پہلا اجلاس طعام کے وقفے کے بعد شروع ہوا جس کی صدارت جناب کلام حیدری نے فرمائی۔ اس اجلاس میں خالد حسین خاں لکچرر میرٹھ کالج نے اکبر کی شاعری کی خصوصیات پر اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ اکبر نے طنز و مزاح کے ذریعہ اپنے دور کی ناہمواریوں کو نشانۂ تنقید بنایا ہے۔ اکبر ایک اعتدال پسند مفکر تھے۔ مشرقی اقدار کے دلدادہ تھے لیکن مغربی تہذیب کی اچھی چیزوں کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ البتہ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ وہ قدیم و جدید تہذیب و تعلیم کی مضر اقدار کے خلاف تھے۔ ڈاکٹر صادقہ ذکی نے

اپنا مقالہ صنف نازک اور اکبر الہ آبادی کے موضوع پر پڑھا اور کہا کہ فنون لطیفہ میں عورت کئی انداز سے جلوہ گر ہے۔ اکبر الہ آبادی نے تعلیم نسواں پر مشروط انداز میں اظہار خیال کیا ہے۔ صدر جلسہ جناب کلام حیدری نے کہا کہ شاعری اور علم کے میدان میں زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح اوچھی چیزیں بھی پیش کی جاتی ہیں اکبر بہر حال ایک ممتاز اور اہم شاعر ہیں۔ ان پر از سر نو غور و فکر کی ضرورت ہے ناظم جلسہ مس صبا مسعود نے مہمانوں اور سامعین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے دوسرے اجلاس کا اعلان کیا۔

دوسرے اجلاس کی صدارت اُردو کے بزرگ شاعر اور نقاد جناب مشتاق شارق نے فرمائی اور اس اجلاس میں مولانا نعیم الدین رضوی (نئی دہلی) مس صبا مسعود (میرٹھ) اور ڈاکٹر عبدالحق (دہلی یونیورسٹی) نے اپنے مقالات پیش کئے۔ مولانا نعیم الدین رضوی نے اپنا مقالہ اکبر کی شاعری میں تصوف کا رنگ پیش کیا۔ انہوں نے کہا کہ اکبر کے ذہن پر تصوف اور اسلامی تعلیمات کے گہرے اثرات ہیں جن کا اظہار انہوں نے اپنی شاعری میں کیا ہے۔ مولانا نعیم الدین رضوی نے اکبر کے کلام سے مثالیں دیتے ہوئے تصوف کے دو تصورات کی وضاحت کی وہ ہیں "تصورِ توحید" اور "صفائے قلب"۔ موصوف نے یہ بات زور دے کر کہی کہ تصورِ توحید تصوف کا سنگ بنیاد ہے اکبر نے کلام مجید کی اُن آیات سے اپنی شاعری میں استفادہ کیا ہے جن میں اللہ تعالیٰ نے اپنی توحید کا اعلان فرمایا ہے مولانا نعیم الدین رضوی نے صفائے قلب کو تصوف کا مرکزی اصول قرار دیتے ہوئے کہا کہ اکبر الہ آبادی نے اپنی شاعری میں دنیا کی آلائشوں اور کدورتوں سے دل کو خالی کرنے اور صفائے قلب کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ یہ تصور اسلامی اخلاقیات کا گہوارہ ہے۔ انہوں نے اکبر کی شاعری کو تصوف کا بیش بہا خزینہ قرار دیا ہے مس صبا مسعود نے اپنا مقالہ اکبر کا عہد اور اُن کی شاعری کے سیاسی، سماجی، ثقافتی اور تعلیمی رشتوں کی بازیافت پر پڑھا۔ موصوف نے کہا کہ اکبر الہ آبادی کا عہد ایک بحرانی عہد تھا۔ اُس دور میں دو تہذیبیں، دو نظریئے اور دو رویّے ایک دوسرے سے متصادم تھے ہر رویّہ اپنی صحت پر اصرار کرتا اور

دوسرے جب کی انگلہ عمل کرنے پر آمادہ تھا۔ اکبر نے اس دور میں اپنا فرض بنایا اور نئی تہذیبی تغیر انگریزی اقتدار کے سائے میں تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی کی منفی اور مضر خصوصیات پر کاری ضرب لگائی۔ انہوں نے مشرقی تہذیب کی فرسودہ اور بوسیدہ قدروں پر بھی وار کیا اور ایک معتدل اور متوازن اندازِ زندگی پر اصرار کیا جس میں اسلامی رنگ کو خاص وقار حاصل ہے۔ حما مسعود نے اکبر الہ آبادی کی دانشورانہ اور بصیرت افروز شاعری کے حوالے دے کر اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کی۔ ڈاکٹر عبدالحق نے مقالہ کی جگہ تقریر کی اور کہا کہ اکبر کی شاعری کو سمجھنے کے لئے اس دور کے مجموعی مزاج کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ انہوں نے کہا کہ اکبر کے عہد میں ایک طبقہ مغربی تعلیم و تہذیب سے مرعوب تھا اور دوسرا طبقہ قدیم اقدار اور خیالات سے چپٹا ہوا تھا۔ سرسید تحریک مغربی تعلیم و تہذیب کی غیر مشروط حمایت کرتی تھی۔ اکبر نے اسلامی اصولوں اور مشرقی تہذیب کی بنیادی قدروں کے تحفظ کے لئے اپنی شاعری کو سپر بنایا۔ صدرِ جلسہ جناب مشتاق شارق نے مقالہ نگاروں کے مقالوں کو وقیع قرار دیتے ہوئے انہیں خوش آئند اور خیال افروز قرار دیا۔ ڈاکٹر ثریا رضوی نے اختتامی اجلاس کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ بیرونی مندوبین کی طرف سے مولانا نعیم الدین رضوی اور مقامی مہمانوں کی طرف سے جناب مشتاق شارق اپنے تاثرات پیش فرمائیں گے۔

اختتامی اجلاس میں مولانا نعیم الدین رضوی نے بیرونی مہمانوں کی طرف سے تاثرات پیش کرتے ہوئے کہا کہ محترمہ ثریا رضوی، حما مسعود صاحبہ اور ان کے کالج کے رفقاء، طالبات نے "اکبر اور ان کا عہد" سیمینار منعقد کر کے ایک غیر معمولی کارنامہ انجام دیا ہے اس سیمینار میں جو مقالے پڑھے گئے ہیں انہوں نے سننے والوں کے ذہنوں میں نئے سوالات کو جنم دیا ہے اور اکبر کی شعری معنویت پر از سر نو غور کرنے کی دعوت دی ہے جناب مشتاق شارق نے کہا کہ اس سیمینار کی غیر معمولی کامیابی جہاں محترمہ ثریا رضوی کے حسنِ انتظام کا ثبوت ہے وہاں بیرونی دانشوروں کی شرکت سے چار چاند لگے ہیں انہوں نے خاص طور پر جناب ابراہیم ظہور قاسم، پروفیسر عنوان چشتی اور دیگر مندوبین کی تشریف آوری اور بصیرت افروز تقریروں اور مقالوں کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ محترمہ ثریا رضوی نے آخر میں شرکا اور میزبانوں کا شکریہ ادا کیا۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری

مولانا حسرت موہانی کی زندگی اور شاعری

انیسویں صدی کی آخری دہائیاں برصغیر کے مسلمانوں کے لئے بڑی آزمائشوں کی دہائیاں تھیں ۱۸۵۷ء کے بعد برطانوی حکمرانوں نے مسلمانوں پر ایسے مظالم ڈھائے تھے کہ سیاسی طور پر وہ بالکل مفلوج ہو کر رہ گئے تھے۔ ہندوؤں نے اس موقع سے پورا فائدہ اٹھایا اور انگریزوں کے اشارے سے پورے برصغیر پر ہندو راج کا خواب دیکھنے لگے۔ راجہ رام موہن رائے، گوکھلے، تلک اور دیا نند سرسوتی وغیرہ نے ہندو قومیت کے احیاء کی راہ پہلے ہی ہموار کر دی تھی، انگریزوں کی رہنمائی اور صدارت میں ۱۸۸۵ء میں نیشنل کانگریس بھی وجود میں آ گئی گویا سیاسی اتحاد کے لئے ہندوؤں نے ایک پلیٹ فارم بنا لیا اور مسلمانوں کے خلاف مختلف شعبوں سے سازشیں ہونے لگیں۔ ان سازشوں میں ایک بڑی سازش یہ تھی کہ ہندوستان کی مقبول عام زبان اردو کو ناگری رسم الخط میں لکھنے کا مطالبہ کیا گیا۔ مقصد یہ تھا کہ عربی اور فارسی سے مسلمانوں کا رشتہ ختم ہو جائے اور ناگری رسم الخط کے ذریعے ہندی کے نام سے ایک ایسی زبان کو فروغ دیا جائے جو ہندو اکثریت کی نمائندگی اور ان کے حقوق کا تحفظ کرتی ہو۔

انگریز اور ہندوؤں کے یہ متحدہ سازشیں جب منظر عام پر آئیں تو مسلمان بھی خواب غفلت سے چونکے۔ سر سید احمد خاں نے ان کی رہنمائی کی۔ ڈپٹی نذیر احمد، مولانا الطاف حسین حالی، محمد حسین

بقیہ

آزاد، مولانا محمد امین علی، محسن الملک، وقار الملک، مولانا شبلی اور دوسروں نے بھی اس طرف توجہ کی لیکن یہ سارے بزرگ رفتہ رفتہ اپنی عمر طبعی کو پہنچ رہے تھے اور یوں لگتا تھا جیسے ان لوگوں کی وفات کے بعد یہ علمی سلسلہ منقطع ہو جائے گا، مگر لیکن ۱۸۹۸ء میں کی وفات سے صرف پندرہ بیس سال پہلے مسلمانوں میں محمد علی جناح، مولانا محمد علی جوہر، مولانا حسرت موہانی، مولانا سلیمان ندوی، مولوی عبدالحق، مولانا ظفر علی خان وغیرہ کے نام سے متعدد ایسے ذہین اور جواں فکر ادیب، شاعر اور سیاسی مصلحین سامنے آگئے کہ سرسید اور ان کے رفیقوں کی روشن کی ہوئی شمع بجھنے نہیں پائی بلکہ اس کی روشنی روز بروز تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔

اس شمع کو بلند رکھنے میں سبھی نے اپنا اپنا کردار ادا کیا لیکن اس سلسلے میں جو نام سب سے پہلے نمایاں ہو کر سامنے آیا اور جس نے نجی زندگی سے لے کر سیاست، قیادت، اسلامی اردو بودوباش، شاعری صحافت اور علم و ادب تک سب میں ایک انقلاب پیدا کر دکھایا اور مسلمانوں کی مکمل رہنمائی کی وہ نام سید فضل الحسن حسرت موہانی کا تھا۔ مولانا حسرت موہانی نے ہر شعبۂ حیات میں غیر معمولی خدمات انجام دیں اور اپنے قول و عمل اور سیرت و کردار سے مسلمانان ہند کو اس طرح سے متاثر کیا کہ ان کے جونیئر اور ہمعصر سبھی ان کے جذبۂ ایثار کے قائل ہو گئے حتیٰ کہ قائد اعظم محمد علی جناح جن کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ کسی کو بہت کم خاطر میں لاتے تھے انہوں نے بھی مولانا حسرت موہانی پر کلی اعتماد کا اظہار کیا اور تحریک پاکستان سے لیکر قیام پاکستان تک بہت سے نازک اور پیچیدہ مسائل کے حل میں مولانا کے مشورہ لیتے رہے۔

مولانا حسرت موہانی کا اصل نام سید فضل الحسن اور والد کا نام سید اظہر حسن تھا۔ حسرت موہانی یوپی کے ضلع اناؤ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ مڈل پاس کر کے اپنے ننھیال فتح پور ہسوہ چلے گئے۔ وہاں سے میٹرک کا امتحان درجۂ اول میں پاس کیا۔ مدرسہ اسلامیہ فتح پور کے بانی حضرت سید ظہور الاسلام سے حسرت کو خاص عقیدت تھی۔ عربی، فارسی اور اصطلاحات کا درس انہوں نے مولانا ظہور الاسلام ہی سے لیا تھا۔ اس درس میں نیاز فتح پوری بھی ان کے ساتھ تھے میٹرک کرنے کے بعد حسرت

علیگڑھ چلے گئے اور 1903ء میں درجہ اول میں بی اے کیا۔ یہاں ان کے اختیاری مضامین عربی اور ریاضی تھے۔ یہیں سے انہوں نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز کیا اور بی اے کا نتیجہ نکلنے سے قبل ہی 1903ء میں اُردوئے معلیٰ کے نام سے ایک رسالہ جاری کر دیا۔

مولانا حسرت موہانی کا یہ پرچہ صرف یہی نہیں کہ ہماری سیاسی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا بلکہ برصغیر کی سیاست و صحافت میں بھی اس نے بہت اہم کردار ادا کیا ہے حسرت موہانی اور ان کا پرچہ اُردوئے معلیٰ برطانوی حکومت کے اولین باغی اور دشمن کہے جا سکتے ہیں اس لئے کہ ان کی طرف سے روزِ اول ہی سے انگریزوں کے خلاف آواز بلند کی گئی تھی کہ 1903ء میں ایک مضمون کی اشاعت کے سلسلے میں مولانا کو ایک سال قید بامشقت کی سزا سنائی گئی اور پریس ضبط کر لیا گیا حسرت موہانی چاہتے تو اس سزا سے بچ سکتے تھے اس لئے کہ یہ مضمون ان کا لکھا ہوا نہ تھا لیکن بحیثیت مدیر کے انہوں نے اسے اپنا ہی مضمون قرار دیا اور یہی صحافتی اخلاقیات کا تقاضا تھا۔ مولانا چاہتے تو آج کل کے مدیروں کی طرح معافی نامے کی دو سطریں لکھ کر بھی سزا سے بچ سکتے تھے لیکن ان کی غیرت نے یہ گوارہ نہیں کیا۔

حسرت نے ہمیشہ مسکراہٹوں اور حوصلوں کے ساتھ اعتراف جرم کیا اور ایک سال کی ایسی اذیت ناک قید بامشقت کاٹی کہ اس کی مثال ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں نہیں ملتی۔ یہ سزا انہیں زمانۂ طالبعلمی میں ملی تھی۔ اس کے بعد وہ زندگی بھر برطانوی حکومت کے خلاف برصغیر کی آزادی کی جنگ لڑتے رہے۔ ان کی عمر کا بہت سا حصہ قید فرنگ میں گزرا۔ 1946ء میں وہ مسلم لیگ کے ٹکٹ پر یوپی اسمبلی اور مرکزی اسمبلی دہلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ ان کی کوششوں سے پاکستان بن گیا لیکن وہ خود پاکستان نہیں آئے جب تک زندہ رہے مسلمانوں کی خدمت کرتے رہے اور کانگریس حکومت سے ان کے حقوق کے لئے لڑتے رہے۔

حسرت موہانی کی شادی بھی زمانۂ طالبعلمی میں موہان کے ایک معزز خاندان کی لڑکی نشاط النساء بیگم سے ہوگئی تھی یہ لڑکی مولانا حسرت کی رفاقت کے لئے بہت موزوں تھی۔ بہت با حوصلہ اور جرأت مند

خاتون تھیں۔ حسرت نینی تال، الہ آباد کی جیل میں بند تھے اور ان کی اکلوتی بیٹی بہت بیمار تھی۔ حکومت چاہتی تھی کہ رحم کھا کر انہیں جیل سے رہا کردے۔ بشرطیکہ یہ تھی کہ مولانا حسرت معذرت نامہ لکھ دیں۔ حسرت نے نہیں لکھا لیکن اس موقع پر نشاط النساء نے بھی جس عظیم کردار کا مظاہرہ کیا وہ بھی ہمارے یہاں بہت کم دیکھنے میں آیا ہے۔ نشاط النساء نے مولانا حسرت کو خط میں لکھا کہ بیٹی کی علالت تمہارے لئے ایک امتحان ہے اگر تم نے بچی کی علالت اور بچی سے محبت میں حوصلہ ہار دیا اور حکومت سے معافی مانگ لی تو مجھے یہ بات اچھی نہ لگے گی۔ اس خط سے حسرت کو مزید قوت ملی۔ آخر کار بیٹی وفات پا گئی حکومت نے انہیں جنازے میں شریک ہونے کی اجازت بھی دے دی لیکن وہ جیل سے باہر نہیں گئے۔ حکومت کا یہ رحم و کرم ان کی حریت پسند مزاج کے بالکل خلاف تھا۔

مولانا حسرت موہانی اپنی بیوی کو دل و جان سے چاہتے تھے بیوی کے انتقال پر انہوں نے غزل کے پیرائے میں بہت پُر سوز نوحہ لکھا تھا۔ اس غزل کے چند اشعار دیکھئے۔

عاشقی کا حوصلہ بیکار ہے تیرے بغیر
آرزو کی زندگی دشوار ہے تیرے بغیر

کاروبارِ شوق کی اب وہ تن آسانی کہاں
دل پہ ذوقِ شاعری اک بار ہے تیرے بغیر

شرکتِ بزمِ سخن سے بھی ہمیں، باوصف عزم
بربنائے بے دلی انکار ہے تیرے بغیر

جس فراغت کا تمنائی تھا میں تیرے لئے
اب وہ حاصل ہے تو اک آزار ہے تیرے بغیر

دردِ دل جو تھا کبھی وجہِ مباہات و شرف
بہرِ حسرت موجبِ صد عار ہے تیرے بغیر

مولانا حسرت موہانی ایک ہمہ جہت اور ہمہ صفت شخصیت کے مالک تھے۔ دینی روایات نہیں

اپنے گھر سے ملی تھیں اور وہ بچپن ہی سے روزہ نماز کے پابند تھے۔ جوانی میں بھی عبادات الٰہی سے غافل نہیں رہے شریعت کے ہر طرح پابند تھے طبیعت عاشقانہ اور صوفیانہ پائی تھی بچپن ہی سے شاہ عبدالرزاق فرنگی محلی کے زمرۂ ارادت میں داخل ہو گئے تھے ان کی وفات کے بعد مولانا حسرت نے ان کے عزیز خلف جانشین اور مولانا عبدالوہاب فرنگی محلی سے تجدید بیعت کر لی۔ سخت سے سخت حالات میں بھی حسرت سے نہ تو نماز ترک ہوئی نہ روزے۔ [illegible] کال کوٹھری میں روزے رکھے اور خوش دلی اور پورے دینی جذبے کے ساتھ رکھے خود کہتے ہیں۔

کٹ گیا قید میں ماہ رمضان بھی حسرت
گرچہ سامان سحر کا تھا نہ افطاری کا

شاعری کے ساتھ ساتھ صحافت اور سیاست سے بھی عمر بھر لگاؤ رہا۔ معاشرتی زندگی کے عام مشاغل سے بھی دلچسپی رہی۔ پتنگ بھی اڑاتے تھے اور قوالی بھی خوب سنتے تھے۔ بزرگوں کے مزار پر حاضری دینا اور فاتحہ پڑھنا بھی ان کے معمولات حیات کا حصہ تھا۔ مختصر یہ کہ ان کی زندگی نہایت ہمہ گیر تھی اور بظاہر یوں لگتا تھا جیسے وہ تضادات کا مجموعہ ہیں لیکن ایسا نہیں ہے وہ ایک خاص کردار اور پختہ سیرت کے مالک تھے طبیعت میں ظرافت بھی تھی مزدور۔ خود کہتے ہیں۔

ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

مولانا حسرت نے اپنی شاعری کو بلحاظ موضوعات و تاثرات کئی خانوں میں تقسیم کیا ہے مثلاً اپنے کلیات میں انہوں نے ناصحانہ، ماہرانہ، عاشقانہ، مضاحکانہ، فاسقانہ اور عارفانہ وغیرہ کے عنوانات قائم کیے ہیں لیکن اہل نقد و نظر نے ان کے کلام کو عموماً دو خاص حصوں سیاسی و عشقیہ میں تقسیم کر کے دیکھا پرکھا ہے اور انہیں بیسویں صدی کی غزل گوئی کا امام قرار دیا ہے ناقدین نے بھی اور بڑے شاعروں مثلاً فراق اور فیض نے بھی شاعری میں ان کے اجتہادات کا اعتراف کیا ہے اور ان کا خاص وصف یہ بتایا ہے کہ ان کی شاعری نے اردو غزل کو گھٹن کی فضا سے نکال کر

آزاد فضا میں سانس لینے اور پروان چڑھنے کا موقع فراہم کیا۔

مولانا حسرت کی شاعری بنیادی طور پر حسن و جمال اور عشق و محبت کی شاعری ہے اس شاعری کا آغاز تو لڑکپن کی اس معصوم اور معمولی بھالی عمر سے ہو گیا تھا جس کے متعلق خود حسرت نے کہا ہے۔

حُسن سے اپنے وہ غافل تھا' میں اپنے عشق سے

اب کہاں سے لائیں وہ ناواقفیت کے مزے

محبت کی یہ گھریلو فضا جس کی ہلکی سی جھلک ان کی ابتدائی شاعری میں موجود ہے عالم شباب کو پہنچتے پہنچتے کچھ سے کچھ ہو گئی ہے اور آخر آخر اس میں ایسا رنگ و آہنگ پیدا ہو گیا ہے کہ وہ اردو کی عشقیہ شاعری میں حسرت کا امتیازی نشان بن گئی ہے حسرت کی عشقیہ شاعری میں محبت کی بارگاہ میں شیفتگی و سرمستی کے باوجود ایسی خود اعتمادی اور خودسری نظر آتی ہے کہ وہ خلوت اور گھریلو زندگی کی اس رومانی فضا کو جس کا ذکر کرنا عموماً عیب کہا جاتا ہے بے تکلف و بے محابا بیان کر دینے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے۔ چنانچہ ان کی غزل صاف پتہ دیتی ہے کہ ان کی محبوبہ کا تعلق زنانِ بازاری سے نہیں بلکہ انہیں کے ہم رتبہ خاندان اور تہذیبی و سماجی معاشرے کی لڑکی سے ہے۔

حسرت نے عام اردو شعراء کے برعکس اپنی محبوبہ کو للچائی ہوئی نظروں سے دور سے نہیں بہت قریب سے دیکھا ہے اس سے باتیں کی ہیں اس سے بارہا ملے ہیں چھیڑ چھاڑ کی ہے۔ ستایا ہے' ناراض کیا ہے اور منایا ہے اور [illegible] پیار و روٹھے ہیں اور منتے ہیں شکوہ شکایت کی ہے اور آنسوؤں کا نذرانہ پیش کیا ہے لیکن یہ سب کچھ اتنے اعتماد و خلوص کے ساتھ ملتا ہے کہ آپ اس پر معصوم محبت کے سوا ہوس کاری کا گمان تک نہیں کر سکتے۔ ان کے سیکڑوں اشعار ایسے ہیں جو محبوب سے ان کی قربت کا پتہ دیتے ہیں حسرت کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ان قربتوں کو جذبات کے ساتھ اپنی غزلوں میں ڈھال دیا ہے اور اس طرح ڈھال دیا ہے کہ تہذیبِ عاشقی کو قوت مل گئی ہے محبت کا اعتبار سوا نہیں ہوا بلکہ اس میں پاکدامنی کے آثار قوی سے قوی تر ہو گئے ہیں صرف ایک غزل کے چند اشعار دیکھئے۔

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے
ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے
بار اٹھنا اسی جانب نگاہِ شوق کا
اور ترا غرفے سے وہ آنکھیں لڑانا یاد ہے
تجھ سے کچھ ملتے ہی وہ بے باک ہو جانا مرا
اور ترا دانتوں میں وہ انگلی دبانا یاد ہے
دوپہر کی دھوپ میں میرے بلانے کے لئے
وہ ترا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے
دیکھنا مجھ کو جو برگشتہ تو سو سو ناز سے
جب منالینا تو پھر خود روٹھ جانا یاد ہے!

عاشقانہ غزلوں کے ساتھ ان کے یہاں سیاسی رنگ کی غزلیں بھی ملتی ہیں ہر چند کہ حسرت کی ساری زندگی سیاست میں بیتی اور عملی سیاست میں گذری اس میں ان کا خاص کردار رہا اور قابل تقلید قابل احترام کردار رہا۔ لیکن انکی شاعری پر سیاست کا اتنا گہرا اثر نہیں ہے جتنا کہ عشق و محبت کا ہے ان کی رومانی طبیعت نے ہمیشہ عاشقانہ غزل میں پناہ لی ہے چنانچہ انکی خاص سیاسی غزلیں بھی عاشقانہ لہجے میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ مثلاً انکی ایک خاص سیاسی غزل کے چند اشعار دیکھئے۔

رسم جفا کامیاب دیکھئے کب تک رہے — حب وطن مست خواب دیکھئے کب تک رہے
پردۂ اصلاح میں کوشش تخریب کار — خلق خدا پر عذاب دیکھئے کب تک رہے
نام سے قانون کے ہوتے ہیں کیا کیا ستم — جبر بزیر نقاب دیکھئے کب تک رہے
۴ حسرت آزاد پر جورِ غلامانِ وقت — از رہِ بغض و عتاب دیکھئے کب تک رہے

یہ غزل [illegible] تعلق رکھتی ہے علاوہ حسرت نے باقاعدہ شاعری کی [illegible] ہے لیکن
اُس کا یہ پہلو اول تا آخر حسرت شاعری پر چھایا ہوا ہے اور تغزل کا وہ رنگ جو حسرت کی عام شخصیت
شاعری میں [illegible] ہے [illegible]

سید حامد
صدر انجمن ترقی اُردو ہند، دہلی

مقابلے کے امتحانوں کی تیاری

قارئین کرام کو غالباً علم ہوگا کہ اب زیادہ تر ملازمتوں کی بھرتی کمیشنوں کے ذریعے ہوتی ہے چونکہ بے روزگاری کی وجہ سے امیدواروں کی ایک بڑی تعداد سرکاری ملازمتوں کے لئے درخواست دیتی ہے اس لئے یہ نظام قائم کیا گیا ہے کہ امیدواروں کی صلاحیت کو مختلف مرحلوں میں جانچا جائے اور صلاحیت کی بنیاد پر ان کا انتخاب کیا جائے۔

سرکاری ملازمتیں مرکزی ہوتی ہیں یا ریاستی مرکز کے دو اہم کمیشن، پبلک سروس کمیشن اور اسٹاف سلیکشن کمیشن ہیں۔ ہر ریاست میں بالعموم ایک ریاستی پبلک سروس کمیشن ہوتا ہے جو ریاستی سیول سروس کے لئے تحریری امتحان اور انٹرویو کے ذریعے امیدواروں کو منتخب کرتا ہے مذکورہ بالا دو مرکزی کمیشنوں میں سے یونین پبلک سروس کمیشن، اعلیٰ سروسوں اور بڑی ملازمتوں کے لئے انتخاب کرتا ہے۔ مثلاً آئی اے ایس، آئی پی ایس، آئی ایف ایس، انڈین ریونیو سروس، انڈین پوسٹل سروس، انڈین آڈٹ اینڈ اکاونٹس، کسٹم اینڈ سنٹرل ایکسائز، انکم ٹیکس وغیرہ۔ اسٹاف سلیکشن کمیشن کے دائرہ انتخاب میں کلرک اور انسپکٹر، اڈیٹر، ان دیشی گیٹڈ وغیرہ آتے ہیں پبلک سروس انڈر ٹیکنگس ملازمتوں کی بھرتی کے لئے اپنا نظم الگ رکھتی ہیں۔ ریلوے سروسیز بورڈ، جن کی تعداد ۹ ہے، ریلوے کی ملازمتوں کے لئے امتحان اور انٹرویو لیتے ہیں۔ اسی طرح بینکوں کے لئے بہت سے کمیشن مختلف علاقوں کے ساتھ مخصوص ہیں۔

ریاستوں میں ریاستی پبلک سروس کمیشن، ریاستی سول سروس کے لئے بھی بھرتی کرتا ہے

اس کے علاوہ ریاستوں میں ماتحت یا سبارڈی نیٹ ملازمتوں کے لئے مرکزی اسٹاف سلیکشن کمیشن وضع کے ریاستی کمیشن قائم کئے گئے ہیں۔ مندرجہ بالا بیان سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ اب بیشتر ملازمتوں کے لئے صلاحیت کو معیار بنادیا گیا ہے۔ اس لئے مقابلوں کی تیاری کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔ ایک اور بات جو اس سلسلے میں اہمیت رکھتی ہے وہ ہے شہریوں کی زندگی میں حکومتوں کا آئے دن بڑھتا ہوا اثر و نفوذ اور اثر۔ اس لئے یہ لازمی ہو جاتا ہے کہ جو طبقہ ترقی کرنا چاہتا ہے اور خوش حال رہنا چاہتا ہے وہ حکومت اور اس کے دفاتر میں مناسب نمائندگی حاصل کرے اور جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں ملک کے جمہوری اور انتظامی نظام میں سرکار کے دفاتر میں نمائندگی حاصل کرنے کا واحد طریقہ مقابلہ کے امتحانوں کی تیاری کرنا اور ان میں بیٹھنا ہے۔

مسلمانوں کا جہاں تک تعلق ہے، یہ احساس شدت پکڑتا جا رہا ہے کہ انہیں ملک کے بند و بست میں نمائندگی برائے نام حاصل ہے آزادی کے ۲۲ سالوں کے دوران سرکاری ملازمتوں میں ان کا تناسب دن بدن کم ہوتا چلا گیا۔ دفاتر میں، خواہ وہ مرکزی ہوں یا ریاستی، وہ شاذ و نادر ہی نظر آتے ہیں۔ لہذا ان کی درخواستوں پر دھیان بالعموم ہمدردی اور تیز رفتاری کے ساتھ نہیں دیا جاتا اور ان کو اس سلسلے میں طرح طرح کی شکایتیں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ علاوہ بریں یہ جاں فرسا احساس ان کی رگ و پے میں سرایت کر گیا کہ اپنے ملک کے انتظام اور نظم و نسق میں ان کو دخل نہیں دینے دیا جاتا۔ ہمارے پاس اس قسم کے اعداد و شمار نہیں ہیں کہ مختلف ملازمتوں میں مسلمانوں کا تناسب کیا ہے لیکن اگر مثال کے طور پر اعلیٰ ملازمتوں کو لیا جائے تو ہر سال تقریباً ۸۰۰ یا ۹۰۰ جگہوں میں سے ایک یا دو جگہیں ان کے ہاتھ آتی ہیں حالانکہ آبادی کے تناسب کے لحاظ سے ہر سال ان کے ۱۰۰ امیدواروں کو منتخب ہونا چاہیئے تھا ایک قباحت یہ بھی ہے کہ آبادی کے تناسب سے مقابلے میں مختلف امتحانوں میں مسلمان امیدواروں کے بیٹھنے کی تعداد بھی بہت کم ہے اور جو بیٹھتے بھی ہیں ان میں سے بہت سے پوری تیاری نہیں کرتے۔ انہیں یہ شکایت بھی رہتی ہے کہ ان کے ساتھ مقابلے

کے امتحانوں میں انصاف نہیں کیا جاتا۔ اسی وجہ سے بھی بعض طالب علم ان امتحانات میں قسمت آزمائی سے گریز کرتے ہیں۔ یہ شکایت صرف جزئی طور پر صحیح ہو سکتی ہے۔ بعض امتحانات اور امتحان لینے والے کمیشن جانبداری کے شک و شبہ سے بالاتر ہوتے ہیں علاوہ بریں بہت سے امتحانوں کا نظم اس وضع کا ہے کہ ممتحنوں کو معلوم [redacted] کس امیدوار کا ہے اور اس کا نام کیا ہے۔ بعض انتخابیوں اور بھرتیوں میں اثرات کام کر جاتے ہیں اور بعض جگہ انٹرویو بورڈ کا رویہ پورے طور پر ہو سکتا ہے کہ منصفانہ نہ ہو لیکن بحیثیت مجموعی یہ کہا جا سکتا ہے کہ اعلیٰ ملازمتوں کے لئے انتخاب میں اثرات کارفرما نہیں ہونے پاتے اور اگر چھوٹی ملازمتوں کے لئے انتخاب میں نا انصافی روا رکھی جاتی ہے تو وہ بھی جزئی طور پر — یہ بات پھر بھی مسلم ہے کہ اگر کوئی امیدوار نمایاں طور پر اچھا ہے تو اس کی راہ میں تنگ نظری حائل نہیں ہو سکتی۔

مندرجہ بالا سطور سے یہ نتیجہ نکلا کہ مسلمانوں کو مناسب روزگار اور اپنے ملک کے انتظام اور ترقی میں معقول حصہ حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ مقابلے کے امتحانوں میں جانفشانی کے ساتھ شریک ہوں اور ہر شہر میں اس قسم کا انتظام کیا جائے کہ انہیں ملازمتوں کے مواقع اور مقابلے کے امتحانوں کی بابت ضروری اطلاعات ملتی رہیں اور کچھ نہ کچھ رہنمائی بھی میسر ہو جس کے تحت وہ تیاری کر سکیں۔ فارم بھر سکیں اور مضامین کا صحیح انتخاب کر سکیں۔ چھوٹے پیمانے پر یہ کام ہر شہر میں وہ لوگ کر سکتے ہیں جو ملازمتوں سے سبکدوش ہو چکے ہیں یا جو ملازمت کے دوران بھی کچھ وقت خدمت خلق کے لئے نکال سکتے ہوں۔

ہماری حکومت نے جسے اقلیتوں کی دراصل زیادہ فکر نہیں رہتی ہے، اس بات کی طرف کچھ دھیان دیا ہے کہ مسلمانوں کا تناسب سرکاری ملازمتوں میں کم کیوں ہوتا جا رہا ہے وہ یہ دھیان زیادہ پہلے اور زیادہ موثر طریقے سے دیتی اگر مسلمانوں کی تعلیم اور صلاحیت کے مقابلہ کی طرف توجہ دیتے۔ بہر کیف حکومت کا دھیان خاموشی کے ساتھ اس طرف دلایا گیا اور تین چار سال کی متواتر کوشش کے بعد حکومت نے یہ طے کیا کہ چونکہ مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں

لے کوئی ریزرویشن نہیں ہو سکتا الّا یہ کہ انہیں کم سے کم ملازمتوں کا اہل بنانے کی
کوشش کی جائے۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کو ہدایت دی گئی کہ وہ ان یونیورسٹیوں اور کالجوں میں
جہاں اقلیت کے طالب علموں کی معقول تعداد ہو وہاں مقابلے کی تیاری کے لئے مراکز کھولے۔
اس ہدایت کے تحت شروع میں سب سے پہلے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو اس کوچنگ سنٹر کے لئے جو
وہاں پہلے سے کام کر رہا تھا۔ امداد دی گئی۔ اور اس کے بعد ۳۵ اور مراکز ملک بھر میں کھولے گئے
جن میں سے ۲۰ یونیورسٹیوں میں اور ۱۵ ڈگری کالجوں میں تھے۔

ہر چند کہ یہ اسکیم ۱۹۸۴ء میں شروع کی گئی لیکن اس کے نتائج بہت امید افزا نہیں ہیں
راقم الحروف کو یو جی سی نے اس کمیٹی کا صدر بنا کر بھیجا جس کا کام یہ تھا کہ وہ ان مراکز کی جانچ کرے
اور اسکیم کو زیادہ موثر بنانے کے لئے اپنی سفارشات پیش کرے۔ یہ رپورٹ شمالی، مشرقی اور
جنوبی ہندوستان کے بعض مراکز کو دیکھنے کے بعد یو جی سی کو دے دی گئی۔ ان مراکز میں کامیابی
حسب امید نہ ہونے کی وجوہات اجمالاً حسب ذیل ہیں۔

(۱) بعض مراکز ایسی جگہوں پر کھولے گئے جہاں مقصود اقلیتوں کی تعداد کم ہے (۲) تربیت دینے
والوں میں مہارت اور دلچسپی کی کمی پائی گئی (۳) ان مراکز کی موجودگی کو ڈھنگ سے اور بڑے
پیمانے پر مشتہر نہیں کیا گیا۔ (۴) مقامی مشورہ اور تائید حاصل کرنے کی کوشش بھی پورے
طور سے نہیں کی جا سکتی۔ (۵) تعلیمی طور پر پسماندہ اقلیتوں کی طرف سے ان مراکز کی پذیرائی اور
ان سے استفادہ خاطر خواہ نہیں کیا گیا اکثر یہ دیکھا گیا کہ اگر ۵۰ امیدواروں کی تربیت کا انتظام ہے
تو ان میں ۵ یا ۱۰ سے زیادہ مذکورہ اقلیتوں کے امیدوار نہیں ہیں اس کے نتیجے میں بقیہ بچی ہوئی
۵۰ نشستیں دوسرے طالب علموں کو دے دی گئیں اس طرح مقابلے کے فن میں دوسرے
طبقوں اور پسماندہ اقلیتوں کے درمیان جو فاصلہ تھا وہ گھٹنے کے بجائے بڑھ گیا (۶) بعض جگہ
اس اسکیم کو الگ چلانے کے بجائے مقابلے کے امتحانوں کی عام اسکیموں یا درج فہرست ذاتوں
اور قبائیلیوں کی اسکیم میں مدغم کر دیا گیا۔ چنانچہ اس کا اصل مقصد فوت ہو گیا۔

یہاں یہ بات واضح کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ حکومت ہند نے اپنی دستاویز "نئی تعلیمی پالیسی عملی پروگرام (۱۹۸۶ء)" میں اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ ہندوستان میں دو فرقے تعلیمی اعتبار سے سب سے زیادہ پچھڑے ہوئے ہیں ایک مسلمان دوسرے نئے بودھ جو ڈاکٹر امبیڈکر کی پیروی میں بودھ مت کے دائرے میں داخل ہوئے۔ (۷) مسلمان طلبا بالعموم ایسے گھروں سے آتے ہیں جہاں تعلیم کا چرچا نہیں ہے اور جہاں ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے دوران ان کو گھر پر تعلیمی مدد نہیں ملی۔ لہٰذا وہ کلاس میں اپنے ہم جماعتوں کا بالعموم مقابلہ نہیں کر پاتے۔ اس سے سب سے بڑی خرابی یہ رونما ہوتی ہے کہ ان کا اعتماد اپنی صلاحیتوں سے ہٹ جاتا ہے اور وہ خود کو کم اہل اور غبی سمجھنے لگتے ہیں ایک بار اگر حوصلہ پست ہو گیا تو زندگی کی دوڑ میں آگے بڑھنا بہت دشوار ہو جاتا ہے۔

آخری دشواری کہ جس کا ذکر ساتویں وجہ کے طور پر آیا ہے، دو حل ہیں ایک طویل مدتی اور دوسرا فوری۔ طویل مدتی جس کے بغیر بات دراصل بنے گی نہیں یہ ہے کہ مسلمان اپنی بیٹیوں کو تعلیم دلانے کو پہلی ترجیح دیں تاکہ نئی نسلیں اس تعلیمی امداد سے جو بچوں کو بہر حال درکار ہوتی ہے محروم نہ رہیں یا فوری حل یہ ہے کہ ہم اپنے گھر میں جو کچھ فراہم نہیں کر پا رہے ہیں ہمارا سماج یا معاشرہ اس کی ذمہ داری لے۔ اس کے لئے اسکول کے اوقات کے باہر ایسے کلاس جنھیں اصلاحی یا تقویتی Remedial اور Promotional & Enrichment کہا جاتا ہے کھولے جائیں، جن میں باوسائل سے بہتر طالب علموں کی کمزوریوں کو دور کیا جائے اور انھیں اس لائق بنایا جائے کہ یونیورسٹی کی سطح تک پہونچتے پہونچتے اپنے ہم وطنوں کے برابر آسکیں۔ یہ کام بھی شہر شہر مقامی ہمدردوں کی کوشش سے کیا جا سکتا ہے۔

غور کیجئے تو اس دو ہی کام کرنے کے ہیں پہلا تعلیم کی زبردست توسیع جس میں تعلیم نسواں کو زیادہ اہمیت دی جائے۔ دوسرا مقابلے کے امتحانوں اور عام طور پر زندگی کی دوڑ میں مقابلے کی صلاحیت پیدا کرنے کے لئے باقاعدہ منظم کوششیں۔ یہی نسخہ کیمیا ہے جس سے ہماری بقا اور سرخروئی کے امکانات پیدا ہو سکتے ہیں۔ اقلیت کے افراد کو بہر حال اکثریت کے افراد سے زیادہ

محنت اور جانفشانی کرنی چاہیئے۔ کچھ اس لئے بھی کہ اکثریت کو جو سہولتیں اور رعایتیں حاصل ہو جاتی ہیں ان سے بھی عہدہ برآ ہوا جاسکے۔

کوچنگ سنٹرز یا تربیتی مراکز کی تفصیل ذیل میں پیش ہے ہماری اپنے قارئین سے اپیل ہے کہ ان مراکز میں دلچسپی لیں ان کے قرب و جوار میں جو مسلمان اور بودھ مت کے نئے ماننے والے رہتے ہوں ان تک یہ بات پہونچائیں کہ ان مراکز سے اگر فائدہ اٹھایا جائے تو ملازمت ملنے کے امکانات روشن ہو جاتے ہیں اس کے علاوہ وہ پیروفیشنل اور انبرجمینٹ کلاسز بھی کھولے جا سکتے ہیں جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ یہ بات بھی ملحوظ رکھے کہ اس دور کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انسان چھوٹی سی ملازمت سے شروع کر کے بڑے سے بڑے عہدے تک پہونچ سکتا ہے لہذا ہم کو اس میں عار نہیں محسوس ہونی چاہیئے کہ ایک چھوٹی سی ملازمت کے لئے مقابلے کے امتحان میں بیٹھ رہے ہیں۔ ہر مقابلے کا امتحان خواہ وہ کسی منصب کے لئے ہو دوسرے مناصب کے امتحانات کی تیاری میں بھی معاون ہوتا ہے ان لوگوں کے لئے جو چھوٹی سی ملازمت میں داخل ہو گئے ہیں یہ کھلی چھوٹ ہے کہ وہ بڑے مناصب کے امتحانات میں بیٹھ سکیں اور ایسی مثالیں بھی ہیں کہ ایک شخص جو کلرک کی حیثیت سے بھرتی ہوا اس نے سول سروسیز کے امتحان کے ذریعے IAS میں راہ پالی جمہوریت میں ترقی کی حد آسمان ہے ہمیں ان بنیادی مواقع کی تشکیل کرنی چاہیئے اور ان سے فائدہ اٹھانا چاہیئے جو کسی جمہوری نظام میں ہر شہری کا بنیادی حق ہوتے ہیں اس کے لئے ہر شہری کا بنیادی حق ہوتے ہیں اس کے لئے ہر شہر میں ایسے لوگوں کا کمر کس کے میدان میں آجانا ضروری ہے جو نئی نسل کی رہنمائی اور مدد کر سکتے ہیں اس کے لئے نہ تمام حکام کی ضرورت ہے نہ لاؤ لشکر کی۔ ضرورت ہے تھوڑے سے خلوص، تنظیم و جہد اور سلیقہ کی اور یہ چیزیں ہر جگہ فراہم ہو سکتی ہیں

ان یونیورسٹیوں اور کالج کے پتے جہاں کوچنگ سنٹر قائم ہیں

یونیورسٹیاں : (۱) آگرہ یونیورسٹی آگرہ ۲۸۲۰۰۴ (یوپی) (۲) علیگڑھ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ (یوپی) (۳) الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد ۲۱۱۰۰۲ (یوپی) (۴) بنگلور یونیورسٹی بنگلور ۵۶۰۰۵۶

(کرناٹک) (۵) بھوپال یونیورسٹی بھوپال ۴۶۲۰۰۱ (ایم پی) (۶) کالی کٹ یونیورسٹی کالی کٹ ۶۷۳۶۳۵ (کیرالا) (۷) دیوی اہلیہ وشو ودیالیہ اندور ۴۵۲۰۰۱ (ایم پی) (۸) گوہاٹی یونیورسٹی گوہاٹی ۷۸۱۰۱۴ (آسام) (۹) گورکھپور یونیورسٹی گورکھپور ۲۷۳۰۰۱ (یوپی) (۱۰) جامعہ ملیہ اسلامیہ جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵ (۱۱) جموں یونیورسٹی جموں ۱۸۰۰۰۱ (جموں وکشمیر) (۱۲) کشمیر یونیورسٹی سرینگر ۱۹۰۰۰۱ (کشمیر) (۱۳) ایل این متھلا یونیورسٹی دربھنگہ (بہار) (۱۴) لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ ۲۲۶۰۰۷ (یوپی) (۱۵) ایم ڈی یونیورسٹی روہتک ۱۲۴۰۰۱ (ہریانہ) (۱۶) میرٹھ یونیورسٹی میرٹھ ۲۵۰۰۰۱ (یوپی) (۱۷) عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد ۵۰۰۰۰۷ (آندھرا) (۱۸) ناگپور یونیورسٹی ناگپور ۴۴۰۰۰۱ (مہاراشٹر) (۱۹) پٹنہ یونیورسٹی پٹنہ ۸۰۰۰۰۵ (بہار) (۲۰) ساؤتھ گجرات یونیورسٹی سورت ۳۹۵۰۰۷ (گجرات)

کالج (۱) بی این کے بی ڈگری کالج اکبرپور فیض آباد (یوپی) (۲) گاندھی فیض عام کالج شاہجہانپور یوپی۔ (۳) گورنمنٹ کالج کاسرگوڈ ۶۷۱۱۲۳ (کیرل) (۴) حمیدیہ گرلس ڈگری کالج الہ آباد (یوپی) (۵) کرامت حسین مسلم گرلز ڈگری کالج لکھنؤ (یوپی) (۶) لال بہادر شاستری ڈگری کالج گونڈہ (یوپی) (۷) ایم ای ایس کالڈی کالج منگھاٹ (کیرل) (۸) این پی آرٹس اینڈ کامرس کالج کوشد (گجرات) (۹) این ایس ایس کالج بیجری (ملاپورم) (کیرل) (۱۰) لکھنؤ کرسچین ڈگری کالج لکھنؤ (یوپی) (۱۱) راجہ سرفوجی گورنمنٹ کالج تھنجاور (تاملناڈو) (۱۲) سینٹ میری کالج سلطان بیتھری کالی کٹ (کیرل) (۱۳) زمورین گروایورپن کالج کالی کٹ (کیرل) (۱۴) سری نارائنا کالج نیشکا تریچور (کیرل) (۱۵) سیفیہ کالج بھوپال (ایم پی) (۱۶) ڈی اے وی کالج جالندھر (پنجاب) (۱۷) شبلی نیشنل کالج اعظم گڑھ (یوپی) (۱۸) فاروق کالج کالی کٹ (کیرل) (۱۹) جمال محمد کالج تریچراپلی ۶۲۰۰۲۰ (تاملناڈو) (۲۰) انوار العلوم کالج ملے پلی حیدرآباد (آندھرا پردیش) (۲۱) گورنمنٹ کالج مالیرکوٹلہ ۱۴۸۰۲۳ (پنجاب) (۲۲) انجمن اسلام ہنوا آرٹس سائنس کالج ۵۸۰۰۲۰ (۲۳) حلیم مسلم ڈگری کالج کانپور (یوپی) (۲۴) سرسید کالج تلی پرمبا (کیرل) (۲۵) ایم ای ایس پونانی کالج پونانی (کیرل) (۲۶) ایم ای ایس ممپاڈ کالج ملاپورم (کیرل) (۲۷) مولانا آزاد کالج آف آرٹس اینڈ سائنس اورنگ آباد (۲۸) پی ای ایس ڈاکٹر امبیڈکر کالج ... ۴۳۱۰۰۱ (مہاراشٹر) ▲▲

(اعلانیہ مسلم انڈیا، انگریزی ماہنامہ مئی ۱۹۹۰ء)

سید شہاب الدین
(ایڈیٹر مسلم انڈیا و صدر انصاف پارٹی)

ہندوستانی سیاست میں ذات پات بحیثیت حرکیاتی عوامل

ذات پات کا تنازعہ: ذات پات کی شناخت اور اس پر مبنی اتحاد ہندوستانی سماج کا مذہب جماعت، زبان اور علاقہ سے زیادہ ایک غالب نسلی وصف رہا ہے جمہوری عمل نے ذات پات کی اس شناخت کو نہ صرف یہ کہ بڑھاوا دیا ہے بلکہ ذات پات کی مزید تفریق کا باعث بنا ہے۔ مستقبل قریب میں ذات پات کی اس ذہنیت کے خاتمے کا کوئی امکان نہیں دکھائی دیتا۔ ذات کی بنیاد پر اس تقسیم در تقسیم نے قوم میں اپنی عددی طاقت کے تناسب سے کہیں زیادہ سیاست اور معیشت میں حصہ داری اور مطالبہ کا رجحان پیدا کر دیا ہے ذات پات کے ایسے گروپس جو اس تعلق سے احساس محرومی کا شکار ہیں وہ اب اس میں مزید حصہ کا مطالبہ کر رہے ہیں اور ایسے گروپس جو قانون ساز اداروں اور افسر شاہی میں اپنے تناسب سے کہیں زیادہ نمائندگی کرتے رہے ہیں وہ اس قسم کے مطالبات کی نہ صرف مزاحمت پر مائل ہیں بلکہ چور دروازوں اور خفیہ حکمت عملی کے ذریعے اپنے وجود کی بقاء اور سابقہ موقف کی برقراری کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ اگر اس زاویہ سے نظر ڈالیں تو ذات پات کا یہ تنازعہ ہندوستانی سماج جو سماجی انصاف اور سیاسی و معاشی مساوات کی منزل کی طرف گامزن ہے اس کے ارتقائی عمل کا ایک ناگزیر اور جابر مرحلہ دکھائی دیتا ہے۔

طبقاتی سماج: ہندوستانی تہذیب کوئی مجروح تہذیب نہیں ہے اور نہ ہی ہندوستانی سماج ایک منتشر سماج ہے لیکن اس کی ہمہ گیر طبقاتیت اور عمودی تقسیم نے اس کو ایک طبقاتی

سماج کا روپ دے رکھا ہے اور ہر طبقہ اس جمہوری نظام میں اپنا ایک مقام اور قومی وسائل اور خدمات میں اپنا ایک حصہ طلب کر رہا ہے ایک طبقاتی سماج میں کوئی ایک فرد نہیں بلکہ ایک گروہ اس کی اکائی بنتا ہے لیکن جہاں بہ حیثیت قوم ہم سب قانون کی نظر میں مساوی درجہ رکھتے ہیں وہاں بہ حیثیت ایک گروہ یا قابل شناخت گروہ کے افراد کی حیثیت سے یہ بات نہیں۔ اس طرح مفادات کا تصادم کسی نہ کسی درجہ میں ناگزیر ہے جو ووٹ بنکس کا ایک روپ اختیار کرتا ہے اور جہاں مختلف سیاسی جماعتیں ان ووٹ بنکس کا استعمال کرتے ہیں وہیں یہ ووٹ بنکس بھی ان سیاسی جماعتوں کے استحصال کا باعث بنتے ہیں۔

ہر سیاسی جماعت کا بالآخر ایک معروف سماجی حلقہ ہے جس کے مختلف گروپ یا گروپس اندر سے اس پر اثر انداز ہوتے ہیں اور جن کے خواہشات کی یہ ترجمانی کرتی ہے جن کے مفادات کی یہ خادم ہے جن کے مقاصد کو یہ فروغ دیتی ہے اور جن کے ووٹ بنکس پر یہ بھروسہ کرتی ہے۔

مستحکم سماجی توازن اور متناسب نمائندگی

یہ بات بالکل اغلب ہے کہ ۱۹۹۰ء کے دہے کی قومی سیاست میں ذات پات پر مبنی ہر ریاست میں مختلف گروہوں کے درمیان ایک مستقل کشمکش کا غلبہ ہوگا جو مشترک مفادات کی تلاش میں ماورائے ریاستی حدود اقتدار کے متلاشی مختلف گروہوں سے بہ حیثیت حلیف یا حریف باہمی قابلِ قبول شرائط پر تعلق کو قائم کریں گے تاکہ وہ اپنے حیطۂ اقتدار کو وسعت دے سکیں۔ ہندوستانی سیاست کا مستقبل اس بات پر منحصر ہے کہ حصول اقتدار کے اس کھیل کے لئے چند بنیادی اصول وضع کیے جائیں تاکہ اس کشمکش میں خود سیاست مجروح ہونے سے محفوظ رہ سکے۔ اگر ملک کو ایک مدنی سماج اور ایک سیاسی اکائی کی حیثیت سے زندہ رہنا ہے تو بحران پر قابو پانا ہوگا اور تصادموں کو ایک حد کے اندر رکھنا ہوگا اور ایک نیا سیاسی توازن، ایک نیا میزانِ طاقت جو عدل و مساوات پر مبنی ہو تشکیل محفوظ رکھنا ہوگا۔

ایک مستحکم سماجی توازن اسی صورت میں حاصل کیا جا سکتا ہے جبکہ تمام سماجی گروپس کو جو اقتدا

کہ اس ڈھانچہ سے وابستہ میں سیاسی و معاشی بنیاد پر مساویانہ و متناسب نمائندگی دی جائے۔ یہ اس بات کا متقاضی ہے کہ ایسی قابل انتظام اور ممکنہ قسم کی مجالس نظم ونسق کی اکائیاں تھوں۔ جو انہیں یادگاروں، خواہشات اور تمناؤں میں مشترک ہوں۔ اس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ اقتدار کی عدم مرکوزیت اوپر سے لے کر نیچے پنچایتوں کی سطح تک ہو تاکہ نظم ونسق کی ہر اکائی کو ایک بڑے پیمانے پر خود اختیاری حاصل ہوسکے۔ یہ خود مختاری جہاں ایک طرف غالب سماجی گروپ کو اپنی اکثریتی سطح پر تشفی کا باعث ہوگی تو وہیں سماجی دباؤ سماج کے کمزور طبقات کی حفاظت کا ضامن ہوگا۔ یہ تخیل ایک ایسا خود مختارانہ نظام کا نقشہ پیش کرتا ہے جو ہر ریاست میں خود مختار اضلاع، ہر ضلع میں خود مختار بلاکس اور ہر بلاک میں خود مختار پنچایتوں کی شکل میں ظاہر ہوں اور جہاں کہیں نسلی بنیاد پر افراد کے مجموعوں کا ارتکاز ایک معینہ علاقہ میں جہاں ایک دوسرا نسلی گروپ غالب نسلی گروپ سے مختلف ہو نظم ونسق کے دوسری اوپری سطح پر نمائندگی کرتا ہو۔ یہ اس بات پر بھی دلالت کرتا ہے کہ قانون ساز اداروں اور افسر شاہی انتظامیہ میں تمام سماجی گروپس کی منصفانہ نمائندگی ہو اور اس میں کسی کی بھی واضح طور پر تناسب سے زیادہ نمائندگی ہو اور نہ کم۔ یہ اس بات کا بھی متقاضی ہے کہ ایک شریفانہ کوشش اس بات کی بھی کی جائے کہ یکساں طور پر قابل اطلاق شرائط پر سیاسی اور سماجی میدانوں میں تحفظات اور کوٹہ سسٹم کے ذریعہ ہر ایک کو ترقی کے لئے مساویانہ مواقع فراہم کیے جائیں۔

پکے فرقہ پرست :- بدقسمتی سے ہندوستانی سماج ایک منقسم شخصیت - Split Personality کا شکار ہے ایک طرف تو ہم فرقہ واریت کی مذمت کرتے ہیں اور دوسری طرف ہم سب اپنی فکر وعمل میں پکے فرقہ پرست واقع ہوئے ہیں ایک طرف تو ہم ذات پات سے مبرا سماج کی طلب میں کٹر ھتے ہیں اور دوسری طرف ہر ممکنہ طریقہ سے ہم خود اپنی ذات برادری کے مفاد کے لئے کوشاں ہیں۔

ہم ہندوستانی ہیں :- اس طرز فکر کے احساس کے نتیجے میں جمہوریہ ہند نے اپنی دہ سالہ

مردم شماری میں ذات شماری کو غیر ملوکہہ دیا ہے ہم ہندوستانی ہیں اور ہم فرقہ واریت پر یا ذات پات کی اساس پر عمل پیرا نہیں ہیں شاید یہ بات ذات پات پر مبنی ہر طاقتور جتھے کو اپنے غالبانہ ادعا کے ذریعہ انتخابی سودا بازی میں بے دردانہ مصروف بنائے ہوئے ہے ۔۔۔

ذات پات کی بنیاد پر مردم شماری :۔۔ گذشتہ جی بر ذات مردم شماری ۱۹۳۱ء میں کرائی گئی بہار جمہوریہ ہند کی دوسری بڑی ریاست ہے جو ملک کی آبادی کا تقریباً دس فیصد کا حامل ہے اور اسی تناسب سے لوک سبھا کی رکنیت بھی رکھتا ہے ۔ آیئے اب ہم اس چیز کا بہار میں ذات پات کے اعداد و شمار کی روشنی میں مطالعہ کریں اس مفروضہ پر کہ گذشتہ ۶۰ سال کے دوران ہر ذات برادری کے گروپ کا آبادی کے تناسب میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی یعنی ان کی شرح اضافہ یکساں رہی اگرچہ کہ ان کے سیاسی مفادات میں نسبتاً بڑی تبدیلی رونما ہوئی ہے ۔ ریاست بہار میں اس صدی کی موڑ پر بنگالیوں، مسلمانوں کائستوں اور برہمنوں کا غلبہ رہا ۔ گذشتہ چند برسوں کے دوران مسلمان اور کائستھ ذرا گھٹ گئے اور ان پر بھومی ہار اور راجپوت فوقیت سبقت لے گئے ۔ پھر کرمی اس منظر پر آتے ہیں اور شودر اور اچھوت ایک سماجی طاقت بن کر ابھرتے ہیں ۔ اسی طرح آدی واسی بھی ۔ لیکن جب کہ اعلیٰ ذات کے ہندوؤں اور شودروں، اچھوت آدی واسی اور غیر ہندوؤں کے درمیان اضافی توازن میں ایک ایسی عاملانہ تبدیلی آئی جس میں بعض ذیلی ذات پات والے گروپس نے اوروں کی نسبت اچھا مظاہرہ کرتے ہوئے دوسرے ہم ذات گروہوں سے ... کی ... سے بہتر ۔ اسی طرح اعلیٰ ذات کے لوگوں میں راجپوتوں کو ... ر اور برہمنوں اور بھومی ہاروں کو انحطاط کا سامنا کرنا پڑا ۔ شودروں میں پہلے کرمیوں (Kurmis) ... کوئیریوں (Koeris) ... نیا مقام بنایا ... یادو طبقہ ... پچھڑ گئے ... چھوٹی ... (SADHS) ... حصہ ... قبضہ ... بہار میں ... (ORAO) ... (MANDA) ...

کو ترقی کی دوڑ میں بہت پیچھے چھوڑ دیا۔ چنانچہ اس تعلق سے چند اعداد و شمار پیش کیے جا رہے ہیں جو بڑی عرق ریزی سے جمع کیے گئے ہیں جو غور و فکر کے محتاج ہیں

نمبر شمار	ذات پاتی گروہ	آبادی کا شرح فیصد	ایم ایل اے کی تعداد ۱۹۸۵ء	ایم ایل اے کی تعداد ۱۹۹۰ء	ایم ایل اے کا شرح فیصد ۱۹۸۵ء	ایم ایل اے کا شرح فیصد ۱۹۹۰ء	تناسب ۱۹۸۵ء	تناسب ۱۹۹۰ء	۱۹۸۵ء اور ۱۹۹۰ء کے درمیان فرق
۱	a۔ برہمن	۴٫۶۵	۳۳	۲۶	۱۰٫۲	۸٫۰	+۱۱۹	+۷۲	-۲۱٫۵
	b۔ بھومی ہار	۲٫۸۴	۳۹	۳۵	۱۲٫۰	۱۰٫۸	+۳۴۵	+۲۳۸	-۱۰٫۰
۲	راجپوت	۴٫۲۹	۴۳	۳۸	۱۳٫۲	۱۱٫۷	+۲۱۵	+۱۷۹	-۱۰٫۹
۳	a یادو	۱۰٫۸۹	۴۶	۶۴	۱۴٫۰	۱۹٫۶	+۳۰	+۸۰	+۳۸٫۰
	b کویری	۴٫۱۳	۱۲	۱۱	۳٫۶	۳٫۴	-۱۳	-۱۷	-۵٫۵
	c کرمی	۳٫۳۰	۱۴	۱۴	۴٫۳	۴٫۳	+۳۰	+۳۰	--
	d کائستھ	۱٫۱۱	۳	۴	۰٫۹	۱٫۲	-۲	+۷	+۳۳٫۳
	E دوسرے شودر	۲۰٫۴۲	۱۳	۳۲	۴٫۰	۹٫۸	-۸۷	۶۸	+۴۵
	F کل شودر	۴۹٫۸۴	۸۸	۱۲۵	۲۶٫۰	۳۸٫۴	+۴۶	-۲۳	۴۲٫۰
۴	a دوسادھ	۴٫۲۰	۱۵	۱۲	۴٫۶	۳٫۷	+۱۴	-۳۰	-۱۹٫۶
	b چمار	۳٫۶۸	۱۶	۱۱	۴٫۹	۳٫۴	+۲۳	-۱۵	-۳۰٫۱
	c دوسرے اچھوت	۴٫۳۲	۱۸	۲۳	۵٫۵	۷٫۱	-۱۲	+۱۱	+۲۹٫۰
۵	درج فہرست قبائل (شیڈول ٹرائب)	۸٫۰۰	۲۹	۳۰	۸٫۹	۹٫۲	+۱	+۵	+۳٫۴
۶	a مسلمان	۱۴٫۰۰	۳۳	۲۰	۱۰٫۲	۶٫۲	-۱۶	-۵۰	-۳۹٫۲
	b دیگر اقلیتی طبقات	[illegible]	۰	۳	۰٫۸	۰٫۹	-۱۰	-۵۰	-۵۰٫۰
	[illegible]								

ریاست بہار کی مجلسِ مقننہ میں نمائندگی کرنے والے مختلف فعال گروپس کے متعلق مذکورہ اعداد و شمار کا اگر تجزیہ کیا جائے تو اس کے حسب ذیل نتائج اخذ کیے جاسکتے ہیں ۔

اعلیٰ ذات کے برہمن، بھومی ہار، اور راجپوت روبہ تنزل ہوچکے ہیں جن کے اندر ۱۹۸۵ سے ۱۹۹۰ کے درمیان مسلمانوں کی نمائندگی کا بُرا حال ہے ۲۱٫۵، ۱۰ اور ۹٫۰۱ فیصد کمی آگئی ہے لیکن اس کے باوجود بھومی ہار کی نمائندگی ۲۳۸ فیصد اور راجپوتوں کی ۹۷ فیصد نسبتاً زیادہ ہے فی الجملہ درمیانی ذات گروپ کی نمائندگی اپنی تعداد کے نسبتاً بہت کمی پر برقرار رہی ہے جو ۸٫۵۴ سے گھٹ کر ۲۳٫۲ رہ گئی ہے، دوسرے یادوؤں کوردوؤں اور کرمیوں کے کوئیری اور کرمی تقریباً اپنے واجبی حصہ کی سطح پر جابلی ہے لیکن یادوؤں نے برہمنوں کی بہ نسبت ۱۹۹۰ میں ۸۰ فیصد زائد از تعداد نمائندگی کی طرف بہت بڑی چھلانگ لگائی ہے جب کہ دوسرے شودروں کی نمائندگی اپنی تعداد کے ۶۳ فیصد نسبتاً کم ہے۔ اچھوتوں میں دوساد اور چمار گھٹ گئے ہیں لیکن دوسرے اچھوت ۱۴ فیصد کمی سے ۱۱ فیصد اضافہ کی طرف ایڈ لگائے ہیں درج فہرست اور درج فہرست قبائل دونوں میں تقریباً اپنی تحفظات کی سطح پر جامد ہیں مذہبی اقلیتوں میں مسلمانوں کی نمائندگی کا حال بہت ہی بُرا ہے جو ۲۷ فیصد کمی سے گھٹ کر ۵۶ فیصد کمی تک پہنچ گئی ہے ۱۹۸۵ء سے ۱۹۹۰ء کے درمیان کے تفاوت کی شرح اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جب تک کہ اس کی اصلاح نہ کی جائے برہمن، بھومی ہاروں اور راجپوتوں اور مسلمانوں میں یہ کمی کا تفاوت بڑھتا ہی جائے گا جبکہ شودروں کی تفاوت کی شرح میں اضافہ ہوگا۔ شودروں میں بھی یادو، دوسرے شودروں اور دوسری ذات والوں کی قیمت پر بڑھتے ہی جائیں گے اور غیر دوساد اور غیر چمار، چماروں اور ساد ھووں کی قیمت پر بڑھتے ہی جائیں گے۔ بدقسمتی سے درج فہرست طبقات اور مسلمانوں میں مختلف ذیلی گروپس کی تقسیم کے اعداد و شمار کے دستیاب نہیں ہیں لیکن اتنا تو کہا جاسکتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کے درمیان موجود غیر صالح عناصر کا دباؤ رہتا ہوگا۔

اُوپر والے نیچے والوں کو محروم کرتے ہیں:-

اس طرح نہ صرف مختلف ذاتوں کے درمیان بلکہ مختلف ذاتوں کے ذیلی گروپس کے درمیان موجود ان نامساوی یا نقوشِ نمائندگی کو پہچانا جا سکتا ہے اور اگر کوئی ان کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کرے تو یہ بات بالکل واضح ہو جائے گی کہ ہر ذات کے ذیلی گروپ اور ذیلی در ذیلی گروپ کے سماج میں موجود ترقی یافتہ طبقے نے اپنے طبقہ کے عوام کی جس کی کہ وہ نمائندگی کرتے ہیں یا جن کے نام پر وہ انصاف کا مطالبہ کرتے ہیں، حق تلفی کرتے ہوئے تمام سیاسی و معاشی فوائد کے ایک بہت بڑے حصے کو ہڑپ کئے ہوئے ہیں۔ وہ لوگ جو اپنے سے اوپر والوں سے اپنے لئے انصاف طلب کرتے ہیں۔ وہی اپنے سے نیچے والوں کو اس سے محروم کرتے ہیں۔ مسلمانوں کے تعلق سے بھی یہی بات کہی جا سکتی ہے (اگر اس تجزیہ کی خاطر ان کو بھی ایک "ذات" گروپ شمار کیا جائے) ان میں اشرف، سید، شیخ اور پٹھان گروپس نے اپنے سے زیرین طبقات کے لوگ بالخصوص جلاہوں کو جو مسلم آبادی کا تقریباً ۲۵ فیصد ہیں اور دوسرے برابر کے پسماندہ گروپس جن کا شمار بھی ۲۵ فیصد ہے ان کو اپنے واجبی اور مستحقہ حصہ سے محروم کر رکھا۔

سماجی استحکام، ہم آہنگی کا ضامن ہے:-

یہ بات بالکل بدیہی ہے کہ مختلف طبقاتی گروپس کے درمیان تمام سماجی وسائل و ذرائع، اشیاء و خدمات کی ایک مناسب اور عادلانہ تقسیم اور اس کے ساتھ ساتھ سیاسی و انتظامی امور میں ان گروپس کا منصفانہ حصہ ہی ایک ایسی بنیاد ہے جو ایک ہمہ نسلی قومی اور ایک کثیر طبقاتی سماج جیسا کہ ہمارا ہے اس میں سماجی استحکام اور ہم آہنگی کا ضامن ہے مجلس مقننہ کی ہئیتِ ترکیبی اور نہ اس سے کچھ کم عوامی روزگار کے ادارے اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ عدل و انصاف عوام کے لئے تمنائے دور دراز کی حیثیت رکھتے ہیں اور اعلیٰ ذات کے گروپس اور چند گنے چنے کم ذات کے گروپس جو اقتدار کی اس کشمکش میں حکمران طبقے سے برسرِ پیکار رہیں وہی آج سیاسی منظر پر چھائے ہوئے ہیں اور باہم توافق و تطابق میں لگے ہوئے ہیں اور یہ

Khan Ahmed Aijaz کی زیر تحقیق ہیں۔

اقتدار کی رسہ کشی :۔ جس مستقبل قریب کی پیش بینی کی جاسکتی ہے اس میں اقتدار کی رسہ کشی ذات پات کی بنیاد پر ہوگی اور جس میں کوئی دس ذات پات کے گروپس حصہ لیں گے پرانے اتحاد ٹوٹ جائیں گے (جس طرح برہمن، مسلم، ہریجن اتحاد ٹوٹ چکا ہے) نئے اتحاد تشکیل پائیں گے جیسے Ajgar ۔ اب بھی اس بات کی گنجائش اور توقع ہے کہ اس میدان میں نئے کھلاڑی ابھریں گے جو اس کھیل کے قواعد سیکھیں گے خود اپنے میں ہمت و اتحاد پیدا کریں گے تاکہ وہ ماتحتی اور دبیل وکم حیثیت کے لوگوں کی طرح نہیں بلکہ خود مختار اکائیوں کی طرح کام کریں گے۔ اس طرح نہ ہی کوئی فرقہ وارانہ یا ذات پر مبنی اتحاد ایک ذیلی گروپ کو اس بات سے روک سکے گا کہ وہ اپنی شناخت و اتحاد کو منواتے ہوئے اپنے جائز حصہ کا مطالبہ کرے سیاسی کھیل میں کامیابی بالآخر اس بات کا ثبوت ہوگی کہ آیا ایک مخصوص گروپ یا ذیلی گروپ جمہوریت کے اس عمل میں میعادی انتخابات کی شکل میں رونما ہوتے ہیں کامیابی سے ہمکنار رہے۔ تمام گروپس اور ذیلی گروپس الیکشن کے راستے کو اختیار کرنے پر مجبور ہیں۔ مگر افسوس کہ کوئی بھی اس سلسلہ میں صحیح طریقہ کار کو اختیار کرنے کے لئے تیار نہیں کیونکہ ہر ایک انتخابی طریقہ کار کا استعمال کرتے ہوئے مجالس مقننہ میں اپنے لئے زیادہ سے زیادہ جگہ بنانا چاہتا ہے جو اقتدار کا سرچشمہ ہے۔ بعض اوقات ایسی دسیسہ کاریوں سے جس پارٹی میں ان کا غلبہ ہے اپنے لئے تناسب سے زائد ٹکٹوں کی اجرائی کے ذریعے اور بعض اوقات اپنی جماعتی حدود کو پھلانگتے ہوئے دوسرے گروپس کے ساتھ معاہدوں کے ذریعے۔ ان گروپس یا ذیلی گروپس کے ہر اتحاد میں سے کوئی ایک گروپ۔ ایک فطری لیڈر یا شاہ ذات master caste کی طرح ابھرتا ہے۔ بعض اوقات میں لیڈر گروپ بھی ان قدیم طاقتوں کی جابکدستیوں کا شکار ہوجاتے ہیں اور وہی پرانا نقشہ تسلط اس تبدیلی کے فریب نظر کے پیچھے برقرار رہتا ہے۔ جیسے بہار میں ایک درج فہرست طبقہ کے چیف منسٹر کے پیچھے راجپوتوں کا تسلط یا ایک مسلم چیف منسٹر کے

پیچھے برہمنوں کا تسلط۔ لیکن کچھ مدت کے بعد جمہوریت اپنے آپ کو منوائے گی اور اس قریب تقریباً یقینی کے درمیان موجودہ سسٹم کو ختم کر دے گی اور اقتدار اعلیٰ ذات کے ہاتھوں سے نکل کر شودروں کے ہاتھ میں منتقل ہو جائے گا۔

منصفانہ سیاسی تحریک:۔ لیکن کیا غیر شودروں کے لئے شودر راج کچھ بہتر ہو سکے گا۔ جس طرح شودروں کے لئے برہمن راج یا راجپوت راج رہ چکا ہے۔ لہٰذا اس طرح ابھرنے والی طاقتیں اقتدار کی اجارہ داری کی کوشش نہ کریں اور نہ ہی اب تک کے محروم گروہوں کو مزید محروم کریں اور نہ ہی اپنے جائز اور مستحقہ حصہ سے ہٹ کر چند حقیر مفادات کی خاطر ان کی تائید اور حمایت خریدنے کی کوشش کریں۔ موجودہ حالت میں ہر کوئی سیاسی اُفق پر اپنی نگاہ جمائے جائے ہوئے ہے۔ ایک ایسی سیاسی تحریک کے لئے جو بالفعل تمام سماجی گروہوں اور ذیلی گروہوں کے ساتھ مساویانہ اور منصفانہ سلوک کرے۔ چاہے وہ برہمن ہو یا راجپوت یا یادو گروپ۔ جب بھی وہ برسر اقتدار آئیں۔ ان کو اپنے حلیفوں کے ساتھ ہی نہیں بلکہ حریفوں کے ساتھ بھی خوش معاملگی اختیار کرنی ہوگی اس لئے کہ اس معاملے میں کوئی مستقل حلیف نہیں ہیں کیونکہ کسی ایک گروپ یا ذیلی گروپ کا ایک طرف سے دوسری طرف سیاسی انحراف موجودہ مساوات کو درہم برہم اور میزان اقتدار کو زیر و زبر کر سکتا ہے۔

جمہوری نمائندگی:۔ اس میں جو بات اہم ہے وہ اس بات کا احساس کہ جہاں جمہوری نمائندگی نے لوگوں نے اقتدار کی بھوک کو تیز کر دیا ہے اور گروہی اتحاد کی صورت گری کی ہے وہیں حصول انصاف کے جذبات کو برانگیختہ بھی کیا ہے چونکہ انصاف کو بلحاظ فطرت آفاقی ہونا چاہیئے اس لئے اقتدار کی حصہ رسدی بھی ہونی چاہیئے ایک عادلانہ سماج میں بعض ایسے گروہ جو کل تک کرسی اقتدار پر فائز تھے اور آج اس سے معزول کر دیئے گئے ہیں ان کو بھی اس نئے تقسیمی نظام میں اپنے واجبی اور مستحقہ حصہ سے محروم نہیں کیا جانا چاہیئے۔

خودکشی:۔ موجودہ عصری مسائل کو اس انداز میں دیکھنا کہ اب صدیوں کے حساب کتاب کے چکانے کا مسئلہ ہے وہ نئی اور ابھرتی طاقتوں کے لئے ایک کوتاہ بینی اور خودکشی کے مترادف (باقی صفحہ پر)

ڈاکٹر مجید بیدار
مولانا آزاد کالج ۔ اورنگ آباد

چارسو سالہ جشنِ حیدرآباد پر

ماہنامہ "شاداب" کی خصوصی اشاعت

شہر حیدرآباد کو ایک ادب دوست اور سماج پرور شاعر محمد قلی قطب شاہ نے بسانے کے بعد اس شہر کو لوگوں سے معمور کرنے کی دعا کرتے ہوئے یہ انوکھی تشبیہ استعمال کی تھی کہ سمندر میں بسنے والی مچھلیوں کی طرح رنگ برنگے اور بے حساب انسانوں سے اس شہر کو خدا کی ذات سے معمور کر دے چنانچہ اب اس شہر میں نہ صرف رنگ و نسل اور مقامات کے اعتبار سے قسم قسم کے لوگ نظر آتے ہیں، بلکہ یہاں پر کئی تہذیبوں اور مکاتبِ خیال کے افراد کا حسین سنگم نظر آتا ہے اور اسی کی نمائندگی اس شہر کے مختلف الخیال افراد نے انجام دی ہے۔ اسی شہر میں اُردو ذریعہ تعلیم کی جامعہ قائم ہوئی اور سب سے پہلے "اُردو انسائیکلوپیڈیا" کی اشاعت کا خیال اسی شہر سے وابستہ افراد کے ذہن میں جاگزیں ہوا۔ بلکہ اس شہر کو "دارالترجمہ" کے ذریعے مخزن علم و فنون کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ کئی علمی و ادبی مجلے اس شہرِ نسوں ساز سے شائع ہوتے رہے۔ چنانچہ شہرِ حیدرآباد کے چارسو سالہ جشن کے موقع پر جدتِ فکر اور اپنی انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے ماہنامہ "شاداب" نے ایک نئی راہ بنائی ہے۔ چنانچہ حیدرآباد کے قدیم رسالہ "مجلّہ مکتبہ" سے اعلیٰ ترین انتخاب اور پھر تمام شماروں کی فہرست کو پرچے کے آخر میں شامل کر کے ناقدین اور محققین کے لئے نئی راہیں ہموار کی ہیں۔

حیدرآباد کی سرزمین سے بہ پابندی گذشتہ سات سالوں میں بغیر کسی تعطل کے شائع ہونے

ماہناموں میں شاداب اپنا انفرادی مقام رکھتا ہے۔ جس کے مدیر محمد قمر الدین صابری ہیں۔ جنھوں نے شاداب کے ماہ اپریل کے شمارے کو سال ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۳ء تک حیدرآباد سے شائع ہونے والے رسالہ مجلہ مکتبہ کے انتخاب سے معنون کیا ہے۔ اس انتخاب کے لئے اُردو ریسرچ سنٹر حیدرآباد کے نادر و نایاب ذخیرے سے مدد لی گئی ہے چنانچہ اس عرق ریزی کے لئے جائینٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے رشید الدین نے تعاون دیا ہے۔ مجلہ مکتبہ ابراہیمیہ کی جانب سے شروع کیا گیا تھا اور شاید اسی مناسبت سے غالباً اُردو میں سب سے پہلے "شاداب" کے مدیر نے رسالے کا انتساب چند ایسے تاجران کتب کے نام کیا ہے جن سے اُردو والے واقف تک نہیں اور حقیقت یہ ہے کہ اُردو کتب، رسائل و جرائد کی توسیع اور اشاعت میں تاجران کتب کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ماہنامہ "شاداب" نے یہ حق ادا کیا ہے۔

"مجلہ مکتبہ" کے چنیدہ مضامین کو شمارہ میں شامل کیا گیا ہے صدق جائیسی کی غزل اور بہادر یار جنگ کی دہلی میں ۱۹۳۳ء میں کی گئی تقریر کی شمولیت کے علاوہ کئی نئے نام اور ان کی تخلیقات "شاداب" کے خصوصی شمارہ میں شامل ہیں جن سے آج کی اُردو دنیا واقف تک نہیں۔

حیدرآباد کی چار سو سالہ تاریخ کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے "ماہنامہ شاداب حیدرآباد" نے ایک منظم منصوبہ مرتب کیا ہے جس کی پہلی کڑی کے طور پر خاص نمبر مجلہ مکتبہ کا تعارف اور اس کے چند اہم مضامین کی دوبارہ اشاعت شامل ہے جس کے بعد حیدرآباد کی ترقی کے سلسلہ میں آصفجاہی خاندان کی خدمات اور نواب میر عثمان علی خان کی اُردو پرستی پر خصوصی اشاعتوں کا منصوبہ ہے مجلہ مکتبہ نمبر کی اشاعت سے خود اندازہ ہوتا ہے کہ دوسرے خصوصی شمارے بھی مزید بہتر شائع ہوں گے۔

"شاداب" کے مجلہ مکتبہ کے خصوصی شمارے میں مدیر نے جو اداریہ لکھا ہے وہ نہ صرف مجلہ مکتبہ کی بھرپور تاریخ ہے، بلکہ اس کے قلمکاروں کی خدمات میں ایک عظیم خراج تحسین ہے مجلہ مکتبہ کی اشاعت حیدرآباد سے اپریل ۱۹۲۸ء سے اکتوبر ۱۹۳۳ء تک جاری رہی۔ اس رسالے کے قلمکاروں میں

صفی اورنگ آبادی، جوش ملیح آبادی، کیفی حیدرآبادی، اکبر وفاقانی، امجد حیدرآبادی، اختر شیرانی، وحید الدین سلیم، علی اختر، ضیا یار جنگ ضیاء، عبدالقدیر حسرت مرحوم، سکندر علی وجد، ہما حشر کاشمیری، تمکین کاظمی، اختر حسن، میر حسن، یاس یگانہ چنگیزی اور ایسے ہی بے شمار نام لئے جاسکتے ہیں جن کی تخلیقات مجلہ مکتبہ کے گیارہ شماروں میں شامل ہیں یہ رسالے نایاب ہی نہیں بلکہ کم یاب ہیں اسی لئے شاداب کے مدیران قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اس رسالے کے "حوالے جاتی اشارہ" کے طور پر شاداب کا خصوصی نمبر شائع کیا۔

شاداب ماہ اپریل کے شمارے میں مجلہ مکتبہ کے گیارہ شماروں کی فہرست پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شعری و نثری تخلیقات کا عمدہ معیار اس رسالے نے قائم کیا تھا۔ چنانچہ مذہبیات فلسفہ، جدید ترقی، معلومات عامہ، سیاحت، تاریخ، تنقید و تبصرہ اور بادۂ کہن کے نام سے قدیم دکنی شعراء کا تعارف اور ایسے ہی بے شمار موضوعات کو مجلہ مکتبہ نے احاطہ کیا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۹۲۸ء میں ہی حیدرآبادی مدیروں میں "ثقافتی ادب" کی ترویج کا رجحان پیدا ہو چکا تھا اس رسالے کی علمی اور ادبی طور پر ستائش کی جانی چاہیئے۔ "شاداب" کے مجلہ مکتبہ خصوصی نمبر کی قیمت ۲۵ روپے رکھی گئی ہے جو بہت زیادہ معلوم ہوتی ہے لیکن حوالہ جاتی کتاب کی حیثیت سے اس رقم کی کوئی خاص اہمیت نہیں۔ "شاداب" کی سالانہ خریداری ۶۵ روپے ہے اور سالانہ خریدار کو یہ رسالہ مفت پڑے گا۔ "مجلہ مکتبہ" نمبر کو ہر کتب خانے میں محفوظ رہنا چاہیئے۔ اس کے ساتھ ہی ادب کی آبیاری کرنے کی دعویداروں کے لئے بھی اس کا مطالعہ ازحد ضروری ہے۔ ماہنامہ شاداب کا یہ خصوصی شمارہ 147-5-11 ریڈ ہلز حیدرآباد کے پتے سے حاصل کر سکتے ہیں ▲▲▲

جواب طلب امور کیلئے جوابی لفافہ یا پوسٹ کارڈ کا آنا ضروری ہے مضامین کا طلب شدہ ہونا ضروری نہیں

منقبت حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز رح

ڈاکٹر محمد منشاء الرحمٰن خان منشا
اسٹار کی ٹاؤن ناگپور ۱۳

کردار کا جو ہوتا ہے غازی
ملتی ہے اُس کو یاں سرفرازی

مقبول بندہ ہوتا وہی ہے
جس کی صفت ہو بندہ نوازی

اے خواجہؒ دراصل اہل صفا میں
رتبہ تمہارا ہے امتیازی

وہ سوزِ ایماں حاصل تھا تم کو
سوغات جس کی ہے دلگدازی

کھنچ کھنچ کے خلقت آتی ہے تم تک
اللہ رے شانِ گیسو درازی

لائے تو لائے کوئی کہاں سے
قلب و نظر کی یہ پاکبازی

فیضانِ حق سے تم کو ملی تھی
دُنیا کی ہر چیز سے بے نیازی

ہر دم تمہارے پیشِ نظر تھی
عام آدمی کی اخلاق سازی

اے شاہ باطن مردِ قلندر
کیا خوب تم میں تھی حرکتا زی

ملکِ دکن میں پھیلا گئی تم نے
روحانیت کی بوئے حجازی

شفیق فاطمہ شعریٰ
شعبۂ اردو ممتاز کالج۔ ملک پیٹ
حیدرآباد

سلامت سبو جبہ ترا ساقیا

نوٹ:۔ ہمارے شہر فرخندہ بنیاد کی شاعرہ شفیق فاطمہ شعریٰ کے شعری مجموعہ "آفاق نوا" کو ۱۹۸۸ء کے نیمن گورڈ سترو ما لمیا ایوارڈ کے لئے منتخب کر لیا گیا۔ انہیں خاتون ادیبہ کی ہندوستانی زبان میں بہترین تصنیف کے لئے یہ ایوارڈ دیا جارہا ہے جو دس ہزار روپے نقد اور توصیفی سند پر مشتمل ہے جو سنٹر برائے ویمنس اسٹڈیز و ویمنس میوزیم نے قائم کیا ہے۔ ۸ جولائی کو کلکتہ میں منعقد ہونے والی تقریب میں یہ ایوارڈ دیا جائے گا۔ شفیق فاطمہ شعریٰ کی شاعری کے بارے میں "نئے کلاسک" نے لکھا تھا "شعریٰ اردو شاعری کی پہلی نسائی آواز ہے جس نے الفاظ کو صیقل کر کے ایسا پارۂ درخشی بنا لیا ہے کہ اس کی ہر بات ماورائی لگتی ہے"۔ ادارۂ شاداب انہیں اس ایوارڈ کے لئے تہنیت پیش کرتا ہے اور ذیل میں "آفاق نوا" میں شامل نظم "سلامت سبو جبہ ترا ساقیا" قارئین شاداب کے لئے پیش کرتا ہے۔ (ادارہ)

***

ازل بھولا بسرا سا اک خواب ہی
سہی
ہند اک باب ہی وہ سدا کے لئے
مگر بارہا
حرف حق لوح جاں سے مٹایا گیا جب

یہ انواع جبر
ازل ہی وہ معرکہ آشنا نا ابد تک جسے ناگزیر

دھماکے سے پہلے کی اک سنسنی
بنی امتحاں گاہ میں
خوف و دہشت کے ہمدوش اک ذمہ داری کا بار
یہاں ہم نہ ہوتے جو اُمیدوار
تو ہوتے کوئی اور اپنے ہی وہ غم نژاد
زمیں آسماں فخر سے ' اور غبارِ پس و پیش ہم
دیکھتے ان کو کس رشک سے
سوالات بیباک سے ارتقار کے تجربے بے شمار
وہ حل کر رہے ہیں
فطانت میں شامل دیانت کے ساتھ

ستاروں کی تقویم کو کس نے دیکھا ہے
لذت کش انتظار
جریدہ میں ثبت اپنے نام
جہاں دیکھ پائیں گے
سطح وجود
وہ ہے دُور کتنی

جہل بجا کے عالم تمام / ترا میکدہ ساقیا

ابھی آب و گل میں گندھی
اندرا ابھی پردۂ غیب سے جھانکتی یادداشت
بہت اس نے دیکھے طلوع و غروب
بہت پیشہ ور پیچ کا پھیلا ہوا کاروبار
جرائم کہ جن کے تناور تنے
یہ فنی مہارت کی اک برتری
اور وہ پاور شپر
مکافات کی اس کے سر پر حدت آ گئی
ستون در ستون تھا دھنواں اُگ رہا
ان کے تھالوں کے بیچ

نتیجہ کی فہرست سے نام کتنے
کہ بجتا تھا ڈنکا کبھی جن کا
ہو کر رہے لاپتہ
نہ کوئی دھماکہ نہ کوئی جھماکہ
نہ دنیا دلہن
پکڑ کر جب کوڑ کر جلائی گئی
قلم کے نوشتہ سے پہنچا ہوا خواب زار
وہی تک ہے سرسبز

کھو دیا قلم نے جہاں تک نہیں اعتبار
مگر پاسبان مفادات صید
قلم نے جہاں لکھ دیا عرف صیاد کا

وہیں شاخ زیتون
گلدانِ آرائش کا اثاثہ بنی

قلم کو بچا
صرف حق کی سزا
بھگتنے کی خاطر سدا
ساقیا
سلامت سبو چہ ترا

***

شفیق فاطمہ شعریٰ
کا اولین مجموعۂ کلام
نجمن گورڈ تمغۂ اعلیٰ الوارڈ یافتہ
آفاقِ نوا
ڈیمائی ۔ سائز ۔ دبیز کاغذ
دیدہ زیب سرورق عمدہ طباعت
Rs 30/-
ناشر :۔ شالیمار پبلیکیشنز ۔ ۲۸۷ بی نیا ملک پیٹ ۔ حیدرآباد ۳۶

غزلیں

رؤف رحیم
۵-۵-۵۲۵ شکر گنج
حیدر آباد ۵۰۰۲۶۵

یہ تو میرے واسطے مژدہ ہوا
آج اک چہرہ ملا ہنستا ہوا

شہر ہے زخمی پرندے کی طرح
ہر طرف ہے خون ہی پھیلا ہوا

موت ہے جامد سمندر کی طرح
زندگی دریا ہے اک بہتا ہوا

اپنا چہرہ مجھ میں دیکھے کیوں کوئی
آئینہ ہوں ٹوٹ کے بکھرا ہوا

اُن کے ماتھے پر پسینہ آ گیا
ہے الاؤ عشق کا دہکا ہوا

پالیا میں نے وفاؤں کا جواب
خط میں اُن کے پھول تھا سوکھا ہوا

کوئی مجھ پہ کیا لکھے گا اے رحیم
میں تو کاغذ ہوں مگر بھیگا ہوا

شجاع الدین شاہد
نارتھ بمبئی سارٹنگ آفس، اندھیری (ای) بمبئی ۹۳

دل درد آشنا بھی ہوا غم شناس بھی
جینے کا یہ ہنر ہے میاں اپنے پاس بھی

اب کے برس بھی خون کے بادل برس پڑے
لیکن ذرا بجھی نہیں دھرتی کی پیاس بھی

لمحے شبِ فراق کے بے حد طویل ہیں
سچ ہے ترا قیاس بھی میرا قیاس بھی

لوگوں میں تو جہ اپنی و راثت کا بانٹ دیں
کیوں رکھیں ہم یہ بارِ گراں اپنے پاس بھی

لکھا ہے یوں تو سب نے کتابِ حیات کو
تکمیل کوئی کر نہ سکا اقتباس بھی

رنگینیاں جہاں کی مبارک ہو آپ کو
تنہائیوں کا درد ہے شاہد کے پاس بھی

ماہنامہ

شاداب

حیدرآباد

قیمت : Rs 6/=

جلد (۷) | شمارہ (۸) | اگست سنہ [illegible]ء | حیدرآباد

ایڈیٹر	جائنٹ ایڈیٹر	مینیجنگ ایڈیٹر
محمد قمر الدین صابری	رشید الدین	کلیم الدین احسن

مجلسِ مشاورت

محترمہ تحفہ بیگم رباب — یوسف ناظم — ڈاکٹر محمد یوسف الدین — پروفیسر رضی الدین — منیر احمد صدیقی

محمد منظور احمد منظور — محترمہ سیدہ مہر — ڈاکٹر محمد مشتاق الرحمن خان مشتاق — پروفیسر میر تراب علی

زرِ تعاون

	ہندوستان	خلیجی ممالک	امریکہ	انگلستان	پاکستان
سالانہ	65 روپے	200 روپے	40 ڈالر	25 پونڈ	175 پاکستانی روپے
۲ سال	120 "	360 "	70 "	45 "	300 "
تاحیات	1500 "	3700 "	700 "	400 "	3000 "

ترسیلِ زر کا پتہ :-

ماہنامہ "شاداب" 147-5-11 ریڈ ہلز۔ حیدرآباد ([illegible])

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلیشر محمد قمر الدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چار کمان سے چھپوا کر دفتر [illegible] ۔ ۔ ۔ ریڈ ہلز حیدرآباد ۔ ۔ ۔ سے شائع کیا

فہرست

امر بالمعروف و نہی عن المنکر	مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی	۴
اسلامی تصوّف	سید احمد عروج قادری	۶
اپنا تجزیہ [illegible]	[illegible]	۱۲
مسلم زیرِ انتظام اسکولوں کا حالات	شوکت علی	۱۷
اُردو میں بچوں کا ادب	پروفیسر اکبر رحمانی	۲۳
مولوی عبدالحق (قسط اول)	ڈاکٹر عبدالستار دلوی	۳۴
علی سردار جعفری	سید احتشام حسین تاندلوی	۴۳
سرِ شام جو نہی آنکھ میری لگی	ابراہیم جلیس	۵۶
گھر سے دور ایک گھر سکر باغ	شیلیش ڈی ویلاس	۶۲

* "شاداب" آپ کا اپنا میگزین ہے
* اِسے اپنے حلقۂ احباب میں متعارف کروائیے۔
* اِس کی توسیع اشاعت میں حصہ لیجئے
* قلمکار حضرات قلمی معاونت فرمائیے

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی

امر بالمعروف و نہی عن المنکر

(مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی مدظلہ العالی کی وہ تقریر جو مولانا نے یکم دسمبر ۱۹۷۷ء کو بعد نماز مغرب جامع مسجد بھوپال کے ہفتہ وار تبلیغی اجتماع میں فرمائی تھی "تعمیر حیات" لکھنؤ ۱۰ مئی ۱۹۷۸ء سے ماخوذ اور ہدیۂ قارئین ہے)

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر وتؤمنون باللہ۔ امر بالمعروف یہ شعبۂ عالمگیر ہے اس لئے خاص طور پر اس کو امتِ محمدیہ کے لئے الاٹ کیا گیا ہے، اُمتِ محمدیہ کی فضیلت و برتری کی علت ڈھونڈی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس اُمت کے ذمہ ایک اعلیٰ اور برتر کام سپرد کیا گیا ہے جس کی وجہ سے خیر الامم کا معزز خطاب اس کو عطا کیا گیا ہے، دین کی تبلیغ کا کام یہ ایک ایسا شعبہ ہے جس کو خدا نے [illegible] کے سپرد کیا ہے اور خدمتِ خلق کا جذبہ اُمت کو دوزخ سے بچانے کا نام ہے اور [illegible] نبوت کی شاخ یہ ہے، درحقیقت دنیا کی پیدائش کا اصل مقصد خداوند کریم کی ذات و صفات کی معرفت کا ہے اور یہ اس وقت تک ناممکن ہے جب تک بنی نوع انسان کو برائیوں اور گندگیوں سے پاک کر کے بھلائیوں اور خوبیوں کے ساتھ آراستہ نہ کیا جائے۔ اسی لئے فرمایا گیا کہ فلاح و بہبود انھیں لوگوں کے لئے ہے جو اس کام کو انجام دے رہے ہیں۔

اس امت کی بعثت آپ کی بعثت کا تکملہ و تتمہ ہے، اس لئے دین کی اشاعت کی ذمہ داری دی گیا

اُمت کے ہاتھ میں دیدی ہے اس کے کرنے میں کامیابی ہے اور نہ کرنے میں دو نقصان ہیں (۱)۔ اپنے کو نااہل قرار دینا ہے یا یوں کہیئے کہ اپنے سر بہت بڑا الزام قائم کر لینا ہے۔ خدا نے انسان کو جس کام کے لئے پیدا کیا ہے اس کو انجام نہ دے، ہر انسان کام کرے تو بیکار ہے بلبل کی سریلی دل آویز آواز ہے، اگر وہ بولے نہیں تو کوا بہتر ہے، طاؤس رقص نہ کرے تو اس سے ہنس اچھا ہے، نمک کے اندر نمکین پن نہ ہو [illegible] کی جگہ یا قوت و جواہرات نہ ہوں تو بیکار ہے جو چیز جس کام کے لئے بنائی گئی ہے وہی کام انجام نہ دے تو کیا فائدہ ؟

بھٹکی ہوئی اور ٹھوکر کھائی ہوئی انسانیت جو آج گہرے غار میں گرنے کے لئے تڑپ رہی ہے۔ اس کو کون بچائے گا ؟ ایک انسانیت کیا بیمار ہے بلکہ سب بیمار ہیں، اخلاقیات بیمار، معاشرہ بیمار، ساری انسانیت بیمار ہے اس کا علاج کون کرے گا ؟ حقیقت یہ ہے کہ تعلق مع اللہ اور دعوت الی اللہ کا سلسلہ منقطع ہو گیا ہے ع

" وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے "

امت محمدیہ جب اس کام کو چھوڑ دے گی تو سخت مصائب و آلام اور ذلت خواری میں مبتلا کر دی جائے گی اور ہر قسم کی غیبی نصرت و مدد سے محروم ہو جائے گی، اور یہ سب کچھ اس لئے ہوگا کہ اس نے اپنے فرضِ منصبی کو نہیں پہچانا اور اس کی قدر نہ کی اور جس کام کے انجام دینے کی ذمہ داری تھی اس سے غافل رہی اور اس کو بھلائے رکھنے سے سستی و کاہلی عام [illegible] گمراہی و ضلالت کی شاہراہیں کھل جائیں گی آپس میں پھوٹ پڑ جائے گی آبادیاں ویران [illegible] تباہ و برباد ہو جائیں گی اور یہ سب کچھ ہو رہا ہے اس تباہی و بربادی کی خبر اس وقت [illegible] جب [illegible] میں خدا کے سامنے باز پرس کے لئے بلایا جائے گا۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر دین کا زبردست رکن ہے جس سے دین کی تمام چیزیں وابستہ ہے اس سے ہمارے لئے یہ بات صاف واضح ہو گئی کہ ہمارا اصل مرض روح اسلامی سے بیزاری [illegible] حقیقت ایمان کا ضعف ہے ہمارے اسلامی جذبات فنا ہو چکے، ہماری ایمانی [illegible]

زائل ہو چکی اور کمزوری کا سبب اصل شئے کو چھوڑ دینا ہے جس پر تمام دین کی بقاء اور دار و مدار ہے اور وہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے۔ اس کام کو چھوڑنے کا دوسرا نقصان یہ ہے کہ انسانیت سسک رہی ہے اور سب کام ہو رہے ہیں۔ صرف دعوت کا کام نہیں ہو رہا ہے کیونکہ یہ جملہ دین پیمانوں کو الٹ کیا گیا تھا وہ اپنی جگہ سے ہٹ گئے، اس لئے آپ بھی اس منصب سے محروم اور اس سے ملنے والی اشیاء سے بھی محروم ہو گئے۔

شریعت اسلام نے اجتماعی زندگی اور اجتماعی اصلاح اور اجتماعی ترقی کو اصل بتایا ہے اور امت مسلمہ کو ایک جسم قرار دیا ہے کہ اگر ایک عضو میں درد ہو جائے تو تمام جسم بے چین ہو جاتا ہے اس وجہ سے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو ایمان کا خاصہ اور لازمی جزو قرار دیا ہے تاکہ اس کی انجام دہی کے سلئے اپنے اندر خوبی و کمال پیدا کریں۔ ظاہر ہے کہ کوئی قوم اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک افراد خوبیوں اور کمالات کے زیور سے آراستہ نہ ہوں اب ہمارے اوپر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ فریضۂ تبلیغ کو اس طرح لے کر کوشش ہوں جس سے ہم میں قوت بڑھے اور رسولؐ کو پہچانیں اور احکام محمد اللہ تعالیٰ کے سامنے سرنگوں ہو جائیں کیونکہ یہ کام خدا کی ایک اہم عبادت اور سعادتِ عظمیٰ ہے اور انبیاء علیہم السلام کی امانت ہے اس کام کا مقصد دوسروں کی ہدایت نہیں بلکہ اس سے خود اپنی اصلاح اور عبدیت کا اظہار مقصود ہے اگر ہم اس کو صحیح طور پر انجام دیں گے تو عزت و آبرو اور اطمینان سکون کی زندگی پالیں گے ▲▲

مکتبہ مجلہ
قیمت /- 25
فوری طور پر اپنی کاپی طلب فرمالیجئے!

"شاداب" کی خصوصی اشاعت جس کی افادیت اپنی جگہ مسلمہ ہے۔ ریسرچ اسکالرس کے پاس اور لائبریریوں میں جس کا رہنا ضروری ہے۔ آج ہی طلب فرمائیے۔

[illegible] حیدرآباد

سید احمد عروج قادری (قسط اوّل)

اسلامی تصوّف

تصوّف کا اقرار و انکار اور اس کے بارے میں بحث و تمحیص اور اعتراض و جواب اعتراض کا سلسلہ صدیوں سے جاری ہے۔ اگر کسی نے اس کا انکار کیا تو اقرار کرنے والے یہ نہیں دیکھتے کہ انکار کس تصوّف کا کیا جا رہا ہے اور اگر کسی نے اقرار کیا تو انکار کرنے والے یہ نہیں سمجھتے کہ کس تصوّف کا اقرار کیا جا رہا ہے۔ اقرار کرنے والے منکرینِ تصوّف کے درمیان مطعون ہوتے ہیں اور انکار کرنے والے حامیانِ تصوّف کے درمیان مذموم قرار پاتے ہیں۔ افراط و تفریط کے درمیان توسط اعتدال کی راہ گم ہو جاتی ہے اور اس پر چلنے والے بہت کم ہوتے ہیں۔ بعض لوگ تو "تصوّف" کے لفظ اور اصطلاح پر جھگڑا شروع کر دیتے ہیں حالانکہ اصطلاح پر جھگڑنا معقول بات نہیں ہے اسی طرح بعض لوگ حقیقت سے زیادہ اس اصطلاح کو ماننے اور منوانے پر اصرار شروع کر دیتے ہیں اور یہ بات بھی قرینِ عقل نہیں ہے۔

راقم الحروف نے تصوّف کی کتابوں کا جو مطالعہ کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تین قسم کے تصوّف پائے جاتے ہیں مومنانہ تصوّف، فلسفیانہ تصوّف، ملحدانہ تصوّف۔

ملحدانہ تصوّف نے اگرچہ مسلم عوام کو بہت نقصان پہنچایا ہے لیکن علماء حق اور صوفیۂ صافیہ ہمیشہ اس کی تردید کرتے آئے ہیں اور کسی مومن مخلص کو اس کے قابلِ ترک ہونے میں شبہ نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک ملحدانہ تصوّف اس تصوّف کا نام ہے جو بزعمِ خویش اللہ تک پہنچے ہوئے لوگوں کے لیے اسلامی شریعت کو معطل قرار دیتا ہے ملحد اور گمراہ صوفیہ جو مسلمانوں

کہ جیسیں ہیں دراصل منافق ہوتے ہیں، یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ جب کوئی مسلمان مقام یقین پر فائز ہوکر خدارسیدہ ہوگیا تو اب وہ نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج اور اس طرح کے شرعی احکام کا مکلف نہیں رہتا، اس گروہ کے نزدیک طریقت، شریعت سے بالکل علیحدہ چیز ہے، اس کے نزدیک شریعت، مدرسۂ سلوک کے صرف مبتدی طلباء کے لئے ہے۔

مومنانہ تصوّف، یعنی اسلامی تصوّف جن حقائق کا نام ہے آج تک کسی مومن مخلص نے اس سے اختلاف نہیں کیا۔ اس لئے کہ وہ کتاب وسنّت سے بصراحت ثابت اور ایمان و اسلام کے لازمی تقاضے ہیں۔ علماء حق کے درمیان اختلاف و نزاع صرف اس تصوّف میں ہے جسے ہم فلسفیانہ تصوف کہتے ہے۔ اس تصوّف کی بنیاد فلسفۂ یونان اور علم الکلام کی دوراز کار بحثوں پر قائم کی گئی ہے۔ اس میں بہت سی ایسی چیزیں داخل کرلی گئی ہیں جن کی تائید کتاب و سنت سے نہیں ہوتی۔ نیز یہ کہ قرآنی حقیقتوں کی فلسفیانہ تشریحیں کرکے انھیں کچھ سے کچھ بنادیا گیا ہے اور ایک بڑی مصیبت یہ ہے کہ بہت سی چیزوں کے لئے انتہائی ضعیف اور موضوع حدیثوں کا سہارا لیا گیا ہے کیونکہ مسلمانوں میں کوئی چیز اس وقت تک قبول عام حاصل نہیں کرتی جب تک اس کے لیے کوئی حدیث نہ پیش کی جائے۔ جہاں تک میں نے غور کیا ہے تصوف کے انکار میں شدت اسی فلسفیانہ تصوّف پر زور دینے کا نتیجہ ہے صوفیہ میں بے شمار ایسے لوگ موجود ہیں جو زبان سے تو یہ کہتے ہیں کہ تصوّف کی بنیاد کتاب و سنّت پر ہے لیکن ان کی روش یہ ہے کہ جو لوگ فلسفیانہ تصوّف کا انکار کرتے ہیں انھیں بھی وہ اس گروہ میں داخل قرار دیتے ہیں جو مطلقاً تصوّف کا منکر ہے اس کے علاوہ بزرگوں کے بارے میں انھوں نے ایسی غالیانہ عقیدت اختیار کر رکھی ہے جس کا کوئی ثبوت کتاب و سنت میں موجود نہیں ہے اور اسی کو انھوں نے تصوّف کے اقرار و انکار کی کسوٹی بنادیا ہے جو شخص ان کی اس خود ساختہ کسوٹی پر کھرا اترے یعنی غالیانہ عقیدت میں ان کا ساتھ دے وہ تصوّف کا علمبردار ہے اور جو اس پر کھوٹا ثابت ہو یعنی اس عقیدت میں ان کا ساتھ نہ

دے وہ تصوف کا انکار کرنے والا ہے اور نوٹ تے فی صد یہ بات بھی صادق ہے کہ انھوں نے بزرگوں کی غالیانہ عقیدت کو اپنے لیے حصولِ عقیدت کا حربہ اور وسیلہ بنا لیا ہے یہ اپنے ماسبق بزرگوں کے سامنے اس لیے سر جھکاتے ہیں کہ دوسرے لوگ ان کے سامنے سر جھکائیں جو لوگ اس پر تنقید کرتے ہیں انھیں وہ تصوف کا مخالف اور اولیاء کا منکر کہہ کر لوگوں میں بدنام کرنا شروع کر دیتے ہیں تاکہ لوگوں کی عقیدت ان کے ساتھ وابستہ رہے اور اس میں کوئی خلل واقع نہ ہو۔

تصوف کی مشہور و معروف و مستند کتابوں میں اسلامی تصوف اور فلسفیانہ تصوف ایک دوسرے کے ساتھ مخلوط ہیں اور ان دونوں کے درمیان امتیاز صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو خود کتاب و سنت کا علم رکھتے ہوں اور جن کے دل و دماغ بزرگوں کی اندھی عقیدت سے ماؤف نہ ہوں۔ ہماری اس کتاب کا موضوع چونکہ اسلامی تصوف ہے اس لیے ہم نے فلسفیانہ تصوف سے صرفِ نظر کیا ہے ۔ ہم اس مختصر مضمون میں حسب ذیل نکات کی وضاحت کرنا چاہتے ہیں ۔

۱۔ اسلامی تصوف کا ماخذ کیا ہے

۲۔ تصوف کیا ہے اور صوفی کون لوگ ہیں

۳۔ کشف و کرامات والہام کوئی دلیل نہیں بلکہ خود ان کی صحت دلیلِ شرعی کی محتاج ہے۔

۴۔ اولیاء اللہ کون لوگ ہیں۔

اسلامی تصوف کا ماخذ اور اس کی بنیاد : تمام صوفیاء علیہ بلا استثناء اس بات پر متفق ہیں کہ وہ جس تصوف کے قائل ہیں اس کی بنیاد کتاب و سنت پر قائم ہے اور یہی اس کے اصل آخذ ہیں ۔

سید الطائفہ ابوالقاسم جنید بن محمدؒ (م ۲۹۷ھ) کہتے ہیں:

"جس شخص نے قرآن وحدیث کے احکام نہیں سمجھے اور ان کا علم حاصل نہیں کیا، تصوف میں اس کی اقتدار نہیں کی جا سکتی، کیونکہ ہمارا یہ علم (تصوف) کتاب و سنت سے مقید ہے اور

اجماع و قیاس کا مرجع بھی یہی دونوں ہیں ۔

ابوعلی روذ باری جنیدؒ سے نقل کرتے ہیں کہ ہمارا یہ مذہب (تصوف) اصولی یعنی کتاب و سنت کے ساتھ مقید ہے پہلے قول میں "علم" کا لفظ استعمال ہوا ہے اور دوسرے میں "مذہب" کا پہلے لفظ سے اشارہ صحت علم کی طرف ہے اور دوسرے لفظ کا اشارہ صحت سلوک کی طرف۔ اس سے معلوم ہوا کہ صوفیاء کسی وقت بھی اپنے علم و عمل میں کتاب و سنت سے مستغنی نہیں ہیں اس قول میں اور اس سے پہلے کے قول میں اس شخص کی تردید ہے جو راہ سلوک میں اپنے "واردات قلبی" پر اعتماد کرتا ہے اور گمان کرتا ہے کہ وہ اللہ کی طرف سے آئے ہیں اور سچے ہیں، وہ انھیں کتاب و سنت پر تولنے سے اپنے آپ کو مستغنی سمجھتا ہے اور یہ کھلی ہوئی گمراہی ہے۔[ا] (ا) رسالہ قشیریہ کا شرح ملحظہ

السید مصطفیٰ العروسی اپنے حاشیہ میں لکھتے ہیں:

حضرت جنیدؒ کے قول کا مطلب یہ ہے کہ طالب سلوک کے لیئے شرط یہ ہے کہ علماء سے شریعت مطہرہ کے احکام کا علم حاصل کرکے اس پر عمل کرے اس کے بعد اس راہ میں اس کی رہبری درست ہوسکتی ہے اور جو شخص اس کے بغیر اللہ تک پہنچ جانے کا مدعی ہو وہ بدعتی ہے، نہ اس کی طرف رجوع کیا جائے گا اور نہ اس کی کسی بات پر اعتماد صحیح ہوگا۔

"علم تصوف دائرہ کتاب و سنت کے اندر ہے" اس جملے کا مطلب یہ ہے کہ علم تصوف کتاب و سنت سے حاصل کیا جائے گا اور اسی کے مطابق عمل ہوگا اور جو شخص علماً و عملاً اس سے خارج ہو وہ زندیق (بے دین) ہے۔ (۱) تاریخ الافکار ج ۱ ص ۱۴۳

ابوالقاسم ابراہیم بن محمد النصرآبادی (م ۳۶۷ ھ) کہتے ہیں:

تصوف کی اصل یہ چیزیں ہیں: کتاب و سنت کی پابندی خواہشات و بدعات کا ترک مشائخ کا احترام مخلوق کی معذرتوں کو قبول کرنا اوراد پر مداومت۔ رخصتوں کے ارتکاب سے پرہیز، تاویلات کو ترک کرنا، اس قول میں مشائخ سے مراد وہ لوگ ہیں جو علم و عمل کے لحاظ

سے کامل ہوں اور شخصوں نے ان مباحات سے بھی اعراض کیا ہو جو ذکر و عبادت میں خارج ہوتے ہیں ایسے لوگ یقیناً احترام و اکرام کے مستحق ہیں اوراد، وِرد کی جمع ہے، ان سے مراد وہ نفل عبادتیں ہیں جو بندہ اپنے رب کی رضا اور تقرب کے لیے روزانہ کرتا ہے یہ عبادتیں اللہ کے لطف و کرم کو جاری رکھتیں اور دلوں کو زندہ کرتی ہیں جب کہ حدیث قدسی میں ہے کہ میرا بندہ برابر نوافل کے ذریعہ میرا تقرب حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں۔ "رخصتوں" سے یہاں مراد آرام و راحت تنعم اور لذائذ ہیں۔ "تاویلات" سے مراد یہ ہے کہ کسی شئے کے بارے میں بندہ اپنے نفس میں یہ خیال کرے کہ نہ اسے کرنے میں گناہ ہے اور نہ ترک میں گناہ ہے، وہ یہ نہ سوچے کہ قربِ الٰہی کے حصول میں اس کا فعل یا ترک مفید ہے یا نہیں۔

سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی (م ۵۶۱ھ) کہتے ہیں:

اجعل الکتاب والسنۃ امامك والنظر فیھما بتامل وتدبر واعمل بھما ولا تغتر بالقال والقیل والھوس؛	کتاب و سنت کو اپنے سامنے رکھو، تامل و تدبر کے ساتھ ان دونوں کا مطالعہ کرو اور انھیں دونوں کو اپنا دستور العمل بناؤ اور قال و قیل اور ہوا و ہوس سے دھوکا نہ کھاؤ۔

آگے چل کر وہ پھر فرماتے ہیں:

لیس لنا نبی غیرہ فنتبعہ ولا کتاب غیر القرآن فنعمل بہ فلا تخرج عنھما فتھلك فیضلك ھواك والشیطان قال اللہ تعالیٰ و لا تتبع الھویٰ فیضلك عن سبیل اللہ والسلامۃ مع الکتاب والسنۃ	سیدنا محمدؐ کے سوا ہمارا کوئی نبی نہیں کہ ہم اس کی پیروی کریں اور قرآن کے سوا کوئی کتاب نہیں کہ ہم اس پر عمل کریں لہٰذا تم ان دونوں کے دائرے سے باہر نہ نکلو ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے تمھاری خواہش اور شیطان تمھیں گمراہ کر دیں گے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اپنی خواہشِ نفس کی

اِخْتِلَافٌ مَعَ غَيْرِهِمَا۔ پیروی نہ کرو ورنہ وہ تجھے اللہ کے راستے سے

بھٹکا دے گی، سلامتی کتاب و سنت کے ساتھ ہے

اور ہلاکت غیر کتاب و سنت کے ساتھ۔

یعنی جو کتاب و سنت کو چھوڑ کر دوسری چیزوں کی طرف جھکتا ہے وہ گمراہ ہو کر اپنے آپ کو ہلاک کر دیتا ہے۔

یہ صراحتیں ان تمام تضادات و بدعات کے خلاف حجت ہیں جو غفلت و استغراق کے عالم میں کتب تصوف کے اندر داخل ہو گئی ہیں اور آج انھیں تضادات و بدعات کو بہت سے لوگ "تصوف" سمجھ رہے ہیں:۔ ***

بقیہ: مسلم زیر انتظام اسکولوں ..... صفحہ ۱۲ سے آگے

مثال گدڑی میں لال جیسی ہے اور اس کا انحصار طلبا کی انفرادی طرح پر ہوتا ہے نہ کہ ادارے کے نظم و ضبط اور علمی ماحول پر۔

بد قسمتی سے ہمارے ملک میں بچوں کے لیے عصری اسکول دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جنھیں کانونٹ یا انگلش میڈیم اسکول کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ان اسکولوں میں تعلیمی اخراجات اتنے زیادہ ہوتے ہیں کہ اسے معمولی وسائل کے والدین اور سرپرست برداشت نہیں کر سکتے۔ چونکہ مسلمانوں کی مالی حالت بالعموم خستہ ہے اس لیے چند کو چھوڑ کر زیادہ تر مسلمان بچے ایسے اسکولوں میں داخلے کی بھی نہیں سوچتے۔ ان اسکولوں میں مسلمان بچوں کے نہ جانے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہاں ان کی مذہبی تعلیم کا کوئی نظم نہیں ہوتا۔ ان حالات میں مسلمان بچے زیادہ تر دوسری قسم کے یعنی مسلم زیر انتظام اسکولوں اور کالجوں کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ان اسکولوں کی حالت کیا ہے؟ وہ تعلیم و تدریس کے معاملے میں کتنے سنجیدہ ہیں؟ اس کا اندازہ مندرجہ بالا سطور سے ہو ہی گیا ہوگا۔ اگر مسلم تعلیمی اداروں کی گرتی حالت سے مزید چشم پوشی کی گئی تو ہندوستانی مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں یاس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے

ہماری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں ■■

انتفاضہ

فلسطین میں شروع ہونے والی تحریکِ آزادی اپنے تیسرے سال میں قدم رکھ چکی ہے انتہائی کم وسائل سے شروع ہونے والی اسلامی تحریک عالمی سطح پر "انتفاضہ" کے نام سے معروف ہو چکی ہے اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ میخائل گورباچوف کی گلاسناسٹ اور پریسترائیکا بین الاقوامی سطح پر جتنی معروف ہیں انتفاضہ بھی ان سے کسی طور پر کم نہیں۔ یہ تحریک بلاشبہ دنیا بھر کے مظلوم مسلمانوں کے لیئے ایک سبق ہے اور اس تحریک سے پوری مسلم دنیا خصوصاً مسلمانوں کے مقبوضہ علاقوں میں امید کی ایک نئی کرن جگمگانے لگی ہے۔ مسلم دنیا میں انتفاضہ نے جو جوش اور ولولہ پیدا کر دیا ہے وہ جہاں مسلمانوں کے لیے خوش آئند ہے وہاں اس نے غیر مسلموں کو بھی چونکا دیا ہے۔ آذربائی جان، تاجکستان میں بھی بسنے والے مسلمان انتفاضہ کی تحریک شروع کر چکے ہیں انتفاضہ کا مقصد صرف اور صرف اسلامی شناخت کو برقرار رکھنا ہے اور اس شناخت کو بچانے کے لئے ہی یہ تحریک محدود وسائل کے باوجود اپنا کام کر رہی ہے یہی وجہ ہے کہ اس تحریک نے پوری دنیا کی اسلامی تحریکوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ القدس الشریف مسلمانانِ عالم کے لئے انتہائی مقدس ہے۔ مسلمانوں میں ان کے اختلافات کی درستگی اور اصلاح کے لئے جن لوگوں نے کام کیا ان میں مولانا جمال الدین افغانی، محمد عبدہ، علامہ اقبال سید قطب الدین اور سید ابوالاعلیٰ مودودی کا بہت بڑا حصہ ہے۔ ان محترم شخصیتوں نے کروڑوں افراد پر اپنے اثرات مرتب کیے ہیں۔

انتفاضہ کی یہ تحریک خاص طور پر جہادِ افغانستان اور انقلابِ ایران سے بڑی حد تک متاثر ہوئی ہے ان دونوں تحاریک یعنی جہادِ افغانستان اور انقلابِ ایران کی طرح انتفاضہ کی تحریک بھی

خود انحصاری پر مبنی ہے صیہونیت جو عالم اسلام کے لئے شدید خطرہ ہے وہ اسے فلسطینی دہشت گردوں کی کارروائی قرار دے رہا ہے (اس بات سے قطع نظر کہ صیہونی خود کتنے بڑے دہشت گرد ہیں)

دنیا بھر کے ٹیلی ویژن پر ایسے ہزاروں بچوں، خواتین اور مردوں کو دکھایا جاتا رہا ہے جو صیہونی درندوں کی بہیمیت کا شکار ہو کر زندگی بھر کے لئے معذور ہو چکے ہیں جو لوگ اسرائیلی بربریت کا نشانہ بن کر جاں بحق ہو چکے ہیں اُن کی تعداد اس سے بھی کہیں زیادہ ہے فلسطین کے مظلوم مسلمانوں کو اقتصادی طور پر بدحال کرنے کا جو سامان ہو رہا ہے بین الاقوامی قومی پریس اس بارے میں بالکل خاموش ہے

فلسطین کے مقبوضہ علاقوں میں پھلوں کے نئے درخت لگانے، کنویں کھودنے یا زمین کو زیر کاشت لانے پر پابندی عائد کر دی گئی ہے۔ ۱۹۷۰ء کے بعد سے مقبوضہ علاقوں میں رہائش پذیر مسلمانوں کے لئے پانی کے کوٹے میں اضافہ نہیں کیا گیا جبکہ دوسری طرف مغربی کنارے اور غزہ کے علاقے میں آباد یہودی آبادی کو پانی کی وافر مقدار فراہم کی جاتی ہے اور پانی کو ریزرو رکھنے کا بھی معقول بندوبست کیا گیا ہے اسی طرح فلسطینیوں سے زرعی زمینیں ضبط کر کے یہودی آبادکاروں میں تقسیم کر دی گئی ہیں۔ فلسطینیوں کے علاقے میں بجلی کی لائنوں کو کاٹ دیا گیا ہے تاکہ فلسطینیوں کے کارخانے اور پیداواری مراکز بری طرح متاثر ہوں اس کے ساتھ فلسطینی تاجروں اور کاروباری حضرات پر مختلف اقسام کے ۱۴ ٹیکس عائد کر دیئے گئے ہیں ان ساری کارروائیوں کا مقصد یہ ہے کہ فلسطینی تنگ آ کر اپنے علاقے چھوڑنے پر مجبور ہو جائیں اور اس طرح ان کی زمینیں اور جائیداد پر یہودی آسانی سے قابض ہو سکیں۔ دوسری طرف ایسی بندشوں سے فلسطینی ماہی گیروں کی صنعت بری طرح تباہ ہو چکی ہے۔

یہودیوں (صیہونیوں) نے فلسطین کے جن علاقوں پر اپنا تسلط قائم کیا ہوا ہے وہ علاقے اپنے پیداوار کا استحکام اور آبی صلاحیت کی بناء پر بڑے مشہور تھے۔ ہر اقسام کے پھل اور دیگر زرعی اجناس کی یہاں پر کاشت ہوتی رہی ہے۔ انتفاضہ کی تحریک کے شروع ہونے کا مقصد بھی یہی ہے کہ یہودیوں کی دہشتناک عسکری قوت اور عالمی بے ضمیری کے خلاف آواز اُٹھائی جائے۔ چنانچہ تحریک شروع کرنے کے ساتھ ساتھ یہ فیصلہ کیا گیا اور اس پر عمل درآمد بھی ہو رہا ہے کہ تمام فلسطینی اپنے اپنے [illegible] اسرائیلی مصنوعات

کا مکمل بائیکاٹ کریں۔ چنانچہ انہوں نے دودھ، مکھن، پولٹری اور دیگر زرعی پیداواری اشیاء جو کہ اسرائیلی برانڈ کی ہوتی تھیں ان کا بائیکاٹ کر دیا۔ ان اشیاء کی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے انہوں نے چھوٹی چھوٹی گھریلو صنعتیں قائم کریں اس طرح پولٹری صنعت اور مویشیوں کے چھوٹے چھوٹے فارم قائم کر لیے۔ اسی طرح فلسطینی صنعت کاروں نے بھی ایسے منصوبے بنائے تاکہ وہ اسرائیل سے اقتصادی تعلقات توڑنے کے بجائے مقامی طور پر اپنی مارکیٹ مستحکم کریں۔ چنانچہ اس غرض کے لئے سب سے پہلے الخلیل (ہیبرون) میں بجلی کے آلات تیار کرنے والے ادارے الشرق کمپنی نے اس منصوبے پر کام کیا۔ دوسری طرف رملا میں ایک بیوریج کمپنی کوکاکولا کمپنی کے مقابلہ کام کر رہی ہے۔

مقبوضہ علاقوں میں فلسطینیوں نے مغربی ثقافت کے اثرات بڑی حد تک ختم کر ڈالے ہیں۔ ان میں خاص طور پر شراب خانے، سینما ہاؤس اور دیگر سرگرمیاں قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح سامانِ تعیشات اور قیمتی ملبوسات کی مانگ میں بھی کمی واقع ہوئی ہے۔ معاشرتی تبدیلی میں قابل ذکر شادی بیاہ کی تقریبات ہیں جو پہلے کی نسبت نہایت سادگی سے انجام پذیر ہوتی ہیں۔

انتفاضہ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس نے مجاہدوں کی ایک بڑی کھیپ پیدا کر دی ہے جو ہر عمر اور ہر طبقے کے افراد پر مشتمل ہیں۔ ان میں بچے، عورتیں، بوڑھے اور جوان سبھی شامل ہیں نوعمر لڑکوں نے جو پہلے اپنی غلیلوں سے گلہریوں اور چڑیوں کا شکار کرتے تھے اب تاک تاک کر اسرائیلی سپاہیوں کے سروں کا نشانہ لینا شروع کر دیا ہے ہر اسرائیلی سپاہی غلیل بردار فلسطینی نوجوان "دہشت گرد" سے سہما رہتا ہے۔ یہاں غلیل رکھنا ایک قابل تعزیر جرم ہے یہ مجاہد اپنے وطن فلسطین کی آزادی کے لیے اپنا خون بہانے کو تیار ہیں بلکہ اپنا خون بہا بھی رہے ہیں۔ اب فلسطینی گھرانوں میں اپنے بیٹوں، بھائیوں اور بابوں کی شہادت کی خبر پر قرن اولیٰ کے مسلمانوں کے انداز میں شکر ادا کیا جاتا ہے۔

فلسطینی تحریک آزادی جس کو عام طور پر انتفاضہ کہا جاتا ہے اسرائیلی معیشت کے لئے اب تک کتنا ثابت ہوئی ہے کچھ ہی عرصہ میں اخراجات اضافے اور اجرتوں میں کمی نے عام اسرائیلی کو پریشان کر رکھا ہے انتفاضہ سے قبل مقبوضہ [illegible] میں ایک فلسطینی ڈاکٹر ... اب نہ پہلے کا اسرائیلی مال فروخت ہوتا تھا اس

کا بائیکاٹ کر دیا گیا ہے جس سے اسرائیلی معیشت پر تباہ کن اثرات مرتب ہوئے۔ اسرائیل میں سیاحت اور مقاماتِ مقدسہ دیکھنے کے لئے آنے والے یہودیوں کی تعداد میں حیرت انگیز کمی ہوگئی ہے سیاحوں اور زائرین کی تعداد میں خاصی کمی کی باعث اسرائیلی فضائی کمپنی "ایلاتی" کو پروازوں میں کمی کرنا پڑی۔ کمپنی نے کچھ طیارے بھی فروخت کر دیئے جس کی وجہ سے "ایلاتی" کے ملازمین کی ایک وسیع تعداد روزگار سے محروم ہوگئی۔ رپورٹوں کے مطابق ۱۹۸۸ء میں اسرائیل کی معیشت و زراعت کے لئے بدترین سال تھا۔ اسرائیل ایوانِ صنعت و تجارت کے صدر ڈینی گلبرٹ کے مطابق صرف ۱۹۸۸ء کے ایک سال میں صنعتی پیداوار میں کمی کے باعث ۲ بلین ڈالر خسارہ ہوا جس کے نتیجہ میں ۱۱ ہزار آسامیاں ختم کرنا پڑا۔ ایک اندازے کے مطابق ۱۹۸۸ء کے آخر تک بے روزگاری دس فیصد ہو گئی تھی۔ یعنی ہر سو میں سے ۱۰ ملازمین بے روزگار ہوئے۔ اسی طرح بیدہ نگاروں کی تعداد ایک لاکھ ۸۰ ہزار ہوگئی۔ ۸۸ء میں یہ تعداد ۹۰ ہزار تھی قیمتوں میں ۱۷ فیصد اضافہ ہوا اور اجرتیں ۱۰ فیصد کم ہوئیں۔

اگست ۱۹۸۹ء میں اسرائیلی بلدیات کے ۳۰ میئروں نے روز افزوں بے روزگاری اور بلدی خزانوں کے خالی ہونے کے خلاف زبردست احتجاجی مظاہرے کئے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسرائیلی شہری کس آگ میں جل رہے ہیں۔

فلسطینیوں کو اسرائیل میں کم اجرت دے کر ملازمت دی جاتی ہے جبکہ ان سے انتہائی مشقت لی جاتی ہے انتفاضہ کا آغاز ہوا تو فلسطینیوں نے اسرائیلی کارخانوں میں جانا چھوڑ دیا۔ بائیکاٹ کرنے والے فلسطینیوں کی تعداد ۱۰ لاکھ کے قریب ہے ایک اندازے کے مطابق گذشتہ دو سالوں میں اسرائیلی اقتصادیات کو ۵ ارب ۳۰ کروڑ ڈالر کا نقصان پہنچا ہے دوسری طرف زراعت میں انحطاط کا عمل اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ اسرائیلی کاشتکاروں کی آمدنی میں ۷ فیصد کمی واقع ہو چکی ہے زوال کا یہ عمل مسلسل جاری ہے اگرچہ تحریک انتفاضہ کے بعد امریکی امداد میں بھی متعدد بار اضافہ ہو چکا ہے تاہم ماہرین کے مطابق اسرائیل یہ جنگ زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتا۔ کیونکہ محض اس جنگ کی وجہ سے ۱۰۸ کمپنیوں کا دیوالیہ اور جنگی اخراجات میں ۳ سو بلین ڈالر کا اضافہ ہو چکا ہے۔ یہی بات اسرائیل کی خفیہ کارروائیوں کے سابق انچارج یہودیہ کا ہانے

حال ہی میں شائع ہونے والی کتاب (اسرائیل مستقبل) میں بھی یہ لکھتا ہے

"اگر اسرائیل یہ سمجھتا ہے کہ وہ تشدد اور جبر سے تحریک بغاوت کو فرو کر سکتا ہے یہ خیال ناقص ہے کیونکہ آج اسے دبا بھی دیا گیا تو اس بات کی کوئی ضمانت نہیں کہ کل کو اس سے زیادہ جوش و خروش سے شروع نہیں ہوگی۔ سچ بات تو یہ ہے کہ اس جنگ کا بہتر نتیجہ فلسطینیوں کے حق میں نکل رہا ہے دراصل وہ مشکلات اور نقصان کو برداشت کرنے کی اسرائیل سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ اسرائیل سمیت تمام مقبوضہ عرب علاقوں میں سنسر شپ کا قانون سختی سے نافذ کیا ہے اسرائیل کے خلاف کوئی مضمون، جریدہ، اخبار یا کتاب نہ چھپ سکتا ہے اور نہ ہی داخل ہو سکتا ہے ایسی متعدد مثالیں موجود ہیں اگر اخبار نے آزادیٔ اظہار سے کام لیا تو اس کے خلاف تادیبی کارروائی کی گئی"

(سہ روزہ "دعوت" سے ماخوذ)

افسر روان
آصف نگر، حیدرآباد

غزل

آ نا سنبھل کے بادِ صبا میرے شہر میں
بدلی ہوئی ہے آج کی ہوا میرے شہر میں

صدیوں کے بعد ہی آیا مرا خیال ؛ اب پوچھتے ہیں میرا پتہ میرے شہر میں
تڑپے ہے روح جاگ اٹھی آخری پہر ، آتی ہے گھنگھروں کی صدا میرے شہر میں
خوشبو مہک رہی ہے ابھی دل کے آس پاس ؛ آنے لگی ہے اُن کی ہوا میرے شہر میں
کچھ لوگ میرے شہر کے ٹوٹے بکھر گئے ؛ پھر سے سجاؤ اُن کی بھا میرے شہر میں
بے مہری بے حسی کی نفعدار عام ہو گئی ؛ کب تک یوں ہی چلے گا بتا میرے شہر میں

انسانیت کے نام سے روشن ہو ہر مکاں
روشن ! وہ چراغ جلا میرے شہر میں

شوکت علی
سینئر فار پروموشن آف سائنس، اے ایم یو، علی گڑھ

مسلم زیرِ انتظام اسکولوں کی حالت

ہندوستانی مسلمانوں کی عمومی پسماندگی بالخصوص تعلیمی پسماندگی اور اس کے اسباب کے بارے میں بہت کچھ لکھا جاتا رہا ہے شاید ہی کوئی ایسی اصلاحی میگزین ہو جس میں مسلمانوں کے تعلیمی مسائل سے متعلق کچھ مواد نہ ملے بات سمجھ میں آتی ہے۔ مرض کا بہتر علاج اسی وقت ممکن ہے جب اس کے بارے میں پوری جانکاری حاصل ہو، مگر عموماً یہ پایا گیا ہے کہ مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کے تجزیے میں زیادہ زور سیاسی اور معاشی اسباب پر ہوتا ہے اس پسماندگی میں خود مسلمانوں کا کتنا دخل ہے اس ذکر سے اکثر دامن بچا لیا جاتا ہے معاشی اور سیاسی اسباب کی اہمیت اپنی جگہ پر لیکن یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ اس پسماندگی کی ایک بڑی وجہ مسلم زیر انتظام تعلیمی اداروں کی دن بہ دن گرتی حالت سے چشم پوشی ہے جس کے ذمہ دار ہم خود ہیں۔ یہ اکثر کہا جاتا ہے کہ مسلم تعلیمی ادارے بہت کم ہیں لیکن اس پر غور کرنے کی کوشش بہت کم کی گئی کہ جو ادارے ہیں بھی ان کی حالت کیا ہے اور ان کی گرتی ہوئی حالت کا ذمہ دار کون ہے؟ حکومت؟ اکثریتی فرقہ یا ہم خود؟

مرکز فروغ سائنس مسلم یونیورسٹی کا ایک ایسا شعبہ ہے جو ہندوستانی مسلمانوں میں عموماً تعلیم خصوصاً سائنسی تعلیم کی ترویج و فروغ کے لئے کوشاں ہے یہ مسلم زیر انتظام اسکولوں اور کالجوں کے اساتذہ کے لیے ریفریشر کورسس کا انعقاد بھی کرتا ہے۔ ہر ریفریشر کورس میں ۲۵ سے ۳۰ اساتذہ شریک ہوتے ہیں اور سال میں کم از کم چار ریفریشر کورسوں کا انعقاد ہوتا ہے۔ ۱۹۸۱ء کورسوں میں آنے والے اساتذہ سے انٹرویو اور کچھ ذاتی مشاہدات کی مدد سے جو معلومات حاصل

گئی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ ہمارے زیادہ تر تعلیمی اداروں کی حالت خستہ ہے اور ان میں تعلیمی سرگرمی کے علاوہ ہر وہ سرگرمی پائی جاتی ہے جو تعلیم و تدریس کے لیے سم قاتل ہے زیادہ تر تعلیمی ادارے بالعموم درج ذیل بیماریوں کے شکار ہیں ۔

۱۔ سیاسی سرگرمیاں (۲) انتظامیہ میں آپسی ٹکراؤ (۳) پرنسپل اور ٹیچر کے اختلافات
۴۔ اساتذہ کی تقرریوں میں دھاندلی (۵) تجربہ کاروں کی کمی (۶) امتحانات میں نقل نویسی کی حوصلہ افزائی۔ (۷) والدین اور سرپرستوں کی غفلت (۸) اسکولوں میں کورسس کا ختم نہ ہونا۔ (۹) اساتذہ کا ٹیوشن کرنا (۱۰) اساتذہ اور انتظامیہ کے لئے طلباء کا کام کرنا (۱۱) اساتذہ کے آپسی اختلافات میں طلباء کا استعمال ہونا (۱۲) ڈسپلن کی کمی (۱۳) اساتذہ کا امتحانات میں نمبر بڑھوانا (۱۴) اساتذہ کا ریفریشر اور ٹریننگ کورسوں میں جانے سے گریز ۔

(۱) سیاسی سرگرمیاں :۔ اکثر مسلم اداروں کی انتظامیہ میں ایسے افراد حاوی ہوتے ہیں جو مقامی اور ملکی سیاست میں حصہ لیتے رہتے ہیں وہ اسکولوں اور کالجوں کو اپنے سیاسی اغراض کے لئے استعمال کرتے ہیں ۔ لہٰذا انتظامیہ کی توجہ درس و تدریس کے امور سے ہٹ کر سیاست کی جانب مبذول ہو جاتی ہے اسکول میں داخلہ سے لے کر اساتذہ کی تقرری تک ان کی سیاست اثر انداز ہوتی ہے یہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ ایسے سیاسی افراد کی وجہ سے ہونہار طالب علموں کے حقوق مارے جاتے ہیں اور قابل و باصلاحیت افراد کے بجائے نااہلوں کی تقرریاں ہوتی ہیں ۔

(۲) انتظامیہ میں آپسی ٹکراؤ :۔ بیشتر اسکولوں اور کالجوں کی انتظامیہ کے افراد میں اختلافات ٹکراؤ کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اس حد تک کہ وہ دو گروہ بن جاتے ہیں جو صبح و شام ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں ایسی حالت میں اسکول کے اندر کیا ہو رہا ہے یہ دیکھنے کی کسی کو بھی فرصت نہیں ہوتی ۔ انتظامیہ کے ٹکراؤ سے نہ صرف درس و تدریس کا نظام خراب ہو جاتا ہے بلکہ ادارے کی ترقی بھی رک جاتی ہے ۔

۳۔ پرنسپل اور مینیجر کے اختلافات : یہ بیماری تک بھگ ۹۵ فیصد اسکولوں اور کالجوں میں پائی جاتی ہے۔ کسی بھی تعلیمی ادارے کے لیے یہ دونوں عہدے دار بڑے اہم ہوتے ہیں ان دونوں کے باہمی جھگڑوں میں زیادہ دخل "انا" کا ہوتا ہے اور اس کی شروعات اس وقت ہوتی ہے جب وہ ایک دوسرے کے دائرہ کار میں ہاتھ ڈالتے ہیں یہ بیماری ادارے کو دیمک کی طرح چاٹ جاتی ہے کیونکہ اس سے اسکول کا اسٹاف نمایاں طور پر دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے اور ایک دوسرے پر فوقیت لے جانے کے لیے زور آزمائی شروع ہو جاتی ہے ایک گروہ پرنسپل کی ہاں میں ہاں ملاتا ہے اور دوسرا مینیجر کی بزم کو رونق بخشتا ہے۔ نتیجتاً کلاس روم اساتذہ سے خالی رہتے ہیں۔

۴۔ اساتذہ کی تقرریوں میں دھاندلی : ایک زمانہ تھا جب اسکولوں اور کالجوں میں اساتذہ کا تقرریاں لیاقت کی بنیاد پر ہوا کرتی تھیں، مگر آج صورت حال کافی مختلف ہے۔ اب تقرریوں میں اقربا پروری، دولت، سفارشات اور اکثر و بیشتر رشوتوں کا دخل ہو گیا ہے۔ بڑھتی ہوئی اس بیروزگاری کے دور میں ان برائیوں کا فروغ پانا کوئی ایسی انہونی بات بھی نہیں ہے لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ ایک غلط استاد کی تقرری آنے والی پوری نسل کو تباہ کر کے رکھ دے گی۔

۵۔ تجربہ گاہوں کی کمی : یہ سائنس کا دور ہے۔ کوئی بھی قوم سائنس سے بے بہرہ رہ کر ترقی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔ مسلمان پہلے بھی سائنسی تعلیم کے میدان میں بہت پیچھے ہیں۔ آج بھی مسلم اداروں میں سائنسی مضامین سے بے توجہی برتی جاتی ہے۔ تجربہ گاہ جو سائنسی مضامین کے لیے ضروری ہے اکثر اسکولوں میں ہوتی ہی نہیں اور اگر کہیں ہوتی بھی ہے تو نہ ہونے کے برابر۔ ہائی اسکول و انٹرمیڈیٹ میں پریکٹیکل امتحانوں کے لیے پڑوس کا کالج یا سائنس کے سامان بیچنے والی دکانوں سے سائنسی آلات کرایہ پر لے لیے جاتے ہیں اور کچھ آسان پریکٹیکل کی مشق کرا دی جاتی ہے۔ آئے ہوئے ممتحن کو خوش کرنے کے لیے طرح طرح کے حربے استعمال کیے جاتے ہیں اور طلبا کو پاس کرا دیا جاتا ہے۔ اس طرح بغیر تجربے کیے ہوئے ہی طلبا ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کے امتحانات پاس کر لیتے ہیں۔ ایسے طلبا اعلیٰ درجوں میں سائنسی مضامین سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں یا آگے جا کر تھرڈ ڈویژن

سے پاس ہوتے ہیں۔

۶ ۔ امتحانوں میں نقل کی حوصلہ افزائی : اسکول کھلنے کے تھوڑے دن بعد ہی سے یہ بات کہی جانے لگتی ہے کہ امسال امتحان کا سنٹر فلاں اسکول پر ہے وہاں بڑی سختی ہوتی ہے اس لیے نقل کے امکانات کم ہیں۔ لہٰذا سینٹر بدلوانے کی کوشش شروع ہو جاتی ہے اسکول کا پورا اسٹاف اس نیک کام میں شریک ہوتا ہے اس کے لیے طالب علموں سے چندہ لے کر اُن حضرات کو نذرانہ پیش کیا جاتا ہے جن کی جنبشِ قلم سے سینٹر بدلا جا سکتا ہے اپنی پسند کی جگہ پر سینٹر قائم کرا لینے کے بعد پڑھائی کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہتی۔ کیونکہ اسکول کا رزلٹ بہت اچھا ہو جاتا ہے جس سے انتظامیہ، پرنسپل اور سرپرست سبھی خوش ہو جاتا ہے بچوں اور ملک کے مستقبل کو یکسر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

۷ ۔ والدین اور سرپرستوں کی غفلت : والدین اور سرپرست اپنے بچوں کو اسکول میں داخلہ دلا دینے کے بعد بالکل مطمئن ہو جاتے ہیں اور اپنی ذمہ داری صرف اس حد تک سمجھتے ہیں کہ بچہ اسکول کے لیے گھر سے روانہ ہو جائے۔ داخلے سے لے کر امتحان شروع ہونے تک بچہ کیا کرتا ہے اس کو دیکھنے کے لیے سرپرستوں کو نہ فرصت ہے اور نہ ضرورت۔ البتہ امتحان کے وقت ایک بار پھر ذمہ داری کا احساس ہوتا ہے۔ اس وقت اسکول اور امتحان کے مرکز کا طواف کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ نقل کرانے کی ساری ترکیبیں استعمال کرتے ہیں امتحان ہال میں سوال کا پرچہ بٹنے سے لے کر جواب کی کاپی جمع ہونے تک یہ والدین اور سرپرست حضرات باہر موجود ہوتے ہیں۔ پرچہ ملتے ہی حرکت میں آ جاتے ہیں اوّلاً تو نقل کروانے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ اگر کسی نے بھی تھوڑی بہت مزاحمت کی تو امتحان ہال کے باہر اس سے نمٹ لیتے ہیں۔ یہ کام بغیر کسی تفریق کے سارے سرپرست مل کر کرتے ہیں "اتحاد" کی اس سے اچھی مثال کہیں اور دیکھنے کو نہیں آتی۔

۸ ۔ اسکول میں کورس کا ختم نہ ہونا : اساتذہ حضرات کلاس روم میں سے اکثر غائب رہتے ہیں لہٰذا کورس ختم ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اکثر طلباء تو نصابی کتابوں کی شکل بھی نہیں پہچانتے البتہ اس کی شرح جو اسکول ہی کے کسی استاد کی محنتوں کا نتیجہ ہوتی ہے اور جس کو خریدنا لازمی ہوتا ہے ...

کے پاس ہوتی ہے۔ امتحان قریب ہونے پر بازار میں گیس پیپر (Guess Paper) ملتے ہیں اس میں اس سال آنے والے ممکنہ سوالات کے جوابات دیے رہتے ہیں۔ اس کو ہر طالب علم خرید لیتا ہے جس سے امتحان میں نقل کی پرچی بنانے کی زحمت سے بھی بچ جاتا ہے سوال و جواب دونوں اکٹھے ہی مل جاتے ہیں۔ اگر اس میں سوال نہ ملا تو ماہر بیٹھے ہوئے سرپرست اپنی ذمہ داری سنبھال لیتے ہیں۔

۹۔ اساتذہ کا ٹیوشن کرنا، عام طور پر ٹیوشن کا شمار اچھائیوں میں ہوتا ہے جو سرپرست اپنے بچوں کی تھوڑی سی بھی فکر رکھتے ہیں۔ وہ اسکول ہی کے کسی استاد کے یہاں ٹیوشن کے لئے بھیج دیتے ہیں بعض ٹیچر کے یہاں ٹیوشن کا باقاعدہ کلاس چلتا ہے۔ اسکول میں بھی انھیں بچوں کی طرف زیادہ دھیان دیتے ہیں جو ان کے یہاں ٹیوشن کے لیے رجسٹرڈ ہوتے ہیں۔ ان طلبار کو پاس کرانے کے لئے یہ ٹیوٹر حضرات ہر جائز ناجائز کام کرتے ہیں تاکہ حق ٹیوشن ادا کر سکیں۔

۱۰۔ اساتذہ اور طلبار کا انتظامیہ کے لئے کام کرنا۔ { اوپر لکھا جا چکا ہے اکثر اسکولوں کی انتظامیہ کے حضرات سیاسی ہوتے ہیں یہ حضرات الیکشن میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں ان میں اکثر حضرات الیکشن میں امیدوار بھی ہوتے ہیں اس دوران میں اسکول الیکشن کیمپ کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اساتذہ اور طلبار دونوں الیکشن میں اپنی انتظامیہ کے لیے کام کرتے ہیں۔ پڑھنے اور پڑھانے سے چھٹی مل جاتی ہے۔

۱۱۔ اساتذہ کے آپسی اختلافات میں طلبار کا استعمال ہونا { اساتذہ میں آپس میں رسّہ کشی ہوتی رہتی ہے وہ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش میں ہر وقت لگے رہتے ہیں اور انتظامیہ میں اپنا اثر و رسوخ بڑھانے کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ ان سب مقاصد کو حل کرنے کے لیے طلبار کو استعمال کیا جا سکتا ہے۔ طلبار میں بیٹھ کر ایک دوسرے استاد کی برائیاں گنوائی جاتی ہیں تاکہ طلبار میں اس کی امیج خراب ہو۔ اسی طرح انتظامیہ میں بھی اپنا سر اونچا کرنے کے لیے طلبار کی اکثریت کے ساتھ ہونے کا تاثر دیا جاتا ہے۔

۱۲۔ ڈسپلن کی کمی: اولاً آج کل بیشتر اسکولوں میں ڈسپلن نام کی کوئی شئے نہیں پائی

جاتی اور اتفاق سے کہیں پکڑی بھی جاتی ہے تو برائے نام۔ یہ نتیجہ ہے طلبہ کے دلوں سے اساتذہ کے احترام و ادب کے ختم ہو جانے کا۔ جس کے ذمہ دار خود اساتذہ حضرات ہیں جب سے تعلیم نہیں اور اختلاف پیشہ کے افراد اپنے اپنے فرائض منصبی کو بخوبی ادا کرنے کے بجائے ٹیوشن اور نقل کروانے کے نام پر تجارت کریں گے گروہ بندیوں کا شکار ہوں گے آپس میں لڑائی جھگڑا اور فتنہ و فساد کریں گے ایک دوسرے کی پگڑی اچھالیں گے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ طلباء میں نظم و ضبط باقی رہے۔

۱۳۔ اساتذہ کا امتحانوں میں نمبر بڑھوانا } مقامی امتحانوں کے نتائج تو اسکول کے اساتذہ اور ذمہ داران ہی تیار کرتے ہیں لیکن ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کے امتحانوں کی کاپیاں باہر کے ممتحن کے پاس جاتی ہیں۔ امتحان ختم ہونے کے ساتھ ہی یہ پتہ لگانے کے بعد کہ کاپیاں کہاں گئی ہوئی ہیں۔ بعض اساتذہ حضرات طلباء کے رول نمبر لے کر شہر کا دورہ شروع کر دیتے ہیں اور ممتحن پر طرح طرح کے دباؤ ڈال کر نمبر بڑھوانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اکثر و بیشتر کامیابی بھی مل جاتی ہے۔

۱۴۔ اساتذہ کا ریفریشر اور ٹریننگ کورسوں میں جانے سے گریز } علوم و فنون کے میدان میں بے پناہ ترقی کے باعث اچھی تعلیم کے لیے یہ ضروری ہو گیا ہے کہ اسکولوں اور کالجوں کے اساتذہ کے لیے مستقل تجدیدی کورسوں کا اہتمام کیا جائے۔ ملک میں این سی ای آر ٹی اور دیگر ادارے ایسے کورسس کا برابر اہتمام کرتے رہتے ہیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں مرکز فروغ سائنس مسلم اداروں کے اساتذہ کے لیے ریفریشر اور ٹریننگ اور ہر سال منعقد کرتا ہے۔ ان کورسوں میں مختلف مضامین کے اساتذہ بلائے جاتے ہیں یہ کورس لگ بھگ دو ہفتے کا ہوتا ہے۔ ہم نے یہ پایا کہ ان کورسس میں اساتذہ حضرات کی شرکت تسلی بخش نہیں ہوتی۔ بالعموم اساتذہ اس میں شریک ہونے سے گریز کرتے ہیں اسکولوں اور کالجوں کے پرنسپل اور منیجر صاحبان بھی اس بابت کوئی حوصلہ افزا رویہ نہیں رکھتے۔

درج بالا سطور میں ہم نے مسلم زیر انتظام تعلیمی اداروں کی چند بیماریوں کا ذکر مختصراً کیا ہے۔ ان سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جب مسلم اداروں میں تعلیم و تربیت کا یہ حال ہو تو وہاں کے فارغین کا مستقبل کیا ہو گا۔ بلا شبہ ان حالات میں بھی ان اداروں سے کبھی کبھی ہونہار طالب علم بھی نکلتے ہیں لیکن ان کی

(باقی صفحہ ... پر)

پروفیسر اکبر رحمانی

اردو میں بچوں کا ادب

(یہ مقالہ مہاراشٹرا اسٹیٹ اردو اکاڈمی کے زیر اہتمام ۱۰ اور ۱۱ اکتوبر ۸۷ء کو بمقام ناگپور "بچوں کا ادب" کے موضوع پر منعقدہ سیمینار میں پڑھا گیا)

اُردو میں بچوں کے ادب کا جائزہ لینے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ بچوں کا ادب کسے کہتے ہیں؟ ایک عرصے تک بچے کی شخصیت نظر انداز کی جاتی رہی ہے لیکن نفسیاتی تحقیقات و انکشافات سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ

"بچہ ایک جامد تختی نہیں بلکہ ایک زندہ، متحرک اور باشعور ہستی ہے۔"

بچوں کی اپنی ایک الگ دنیا ہوتی ہے۔ ان کی اپنی پسند اور ناپسند ہوتی ہے۔ ان کی اپنی ضرورتیں اور دلچسپیاں ہوتی ہیں عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ ان کی پسند اور ناپسند، ضرورتیں، دلچسپیاں، احساسات سوجھ بوجھ، شعور اور عادتوں میں تبدیلیاں ہوتی جاتی ہیں۔ غرض بچوں کے شعور، احساس اور فہم و ادراک کی دنیا بڑوں سے بالکل الگ ہوتی ہے۔ اس لیے "وہ ادب جس کے ذریعے بچوں کی دلچسپی اور شوق کی تسکین ہو اور جو مختلف عمر کے بچوں کی نفسیات، ضرورتوں، دلچسپیوں، میلانات اور ان کی فہم و ادراک کی قوت کو پیش نظر رکھ کر تخلیق کیا گیا ہو، صحیح معنوں میں "بچوں کا ادب" کہلانے کا مستحق ہے۔"

اس اعتبار سے جب ہم اردو میں بچوں کے ادب کا جائزہ لیتے ہیں تو سخت مایوسی ہوتی ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اردو میں بچوں کے ادب کا جو سرمایہ ہے، وہ بہت کم ہے اور دوسرے اس میں سے

اکثر غیر معیاری ہے۔ کیا کیفیت اور کیا کمیت دونوں اعتبار سے یہ سراپا ناقص اور کمزور ہے۔

بچوں کے ادب کے نام سے جو کتابیں ہمارے یہاں ہیں وہ نہ ظاہری اعتبار سے رنگین و دلکش ہیں کہ بچے انھیں دیکھ کر للچائیں اور کتاب کے تئیں ان کے دل میں ترغیب و محبت کا جذبہ موجود ہو نہ یہ کتابیں معنوی اعتبار سے دلچسپ ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ ان میں بچوں کی عمر، ضرورتوں اور دلچسپیوں کا کوئی خیال نہیں رکھا گیا ہے۔

معیاری ادب کی کمی کا یہ نتیجہ ہے کہ بچوں کی صحیح ڈھنگ سے ذہنی نشوونما نہیں ہو پا رہی ہے خواندگی اور اکتساب علم کے ابتدائی مراحل میں بچوں کے لیے ناگزیر غیر نصابی لٹریچر بے حد ضروری ہے اس لٹریچر کی بدولت جہاں مطلوبہ لسانی مہارتوں کا حصول سہل ہوتا ہے، وہاں اس سے ان کی ذہنی و جذباتی نشوونما میں بھی بڑی مدد ملتی ہے اور تعلیم کے اعلیٰ مراحل طے کرنے میں آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔

آج اردو تعلیم گاہوں سے جو نسل برآمد ہو رہی ہے وہ نہ اپنے مافی الضمیر کو صحیح طور پر بیان کر سکتی ہے اور نہ دوسروں کے خیالات کو صحیح طور پر سمجھنے کی صلاحیت رکھتی ہے ذہانت اور شخصیت کی متوازن نشوونما میں "مادری زبان" اہم کردار ادا کرتی ہے مگر ہم ہیں کہ اسی سے غفلت برت رہے ہیں۔

ہماری غفلت اور لاپروائی کا یہ حال ہے کہ اب تک ہم بچوں کے ادب کو ایک مسلّمہ صنفِ ادب کا درجہ نہیں دے سکے ہیں۔ جس ادب پر بچوں کے مستقبل کا دارومدار ہے اور اردو زبان کی بقاء کا انحصار ہے اس کو ہمیشہ نظرانداز کرتے رہے۔

"ایک زمانے تک تو ہمارے یہاں یہ تصور رہا کہ بچوں کے لئے کسی مخصوص قسم کے ادب کی ضرورت نہیں ہے جو چیزیں بڑوں کے لئے لکھی جا چکی ہیں انہی کو آسان بنا دیا جائے تو وہ بچوں کے کام آسکتی ہیں۔"

ایک عرصے تک یہی تصور کارفرما رہا لیکن معدودے چند ادیبوں کو اس کا احساس ہوا اور انہوں نے اپنی زندگی اور فن کو بچوں کے لیے ادب تخلیق کرنے میں وقف کر دیا۔ لیکن بڑے ادیبوں نے اس وادی پُرخار میں قدم رکھنا اپنے مرتبے سے فروتر جانا۔ مگر اب رویّے میں تبدیلی کے آثار نظر آنے لگے ہیں۔

بعض محققین اور مبصرین نے سالانہ ادبی جائزہ میں دیگر معروف اصناف ادب کے ساتھ بچوں کے ادب کا بھی سرسری جائزہ لیا ہے[۱] یہ ایک خوش آئند تبدیلی ہے۔

اُردو میں بچوں کا ادبی سرمایہ:۔ اُردو میں بچوں کے ادب کی جھلکیاں ہمیں غالب کے "قادرنامے" اور نظیر اکبرآبادی کی شاعری میں نظر آتی ہیں مگر اس صنفِ ادب کا آغاز ۱۸۵۷ء کے غدر کی ناکامی کے بعد سرسید احمد خاں کی اصلاحی تحریک کے زیرِ سایہ ہوا۔ مولانا الطاف حسین حالی، شبلی نعمانی، محمد حسین آزاد اور دیگر رفقائے سرسید نے بچوں کے اخلاق و عادات اور ان کی ذہنی نشو و نما سے متعلق اخلاقی کہانیاں اور قصے اور دلچسپ نظمیں تخلیق کرکے بچوں کے ادب کی داغ بیل ڈالی۔ اس ادب کو پروان چڑھانے میں اور اسے ایک صنفِ ادب کا درجہ دینے میں سب سے اہم کام مولانا محمد اسماعیل میرٹھی نے انجام دیا۔

مولانا اسماعیل میرٹھی نے اگرچہ علم نفسیات کا باقاعدہ مطالعہ نہیں کیا تھا۔ لیکن وہ بقول سلامت اللہ "سمجھتے تھے کہ بچوں کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کی نشو و نما کس طرح ہوتی ہے۔ بچے ذہنی اور جذباتی اعتبار سے منزل بہ منزل کیوں کر ترقی کرتے ہیں۔ کسی خاص عمر کے بچوں کو کون سی چیزیں اپیل کرتی ہیں اور عمر کی کس منزل پر ان میں سیکھنے کی صلاحیت کس درجہ فروغ پاتی ہے۔۔ انہوں نے بچوں کے لئے جو ادبی سرمایہ چھوڑا ہے وہ آج بھی اتنا ہی مقبول ہے جیسا کہ ان کے زمانے میں تھا۔"

اس لحاظ سے اسماعیل میرٹھی بچوں کے ادب کے امام کہے جا سکتے ہیں۔

علامہ اقبال، سرور جہاں آبادی، تلوک چند محروم، چکبست اور اختر شیرانی نے ادبی حسن سے آراستہ نظمیں تخلیق کرکے بچوں کے ادب کو نہ صرف فروغ دیا بلکہ اسے مضبوط اور مستحکم بنیادوں پر قائم کیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر ذاکر حسین، کرشن چندر، عصمت چغتائی، حامد اللہ افسر میرٹھی، احمد ندیم قاسمی، جگن ناتھ آزاد، اشرف صبوحی، قرۃ العین حیدر، عبدالواحد سندھی، میرزا ادیب، عبدالحئی، مقبول احمد

---

[۱] دیکھئے مضمون "۱۹۹۰ء کا اُردو ادب" از شیخ سلیم احمد ماہنامہ ایوانِ اُردو دہلی جنوری ۱۹۸۷ء

مسعود ہاروی، راجہ مہدی علی خاں، مائل خیرآبادی، صالحہ عابد حسین، محمد حسن، اسعد مجیب، ڈاکٹر محمد مفتی، مظہر الحق علوی، عفت موہانی، قدسیہ زیدی، اطہر پرویز، عبدالغفار مدھولی اور شفیع الدین نیر وغیرہ نے بچوں کے ادب کی آب یاری اپنے خون جگر سے کی۔ یہ انہی ادیبوں اور شاعروں کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ بچوں کے ادب کے فروغ میں بیحد اضافہ اور معیار میں اضافہ ہوا۔

بچوں کے اِن ادیبوں میں جناب شفیع الدین نیر اس لحاظ سے ممتاز ہیں کہ انھوں نے مختلف عمر کے بچوں کی دلچسپیوں اور ذہنی نشو و نما کے پیش نظر، نظم و نثر کی کتابیں تصنیف کی ہیں اور اہم بات یہ ہے کہ انھوں نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ کون سی کتاب کس عمر کے بچوں کے لئے مختص ہے۔ اب تک بچوں کے ادیبوں نے اِس لحاظ سے کتابیں تصنیف نہیں کی تھیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ آزادی کے بعد بچوں کے ادب میں نہ صرف اضافہ ہوا بلکہ صوری و معنوی اعتبار سے اس کے حُسن میں بھی اضافہ ہوا۔

مکتبۂ جامعہ دہلی آزادی سے پہلے بھی بچوں کی کتابیں شائع کرنے میں مصروف تھا لیکن آزادی کے بعد اس نے مزید توجہ دے کر بچوں کے ادب میں تنوع پیدا کر کے اسے دلچسپ اور دلکش بنایا۔ آج بھی یہ ادارہ پہلے سے بڑھ کر خدمت انجام دے رہا ہے۔ اب اِس ادارے سے بچوں کی کتابیں آفسیٹ پر نہایت دیدہ زیب شائع ہو رہی ہیں۔

حافظ محمد یوسف دہلوی کے ادارے "شمع بک ڈپو" نے بھی بچوں کے ادب کی گراں قدر خدمت انجام دی ہے۔ اس ادارے نے اُردو کے نامور اور معروف ادیبوں سے بچوں کے لیے کتابیں لکھوائیں اور انہیں آفسیٹ پر شائع کیا۔ یہ کتابیں نہایت ہی حسین اور دیدہ زیب تھیں کتابت اور طباعت دونوں اعتبار سے دل کش ہوتے اور قیمت میں ارزاں ہونے کی وجہ سے بچوں میں بےحد مقبول ہوئیں۔

بچوں کی کتابیں شائع کرنا منافع بخش کاروبار نہیں ہے بلکہ گھاٹے کا سودا ہے شاید یہی وجہ ہے کہ "شمع بک ڈپو" نے اب بچوں کی کتابیں شائع کرنا بند کر دیا ہے صرف بچوں کا رسالہ

کمسن بچے بھی بک ڈپو کی کتابیں بڑے شوق اور دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔

لکھنؤ کا نسیم بک ڈپو بھی بچوں کے ادب کی بیش بہا خدمت انجام دے رہا ہے۔ اس ادارے سے اب تک سو سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کتابوں کی کتابت و طباعت ویسی معیاری نہیں ہے جیسی مکتبہ جامعہ اور شمع بک ڈپو کی ہے۔ مگر ان کا مواد دلچسپ اور ایڈونچر سے بھرا ہوا ہے۔ ایک زمانے میں اس ادارے سے بچوں کا رسالہ "کلیاں" بھی نکلتا تھا جو کافی عرصہ جاری رہنے کے بعد بند ہو گیا ہے۔

مکتبۃ الحسنات رام پور، مکتبہ الکتاب رام پور، مکتبۂ اسلامی دہلی اور الجمیعۃ بک ڈپو دہلی نے بچوں کے اخلاق و کردار کو سنوارنے والی مذہبی، تاریخی اور اخلاقی قصوں اور واقعات پر مبنی سینکڑوں چھوٹی چھوٹی کتابیں شائع کی ہیں جو آج بھی درس گاہوں اور گھروں میں دلچسپی اور انہماک سے پڑھی جاتی ہیں۔ ان کتابوں کی وجہ سے بچوں میں مطالعۂ کتب بینی کا شوق بڑھا ہے۔ آج بھی ان اداروں سے بچوں کی کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ مذہبی اور اخلاقی موضوعات کے علاوہ سائنس، ایڈونچر، تلاش و تحقیق اور جاسوسی پر بھی کتابیں شائع کر رہے ہیں، اب ان اداروں نے بھی آفسیٹ پر کتابیں شائع کرنا شروع کر دیا ہے۔

سرکاری اداروں میں نیشنل بک ٹرسٹ اور ترقی اردو بیورو نے بچوں کے ادب پر خصوصی توجہ دی ہے۔ ان اداروں نے بچوں کی کتابوں کو ظاہری اعتبار سے کافی دلکش اور رنگین بنا کر پیش کیا ہے۔ بیشتر کتابوں کا سائز بھی ایسا مناسب رکھا ہے کہ بچوں کے دلوں میں انہیں خرید کر پڑھنے کی ترغیب پیدا ہوتی ہے۔ مختلف رنگوں میں نامور آرٹسٹوں کی تصاویر سے مزین یہ دلکش کتابیں بچوں کے لیے بہترین تحفہ ہیں۔

نیشنل بک ٹرسٹ نے نہرو بال پستکالیہ کے تحت تقریباً ۵۰ کتابیں اور ترقی اردو بیورو نے تقریباً [illegible] کتابیں اعلیٰ قسم کے نفیس کاغذ پر سستے داموں شائع کی ہیں۔

قومی کونسل تعلیم نے پاپولر سائنس سیریز کے تحت بھی اردو میں چند کتابیں اچھی سائز میں شائع

کی ہیں۔ ان کتابوں کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے موضوعات الگ الگ ہیں۔ ان میں اخلاقی و سماجی کہانیاں بھی ہیں، سائنسی معلومات اور ایڈونچر سے بھرپور کہانیاں بھی، شاہکار ملکی اور غیر ملکی کہانیوں کے تراجم بھی۔

گزشتہ چند برسوں میں بچوں کے ادب نے بڑی تیزی سے ترقی کی ہے بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں نے بھی بچوں کے لئے لکھنا شروع کر دیا ہے۔ ظ، انصاری، یوسف ناظم، شمیم حنفی مظفر حنفی، غلام حیدر، محمد امین، میرزا ادیب، واجدہ تبسم، جگن ناتھ آزاد، حکیم محمد سعید اور دیگر کئی چھوٹے بڑے ادیب و شاعر بچوں کے لیے سبق آموز، دلچسپ اور فکر انگیز تخلیقات پیش کر رہے ہیں اب اُردو کے بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں کو بچوں کے ادب کی اہمیت کا احساس ہو چلا ہے۔

بچوں کا رسائل، اردو میں بچوں کے ادب کو فروغ دینے میں بچوں کے رسائل نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ آزادی سے قبل "پھول" نامی رسالہ لاہور سے شائع ہوتا تھا جس میں بڑے بڑے ادیبوں کی تخلیقات شائع ہوتی تھیں۔ لکھنؤ سے کلیاں، ثانی الذکر پھلواری جیسے رسائل شائع ہوئے۔ بجنور سے غنچہ، پٹنہ سے مسرت اور مراد آباد سے "چاند" کچھ عرصے شائع ہوا اور پھر بند ہو گیا۔ حکومت ہند کے اشاعتی ادارے سے بچوں کے لیے "نونہال" کچھ عرصے پابندی سے شائع ہوتا رہا۔

مکتبۂ جامعہ دہلی نے آزادی سے قبل "پیام تعلیم" کا اجراء کیا تھا آج بھی یہ رسالہ جاری ہے اور پہلے سے زیادہ آب و تاب کے ساتھ شائع ہوتا ہے۔ اس رسالے نے بچوں کی حوصلہ افزائی کے لیے اُنہی کی تخلیقات پر مشتمل کئی خصوصی نمبر شائع کیے ہیں۔

شمع بک ڈپو دہلی نے اگرچہ بچوں کے لئے کتابیں شائع کرنا بند کر دیا ہے لیکن بچوں کا رسالہ "کھلونا" اسی شان و شوکت سے جاری ہے۔

مکتبۂ الحسنات رام پور وہ ادارہ ہے جس نے چھوٹی عمر اور بڑی عمر والے بچوں کے

لیے بالترتیب ہلال اور نور کے نام سے دو نہایت دیدہ و زیب رسالے جاری کیے گئے ہیں۔ یہ رسالے بچوں کی دلچسپی کے کئی پہلوؤں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں اسی لیے بچوں میں کافی مقبول ہیں۔

حال ہی میں دہلی اکاڈمی کی جانب سے "اُمنگ" نامی بچوں کا رسالہ شائع ہونا شروع ہوا ہے اس رسالے کے اجرا کا مقصد

"بچوں میں تعلیمی لگن پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ انہیں نئی سماجی اور سائنسی سچائیوں سے باخبر کرنا اور ان کی دلچسپی کا لحاظ رکھتے ہوئے ایسی صاف ستھری تحریروں کی فراہمی اور پیش کش ہے جو اُن کی کردار سازی اور انہیں اچھا شہری بنانے میں معاون ہوں۔"

اُردو میں اب تک ایسے رسالے کی کمی شدت سے محسوس کی جا رہی تھی جو تصویری کہانیوں پر مشتمل ہو جس میں تصویروں اور کارٹونوں کے ذریعے کہانی مکمل کی گئی ہو۔ اس کمی کو بمبئی کے نامور آرٹسٹ اور کارٹونسٹ شہاب نے "اُردو کومک" کا اجراء کر کے پورا کر دیا ہے یہ رسالہ دو رنگوں میں ڈیمائی سائز پر حسین کتابت اور فوٹو آفسیٹ طباعت پر پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔ اب تک ۶ شمارے منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ ایسے رسائل کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیے۔

دلکش اور رنگین تصویریں بچوں میں کتابوں کے پڑھنے کا شوق پیدا کرتی ہیں۔ علم سے لگن بھی پیدا ہوتی ہے دوسری زبانوں میں اس قسم کے رسائل کی جس طرح حوصلہ افزائی کی جاتی ہے اسے دیکھنا ہو تو "امر چترکتھا سیریز" کو دیکھیے جو ملک کی چار زبانوں میں شائع ہوتا ہے اور لاکھوں کی تعداد میں فروخت ہوتا ہے اس کی تقلید میں ہندی زبان میں کئی تصویری کہانیوں پر مشتمل سیریز شائع ہونا شروع ہو گئے ہیں اور یہ سب بچوں میں کافی مقبول ہوتے جا رہے ہیں۔ چند سال پہلے اُردو میں بھی امر چترکتھا سیریز شائع ہونا شروع ہوئی تھی۔

رضیہ سلطان اور اکبر کے نام سے یہ کتابچے شائع ہوئے تھے ۔ لیکن اردو والوں کی بے حسی اور عدم دلچسپی کی وجہ سے یہ سلسلہ درمیان ہی میں منقطع ہو گیا۔

بچوں کے ادب کو فروغ دینے میں اخبارات کا بھی اہم رول رہا ہے۔ اکثر ہفتہ وار اور روزناموں نے بچوں اور طلباء کے خصوصی صفحے شائع کرنا شروع کر دیئے ہیں۔ مالیگاؤں سے گزشتہ ایک سال سے ایک ہفتہ وار اخبار "غبار تدریش" کے نام سے شائع ہو رہا ہے جو بچوں کے لیے مختص ہے میری معلومات کے مطابق یہ بچوں کا پہلا ہفتہ وار اخبار ہے۔

اردو میں شائع ہونے والے بچوں کے رسائل کی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں، لیکن یہ رسائل جدید تقاضوں اور بچوں کی ضروریات اور دلچسپیوں کو پورا کرنے سے قاصر ہیں۔ رنگین تصویروں کی کمی، کارٹونوں، خاکوں اور موضوعات میں یک رنگی بار بار کھٹکتی ہے۔ ان رسائل کا کوئی خاص ادبی اداراتی عملہ نہیں ہے۔ ان رسائل کے مدیران نے مختلف عمر کے بچوں کی ضرورتوں، دلچسپیوں اور رجحانات کو جاننے کے لیے مطالعاتی کیمپ یا سروے کیا ہو، ایسا واقعہ اب تک میری نظروں سے نہیں گزرا ہے بچوں میں کتب بینی کا شوق پیدا ان میں پڑھنے اور ان میں علم و ادب کی لگن پیدا کرنے کے لئے قومی یا ریاستی سطح پر بچوں کے میلے "بچوں کی کتابوں کی نمائش" کے انعقاد کی خبر اب تک کہیں سے سننے میں نہیں آئی نہ پڑھنے میں آج بھی اردو میں چندا ماما جیسے رسالے کی کمی ہے۔ بچوں میں اس رسالے کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ لاکھوں کی تعداد میں ملک کی سات زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔

تنقیدی جائزہ : بچوں کے ادب کی جو تعریف کی گئی ہے اس کی روشنی میں جب ہم بچوں کے ادبی سرمائے کا جائزہ لیتے ہیں تو اکثر یہ غیر معیاری، ناقص اور کمزور نظر آتا ہے ــــ جیسا کہ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ ان میں مختلف عمر کے بچوں کی نفسیات، ضرورتوں، دلچسپیوں اور معلومات کا کوئی خیال نہیں رکھا گیا ہے اور نہ ان کی قوت فہم و ادراک کے پیش نظر تخلیق کیا گیا ایسا شمار یہ بہت کم سرمایہ ملتا ہے۔ آج اگر ہم پہلی جماعت سے لے کر دسویں جماعت تک ہر درجے کے طلباء کی عمر اور ان کی [illegible] کتابوں کی فہرست مرتب کرنا چاہیں تو شاید ہی یہ کام

اطمینان بخش طور پر انجام پاسکے۔

چند سال پہلے راقم الحروف نے پہلی سے آٹھویں جماعت تک کے طلباء کے لیئے اس قسم کی فہرست مرتب کرنا چاہی۔ اس وقت بچوں کی جتنی کتابیں دستیاب تھیں انہیں منگوا لیا گیا جب فہرست بنائی گئی تو معلوم ہوا کہ ۴ تا ۶ سال کی عمر کے بچوں کیلئے کوئی معقول کتاب نہیں۔ ۶ تا ۱۰ سال کی عمر والوں کے لئے بھی کتابیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ شفیع الدین نیر کی چند کتابیں ہیں جو طلبار کی ضرورتوں کے لیئے ناکافی ہیں ۱۱ تا ۱۴ سال کی عمر کے طلباء کے لئے کتابیں بہ نسبت متذکرہ AGE-GROUPS کے زیادہ ملتی ہیں۔ لیکن آمدہ تعلیم کے روبہ زوال معیار کو دیکھتے ہوئے یہ کتابیں بھی غیر موزوں معلوم ہوتی ہیں۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اردو میں بچوں کا جو ادبی سرمایہ ہے اس کا ۹۰ فی صد حصہ بڑی عمر کے بچوں (۱۳ تا ۱۶) سال کی عمر کے لیئے ہے۔

یہاں یہ بات دھیان میں رکھنی چاہیئے کہ باضابطہ تعلیم کا ابتدائی مرحلہ (نرسری پرائمری اور پرائمری) بڑی اہمیت کا ہوتا ہے بچے کی شخصیت کی ہمہ جہتی نشوونما میں یہ ایک بنیادی منزل ہوتی ہے۔ یہی وہ منزل ہوتی ہے جب کہ ہم بچوں میں تعلیم سے رغبت اور دلچسپی پیدا کر سکتے ہیں۔ اسی منزل پر بچوں میں مطالعہ کتب بینی کا شوق پیدا کیا جاتا ہے اس لیئے اس مرحلے پر ایسی معاون اضافی کتابوں کا فراہم کرنا بہت ضروری ہے جو نہ صرف بچوں کی معلومات میں اضافہ کریں بلکہ ان میں جذبۂ تجسس کو ابھارنے والا دلچسپ مواد بھی ہو۔

اب تک اس اہم اور بنیادی کام کی طرف کسی تعلیمی ادارے یا اشاعتی ادارے نے توجہ نہیں دی ہے اگر ہم اپنی نسل کو گونگے اور بہرے ہونے سے بچانا چاہتے ہیں اور موجودہ مسابقتی دوڑ کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں تو اس بنیادی کام کی طرف سنجیدگی سے توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

ایک اور خامی جو بچوں کے ادبی سرمائے میں نظر آتی ہے وہ موضوعات کی یک رنگی و یکسانیت ہے آپ کو میری اس رائے سے متفق ہونا پڑے گا کہ اردو میں بچوں کے ادب کا ۷۵ فی صد سرمایہ پرانی داستانوں، لوک کہانیوں مذہبی و تاریخی قصوں، اخلاقی حکایتوں، پریوں اور پری زادوں کے قصوں نیز کچھ اصلاحی اور فرقی منظری

واقعات پر مشتمل ہے۔ سائنسی علوم، سماجی علوم، ڈرامے، مہمات، مختلف ممالک کے جغرافیائی حالات اور وہاں کے باشندوں کے رہن سہن اور تہذیب پر کتابیں بے حد کم ہیں۔ مزاحیہ نثر و نظم کی کتابیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ موضوعات کے تنوع کے بارے میں ملک کے نامور اہلِ قلم موہن راکیش نے بڑے پتے کی بات کہی ہے:

"... بچوں کو کہانیوں کی کتابیں پڑھانے کے بجائے اُن میں خاندان اور سماج کے تعلق کی اہمیت کو اُبھارا جائے۔ ہم بچوں کو خاندان سے محبت کا سبق سکھائیں اس کے بغیر کیوں کر توقع رکھ سکتے ہیں کہ یہی بچے آئندہ چل کر اپنی قوم اور ملک سے محبت کر سکیں گے۔ دوسرے یہ کہ بچے ایڈونچر پسند کرتے ہیں یورپ اور امریکہ میں دُنیا کے تقریباً تمام ایڈونچر کہانیاں لکھی جا چکی ہیں اور انہیں بڑے اہتمام سے شائع کیا جا رہا ہے۔ ان کہانیوں کے تراجم سے بچوں کے ادب کو مالا مال کیا جا سکتا ہے کچھ ایسا ہی حال سائنسی کتابوں کا ہے ہمیں سائنسی موضوعات پر کتابیں لکھنے کی ضرورت ہے۔" [1]

حالیہ چند برسوں میں بچوں کے لیے جو کتابیں شائع ہوئی ہیں، ان میں اکثر سائنسی، ایڈونچر اور طلبا کے ماحول سے متعلق سماجی کہانیوں پر مشتمل ہے یہ خوش آئند تبدیلی ہے اور توقع کی جاتی ہے کہ آئندہ اس میں مزید ترقی ہوگی۔

دراصل بچوں کے لیے لکھنا کوئی آسان کام نہیں۔ بچوں کے ادیب کے لئے ضروری ہے کہ وہ علم نفسیات سے اچھی طرح باخبر ہو۔ اگر اس نے علم نفسیات کا باضابطہ مطالعہ نہ کیا ہو تو کوئی حرج نہیں مگر بچوں کی دلچسپیوں ضرورتوں، ان کی پسند، ناپسند، میلانات اور قوتِ فہم و ادراک سے بخوبی واقف ہو۔ ایسا ادیب ہی بچوں کے لیے صحیح مواد تخلیق کر سکتا ہے۔

ان دنوں اُردو کے اکثر ادیب و شاعر بچوں کے لئے لکھ رہے ہیں ــــ وہ اگر مختلف عمر کے بچوں کی

---

[1] "ہماری زبان" دہلی شمارہ ۸، ۱۵ر اکتوبر ۱۹۷۹ء

ورثے کے لئے خطرناک ہوسکتی تھیں۔ یہ اُن کی عظمت کی نشانی ہے۔ حاؔلی کا بھی یہی حال تھا وہ اپنے فکر و عمل میں توازن رکھتے تھے اور ہر پرانی چیز کو سونا سمجھ کر نئی چیز سے بدکتے نہیں تھے یہی وجہ ہے کہ عبدالحق حقیقی معنوں میں حاؔلی کے جانشین کہلاتے ہے۔

تنقید کی ذیل میں عبدالحق کے تبصروں کو بھی شمار کیا جاتا ہے۔ اُردو ادب میں تبصرہ کوئی نئی چیز نہیں ہے لیکن اس سے پہلے جو بھی تبصرے لکھے گئے' باستثنیٰ حاؔلی کے تبصروں کے وہ عموماً تعریف یا تنقیص ہوتے تھے۔ اِسے فن کی حیثیت سے بہت کم برتا گیا تھا۔ عبدالحق نے حاؔلی کی پیروی کرتے ہوئے نہایت سنجیدگی' متانت اور غیر جانب داری کے ساتھ تبصرے لکھے اور اُردو ادب میں "تبصرہ نگاری" کو فن کا درجہ دیا۔ بڑا آدمی وہ ہے جو دوسروں کی بڑائی کا اعتراف کرے۔ عبدالحق نے دوسروں کی بڑائی کے اعتراف میں شاید ہی کبھی پس و پیش کیا ہو۔ جب علامہ اقبال کی بانگِ درا شائع ہوئی تو عبدالحق نے اس پر تبصرہ لکھا۔ اس سے عبدالحق کے ذہن کی تیزی اور عالمانہ وقار کا اندازہ ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں۔

> "کتاب کھولتے ہی پہلی نظم جس پر نظر پڑی "ہمالہ" ہے کہ وہ ہمالہ ہندوستان کی شان و شوکت کا نشان اور اُس کے دامن کا پاسبان ہے۔ ہندوستان کا بچہ بچہ اسے جانتا ہے اور اس پر فخر کرتا ہے جس کی شاعری کی ابتدا ہمالہ ہو اُس کی انتہا کیا ہوگی؟ میں اقبال کے لئے اُس میں نیک شگون پاتا ہوں۔ وہ محاسن جو بعد میں ڈھونڈ' ڈھونڈ کر اقبال کے کلام میں ہم نے نکالے ہیں' اُن سب کے بیج اس نظم میں نظر آتے ہیں۔ تخیل' تشبیہات' بندش اور خیالات سب آئندہ کی غمازی کر رہے ہیں اور جو اپنا پیغام دلوں تک پہنچاتی ہے وہ یہ ہے کہ اس میں حبِّ وطن کی بو آتی ہے۔"

اقبال کی دوسری نظمیں اور اُن کی شاعری کی روشنی میں اگر عبدالحق کے تبصرے کو دیکھا جائے تو اُن کی رائے میں توازن' سنجیدگی و متانت اور شخصیت و فن کے اعلیٰ پارکھ اور نباض ہونے

ہونے کا ثبوت مل جاتا ہے۔

میں نے ابتداء میں مولوی صاحب کے مورخ اور ماہرِ لسانیات ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس حقیقت کا اندازہ "قواعدِ اُردو" اور "دریائے لطافت" کے مقدمے پڑھ کر ہوتا ہے اسی طرح قدیم ادب کی جتنی کتابیں مولوی صاحب نے مرتب کی ہیں ان میں انھوں نے لسانی مطالعے کو ملحوظِ خاطر رکھا ہے وہ عربی اور فارسی کے الفاظ کم سے کم استعمال کرتے ہیں۔ وہ زبان کو ثقیل نہ بناتے ہوئے اس میں شیرینی، صفائی اور سادگی پر زور دیتے ہیں اپنے مختلف مضامین کے علاوہ اپنی دوسری دو مستقل تصانیف "نصرتی" جو بیجاپور کے ملک الشعراء کے حالاتِ زندگی اور کلام سے متعلق ہے اور "اُردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام" میں بھی عبدالحق کا نقطہ نظر برابر قائم رہا اور انہوں نے اس کے زیر اثر داخلی اور خارجی دونوں خوبیوں کو پیش کیا ہے۔ مولوی صاحب کے دماغ کا یہ تجزیاتی پہلو جو ان کی دوسری تصانیف میں بھی دکھائی دیتا ہے' اس کی بنیاد شاید لسانیات ہی پر ہے جو مولوی صاحب کا محبوب ترین موضوع رہا ہے "خطباتِ اُردو" میں بھی ان کا تجزیاتی ذہن کارفرما ہے "خطباتِ اُردو" اور "چند ہم عصر" میں جو ان کے آٹھ مضامین پر مشتمل ہے ان کے نقطۂ نظر، سیرت و کردار اور تلاش و جستجو کا رجحان بدرجۂ اتم دکھائی دیتا ہے۔ عبدالحق نے اپنے آپ کو جو چھپانے کی کوشش کی ہے اس کی پردہ دری تھوڑی بہت اگر کہیں ہوتی ہے تو وہ اپنی خطبات اور خاکوں کے اسی مجموعے میں۔

مولوی صاحب کی شخصیت اور سرسید کی شخصیت میں بڑی مماثلت ہے۔ دونوں دھن کے پکے تھے اپنی زبان کے عاشق و شیدا اور آزاد خیال (MODERNISM) کے در پر وہ PRIMITIVE تھے۔ مذہب سے دونوں کا تعلق تھا بھی اور نہیں بھی۔ بظاہر ان دونوں سے زیادہ کافر اور مرتد مسلمانوں میں کوئی اور نہیں اور بباطن ان دونوں سے زیادہ اسلام اور مسلمانوں کا غمگسار ملنا مشکل ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ سرسید نے سرکاری نوکری کی اور سیاست میں بھی حصہ لیا اور مولوی صاحب سیاست سے بیگانہ نہ رہے' لیکن بیگانہ مصلحت اندیشی' جیسے

غیر از سیاست معاشرہ سمجھا جاتا ہے، مولوی صاحب کے لئے ناگوار تھی۔ اُن کی کمزوریاں محاسن کا پیش خیمہ تھیں حق پسند صاف اور سیدھی بات کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے۔ اُردو تحریک جس کے کئی روپ ہیں اور جو انجمن ترقی اُردو سے کر عثمانیہ یونیورسٹی تک پہنچی۔ بلا کسی سیاسی نقطۂ نظر کے اپنا کام کئے جا رہی تھی۔ اور کسی مفاد پرست کا اس تحریک سے تعلق نہیں تھا مولوی صاحب ہمارے ادب میں پہلے ڈکٹیٹر تھے اور شاید آخری بھی۔ اُن کی یہ آمریت مفاد پرستوں کے لئے مفید ثابت نہیں ہوئی لیکن اُردو کو اس سے بڑا فائدہ پہنچا ہے۔ کہتے تھے ۔

"ایسے لوگ بھی دھوکا دے گئے جن کے متعلق میں سمجھتا تھا کہ یہ مجھ سے زیادہ مخلص ہیں۔ اب تو یہ صورت ہے کہ خود اپنے آپ پر بھی اعتبار نہیں رہا۔"

اس سے اس بات کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ مولوی صاحب شروع میں صلاح و مشورے سے کام کرتے رہے ہوں گے۔ بعد میں احباب کے رویئے نے انہیں ادبی آمر بنا دیا۔

عبدالحق نے شروع ہی سے ایک مقصدی زندگی گزاری۔ مقصدی زندگی کا ڈھونگ تو بھی رچاتے ہیں، مگر بہت کم لوگ اس میں پھل ہوتے ہیں۔ اکثر اوقات یہ مقصد ذاتی مفاد، فلیٹ اور کار کا ملا نذر ہو جاتے ہیں۔ مگر مولوی صاحب نے اپنی زندگی کو مقصد کی نذر کیا اپنی زندگی کے قیمتی ایام 'انجمن' کے دفتر میں گزارے۔ انہیں نہ صحت کی پرواہ تھی نہ جاہ و منصب کی۔ بس ایک دھن اور ایک لگن اور ایک مقصد تھا، جس کی طرف وہ کھنچے جا رہے تھے۔

مولوی صاحب نے شادی نہیں کی۔ شادی کرنا کون نہیں چاہتا۔ مگر شادی کے بعد توجہ کا بٹ جانا یقینی ہے۔ بیوی اور اولاد سے پیار و محبت، اپنے مقصد سے محبت میں مانع آتی ہے وہ اپنے مقاصد میں کسی طرح کا دخل گوارا نہیں کر سکتے تھے اور شاید اسی لئے وہ اپنے مقاصد میں کامیاب بھی ہوئے۔ اس سلسلے میں مولوی صاحب کی سپھلتا کا راز وہ ماحول اور زمانہ ہے جو سر سید کے عہد سے لے کر آج تک ہمارے ادب پیش رہا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ماحول کا انسان کے مقصد میں بہت بڑا دخل ہے ایک ناسازگار

ماحول اکثر اوقات اعلیٰ سے اعلیٰ دماغی صفات کو ضائع کر دیتا ہے اور اگر کوئی معقول صحبت یا ماحول مل گیا اور صلاحیت بھی ہوئی تو آدمی ترقی کی اوج تک پہنچ جاتا ہے۔ مولوی صاحب بڑی حد تک ماحول ہی کی پیداوار ہیں جنھیں اُن کے مقصدِ حیات اور مقاصد نے ترقی کی اوج تک پہنچانے میں مدد کی۔

بزمِ فروغِ اُردو اسلامیہ کالج، لاہور کے سپاس نامے کے جواب میں تقریر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ

"میں آپ کے لئے دعا کرتا ہوں کہ آپ ہمیشہ جوان رہیں۔ میری طرح کبھی بوڑھے نہ ہوں۔ اس دعا کو کوئی معمولی یا ناممکن نہ سمجھے۔ ہمیشہ جوان رہنا ممکن ہے بے شک جوانی لوٹ کر نہیں آتی، لیکن وہ قائم رہ سکتی ہے، جوانی کو قائم رکھنے کے لئے کوئی بلند مقصد ہونا چاہیئے۔ مقصد سے زندگی بنتی بھی ہے اور بڑھتی بھی ہے اور قائم بھی رہتی ہے آپ بار بار مجھے بڈھا اور پیر کہتے ہیں۔ میں ابھی دو سال پہلے تک بڈھا نہیں تھا۔ جوانی چوڑے چکلے سینے، کسے ہوئے ڈنڈ اور بھاری ڈیل ڈول سے نہیں بنتی اور بڈھا سفید بالوں اور کبڑی کمر سے نہیں بنتا۔ جوانی ہمت اور عزم سے ہوتی ہے جوان وہ ہے جس کا عزم جوان ہے۔"

برنارڈ شا کی طرح مولوی صاحب کو بھی ادب میں شخصیت سے زیادہ تصورِ حیات سے دلچسپی رہی۔ شخصیت پرستی سے زندگی بنتی نہیں۔ بگڑتی ہے۔ شخصیت پرستی سے ذہنی صلاحیتیں فروغ پانے کی بجائے مرنے لگتی ہیں اُنھیں خوشامد اور ظاہرداری سے چڑ ہے چنانچہ اُن کی تحریروں میں جابجا ایسی مثالیں ملیں گی جن سے میرے بیان کی تصدیق ہو سکتی ہے۔ وہ شخصیتوں کے مداح نہ تھے، اُن کے کارناموں کے گرویدہ تھے۔

"چند ہم عصر" میں مولوی صاحب کے مختلف اشخاص پر لکھے ہوئے خاکے ہیں۔ یہ کتاب صرف ادبی حیثیت سے ہی نہیں، بلکہ مولوی صاحب کے سمجھنے میں بھی ہماری مدد کرتی ہے دوسری شخصیتوں کو سمجھنے کے لئے ہر شخص کے پاس حسن و قبح کا ایک مخصوص میزان ہوتا ہے دوسرے دن

دلچسپیوں اور ضرورتوں کا مطالعہ کرنے کے بعد ادب کی تخلیق کریں تو یہ ایک نہایت مفید خدمت ہوگی اور بچوں کے لیئے ایک عظیم نعمت ثابت ہوگی۔ اس قسم کے ادب سے اردو زبان بھی زندہ و قائم رہے گی۔

بچوں کے ادب کو بہتر، معیاری اور سائنٹفک بنانے کی ذمہ داری ادیبوں، شاعروں اور ناشروں کے علاوہ والدین اور سرپرستوں پر بھی عائد ہوتی ہے۔ نا گفتہ بہ ہمارا معاشرہ معاشی اعتبار سے مفلسی کا شکار ہے لیکن اتنا بھی گیا گذرا نہیں کہ اپنے بچوں کے بہتر مستقبل سے بالکل لاپرواہ ہوجائے۔ اگر والدین اور سرپرست حضرات بچوں کے لئے معاونِ نصاب چھوٹی چھوٹی کتابیں اور دیگر مواد (جیسے بچوں کے رسائل) کی خریداری پر توجہ دیں گے تو اس سے بچوں کے ادب کی حوصلہ افزائی ہوگی۔

درس گاہوں اور تعلیمی اداروں میں بھی بچوں کی لائبریری کا ہونا بعد ضروری ہے اسکول کے اوقات میں بھی کتابیں اور رسالے پڑھنے کا شوق پیدا کیا جائے۔ گھر پر مطالعہ کے لیئے کتابیں لے جانے کی بھی ترغیب دی جائے۔

ہر سال مختلف مقامات پر بچوں کی کتابوں کے میلے منعقد کر کے بچوں میں کتاب پڑھنے کا شوق پیدا کیا جائے۔

مختلف جماعتوں اور عمروں کے لحاظ سے بچوں کی کتابوں کی ایک جامع فہرست شائع کی جائے۔

ہر کتاب پر یہ تحریر ہو کہ یہ کس عمر (AGE-GROUP) کے بچوں کے لیئے مناسب ہے۔

مختلف جماعتوں کی درسی کتابوں کا جائزہ لے کر ذخیرۂ الفاظ (vocabulary) کی فہرست بنائی جائے تاکہ ان کے پیش نظر ادیبوں اور شاعروں کو بچوں کا معیاری ادب تخلیق کرنے میں آسانی ہو۔

ان چند تجویزوں پر عمل کیا گیا تو معیاری ادب کی تخلیق کے ساتھ بچوں کے ادب کو بھی فروغ حاصل ہوگا۔

٭٭٭ ٭٭٭ ٭٭٭

قلمکار حضرات اپنی نگارشات "شاداب" کو روانہ کرتے وقت خیال رکھیں کہ

وہ غیر مطبوعہ، صاف خوشخط اور کاغذ کے صفحہ ایک جانب لکھی ہوئی ہوں!

■ جواب طلب امور کیلئے جوابی لفافے یا پوسٹ کارڈ کا آنا ضروری ہے۔

ڈاکٹر عبدالستار دلوی

مولوی عبدالحق

مولوی عبدالحق سنہ ۱۸۷۰ء میں میرٹھ ضلع کے قصبے ہاپڑ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے وطن ہی میں حاصل کی اور اعلیٰ تعلیم کے لئے دارالعلوم علی گڑھ تشریف لائے جہاں سے ۱۸۹۴ء میں فلسفہ، تاریخ میں بی۔ اے پاس کیا۔ علی گڑھ کے قیام کے دوران میں سر سید سے بہت قریب ہو گئے یہاں تک کہ زیادہ وقت سر سید کے ساتھ علمی و ادبی کاموں میں مصروف رہتے۔ دورانِ طالب علمی ہی میں سر سید کے خاندان کے ایک فرد بن گئے تھے جب علی گڑھ کالج کے لئے پہلے پہل یونیفارم بنا تو سر سید نے اپنے اور سید محمود کے علاوہ کسی لڑکے کے لئے یونیفارم تیار کرایا تو وہ عبدالحق تھے۔

بی اے پاس کرنے کے بعد عبدالحق ۱۸۹۵ء میں حیدرآباد تشریف لے آئے، جہاں ایک نہایت قلیل مشاہرے پر ملازمت قبول کر لی اور بعد میں انگریزی دانی کے بدولت اپنے لئے ترقی کا راستہ ہموار کیا۔ حیدرآباد ہی میں انہوں نے ایک مولوی صاحب سے عربی زبان و صرف و نحو اور ادب کی کتابیں پڑھیں۔ ہندی سے دلچسپی بھی اسی دوران میں پیدا ہوئی اور اس پر عبور بھی حاصل کیا دکنی اور گجری کا بھی مطالعہ کیا اور ان میں مہارت بہم پہنچائی۔ علم کے دریائے ناپیدا کنار سے دلچسپی جو سر سید ہی کی وساطت سے پیدا ہوئی تھی اس کو اوجِ ترقی پر پہنچانے کے حوصلے اور مواقع سرزمینِ حیدرآباد ہی میں میسر آئے اور بلند و بالا مقاصد کی تعبیر ہونے لگی۔ ۱۹۰۱ء میں افسر الملک کے کہنے پر رسالہ "افسر" جاری کیا۔ جس کا مقصد اردو زبان میں علمی، تاریخی، فلسفیانہ، تمدنی، قومی مضامین اور عمدہ کتابوں پر ریویو لکھنا تھا۔ اس رسالے کے علمی معاونین میں حالی، ذکاء اللہ، [illegible] عماد الملک [illegible]

شخصیتیں تھیں۔ رسالہ افسر کے اجرا سے دراصل عبدالحق کی ادبی خدمات کا باب کھلتا ہے اور اُردو میں علمی، تاریخی، فلسفیانہ اور تمدنی مضامین لکھنے کا رواج عام ہوتا ہے۔

اُردو ادب میں مولوی صاحب مختلف النوع شخصیت کے مالک ہیں اور ادبی دنیا اُن سے ایک مورخ، محقق، نقاد، لغت نویس، مترجم اور خاکہ نگار کی حیثیت سے واقف ہے تحقیق کے میدان میں اُن کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے قدیم دکنی ادب کو منظرِ عام پر لا کر اُسے عوام سے روشناس کرایا اور اُس کی عمر کو صدیوں آگے بڑھایا۔ ابھی کچھ سال پہلے تک دکنی شعر و ادب سے ہم ناواقف تھے، مولوی صاحب نے ہمیں دکن میں قطب شاہی اور عادل شاہی دور کی ادبی خدمات سے روشناس کرایا اور اس عہد کے متعدد شاعروں اور ادیبوں کے فن پاروں کو بہ تصحیح مرتب کر کے شائع کیا۔ اس سلسلے میں مولوی صاحب کے سب سے اہم اور قابلِ قدر کارنامے خواجہ گیسو دراز[1] کی معراج العاشقین، قطب شاہی دور کے ملک الشعراء اور عظیم نثر ملا وجہی کی "قطب مشتری" اور "سب رس" ہیں۔ سب رس جو مولوی صاحب کے حسنِ ذوق اور دلی شوق کا نتیجہ ہے، اُردو نثر کی پہلی داستان ہے جو مربوط اور صاف ادبی زبان میں پہلے پہل سامنے آئی۔ اُردو میں باقاعدہ نثر لکھنے کی تحریک دراصل اسی داستان سے شروع ہوتی ہے یہ اور اسی قسم کی دوسری کتابوں پر لکھے ہوئے مولوی صاحب کے بسیط اور عالمانہ مقدمے محض تحقیق ہی نہیں، بلکہ تنقید بھی ہیں۔ اُردو ادب میں تحقیق و تنقید کے مقاماتِ اتصال کی نشان دہی اوّلین اور بہترین مثالیں مولوی صاحب کے انہیں مقدموں میں تلاش کی جا سکتی ہیں اس ضمن میں باغ و بہار اور انتخابِ میر کے مقدمے تحقیق اور تنقیدی نظر کی گہرائی اور گیرائی اور اُن کے مقامات اتصال کی بہترین مثالیں ہیں۔

---

[1] جدید تحقیقات سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ معراج العاشقین، مخدوم حسینی کی تصنیف ہے خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی نہیں۔

عبدالحق نے سرسید اور حالی کے عہد کو دیکھا ہی نہیں، بلکہ اُن سے متاثر ہو کر اُن کے ساتھ اُن کے مقاصد کی تعمیر میں عملی حصہ بھی لیا۔ وہ کام جس کی ابتدا سرسید اور حالی کے ہاتھوں ہوئی، اُس کام کو نئی نسل سے روشناس کرانے کا سہرا عبدالحق ہی کے سر ہے۔ ہمارے ہاں تاثرات میں رنگینی اور رعنائی پیدا کرتے کا نام "ادب" رکھا گیا تھا۔ آزاد کے الفاظ میں "اس عہد کے ادب کی ساری پونجی مضامین عاشقانہ، گلگشت مستانہ، وہی تقدیر کا رونا اور اُمید موہوم پر خوش ہونا تھی"۔ سرسید نے اس تصورِ ادب کی زہرناکی کو محسوس کر لیا تھا۔ انہیں اس چیز کا اندازہ ہو گیا تھا کہ کوئی بھی ادب محض شاعری اور پُر تکلف مسجّع و مقفّیٰ نثر سے آگے نہیں بڑھ سکتا بلکہ اُسے ہمارے خیالات کے اظہار کا فطری آلۂ کار ہونا چاہیئے۔

عبدالحق نے اپنے تمام تنقیدی و تحقیقی مضامین میں جو زبان استعمال کی ہے وہ سرسید اور حالی ہی کے اثر کا نتیجہ ہے۔ اسلوبِ بیان میں اس پرکار سادگی کی ہمارے ادب میں بڑی اہمیت ہے۔ عبدالحق کے یہاں وہ عبارت آرائی نہیں جو ابوالکلام اور نیاز وغیرہ کی خصوصیت ہے۔ ان کی عبارات میں تسلسل اور روانی ہے جو بلاشبہ ان کے خیالات میں تسلسل و روانی کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔ عام طور سے گونگے خیالات، عبارات آرائی اور تشبیہات و استعارات کے سہارے آگے بڑھتے ہیں عبدالحق کی نثر اُن کے خیالات کا آئینہ ہے اور لطف تو یہ ہے کہ اس روانی کے باوجود جوش اور احساس کی شدت میں کسی طرح فرق پیدا نہیں ہوتا۔ یہ اُن کے خیالات کی قطعیت کا نتیجہ ہے جو اُس عہد میں تنہا عبدالحق کی خصوصیت ہے۔

اُردو نثر کی اِن خصوصیات کے ساتھ ہی ساتھ اُردو تنقید بھی گوناگوں تبدیلیوں سے دوچار ہوئی اور تنقید میں قدیم مشرقی اور جدید مغربی نظریات کے امتزاج نے ایک نئی روایت کو جنم دیا۔ عبدالحق نے اس تنقیدی روایت کو جس کے علمبردار حالی ہیں بڑے خلوص اور عزم کے ساتھ برتا ہے۔ حالی کی طرح وہ بھی ماضی سے رشتہ توڑنا پسند نہیں کرتے تھے۔ انھوں نے ماضی اور حال کی تمام اچھائیوں کو قبول کرتے ہوئے، اُن تمام چیزوں سے اپنے آپ کو دُور رکھا جو ہمارے ادبی

زندگی ایک زمیں ایک اور انساں بھی ایک
فکر کا بحر بھی جذبات کا طوفان بھی ایک

وہی سورج ہے وہی چاند ہے تارے ہیں وہی
نیلے آکاش کے گلرنگ کنارے ہیں وہی

ان کے ہاں بھی ہیر رانجھا اور سوہنی مہیوال جیسی عشقیہ داستانوں کا وجود رہا ہے اور ان کے ساتھ بھی وہی المیہ پیش آیا ہے جو ہیر اور سوہنی کی سچی محبت کا حاصل رہا ہے۔

ہیر مغموم ہے پنجاب کے میدانوں میں
جولیٹ روتی ہے انگلینڈ کے ایوانوں میں

اگر کوئی فرق ہے تو وہ ہے بدلتی ہوئی تہذیب اور ذہنیت کا اور جس کے لیئے وہاں کے لوگ نہیں بلکہ وہاں کا سرمایہ دارانہ نظام ذمہ دار ہے جس نے انھیں اپنے دام میں اسیر کر کے صبح سے شام تک سرمایا کی طویل و عریض چہار دیواری میں دوڑ لگانے کے لیے مجبور کر دیا ہے جس کے نتیجہ میں وہ انسانی اور اخلاقی قدروں سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ قناعت پسندی جو انسان کو ذہنی سکون عطا کرتی ہے وہاں کا انسان اس عظیم نعمت سے خود کو محروم کر چکا ہے وہ خود کو مادی اعتبار سے اپنے پیش رو کی صف میں کھڑا کرنے کے لیئے نہ جانے کیسے کیسے مکر و فریب کے جال بُن رہا ہے اخلاق بلندی اور اخوت جو انسان کا اصل جوہر ہے اس میں پوری طرح مفقود ہو چکا ہے۔

سردار جعفری کی دور اول کی شاعری میں رومان کے قدموں کی ہلکی سی آہٹ ضرور سنائی پڑتی ہے مگر ان کے طبقاتی شعور کی گھن گرج نے بہت جلد اس آہٹ کو خود میں ضم کر لیا ہے اور وہ سیاسی اور سماجی مسائل کو حقیقت پسندانہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ ان کی شاعری کا کینوس اتنا وسیع ہے کہ اس میں انسان دوستی، عالمی امن اور بین الاقوامی اخوت وغیرہ سمٹ کر آگئی ہیں۔ حق تلفی، ناانصافی استحصال، نابرابری اور نسلی تعصب کے خلاف جنگ لڑنا ان کا مسلک بن چکا ہے یہی وجہ ہے کہ مزدور کی محنت کا صحیح معاوضہ نہ دینے والوں کو اپنی نظموں میں کافی ذلیل کیا ہے اور ان کے استحصال کے خلاف جنگ

کرتے رہنے کا فیصلہ بھی کیا ہے اور اسی فیصلے ہی کی وجہ سے انھیں کئی بار قید و بند کی صعوبتیں بھی اٹھانی پڑی ہیں مگر جب بھی زنداں کے دروازے پر پہنچے تو شان کے ساتھ یہ شعر پڑھ کر ہی داخل ہوئے ؎

اسی لیے تو ہے زنداں کو جستجو میری
کہ مفلسی کو سکھائی ہے سرکشی میں نے

اور قید میں رہ کر بھی بھولے بھالے عوام کے ذہنوں کو بیدار کرنے اور سرمایہ داروں کے مکر و فریب سے انھیں بچانے کی کوشش جاری رکھی۔ ؎

دل و نظر کو ابھی تک وہ دیے جاتے ہیں فریب
تصوراتِ کہن کے قدیم بت خانے

سردار جعفری کو جیل میں رہ کر بھی یقین ہے کہ ایک روز سرمایہ داری کا طلسم ضرور ٹوٹے گا اور غریبوں و ناتوانوں کے نوالوں پر جھپٹنے والے سرمایہ داروں کو ان کے تمام مظالم کے لیے عوام کی عدالت میں سخت سزا دی جائے گی اس لیے وہ مزدور کو اپنی تحریک اور تیز کرنے کا مشورہ دیتے ہیں اور یہ کہہ کر اسے ہمت دلاتے ہیں ؎

انقلاب آئے گا رفتار سے مایوس نہ ہو
بہت آہستہ نہیں ہے جو بہت تیز نہیں

سردار جعفری نے ہمیشہ مٹی اور کیچڑ میں لتھڑے ہوئے مزدور کے ہاتھوں کا بوسہ لینے کا حکم دیا ہے کیونکہ کائنات کی بیشتر شے میں چمک دمک ہے وہ انھیں ہاتھوں کی محنت کا ثمرہ ہے انھوں نے ہی کڑی دھوپ میں اپنا پسینہ بہا کر عالی شان عمارتیں تعمیر کی ہیں۔ ملوں اور فیکٹریوں میں بننے والی تمام اشیاء کو انھیں ہاتھوں کی محنتِ شاقہ کا نتیجہ کہا جا سکتا ہے یہ مٹی کو چھو کر اس سے عالی شان محل تعمیر کر دیتے ہیں پتھر کو کاٹ کر اتنا خوبصورت مجسمہ بنا دیتے ہیں کہ انسان اس سے محبت کرنے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے۔

کالک کو چھو دیتے ہیں تو اس کا کاجل بن جاتا ہے کہ اسے معشوق آنکھوں میں لگا کر جب عاشق کے سامنے آتا

ہے تو بے ساختہ اس کی زبان سے نکل پڑتا ہے ۔

تیری آنکھوں کی سوا دنیا میں رکھا کیا ہے

ریشم کو اگر یہ ہاتھ نکھار دیتے ہیں تو ایسا کپڑا تیار ہوتا ہے کہ ہر شخص اپنے حسن کی افزائش کے لیے اسے زیب تن کرنا لازمی سمجھنے لگتا ہے اور اگر معشوق پہن لے تو انسان سے حور بن جائے یعنی اس دنیا کی مخلوق ہی نہ رہ جائے اور اگر یہ چاندی کو چھو دیں تو بہترین پائل کی شکل اختیار کر جاتی ہے اور اسے نازنین اپنے حنائی پیروں میں پہن کر جب رقص کرتی ہے تو زاہد خشک کو مجبوراً کہنا پڑتا ہے ؎

توڑ سکتی نہیں تقوے کو مرے کوئی صدا
شرط یہ ہے کہ وہ پازیب کی جھنکار نہ ہو

مگر افسوس یہ ہاتھ چند سکوں اور مٹھی بھر دانوں کے لیے کس قدر کڑی محنت کرتے ہیں اس کا احساس نہ ریشمی کپڑے پہننے والے عیش پسند سرمایہ دار کے گھر والوں کو ہے نہ کاجل لگانے والے معشوق کو، نہ پتھر کے بُت سے محبت کرنے والے انسان کو، نہ چاندی کی پائل پہن کر رقص کرنے والی نازنین کو، نہ مٹی دے کر سونا پانے والی عالی شان عمارات میں بیٹھنے والے مل مالکوں کو۔ مزدور ہر طبقے کے لیے اپنی محنت اور اپنا پسینہ بہانے کے لئے تیار رہتا ہے مگر سماج میں اس کی محنت سے فیض حاصل کرنے والا کوئی طبقہ ایسا نہیں ہے جو اس کی اس محنت کو محسوس کرے اور اس کو اس کا جائز حق دلانے کے لیے آگے آئے۔ شاعر نے ہر شئے کو حقیقت پسندانہ نظروں سے دیکھنے والے پوری دنیا کے انسانوں کو کہا ہے کہ وہ ان کی حمایت ہی نہیں بلکہ ان کی تعظیم بھی کریں ؎

اعجاز ہے یہ ان ہاتھوں کا ریشم کو چھوئیں تو آنچل ہے
پتھر کو چھوئیں تو بت کر دیں کالک کو چھوئیں تو کاجل ہے
مٹی کو چھوئیں تو سونا ہے چاندی کو چھوئیں تو پائل ہے
ان ہاتھوں کی تعظیم کرو
ان ہاتھوں کی تکریم کرو

دُنیا کے حسن لازوال یہی
ان ہاتھوں کو تسلیم کرو

سردار جعفری آنکھ کھولنے اور بولنے ہی کے زمانے سے انسان اور انسانیت کی اعلیٰ قدروں پر فریفتہ رہے ہیں وہ ہر شخص میں انس، محبت اور اخلاص و اخوت کو ہمیشہ ڈھونڈتے رہے ہیں اور اسی انسان اور انسانیت کی تلاش نے انھیں ایشیا کا عظیم شاعر بنادیا ہے، انھوں نے یوں اپنی اس سرگزشت میں کروڑوں لوگوں سے ملاقات کی ہے مگر ان میں انسانیت کا جوہر نہ پاکر یہ کہنے پر مجبور ہوئے ہیں ؎

آہ یہ جنس گراں کس قدر نایاب ہے
ڈھونڈتے پھرتے ہیں انسانوں کو انسانوں میں ہم

انھوں نے یہ محسوس کیا ہے کہ آدمی بس نام کے لیے ہی نسلِ آدم سے تعلق رکھتا ہے ورنہ اس کی حرکات و سکنات، عادات و اطوار جانوروں سے بھی بدتر ہیں، انسانی اور اخلاقی جذبہ اس میں بالکل مفقود ہو چکا ہے اور اگر ایک آدھ بھنے میں سہواً اس سے کوئی اچھا کام سرزد ہو بھی جاتا ہے تو اس کا کیا شمار۔ اور اگر اسی رفتار سے اس میں انسانی جذبہ پیدا ہوتا رہا تو پھر انسان کی جو صحیح تصویر ہے اس روپ میں تو اسے آنے میں کئی صدیاں لگ جائیں گی۔ ؎

طلوع آدمیت ہے بہت آہستہ آہستہ
ابھی انسان کو کرنا ہے صدیوں انتظار اپنا

آج کے آدمی پر سردار جعفری نے اس شعر میں زبردست طنز کیا ہے کہ وہ اپنے اندر انسانیت، اخلاق مروت اور اخوت کا جذبہ تیزی سے پیدا کرے کیونکہ وہ ہر معاملے میں تو کافی تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے مگر اس میدان میں بُری طرح پیچھے ہو گیا ہے اور اس پسماندگی کے لیے اس کی لاپرواہی، بے توجہی اور بے حسی کو موردِ الزام ٹھہرایا جاسکتا ہے۔ دیگر معاملات کے مقابلے میں اس امر میں رفتار کا تناسب صحیح نہ ہونے کی وجہ سے وہ اکثر شدید ردعمل کا شکار بھی ہوتا رہا ہے لہٰذا وہ اپنے سبھی معاملات میں اپنی رفتار کے تناسب کا جائزہ لے تاکہ وہ اپنی زندگی میں ہونے والے مہلک ردعمل سے بچ سکے۔

ہیں وہی باتیں اور محاسن دیکھنا چاہتا ہے جو اُسے پسند ہوں۔ آدمی کی بڑائی کا معیار بالترتیب حسنِ خلق، پاک سیرت، انکسار، خندہ پیشانی، پابندی صوم وصلوٰۃ، وقار، متانت اور شگفتہ بیانی ہیں۔ امیر مینائی کے حال میں لکھتے ہیں:

"منشی صاحب مرحوم نہایت بااخلاق اور پاک سیرت آدمی تھے۔ تکبر اور عُجب نام کو بھی نہ تھا ہر ایک سے خندہ پیشانی سے پیش آتے۔ صوم وصلوٰۃ کے بھی پابند تھے۔ وقار اور متانت کو کبھی ہاتھ جانے نہیں دیا اور علاوہ اس کے شگفتہ بیان تھے۔"

شخصیت کے سانچے میں خاکہ نگار کا خوبیوں اور کمزوریوں کا معیار بڑی اہمیت رکھتا ہے اِس سے اُس کے مافی الضمیر کا سمجھنا اور اس کی ذہنیت وسیرت کا انگیز کرنا اور اُس کے جذبات و خیالات کا سمجھنا اور ذہنی کوائف کا جاننا آسان ہو جاتا ہے مولوی صاحب نے "انسان دوستی" کے بعد محنت اور مقصد کو جس قدر سراہا ہے اور وقار، متانت اور خندہ پیشانی و شگفتہ بیانی پر جو زور دیا ہے وہ محض اتفاق نہیں بلکہ اُس کی تہہ میں مولوی صاحب کی ذہنیت اور سیرت کا پرتو ہے وہ انسان اور انسانیت کے ثناخواں ہیں۔ وہ ناموں سے مرعوب نہیں ہوتے کاموں کو سراہتے ہیں۔ شخصیت سے زیادہ اُس کے تصوّرِ حیات سے دلچسپی لیتے ہیں۔ "نامدیو مالی" کے ذکر میں لکھتے ہیں۔

وہ گرمی ہو یا جاڑا، دھوپ ہو یا سایہ، دن رات برابر کام کرتا رہا۔ لیکن اُسے کبھی یہ خیال نہ آیا کہ میں بہت کام کرتا ہوں یا میرا کام دوسروں سے بہتر ہے، اِسی لئے اُسے کبھی اپنے کام پر فخر یا غرور نہ تھا۔ وہ یہ باتیں جانتا ہی نہ تھا۔ اُسے کسی سے بیر نہ تھا نہ جلاپا۔ وہ سب کو اچھا سمجھتا اور سب سے محبت کرتا وہ غریبوں کی مدد کرتا، وقت پر کام کرتا۔ آدمیوں، جانوروں، پودوں کی خدمت کرتا، لیکن اُسے کبھی یہ احساس نہ ہوا کہ وہ کوئی نیک کام کر رہا

ہے جہاں اُس نے یہ کہنا شروع کیا۔ نیکی نیکی نہیں رہتی۔"

جب کبھی مجھے نام دیو کا خیال آتا ہے تو میں سوچتا ہوں کہ نیکی کیا ہے اور بڑا آدمی کسے کہتے ہیں؟ ہر شخص میں قدرت نے کوئی نہ کوئی صلاحیت رکھی ہے اُس صلاحیت کو درجۂ کمال کو پہنچانے میں ساری نیکی اور بڑائی ہے درجۂ کمال تک نہ کوئی پہنچا ہے نہ پہنچ سکتا ہے، لیکن وہاں تک پہنچنے کی کوشش ہی میں انسان انسان بنتا ہے یہ کھو کندن ہو جاتا ہے۔ حساب کے دن جب اعمال کی جانچ پڑتال ہوگی، خدا یہ نہیں پوچھے گا کہ تو نے کتنی اور کس کی پوجا پاٹ کی یا عبادت کی۔ وہ کسی کی عبادت کا محتاج نہیں۔ وہ پوچھے گا۔ تو یہ پوچھے گا کہ میں نے جو استعداد تجھ میں ودیعت کی تھی، اُسے کمال تک پہنچانے اور اُس سے کام لینے میں تو نے کیا کیا اور خلق اللہ کو اُس سے کیا فیض پہنچایا۔ اگر نیکی اور بڑائی کا یہ معیار ہے تو نام دیو نیک بھی تھا اور بڑا بھی۔"

مندرجہ بالا اقتباس میں مولوی صاحب کی سیرت جلوہ بار ہے۔ چنانچہ سخاوت و ایثار میں مولوی عبدالحق ممتاز درجے پر فائز ہیں۔ اپنی ذاتی آمدنی کا بیشتر حصہ اپنے اور پرایوں کی امداد اور غریب طلباء کے وظائف میں صرف ہوتا۔ طلباء کی امداد اور تعلیم کا خیال بہ نظر مولوی صاحب کے لیے والدین کی خدمت، اطاعت گزاری اور محبت اس سے بھی بڑھی ہوئی تھی۔ بھائیوں اور عزیز و اقارب کے ساتھ ہمیشہ محبت اور خلوص سے پیش آتے۔ مولوی عبدالحق کے ایک بھائی بھوپال میں تھے، مولوی عبدالحق کا گزر جب بھی بھوپال کے راستے ہوتا، بھائی سے جاکر ملنا ان کے فرائضِ منصبی میں داخل تھا بھائیوں کی اولاد سے بھی وہ بطورِ خاص شفقت سے پیش آتے۔

حسنِ خلق مولوی صاحب کے لیے ثانوی مزاج کی حیثیت رکھتا تھا۔ ایک مرتبہ کی ملاقات میں لوگ اُن کے گرویدہ ہو جاتے تھے۔ چھوٹے بڑے، ہر ایک سے شفقت [illegible] سے ملتے تھے۔ ان کی بزم بزمِ بے تکلف ہوتی۔ اختلافات اور بحث و تکرار کے موقع پر بھی وہ اعتدال کا دامن ہاتھ سے

(باقی سلسلہ صفحہ پر)

سید احتشام حسین ٹانڈوی
محلہ میراں پور۔ ٹانڈہ۔ فیض آباد

علی سردار جعفری

ہوائے صبح مشرق جاگ اٹھی ہے
چمن میں آتش گل تیز تر ہے
نگار ایشیا ہے گل بداماں
کہ عید شعلہ و جشن شرر ہے

(سردار جعفری)

اُردو کے وہ شعراء جنھوں نے ایشیائی قوموں کو بیدار کرنے میں اپنے جوش و خروش اور انہماک کا مظاہرہ کیا ان میں شاعر مشرق علامہ اقبال کے بعد اگر چند نام لئے جا سکتے ہیں تو وہ نام ہیں صرف فیض احمد فیض اور سردار جعفری کے۔ اقبال نے اپنی بیشتر نظموں میں جہاں ملت اسلامیہ کے ذہن کو جھنجھوڑا ہے وہیں دیگر ایشیائی قوموں کو بھی خواب غفلت سے بیدار کرنے کا کام انجام دیا ہے ؎

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روٹی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

فیض نے زنداں کی چہار دیواری میں رہ کر بھی اس آواز پر لبیک کہا اور ان کی آواز دیواروں سے چھن کر ایشیائی قوموں تک پہنچ ہی گئی۔

عرصۂ دہر کی جھلسی ہوئی ویرانی میں
ہم کو رہنا ہے مگر یوں تو نہیں رہنا ہے
اجنبی ہاتھوں کا بے نام گراں بار ستم
آج سہنا ہے ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے

سردار جعفری نے اقبال کا جانشین بن کر ایشیائی قوموں کی رہنمائی کی ذمہ داری اپنے سر لی اور یورپ کی زمین اور وہاں کے رہنے والوں کو انتہائی تفہیمی اور نیم طنزیہ انداز میں مخاطب کیا ہے

ایشیا والے سے یورپ کی زمیں کھینچ کے نہ مل
میری سوغات بھی دل ہے تری سوغات بھی دل
جس نے لوٹا ہے ہمیں جس نے ستم ڈھایا ہے
ارضِ مغرب نہیں مغرب کا وہ سرمایا ہے

اور سرمایہ ہندی ہے نہ برطانی ہے
یہ مرے اور ترے خون کی ارزانی ہے

سردار جعفری نے ایشیا والوں کو مغرب کی اس سرمایہ دارانہ ذہنیت سے ہمیشہ دور رہ کر اپنی عظیم قابلِ قدر اور صالح روایات کا امین بننے کی تلقین کی ہے اخوت، محبت، انسانیت اور باہمی اتحاد و اتفاق کو اپنا مسلک بنانے کا مشورہ دیا ہے انسانی اور اخلاقی قدروں کو سرمایہ پر فوقیت دینے کا سبق پڑھایا ہے انھوں نے ایشیا والوں کو مغرب کے باشندوں سے نفرت کرنے یا ان کی پرچھائیں سے بچنے کا مشورہ نہیں دیا ہے بلکہ انھیں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ مشرق اور مغرب کی زمین میں کوئی فرق نہیں ہے کیونکہ وہ بھی آدم کی ہی اولاد ہیں وہ بھی ہماری طرح سوچتے ہیں اور وہ بھی احساس رکھتے ہیں ان کے یہاں بھی جذبات کا طوفان ہے وہاں بھی سرد و گرم ہوائیں چلتی ہیں۔ آسمان وہاں بھی نیلا ہی دکھائی پڑتا ہے

سردار جعفری نے مفاد پرست اور طاقت کے نشے میں بدمست سیاستدانوں اور حکمرانوں کو بھی متنبہ کیا ہے کہ طاقت کے نشے میں چور ہو کر جنگ مت کرو اور بھولے بھالے عوام پر ظلم کرنے سے باز آؤ۔ تمہیں اس بات پر یقیناً غرور ہوگا کہ تم نے کئی ملکوں کو تاراج کر کے وہاں کے بھولے بھالے عوام کو اپنے پیروں تلے روند ڈالا ہے۔ مگر تمہیں معلوم نہیں کہ ظلم کی میعاد کے دن تھوڑے ہوتے ہیں۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ تم ؎

اس پہ پھولے ہو کہ ہر چل کو کچل ڈالا ہے
اس پہ پھولے ہو کہ ہر گل کو مسل ڈالا ہے
اور ہر گوشۂ گلزار میں سناٹا ہے

مگر افسوس تم کو آنے والے کل کی نہ کوئی فکر ہی ہے اور نہ کوئی خبر کیونکہ اگر تمھاری محول سے کہیں بھی کوئی آہ دبی رہ گئی ہوگی تو وہ آگے چل کر طوفان ہوگی اور یقیناً بھیانک احتجاج اور انتقام کا روپ لے کر رہے گی۔

وہ جواں ہو کے اگر شعلۂ جوالا بنی
وہ جواں ہو کے اگر آتش صد سالہ بنی
خود ہی سوچو کہ ستم گاروں پہ کیا گزرے گی

شاعر نے مفاد پرست سیاستدانوں اور مطلق العنان حکمرانوں کے ساتھ ہی سرمایہ کے نشے میں چور ہو کر غریب اور مجبور انسانوں پر ظلم کرنے والے زر پرستوں کو بھی انتباہ دیا ہے کہ ظلم کرنے والا چاہے عالمی حیثیت کا ہو یا ملکی، چاہے صوبائی سطح کا ہو یا ضلعی، چاہے قصبہ کا ہو یا گاؤں اور محلہ کا۔ ظلم بہر حال ظلم ہے وہ ایک روز مٹ کر ہی رہتا ہے کیونکہ یہ کسی فطری عمل کا نام نہیں ہے اس لئے انھوں نے ہر حیثیت اور ہر سطح کے ظالموں کو ظلم کا راستہ ہمیشہ کے لئے چھوڑنے کا مشورہ دیا ہے۔

علامہ اقبال کی طرح سردار جعفری نے بھی زندگی کے ہزار جہت پہلوؤں کو دکھلانے کی کوشش کی ہے۔ بقول ساحر لدھیانوی؛ ؎

"زندگی شوق بھی ہے احساس بھی ہے زندہ بھی ہے"

سردار جعفری نے بھی اسے ہزار رنگ میں دیکھا ہے۔ دن کے ہنگاموں میں، شب کے سکوت میں، جنگ کے میدان میں، حجلۂ عروس میں ایسے سجائے شہروں میں، اجڑی ہوئی بستیوں میں، زہر عشق میں، فریب کے جام میں، ... میں اور بت خانے میں۔ تاج وزر میں، مزدور کی ٹھوکریں، اشک اور گہر میں بھی، سنگ اور شرر میں، مگر ہر ماحول اور ہر شئے میں اسے بے چین اور بے قرار ہی پایا ہے اور یہی اس کے رواں دواں ... ہونے کی ضامن بھی ہے اور اگر یہ بے قراری ختم ہو گئی تو زندگی میں پھر وہ کشش نہیں رہ جائے گی جس ... وہ آج قابل دید و قابل ذکر بنی ہوئی ہے۔

کس نے کہا کہ حاصل وہم و گماں ہے زندگی
کس نے کہا کہ دہر کا سرِ نہاں ہے زندگی
جتنی نہاں ہے زندگی اتنی عیاں ہے زندگی
کتنی حسین کتنی شوخ کتنی جواں ہے زندگی

بھوک کا خارزار ہے پیاس کا ریگ زار ہے
عمرِ رواں کی پشت پر عمرِ رواں کا بار ہے
کل بھی وہ بے قرار تھی آج بھی بے قرار ہے
قلب بشر میں درد کی جوئے رواں ہے زندگی

کسی زمانے میں علامہ اقبال نے خدا سے مخاطب ہو کر کہا تھا۔

"شب آفریدی چراغ آفریدم سفال آفریدی ایاغ آفریدم"

یعنی تو نے رات بنائی میں نے چراغ بنایا، تو نے مٹی بنائی میں نے پیالہ بنایا، تو نے جنگل بنائے میں نے کاٹ کر خوبصورت شہر بنایا، تو نے صحرا بنایا میں نے سڑک بنائی۔ سچ پوچھئے تو بڑا کریڑ ... بہر حال سردار جعفری بقول خود ان کے اقبال کے کافی گرویدہ رہے ہیں لہٰذا ان کے نظریات کا کچھ عکس تو ان ... میں بھی پڑنا لازمی ہے۔ سردار جعفری نے بھی تقریباً یہی بات نہایت ہی خوبصورت انداز میں ادا

ا
ہا
سر
سے
کی
ان
کا

تخلیق پہ فطرت کی گزرتا ہے گماں اور
اس آدم خاکی نے بنایا ہے جہاں اور

سردار جعفری نے اپنی شہرہ آفاق مثنوی "نئی دنیا کو سلام" لکھ کر مطلق العنان حکمرانوں اور شہنشاہوں کے سر سے تاج اتار لیا ہے اور پوری دنیا میں غلامی کی زندگی بسر کرنے والوں کو اپنے حقوق کے لیے برسرپیکار ہونے کا مشورہ دیا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ حکمرانوں اور شہنشاہوں کو عام انسان کی طرح وہاں لاکر کھڑا کر دیا ہے جہاں معمولی کسان کو صبح سے شام تک کڑی دھوپ میں سخت محنت کرنے کے باوجود اپنے پسینے کا صحیح معاوضہ نہیں مل پاتا ہے جہاں مزدور سڑک کی تعمیر کے لیے مٹی اور پانی میں شرابور ہونے کے بعد بھی اپنی بھوک مٹانے کا معقول انتظام نہیں کر پا رہا ہے جہاں کپڑا دھونے والا مزدور دل کو ہلا دینے والی سردی کے باوجود پانی میں کھڑا کپڑے دھو رہا ہے۔ جہاں مل میں کام کرنے والا اپنی نیند کو سرمایہ دار کے ہاتھوں بیچنے میں مشغول ہے شہنشاہوں، حکمرانوں اور سرمایہ داروں کو جہاں ان کی حرکات مذمومہ کے لیے انھیں حد سے زیادہ ذلیل کیا ہے، وہیں ایسے ماحول میں خاموشی سے ظلم سہنے والے انسان کو متحد ہو کر آخری اور فیصلہ کن جنگ کرنے کیلئے اکسایا بھی ہے تاکہ دنیا کا کوئی ملوکیت پسند حکمراں پھر اپنے سر پر خودی کا تاج نہ رکھ سکے یہ مثنوی شہنشاہیت اور ملوکیت کے خلاف زبردست احتجاج ہے۔ مثنوی تو ہندوستان کے پس منظر میں لکھی گئی ہے مگر اس کی آواز اور اس کا پیغام ہمہ گیر ہے سردار جعفری حق تلفی اور استحصال کے ہمیشہ مخالف رہے ہیں ان کو یہ معلوم ہے کہ مزدور اور محکوم کو جب تک پوری طاقت سے جھنجھوڑا نہ جائے گا تب تک وہ خواب غفلت سے بیدار نہیں ہو سکتا۔ انھیں یہ بھی معلوم ہے کہ اس کے صرف آنکھ کھولنے اور کروٹ بدلنے پر ظالم اور جابر حکمراں اس کے منھ میں فریب یقین کا ایسا میٹھا پیالہ لگا دیتے ہیں کہ وہ پھر سو جاتا ہے انہا انھوں نے یہ کوشش کی ہے کہ اسے صرف اٹھا کر بٹھا ہی نہ جائے بلکہ اسے سرمایہ دار کے دوبدو کھڑا کرکے بزور آزمائی کے لیے اکسایا جائے تاکہ وہ اپنے ناکردہ گناہوں یعنی حق تلفی اور استحصال کی روایتی سزا سے بچ سکے۔ اس مثنوی کے آغاز ہی سے حق تلفی، ناانصافی اور استحصال کے خلاف احتجاج کی جھنکار سنائی پڑنے لگتی ہے۔

سیاہ رنگ پھریرے ہوا میں اُڑتے ہیں
کھڑی ہوئی ہے سیہ رات سر اٹھائے ہوئے
سیاہ گھوڑوں کی ٹاپوں سے ہل رہی ہے زمیں
سیہ عقاب سیہ آسماں پہ چھائے ہوئے
سیاہ فیکٹری کی سیاہ چمنی پہ
سیہ دھوئیں کے سیہ ابر تھرتھرائے ہوئے

شاعر نے آغاز ہی سے غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے انسانوں کو ان کی محکومانہ زندگی کا احساس دلانا شروع کر دیا ہے تاکہ وہ خوابِ غفلت کی چادر جو انھوں نے خود اپنے ہی ہاتھوں سے اوڑھ رکھی ہے اسے اپنے ہی ہاتھوں سے نوچ کر پھینک دیں۔ مزدور اور محکوم کو یہ خبر نہیں ہے کہ جبر و استحصال کے سبب سارا منظر سیاہ ہو چکا ہے۔ ہر طرف استحصال کی آندھیاں چل رہی ہیں اور حق تلفی کا بازار گرم ہے۔ مطلق العنان حکمراں سیاہ گھوڑوں کی ٹاپوں سے زمین کو ہلا کر یعنی اپنی مسلح افواج کے ذریعہ اپنے جاہ و جلال کا مظاہرہ کر رہے تاکہ کوئی شخص اس ماحول اور منظر کی مخالفت کرنے کے لیے آگے بڑھے تو اس کا جسم پاش پاش کر دیا جا سیاہ فیکٹری کی سیاہ چمنی سے نکلنے والا دھواں یہ بتلا رہا ہے کہ فیکٹری میں کام کرنے والے کسی محنت کش کو جائز مزدوری مانگنے کا کوئی حق نہیں ہے اسے مل مالک کی مرضی کے مطابق ہی تھرتھراتے ہوئے ہاتھ گھٹنے ٹیک کر انتہائی محکومانہ انداز میں ہی کچھ مانگنا ہے۔ اگر مانگتے وقت اس کا ہاتھ نہ کانپا تو اسے بھی مل مالک کے غیظ و غضب کا شکار ہونا ہے وہ اپنی کسی خواہش کا اظہار کرنے سے قاصر ہے پیٹ کی نے اسے گونگا بنا دیا ہے ۔

نشاں سیاہ لبوں پر سیاہ بوسوں کے
سیہ نشاط کی بدمستیاں چرائے ہوئے
سیہ دوپٹوں کے آنچل سیہ جبینوں پر
سیہ لباس سیہ جسم کو چھپائے ہوئے

سیاہ دودھ ہے ماں کے سیاہ سینے میں

سیاہ بچوں کو آغوش میں سلائے ہوئے

سیاہ جبر سیہ عصمتیں سیہ چیخیں

سیاہ عدل سیہ کلغیاں لگائے ہوئے

طاقتور، جابر اور خود سر عیش پرستوں نے سرمایہ اور اقتدار کے نشہ میں کسی غریب کی بیٹی کے ساتھ جو سلوک کیا ہے اس کے نتیجہ میں اس کے لب سیاہ ہو گئے ہیں کیونکہ بوسہ دینے والوں کے لب ان کے دل اور ان کے ضمیر سیاہ تھے اور چونکہ اس فعل میں مظلوم کی مرضی نہیں شامل تھی اس لیے شاعر نے ان کی اس حرکت مذمومہ کو سیاہ تلفظ کی بدمستیوں سے تعبیر کیا ہے چونکہ جابر اور طاقتور انسانوں نے طاقت کے زعم میں ان کی عصمت پہ حملہ کر کے ان کے آنچل کی پاکیزگی کو ختم کر دیا ہے اس لیے اب نہ وہ مہ جبیں رہ گئی ہیں اور نہ ان کے دوپٹے سرخ رہ گئے ہیں اب ان کے دوپٹے بھی سیاہ ہو چکے ہیں ان کی جبیں اور ان کا لباس بھی۔ رہی بات سیاہ جسم کی تو وہ سب سے پہلے ہی سیاہ ہو چکا ہے۔ اب جب ان کا جسم سیاہ ہو چکا ہے تو اس میں سے نکلنے والی ہر شئے کے کسی نہ کسی جزو اعظم پر اس سیاہی کا اثر پڑنا لازمی ہے لہٰذا پیدا ہونے والا بچہ بھی اس سے مفر حاصل نہیں کر سکتا۔ جبکہ اس بچہ کو یہ معلوم نہیں ہے کہ وہ کس ماحول اور کن حالات کی دین ہے مگر اس کی ماں سب کچھ جانتے ہوئے بھی زبان نہیں کھول سکتی اور اپنی شفقت مادری کے سبب اپنے سیاہ جسم سے نکلنے والا سیاہ دودھ پلانے کے لیے مجبور ہے اور اپنی آغوش میں اس کی پرورش کرنے کی بھی پابند ہو چکی ہے۔ جبر و استحصال کرنے والے سیاہ ہاتھ دوشیزاؤں کی عصمت دری کے بعد ان کے گلے کو اس طرح دبائے ہوئے ہیں کہ ان کی چیخیں نہ فضاء میں گونج سکیں اور نہ سماج میں ان کا کوئی ردعمل ہو سکے۔

رہی بات عدل گاہوں کی جہاں کا ہر کارندہ دولت کی سیڑھی پر پھسلتا ہی رہا ہے۔ منصف کی لال ٹوپی بھی عدالت کی تاریکی میں سرمایہ کی کلغیوں یعنی چاندی کے جوتوں پر اتار کر رکھی جاتی رہی ہے۔ ان حالات اور کوائف کو بھی پیش نظر رکھ کر ... کے سامنے رکھ کر آخر میں اس راز کا بھی انکشاف

کیا ہے کہ .... کھیل ہو رہا ہے۔ تم کو ان حالات تک لانے کے لیے کون سے اشخاص اور کون سی

1- شیاء ذمہ دار ہیں وہ کون سے عوامل ہیں جنھوں نے تمھیں اس طرح کی زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا ہے۔

کیا وجہ ہے کہ ہر چمکدار شئے کو سیاہی نے اپنے گھیرے میں لے لیا ہے۔ یہ اندھیرا کیا ہے اور پھر بتایا ہے

کہ ان سب کے لیے تمھارا محکومانہ ذہن اور غلامانہ روش ذمہ دار ہے اور جو اپنی لاپرواہی اور بے حسی کی

وجہ سے اُجالے کا سامنا کرنے سے قاصر ہو چکی ہے کیونکہ اُجالے کا سامنا کرنے کے لیے عزم صمیم،

قوتِ ارادی اور خود اعتمادی کی ضرورت ہے۔

سردار جعفری نے اپنی اس مثنوی میں جا بجا محکوم مزدور اور مظلوم کو اپنے حق کی لڑائی لڑنے کے لیے

آمادہ کیا ہے کہ کتنا ہی بزدل رہے اور بے حس آدمی کیوں نہ ہو، ایک بار ضرور مرمٹنے کے لیے

تیار ہو جائے گا۔ اب اگر آگے کے اشعار بھی درج کیے جائیں تو بھی مزدور کے ذہن کو جھنجھوڑنے کے لیے ان کا

یہی ایک شعر بہت کافی ہے ؎

منہ سیہ عہدِ غلامی کی یہ تیرگی ہے یہ رات

جو پھر رہی ہے اُجالے سے منہ چھپائے ہوئے

آخر میں شعر و سخن کے سلسلے میں بھی شاعر کا نقطۂ نظر واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کیونکہ پورے

مضمون میں تغزل یا اس کے عاشقانہ جذبات سے متعلق کسی بھی شعر کا حوالہ نہیں دیا گیا ہے اس کا مطلب

یہ نہیں ہے کہ شاعر نے حسن و عشق اور عاشقانہ جذبات سے متعلق شعر ہی نہیں کہے ہیں۔

ہاں اتنا ضرور ہے کہ وہ عوامی مسائل مثلاً بے روزگاری، ناانصافی، حق تلفی، بھکمری اور استحصال

کو اپنے عاشقانہ جذبات پر ترجیح دیتا ہے اس کا کہنا ہے کہ محبوب کے لب و رخسار سے کھیلنا کوئی بڑی بات

نہیں ہے۔ تقریباً سبھی شعراء نے اس کھیل کو کم و بیش اپنی شاعری میں جگہ دی ہے مگر شاعر کی یہ بھی ذمہ داری

ہے کہ وہ اپنے عاشقانہ جذبات کے ساتھ ہی سماج میں ہونے والی زیادتی، غلط رسم و رواج اور مذہب کی آڑ

میں انسان کے استحصال کے لیے بنائے گئے منصوبوں پر بھی قلم اُٹھائے۔ اس کا کہنا ہے کہ شعر و سخن کا لطف

تب ہے جب اپنے اور غیر سبھی اس کے قتل پر آمادہ ہوں مگر وہ حق بات کہنے میں ایک قدم بھی پیچھے نہ ہٹے

مصلحت اس کو اس کی دردمند گوئی کے لئے اس کے خوش آئند مستقبل کا خواب دکھلائے مگر وہ وقت کی کسی مصلحت سے کوئی سمجھوتہ کئے بغیر لب پہ حرف انکار سجا کر بیٹھا ہو۔ اس کے ضمیر کے ساتھ ہی اس کا ایک ایک لفظ بھی بیدار ہو اور شاعر کے ساتھ اس کے الفاظ بھی دار پر چڑھنے کو تیار ہوں ؎

اپنے اور غیر ہوں سب کہتے ہیں آمادۂ قتل
اور نہ ہو کوئی طرفدار تو ہے لطفِ سخن
مصلحت وقت کی اقرار سکھائے لیکن
دل میں ہو جرأت انکار تو ہے لطفِ سخن

شاعری کے تعارف کے بعد شاعر کی شخصیت کے تعارف کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتا کیونکہ سردار جعفری کی شخصیت آزادی سے قبل ہی ہندوستان کے جغرافیائی حدود کو پار کر کے بین الاقوامی شہرت کی حامل بن چکی ہے۔ دنیا میں جہاں کہیں بھی ادب شناس حضرات موجود ہیں وہاں سردار جعفری کا نام بڑے احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ انھوں نے ایشیا کے رتبے کو بلند کیا ہے۔

شام اودھ کی آغوش میں پرورش پانے والے اس شہید کے اس بیدار شاعر نے نہ جانے کیوں اس جہانگیری کو اپنا مسکن بنا لیا ہے جس کے لئے [illegible] نے کبھی کہا تھا ؎

مختلف جس کے دنیا میں رہ دیکھی ہے بمبئی

بہرحال بمبئی میں کوئی کشش ایسی ضرور ہے جس نے ہندوستان کے تمام اہلِ قلم کے دل کو لُبھا لیا ہے اور اس میں شک نہیں کہ بمبئی نے کتنوں کے بکھرے ہوئے گیسو سنوار دیئے ہیں سردار جعفری کو بھی اس نے سوچنے پر مجبور کر دیا ہے ؎

نہ جانے کیا کشش ہے بمبئی تیرے شبستاں میں
کہ ہم شام اودھ صبح بنارس چھوڑ آئے ہیں

امۃ المبین جبیں

سرِ شام جونہی آنکھ میری لگی

ڈاکٹر اور حکیم کہتے ہیں کہ

"جلد سونا صحت کی نشانی ہے"

اور عقلِ سلیم کہتی ہے کہ

"جلد سونا حماقت کی نشانی ہے"

ممکن ہے دنیا میں ناممکن کوئی کام نہ ہو۔ لیکن جلد سونا یقیناً ناممکن ہے۔ یا اگر ممکن ہے تو پھر ناممکن قسم کا ممکن ہے

ہم تو یہاں ایسی "آپ بیتی" بیان کرتے ہیں کہ جس پر "جگ بیتی" کا گمان ہو۔

گذشتہ اتوار کو ہمارے ایک پیارے دوست مسٹر ایکس وائی زیڈ کی بیگم لندن جانے والی تھیں۔ لندن سے ہمارے دوست مسٹر ایکس وائی زیڈ نے بڑی تاکید کا خط ہمیں لکھا تھا کہ "میری بیگم پہلی بار لندن آ رہی ہیں اس لئے تمہاری ڈیوٹی لگاتا ہوں کہ تم اپنی بھابی کو خود ہوائی جہاز میں سوار کرا دینا تم کو واللہ سے سخت تاکید ہے"

ہمیں یہ خط پڑھ کر بڑا غصہ آیا۔ غصہ اس لئے نہیں آیا کہ ہمارا دوست بھی عجب اُلّو ہے جو لندن میں رہ کر گھر سے بیوی منگواتا ہے بلکہ غصہ اس لئے آیا کہ ہوائی جہاز علی الصبح پانچ بجے جاتا تھا۔

مسٹر ایکس وائی زیڈ کے اس حکم کا مطلب تو یہ ہوا کہ دو بجے رات سے اٹھو، نہا دھو کر تین بجے تک خود تیار ہو اور ساڑھے تین بجے تک بیگم ایکس وائی زیڈ کی کوٹھی پر پہنچو اور انہیں لے کر چار سوا چار بجے تک ہوائی اڈے سے پہنچو، کیونکہ ہوائی جہاز کی روانگی سے ایک گھنٹہ پہلے ہوائی اڈے پر پاسپورٹ اور کسٹم چیکنگ کے لئے موجود ہونا ضروری ہوتا ہے لیکن مسٹر ایکس وائی زیڈ ہمارے جگری دوست ہیں اور پردیس سے انھوں نے ایک خدمت ہمیں سونپی تھی اور اس کے علاوہ ... ایکس وائی زیڈ کی بیگم کی ہم ایسی ہی عزت کرتے ہیں جیسی کہ بھابی نہیں وہ میری ماں ہے

اس لئے ہم نے تہیہ کر لیا کہ چاہے ادھر کی دنیا اُدھر ہو جائے ہم "بڑی بی" کو ہوائی جہاز میں بٹھائے بغیر باز نہیں آئیں گے" (یعنی واپس نہیں آئیں گے)

ہفتے کی رات سر شام ہم گھر لوٹے کہ جلدی سو جائیں تاکہ جلدی جلدی جاگ اٹھیں۔ بچے حیران کہ برسہا برس کے بعد باپ رات کا کھانا ہمارے ساتھ کھا رہا ہے بیوی پریشان کہ "خدانخواستہ تمھاری طبیعت تو ٹھیک ہے جو جلدی سونا چاہتے ہو۔ کہو تو ڈاکٹر کو بلالوں" گویا جلدی سونا صحت کی نشانی نہیں بیماری کی نشانی ہے؟

خیر، بہرحال بیوی کو وجہ بتائی۔ بیوی نے اطمینان کی سانس لی اور ہم نے اپنے اوپر رضائی لی۔ اس وقت آٹھ بج رہے تھے۔

بچپن کے بعد پہلی بار آٹھ بجے بستر پر لیٹے تھے اس لئے عجیب عجیب معلوم ہوا۔ نیند کے بجائے شرم آرہی تھی کہ ابھی ریڈیو سے بچوں کو سلانے والی کہانی بھی نشر نہیں ہوئی کہ بچوں سے پہلے بستر پر لیٹ گئے۔ نیند لانے کے لئے ناچار بھیڑیں گننی شروع کر دیں: ایک دو تین......

کچھ غنودگی سی طاری ہوئی تھی کہ بھیڑیے پھاڑنے لگیں ہڑبڑا کر جاگے تو پتہ چلا کہ ہماری دو بچیاں آپس میں لڑ پڑی تھیں۔ یعنی بڑی آپا اور چھوٹی آپا میں "آپا دھاپی" ہو گئی تھی اور دونوں کی دونوں دھاڑیں دھاڑیں رو رہی تھیں۔ بڑی مشکل سے بیگم نے انہیں چپ کرایا پھر سناٹا سا ہو گیا اور پھر آنکھ لگنے لگی کہ اچانک "پھٹ پھٹ پھٹ پھٹ" شروع ہوئی پتہ چلا کہ پڑوسی موٹر رکشہ میں گھر آیا ہے ... موٹر رکشہ والا بھی چیخ رہا ہے اور موٹر رکشہ بھی شور مچا کر مالک کا ساتھ دے رہا ہے۔

خدا کا شکر کہ معاملہ جلدی طے ہو گیا۔ موٹر رکشہ چلا گیا اور ہم نے آنکھوں پر پھر پلکیں ڈھانپ لیں۔

اب نو بجا چاہتے تھے۔ اچانک عورتوں کی لڑائی کا شور مچ گیا

"ہڑدنگی، کلموہی، نکمی، چڑیل، چھنال!

شتفتن، حرام خور، پھپھل پائی، دیدہ پھٹ"

بیوی کی آواز آئی۔

"ارے کوئی ریڈیو بند کرو جلدی۔"

دل سے آہ نکلی — ریڈیو پھوڑ ڈرامہ ہو رہا تھا۔

ریڈیو بند ہوا تو آنکھیں بھی بند ہو گئیں۔ ابھی نئی غنودگی طاری ہوئی تھی۔

کہ دروازے پر بڑی زور زور کی دھڑ دھڑ ہوئی اور ساتھ ہی آواز آئی۔

"میاں کیا سو گئے؟" ابھی سے سو گئے۔

بھئی کیسے علیگ ہو" "ہو! علی گڑھ میں کہیں ڈے اسکالر تو نہیں تھے"

ہمارے علیگ دوست نصیح الدین علوی تھے۔ جی چاہا کہ پوچھوں کیوں بھئی —

علی گڑھ میں چمگادڑ اور الو پڑھا کرتے تھے!

بہ ہمارے بچے نے ہماری طرح جھوٹ بول کر ہماری نیند بچائی کہ

"ابا سو رہے ہیں اس لئے امی نے کہا ہے کہ ابا ابھی گھر نہیں آئے"

ساڑھے دس بج چکے تھے رات کا سناٹا پھیل رہا تھا کہ پڑوس کے شادی کے گھر میں فلمی ریکارڈ گراموفون پر بجنے شروع ہوئے۔

ہم تو آنکھیں بند کرنا چاہتے تھے اور کوئی نسیم بیگم یا اقبال بانو گراموفون کے بھونپو سے ہمیں ڈانٹ رہی تھی۔

نخریا ملا۔ نخریا ملا۔ نخریا ملا

رسیلے مورے نیناں نخریا ملا

گراموفون ریکارڈ بند ہوئے تو عورتیں ڈھولک لے بیٹھیں اور نہایت بھونڈی آواز میں الاپنے لگیں۔

گوری گھونگھٹ میں مکھڑا چھپا ناز

یہ تو نیناں لڑانے کی رات ہے

"انا للہ و انا الیہ راجعون۔ بی بیبو نے۔ یہ نیناں لڑانے کی رات نہیں بلکہ یہ تو نیناں موند کر سو جانے کی رات ہے کیونکہ "بیڑی بی" علی الصبح لندن جا رہی ہیں"۔

غالباً بی بیبو نے دل کی آواز سن لی۔ وہ چپ ہو گئیں۔ ابھی خدا کا شکر پوری طرح ادا کر پائے کہ قوال شروع ہو گئے۔

موڑے آقا دی کملی ہے کالے رنگ دی

موڑے آقا دی کملی ہے۔ ہے واہ

آں آں آں۔ ہاں ہاں ہاں۔ آں آں

موڑے آقا دی کملی ہے کالے رنگ دی

مجبوراً کانوں پر رضائی خوب اچھی طرح ڈھانپ کر سونے کی کوشش کی اور سو بھی گئے لیکن تھوڑی ہی دیر میں ٹیلیفون بجنے لگا۔

ٹوں ـــــ اونگ ـــــ ٹوں ـــــ ٹھنک

ریسیور اٹھایا تو آواز آئی

"ہیلو - ابرام بھائی ہے ؟"

ہم نے پوچھا ـــــ کون ابرام بھائی ؟

آواز آئی ـــــ "ارے اپنا ابرام بھائی بانڑوے والا"

ہم نے غصّے سے پوچھا "آپ کون بول رہے ہیں ؟"

آواز آئی۔ "ہم گھفار بھائی (غفار بھائی) بولتا پڑا ہوں

ہم نے غصے سے جواب دیا ـــ "ادھر کوئی ابرام سیٹھ نہیں رہتا ہے۔ رانگ نمبر"

جواب آیا۔ "اوہ سوری ـــ رونگ نمبر ـــ ماپھ کرنا۔

گھفار بھائی (غفار بھائی) کو ماپھ کر کے گھڑی پر جو نگاہ ڈالی تو دو بج رہے تھے۔ اب کیا سونا ـــــ سو ناممکن ـــــ جلدی جلدی منہ دھو کر بیگم ایکس وائی زیڈ کی کوٹھی پہنچے اور سے

بجائی کی تو بالیں پہ ہوا شور ہمارا
خدام ادب سے بولے ابھی آنکھ لگی ہے

بے چاری وہ بھی ہماری طرح سونے کی کوشش کرتے کرتے ابھی سوئی تھیں۔ انھیں جگایا بھاگم بھاگ ہوائی اڈے پہنچے تو یہ اعلان سُنا۔

"موسم کی خرابی کے باعث ہوائی جہاز آج لندن نہیں جائے گا!

ا حالت تمہی بیڑہ غرق !

۲ کار میں ہوائی اڈے گئے تھے

۳ بے کار میں ہوائی اڈے گئے تھے

ناچار پھر گھر لوٹے تو سویرا ہو چکا تھا۔

رات تو ہم جلدی نہ سو سکے تھے

البتہ علی الصبح سویرے ہی سے سو گئے

چٹکلے — ایک طرح سے یہ بھی ایک تہمت ہے کہ ہم جلدی نہیں سوتے اور ہم میں بڑی بیداری ہے۔

لیکن جلدی نہ سونے کے باوجود قوم کا یہ حال ہے تو اگر ہم جلدی سونے لگ جائیں ! ؟

تو پھر یارو — باقی رہے نام اللہ کا !

—★★★—

(بقیہ سلسلہ صفحہ ۴۲ سے آگے)

گذرتے تھے۔ مستقل ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد جامعہ عثمانیہ میں مولوی صاحب کو اردو کی پروفیسری پر ماہانہ ایک ہزار روپے تنخواہ پر مامور کیا گیا۔ حکومت کے ساتھ شرط تھی کہ جب تک چاہیں گے ملازمت میں رہیں گے اور جب تک وہ خود علاحدگی نہ چاہیں، اس عہدے پر مامور رہیں گے۔ ہاتھ پاؤں میں قوت بھی تھی۔ مگر مولوی صاحب نے جب دیکھا کہ اس سے وہ ترقی ادب" کا کام خاطر خواہ طریقے سے نہیں کر سکتے، وہ ملازمت سے مستعفی ہو گئے اور دلی جا کر قیام کیا۔ "چند ہم عصر" میں عبدالحق کی اپنی شخصیت متعدد بار ابھر کر سامنے آئی ہے۔ اِن خاکوں میں عبدالحق نے جن سیرتوں پر روشنی ڈالی ہے، اس سے بڑی حد تک خود اُن کے سوچنے سمجھنے کے انداز پر روشنی پڑتی ہے اور اُن کی وہ اخلاقی قدریں سامنے آتی ہیں جنھیں وہ پسند کرتے تھے۔

(باقی آئندہ شمارے میں)

شینیش ڈی ریاس

گھرسے دور ایک گھر ۔ سکر باغ

دو سالہ بینا اس وقت تقریباً مر گئی تھی جب اس کی اپنی ماں نے اس پر زبردست حملہ کر دیا تھا۔ ... بہت خون بہا اور اس کے چہرے اور جسم کے بیشتر حصے کی جلد کو بے حد نقصان پہونچا جس ... خوفناک شکل ابھر آئی۔ بینا کو فوراً آپریشن کے لئے لے جایا گیا جہاں اس کی پلاسٹک سرجری کی گئی ... بعد ہی اس کی حالت بہتر ہو گئی اور وہ ایک مرتبہ پھر اپنی اصل حالت میں آ گئی۔ وہ پوری طرح صحت یاب ہوئی اور اس نے اعتماد کے ساتھ گھومنا پھرنا شروع کر دیا۔

لہٰذا یہ چھوٹی سی مادہ چیتا "بینا" ہمارے ملک کا وہ پہلا جانور ہے جس کی پلاسٹک سرجری ... یہ سرجری آپریشن جوناگڑھ سے کچھ کلومیٹر دور واقع سکر باغ چڑیا گھر میں کیا گیا۔ یہ مشہور چڑیا ... سرپرستی فخر کے ساتھ اپنی 125 ویں سالگرہ منا رہا ہے۔ سکر باغ چڑیا گھر میسور، مدراس اور ... کے بعد ملک کا تیسرا سب سے قدیم چڑیا گھر تصور کیا جاتا ہے یہ چڑیا گھر گرنار پہاڑ کے پچھلے ... غ ہے۔ یہ پہاڑ اس علاقے کے ہمالیہ کے طور پر مشہور ہے۔ تاریخی شہر جوناگڑھ کے حاکم ... خاں بابی صاحب نے ۱۸۶۳ء میں اس چڑیا گھر کی شروعات کی تھی۔ جانوروں کے زبردست ... ہونے کے ناطے نواب کو گرنار کے جنگلات میں حیوانات کے لئے ایک رہائش گاہ تعمیر کرانے کی زبردست خواہش تھی۔ انھوں نے ذاتی طور پر بہت سے جانور بھی جمع کئے ہوئے تھے۔ چڑیا گھر کی تعمیر کا کام ۱۸۶۳ء میں شروع کیا گیا تھا۔ ابتدا میں شیروں کی رہائش کے لیے تین چار پنجرے بنائے گئے تھے لیکن بعد میں [illegible] چیتے، پینتھر، ہرن، اکثر بھگوں اور پرندوں کا اضافہ کیا گیا۔

حصولِ آزادی کے بعد سے چڑیا گھر اس وقت کے بمبئی ریاست کے محکمۂ تعلیم کے حوالے کر دیا گیا اور ۱۹۵۶ء میں اس چڑیا گھر کو چلانے کی ذمہ داری محکمۂ جنگلات کو سونپ دی گئی تھی۔

سکر باغ نے گر (GIR) جنگل میں جانوروں کے تحفظ اور اس سے متعلق مینجمنٹ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ چڑیا گھر کی طرف سے آس پاس کے گاؤں میں رہنے والے افراد اور حساس علاقے کے قبائلیوں کو جانوروں سے متعلق تعلیم دی جا رہی ہے۔ یہ تعلیم جنگل کے قریب اور شہروں کے مضافات میں قدرتی کیمپوں کا اہتمام کر کے اور کلب قائم کر کے دی جا رہی ہے۔ سکر باغ ایک خوبصورت سانپوں کے پارک، ہرنوں کے ایک بڑے احاطے، ہرنوں کے ایک میدان اور ایک حیوانی ہسپتال پر مشتمل ہے جس میں اندرونی اور باہر کے مریض جانوروں کے لئے وارڈ ہیں نیز اس میں ساز و سامان سے لیس ڈسپنسری اور پوسٹ مارٹم روم بھی ہیں۔

اس چڑیا گھر میں محض جنگلی جانوروں کو رہنے کے لئے جگہ ہی فراہم نہیں کی جاتی بلکہ اس کی نسل کو بڑھانے کی ذمہ داری بھی لی جاتی ہے۔ اس چڑیا گھر کے قیام سے ہی اس کی اہم سرگرمی شیروں کی نسل کو بڑھانا رہی ہے۔ اس وقت سکر باغ میں 45 شیر و شیرنیاں ہیں جن میں 17 نر اور 28 مادہ ہیں۔ یہ شیر ملک کے مختلف چڑیا گھروں میں تقسیم کئے جاتے ہیں اور بہترین نسل کے شیر غیر ممالک کو برآمد کئے جاتے ہیں ۱۹۵۶ء سے کل ۱۰۱ شیر بھارت کے مختلف حصوں میں بھیجے جا چکے ہیں اور کافی یوروپی ممالک کو برآمد کئے جا چکے ہیں سکر باغ خالص ایشیائی نسل کے شیر کی زیادہ سے زیادہ عمر کے ریکارڈ کا بھی حامل ہے کیونکہ شیرنی روہنی نے ۲۵ برس اور ۸ ماہ کی ریکارڈ عمر پائی۔

شیر، تیندوا، چیتے، سامبھر، چنکارا، چار سینگ والا ہرن، نیل گائے، لکڑ بھگا جیسے دیگر جانوروں اور متعدد دوسرے جانوروں کی کامیاب نسلیں تیار کی گئی ہیں۔ سکر باغ کو جنگلی گھوڑوں کی نسل تیار کرنے کا ریکارڈ بھی حاصل ہے جو کہ اپنے آپ میں نمایاں ہے۔

ایک اہم پراجکٹ کے تحت سکر باغ کو خالص ایشیائی نسل کے شیروں کی نسل کی افزائش [illegible] اتاتی پارک کی حیثیت سے خاص طور سے شامل کیا گیا ہے اور اس طرح غیر ممالک

کی مانگ کو بھی پورا کیا جا رہا ہے۔

ماضی میں گجرات کے سوراشٹرا اور کچھ علاقوں کو اکثر خشک سالی کا سامنا کرنا پڑا ہے جس سے خشک ہو جانے والی جھیلوں میں رہنے والے مگرمچھوں کی زندگی کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا سکر باغ کا انتظامیہ ان رینگنے والے جانوروں کی مدد کے لئے سامنے آیا اور چڑیا گھر کے چڑیا گھر کے محفوظ ماحول میں انھیں رہنے کے لئے جگہ فراہم کی گئی۔

سکر باغ حیاتیاتی تجربوں اور دیگر مطالعوں کے لئے بھی صف اول کے تحقیقاتی ادارے کی حیثیت سے خدمت انجام دیتا ہے۔ ۱۹۸۵ء میں امریکہ کے محققین نے چڑیا گھر کے ۳۰ ببر شیروں کا خون، منی اور جلد کے نمونے مختلف مقاصد کے لئے جمع کئے۔ گذشتہ دنوں غیر ممالک سے کچھ محققین نے چڑیا گھر کا دورہ کیا۔ اور ایشیائی نسل کے شیروں کے خون کے نمونوں کی جانچ کی۔ ان میں ایڈز کے جراثیم نہیں پائے گئے۔ یہ معلوم ہوا تھا کہ افریقی نسل کے کچھ شیروں میں ایڈز کے مثبت جراثیم پائے جاتے ہیں۔

سکر باغ ایک نہایت خوبصورت جگہ ہے جہاں ہرے بھرے درخت ہیں اور مقدس گرنار پہاڑ کا خوبصورت منظر ہے نیز وہاں پرندوں کے چہچہانے کی آوازیں اور جانوروں کے شہنشاہ کے دھاڑنے کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ یہاں گھومنے آنے والا کوئی بھی چوکنا شخص جس کی سماعت کی طاقت اچھی ہو، راستے میں قریب سے آنے والی سانپوں کی سی سی کی آوازیں سن سکتا ہے۔

بھارت اور غیر ممالک کے ساتھ لاکھ سے زائد سیاح ہر برس اس مشہور چڑیا گھر کو دیکھنے آتے ہیں۔ سیر و تفریح کے مقام کے علاوہ یہ چڑیا گھر عالموں اور بالخصوص ماہرین ماحولیات کے لئے نعمت ثابت ہوا ہے۔ ۱۹۸۵ء میں ماحولیاتی تعلیمی مرکز وجود میں آیا جس کا مقصد اسکول کے بچوں میں اپنے مادر وطن کے بارے میں بیداری پیدا کرنا ہے۔ آج سکر باغ اپنی زندگی کے اہم دور یعنی اپنے وجود کے ۱۲۵ سالہ شاندار دور میں داخل ہو گیا ہے۔

شاداب

حیدرآباد

Rs 6/-

(جلد (۷ | شمارہ (۹) | ستمبر ۱۹۹۰ء حیدرآباد

...یٹر	جائنٹ ایڈیٹر	مینجنگ ایڈیٹر
...یرالدین صابری	رشید الدین	کلیم الدین احسن

مجلسِ مشاورت

...علقہ بیگم رباب * یوسف ناظم * ڈاکٹر محمد یوسف الدین * پروفیسر رضی الدین احمد

...نظور احمد منظور * محترمہ سعیدہ مہر * ڈاکٹر منشاء الرحمن خاں منشاء * پروفیسر میر تراب علی

* نسیم احمد صدیقی

...رِ تعاون :

...ندوستان	خلیجی ممالک	امریکہ	انگلستان	پاکستان
65 روپے	200 روپے	40 ڈالر	25 پونڈ	175 پاکستانی روپے
120 "	360 "	70 "	45 "	300 "
1500	3700 "	700 "	400 "	3000 "

:-(ترسیلِ زر کا پتہ):-

ماہنامہ "شاداب" 147-5-11 ریڈ ہلز. حیدرآباد

...پرنٹر پبلشر [illegible] مظفر اللہ صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان سے چھپوا کر

دفتر شاداب [illegible] 11-5-147 ریڈ ہلز حیدرآباد سے شائع کیا.

فہرست

اسلامی تصوف (قسط دوم)	سید احمد عروج قادری	۳
دینی تعلیم	ریاض الدین احمد	۹
مولوی عبدالحق (قسط دوم)	ڈاکٹر عبدالستار دلوی	۱۴
قرۃ العین حیدر، ہندستانی.....	کے۔ کے۔ کھلر	۲۱
رؤف خیر سے انٹرویو	اطہر عیسیٰ	۲۸
بہار میں اردو	پروفیسر عبدالمغنی	۳۷
تراشِ خراش (طنز و مزاح)	یوسف ناظم	۴۴
بی ۔ ایم ۔ برلا سائنس میوزیم	ڈاکٹر مجید بیدار	۴۸
فرقہ واریت کا مقابلہ وقت کی....	شہناز حسین	۵۱
ہندستانی مردم شماری؛ دنیا کی عظیم....	محبوب ذکریا	۵۷
The Hand..... (نظم)	محترمہ بلقیس علاء الدین	۶۱
مستقل	خط ڈاکٹر رشید الرحمٰن خان حسرت (ن قرآنی روشنی)	۶۳

اکثر تخلیقات صاف اور خوش خط نہ ہونے کے باعث اشاعت سے محروم رہ جاتی ہیں
قلمکار حضرات اس بات کو ذہن نشین رکھیں اور تخلیقات صاف اور خوشخط روانہ کریں۔

سید احمد عروج قادری

قسط دوم

اسلامی تصوف

…وف کیا ہے اور صوفی …ن لوگ ہیں

صوفیہ کے اقوال پیش کرنے سے پہلے یہ یاد دہانی مناسب معلوم ہوتی ہے کہ اگرچہ "تصوف" اور "صوفی" کی اصطلاحیں بہت مشہور ہیں لیکن صوفیاء اپنی کتابوں میں لکھتے آ رہے ہیں کہ یہ دونوں لفظ قرآن و حدیث میں نہیں آئے ہیں، اس لیے "تصوف" کا لفظ مطلوب ہے اور نہ "صوفی" کا لقب مقصود ہے۔ شیخ شہاب الدین سہروردیؒ (۶۳۲ھ) عوارف المعارف میں لکھتے ہیں:

"مشرق سے مغرب تک اسلامی ممالک کے دونوں کناروں میں اہلِ قرب کے لیے صوفی کا نام معروف و مشہور نہیں ہے۔ یہ نام انہیں لوگوں کے لیے معروف ہے جو خاص قسم کا لباس استعمال کرتے ہیں۔ بلادِ مغرب، بلادِ ترکستان اور ماوراء النہر میں بہت سے اللہ کے مقرب بندے ہیں لیکن وہ "صوفیہ" سے موسوم نہیں ہیں کیونکہ وہ صوفیاء کا لباس استعمال نہیں کرتے اور الفاظ و اصطلاحات میں کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ صوفیاء سے ہماری مراد "مقربین" ہی ہیں۔"

اس سے معلوم ہوا کہ چھٹی، ساتویں صدی ہجری تک "صوفیاء" کے نام سے وہی لوگ جانے جاتے تھے جو خاص قسم کا لباس پہنتے تھے لیکن بعد کو لباس کی قید اٹھ گئی اور یہ نام اس طبقے کے لئے مشہور ہو گیا جس میں پیری مریدی کا سلسلہ جاری ہو اور وہ بزرگوں کے بارے میں غالیانہ عقیدت رکھتا ہو۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء میں لکھا ہے:

علوم احسان و یقین کہ الیوم باسم تصوف مشہور شدہ ..... حقیقت تصوف کہ بعرف شرع تام آں احسان استیلہ	علوم احسان و یقین کہ آج کل تصوف کے نام سے مشہور ہو گئے ہیں ... تصوف کی حقیقت جس کا نام عرف شرع میں "احسان" ہے۔

اس سے بھی معلوم ہوا کہ "تصوف" کوئی شرعی نام نہیں ہے بلکہ اس کا شرعی نام احسان ہے بعض علمائے صوفیاء نے تصوف کو طریق تحقیق کہا ہے اور تصنیف کرتے ہیں "تزکیۂ نفس" کی اصطلاح تو اتنی ہی مشہور ہے جتنی خود تصوف کی اصطلاح ہے۔ بہر حال علوم احسان و یقین کہیے یا طریقِ تقویٰ یا تزکیۂ نفس یہ سب اس تصوف کی تعبیریں ہیں جنھیں کی بنیاد کتاب و سنت پر قائم ہے اور جسے ہم اسلامی تصوف کہتے ہیں۔

تصوف کو "احسان" کہنے کی وجہ وہ حدیث ہے جس میں حضرت جبریل نے صحابۂ کرامؓ کے مجمع میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دین کے بارے میں چند سوالات کیے تھے اور آپؐ نے جوابات دیئے تھے۔ احسان کے بارے میں سوال و جواب کے الفاظ یہ ہیں،

قال فاخبرنی عن الاحسان قال ان تعبد الله کانك تراه فان لم تکن تراه فانه یراك ۲	مجھے احسان کے بارے میں بتلائیے حضورؐ نے فرمایا احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو جیسے تم اسے دیکھ رہے ہو۔ اور اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے ہو تو یقیناً وہ تمھیں دیکھ رہا ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ حدیث تصوف کی بہت بڑی اصل ہے اور تصوف کی تمام مستند کتابوں میں اس سے استدلال کیا گیا ہے تصوف اب ایک مستقل علم کا نام ہے اس لیے اس کی تعریف یہ کی گئی ہے،

---

۱ ازالۃ الخفاء مقصد دوم ص ۴۲

۲ ریاض الصالحین بحوالہ مسلم شریف

التصوف علم تعرف بہ احوال تزکیۃ النفوس و تصفیۃ الاخلاق و تعمیر الظاہر و الباطن لنیل السعادۃ الابدیۃ[1]

تصوف ایک علم ہے جس سے نفوس کی پاکی، اخلاق کی صفائی اور ظاہر و باطن کی آبادی و آراستگی کے احوال معلوم ہوتے ہیں اور اس کا مقصد ابدی سعادت کا حصول ہے۔

اس عبارت میں علم تصوف کی فنی تعریف بھی کی گئی ہے اور اس کی غرض و غایت بھی بتائی گئی ہے ائمۂ صوفیاء اپنی کتابوں میں یہ بھی لکھتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ العلماء ورثۃ الانبیاء (علماء انبیاء کے وارث ہیں) اور حضورؐ نے فرمایا ہے من عمل بما علم ورثہ اللہ علم مالم یعلم (آدمی جو کچھ جانتا ہے جب اس پر عمل کرتا ہے تو اللہ اسے ایسی باتوں کا علم عطا کرتا ہے جنھیں وہ نہیں جانتا تھا) صوفیاء کہتے ہیں کہ علم الوراثۃ دین میں فہم و بصیرت کا نام ہے اور اسی کو قرآن میں حکمت سے تعبیر کیا گیا ہے:

یُؤتِی الحِکْمَۃَ مَنْ یَّشَاءُ وَمَنْ یُّؤتَ الحِکْمَۃَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا وَمَا یَذَّکَّرُ اِلَّا اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝ (البقرہ ۳۷)

وہ جس کو چاہتا ہے حکمت بخشتا ہے اور جسے حکمت ملی اسے خیر کثیر کا خزانہ ملا مگر یاددہانی وہی حاصل کرتے ہیں جو عقل والے ہیں۔

اب میں تصوف اور صوفی کے بارے میں ائمہ تصوف کے چند اقوال نقل کرتا ہوں۔

"میں نے محمد بن احمد بن یحییٰ صوفی کو کہتے ہوئے سنا، وہ کہتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بن تمیمی کو کہتے ہوئے سنا کہ ابو محمد جریری سے تصوف کے بارے میں سوال کیا گیا تو انھوں نے کہا کہ تصوف ہر بلند اخلاق میں داخل ہونے اور ہر پست اخلاق سے خارج ہونے کا نام ہے۔ بلند اخلاق جیسے ورع، زہد، توکل، رضا اور

---

[1] شیخ الاسلام ذکریا انصاری، شرح الرسالۃ القشیریہ ج ۱ ص ۹۹

تفویض وغیرہ اور پست اخلاق جیسے ریا، عجب، کبر، حسد اور بدگمانی وغیرہ سے

امام قشیری نے اپنی کتاب کے "باب التصوف" میں خود اپنی سند سے سب سے پہلے یہ قول نقل کیا ہے، اس قول کا حاصل یہ ہے کہ ہر بلند اخلاق سے آراستگی اور ہر پست اخلاق سے پاکی و صفائی ہی حقیقی تصوف ہے

عمرو بن عثمان مکی سے تصوف کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے کہا:

"تصوف یہ ہے کہ بندہ ہر وقت اسی کام میں مشغول ہو جو اللہ کے نزدیک اس وقت کے لیے بہترین اور مناسب ترین ہو۔"

شارحین نے اس جملے کی تشریح میں لکھا ہے کہ صوفی کی شان یہ ہے کہ وہ مختلف اوقات میں اعمال، اخلاق، احوال اور ہر عمل خیر میں سے اسی کو اختیار کرتا ہے جو اس وقت کے لحاظ سے افضل ترین و اکمل ترین سمجھے ہو اور جس کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ اللہ کی رضا حاصل کی جا سکتی ہو اس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہوا کہ ہر وقت اس کے عمل کی بنیاد کتاب و سنت کے احکام پر ہوتی ہو کیونکہ ان ہی کے ذریعہ معلوم ہو سکتا ہے کہ مختلف اوقات میں کون کسی چیز میں سب سے زیادہ مناسب ہے۔ افسوس کہ اس زمانے کے اکثر صوفیا ر نے تصوف کی اس حقیقت کو بالکل پس پشت ڈال دیا ہے

حضرت معروف کرخی نے فرمایا ہے کہ:

"تصوف یہ ہے کہ آدمی حقائق کو اختیار کرے اور مخلوق کے پاس جو کچھ ہے اس سے مایوس ہو جائے۔"

اس کی تشریح میں شیخ الاسلام زکریا انصاری لکھتے ہیں:

جسے اللہ کی معرفت حاصل ہو اور وہ یہ جان لے کہ اللہ کے سوا کوئی نافع، ضار اور معطی نہیں ہے، نفع و ضرر اور عطا و بخشش صرف اس کے دست قدرت میں ہے

لہ الرسالۃ القشیریہ مع شرح ج ۲ ص ۱۲۶

ایسا شخص یقیناً انہی اعمال کو اختیار کرے گا جو اللہ سے قریب کرنے والے ہیں اس کی نظر ان چیزوں پر نہ ہوگی جو مخلوق کے قبضہ و تصرف میں ہیں۔ اس کا اعتماد صرف اللہ پر ہوگا اور کسی پر نہیں۔ حکایت بیان کی جاتی ہے کہ ایک بادشاہ کے وزیر کو اللہ نے توفیق بخشی اور وہ بادشاہ کے دربار سے کنارہ کش ہوگیا، بادشاہ نے اُسے پکڑ بلوایا اور خفگی کے انداز میں کہا۔ کیا تو مجھ سے بھاگتا ہے؟ وزیر نے کہا' ہاں میں اس لیے بھاگتا ہوں کہ میں نے تم سے بہتر بادشاہ کو پالیا۔ بادشاہ کو غصہ چڑھا اور اس نے پوچھا مجھ سے بہتر بادشاہ کون ہے؟ وزیر نے جواب دیا وہ بادشاہ تم سے بہتر ہے جو مجھے کھلاتا ہے مگر اسے خود کھانے کی ضرورت نہیں اور تمہارا حال یہ ہے کہ جب تک تمہیں کھلا نہ دیں تم مجھے کھلا نہیں سکتے' تم سے بہتر وہ بادشاہ ہے جو مجھے سلاتا ہے لیکن خود نہیں سوتا جسے نیند نہیں آتی۔ اور تمہارا حال یہ ہے کہ جب تک تم سو نہ جاؤ میں سو نہیں سکتا۔ تم سے بہتر وہ بادشاہ ہے کہ میری خطائیں کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہوں وہ مجھے معاف فرما دیتا ہے لیکن تمہارا حال یہ ہے کہ معمولی قصور پر بھی مواخذہ کرتے ہو' تم سے بہتر وہ بادشاہ ہے کہ جب میں اس کی خدمت میں لگا تو سارا عالم وجود میری خدمت کرنے لگا اور تمہاری خدمت کا حال یہ تھا کہ مجھے مجبور تھا کہ تمہارے ہر مقرب کی خدمت کروں تاکہ وہ تمہارے پاس مجھے اذیت نہ پہنچائے۔ یہ سُن کر بادشاہ نے جواب دیا۔ تم نے سچ کہا' بے شک وہ مجھ سے بہتر ہے اس کی چوکھٹ سے چمٹ جاؤ اور اس کی اطاعت کو غنیمت سمجھو۔ [1]

شیخ الاسلام کی یہ تشریح اور یہ حکایت کتنی موثر اور دلنشین ہے۔

ایک بار حضرت جنیدؒ بغدادی نے فرمایا۔

---

[1] شرح عارسہ باب التصوف

"التصوف ذکر مع اجتماع و وجد مع استماع و عمل مع اتباع" — تصوف اجتماع کے ساتھ ذکر، استماع کے ساتھ وجد اور اتباع کے ساتھ عمل کا نام ہے

شارحین رسالہ کی شرح میں لکھتے ہیں کہ "اجتماع" سے مراد اجتماع ہمت ہے ذکر مع الاجتماع کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کا ذکر پوری توجہ سے حضور قلب اور حسن نیت کے ساتھ کیا جائے کیونکہ غفلت مذموم ہے اور عمل، حسن نیت ہی سے صحیح ہوتا ہے۔ "وجد" تصوف کی اصطلاح میں جذبۂ اشتیاق و محبت کی زیادتی کو کہتے ہیں اور استماع سے مراد کسی ایسی چیز کا سننا ہے جو اس جذبے میں تحریک پیدا کرتی ہے وجد مع استماع کا مطلب یہ ہوا کہ موثر مواعظ یا ایسی باتیں سن کر جن کی سند کتاب و سنت میں موجود ہو۔ جذبۂ شوق میں زیادتی اور تحریک پیدا کی جائے۔ "عمل مع اتباع" میں اتباع سے مراد اتباع سنت ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر عمل سنت کے مطابق ہو کیونکہ ہر وہ عمل، یا حال یا مقام جو اتباع سنت سے خالی ہو، بدعت ہے۔

حضرت جنیدؒ بغدادی کے صحبت یافتہ ابوبکر کتانی نے کہا ہے:

"تصوف اخلاق جمیلہ سے آراستگی کا نام ہے جو شخص تم سے اخلاق حسنہ میں بڑھا ہوا ہے وہ تم سے صفائے قلب اور تصوف میں بڑھا ہوا ہے" [1]

ذوالنون مصریؒ سے اہل تصوف کے بارے میں سوال کیا گیا تو انھوں نے جواب میں کہا۔

"یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اللہ عزوجل کو ہر دوسری شے پر ترجیح دی تو اس کے صلہ میں اللہ تعالیٰ نے انھیں ہر دوسری شے پر ترجیح عطا فرمائی۔"

یہ ہے اسلامی تصوف کی حقیقت جسے فلسفیانہ تصوف نے انتہائی پیچیدہ اور ناقابل قبول بنا دیا ہے۔

(تیسری قسط اکتوبر ۹۰ء کے شمارے میں ملاحظہ فرمائیے)

---

[1] شرح رسالہ باب التصوف

ریاض الدین احمد
سابق جنرل سکریٹری مرکزی تعلیمی کونسل اتر پردیش

جبل تعلیم، دوحہ قطر
ص ب ۳۵۵۰

دینی تعلیم

صدیاں گواہ ہیں کہ بزرگانِ اسلام نے ملت کے نونہالوں میں دینی تشخص برقرار رکھنے کے لئے سعیٔ مسلسل سے کبھی گریز نہیں کیا۔ اور ان محرومین کو قریہ بہ قریہ تنگی ترشی کی زندگی گذار رہے تھے رشتۂ قرآن سے منسلک رکھا۔ دینی مدارس اور مکاتب کا ایک سلسلۂ دراز جو شاہانِ مغلیہ کے دور سے آج تک الوٹ چلا آرہا ہے اس دعوی کا کھلا ثبوت ہے۔

مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس تعمیری محاذ کے وجود کا ہمیشہ انکار کیا گیا ہے اور اس کے تنقیصی پہلوؤں کو اچھالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تہذیب حاضرہ کے پرستاروں نے ان کا استہزا کیا۔ قالین نشینوں کی صفوں نے ان کو نظرِ احتساب سے نوازا۔ ترقیاتی علوم کے علم برداروں نے [illegible] لیبل لگایا۔

لیکن دیکھنے والی آنکھیں دیکھتی رہیں کہ انہیں خستہ حال تعلیمی اداروں نے جن کے سر پر کھلا آسمان اور پیر کے نیچے فرشِ غبار آلود تھا۔ ملت کے غریب غربا میں دین کا چراغ گل ہونے سے بچا لیا۔

اللہ کو بے دلیل ماننے والے انہیں نے پیدا کیے۔ عاشقانِ رسولؐ کی ٹولیاں ان ہی سے ابھریں۔ کتاب اللہ کی حفاظت کا بیڑا ان ہی نے اٹھایا گشتۂ دوراں زبان اردو میں سانس کی روانی ان ہی کے دم سے ہے۔

یہ فاقہ مست حفاظ جنھوں نے اپنا سب کچھ کھو کر قرآن عظیم کی بیش بہا دولت اپنے سینے ہی میں چھپا رکھی ہے کس کا کارنامہ ہیں؟ کونوں گوشوں میں پھیلی ہوئی لاکھوں مساجد میں اللہ اکبر کا نعرۂ دل گداز بلند کرنے والے یہ کہاں سے آتے ہیں؟ لبادۂ افلاس میں لپٹے ہوئے یہ پرستارانِ حق جو

اللہ کا سہروں کو کیا یاد کیے ہوئے ہیں کس پایہ درس گاہ کے سپوت ہیں؟ اس کا جواب خلیجی یونیورسٹیاں اور دولت نواز تعلیمی ادارے دے سکتے ہوں تو دیں۔ حق یہ ہے کہ گلی در گلی پھیلے ہوئے حفاظ کرام ملت کا قابل فخر سرمایہ اور آخرت کے تاجدار ہیں۔ بد نصیب ہے وہ قوم جو انھیں مرتبۂ عظمت سے گرانے کی سازش میں ملوث ہو۔

مگر یہ ماننا پڑے گا کہ آج "امت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے"۔ ہمارے ان بیش بہا قیمتی اداروں کو ترقیاتی دوڑ نے پیچھے چھوڑ دیا اور جو پاسبان قرآن تھے وہی اس کے نوحہ خواں بن گئے اس کا سبب یہ ہے کہ قرآن جو ہر دور انقلاب کے لئے ایک سربراہ انسان پیدا کر سکتا ہے۔ اس کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

مکاتب نے بھی قرآن پڑھایا۔ مدارس نے بھی قرآن پڑھایا۔ عالم قرآن پیدا ہوئے حافظ قرآن پیدا ہوئے مگر عامل قرآن نہیں پیدا ہو سکے کیونکہ تفکر فی القرآن کا کام غیروں نے لوٹ لیا اور اس پر اپنا ٹریڈ مارک چسپاں کر دیا دور زماں تجسس علمی کی طرف بیتابانہ دوڑ رہا ہے نت نئے تعلیمی نصاب اور درسیات بھی وضع کئے جا رہے ہیں مگر ایک مکمل اور متوازن انسان وجود میں لانے سے قاصر ہیں حالانکہ ایک ترقی پذیر انسان میں جو صلاحیتیں پیدا ہونا چاہئیے وہ کتاب اللہ میں کھول کھول کر بیان کر دی گئی ہیں مگر دیکھنے والی آنکھیں دیکھ نہیں رہی ہیں۔ سننے والے کان سن نہیں رہے ہیں عقل والی صلاحیتیں مردہ ہو گئی ہیں علم اپنا توازن کھو چکا ہے عمل گم کردہ راہ ہوتا جا رہا ہے آج آمادۂ زیاں قوم کو قرآن پکار رہا ہے اور ایک ایسے انقلابی نصاب تعلیم کی دعوت دے رہا ہے جو قرآنی تصور کا انسان پیدا کر سکے۔ قرآن کی مطلوبہ صلاحیتیں یہ ہیں۔

(۱) قومٌ یتفکرون (۱۳/۴۵) ۱۲۔ تفکر فی خلق السموٰت والارض پر بار بار توجہ دلائی گئی ہے۔

(۲) (قومٌ) یتدبرون القرآن ۵/ (۴)

۸۴۔ صحیفۂ الٰہی کے رموز پر تجسس کرنے والے

(۳) قوم یذکرون ۱۴/(۱۶)-۱۳۔

اللہ کی نشانیوں سے سبق لینے والے

(۴) قومٌ یؤمنون ۱۴/(۱۶) ۷۹- ۷/(۶) ۹۹-

اللہ پر ایمان لانے والے اور اُس کی قدرت کاملہ کے مشاہدہ سے ایمان میں جلا پیدا کرنے والے ہیں۔

(۵) قومٌ یسمعون ۱۴/(۱۶) ۶۵

اللہ کے رسولؐ کی باتوں کو غور سے سننے والے۔ نہ کہ ان میں سے جو کہتے ہیں ہم نے سن لیا مگر سنتے نہیں (۹/(۸) ۲۱)

(۶) قومٌ یعلمون ۱۹/(۲۷) ۵۲

جن کا علم حکمت قرآن کے تابع ہے

(۷) قومٌ یوقنون ۲۵/(۴۵) ۲۰

جن کا حاصل یقین کامل کا نتیجہ ہے

(۸) قومٌ یعقلون ۱۴/(۱۶) ۱۲

جو عقل سلیم کو آیات اللہ کی تلاش میں صرف کرتے ہیں اور منکرین حق کو منہ توڑ جواب دے سکتے ہیں۔

(۹) قومٌ یفقہون ۷/(۶) ۹۸

جو اپنی حقیقت کو پہچانتے ہیں اور اپنی پیدائش پر غور کرتے ہیں۔

(۱۰) قومٌ یتقون ۱۱/(۱۰) ۶

جو دن کی رات کے پھیر اور زمین آسمان کی ساخت میں اللہ کی نشانیاں تلاش کرتے ہیں۔

تو اب دیکھنا یہ ہے کہ ہماری نئی نسل جو مدارس یا مکاتب اسلامیہ سے نکل رہی ہے یا ہمارے تعلیمی اداروں سے فارغ ہو رہی ہے قرآنی علوم و حقائق سے کما حقہ ہو کر نکل رہی ہے؟

اگر جواب نفی میں ہے تو جہاں بھی خلا ہے اس کو پُر کرنا ضروری ہے اس لیے جب بھی کوئی انقلابی تعلیمی پالیسی وضع کرنے کا سوال پیدا ہوتا ہے تو یہ دیکھنا پڑے گا کہ ایسے مضامین داخل نصاب ہیں یا نہیں جو مقاصدِ قرآنی کو پورا کرنے کے اہل ہیں۔ اس راستے میں اگر عربی مدارس اور دینی مکاتب میں سائنس اور ترقیاتی مضامین کی تعلیم ضروری ہے تو ان کا داخل نصاب ہونا عین تقاضائے وقت ہے اور اسے پورا ہونا چاہئے اسی طرح اگر انگریزی طرز کی تعلیم گاہوں میں خلا علوم قرآنیہ کے فقدان کی وجہ سے ہے تو اس کو داخل درس کرنے کی فکر ملت کے فرائض اولین میں سمجھنا چاہئے اگر سرکاری نظامِ تعلیم اس کا متحمل نہیں ہوتا تو ملت کو خود آگے بڑھ کر اس کا بوجھ اٹھانا چاہئے اور اگر ایمان والی ماؤں کی گود سے ایسے لال وگوہر نہیں نکل رہے ہیں جو آئندہ زندگی میں قرآنی مقاصد کے علم بردار بن سکیں گے تو گھروں میں انقلاب پیدا کرنے کی جدوجہد دورِ حاضرہ کی اعلیٰ ترین عبادت میں شمار ہوگی۔

مگر یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اس وقت ملتِ اسلامی جس احساسِ کمتری کا شکار ہو گئی ہے اس کا سبب یہ ہے کہ ترقیاتی علوم اور بڑھتی ہوئی ٹکنالوجی نے اسے چکا چوند میں مبتلا کر دیا ہے اور وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ اس سیلِ رواں کے ساتھ قرآن کوئی موثر کردار ادا کر سکتا ہے اس کا کھلا ہوا جواب یہ ہے کہ جدید سائنسی اور تکنیکی کمالات نے اخلاقی حدود پار کر دیئے ہیں اور عوامی تخریب کاری کی راہ ہموار کر کے دنیا کو ایک فتنۂ عظیم میں مبتلا کر دیا ہے شاید یہ وہی فتنہ ہے جس کی پیش گوئی رسول برحق کی زبان مبارک سے سنی گئی تھی۔ اس وقت آپؐ نے ارشاد فرمایا تھا کہ جب یہ فتنہ برپا ہو جائے تو اس کا علاج اللہ کی کتاب ہے مزید یہ فرمایا کہ جس جابر نے کتاب کو ترک کر دیا اللہ اسے ہلاک کر دیں گے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سرِدست علومِ جدیدہ کو راہِ اعتدال پر لانے کے لئے قرآن کی ضرورت ہے کیوں کہ اس صحیفۂ ابدی کی لازوال صفت یہ ہے کہ وہ دورِ زماں کی ترقیات کا انکار نہیں کرتا مگر ان کو فتنے میں تبدیل ہو جانے سے روکتا ہے۔

(باقی آئندہ شمارے میں)

ڈاکٹر عبدالستار دلوی قسط دوم

مولوی عبدالحق

سید محمود کے حال میں لکھتے ہیں ۔

" باوجود اس لیاقت اور ثروت کے اپنی زندگی درویشانہ بسر کی۔ دولت اور حکومت جن سے ایک عالم میں ہیجان اور انقلاب برپا ہے اور جن کی آگ تقریباً ہر سینے میں مشتعل ہے، وہ اُن کی آنچ سے بالکل محفوظ تھے ورنہ چاہتے تو اِس قدر شہرت و دولت حاصل کر سکتے تھے جو دوسروں کی قدرت سے باہر ہے۔ لیکن انہوں نے حقارت سے اس پر نظر ڈالی اور مستانہ وار ٹھکرا کر چلے گئے "

بقول عابد صاحب کے مولوی صاحب کے مذاق کی خاص چیز جو محسن الملک میں تھی وہ یہ تھی : اُن میں پارس پتھر کی خاصیت تھی۔ کوئی ہو۔ کہیں کا ہو، اُن سے چھوا نہیں اور کندن ہوا نہیں اگر کسی نے سلام بھی کر لیا تو ان پر اس کا بار رہتا اور جب تک اس کا معاوضہ نہ کر لیتے، اُن کو چین نہ آتا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے دشمن کو بھی نہیں بھولتے تھے۔"

یہی وجہ تھی کہ نواب محسن الملک کی رخصت کے وقت حیدرآباد میں کہرام مچ گیا تھا اور ہزارہا آدمیوں کا ٹھٹھ اسٹیشن کے باہر اور اندر لگا ہوا تھا۔ سینکڑوں آدمی جن میں غریب، بیوائیں، یتیم سبھی تھے، زار و قطار رو رہے تھے۔

عبدالحق، حالی سے ادب ہی میں نہیں، بلکہ زندگی کے متعلقات میں بھی متاثر تھے۔ اُن کی زندگی حالی کی زندگی کا عکس ہے۔ حالی کی شرافت، نیک نفسی، ہمدردی اور شفقت سے مولوی صاحب

متأثر ہی نہیں بلکہ مرعوب تھے وہ تمام خصوصیتیں جو حالی میں تھیں عبدالحق کے حصے میں بھی آئیں۔ حالی سے متعلق لکھتے ہیں:

"مرحوم ہماری قدیم تہذیب کا بے مثل نمونہ تھے۔ شرافت اور نیک نفسی اُن پر ختم تھی۔ چہرے سے شرافت، ہمدردی اور شفقت ٹپکتی تھی اور دل کو اُن کی طرف کشش ہوتی تھی۔ اُن کے پاس بیٹھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ کوئی چیز سم بد اثر کر رہی ہے۔ درگذر کا یہ عالم تھا کہ کوئی اُن سے کیسی ہی بدمعاملگی اور بدسلوکی کیوں نہ کرے، کیا مجال کہ اُس کی بدسلوکی کی یا بدمعاملگی کا ذکر زبان پر آئے۔ ایسے لوگ جن سے ہر شخص حذر کرتا، جب اُن سے ملتے تو اُن کے حسنِ سلوک اور محبت کا کلمہ پڑھتے ہوئے جاتے تھے۔ وہ پہلے درجے کے نکتہ چیں جو دوسروں کی عیب گری کے بغیر مانتے ہی نہیں، اُن کے ڈنک یہاں آکر گر جاتے تھے۔"

حالی ہی کے سلسلے میں ایک واقعہ لکھتے ہیں:

"ایک صاحب جو علی گڑھ کے گریجویٹ اور حیدرآباد میں ایک معزز عہدے پر فائز تھے مولانا سے ملنے آئے۔ ٹم ٹم پر سوار تھے۔ زینے کے قریب اُترنا چاہتے تھے سائیس کی جو شامت آئی تو اُس نے گاڑی دو قدم آگے کھڑی کی۔ یہ حضرت ذرا سی چوک پر آپے سے باہر ہو گئے اور ہنٹر اسٹر کی ہنٹر اُس غریب کے رسید کر دیئے۔ مولانا یہ نظارہ اُوپر برآمدے میں کھڑے دیکھ رہے تھے۔ اِس کے بعد وہ کھٹ کھٹ سیڑھیاں پھرتے اوپر چڑھ آئے۔ مولانا سے ملے۔ مزاج پُرسی کی اور کچھ دیر باتیں کر کے رخصت ہو گئے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ مولانا کا چہرہ متغیر تھا وہ برآمدے میں ٹہلتے جاتے تھے اور کہتے تھے۔ "ہائے ظالم کیا کیا! اُس روز کھانا بھی اچھی طرح نہ کھا سکے، کھانے کے بعد قیلولے کی عادت تھی، وہ بھی نصیب نہ ہوا۔ فرماتے تھے! یہ معلوم ہوتا ہے وہ ہنٹر کسی نے میری پیٹھ پر مارے ہیں، اِس کیفیت سے جو درد و کرب مولانا تھا

وہ بدنصیب سائیس کو بھی نہ ہوا ہوگا۔"

عبارت کا انداز یہ ظاہر کرتا ہے کہ مولوی عبدالحق بھی اس درد و کرب میں حالی کے برابر کے شریک تھے۔

انکسار، خندہ پیشانی، مروّت، ہمدردی اور اخلاق جس کی تلاش مولوی عبدالحق نے دوسری شخصیتوں میں کی ہے، اس کا نادر نمونہ خود آپ کی ذات تھی محترمہ رابعہ دورانی شہر سے دور جنگل میں ہوتے ہوئے بھی مولوی صاحب سے ملنے والوں کا ایک ہجوم رہتا تھا۔ ملاقاتیوں میں امیرزادے اور غریب سبھی رہتے اور آپ سبھوں سے خندہ پیشانی سے ملتے۔ رئیسوں اور اکابرینِ شہر کی موجودگی میں اُن کی توجہ کسی غریب اور معمولی آدمی پر مرکوز ہوتی، جو وہاں بیٹھا ہوتا۔

مولوی صاحب معمولی اور غریب آدمیوں میں اپنے اخلاق سے احساسِ کمتری پیدا نہیں ہونے دیتے تھے۔ بامروّت ایسے تھے کہ اُن کے ملاقاتیوں میں سے اگر کوئی اناپ شناپ اور غیر متعلق باتیں بھی کرتا اور اُن کے کام میں ہرج بھی ہوتا تو وہ اِس کا اظہار نہیں کرتے تھے اور اُس کی باتوں کو کڑوے گھونٹ کی طرح پی جاتے۔ طبیعت میں انکسار اس قدر تھا کہ قصبہ بھینیٹ (ضلع ناندیڑ) کے مڈل اسکول کے معائنے کے لئے گئے۔ اس موقع پر وہ وہاں کے ہیڈ ماسٹر صاحب کے طریقۂ تعلیم سے اس قدر خوش ہوئے کہ کتاب الرائے (REMARKS BOOK) میں لکھا۔ "مجھے فخر ہوتا، اگر میں ان کی ماتحتی کرتا۔"

مولوی صاحب اپنے ماتحتوں سے نہایت شفقت کے ساتھ پیش آتے، اُن سے بے تکلف ہوتے اور اُن کے شکوہ و شکایت میں اُن سے ہمدردی سے پیش آتے اور اشتراک بھی کرتے۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ مہاراجہ کشن پرشاد اورنگ آباد آئے، اُن کی مولوی صاحب سے عقیدت انہیں محترمہ رابعہ دورانی لے آئی، جہاں پر گھنٹوں مولوی صاحب سے اُن کی گفتگو ہوتی رہی۔ بنگلے کے چاروں طرف پولیس کا گھیرا تھا، اس وقت کوئی شخص مولوی صاحب سے ملاقات نہیں کر سکتا تھا۔ اتفاقاً مدرسے کا چوکیدار مولوی صاحب سے ملنے کا خواہشمند ہوا اور ملنے کی غرض سے مولوی صاحب کے بنگلے کی طرف بڑھ رہا تھا کہ پولیس کے آدمیوں نے اُسے روک دیا۔ اُس وقت مولوی

صاحب مہاراجہ کشن پرشاد سے محوِ گفتگو تھے۔ اِس دوران اُن کی نظر کسی طرح اُس چوکیدار پر پڑی۔ مولوی صاحب کے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ درخواست پیش کرنا چاہتا ہے۔ مولوی صاحب نے درخواست لینے کے لئے کہا اور عدیم الفرصتی کی وجہ سے اُسے دوسرے روز ملنے کا وقت دیا۔ جب مہاراجہ کشن پرشاد چلے گئے تو درخواست پڑھی۔ جس میں لکھا تھا کہ "صدر مدرّس نے اُسے مارا ہے جس چپل سے اُسے مارا ہے وہ درخواست کے ساتھ منسلک ہے۔"

دوسری صبح چوکیدار مولوی صاحب سے ملنے آیا اور مولوی صاحب کی میز پر اُن کے سامنے بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ مولوی صاحب نے اُس سے پوچھا کہ وہ اس مدرسے میں رہنا چاہتا ہے یا صدر مدرّس کا تبادلہ کیا جائے؟ اِس پر چوکیدار نے کہا کہ وہ اِسی گاؤں کا رہنے والا ہے جس کی وجہ سے وہیں رہنا چاہتا ہے۔ مولوی صاحب نے مسکراتے ہوئے اُسے جانے کے لئے کہا اور بتایا کہ صدر مدرّس کا تبادلہ کیا جائے گا۔

اپنے ماتحتوں سے ہمدردی کے ساتھ اِس میں انسان کی دوستی کی اعلیٰ مثال ہے مولوی صاحب کے دربار میں محمود و ایاز ایک ہی صف میں کھڑے ہوتے ہیں۔ مولوی صاحب کی چائے کی میز پر کشن پرشاد اور چوکیدار میں کوئی امتیاز نہیں ہوتا۔ یہ اخلاقِ انسانی کی معراج ہے۔

مولوی صاحب کے نظریاتِ اخلاق میں بڑی وسعت ہے مندرجہ بالا واقعات اور بیانات مدِ نظر رکھتے ہوئے اُن کے اِس نظریۂ اخلاق کو دیکھئے اور قول و فعل میں مطابقت کی داد دیجئے۔

"اخلاق سے صرف یہ مراد نہیں ہے کہ آدمی دوسروں سے خندہ پیشانی سے پیش آئے، خاطر مدارات کرے، وقت پر کسی حاجت مند کی حاجت روا کرے۔ زبان و قلم سے ہمدردی کا اظہار کرے یا اکثر جیسا کہ اکثر تعریف کے طور پر کہا جاتا ہے مرنجانِ مرنج ہو، اخلاق کی حدود اس سے بہت آگے تک ہیں۔ عزم و استقلال، ضبط و تحمّل، جرأت (خصوصاً اخلاقی جرأت) کام کی لگن فرض شناسی، دیانت صداقت، رواداری، انصاف، ہمدردی، ایثار کا درجہ سب سے اعلیٰ ہے یعنی ذاتی

اعزاز ہے۔ قومی مفاد کو ترجیح دے۔ اپنے بھائیوں کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد دیکھے۔ انتہا یہ ہے کہ اپنے آپ کو بھول جائے۔ انسانیت اسی سے عبارت ہے۔

عبدالحق کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ "ان" خاکوں" میں "میں" کا استعمال بہت کم کرتے ہیں، اپنا اشتہار نہیں کرتے۔ بلکہ خود دوسروں تک پہنچنے کی خلوص دل سے کوشش کرتے ہیں وہ اپنی ذات کو اہمیت نہیں دیتے، بلکہ دوسروں کی ذات کو اہم سمجھتے ہیں۔ بات بات میں اپنا ذکر کرنا ادب کی دوسری اصناف میں ممکن ہو، پسند کیا جاتا ہو۔ خاکوں میں خصوصاً یہ بہت معیوب ہے شاید یہی وجہ ہے ضمیر متکلم کا صیغہ وہ کم سے کم استعمال کرتے ہیں۔ ادیبوں اور شاعروں کے حالات کی عدم موجودگی میں ان کی تصانیف سے مواد فراہم کرنا عام ہے، لیکن یہ اُس وقت ہوتا ہے جب ادیب اور شاعر کچھ اشتہاری قسم کا ہو۔ مولوی صاحب کے یہاں یہ اشتہاری انداز نہیں ملتا۔ برعکس اس کے کہ وہ اپنے آپ کو پیش کریں، کچھ سہمے دبے سے رہتے ہیں۔ اپنے آپ کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔

حیدرآباد ابتدا ہی سے اُردو کا اہم مرکز رہا ہے۔ سلاطین گولکنڈہ اور بیجاپور نے اُردو کی جو بھی خدمت کی، وہ آج کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ ان سلاطین کی اُردو نوازی کا سراغ لگانا بھی مولوی صاحب ہی کا کارنامہ ہے۔ ورنہ آج سے کچھ سال پہلے تک اُردو کا دکنی دورِ عالم خفا میں تھا۔ دورِ جدید میں حیدرآباد میں اُردو کو مادری زبان کی حیثیت سے عام کرنا اور اُسے اسکولوں اور کالجوں میں ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے رائج کرنے کا سہرا بھی مولوی صاحب کے سر ہے۔ زبان کی مقبولیت کا راز اُس کی عوام دوستی میں ہے لیکن اس کے ساتھ سلاطین اور نوابوں کی سرپرستی کی وجہ سے بھی زبانیں اُس علاقے کے عوام میں مقبول ہو جاتی ہیں۔ محکوم حاکموں کی زبان کو جاننا اور سیکھنا اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتے ہیں۔ اس لحاظ سے حیدرآباد میں اُردو کو مقبول بنانے کے سلسلے میں مولوی صاحب نے نفسیاتی طریقہ اختیار کیا۔ نواب عماد الملک ناظم تعلیمات تھے اور ولی عہد میر عثمان علی خاں کے اتالیق بھی۔ مولوی صاحب نے نواب صاحب نے اُردو خطوط نویسی پر رسالہ لکھنے کی ضرورت پر اپنے خیال کا اظہار کیا۔ مولوی صاحب نے فرمائش کو حکم جان کر سنہ ۱۹۰۱ء میں اس موضوع پر دو رسالے مرتب کیے، جس میں دوسرے رسالے میں بیٹے کے نام باپ کا ایک خط ہے۔

جانِ پدر!

چوں کہ اِس خط میں تمھاری تعلیم کا ذکر آ گیا ہے۔ میں اِس موقع پہ ایک ضروری بات کہنا چاہتا ہوں۔ اِس میں شک نہیں کہ تم قریب قریب سب مضامین میں اچھے ہو اور اُن میں دلچسپی بھی ہے، لیکن میں ایک بڑی کمی دیکھتا ہوں جس کا ظاہر کر دینا میرا فرض ہے وہ یہ ہے کہ تم اُردو یعنی اپنی مادری زبان کی طرف بہت کم توجہ کرتے ہو۔ اس سے زیادہ افسوس کی کوئی بات نہیں ہو سکتی کہ ہم دوسری زبان کے حاصل کرنے میں تو ہمہ تن مصروف ہیں، لیکن اپنی مادری زبان کی طرف بالکل توجہ نہ کریں۔ علاوہ مادری زبان کے ہمیں زیادہ کام اب تک اِسی زبان سے پڑتا ہے آپس کی خط و کتابت اور عدالت کی کارروائی اُردو ہی میں ہوتی ہے۔ اِس میں علمی ذخیرہ بھی روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ میرے خیال میں اِس کی طرف سے بے توجہی کرنا سراسر غلطی ہے اور اس میں نقص رہ جانے سے بعد میں بڑی بڑی دقتیں پیش آتی ہیں۔"

باپ کے اِس پیغام پر بیٹے کا سعادت مندانہ جواب بھی ملاحظہ ہو:

"آداب"

آپ کا عنایت نامہ پہنچا۔ آپ نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے، وہ بالکل صحیح ہے۔ حقیقت میں افسوس کی بات ہے کہ ہم اپنی زبان کی طرف بہت کم توجہ کرتے ہیں۔ ہمارے ایک اُستاد یہی کہا کرتے تھے! مگر ہے یہ کہ متعدد مضامین تیار کرنے کی وجہ سے بہت کم فرصت ملتی ہے کہ اِن چیزوں کی طرف بھی توجہ کی جائے، جو ہمارے امتحان میں نہیں ہیں۔ لیکن آج سے میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ فرصت کا تمام وقت اُردو کے سیکھنے میں صرف کروں۔"

اِس طریقے سے مولوی صاحب نے ولی عہد میر عثمان علی خاں میں جو آئندہ تاجدارِ حیدرآباد ہونے والے تھے اُردو کے لئے ذوق و شوق پیدا کیا۔ جس کی سرپرستی نے حیدرآباد میں اُردو کی بنیاد مستحکم کیں اور وہ صحیح معنوں میں اِس قابل ہوئی کہ قوم بہنوں سے آنکھیں ملا کر بات کر سکے۔

مرا ٹھواڑہ میں آج بھی اُردو کو علاقائی زبان کی حیثیت حاصل ہے اور وہاں کے طلباء بڑی لے ہی اُردو علاقائی زبان Regional Language کی حیثیت سے امتیازی مضمون کے طور پر پڑھتے ہیں۔ یہ مولوی صاحب ہی کا فیضان ہے۔

" تصویر جس قدر بڑی شاندار اور نفیس ہوتی ہے، اُسی قدر اُسے پیچھے ہٹ کر دیکھنا پڑتا ہے تاکہ اُس کے خط و خال واضح ہو سکیں اور صناع کے کمال اور تصویر کے حسن و قبح کا اندازہ ہو سکے۔ یہی حال بڑے لوگوں کا ہے جنھوں نے دنیا میں کسی نہ کسی حیثیت سے کار نمایاں کئے ہیں۔ ہم عصر بے لاگ رائے دینے سے قاصر رہتے ہیں۔ اُن میں موافق بھی ہوتے ہیں اور مخالف بھی۔ (وہ آدمی ہی کیا جس نے مخالف نہ پیدا کیے) موافق، مخالف دونوں مبالغہ کرتے ہیں۔ اُن میں مخلص بھی ہوتے ہیں اور ریاکار بھی۔ خود غرض بھی ہوتے ہیں اور بے نفس بھی۔ ہم عصر کیسا ہی بے لاگ ہو۔ اپنے زمانے کے حالات و خیالات اور الجھنوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ایک مدت کے بعد جب بے جا مخالفتوں اور حمایتوں کا گرد و غبار چھٹ جاتا ہے دراصل حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے " [1]

اِس ضمن میں مولوی عبدالحق نے بھی بیشتر مخالف پیدا کیے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ مخالف پیدا ہوئے اِس قبیلے کے طور پر جو ہمیشہ سے مرنجانِ مرنج اور بڑے آدمیوں کے ساتھ رہا ہے جو اپنی ذات کو دوسروں کے لئے فنا کر دیتا ہے۔ اِن مخالفتوں کی بنیاد عام طور پر حسد اور بغض ہوتا ہے سر سید اور شبلی کی طرح مولوی عبدالحق بھی ان مخالفتوں سے نہ بچ سکے۔ اُن کے مقاصد اور اداروں کو شک کی نظروں سے دیکھا گیا۔ مظاہرے ہوئے اور جلسے و جلوس کیئے گئے، لیکن مولوی صاحب نے اِس کی مطلق پرواہ نہیں کی اور ایک تناور درخت کی طرح استقلال و استقامت سے کھڑے مقابلہ کرتے رہے۔ مخالفتیں کیا تھیں، بادِ صرصر کی طرح آئیں اور گزر گئیں۔ یہی نہیں بلکہ مخالفین کے ساتھ بعد میں خندہ پیشانی سے پیش آئے اور بسا اوقات پھر اُن کی مدد بھی کرتے۔ مخالفین کے خلاف اُنھوں نے اپنے دل پر غبار تک آنے نہیں دیا۔ وہ مخالفتوں کو کام کرنے کے لئے بہت ضروری

---

[1] سر سید احمد خاں، حالات اور افکار　ص

سمجھتے تھے اور شاید یہ مخالفتیں ہی تھیں، جنھوں نے خلوص اور مقصد سے لگن کی آنچ کو تیز تر کر دیا۔ بہت زیادہ مخالفتوں سے آدمی میں کام کرنے کے سلسلے میں ایک ضد سی پیدا ہو جاتی ہے۔ کام کرنے والوں کے لیے مخالفتوں کا یہ ایک اچھا پہلو ہے۔ اُردو کانفرنس کراچی کے خطبے میں کہتے ہیں۔

"کسی تحریک کو ہمدردوں کی ہمدردی اور مربیوں کی سرپرستی سے تقویت نہیں پہنچتی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس تقویت کا راز بہت کچھ مخالفت میں بھی ہے۔ مخالفت بیدار کرتی ہے۔ عملی قوت کو اُبھارتی ہے۔ انسان کے آن جوہروں کو چلا دیتی ہے جو پہلے مدھم پڑے تھے۔ مخالفت دَر پردہ امتحان ہے۔ تحریک اگر حق ہے اور کام کرنے والوں میں خلوص و استقلال ہے تو مخالفت دب جائے گی اور تحریک سو بہو سے کامیاب ہوگی۔"

پھر یہی نہیں بلکہ پاکستان رائٹرس گلڈ کو مخاطب کرتے ہوئے کام کرنے کا طریقہ بھی بتاتے ہیں:

"صرف انجمنیں بنا دینا، قرار دادیں منظور کر دینا یا حکومت سے امداد حاصل کر لینا کافی نہ ہوگا۔ ہمیں کام کرنا ہوگا۔ کام سے مراد یہ نہیں، جو سرکاری دفتروں میں ہوتا ہے کہ نو بجے اور ۴ بجے چلتے بنے۔ یہ کام جو ہمیں کرنا ہے، پوری طاقت اور استقلال سے کرنا ہوگا۔ دن رات، گرمی سردی بارش سے بے نیاز ہو کر۔ کام سے عشق ہونا چاہیئے۔ عشق نہیں تو وہ کام نہیں، بے گار ہے جو لوگ کسی بڑے مقصد کو لے کر خلوص و صداقت سے والہانہ کام کرتے ہیں اور اپنی جان تک کھپا دینے کی پرواہ نہیں کرتے، وہ کبھی نہیں مرتے۔ ہمیشہ زندہ رہتے ہیں اور جو اپنی جان عزیز رکھ کر محنت سے جی چُراتے ہیں مرتے ہیں۔"

تاہم دیو مالی کے بیان میں لکھتے ہیں۔

"کام اُسی وقت ہوتا ہے، جب اُس میں لذت آنے لگے۔ بے مزہ کام، کام نہیں بے گار ہے۔"

(باقی آئندہ شمارے میں)

ے۔ کھو

قرۃ العین حیدر

ہندوستانی مشترکہ تہذیب کی علامت

"اکیسویں صدی زیادہ دور نہیں۔ یہ بچیاں اور بچے آزادی کے بعد پیدا ہونے والی اس نسل میں شامل ہیں جو کارِ جہاں سنبھال چکی ہے یا سنبھالنے والی ہے ہم لوگوں نے اور ہم سے پہلے والوں نے دنیا کو اپنے اپنے وقت کے لحاظ سے اور اپنی نظروں سے دیکھا تھا۔ نئے لوگ اکیسویں صدی میں پہنچ کر عوام کو شاید ہم سے بہتر طور پر سمجھ سکیں۔" قرۃ العین حیدر (کارِ جہاں دراز ہے)

قرۃ العین حیدر جنھیں ۲۵ ویں گیان پیٹھ ایوارڈ سے نوازا گیا ہے پانچ ناولوں، چار ناولٹوں اور چار افسانوں کے مجموعوں کی خالق ہیں۔ اس نامور ادیبہ کو اردو ادب کی ورجینا وولف کہا جاتا ہے اردو کو یہ ایوارڈ فراق گورکھپوری کے بعد قرۃ العین حیدر کو ان کی ۱۹۶۹ء سے ۱۹۸۳ء کے دوران ہندوستانی ادب میں نمایاں کارکردگی پر دیا گیا ہے۔ اس سے پہلے وہ ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ لے چکی ہیں۔ قرۃ العین حیدر ہندوستانی مشترکہ تہذیب کی حامی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ پاکستان جاکر پھر ہندوستان لوٹ آئیں۔ ان کا کہنا ہے کہ "یہ مشترکہ کلچر کسی اخبار کی سرخی نہیں جو دوسرے دن ہی بھلا دی جائے۔ یہ تو دنیا کی تاریخ کا عنوان ہے جو اپنی جگہ محفوظ بھی ہے اور دوسری تہذیبوں کو اپنی طرف بھی کھینچتا ہے۔ تہذیب اور تاریخ کا رشتہ سورج اور زمین کا رشتہ ہے جس میں [illegible] کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ زمین سورج سے ٹوٹ کر علیحدہ ہونے والے ایک حصہ

کا نام ہے۔ لیکن یہ کب ہوا یقین کے ساتھ کہنا مشکل ہے۔ اتنا تو آسانی کہا جا سکتا ہندوستان کی تہذیب، ہندوستان کی تاریخ سے پرانی ہے اور اس کی بنیاد پر...

قرۃ العین حیدر نے ہندوستانی ادب میں خاص کر اردو میں شعور کی رو کو نمایا "آگ کا دریا" میں جب گوتم نیلمبر ندی میں ایک کنکر پھینکتا ہے اس کی لہروں کا دائرہ وسیع ہو جاتا ہے۔ قرۃ العین حیدر نے بھی ہندوستانی تہذیب کی لہروں کو دیکھنا چاہا۔ لیکن انہوں نے کنکر کے بجائے پھول پھینکا۔ شعور کی رو میں وہ اپنے کیپ میں ایک گھومتی ہوئی لہر ہیں۔ قرۃ العین حیدر لکھتی ہیں کہ ہندوستانی تہذیب وہ تہذیب ہے جو آج زندگی کے ساتھ وابستہ ہے وہ زندگی جس کا یہاں ہمیشہ ایک مشترکہ تصور رہا ہے۔ جس کی تشکیل مختلف نسلوں، مذہبوں اور پیغمبروں نے حصہ لیا ہے۔ سندھ جیسے قرۃ العین حیدر دیش کہتی ہیں اسی مشترکہ تہذیب کی نشانی ہے۔ وہاں مسلمان عورتیں آج بھی اپنی مانگ میں سیندور لگاتی ہیں۔ سندھی لوگ مسلمان ہونے کے باوجود اپنے پرانے مذہب کی عزت کرتے ہیں۔ ہزار ہا درگا ہیں ایسی ہیں جہاں کہ پیروں کا ایک نام تو ہندو تھا۔ اور ایک محمڈن۔ راجہ بھرتری لال شہباز ہے۔ پیر ٹیپو، پیر سلطان زندہ پیر، خواجہ خضر، دیرو لال شیخ طاہر لالو سہنج ہے۔ منگھو پیر۔ جیسے ہندوؤں کے یہاں ہر چیز کے لئے ایک ایک دیوی دیوتا ایجاد کر لیا جاتا ہے اسی طرح سندھ کے مسلمان کے یہاں ہر چیز کے لئے الگ الگ پیر بنا لیئے گئے۔ راگوں کے پیر۔ مٹی کے برتنوں کے پیر۔ پنگھوڑے کے پیر سارا سندھ پیروں کا دیش بن گیا۔ اس کے ساتھ ہی رمضان کا مہینہ ہندوؤں کے لئے پوتر ہو گیا اور وہ تعزیوں کے سامنے نذر و نیاز چڑھانے لگے۔ ہندو مسلم شادیاں عام ہو گئیں۔"

"ستاروں سے آگے" سے لے کر "گردش رنگ چمن" تک "کار جہاں دراز ہے" اور "آخر شب کے ہمسفر" سے ہوتے ہوئے قرۃ العین حیدر کا سبھی ناولوں میں یہی موضوع ہے

بچہ مسلمان کے گھر پیدا ہوتا ہے گیت کرشن کنہیا کے گائے جاتے ہیں۔ مسلمان بچے برسات کی دُعا مانگنے کے لئے منہ نیلا پیلا کیئے گلی گلی ٹین بجاتے ہیں اور ساتھ چلاتے ہیں "ہاتھی گھوڑا پالکی ـــ جیئے کنہیالال کی" مسلمان پردہ نشین عورتیں جنھوں نے ساری عمر کسی ہندو سے بات نہیں کی جب ڈھولک لے کے بیٹھتی ہیں تو لہک لہک کر الاپتی ہیں "بھری گگری میری ڈھلکائی شیام ۔"

قرۃ العین حیدر کے نقطہ نظر میں سب سے بڑا المیہ برصغیر کی تقسیم ہے۔ قرۃ العین حیدر کا دوسرا پسندیدہ موضوع ہے وقت کا وہ دھارا۔ وہ دھارا جو انسانی وسعتوں کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے انسان وقت کے درخت پر پتوں کی طرح ڈول رہا ہے گوتم کے گرو نے اس سے کہا تھا کہ وقت کے سامنے کوئی بچ نہیں سکتا۔ وقت کے سامنے کوئی رشتے ناتے نہیں ہیں۔ ہر شئے فنا ہے۔ وقت فنا میں شامل ہے۔ وقت کو مختلف حصوں میں قید کر لیا گیا ہے مگر وہ پل پل چھن کر اس قید کو توڑتا ہوا چپ چاپ آگے نکل جاتا ہے وقت جو تباہ کن ہے اور قائم بھی رہتا ہے سر والٹر سکاٹ کی طرح ماضی کو از سرِ نو زندہ کرنے کی صلاحیت قرۃ العین حیدر میں ہے۔ "آگ کا دریا" کا اصل موضوع تو انسان کی وہ زخمی اور پیاسی روح ہے جو تاریخ کی اس چوکھٹ پر پیش کی گئی ہے جو گہری ندیاں اور گہرے جل کے پار اترنا چاہتی ہے لیکن جیسے کوئی گھیوں پار نہیں ملتا۔ ٹی ایس ایلیٹ کی نظم FOUR - QUARTETS جو "آگ کا دریا" کے شروع میں بطور ایپی گراف دی گئی ہے EPIGRAPH ظاہر کرتی ہے کہ وقت کا دھارا بھی قرۃ العین حیدر کا موضوع ہے ملاحظہ ہو۔

"ہمارا اپنا ماضی کرم کی دھاراؤں میں چھپا ہوا ہے اور مستقبل ایک مدھم گیت ہے۔ خاتمہ کہیں نہیں ہے صرف اضافہ ہے مزید دنوں اور گھنٹوں کا گھٹتا بڑھتا تسلسل ہے"

ٹی ایس ایلیٹ

معنفہ کے صنم خانوں میں کوئی بھی چیز بے معنی نہیں ہے وہاں تو اسں لفظ بے معنی کے بھی معنی موجود ہیں

قرۃ العین حیدر بلا شبہ اس دور کی سب سے بڑی رزمیہ نگار ہیں۔ انہوں نے انسانی زندگی کا جو رزمیہ لکھا ہے اسے لکھنے کے لئے انہیں نہ صرف جلاوطن ہونا پڑا بلکہ "آگ کے دریا" سے بھی گزرنا پڑا ہے۔ اور اس مقدس آگ نے سب کچھ پوتر کر دیا ہے۔ ان کے فن کو تپا تپا کر کندن بنا دیا ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اپنے لافانی کردار گوتم نیلمبر کی طرح قرۃ العین حیدر نے بھی چلتے چلتے ٹھٹھک کر پیچھے دیکھا ہے۔ بہت پیچھے انہیں ماضی میں مختلف صدیوں میں جیتی، سانس لیتی جو زندگی نظر آئی ہے وقت کا جو لامتناہی سلسلہ نظر آیا ہے وہ ان کا حاصل ہے۔ صدیوں پر محیط بہت پیچھے کا ماضی۔ قرۃ العین جتنا پیچھے جاتی ہیں اور جتنی پرانی کہانیاں سناتی ہیں وہ اتنی بچھڑی نہیں بن جاتیں بلکہ اور حساس ہو جاتی ہیں۔ اور مستقبل پر ان کا یقین اور بھی پختہ ہو جاتا ہے اور وہ تعمیر کی ایک زبردست خواہش اپنے دل میں خود اپنے ناول کی ایک کردار بن کر بڑے اعتماد کے ساتھ یہ کہتی ہیں۔

"اب ماضی پہ رونا اور ماضی کی غلطیوں پر پچھتانا مضحکہ خیز ہے۔ کیونکہ مستقبل ابھی باقی ہے۔"

بے شک مستقبل ابھی باقی ہے دیکھنا یہ ہے کہ قرۃ العین حیدر اس باقی مستقبل میں اپنے فن کے اور کتنے صنم خانے اور کتنے شاہکار تعمیر کرتی ہیں۔ دیکھنا یہ بھی ہے کہ یہ شہرہ آفاق اُردو ادیبہ ادب اور فن کی کتنی اور منزلیں طے کرتی ہے ۱۹۸۶ء میں ان کے ناول "گردشِ رنگِ چمن" نے کافی ہلچل پیدا کی۔ قرۃ العین حیدر نے ۱۹۴۷ء میں پاکستان ہجرت کی تھی لیکن وہاں کے حالات اور برصغیر کے مشترکہ کلچر نے انہیں مجبور کر دیا اور وہ ہندوستان واپس آگئیں۔ ان کی بیشتر کتابوں کا کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

قرۃ العین حیدر ایک معتبر اور مشہور مترجم بھی ہیں ہنیری جیمز کا ناول Portrait of a Lady

انہوں نے اُردو میں ترجمہ کیا۔ ٹی ایس ایلیٹ Murder in the cathedral بھی انہوں نے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ وہ انگریزی میں بھی لکھتی ہیں۔ علی سردار جعفری کے ساتھ انہوں نے ایک کتاب غالب کی شاعری اور غالب کے خطوط غالب کی اسی سالہ برسی پر شائع کی۔

مصنفہ کی ان تمام تحریروں میں ہندوستان کی تاریخ بھی ہے اور تہذیب بھی۔

"آگ کا دریا" موریہ عہد سے لے کر انیسویں صدی تک کی ایک تاریخ ہے ہندوستانی نقطۂ نظر سے "آخر شب کے ہمسفر" بنگال کی تاریخ ہے۔ ۱۹۴۰ء کے بعد سے بنگلہ دیش کی تشکیل تک "کار جہاں دراز ہے" دو جلدوں پر مشتمل ایک طویل ناول ہے سوانحی انداز میں حیدر آباد اور لکھنؤ کی تہذیبوں کی جھلکیوں سے ملبوس "پت جھڑ کی آواز" ہندوستان کے موسموں کی خوبصورتی "اگلے جنم مجھے بٹیا نہ کیجیو" نسوانی نقطۂ نظر سے ہندوستانی سماج کی عکاسی ہے "یاد کی دھنک" ہے میں قرۃ العین حیدر پوچھتی ہیں کہ "عورت اتنی پرستار اتنی پجارن کیوں ہوتی ہیں اور پھر خود ہی اس کا جواب دیتی ہیں۔ اس لئے کہ وہ کمزور ہیں اور سہارے کی حاجت مند ہیں۔" مصنفہ کی زبان سے ایک ہی دعا نکلتی ہے۔ "اگلے جنم مجھے بٹیا نہ کیجیو"۔ آج عورت نہ تو کمزور ہے اور نہ ہی اسے کسی سیڑھی یا سہارے کی ضرورت ہے لیکن پھر وہ پجارن ہے۔ پرستار ہے۔ اس لئے کہ وہ عورت ہے۔

مس حیدر کو اس بات سے اتفاق ہے کہ تاریخ میں تبدیلیاں کشمکش کی وجہ سے ہے"

اور معاشی نظام سماج کی جان ہے مذہب، تمدن، تہذیب، زندگی کا فلسفہ،
تمام تر معاشی نظام کے ہی پرتو یا عکس ہوتے ہیں۔ وہ آزادی کے لئے
انسانی تاریخ کا سب سے بڑا کارنامہ سمجھتی ہیں۔ ان کا

نی جائے۔ ان کا دشوں اور کوششوں کا دوسرا نا
با ننا کے سہارے اپنا وقت گزارتے
استے ہی دن میں جتنا ن

میں انہیں جذبات کی ترجمانی ملتی ہے۔

"آگ کا دریا" میں ایک لڑکی دوسری لڑکی سے پوچھتی ہے "جب لوگ اتنا پڑھ جاتے ہیں تو کیا ہوتا ہے۔" "ہوتا کیا ہے جھک مارتے ہیں۔ کسی دھرم کا اوشکار کر لیتے ہیں یا کسی نئے فلسفے کا پرچار شروع کر دیتے ہیں۔" لیکن افسوس تو یہ ہے کہ نیا دھرم یا نیا فلسفہ بھی بے آواز چیخوں کو ختم نہیں کر پاتا۔ بھوک نہیں مٹا پاتا۔ خزاں میں چپ چاپ مرجھائے ہوئے پھولوں کا جو خاموشی سے اپنی پنکھڑیاں گراتے ہیں کبھی خاتمہ نہیں ہوتا۔ وقت لامحدود ہے وقت ایک عظیم طاقت ہے۔ وقت ایک لہر بھی ہے اور شعور کی لہر بھی۔ وقت کی طاقت کا اندازہ لکھنؤ کے اس گھر سے لگائیے۔ جس کا نقشہ قرۃ العین حیدر "آگ کا دریا" میں کھینچتی ہیں۔

"یہاں سے اپنے پیاروں کی ارتھیاں نکلیں۔ دلہنوں کے ڈولے آئے۔ براتیں چڑھیں۔ بیٹیاں وداع ہوئیں۔ بڑے بڑے رام نومی تہوار منائے گئے۔ رام نومی، جنم اشٹمی، دسہرا، دیوالی، شوراتری، یہاں بچے پیدا ہوئے، لڑائی جھگڑے ہوئے، لوگ ہنسے اور روئے اور پھر ہنسے۔ ہر گھر میں یہ سب ہوتا ہے گھر خاموشی سے یہ سب دیکھتا ہے۔ اس کی داستان پر کوئی کان نہیں دھرتا۔ اس کی وقت سے ہمیشہ ٹھنی رہتی ہے۔ دیکھتا ہوں کہ تم میرا کب تک ساتھ دیتے ہو۔ تم میری نشان دہی کب تک کرتے رہو گے۔ وقت کہتا ہے گھر پھر بھی خاموش رہتا ہے برس گزرتے ہیں صدیاں بدلتی ہیں۔ موسم پلٹ پلٹ کر آتے ہیں۔ گھر وقت کی ندی میں چھوٹے سے جہاز کی طرح لنگر انداز رہتا ہے۔ کبھی کبھی لہریں اسے بہا لے جاتی ہیں۔ پھر اس کا نام و نشان بھی نہیں ملتا۔"

مندرجہ بالا تحریر ایک سوانحی البم ہے زندگی کا وہ مشترکہ تصور جو عینی حیدر بیان کرتی ہیں اس کی تشکیل میں مختلف قوموں، نسلوں اور لوگوں نے حصہ لیا ہے وہ اپنے آپ میں ایک تصویر ہے۔ انگریز مورخ کہتا ہے کہ قدیم زمانے سے ہندوستان میں ملکی وحدت

نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ ملک ہمیشہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹا رہا ہے پورے ملک کا ایک نام بھی نہیں تھا اور یہاں کے رہنے والے ہر علاقے کو الگ الگ ملک سمجھتے تھے لیکن قرۃ العین حیدر کہتی ہیں کہ یہ بات سراسر غلط ہے۔ کیونکہ ہندوستانی تاریخ اور تمدن کی تاریخ کچھ اور کہہ رہی ہے۔ زمان، مذہب اور طرز معاشرت کے اختلافات کے باوجود یہاں تہذیبی اتحاد تھا۔ سیکولرازم کا مطلب لا مذہبیت نہیں بلکہ تمام مذاہب کا احترام کرنا ہے۔ کثرت کے اندر وحدت کا جو رشتہ ہے وہ ہندوستانی تہذیب کا خاصہ ہے وہ ارباب قوت کے جبر و تشدد سے نہیں بلکہ عارفوں کے وجدان سے، بھکتوں کے گیتوں سے، فلسفیوں کے افکار سے اور فن کاروں کے فن سے پیدا ہوا ہے۔ قرۃ العین ایک ایسی ادبی مورخ ہیں جو ہمیں لمحات کے گزرنے کی چاپ سناتی ہیں اور کہتی ہیں۔

"پرندوں کی پرواز دیکھو۔ ان کے ساتھ اڑو"

قرۃ العین حیدر کو دکھ ہے کہ اچھے انسان برسوں کے الٹ پھیر کے بعد پیدا ہوتے ہیں کتنی زیادتی ہے اور پھر ایک رات ایسی آتی ہے جب وہ سارے پچھلے زمانوں کو جمع کر کے ایک طرف رکھ دیتی ہیں اور پیچھے کی اور دیکھتی چلی جاتی ہیں۔ بل کھاتے اور بارش میں بھیگے ہوئے کوہستانی راستے جو میلوں لمبی دوری کو طے کر کے ایک دوسرے کے اتنے قریب آ جاتے ہیں لیکن پھر یک لخت جدا ہو جاتے ہیں یہ پہاڑی راستے ہیں۔ یہ زندگی کے انداز کو سمجھتے ہیں۔ عین اسی طرح جس طرح قرۃ العین سمجھتی ہیں۔ یوکلپٹس کے سائیں سائیں کرتے ہوئے جھنڈوں کی طرح ساگوان کے درختوں سے نکلتے ہوئے نغمے کی طرح۔ نوکن چمیلی اور موتیے کے بھی تو جھنڈ ہوتے ہیں جہاں مری ہوئی صدیوں کے سائے لرزتے ہیں۔ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب میں اتنی کشش ہے کہ وہ روٹھے ہوئے دلوں کو واپس بلا سکتی ہے اور قرۃ العین حیدر اس امر کی زندہ مثال ہیں۔ اور نہ صرف ان کی شگفتہ اور فکر انگیز تحریر اس بات کی گواہ ہے کہ ہندوستان کا مشترکہ کلچر ہمیشہ زندہ رہے گا اور تمام دنیا کے لئے ایک مشعل راہ کا کام کرے گا۔ کھبات ہے کہ مٹتی نہیں

(باقی صفحہ پر)

اظہر نیر
11/24, Sec. 6, بھلائی نگر
مدھیہ پردیش 490006

رؤف خیر سے انٹرویو

حیدرآباد دکن زمانۂ قدیم سے فنونِ لطیفہ کا گہوارہ علم و تہذیب اور شعر و ادب کا مرکز رہا ہے ولی دکنی سے لے کر مخدوم محی الدین، شاذ تمکنت وغیرہ کے بعد ایک اہم نام رؤف خیر کا ہے

جناب رؤف خیر نے ادبی سفر میں سارے مرحلے طے کئے ہیں عصری اور تجریدی الفاظ و افکار کو برتنے کے مرحلے (جس سے خیال و افکار میں نئی روشنی آتی ہے) طے کئے دیں روایت کے خزانے کو بھی کھنگالا ہے جو رؤف خیر کے تخلیقی سفر میں بڑی بالغ نظری اور بانکپن کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ رؤف خیر کی شاعری میں موضوع و مواد، فکر و خیال، جذبہ و احساس، علامت و اشاریت تشبیہ و استعارہ، ہیئت و ساخت کی تازہ کاری اور جدت طرازی بھی ہے صنفِ سخن ترائیلے کو نزیش کمار شاد نے جہاں چھوڑا تھا وہاں سے رؤف خیر نے آگے بڑھانے میں جد و جہد کی اور کامیاب رہے۔ رؤف خیر کا نام ہند و پاک کے ادبی حلقوں میں اجنبیت نہیں رکھتا۔ آئیے آج اُن سے ہم ادبی مسائل پر گفتگو کریں۔

اظہر: جناب۔ سب سے پہلے تو یہ بتائیے کہ آپ کب اور کہاں پیدا ہوئے اور تعلیم کہاں کہاں سے اور کہاں تک حاصل کی ؟

خیر: میں پانچ نومبر ۱۹۴۸ء کو حیدرآباد دکن میں پیدا ہوا۔ یہیں ساری تعلیم پائی۔ عثمانیہ یونیورسٹی سے ایم اے (اردو) کرنے کے بعد یہیں سے "اقبال کے اسلوب کا ارتقاء" کے موضوع پر پی ایچ ڈی کر رہا ہوں۔

اظہر: رؤف خیر صاحب۔ آپ سے دوسرا سوال یہ ہے کہ آپ کی ادبی زندگی کا آغاز کب اور کیونکر ہوا؟

خیر: میری ادبی زندگی کا آغاز (۱۹۶۴ء) سے ہوا جب میں بچوں کے لئے کہانیاں لکھا کرتا تھا۔ پھر غزلیں کہنی شروع کیں۔

اظہر: آپ کی ادبی زندگی میں سب سے زیادہ اور پہلے کس نے رہنمائی کی؟ اور آپ کن کن شاعروں سے زیادہ متاثر تھے اور ابھی ہیں؟

خیر: میری ادبی زندگی میں اگر کسی نے واقعی رہنمائی کا حق ادا کیا تو وہ میرا مطالعہ ہے آج بھی مطالعہ ہی میرا استاد ہے خاص طور پر نیاز فتح پوری کی ناقدانہ بصیرت، مالہ وما الیہ، انتقادیات اور نگار کے پرچوں کے حوالے سے فیض اٹھایا ہے۔ جہاں تک متاثر ہونے کی بات ہے تو عرض کروں کہ میں کبھی کسی کے اثر میں نہیں رہا۔ پسند کئی شاعروں اور ادیبوں کو کرتا رہا ہوں اور ایک حد تک ان کا قائل بھی رہا مگر اُن کا لہجہ اختیار نہیں کیا اور یوں بھی کسی کی کاپی کرنا اور اس کا لہجہ اختیار کر لینا بہت مشکل ہے کیونکہ کسی کا بھی لہجہ ہو بڑی مشکل سے بنتا ہے اور کوئی دوسرا شخص اس کی نقل اتنی آسانی سے نہیں کر سکتا اور پھر مجھے اپنے آپ کو بھی تو منوانا تھا۔ مجھے اپنا لہجہ آپ بنانا بھی تو ہے۔ میرے پسندیدہ شاعروں میں غالب، اقبال، فانی، یگانہ چنگیزی، خورشید احمد جامی وغیرہ اور جدید شاعروں میں مجھے باقی اور ظفر اقبال اچھے لگتے ہیں (ان کے حشو یا بس کو چھوڑ کر)۔

اظہر: آپ ادب میں کس حد تک افادیت اور مقصدیت کے قائل ہیں؟

خیر: میرا خیال ہے کسی بھی [illegible] کا کوئی بھی جملہ بے معنی یا بے مقصد نہیں ہو سکتا۔ چہ جائیکہ شاعری [illegible] لطیف۔ یقیناً میں انسان اور کائنات کے حوالے سے کوئی بات [illegible] مگر [illegible] کے لئے پہلے سے کوئی پلاننگ نہیں کرتا کیونکہ شعر پلاننگ کے

فقت نہیں ہوتے۔ چونکہ میں سوچنے کا اک افادی پہلو رکھتا ہوں اس لئے لایعنی بات نہیں کر سکتا اگر اس کو مقصدیت کہیں تو مجھے تسلیم ہے مگر شاعر اور واعظ یا محتسب میں بہر حال فرق ہے اور میں اس فرق کا خیال رکھتا ہوں۔ حالات مجھ سے شعر کہلاتے ہیں اور میں اس فرق کا خیال رکھتا ہوں۔

الطہر: آپ اپنے تخلیقی سفر میں سب سے زیادہ کس کس صنف سے متاثر ہوئے؟

خیر: مجھے تنقید پسند ہے اور فرانسیسی صنفِ سخن ترائیلے نے متاثر کیا۔ مجھے یہ فارم اچھا لگنے لگا۔ آٹھ مصرعوں کا التزام اور وہ بھی اک خاص تکنک کے ساتھ۔ میں نے بے شمار ترائیلے لکھے۔ کچھ "اقرار" (۱۹۷۷ء) میں شامل تھے اور بہت زیادہ ترائیلے میرے دوسرے مجموعہ کلام "ایلاف" (۱۹۸۲ء) میں شامل ہیں اب یہ الگ بات ہے کہ اُردو میں یہ صنف زیادہ کامیاب نہ ٹھہری بلکہ خود فرانسیسی اور انگریزی میں بھی یہ زیادہ چل نہ سکی۔ بہر حال اک جدت تھی۔ میں نے اپنائی۔

الطہر: آپ کے خیال میں "غزل" اور "نئی غزل" کی جامع اور مستند تعریف کیا ہے؟ اس کے مستقبل کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

خیر: غزل اب صرف عورتوں کی یا عورتوں سے باتیں کرنے تک محدود نہیں رہ گئی۔

غزل اب عصری تقاضوں سے مملو ہے اس میں ہر قسم کے مضامین باندھے جا رہے ہیں اور باندھے جانے چاہئیں۔

نئی غزل عصری محاورہ اور عصری حسیت سے عبارت ہے جس میں زبان و بیان کا اتنا ہی خیال رکھا جاتا ہے جتنا کہ کلاسیکل غزل میں رکھا جاتا تھا البتہ اپنے دور کے محاورے میں اک خیال کو پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے نئی غزل روایت کی پاسداری کے باوجود محض روایتی نہیں، ترقی پسندی کو بے باکی سے رکھنے کے باوجود محض حرف بہ حرف نہیں ہے۔ نئی ہونے کے باوجود جدیدیت کی لایعنیت سے بھی پاک ہے۔

آج نئی غزل ان تینوں مکتبہ خیال سے الگ اپنی شناخت بنانے میں کوشاں ہے۔

اظہر: کیا ماضی کے تجربے اور بنیادی سچائیاں، نئی شاعری کے مطالعہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں؟

خیسر: ماضی کے تجربے اور بنیادی سچائیوں کے بغیر تو نئی غزل کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

اظہر: اردو کا نیا ادب کس تحریک سے متاثر ہے اور وہ کونسا رجحان ہے جو نئے ادیبوں کو اپنی ذات کی اندھیری گپھاؤں میں سمیٹے لئے جا رہا ہے؟

خیسر: ہر تحریک کا اک خاص زمانہ ہوتا ہے۔ غزل کے بالمقابل نظم کی بنیاد رکھی گئی تو حالی، آزاد وغیرہ جدیدیت شاعر ٹھہرے اور پھر اس نئی تحریک کو طعون و مطعون ٹھہرایا گیا۔ پھر نظم نے اتنا عروج پایا کہ غزل کہنا عیب سمجھا جانے لگا اور آج غزل اور نظم دونوں ہی جدیدیت اور تجریدیت کی زد سے باہر نکل آئے۔ تجریدیت کی تمام تحریکیں آج دم توڑ رہی ہیں اس لئے کہ اب جو تحریک ہے وہ ابلاغ و ترسیل میں یقین رکھتی ہے البتہ اک ابہام کے ساتھ۔ ورنہ آدمی اپنی ذات کی گپھاؤں کو غار حرا میں تبدیل نہ کر پائے گا۔

اظہر: جناب کیا جدیدیت، ترقی پسندی کی ترقی یافتہ شکل ہے یا بالکل نئی تحریک ہے؟

خیسر: ترقی پسندی کے بنیادی اصول ہیں اور تخلیق کار ان اصولوں کے دائرے سے باہر قدم نہیں نکال سکتے ہیں۔ کسان، مزدور، آزادی کا راگ، عورت، سرمایہ و محنت وغیرہ بہرحال اک منشور کی پابندی سے عبارت ترقی پسند تحریک سے جدیدیت کا بھلا کیا تعلق؟ جدیدیت تو علی الاعلان ہر اس موضوع کو برت ڈالتی ہے جو کسی فنکار کو اپیل کرتا ہے۔ آزادئ رائے کا مکمل اظہار جدیدیت میں ہی ہو سکتا ہے مثلاً ظلم بہرحال ظلم ہے چاہے وہ ہیروشیما پر ہو کہ ویٹ نام پر کہ افغانستان میں۔ مگر ترقی پسند شاعر یا ادیب افغانستان میں ہونے والے کسی ظلم کے خلاف آواز نہیں

اٹھاتا ہے ۔ ہر شکر وہ یہاں اپنے منشا کا پابند ہے۔

اظہر ۔ ادب کے ساتھ تنقید کا کیا تعلق ہے ؟ اگر تعلق ہے تو پھر کیسا ہے ؟

خیر ۔ تخلیق تنقید کا تعلق تو ازل سے ہے تخلیق کار کسی چیز کی تخلیق کے دوران ہی اُسے اندرونی تنقیدی صلاحیتوں سے نکھارتا سنوارتا ہے اُس کے باوجود کوئی کسر ہے تو وہ بیرونی نقاد انجام دیتے ہیں ۔ تنقید بہرحال ایک CHECK POST ہے وجہ سے ادب ' ادب رہ جاتا ہے ۔

اظہر ۔ آپ کے خیال میں فنکار نقاد کو متاثر کرتا ہے یا نقاد فنکار کو متاثر کرتا ہے ؟ اثر پذیری کی نوعیت کیا ہے اک سوال اور کہ تنقید میں کس طرح اور کس قدر ردو بدل سے نئے ادب کے ابلاغ کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے ؟

خیر ۔ فنکار کے بغیر نقاد کا تصور محال ہے یہ فنکار کا فن ہے جو نقاد کو متاثر وہ اُس پر اچھی یا بُری رائے دیتا ہے اور نقاد کی رائے فنکار کے فن کو ... ہے ۔ بس ۔

اظہر ۔ اُردو ادب میں ابہام گوئی کیا ہے ؟

خیر ۔ ابہام ہی تو شاعری کا حُسن ہے افسانے کی خوبی ہے اور ناول کی جان اگر پہلے ہی لفظ سے معلوم ہو جائے کہ افسانہ اور ناول کس انجام کو پہنچنے والے ہیں پڑھے گا ہی کون ۔ اسی طرح شعر کی جان ابہام ہے کہ شعر کھلتے کھلتے کھلے ۔ یہی سبب غالب کے کلام کی اتنی ساری شرحیں لکھی گئی ہیں ۔ بات پہنچے ضرور ۔ مگر دھیرے ،

اظہر ۔ کیا ہمارا موجودہ ادب واقعی جمود کا شکار رہا ہے ؟

خیر ۔ ادب کبھی جمود کا شکار نہیں ہو سکتا البتہ انفرادی طور پر کوئی شاعر یا ادیب شکار ہو سکتا ہے ۔ اچھے اور بُرے حالات میں ادب برابر تخلیق پاتا ہے ۔ ہند پاکستان کے حالات بالکل مختلف ہیں اور دونوں طرف کا ادب اپنے اپنے حالات

اور اپنے مقام پر اپنے استعارے رکھتا ہے۔

الجبر: اردو ادب میں مکتوباتی ادب کی کیا اہمیت ہے؟ مکتوباتی ادب پیش کیا گیا؟ کیا ادب میں اس کی ضرورت ہے؟ ہے تو کیوں؟

خیبر: ؎ پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے

مکتوباتی ادب قلم کے اخلاص کا ترجمان ہوتا ہے۔ غالب کے تمام خطوط اپنے دور کی عکاسی کرنے کے ساتھ ساتھ غالب کے سوچنے کے انداز کو اجاگر کرتے ہیں اس کے دور کے تقاضے بھی سمجھ میں آتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی محبتیں اور رنجشیں بھی ملتی ہیں۔ یہ سب سچائیاں شعر میں یا افسانے میں فنی رچاؤ کا لبادہ اوڑھنے پر مجبور ہیں جبکہ مکتوبات اپنی جگہ بالکل خالص لہجہ رکھتے ہیں۔ میں ان مکتوبات کو بھی ادب ہی کا حصہ سمجھتا ہوں جو ضیاعِ خاطر نکالنے کے بہانے قلم کا لوہا بھی منوانا چاہتے ہیں جو لوگ مولانا ابوالکلام آزاد کی تقلید کرتے ہیں وہ دو چار خطوط ان کی طرح تو لکھ دیں۔ ادب میں مکتوبات کی اہمیت ضرور ہے مگر یہ مکتوبات پہلے صرف مکتوبات ہوں بعد میں وہ ادب بن سکتے ہیں مگر یہ سوچ کر مکتوبات تخلیق کرنا کہ انھیں ادب کا حصہ بننا ہے یہ لوگوں کے ساتھ تو دھوکا ہے ہی، خود فریبی بھی ہے جیسے غالب کے جعلی خطوط۔ اقبال سے منسوب یہ خطوط جعلی نہ بھی ہوتے تو ان کا مقصد تو بہر حال ادب میں گھس آنا ہی تھا ادب میں زندہ رہنے کے لئے لوگ کیا کیا جتن کرتے ہیں۔

الجبر: تبصرہ کیا ہے؟ اردو ادب میں اس کا کیا مقام ہے۔ رسالوں میں کس طرح کا تبصرہ شائع ہوتا ہے اور کیسا ہونا چاہیئے؟

خیبر: تبصرہ دراصل کسی کتاب کے اجمالی مگر مکمل تعارف کا نام ہے۔ ادب میں تبصرے کی بڑی اہمیت ہے تبصرہ نگار بے دلیل بات تو نہیں کرسکتا۔ ظاہر ہے اپنی کسی بات کی دلیل وہ زیرِ تبصرہ کتاب سے ہی دے گا اس طرح کتاب کے حوالے زیر بحث آئیں گے تو قاری کا تجسس جاگے

اور وہ اصل کتاب پڑھنے کے لئے بے تاب ہو جائے گا۔ یہی تبصرے کا مقصد ہے تبصرہ اگر سخت بھی ہو تو قاری کا تجسس جاگتا ہے بلکہ زیادہ جاگتا ہے جیسے سلمان رشدی کی کتاب پہ صد ہا سخت تبصروں کا آنا۔ نہ بھی اسی طرح قاری کا تجسس اس قدر بڑھا کہ اس کی لاکھوں کاپیاں بک گئیں۔ ان تبصروں کی وجہ سے بک رہی ہیں کہ اس کتاب کا کوئی نوٹس ہی نہ لیا جاتا تو وہ کبھی کی بے وقار و بے نام و نشان NOWHERE ہو گئی ہوتی۔ مصنف کی شہرت کا سبب تبصرہ نگاری ہے تبصرہ کو کتاب اور مصنف کا اجمالی تعارف ہونا چاہیئے۔ فاروقی کے تبصرے بہت دلچسپ ہوتے ہیں۔

اظہر: آپ کے مجموعوں کے نام "اقرا" اور "ایلاف" ہیں۔ ان کا علامتی مفہوم؟

خیر: اللہ نے میری تخلیق کی۔ پھر قلم کے ذریعہ لکھنا سکھایا اور جب میں لکھنے لگا تو میری خواہش ہوئی کہ کوئی اسے پڑھے بھی۔ لہذا میں نے اک کتاب ہی لکھ دی اور کہا "پڑھ" اس واسطے کہ میرے پاس پاس ہی سے تو اپنے لکھنے کے معلومات رسالہ اٹھا لیا تھا۔ یہ سب پڑھا بھی تو جانا چاہیئے۔

"ایلاف" کے معنی ہیں چاہنے والا۔ چاہا جانے والا۔ ہزار پورے کرنے والا میں بحیثیت شاعر چاہتا تو ہوں۔ چاہا جانا چاہتا ہوں۔ ہزار برس نہ سہی طبعی ادبی زندگی کا خواہشمند تو ہوں۔

اظہر: ترائیلے فرانسیسی شاعری کی نہایت مقبول مگر دشوار صنف ہے آپ نے بھی اس صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ آپ اس صنف سے کیسے متاثر ہوئے۔ اردو شاعری کی دوسری اصناف کی طرح کیا یہ صنف مقبولیت حاصل کرے گی؟ ترائیلے کے بارے میں ذرا تفصیل سے بتائیں۔ نوازش ہوگی۔

خیر: سچ تو یہ ہے کہ حریت نگار رشاد کے ترائیلے پڑھ کر ہی میں اس صنف کی طرف متوجہ ہوا۔ [illegible] ترائیلے ہی لکھے ہوں گے کہ فرحت کیفی نے لکھے مگر وہ

بہت کمزور لگے۔ میں نے بہت ترائیلے لکھے۔ اب میں یہ دعویٰ تو نہیں کرتا کہ "ایلاف"

میں شامل میرے تمام ترائیلے اچھے ہیں۔ بعض کمزور بھی ہوں گے۔ یہ آٹھ مصرعوں کی نظم

ہے جس میں ایک خاص انداز میں مصرعوں کو دہرایا جاتا ہے۔ یہ صنف اُردو تو کیا خود

فرانسیسی اور انگریزی میں بھی مقبول نہ ہو سکی۔ میں نے بعض سنجیدہ موضوعات کو جو

چھوٹی چھوٹی نظموں کے متقاضی تھے ترائیلے کا روپ دے دیا۔ یہ میری ایک ادنیٰ سی

کوشش تھی۔ بعض نقادوں نے ترائیلے کے حوالے بھی میری کتاب اقرار سے دیئے۔

اظہر: جناب! نئی شاعری میں بہت سے نئے تجربات ہو رہے ہیں جیسے ہائیکو،
آزاد غزل وغیرہ۔ آپ اِن اصناف سے کس حد تک متفق ہیں؟

خیام: "ہائیکو" مختصر ترین جاپانی نظم ہے جو اُردو میں ابھی تجربے سے گزر رہی ہے اس

میں شک نہیں ہمارا دور طویل ادبی تخلیقات کا متحمل نہیں رہ گیا اور ویسے بھی مختصر

انداز میں کہی ہوئی بات جامع ہو سکتی ہے۔ تفصیلات دراصل تشریحات کی مرہونِ منت

ہوتی ہیں اور شاعری ایجاز و اعجاز کا فن ہے اس لئے ہائیکو مناسب ہے ہائیکو

کے فارم میں انگریزی کے ABA SYLLABLES سلے بلز کے حساب سے مصرعے کہے جاتے ہیں اُردو میں

۷-۵-۷ سلے بلز کی جگہ ۷-۵-۷ افاعیل میں نظم کہی جانی چاہیئے مگر اُردو میں اس کا

خیال نہیں رکھا جاتا۔ اِلّا ماشاءاللہ۔ محمد امین نے اچھے ہائیکو لکھے۔ بعض حضرات ہائیکو

کے لئے صرف اٹھارہ الفاظ کی قید بھی لگاتے ہیں اور محمد امین نے اپنے ہائیکو اٹھارہ

لفظ ہی کے لکھے۔ باقی ہائیکو نگاروں کے لئے یہ پابندی غیر ضروری لگتی ہے۔

آزاد غزل کے بارے میں میری رائے کچھ اچھی نہیں ہے۔ ممکن ہے سہل پسند

اور عروض سے نابلد شاعروں کے لئے یہ اچھا میدان ثابت ہو مگر عوامی اور علمی سطح پر

اس کے مقبول ہونے کے امکانات صفر ہی ہیں آزاد غزل کے مبلغین کا خیال ہے کہ

آزاد غزل حشو و زوائد سے پاک صنف ہے جبکہ میرا مشاہدہ کہتا ہے کہ یہ وجود میں

حشو و زوائد کی بنیاد ہی پر آتی ہے اکثر مصرعوں کو محض آزاد کرنے کے لئے کھینچا یا بڑھایا جاتا ہے حشو و زوائد نکال دیئے جائیں یا اس کی عجز بیانی کو دور کرنے کے لئے ایک آدھ لفظ رکھ دیا جائے تو آزاد غزل آسانی کے ساتھ خوش آہنگ غزل میں تبدیل کی جا سکتی ہے چنانچہ میں نے تجربتاً مظہر امام، علیم صبا نویدی وغیرہ کی آزاد غزلوں کو بڑی آسانی سے پابند کر کے رکھ دیا۔ ویسے کوئی صاحب تو غالب کی پابند غزلوں کو آزاد کرنے کا بیڑہ بھی اٹھا سکتے ہیں۔

الہدیٰ: ادبی زندگی کا کوئی ناقابلِ فراموش واقعہ جس سے آپ متاثر ہوئے ہوں

خیر: ادبی زندگی کے آغاز میں میری خواہش ہوئی کہ ایک مشاعرے میں کلام سنانے کا موقع ملے۔ حیدرآباد کے ایک بہترین تھیٹر رویندرا بھارتی میں کوئی مشاعرہ تھا اس وقت میری غزلیں، نظمیں، اور بچوں کے لئے کہانیاں مقامی اخبارات اور مختلف رسائل میں چھپ چکی تھیں۔ میں اس وقت ایک معمولی جماعت کا میٹرک پاس کم سن لڑکا تھا۔ منتظم مشاعرہ سے میں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ میں رؤف خیر ہوں اور مجھے شعر سنانے کا موقع دیا جائے تو انہوں نے کہا میں رؤف خیر کو نہیں جانتا۔ ان کی کئی تخلیقات نظر سے گزر چکی ہیں وہ تو کسی بڑے آدمی کا نام ہے۔ چنانچہ میں کلام سنائے بغیر صف ہی میں بیٹھا رہا۔ الحمد للہ لوگوں کی خواہش ہوتی ہے کہ میں کلام سناؤں اور وہ سنتے رہیں۔

الہدیٰ: جناب رؤف خیر صاحب آخری سوال کی اجازت چاہتا ہوں۔ آپ کی کون کون سی کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور ان دنوں کیا کچھ لکھ رہے ہیں؟

خیر: میری دو کتابیں چھپ چکی ہیں۔ اقرا (۱۹۷۷ء میں) اور "ایلاف" (۱۹۸۲ء میں) میں غالب تلاذ و تعلمیذ اتخیلوں کی ہے اس کے علاوہ میرا ایک مقالہ عثمانیہ یونیورسٹی کے زیر اہتمام منعقدہ سمینار کے مقالوں پر مشتمل کتاب "بیرونی شعراء اور حیدرآباد" میں بھی شامل ہے

(باقی صفحہ ۳۳ پر)

پروفیسر عبدالمغنی

بہار میں اردو

آزادی کے بعد ہندوستان کا پہلا اردو کنونشن ۱۹۵۱ء میں بہار کے دارالسلطنت عظیم آباد (پٹنہ) میں منعقد ہوا اور اس کے بعد ریاست میں قدیم انجمن ترقی اردو کی نئی تشکیل و تنظیم ہوئی۔ اس وقت سے اردو آبادی کے آئینی و جمہوری حقوق کے حصول کے لئے ایک عوامی تحریک بہار میں چلنے لگی جس نے سب سے پہلے دستور ہند کی دفعہ ۳۴۷ کے مطابق اردو کو ریاست کی ایک علاقائی زبان قرار دینے کا مطالبہ کیا اور اس مقصد کے لئے ایک مستقل مہم چلائی۔ لیکن یہ مہم کامیاب نہیں ہوئی۔ البتہ دفعہ ۳۵۰ الف کے تحت بہار میں اردو کی ابتدائی تعلیم کا بندوبست ہوتا رہا۔ اور دفعہ ۳۰ کے مطابق اقلیتی تعلیمی اداروں کو بھی امداد اور منظوری ملتی رہی۔ اس کے علاوہ ۳۵۰ سے اردو میں دفاتر کو عرضیاں پیش کرنے کی جو سہولت دی تھی وہ اصولاً موجود رہی مگر اس پر عمل گویا نہیں ہوا۔ اگرچہ دفعہ ۱۲۰ کے مدنظر اسمبلی میں اردو میں تقریر کی اجازت باقی رہی۔

ثانوی اور اعلیٰ سطح پر اردو کی تعلیم کا انتظام بھی ممکنہ حد تک اسکولوں اور یونیورسٹیوں میں ہوتا رہا۔ مختلف امتحانوں میں غیر لسانی مضامین کے پرچے اردو میں لکھنے کی سہولت سے کچھ نہ کچھ فائدہ اٹھایا جاتا رہا۔ اگرچہ اس سلسلے میں اردو کی درسی کتابوں، سوالوں اور اردو داں ممتحنوں کے تقرر کے مسائل تسلی بخش طور پر حل نہیں ہوئے۔ بہار مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کے فارغین کو

اُردو فارسی عربی اور دینیات کے مشرقی علوم کے اداروں میں ملازمتیں ملتی رہیں۔ یہ کہ اب اُردو ذریعہ تعلیم سے چلنے والے ان مدارس اسلامیہ کی اسناد کو مجوزہ ایجوکیشن سے ملحق ہیں میٹرک سے بلدائے تک اسکول اور کالج کی ڈگریوں کے برابر تسلیم کر لیا گیا کہ تمام اقلیتی تعلیمی اداروں، مدارس، اسکول کالج کے اساتذہ و ملازمین کو براہ راست یہ تحویل میں لیئے ہوئے اداروں کے برابر تنخواہیں اور دیگر سہولیتیں دینے کا اصول تسلیم کر لیا ہے اور اس پر عمل بھی بعض خامیوں اور کوتاہیوں کے باوجود ہوتا رہا ہے۔

انجمن ترقی اُردو بہار نے اس صورت حال کو اطمینان بخش نہیں تصور کیا۔ اس لیے کہ ضمانت کے باوجود اُردو کو کوئی قانونی حیثیت نہیں دی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دستوری حقوق حصول میں دشواریاں ہونے لگیں اور انتظامیہ کی جانب سے ملنے والی مراعات میں کوتا سب سے بڑھ کر یہ کہ دفتروں اور محکموں میں اُردو کا سرکاری استعمال نہیں ہونے کے سبب اس روزگار کے مواقع کم سے کم ہونے لگے اور اس کا اثر اُردو کی تعلیم پر پڑنے لگا کہ خود اُردو بولنے کی توجہ اُردو میں اپنی آئندہ نسلوں کی تعلیم کی طرف بتدریج کم سے کم تر ہونے لگی وہ سمجھنے آزاد ہندوستان میں ان کی نئی نسلیں اپنا مقدر اُردو کے ذریعے تعمیر نہیں کر سکیں اور ا مستقبل اس زبان کے ذریعے اظہار میں محفوظ نہیں حالانکہ اُردو اہل اُردو کی صرف ماد زبان ہی نہیں ان کے تہذیبی سرمایہ اور معاشرتی قدروں کی امین بھی ہے لہذا ایک زندہ زبا حیثیت سے اس کی ترقی کے بغیر اُردو آبادی کے وجود کا کوئی تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اس تر لئے ضروری ہے کہ بازار میں اُردو کا چلن ہو۔ روزگار اور کاروبار میں اس کا ہو۔ دفتروں اور محکموں میں اس کا استعمال کیا جائے۔ وہ محض شوق کی نہیں کام کی زبان ہو اور اس کا مطالعہ تفریح طبع کے ساتھ علم و ہنر کے لئے بھی کیا جائے۔

ان مقاصد کے حصول کا واحد طریقہ یہ معلوم ہوا کہ دستور کی دفعہ ۳۴۵ کے مطابق سر زبان کے قانون میں باضابطہ ترمیم کر کے اُردو کو بھی ایک سرکاری زبان بنا دیا جائے۔

پہلا ۱۹۶۲ء سے انجمن ترقی اردو بہار نے اپنا نصب العین اس مطالبے کو بنا لیا یہاں تک کہ ۱۹۶۵ء میں اردو کو ایک الیکشن ایشو بنانے کا فیصلہ کیا گیا اور ۱۹۶۷ء کے عام انتخابات میں اس فیصلے پر عمل بھی کیا گیا۔ نتیجے کے طور پر اس سال بننے والی ملی جلی سرکار نے اپنے ۳۳ نکاتی پروگرام میں اردو کو بہار کی دوسری سرکاری زبان بنانا بھی شامل کر لیا۔ لیکن یہ وعدہ وفا نہ ہوا۔

۱۹۸۰ء کے انتخابات میں کانگریس نے انجمن کے ساتھ گفت و شنید کر کے اپنا جو منشور مرتب کیا اس میں اس نے اردو کو ایک سرکاری زبان بنانے کا عہد کیا اور نئی وزارت بنتے ہی اس عہد کو پورا کرنے کا اعلان بھی کابینہ میں فیصلہ کر کے دیا مگر اس فیصلے پر عمل درآمد میں تاخیر ہونے لگی جس طرح ۱۹۶۷ء میں ہوئی تھی تو انجمن ترقی اردو بہار نے ایک زبردست عوامی تحریک چلائی اور راست اقدام تک کا الٹی میٹم دے دیا جس کا اثر یہ ہوا کہ نومبر ۱۹۸۰ء میں آرڈیننس، پھر دسمبر ۱۹۸۰ء میں ایک ترمیمی بل کے ذریعے دفعہ ۳۴۵ کے تحت بہار میں انجمن کے مطالبے کے مطابق اردو کو باضابطہ آئینی طور پر سرکاری زبان قرار دے دیا گیا اور اپریل ۱۹۸۱ء میں اس قانون کے نفاذ کے پہلے مرحلے پر پندرہ اضلاع میں بلاک سے ضلع تک ضروری مقاصد کے لئے اردو کے سرکاری استعمال کے احکام جاری کر دیئے گئے۔ اس کے بعد ان احکام پر عمل درآمد کے لئے تقریباً ایک ہزار سند یافتہ اردو داں مترجموں اور ٹائپسٹوں کا تقرر ان کی لیاقت کے مطابق کیا گیا۔

اس سلسلے میں قانون اور نفاذ قانون کے حقائق حسب ذیل ہیں۔

بہار راج بھاشا (ترمیمی) ایکٹ ۱۹۸۰ء (بہار اسمبلی و کونسل سے منظور شدہ)

ریاست بہار کے مخصوص علاقوں میں سرکاری کام کاج کے لئے اردو زبان کو دوسری سرکاری تسلیم کرنے کے مقاصد سے بہار راج بھاشا ایکٹ ۱۹۵۰ء میں ترمیم کرنے کے لئے ایکٹ جمہوریہ ہند کے ۳۱ ویں سال میں ریاست بہار کے ودھان منڈل کے ذریعہ مندرجہ ذیل شکل میں یہ ایکٹ ہوا۔

۱۔ مختصر نام، نفاذ اور آغاز۔ یہ ایکٹ بہار راج بھاشا (سنشودھن) ادھینیم ۱۹۸۰ (بہار آفیشیل لینگویجز امنڈمنٹ ایکٹ ۱۹۸۰ء) کہلائے گا۔ اس کا اطلاق ریاست بہار کے ان علاقوں میں ہوگا اور یہ اس تاریخ سے لاگو ہوگا جو ریاستی حکومت اعلانیہ کے ذریعے طے کرے۔

دوسری سرکاری زبان: ریاستی حکومت وقتاً فوقتاً گزٹ میں اعلانیہ شائع کرکے ہدایت دے گی کہ مذکورہ اعلانیہ میں بتائے گئے علاقے میں اردو بولنے والوں کے لئے ہندی کے علاوہ اردو زبان بتائے گئے کاموں میں دوسری سرکاری زبان کی حیثیت سے استعمال کی جائے گی۔

بہار آفیشیل لنگویجز (امنڈمنٹ) آرڈی ننس ۱۹۸۰ء (بہار آرڈی ننس نمبر ۴۴، ۱۹۸۰ء) اس ایکٹ کے ذریعے منسوخ کیا جاتا ہے۔

ایسے اعلان کے ہوتے ہوئے بھی مذکورہ آرڈی ننس کے ذریعے یا اس سے حاصل شدہ اختیارات کے تحت کیا گیا کوئی کام یا کی گئی کوئی کارروائی قانونی سمجھے جائیں گے گویا یہ ایکٹ اس دن عمل میں تھا جس دن ایسا کام کیا گیا تھا یا ایسی کارروائی کی گئی تھی۔

حکومت بہار / بہار سرکار محکمہ سرکاری زبان / راج بھاشا وبھاگ کے ذریعے جاری دو اعلانات کے حوالے ۱۔ نمبر ۳/ سی ۳۔ ۶۱۸/۷۷/۶۶۱ / راج بھاشا، ۷ / اپریل ۱۹۸۱ء

اس کے تحت حکومت بہار نے گورنر بہار کے حکم اور راجیشور پرساد سنہا کمشنر و سکریٹری کے دستخط سے ریاست کے بروقت ۱۵ ضلع میں اردو کی سرکاری حیثیت کے قانون کے نفاذ کے سلسلے میں فی الحال سات کاموں کے لیے اردو کے سرکاری استعمال کے باضابطہ احکام جاری کیے ہیں۔

نمبر ۳/ سی ۳۔ ۶۱۸/۷۷/۶۶۱ / راج بھاشا ۸ / اپریل ۱۹۸۱ء

عنوان: دوسری سرکاری زبان کی حیثیت سے اردو کا استعمال اس اعلان میں کیا گیا ہے کہ ریاست کے صدر مقام سے بلاک سطح تک سرکاری استعمال کے لئے اردو کے شعبے کی تشکیل کس طرح کی جائے گی۔

پندرہ اضلاع

پٹنہ، کیٹہار، دربھنگہ، سیتامڑھی، بھاگلپور، مدھوبنی، بیگوسرائے، مظفرپور، سہرسا، مشرقی چمپارن، نوادہ، دھنباد، مغربی چمپارن، گیا، سمستی پور

مقاصد: (۱) اُردو میں درخواستوں اور عرضیوں کی وصولی اور اُردو میں ان کا جواب۔ (۲) اُردو میں لکھی دستاویز کا رجسٹریشن آفس کے ذریعے منظور کیا جانا۔ (۳) اہم سرکاری قواعد، حکم نامے اور اعلانیہ کی اُردو میں بھی اشاعت (۴) عوامی اہمیت کے سرکاری احکام اور ہدایات کا اُردو میں بھی جاری کیا جانا۔ (۵) اہم سرکاری اشتہارات کی اُردو میں بھی اشاعت۔ (۶) ضلع گزٹ کے اُردو ترجمے کی بھی اشاعت (۷) اہم سائن بورڈوں کا اُردو میں بھی لکھا اور لگایا جانا۔

جن سات کاموں کے لیے ابھی اُردو کا سرکاری استعمال ہو رہا ہے ان سے اُردو آبادی کی دو عام ضروریات پوری ہو جاتی ہیں جن کا تعلق محکموں اور دفتروں سے ہے سنہ ۱۹۸۱ء میں ۳۴ اضلاع میں سے ۱۵ ضلعوں میں اُردو کے سرکاری استعمال کے احکام جاری کیے گئے تھے جب کہ بعد میں اضلاع کی نئی تقسیم و تنظیم ہونے سے ان کی تعداد اب ۳۹ ہو گئی ہے اس لحاظ سے گویا مزید ۲۴ اضلاع میں قانون اُردو کا نفاذ ہونا ہے اگرچہ نئی تقسیم ان پندرہ اضلاع میں سے بعض میں بھی ہوئی ہے جنھیں پہلے بھی لیا جا چکا ہے اس طرح عملاً تقریباً ۲۰ یا ۲۱ اضلاع اور باقی ہیں انجمن ترقی اُردو بہار مسلسل حکومت سے مطالبہ کر رہی ہے کہ باقی ماندہ اضلاع میں بھی اُردو کے سرکاری استعمال کے احکام جلد جاری کیے جائیں گے اور حکومت پیہم یقین بھی دلاتی اور اعلان بھی کرتی رہی ہے کہ وہ مزید اضلاع میں قانون اُردو کا نفاذ کرے گی مگر ابھی تک اس سلسلے میں ضروری احکام جاری نہیں ہوئے ہیں۔

اس دوران میں حکومت کا محکمہ راج بھاشا قانون اُردو کے نفاذ کے سلسلے میں کبھی غفلت اور کبھی شرارت کرتا رہا ہے مثلاً ایک بار اس نے ۱۵ اضلاع میں اُردو کے سرکاری استعمال کا جائزہ لینے کی تحقیقی کوشش کی جس کا مقصد محض یہ تھا کہ دفتر شاہی کی بدعنوانیوں اور عوام الناس کی کوتاہیوں کے

بہت [illegible] اُردو کے سرکاری استعمال میں جو رکاوٹ پیدا کی جا رہی ہے اُسے [illegible]
شکایت پیدا کی جاتی ہے [illegible] مسائل [illegible] یہ بہت اہم بات ہے
اُردو ٹرانسلیٹروں اور اسسٹنٹ ٹرانسلیٹروں اور ٹائپسٹوں کی تنخواہ میں مزید اضافے کے لئے
انجمن ترقی اُردو مؤثر کوشش بھی کر رہی ہے انجمن ان معاملات کو عوام کے سامنے رکھنے کے ساتھ ساتھ ان کے لئے
حکومت سے بھی گفت و شنید کرتی رہی ہے چنانچہ ۲۸ مارچ ۸۶ء کو سابق وزیر اعلیٰ ستیندر نرائن سنہا نے
انجمن کے وفد کی پیش کردہ یادداشت پر گفتگو کرتے ہوئے یقین دلایا ہے کہ قانون اُردو
نفاذ میں جو مسائل پیدا ہو رہے ہیں انجمن کو ان کے بارے میں اُردو کے تعلق سے ہدایات جاری ہوئے اور برق
مزید دس اضلاع میں اُردو کے سرکاری استعمال کے احکام جاری کئے جائیں گے۔

بہار میں اُردو کی تعلیم کی جو سہولتیں ہر سطح پر ہیں ان کا کوئی تصور کسی دوسری ریاست میں نہ
کیا جا سکتا۔ شاید اُردو کے سب سے زیادہ طلبا و اساتذہ بہار ہی میں ہیں جن کی مجموعی تعداد ممکن ہے
ملک کی دیگر ریاستوں کی کل تعداد سے بھی زیادہ ہو اس کے باوجود ریاست کے اُردو داں حکومت
ان کوتاہیوں کی شکایتیں اکثر کرتے رہتے ہیں جو مذکورہ سہولتوں کے حصول میں دشواریاں پیدا کرتی ہیں
پرائمری و مڈل کلاسوں میں سرکاری فیصلہ و ہدایت یہ ہے کہ پڑھنے والوں کی شرط کے بغیر جہاں کہیں کم
کم اُردو آبادی بھی ہو وہاں اُردو کی تعلیم کا بندوبست لازماً کیا جائے چنانچہ جب اس معاملے میں دفتر شاہی
کوتاہی ہوتی ہے تو اس کی سخت شکایت کی جاتی ہے یونیورسٹی کی سطح پر تقریباً تمام کالجوں میں اُردو کے
قائم ہیں مگر اُردو دوستوں کا مطالبہ ہے کہ کمیشن کی منظور شدہ سفارشات کے مطابق ہر کالج
یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو میں اساتذہ کی مطلوبہ تعداد اور ان عہدوں پر ان کی ترقی کی گنجائش ہونی چاہیے
تعلیمی اداروں کو حکومت کی تحویل میں لئے ہوئے اداروں کے برابر تنخواہیں اور دیگر سہولتیں دی گئی ہیں
ان کی ادائیگی میں بعض اوقات غیر معمولی تاخیر کے سبب عدم مساوات کی صورت پیدا ہوتی نظر آ
جس سے شدید احتجاج ہوتا ہے جس کا مظاہرہ انجمن کے وفد کی ملاقات میں ہو چکا ہے لیکن توقع
کہ جلد ہی وقت پر ان کی ادائیگی کا اعلان کیا جائے گا۔ یہی معاملہ بہار مدرسہ ایجوکیشن بورڈ سے ملحق مدرسوں [illegible]

مدارس اسلامیہ کا ہے۔

اس مختصر جائزے سے واضح ہوتا ہے کہ بہار میں اردو کے تحفظ سے زیادہ اس کی ترقی کے مسائل ہیں چونکہ اردو اب ریاست بہار کی دوسری سرکاری زبان ہے اور ہر سطح پر اردو کی تعلیم کے انتظامات بھی یہاں ہیں لہٰذا قانونی اردو کے مکمل و موثر نفاذ اور اردو کی تعلیم کے بڑے پیمانے پر بندوبست کے مسائل ہی فطری طور سے پیدا ہوتے رہتے ہیں جن پر اردو دوستوں کو پریشانی رہی ہے اس لیے وہ اپنے آئینی و جمہوری حقوق چاہتے ہیں محض مراعات نہیں خواہ حقوق کے مکمل حصول میں کتنی ہی دشواریاں ہوں۔

اب بہار میں اردو تحریک اور اس کی نمائندہ تنظیم انجمن ترقی اردو بہار کی جد و جہد یہ ہے کہ اردو کی ترقی کے لیے جو قانون اس نے حکومت سے منظور کرایا ہے اور جو احکام وہ جاری کرا چکی ہے ان پر پورا پورا عمل جلد از جلد ہو تاکہ اردو آبادی کو اطمینان ہو کہ جمہوریۂ ہند میں اس کی آئینی آزادیاں برقرار ہیں اور وہ دستورِ ہند کی دی ہوئی تمام سہولتوں سے دوسرے شہریوں کے برابر فائدہ اٹھا رہی ہے۔

حکومت بہار نے ۱۶ اگست ۱۹۸۹ء کو ایک گزٹ نوٹیفکیشن جاری کر کے باقی ۱۳ اضلاع میں بھی اردو کے سرکاری استعمال کے احکام جاری کر دیئے ۔۔۔

(بقیہ سلسلہ ص ۳۶ سے آگے)

میری ایک نظم کو حکومت بہار نے تیسرے درجے کی جماعت کے نصاب میں شامل کر رکھا ہے
ان دنوں میں مضامین، تبصرے، غزلیں، نظمیں حسب معمول لکھ رہا ہوں۔ نیا مجموعہ زیر ترتیب ہے۔

اظہر: جناب مظفر صاحب آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے میرے سوالات کے جوابات تفصیل سے دیئے۔ ایک بار پھر شکریہ ۔۔۔ خدا حافظ

مظفر: فی امان اللہ

یوسف ناظم

(بمبئی)

تراش خراش

سنا گیا ہے کہ آئندہ سے وزراء صاحبان تقریر کے موقع پر انہیں مطبوعہ حلف ناموں کے ساتھ ساتھ استعفیٰ ناموں کے دو دو فارم بھی فراہم کیے جائیں گے۔ یہ خبر بی بی سی سے نشر ہوئی ہے۔

★

ہمارے ایک قومی لیڈر نے یہ بیان دیا ہے کہ وزیر اعظم کو اتنی آسانی سے مستعفی نہیں ہونا چاہیے۔ شرح دیوان غالب میں اس نثری شعر کا مطلب یہ درج ہے کہ استعفیٰ تو دینا چاہیے لیکن ذرا مشکل سے۔

★

بنارس کے پہلے صرف بنارسی پان بنارسی ساڑیاں اور بنارسی لنگڑا آم مشہور تھے۔ اس سال ایک اور چیز مشہور ہو گئی۔۔۔ بنارسی داس گپتا۔

★

ان دنوں اسکول کے بچوں کی پیٹھ پر جتنا علم لادا جاتا ہے اتنا علم تو ہمارے آباء و اجداد نے برسوں میں بھی حاصل نہیں کیا تھا۔ کچھ والدین سوچ رہے ہیں کہ بچوں کی نصابی کتابیں خریدتے وقت ایک بچہ گاڑی بھی خرید لیں تاکہ ان کے بستے، پانی کی بوتلیں اور کھانے کے ڈبے سب ان بچہ گاڑیوں میں گھر سے اسکول تک لے جائے جاسکیں۔ بڑی جماعت کے بچوں کے لئے

ہاتھ گاڑی کا بہ مطابق کیا جانے والا ہے۔ بچہ ساتھ ساتھ پیدل جائے گا۔

★

سنا گیا ہے کہ حکومت یہ سوچ رہی ہے کہ تعلیمی اداروں میں داخلے کے لئے جو عطیے وصول کیے جاتے ہیں وہ بند کر دیئے جائیں۔ اول تو سوال یہ ہے کہ حکومت کیا کیا بند کرے گی دوسرا سوال یہ ہے کہ حکومت سوچتی بہت ہے۔

★

بہار میں ایک اردو ٹائپسٹ کا آٹھ مہینوں میں دس مرتبہ تبادلہ کیا گیا ہے (تبادلوں کی بہار ہے) لیکن یہ کوئی ایسی اہم خبر نہیں ہے۔ کچھ ریاستوں میں تو ان کارکنوں کے بھی تبادلے کئے جاتے ہیں جنھیں وفات پا کر دو تین سال ہو چکے ہیں۔ اصل میں تبادلہ ایک دفتری کارروائی ہے جو حسب معمول جاری رہنی چاہئیے۔ عملے کے لوگ اگر تبادلے دینے سے پہلے وفات پا جاتے ہیں تو یہ قدرت کا انتظام ہے سرکار کا نہیں۔ کسی بھی ریاست کی سرکار قدرت کے کاموں میں دخل نہیں دے سکتی۔

★

پٹرول میں بچت کی خاطر ایک ریاست کے چیف منسٹر نے سائیکل استعمال کرنی شروع کر دی ہے اندیشہ ہے کہ سرکاری گوداموں میں سائیکلوں کی کمی کی وجہ سے کہیں ڈبل سواری کی رسم شروع نہ ہو جائے جس صورت میں اپنے وزیر مملکت کے کیریر پر بیٹھا نظر آئے گا۔

★

پتہ چلا ہے کہ ہمارے بے حد مقبول اور بہت زیادہ بکنے والے مشروبات میں کچھ ایسے اجزاء بھی شامل ہیں جو ہماری صحت کے لئے بہت مضر ہیں۔ اچھا ہوا کہ بہ سال کے اندر ہی اندر یہ بات سامنے آگئی۔ کچھ یادوں تحقیقات میں اتنی تیز رفتاری اس سے پہلے استعمال نہیں کی گئی تھی اس طرح ٹوتھ پیسٹ کے بارے میں بھی یہ انکشاف عوام الناس کی سماعت تک پہونچایا گیا ہے کہ اس میں جو فلورائیڈ نام کی شے ہے وہ بھی دانتوں کے لئے مضر ہے ... ویسے اس قسم کی معلومات سے عوام الناس کو کوئی خاص فائدہ

نہیں پہونچتا۔ وہ اس سے بھی زیادہ صرف اشیاء استعمال کرکے ثابت و سالم ہیں۔ وہ ایسے ٹی وی کے ذریعہ یہ اچھی اچھی باتیں بھی سیکھ رہے ہیں مثلاً کھانا کھانے سے پہلے ہاتھ دھونا وغیرہ۔ باہر کے سیاح جب ہندوستان آتے ہیں تو ٹی وی پر اس قسم کے اشتہار دیکھ کر اپنے اپنے گائیڈ سے پوچھتے ہیں کہ کیا ہندوستانیوں میں ہاتھ دھوکر کھانے کا طریقہ ابھی ابھی شروع ہوا ہے اور کیا وہ لوگ کھانا کھانے کے بعد بھی ہاتھ دھوتے ہیں۔

★

تحقیقات کے ذکر پر یاد آیا کہ صحت عامہ کے عالمی ادارے نے بتایا کہ ساری دنیا میں تمباکو نوشی کی وجہ سے ہر سال تین ملین آدمی وفات پاتے ہیں۔ اس میں ہندوستان کے غالباً ایک لاکھ آدمی شامل ہوں گے۔ شکر ہے کہ ہماری سرکار نے تمباکو نوشی کے خلاف حال حال میں بہت سخت قدم اٹھائے ہیں (جب سرکار کوئی قدم اٹھاتی ہے تو سخت ہی اٹھاتی ہے) اور دفتروں میں ٹرینوں میں بسوں میں سگریٹ نوشی قطعی ممنوع ہے۔ ٹی وی پر تھوڑے سے بہت اشتہارات سگریٹوں کے مزید دکھائے جاتے ہیں لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا ہے کہ سرکار سگریٹ نوشی کی مخالف نہیں ہے۔ کچھ لوگ کہہ رہے تھے کہ سرکاری جگہوں پر سگریٹ نوشی کی مخالفت کی وجہ سے پولیس تھانوں پر جو کارروائیاں ہوتی تھیں ان میں خلل پڑ گیا ہے ملزموں سے اقبالِ جرم کروانے میں اب جلتی سگریٹوں کا استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا بدل کیا سوچا گیا ہے پتہ نہیں۔

★

یہ داڑھی کا معاملہ بھی عجیب ہے کہیں نہ کہیں مزید زیر بحث آ جاتی ہے تازہ خبر یہ ہے کہ واشنگٹن میں کسی ہندوستانی کو ایک پارسل کمپنی نے ڈرائیور کی نوکری دینے سے صرف اس لئے انکار کر دیا کہ امیدوار کی داڑھی تھی اس شخص نے متعلقہ محکمے میں اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے اپنا مقدمہ درج کروایا ہے اور یہ کہا ہے کہ یہ سراسر ناانصافی ہے کیونکہ خود امریکہ کے صدر ابراہام لنکن بھی باریش تھے۔ یہ دلیل ہمیں پسند نہیں آئی۔ کسی ملک کے صدر کے اختیارات بہت وسیع ہوتے ہیں وہ چاہیں داڑھی رکھیں یا کچھ اور۔ اس

زہ عوام نہیں اٹھا سکتے۔ داڑھی تو خیر اللہ کی اپنی چیز ہوتی ہے جسے وہ چاہیں رکھیں یا منڈوائیں مونچھ تو اتنے تیار ہوتے ہیں کہ دوسروں کی چیزیں بھی رکھ سکتے ہیں۔

ہاں اس بات کی ہم تائید کریں گے کہ دین یا ٹرک چلانے میں ڈرائیور کی داڑھی حارج نہیں ہوتی۔ ، ڈرائیور کی تو نشست بھی علاحدہ ہوتی ہے اس لئے داڑھی سے کسی کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہیں ہے شنگٹن میں کس کا انفعال کیوں ہو رہا ہے۔ وہ وضاحت کریں کہ عہدیدار کا خلاف ہونا ضروری ہے ڑی مونچھ کا کوئی بکھیڑا نہیں ہو گا اور جو فاصلے ہوں گے وہ الگ!

★

ہمارے یہاں ایک طریقہ قدیم ہے وہ یہ کہ جتنی بھی ملازمتیں ہوتی ہیں وہ سب کی سب عارضی ہوتی ہیں سرکاری دفتروں میں اگر کوئی شخص ۲۵ بیس سال تک عارضی نہیں رہتا تو اسے بدقسمت سمجھا جاتا ہے اور ہے خوش قسمت ملازمین وہ ہوتے ہیں جنہیں وظیفے پر سبکدوش ہونے کے بعد مستقل کیا جاتا ہے ہی ہمارے یہاں عارضی وظیفہ یابوں کا طریقہ شروع نہیں ہوا ہے لیکن امید ہے کہ یہ سلسلہ بھی جلد ہی شروع ہو گا۔

★

دوسری زبانوں میں کیا قاعدہ ہے وہ تو ہمیں ٹھیک سے نہیں معلوم۔ لیکن اردو میں یہ قاعدہ برسوں سے چلا آ رہا ہے کہ اگر کسی ایک ادیب کو کوئی ایوارڈ یا اعزاز ملتا ہے تو وہ خود تو خوشی سے نہیں پھولتا لیکن باقی سارے ادیبوں کے منہ ضرور پھول جاتے ہیں۔

★

آج کل اخبار پڑھتے ہوئے نہیں چلتا کہ یہ تازہ ہے یا کئی سال پرانا۔ چند ہی دن پہلے ایک اخبار میں مغربی ملک میں انتشار پھیل رہا ہے یہ خبر تو پرانی ہے ہمیں تو یاد پڑتا ہے کوئی دس سال پہلے ہم نے یہ خبر پڑھی تھی اور اب ملک تو پھیلنے سے رہا انتشار ہی پھیل سکتا ہے انتشار کا اندازہ کرنا ہو تو سوچئے کہ جتنی چادر ہے اتنے [illegible] اور اسے اگر گرم ہوا ہم پہنچا دیں تو یہ پھیلتا ہی چلا جاتا ہے

ڈاکٹر مجید بیدار
مولانا آزاد کالج - اورنگ آباد

بی - ایم - برلا سائنس میوزیم

نوبت پہاڑ کی بلندی پر جہاں براق جیسی شفاف اور پرشکوہ برلا مندر کی عمارت ہر آنے والے کو دعوت نظارہ دیتی ہے وہیں اسی کے دامن میں ایک چار منزلہ خوبصورت عمارت جدید سائنس اور ٹکنالوجی کی کرشمہ سازیوں کو عوام تک پہنچانے کے لئے مختص کی گئی ہے اور اس عمارت کا نام "بی ایم برلا سائنس میوزیم" رکھا گیا ہے دس کروڑ کے سرمایہ سے اس عمارت کی تعمیر کا آغاز مارچ ۱۹۸۶ء میں کیا گیا جس کی تکمیل پر ۱۶ مارچ سال رواں کو آندھرا پردیش کے چیف منسٹر ڈاکٹر ایم چنا ریڈی نے اس عمارت کو عوامی استفادہ کے لئے کھول دیا چنانچہ ہر روز یہاں کئی سو سیاح سائنس کی ترقیات کا عملی مشاہدہ کرنے کے لئے آتے اور تحسین و آفرین کے کلمات ادا کر کے جاتے ہیں۔

بی ایم برلا سائنس میوزیم کی عمارت زمینی منزل کے علاوہ مزید ۳ منزلوں کی ہے اور ہر منزل کا احاطہ ۲۳ ہزار فیٹ ہے استقبالیہ سے وابستہ افراد نے بتلایا کہ ۱۰ کروڑ سے شروع ہونے والے اس پراجکٹ کی ۷۵ فیصد رقم استعمال میں لائی جا چکی ہے جبکہ ۲۵ فیصد رقم استعمال ہونے سے ابھی موجود ہے اس میوزیم کے ڈائرکٹر ڈاکٹر بی جی سدھا کر ہیں جو کہ [illegible] انجینئرنگ کے علاوہ چیف انجینئرس، سیول انجینئرس کے ہمراہ سول افراد اس تکمیل کی میل تک ہوتے ہیں میوزیم کے کام اور [illegible] کی نگرانی کے لئے [illegible] افراد کا بندوبست کیا گیا ہے۔ میوزیم کے ملازمین کو رہائش [illegible] کی [illegible] کے لئے مستقبل میں [illegible] کی تعمیر کا منصوبہ بھی زیر غور [illegible] سائنس [illegible]

ب الداخلہ کے بعد ایک وسیع ہال ہے جہاں وردی پوش سپاہی مستعد نظر آتے ہیں آہنی کھڑکیوں سے مزین دروازوں سے گذر کر اندر پہنچنے پر سائنس کی ترقیات کی تصاویر اور عملی صورت میں دیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ چنانچہ میوزیم کی اس بالائی منزل میں کمپیوٹر ورلڈ، میکانکس، حسابی عمل، میچ، گورکھ دھندوں کے سائینسی نظارے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ میوزیم میں براعظم انٹارٹیکا کی ۸ قد آدم تصاویر لگائی گئی ہیں فرانس سے حاصل کردہ ہے اور ہر تصویر میں اس براعظم کی جغرافیائی اور فطری خصوصیت کو واضح کیا گیا۔ عام طور پر عمارتوں کی تعمیر زمینی سطح سے بالائی سطح پر سفر کرنے کی نوعیت کی ہوتی ہے لیکن برلا سائنس میوزیم کی عمارت کی خصوصیت یہی ہے کہ اس عمارت میں بالائی منزل سے زمینی سطح کی منزل کی جانب سفر کرنا پڑتا ہے۔ حیدرآباد میں اس انداز کا تجربہ آصفیہ لائبریری کی عمارت کے ذریعہ کیا جاچکا ہے۔

نظری آلات OPTICS کے ذریعے اس میوزیم میں ہینڈلم طرز کی سائنس کو واضح کیا گیا ہے۔ آرشمدس اسکرو، کمان برج، برستے گولے، ہوائی کیبن، آواز کا ارتعاش اور سائنس کی ترقی کی ترجمانی کرنے والے بے شمار معاملات کو عملی شکل میں دکھایا گیا ہے۔ میوزیم میں پرتھوی اور ترشول جیسے ہندوستان میں داغے جانے والے میزائل کے نمونے رکھے گئے ہیں تجربات اور الکٹرانکس کے زیر عنوان تہرہ اور اس کے تاثرات کے علاوہ غیر متحرک طرز، پلازما گلوب اور آواز کو ارتعاشی شکل میں رکھا گیا ہے جو ایک نظری کارنامہ کہلانے کا مستحق ہے میوزیم میں دستکاری، ڈرائنگ کے علاوہ روزمرہ زندگی کے معمولات کو بھی سائینسی انداز پر سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ گرہ ڈالنا، اس کی مختلف قسمیں، خلاء، خلا کا عمل، حساب کے مختلف انداز، کرۂ مثلث، غرض ہر طریقہ کو انسانی ذہن تک پہنچانے کے لئے سائینسی طریقہ کا سہارا لیا گیا ہے اس کے باوجود سائنس کے کئی پہلوؤں کی تشریح باقی ہے چنانچہ قوت، گرمی اور کرنٹ سے ہونے والی سائینسی کرشمہ سازیوں کو میوزیم کے حسن میں اضافے کے لئے استعمال کیا جانا چاہیئے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اکروڑ سرمایہ کا بہت بڑا حصہ عمارت بنانے اور تاریخی آثار جمع کرنے پر خرچ کیا گیا ہے چنانچہ سائنس میوزیم میں آرٹ گیلری، آلات حرب، چینی کے ظروف کانچ کے ظروف، لکڑی اور کارچوبی کام کی نمائش بڑی عجیب دکھائی دیتی ہے چینی کے بنے ہوئے پرندے، ناچتی ہوئی عورتوں کے مختلف اسٹائیل، قدیم مندروں کے چوبی دروازے، تانبہ اور پتھر کی مورتیاں اس میوزیم کی دو

منزلوں میں محفوظ کی گئی ہیں لیکن ان کا سائنس سے تعلق سمجھ میں نہیں آیا۔ اگر مجسمہ سازی کا ظریف سازی اور جو اہکام کو سائنس کی صنعت میں شامل کیا گیا ہے تو میوزیم کے ارباب مجاز کو چاہئے تھا کہ وہ بیونی صنعت ہینڈ پارچہ بافی کی صنعت کی نمائندگی پر بھی متوجہ ہوتے۔ البتہ یہ ماننا ہے کہ آج تک انسان کے ارتقائی مراحل، قبل مسیح کے دور کے مٹی کے برتن، قلمی کتابیں، تاڑ کے پتوں پر تحریروں سے اندازہ ہوتا ہوتا ہے کہ اس میوزیم میں سائنس کے نام پر قدیم آثار سے رغبت کو نمایاں کیا گیا ہے۔ ہندوستانی قوموں کی اس سے بڑھ کر اور کیا بدقسمتی ہو سکتی ہے کہ یورپی قومیں مستقبل کی تلاش میں نکل کر ایجادات و اختراعات کے نئے در کھول رہی ہیں اور ہندوستانی قومیں ابھی ماضی میں گم ہو کر اسی کو گلے سے لگائے ہوئے ہیں۔ غرض ضرورت اس بات کی ہے کہ اس سائنس میوزیم کو سائنسی طرزِ عمل سے وابستہ رکھا جائے نہ کہ سائنس کے نام پر کسی مذہب یا فرقہ کی تشہیر کے لئے استعمال کیا جائے۔ برلا سائنس میوزیم حقیقی معنوں میں سائنس کی کرشمہ سازیوں کی بہتر طور پر نمائندگی کر سکتا ہے اور ایسے ماضی کے جھروکوں میں جھانکنے سے پرہیز کرتے ہوئے موجودہ سائنسی ترقیات اور ٹکنالوجی کو میوزیم میں مجتمع کرنا چاہئے۔ شریمتی نرملا برلا کا عطیہ دیا ہوا آرٹ گیلری کا منظر بہت خوب ہے اقبال آرٹسٹ نے شیواجی کے دربار کا منظر، رام چندر جی کے استقبال مہابھارت کے منظر، جہانگیر اور نورجہاں کے مناظر اور ایسے ہی بے شمار مرقعوں کو رنگوں میں قید کر دیا ہے جو عمدہ ہونے کے علاوہ جاذب نظر ہے۔ اقبال آرٹسٹ کی طرح دیگر اقلیتی فنکاروں کے کارناموں کو اس سائنس میوزیم میں محفوظ کرنے کی ضرورت ہے یہ میوزیم ابھی اپنی بنیادی منزل میں ہے۔ لیکن امید ہے کہ بہت کم وقت میں یہ ایشیا کا بہترین سائنس میوزیم بن جائے گا۔ اس توقع کا دارومدار برلا سائنس میوزیم کے کارکنوں ڈائرکٹر کی محنت پر ہے اور یقین ہے کہ میوزیم سے وابستہ افراد عوام کی خواہش کا احترام کریں گے۔

- ◆ مضمون نگار حضرات اپنی تخلیقات صاف اور خوشخط روانہ کریں۔
- ◆ تبصرے کے لئے رسالہ، مجلہ یا کتاب کی دو جلدوں کا آنا ضروری ہے۔

باب

شہباز حسین نئی دہلی

فرقہ واریت کا مقابلہ

وقت کی اہم ترین ضرورت

ہندوستان کو قدرت نے اپنی فیاضیوں سے نوازا ہے۔ ہرے بھرے درخت، جنگل، پہاڑ، لہلہاتے کھیت، گنگناتی ندیاں، اَن گنت معدنیات، طرح طرح کے موسم، پھل اور بھانت بھانت کے لوگ، دنیا کی ہر نسل کے نمائندے، رنگا رنگ تہذیبیں، قسم قسم کی بولیاں اور زبانیں، ریت رواج، رسمیں اور مذاہب سبھوں نے مل کر ہندوستان کو ایک حسین گلدستہ، ایک خوبصورت مرقع بنا دیا ہے۔ جہاں اس تنوع اور رنگا رنگی نے اس ملک کو حسن اور دلکشی عطا کی ہے۔ وہاں بعض مسئلے بھی پیدا کر دیئے ہیں مگر وہ ایسے نہیں ہیں کہ انہیں حل نہ کیا جا سکے۔

ہندوستان ایک جغرافیائی وحدت ہے۔ ریاستیں الگ الگ ہیں، زبانیں الگ ہیں، کلچر الگ ہیں، مذاہب جدا ہیں لیکن ان سب کو اس جغرافیائی وحدت نے ایک لڑی میں پرو رکھا ہے۔ سبھوں کے اشتراک اور تعاون سے یہ ملک صدیوں سے علم و ادب اور تہذیب و ثقافت کا گہوارہ بنا ہوا ہے اور آج بھی ایسے ممالک میں شمار کیا جاتا ہے جسے اقوامِ عالم کی برادری میں عزت و افتخار حاصل ہے۔ لگ بھگ دو سو برسوں کی نوآبادیاتی لوٹ کھسوٹ اور استحصال کے بعد جب ملک آزاد ہوا تو مقامی قومی حکومت نے ملک کی تعمیر و ترقی کا کام شروع کیا اور ملک گیر پیمانے پر پنج سالہ پلانوں کے ذریعہ تعمیری دور کا آغاز ہوا۔ مگر برسوں کی نوآبادیاتی لوٹ کھسوٹ نے ملک کو بالکل کنگال بنا دیا تھا۔ لہٰذا

جتنے وسائل کی ضرورت تھی وہ ایک بار مہیا نہیں ہو سکتے تھے۔ اس کے علاوہ ترقیاتی عمل میں ریاستی حکومتوں اور وہاں کے رہنے والوں کا بھی بہت بڑا ہاتھ تھا۔ اس کے علاوہ یہ بھی ہوا کہ بعض طبقے جو مختلف سماجی اور سیاسی وجوہ کی بناء پر پچھڑ گئے وہ اس دوڑ میں دوسروں سے پیچھے رہ گئے۔ اس طبقہ میں ہریجن، آدی باسی، عورتیں اور بعض اقلیتیں شامل تھے۔ ان لوگوں میں یہ احساس پیدا ہوا کہ حکومت ان کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں کر رہی ہے۔ لہٰذا ان کی قیادت نے حکومت پر طرح طرح سے دباؤ ڈالا کہ ان طبقوں کی بھلائی کے لئے خصوصی اقدامات کئے جائیں اور حکومت نے کئی اقدام کئے بھی مگر جب وسائل محدود ہوں اور ملک کو ان گنت مسائل کا سامنا ہو تو کسی ایک فرقے یا طبقے کو کلی طور سے مطمئن نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس کوشش میں یہ بات نظر انداز ہو گئی کہ ملک کے مسائل سب کے مسائل ہیں، اگر ملک میں سڑک بنے گی نہریں جاری ہونگی، اسپتال کھلے، تعلیم کا پھیلاؤ ہو گا تو سبھی اس سے فائدہ اٹھائیں گے غریبی بے کاری، جہالت پورے ملک کا مسئلہ ہے کسی ایک فرقے کا نہیں اس نقطۂ نظر کو دھندلا کرنے میں بعض سیاسی پارٹیوں کا رول بھی افسوسناک رہا ہے اور مذہبی رہنماؤں کا بھی۔ جنھوں نے مسئلے کو خالص معاشی یا ترقیاتی نظریے سے دیکھنے کے بجائے فرقہ وارانہ عینک سے دیکھا۔ لہٰذا ایک طرف اقلیتوں میں یہ احساس پیدا کرا دیا کہ اس کو نظر انداز کیا جا رہا ہے اور دوسری طرف اکثریت کے ایک طبقے کو بدگمان کر دیا کہ اقلیتوں کی ضرورت سے زیادہ پذیرائی کی جا رہی ہے۔

تاریخی اسباب کی وجہ سے اس بدگمانی کو پھیلانے میں زیادہ دقت بھی پیش نہیں آئی مسلمانوں میں یہ خوف پہلے سے جاگزیں تھا کہ ایک جمہوری نظام میں تعداد کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور چونکہ وہ تعداد میں کم ہیں اس لئے اس نظام میں انہیں عزت و وقار حاصل نہیں ہو گا۔ لیکن یہ خوف بے بنیاد تھا اور آزادی کے ۴۰ سال کے بعد کے تجربے نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ جمہوری نظام نے اپنی ووٹوں کی جو طاقت بخشی ہے انہیں کوئی سیاسی طاقت نظر انداز نہیں کر سکتی۔ ملک کے جمہوری دستور نے بالکل برابری کا درجہ دیا ہے، اپنے ادارے قائم کرنے کی اجازت دی ہے مکمل مذہبی آزادی دی ہے اور حتیٰ کہ تبلیغ اور تبدیلی مذہب پر بھی کوئی رکاوٹ نہیں لگائی گئی ہے ملک کا دستور، عدلیہ اور جمہوری نظام اقلیت

کے لئے سب سے بڑی ضمانت ہیں ۔ لہذا انہیں سب سے زیادہ اس نظام کی حفاظت کرنا چاہئے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کو جو مخصوص مسائل درپیش ہیں ان میں سب سے تکلیف دہ اور قابلِ مذمت مسئلہ فرقہ وارانہ فسادات کا ہے جو بدقسمتی سے اب بھی برابر ہوتے جارہے ہیں۔ مرکزی اور ریاستی حکومتوں نے متعدد اقدام کئے۔ تحقیقاتی کمیشن بٹھائے گئے۔ قومی یکجہتی کونسل وجود میں لائی گئی، اقلیتی کمیشن قائم کیا گیا مگر ان سب کے باوجود فرقہ وارانہ فسادات ہوتے رہتے ہیں اور اکثر بڑے بھیانک ہوتے ہیں جن میں بہت بڑے پیمانے پر جان و مال کا نقصان ہوتا ہے ۔

حکومت کے اقدامات سے قطع نظر سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ذہنی رویوں کو بدلا جائے۔ ہماری تاریخ میں سیکڑوں نیم تاریخی اور غیر معتبر قصّے اور ذہنی اختراع کی مثالیں موجود ہیں جنھوں نے ذہنوں میں گھر کر لیا ہے۔ تعلیم کے پھیلاؤ اور شعور کی بالیدگی نے ان تعصبات کو کم تو کیا ہے مگر ابھی دلوں میں کدورتیں باقی ہیں جن کو احیاء پرست اور بنیاد پرست طاقتیں ہوا دیتی رہتی ہیں۔ اکثریت اور اقلیت کا تصور اب کوئی معنی نہیں رکھتا سارے ملک کے شہری ایک ہیں اور ایک جیسے حقوق کے مالک ہیں اور حکومت میں ساجھے دار ہیں مگر مذہب کے سوداگروں کو اپنی دکان چمکانے کے لئے یہ باور کرانا پڑتا ہے کہ ہم سب برابر نہیں ہے ۔ یہ بات بار بار کہی گئی اور جنگ آزادی کے زمانے میں بڑی شدت سے کہی گئی کہ ہندوستان میں ہندو مسلم مل کر ایک قوم بن سکتے ہیں مولانا آزاد نے بار بار لکھا

"مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ احکامِ شرع کو سامنے رکھ کر حضور[۴] پیغمبر اسلام کے اس اسوۂ حسنہ کو پیشِ نظر رکھ کر جو انہوں نے اہلِ مدینہ اور بت پرستوں سے مصالحت کرتے ہوئے دکھایا۔۔ ہندوستان کے ہندوؤں سے کامل سچائی کے ساتھ محبت کا پیمان باندھ لیں اور ان کے ساتھ مل کر ایک نیشن ہو جائیں۔ اس وجود مقدس نے عہد نامہ لکھا بجز اس کے الفاظ میں انہ امۃ واحدۃ یعنی سب مل کر ایک واحد اُمت بن جائیں۔ لیکن ہم نے دیکھا کہ یہ نقطۂ نظر قابلِ قبول نہ ہوا اور دو قومی نظریئے کی بنیاد پر ملک تقسیم ہو گیا اور پھر تقسیم شدہ حصہ دو حصوں میں بٹا۔ لہٰذا اب ہم اتنا تو کہہ سکتے ہیں کہ جن مسائل کو حل کرنے کے لئے اتنی

بڑی انسانی قربانی دی گئی تھی ان میں سے کوئی مسئلہ بھی حل نہ ہوا اور مزید یہ کہ زبان اور کلچر مذہب سے بڑی طاقت ہے۔ یہ حقیقت بھی سامنے آئی۔

ہندوستان کے ارد گرد جو دو ملک وجود میں آئے ہیں وہ مذہبی ملک ہیں مگر ہندوستان ایک سیکولر ملک ہے لہٰذا اصل مسئلہ یہی ہے کہ فرقہ پرستی کو کس طرح ختم کیا جائے خواہ یہ اقلیت کی ہو یا اکثریت کی۔

یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ فرقہ پرستی کا جواب فرقہ پرستی نہیں ہے۔ بُرائی کو بُرائی سے ختم نہیں کیا جا سکتا۔ اگر فرقہ وارانہ فسادات کا تجزیہ کیا جاتا ہے اور تو یہ زیادہ تر صورت نظر آتی ہے کہ مواد پہلے سے تیار کیا جاتا ہے اور پھر کوئی جھگڑا کا سامان پیدا کیا جاتا ہے جیسے جلوس پر پتھراؤ وغیرہ پھر فساد شروع ہو جاتا ہے اس کو روکنے میں یقیناً انتظامیہ اور پولیس کی بہت بڑی ذمہ داری ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہماری بھی کچھ ذمہ داری ہے۔ لہٰذا ہمیں اپنی ذمہ داری پوری کرنی چاہئیے خواہ دوسرے نہ کریں۔

ہماری ذمہ داری یہ ہے کہ ہم جس علاقے یا محلے میں رہتے ہیں وہاں ایک دوسرے سے سماجی رشتے قائم کریں، ایک دوسرے کے دُکھ درد میں شریک ہوں، تہواروں کے موقع پر ملیں۔ ایسے ادارے بنائیں جن میں دونوں فرقوں کے لوگ شامل ہوں۔ جیسے لائبریری، یوتھ کلب، مہیلا منڈل، سیاسی پارٹیوں میں زیادہ سے زیادہ شریک ہوں، انتظامیہ کے لوگوں سے میل جول رکھیں، فسادات کے بعد امن کمیٹیاں بنتی ہیں مگر پہلے سے ایسی کمیٹیاں بن جائیں جو حالات پر نظر رکھیں اور صورت حال کو بگڑنے نہ دیں تو بہت اچھا ہو۔ افواہوں پر قطعی یقین نہ کریں، بلکہ کشیدگی کے زمانے میں ایک دوسرے سے میل ملاپ زیادہ بڑھائیں۔

ایسا نہیں ہے کہ اکثریت میں سارے لوگ فرقہ پرست ہیں یا انتظامیہ کے سارے افسر مسلم دشمن ہیں۔ روابط رکھنے اور ملنے جلنے سے شبہ اور بے یقینی کم ہوتی ہے انتظامیہ کی ناکامی اکثر نااہلی کی وجہ سے بھی تعصب سے جیسے اکثر معاملوں میں دیکھنے آتا ہے ہمیشہ اس کی وجہ فرقہ پرستی نہیں

سا داب

بی۔ صبر وتحمل اور اشتعال انگیزی سے احتراز کر کے حالات کو بگڑنے سے بچایا جاسکتا ہے۔ بنیادی چیز انسانیت میں اعتماد ہے۔ ہمارے ملک میں بہت سے اخبارات ہیں جو پوری ایمانداری سے واقعات شائع کرتے ہیں سیکولر افراد اور جماعتوں سے مدد لینی چاہئے اور اپنے اوپر مکمل کنٹرول رکھنا چاہئے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حکومت اپنی ذمہ داری نہ نبھائے۔ شہری کے جان ومال کی حفاظت حکومت کا اولین فرض ہے۔

جناب وشوا ناتھ پرتاپ سنگھ کی قیادت میں قومی مورچے کی جو حکومت برسراقتدار آئی ہے اس نے پندرہ نکاتی پروگرام پر عمل درآمد کو بڑی اہمیت دی ہے۔ خود وزیراعظم کی قیادت میں کابینہ کی ایک کمیٹی تشکیل دی گئی ہے جس کی میٹنگ ہر ماہ ہوتی ہے اور پیش رفت کا جائزہ لیا جاتا ہے اور ریاستوں کو مناسب ہدایات دی جاتی ہیں۔

ان پندرہ نکات میں وہ تمام مسائل شامل ہیں جو اقلیتوں کی ترقی اور آبرومندانہ زندگی کے لئے ضروری ہے لیکن فرقہ وارانہ فسادات کے سلسلے میں ریاستی حکومت کو خاص طور سے تفصیلی ہدایت نامے جاری کیے گئے ہیں۔ جس میں کہا گیا ہے کہ مختلف سطحوں پر اسکریننگ کمیٹیاں بنائی جائیں جن میں علاقے کے ممتاز شہریوں کو شامل کیا جائے۔ تدارکی اقدامات میں بھی ان لوگوں کو شامل رکھا جائے۔

فرقہ وارانہ فسادات میں ملوث افراد کو سزا دینے کے لئے خصوصی عدالتیں قائم کی گئی ہیں۔ ایسی تین عدالتیں دہلی میں اور ایک ایک میرٹھ اور بھاگل پور میں قائم کی گئی ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ مجرموں کو جلد اور واقعی سزا ملے اور ان میں یہ احساس پیدا ہو کر فسادات برپا کرانے کے بعد وہ قانون کی گرفت سے نہیں بچ سکتے۔

پہلے مرنے والوں یا مستقل طور پر معذور ہو جانے والوں کو ۲۰ ہزار روپے بطور معاوضہ دیا جاتا تھا۔ جسے بڑھا کر اب پچاس ہزار روپیہ کردیا گیا ہے۔ فسادات میں ہلاک

ہونے والے کم آمدنی والے افراد کی بیواؤں کو ۵۰۰ روپے ماہوار پنشن دی جائے گی۔ ان احکامات پر یکم اپریل ۱۹۹۰ء سے عمل درآمد شروع ہو گیا ہے میرٹھ اور بھاگل پور میں فسادات سے متاثر ہونے والے زیادہ تر افراد مسلم ہیں ان کو دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑا کرنے کے لئے خصوصی امداد دی جا رہی ہے مرکز اور ریاستی انتظامیہ خصوصاً پولیس میں اقلیتوں کو مناسب نمائندگی دینے کی کوشش کی جا رہی ہیں یہ بھی ہدایت دی گئی ہے کہ فسادات کے موقع پر تعینات کے لئے جانے والے پولیس دستے میں ہر سطح پر مختلف فرقوں کے لوگ شامل ہیں تاکہ یکطرفہ کارروائی کی شکایت کا موقع نہ ہو۔

آل انڈیا ریڈیو اور دوردرشن سے کہا گیا ہے کہ وہ ایسے پروگرام اور سیریل پیش کریں جس سے قومی یکجہتی کو فروغ حاصل ہو۔ جنگ آزادی اور قومی تعمیر و ترقی میں اقلیتوں کے لوگ دان کو نمایاں کرنے کے لئے متعدد پروگرام پیش کئے گئے ہیں اور آئندہ بھی کئے جائیں گے کیونکہ ذہنوں کو بدلنے میں ماس میڈیا کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

ضلع افسروں پر خصوصی ذمہ داری ڈالی گئی ہے کہ وہ فسادات کی روک تھام میں پوری مستعدی دکھائیں ورنہ ان کی غفلت کے خلاف تادیبی کارروائی کی جائے گی سی آئی ڈی کے محکمے کو بھی زیادہ چوکس اور باخبر ہونے کی ہدایت کی گئی ہے تاکہ پیشگی اطلاع ہوتے پر پیش بندی کی جا سکے۔

قومی مورچہ کی سرکار کو اقتدار میں آئے ہوئے ابھی چند مہینے گزرے ہیں لیکن اترپردیش اور بہار کے وزرائے اعلی نے ایسے موقعوں پر جس دوراندیشی کا مظاہرہ کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ حکومت اپنے ارادوں میں پر خلوص ہے۔

فرقہ پرستی اس ملک کا ایک بہت بڑا مسئلہ ہے بدقسمتی سے اب اس کا تعلق اقتدار سے ہو گیا ہے لہٰذا بنیاد پرستوں کو اپنے اپنے سماج میں عزت و وقار بھی حاصل ہو گیا لیکن فرقہ پرستوں نے تمام شور وغل اور ہنگامے کے باوجود ہندوستان کا غالب حصہ جس میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی سبھی شامل ہیں سیکولر ہے کیونکہ ہندوستان کی روح سیکولر ہے لہٰذا مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ بڑی ہمت اور اعتماد کے ساتھ فرقہ پرستی سے لڑنے کی ضرورت ہے لیکن بدی پر اچھائی برائی پر ہمیشہ فتح یاب ہوتی ہے

محبوب ذکریا

بھارت میں مردم شماری

دنیا کی عظیم انتظامی مشق

•

بھارت کو ۱۸۷۱ء سے مسلسل مردم شماری کرنے کا امتیاز حاصل ہے۔

۱۹۹۱ء میں ہونے والی مردم شماری ۱۲ ویں دس سالہ مردم شماری ہے۔ ۱۹۹۱ء میں ہونے والی مردم شماری کے پہلے مرحلے میں مکانات کی فہرست تیار کرنے اور گنتی کے لئے ان پر نمبر لگانے کا کام تمام ملک میں شروع ہو چکا ہے۔

مردم شماری کا سلسلہ چار ہزار برس قبل از مسیح شروع ہوا جب بے بی لون کے باشندگان نے مالیہ وصول کرنے کے لئے ایک نظام قائم کیا تھا۔ ریکارڈ سے پتہ چلتا ہے کہ مصریوں نے اہرام مصر کی تعمیر کے لئے تین ہزار برس قبل از مسیح مزدوروں کے اعداد و شمار جمع کئے تھے۔ روم میں بھی شہریوں کے رجسٹریشن کے لئے باقاعدہ طور پر مردم شماری کی گئی تھی۔ یونان اور چین میں بھی اس قسم کی مردم شماریاں کی گئی ہیں۔

بھارت میں بھی مردم شماری ایک مستقل عمل رہا۔ قبل از مسیح تیسری صدی کے اشوک کے فرمانوں میں مردم شماری کا ذکر ایک مستقل ادارے کی حیثیت سے ملتا ہے۔ اس کے دور کی مردم شماری میں ہر گاؤں کی کل آبادی ہی شامل نہیں ہوتی تھی بلکہ اس میں کاشت کاروں، تاجروں،

فن کاروں، مزدوروں اور غلاموں نیز دوپایہ اور چارپایہ مویشیوں کی تعداد بھی شامل ہوتی تھی کوٹلیہ کے ارتھ شاستر میں آبادی کی گنتی کرنا (مردم شماری) ٹیکسوں کی وصولیابی کے لئے بطور موثر ذریعہ تجویز کیا گیا تھا۔

لفظ خانہ شماری (مردم شماری) فارسی کے لفظ "خانہ" جس کے معنی مکان کے ہیں اور "شماری" جس کے معنی گنتی کرنے کے ہیں سے اخذ کیا گیا ہے۔ مردم شماری سے لوگوں کی تعداد کے علاوہ پیدائش اور اموات کے اعداد و شمار دیگر تفصیلات کے بارے میں بھی بیش قیمت معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ مردم شماری منصوبہ بندی، پالیسی تیار کرنے اور ترقیاتی عمل میں بڑی اہمیت کی حامل ہے یہ متعدد تحقیقی تنظیموں کے لئے تجربی و علمی بنیاد بھی تیار کرتی ہے۔

"بھارت میں باقاعدہ مردم شماری کی شروعات ۱۸۷۲ء میں ہوئی جب برطانوی حکومت نے ملک کے کچھ حصوں میں مردم شماری کرائی۔ تاہم اس کے اعداد و شمار ایک ہی وقت کے نہیں تھے کیونکہ جو اعداد و شمار جمع کیے گئے تھے۔ بھارت میں باقاعدہ مردم شماری ۱۸۸۱ء میں شروع ہوئی۔ بھارت کو گزشتہ ۱۱۰ برسوں سے متواتر دس سالہ مردم شماری کرنے کا فخر حاصل ہے۔ دیگر ممالک میں عالمی جنگوں، قدرتی آفات اور جان لیوا بیماریوں کی وجہ سے باقاعدہ مردم شماری نہیں ہوئی ہے

بھارت میں جب باقاعدہ مردم شماری کی شروعات ہوئی تو اس زبردست مہم کے بارے میں مختلف افواہیں اڑائی گئیں۔ بعض لوگوں نے کہا کہ لوگوں کی فہرستیں اس لیے تیار کی جارہی ہیں کہ انہیں برطانیہ کے ایک عجیب الخلقت دیو کو پیش کیا جائے گا جو ان کے بدلے میں سونا دے گا۔ کچھ لوگ اس بات سے خائف تھے کہ مردم شماری کا مقصد فوج میں بھرتی کرنے کے لئے اچھے و تندرست افراد کی شناخت کرنا ہے لوگ مردم شماری کے لئے اعداد و شمار جمع کرنے والے افراد سے بچنے کے لئے چھپ جایا کرتے تھے تاہم عوام کے ذہن سے تمام خدشات اس وقت دور ہو گئے جب انہیں اس عمل کی اہمیت کا اندازہ ہونے لگا۔

بھارت جیسے ملک میں ۲۰ دن کے اندر اندر مردم شماری کرنا دنیا کی ایک عظیم انتظامی مشق ہے

مرجانا گھر میں رہنے والے افراد کا شمار کرنا نیز پیدائش اور موت، سماجی و اقتصادی حقائق متعلق اعداد و شمار جمع کرنا ایک دردِسر والا کام ہے۔ ناخواندگی، غربت اور مردم شماری کی بت سے لاعلمی اس مسئلہ کی شدت میں اور اضافہ کردیتی ہے۔

مردم شماری برائے ۱۹۹۱ء کے پہلے مرحلے میں مکانات کی فہرست بندی اور گنتی کے لئے پر نمبر لگانے کا کام ملک میں پہلے ہی شروع ہوچکا ہے اس مہم کے دوران ہر مکان اور بوٹ ھاؤس ھاؤسز TREE HAUSES گاڑیوں، غاروں اور جھونپڑیوں سمیت ان تمام جگہوں پر گنتی لئے نمبر لگائے جائیں گے جن میں لوگ رہائش پذیر ہیں یا ان میں لوگوں کے رہائش پذیر ہونے کی توقع ہے۔ ریلوے اسٹیشن، بس اسٹینڈوں اور کھلے میدانوں میں جہاں بے گھر افراد رہائش اختیار رسکتے ہیں، جیسے مقامات کی بھی نشاندہی کی جائے گی ان رہائشی مقامات کی نشاندہی کے بعد ان پر یہ نمبر پینٹ کیا جائے گا جو حرف "سی" سے شروع ہوگا جنگل والے علاقوں میں یہ نمبر "سی الف" سے شروع ہوگا۔

پہلے مرحلے کے دوران شمار کنندگان ملک کے ہر علاقے کا دورہ کریں گے اور دو فہرستیں تیار کریں گے یعنی مکانات کی فہرست اور صنعتی اکائیوں کی فہرست۔ مکانات کی فہرست میں مکانات میں رہائش پذیر افراد کی جنس وار تفصیلات اور ان کے مذہب کے اندراج کے علاوہ مکان کی تعمیر میں استعمال ہونے والے میٹریل سے متعلق معلومات، رہائشی کمروں کی تعداد، پینے کے پانی کی سپلائی، بجلی "بیت الخلاء" کی سہولیات اور کھانا پکانے میں استعمال ہونے والے ایندھن کے بارے میں بھی تفصیلات جمع کی جائیں گی۔ صنعتی اکائیوں کی فہرست مرکزی اعداد و شمار کی تنظیم کے لئے اقتصادی مردم شماری کے حصے کے طور پر تیار کی جاتی ہے۔ اس میں زرعی اور غیر زرعی صنعتی اکائیوں، اس کی ملکیت، اس میں ملازم افراد کی تعداد، آیا صنعتی اکائی پورے برس کام کرتی ہے یا وقتی طور پر ہے اور اس میں استعمال ہونے والی بجلی اور ایندھن سے متعلق اعداد و شمار حاصل کیے جائیں گے۔ مردم شماری کے پہلے دور میں ۱۲ لاکھ شمار کنندگان سمیت 15 لاکھ سے زیادہ افراد شامل ہوں گے۔

یہ پہلا دور اصل مردم شماری کی محض ابتدا ہے جو کہ آئندہ برس ۹ فروری سے ۵ مارچ کی جائے گی۔ یکم مارچ کا غروب مردم شماری کا ریفرنس ٹائم (حوالہ جاتی وقت) ہوگا۔ بے گھر افراد کا شمار ۲۸ فروری کی شب میں کیا جائے گا۔ مردم شماری برائے ۱۹۹۱ء کے عارضی اعداد و شمار ۵ مارچ تک جاری کر دیئے جائیں گے۔ بعد ازاں قطعی اعداد و شمار اور تجزیے متعدد جلدوں میں پیش کیے جائیں گے۔

مردم شماری کے سلسلے میں جمع کی گئی تمام معلومات کو سختی کے ساتھ پوشیدہ تصور کیا جائے گا مردم شماری میں جمع کیے گئے اعداد و شمار کسی بھی شخص کے حق میں یا اس کے خلاف استعمال نہیں کیے جائیں گے۔ اس رازداری کی وجہ ان لوگوں کی حوصلہ شکنی کرنی ہے جو اس غلط خیال سے غلط اعداد و شمار دیتے ہیں کہ اس سے انہیں راشن کارڈ حاصل کرنے نیز فرقے کی بنیاد پر ریزرویشن یا کوئی دیگر اٹھانے میں مدد ملے گی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس سے عوام میں صحیح اور قابل اعتماد اعداد و شمار دینے کے لئے اعتماد بھی پیدا ہوگا کیونکہ بیان کے کسی بھی مفاد کے خلاف استعمال نہیں کیے جائیں گے۔ مردم شماری کے دوران جمع کئے گئے اعداد و شمار کسی بھی باہری ایجنسی یا محکمے کے معائنے کے لئے دستیاب نہ ہوں گے اور نہ ہی انہیں مردم شماری سے متعلق قانون ۱۹۴۸ء کی دفعہ ۱۵ کے تحت کسی عدالت میں چیلنج کیا جاسکتا ہے۔

(باقی سلسلہ ص ۲۷ سے آگے)

ہماری وہ بات کیا ہے۔ اس کی چھان بین مس حیدر نے کی ہے اور اسی نتیجے پر پہنچی ہیں کہ علامہ اقبال نے ٹھیک ہی کہا تھا۔

ایران و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے
باقی مگر ہے اب تک نام و نشان ہمارا

٭٭٭

محترمہ بلقیس علاء الدین
Shangrila - Road No 9
Banjara Hills. HYD 3

The hand that asks for The needy.

Give to The hand That asks for The needy.
Let not That hand, ask in vain.
Give to him whose need is greater Than yours.
To him whose Life is full of Sorrow and Path.

Be not ashamed of your mite, if its small.
Think of it in The eyes of God.
The Pearl is embedded in The deep dark ocean.
The Pearl is hid in The womb of The Pod.

Only on drop is required to make The pot over flow.
Only one spark can set The field on fire.
Only one broken string can ruin The music
Of The guiter, The zither, The lute and The Lyre.

محترمہ مطیعہ ہاشمی

جو ہاتھ...

جو ہاتھ کسی ضرورت مند کے لئے مانگتا
اُس ہاتھ کو خالی واپس مت کرو

کسی کی ضرورت آپ کی ضرورت سے زیادہ ہے
جو دکھ اور مجبوری میں مبتلا ہے

آپ کی امداد ہو کتنی ہی ادنیٰ
وہ اللہ کی نظر میں بڑی ہوتی ہے

کیوں سوچتے ہو پھول کلی میں بند ہے
زمیں میں درخت اور سیپی میں موتی ہے

ایک ہی بوند پانی سے کوزہ اُبل جاتا ہے
ایک چنگاری کھیت کو راکھ کر سکتی ہے

ایک تار ٹوٹ جانے سے نغمہ بگڑ جاتا ہے
ساز آخر ٹوٹ جاتا ہے موسیقی بیکار ہو جاتی ہے

غزلیں

ڈاکٹر محمد ضیاء الرحمٰن خان [illegible]
۱۱- اسکالرز ٹاؤن - [illegible]

سرخ اپنے ہی لہو سے ہے لبادہ میرا
چاک سینہ ہے گلوں سے بھی زیادہ میرا
کیوں کسی اور پہ بربادیٔ جاں کا الزام!
میرا قاتل تو ہے ننھا دلِ سادہ میرا
پھول تو پھول ہیں کانٹے بھی سمو لوں اس میں
میرے دل کی طرح دامن ہے کشادہ میرا
آپ ہی اپنا کفن سر پہ لئے پھرتا ہوں
مجھ سے پوچھے نہ کوئی کیا ہے ارادہ میرا
منزلیں گردِ سفر بن کے اڑی جاتی ہیں
ساتھ دے کیسے کوئی برسرِ جادہ میرا
جو سدا مست ہو وہ صاحبِ کردار نہیں
نشہ ہرگز نہیں منت کشِ بادہ میرا

رہے انساں کا بھلا [illegible] ہر دم [illegible]
صدقِ دل سے ہے یہ دائمی وعدہ میرا

فراغ روہوی [illegible]

کعبہ رہے گا یہ، نہ کلیسا زمین پر
ہوتا ہے جن کے نام پہ فتنہ زمین پر
حد بندیاں ہیں کس لئے دنیا میں اس قدر
سرحد ہی رہ سکے گی نہ صوبہ زمین پر
پودے اگائے جاتے ہیں فرقوں کے ان دنوں
ملت کے بیج بھی کوئی بوتا زمین پر
نفرت کی دور تک کوئی پرچھائیں بھی نہ ہو
ایسا نکالئے کوئی رستہ زمین پر
پگڑی کسی اچھل گئی کہیں دستار چھن گئی
ہوتا ہے روز ہی یہ تماشا زمین پر
برہم ہے آسماں کی طرح اس کا بھی مزاج
پھر ہو کسی کو کیسے بھروسہ زمین پر
اٹھیے یہاں سے ڈھونڈیں کوئی اور سائباں
گرنے لگا ہے شاخ سے پتا زمین پر
یارب شجر کے سائے سے اس کو نواز دے
مدت سے جل رہا ہے یہ صحرا زمین پر
آیا ہے جو یہاں اسے جانا ہے ایک دن
باقی رہے گا کون ہمیشہ زمین پر
تنہائیوں کا غم وہ کرے بھی تو کیا کرے
آیا ہے جو فراغ اکیلا زمین پر

خود مختاری سے
آزادی کی طرف

ماہنامہ

شاداب

حیدرآباد

[illegible]/-

جلد (۷) شمارہ (۱۰) اکتوبر ۱۹۹۲ء حیدرآباد

ایڈیٹر
محمد قمر[illegible]

جائنٹ ایڈیٹر
رشید الدین

مینجنگ ایڈیٹر
حکیم الیقین احسن

مجلسِ مشاورت:

محترمہ بیگم اب • یوسف ناظم • ڈاکٹر محمد یوسف الدین • پروفیسر رضی الدین احمد

محمد منظور احمد منظور • محترمہ سیدہ مہر • ڈاکٹر منشاء الرحمٰن خان منشاء • پروفیسر محمد تراب علی

منیر احمد صدیقی

زرِ تعاون:

	ہندوستان	خلیجی ممالک	امریکہ	انگلستان	پاکستان
سالانہ	65 روپے	200 روپے	40 ڈالر	25 پونڈ	175 پاکستانی روپے
سہ سالہ	120 "	360 "	70 "	45 "	300 "
تاحیات	1500 "	3700 "	700 "	400 "	3000 "

ترسیلِ زر کا پتہ:

ماہنامہ "شاداب" 147۔5۔11 ریڈہلز۔ حیدرآباد

اڈیٹر، پرنٹر، پبلشر محمد قمرالدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان
سے چھپوا کر دفتر شاداب" 147-5-11 ریڈ ہلز حیدرآباد دکن سے شائع کیا۔

فہرست

غلطی کو غلطی تسلیم کیجئے		مولانا سید ابوالحسن ندوی	۳
اسلامی تصوف	قسط سوم	سید احمد عروج احمد قادری	۹
تلاوتِ قرآن		میاں ظفر احمد	۱۵
صہیونی تاریخ پر ایک نظر		ایم اے رشید	۱۸
دینی تعلیم تجزیہ و تجاویز		سید حامد	۲۳
دینی تعلیم	(قسط دوم)	ریاض الدین احمد	۳۳
سوویت یونین میں اسلامی تعلیم		عزری علی مائیق	۳۷
مولوی عبدالحق	(قسط سوم)	ڈاکٹر عبدالستار دلوی	۳۸
اہلیہ زبان		ابراہیم جلیس	۴۷
نیند		ڈاکٹر سکے بجکٹ وتسل راڈ	۵۱
غزلیں		عزیز بہارتی، بانو طاہرہ سعید	۶۰
"		مومن خان شوق، صادقہ نوید	۶۱
"		صلاح الدین نیر، اختر زمان	۶۲
"		متان منظور، عزیز تنکیدی	۶۳

مولانا سید ابوالحسن ندوی

غلطی کو غلطی تسلیم کیجیے

(۲۲ر جولائی ۱۹۹۰ء کو ریاست اترپردیش کی راجدھانی شہر لکھنؤ میں "فولس" کے زیر اہتمام ایک نمائندہ فرقہ واریت مخالف کنونشن ہوا جس میں ملک کے سیکولر مزاج دانشوروں اور علماء کے علاوہ متعدد علمی، سیاسی، سماجی اور مذہبی شخصیتوں نے شرکت کی۔ اس موقع پر مولانا سید ابوالحسن ندوی مدظلہ نے ایک اثرانگیز تقریر فرمائی۔ "تعمیر حیات" لکھنؤ سے ماخوذ اور ہدیۂ قارئین ہے)۔

حضرات! غلطی سب سے ہوتی ہے انسان ہی غلطی کرتا ہے۔ پتھر غلطی نہیں کرتا، درخت غلطی نہیں رتا، بیمار بھی ہوتا ہے تو انسان ہی بیمار ہوتا ہے پتھر بیمار نہیں ہوتا، غلطی کرنا اور بیمار ہونا ئی خلاف فطرت بات نہیں، تاریخ قوموں، ملکوں اور حکومتوں اور معاشروں کی غلطی کی نظیروں سے بھری ہوئی ہے۔ لیکن جو چیز خطرناک ہے وہ یہ کہ غلطی کو غلطی مانا نہ جائے۔ غلطی کو محسوس نہ کیا جائے اس کے بعد دوسرا درجہ یہ ہے کہ پھر اس کو ہمت کر کے غلطی بتایا نہ جائے اب امید بنتی ہے اور س پیدا ہوتی ہے کہ ہم آپ سب غلطی کو غلطی سمجھ رہے ہیں۔ کس کی غلطی؟ میں کسی جماعت کسی فرقے کا نام یں لوں گا؟ ہم کسی کا نام نہیں لیتے لیکن کہتے ہیں کہ غلطی ہوئی۔ دنیا کے مذاہب سب سے افضل مرتبہ مذہبوں کا ہے اس کے بعد تہذیبیں، کلچر، ملک اور سماج یہ سب کے سب اسی طرح پہنچے ہیں کہ غلطی کو غلطی

[illegible]

ضروری ہے، وقت گذر جانے کے بعد تنقید و اعتراف کرنے سے کچھ زیادہ فائدہ نہیں ہوتا۔

حضرات! میرے پاس وقت کم ہے، مجھے اس بارے میں معاف کیا جائے کہ تاریخ کا ایک طالب علم ہوں، میرا ذہن ماضی کی طرف سفر کرتا ہے اور پیچھے کی طرف لوٹتا ہے وہ تاریخ کے گذرے ہوئے منظروں کو اپنے سامنے لاتا ہے، مجھے وہ دن یاد آرہا ہے کہ ۱۷ نومبر ۱۹۴۶ء کی تاریخ ہے اور دہلی میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم (سابق صدر جمہوریہ ہند) جو اس وقت جامعہ ملیہ کے وائس چانسلر (شیخ الجامعہ) تھے، جامعہ کی سلور جوبلی منائی جا رہی تھی، ان کی دعوت پر ہندوستان کے دارالحکومت دہلی میں میں اپنے تاریخی مطالعہ کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ ایک ایسا چیدہ اور چنیدہ مجمع ڈائس پر نظر آرہا تھا جو میرے علم میں نہ اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد دیکھنے میں آیا ہے، میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ سامنے ایک طرف پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، شری راج گوپال اچاریہ جی بیٹھے ہوئے ہیں دوسری طرف مسٹر محمد علی جناح، نواب زادہ لیاقت علی خاں اور سردار عبدالرب نشتر بیٹھے ہوئے ہیں ان کے پیچھے ڈائس پر ہندوستان کے مشہور ترین فضلاء، مصنفین و مفکرین اور ادیب و اہل قلم تشریف فرما ہیں جن میں علامہ سید سلیمان ندوی، سر شیخ عبدالقادر مدیر مخزن لاہور، محمد اسد صاحب (سابق لیوپولڈ ویس) بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق، مشہور شاعر حفیظ جالندھری (اور مسلمان علماء اور زعماء میں سے) مولانا قاری محمد طیب صاحب، مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ناظم جمعیۃ العلماء ہند، اور متعدد عظیم رہنما اور تحریک آزادی کے مجاہدین موجود ہیں۔

یہ عظیم اور وقیع مجمع سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ اور حالات یہ تھے کہ دہلی میں (فرقہ وارانہ فسادات کے سلسلہ میں) چھرے زنی اور چاقو بازی کی وارداتیں ہو رہی تھیں ہم لوگ جو باہر کے مہمان کی حیثیت سے آرہے تھے۔ (میں بھی خوش نصیبی سے ان میں شامل تھا) ہم لوگ پولیس اور والنٹیروں کی حفاظت و معیت میں اپنی قیام گاہ تک پہونچائے گئے تھے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم نے اس وقت اس منتخب اور قابل احترام مجمع کو خطاب کر کے جو کچھ کہا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس سے بہتر اور اس سے زیادہ موثر اور ادبی انداز میں کہنا مشکل ہے۔ مجھے صدر صاحب اجازت دیں کہ میں ان کے خطبہ کا ایک اقتباس

QUOTATION آپ حضرات کو سناؤں، معلوم ہوتا ہے کہ بالکل اس موجودہ صورت حال کی عکاسی کرتا ہے

" آپ سب صاحبان آسمانِ سیاست کے تارے ہیں۔ لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں آدمیوں کے دلوں میں آپ کے لئے جگہ ہے۔ آپ کے یہاں کی موجودگی سے فائدہ اٹھا کر میں تعلیمی کام کرنے والوں کی طرف سے بڑے ہی دکھ کے ساتھ چند الفاظ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

آج ملک میں باہمی منافرت کی آگ جو بھڑک رہی ہے۔ اس میں ہمارا چمن بندی کا کام دیوانہ پن معلوم ہوتا ہے یہ آگ شرافت اور انسانیت کی سرزمین کو جھلسے دیتی ہے، اس میں نیک اور متوازن شخصیتوں کے تازہ پھول کیسے پیدا ہوں گے۔ حیوانوں سے بھی پست تر سطح اخلاق پر ہم انسانی اخلاق کو کیسے سنوار سکیں گے؟ اس کے لئے خدمت گزار کیسے پیدا کر سکیں گے؟ جانوروں کی دنیا میں انسانیت کو کیسے سنبھال سکیں گے؟ یہ الفاظ شاید کچھ سخت معلوم ہوتے ہیں، لیکن ان حالات کے لئے جو روز بروز ہمارے چاروں طرف پھیل رہے ہیں۔ اس سے سخت الفاظ بھی بہت نرم ہوتے، ہم جو اپنے کام کے تقاضوں سے بچوں کا احترام کرنا سیکھتے ہیں، ان کو کیا بتائیں کہ ہم پر کیا گزرتی ہے جب ہم سنتے ہیں کہ بہیمیت کے اس بحران میں معصوم بچے بھی محفوظ نہیں ہیں۔ شاعر ہندی نے کہا تھا کہ:

" ہر بچہ جو دنیا میں آتا ہے اپنے ساتھ یہ پیغام لاتا ہے کہ خدا ابھی انسان سے پوری طرح مایوس نہیں ہوا۔"

مگر کیا ہمارے دیس کا انسان اپنے سے اتنا مایوس ہو چکا ہے کہ ان معصوم کلیوں کو بھی کھلنے سے پہلے ہی مسل دینا چاہتا ہے۔ خدا کے لئے سر جوڑ کر بیٹھیے اور اس آگ کو بجھائیے یہ وقت اس کی تحقیق کا نہیں کہ آگ کس نے لگائی؟ کیسے لگی؟ آگ لگی ہوئی ہے اسے بجھائیے، یہ مسئلہ اس قوم اور اُس قوم کے زندہ رہنے کا نہیں، تہذیب، انسانی زندگی اور وحشیانہ زندگی میں انتخاب کا ہے۔ خدا کے لئے اس ملک میں مہذب زندگی کی بنیادوں کو یوں کھدنے نہ دیجئے[1] "

---

[1] خطبۂ ڈاکٹر ذاکر حسین ... جامعہ ملیہ ... ۱۹۴۶ء۔ بعض ... والوں نے بتایا کہ اس [illegible]

حضرات ! میں محسوس کر رہا ہوں گویا یہ بات آج کہی جا رہی ہے اور اس سے بہتر الفاظ میں کہنی مشکل ہے اس وقت مسئلہ یہ ہے کہ آپ اس ملک کو سنبھالیئے ۔ اس ملک میں شریفانہ زندگی گذارنے اس ملک کے باصلاحیت باشندوں کو اپنی ذہانتوں کے اظہار اور اس سے بڑھ کر اپنے خلوص اپنی خدا ترسی انسانیت دوستی اور شرافت واخلاق نمایاں کرنے کا موقع دیجئے ۔ اس ملک میں خدا کے فضل یہ سب کچھ موجود ہے، میں نے نہ صرف ہندوستان کی بلکہ باہر کی تاریخ بھی پڑھی ہے اس کی روشنی میں کہتا ہوں کہ کوئی ایسی نعمت و دولت نہیں ہے جو اس ملک میں نہ ہو، یا کسی نہ کسی راستہ سے یہاں نہ آئی ہو یہاں کی سرزمین اور فضا نے اس کو ترقی دینے اس کی قدر کرنے اور اس کو آگے بڑھانے کی صلاحیت کا اظہار کیا آپ اس ملک کو سنبھالئے اور خدا کی اس نعمت کی قدر کیجئے ۔ میں یہاں تک کہوں گا کہ اس ملک کو دنیا کی اخلاقی (MORAL) قیادت کرنی چاہیئے، دنیا کی بڑی طاقتوں اور بڑے ممالک نے ایشیا کو اس قابل نہیں رکھا کہ وہ دنیا کی قیادت کر سکیں ۔ بلکہ ایک حقیقت پسند انسان یہ دیکھتا ہے کہ ایشیا کے ان ملکوں میں ان بڑی مغربی طاقتوں کی وجہ سے خرابی پیدا ہو رہی ہے وہ کسی صالح کسی لائق قیادت کو کسی اچھی لیڈر شپ کو ابھرنے نہیں دیتے اور اگر وہ قیادت وہاں پیدا ہو جاتی ہے تو اس کو زیادہ دنوں تک باقی رہنے کا موقع نہیں دیتے ۔ وہ وہاں کی سیاست میں دخل دیتے ہیں، وہاں کی اقتصادیات و اخلاقیات میں دخل دیتے ہیں ۔ میں آپ سے صاف کہتا ہوں کہ آج دنیا میں وہ تخت خالی ہے جس پر ایک بڑا ملک بیٹھے اور دنیا کو اخلاق ۔ سچی خدا ترسی (محض اس کے نام پر فائدہ اٹھانے کے لئے اور مخلوق پر دست درازی اور فائدہ اٹھانے کے لئے نہیں، بلکہ خدا سے صحیح طور پر ڈر کر اور خدا کی محبت میں (جو خالق کائنات اور خالق نوع بنی انسان ہے) بلا اختلاف رنگ ونسل انسانوں کو سینہ سے لگائے اور ان سے محبت اور ان کی خدمت کرے ۔

آج یہ تخت خالی ہے ۔ روس نے، مجھے معاف کیا جائے ۔ اس بارے میں اپنی نااہلی ثابت کر دی وہ فیل ہو گیا ۔ امریکہ فیل ہو رہا ہے برطانیہ فیل ہو چکا ہے یورپ کی دوسری بڑی طاقتیں سب فیل ہو گئیں جب کوئی قوم، ملک اپنے خلوص و بے غرضی، اپنی صلاحیت و اہلیت اور اپنی خدا ترسی اور انسانیت دوستی

کا ثبوت دے رہا ہے تو اس کے ساتھ جنگ کی ضرورت نہیں بلکہ اس کے لئے بہت بڑے پیمانے پر دیگر شعبوں کی ضرورت نہیں اس کے لئے حقائق (FACTS) لٹریچر اور صداقت کی ضرورت ہے، اخلاقیات، انسان دوستی اور محبت اور خلوص اور روحانیت اس ملک کی روایات میں ہے اس کی تاریخ کے مختلف دوروں میں یہ صفات باہر بھی گئی ہیں اور اب بھی پہنچ سکتی ہیں، میں اپنے مسلمان بھائیوں سے خاص طور پر کہوں گا کہ ان کی اس سلسلہ میں خاص طور پر بڑی ذمہ داری ہے، قیامت کے روز ان سے پوچھا جائے گا کہ دنیا لٹ رہی تھی، برباد ہو رہی تھی انسانیت مسلسل انحطاط کے نیچے روندی جا رہی تھی، اخلاقیات کا خون کیا جا رہا تھا، عصمتیں برباد تھیں، عزتیں پامال تھیں اور انسان کا خون سب سے زیادہ سستا ہو چکا تھا تم بیٹھے کیا کر رہے تھے، تمہارا فرض تھا تم اس صورت حال کو بدلنے کی کوشش کرتے۔ تمہاری یہ ذمہ داری صرف ہندوستان ہی میں نہیں، ساری دنیا میں تھی۔ ڈاکٹر اقبال نے اس حقیقت کو اس طرح بیان کیا ہے کہ: ع "ہے حقیقت جس کے دیں کی احتساب کائنات"

حضرات! میں آپ سے صاف کہتا ہوں کہ میں پیام انسانیت کا CREDIT خود نہیں لیتا اس کا سہرا میرے سر بندھا ہوا نہیں ہے۔ میری صلاحیتیں، میرا تجربہ، میرے مشاغل، میرا ذوق اور میری صحت کوئی چیز بھی اس کی متحمل نہیں تھی، لیکن دل میں ایک چبھن تھی جس نے مجھے اس پر آمادہ کیا، بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ آگ لگی ہے اور آگ بجھانے والے بھی ہوتے ہیں لیکن ان کو آواز دینے والا کوئی نہیں ہوتا۔ اس وقت ایک بچہ بھی چلا اٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ آگ لگی ہے، آگ لگی ہے۔ اس وقت یہ نہیں دیکھا جاتا کہ کس عمر کے آدمی نے آواز لگائی، کسی قابل آدمی نے آواز لگائی ہے یا ناقابل، تعلیم یافتہ آدمی نے، جب آگ لگی ہو اور گاؤں اور بستی جل رہی ہو، تو پھر جو بول سکتا ہے اس کو بولنا چاہیئے جو دوڑ سکتا ہے اس کو دوڑنا چاہیئے جو دہائی دے سکتا ہے اس کو دہائی دینا چاہیئے اس احساس فرض نے مجھے مجبور کیا کہ اتنے بڑے ملک میں اور اتنے بڑے بڑے لوگوں کی موجودگی میں یہ آواز لگاؤں اور میں یہ دعویٰ بھی نہیں کرتا کہ سب سے پہلے میں نے ہی آواز لگائی۔ آواز برابر لگائی جاتی رہی ہے، یہ ہمارے ملک کی ناقدری، اس کی تاریخ سے ناآشنائی ہے کہ یہ کہا جائے کہ یہ آواز پہلی مرتبہ لگائی گئی ہے، میں

نہیں بچ سکا تو کون ہمدردی خالی کی ہو کہ جب یہاں ایسے مجاہد جب تک انسان موجود نہ ہوں جنھوں نے آواز لگائی ہو آپ کے سامنے صاف اقرار کرتا ہوں مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میری یہ تحقیق اتنے بڑے آدمی کو اور اتنے پڑھے لکھے شخص کو متاثر کرے گی، یہ اس ملک کی اخلاقیت اور زندہ دلی کی دلیل ہے۔

میں اپنے صوبہ کے وزیر اعلیٰ مسٹر ملائم سنگھ یادو کو اس بات کی داد دوں گا کہ انھوں نے ایک ایسے زمانہ میں جب صرف سیاسی مقاصد، سیاسی زبان اور سیاسی انداز ہر طرف رائج ہے، انھوں نے ایک اصول اور اخلاق کی آواز بلند کی، اور کہا کہ ہم قانون کو اس طرح پامال ہوتے نہیں دیکھ سکتے، اگر قانون کھیل بن گیا اگر عدالت کے فیصلے کھیل بن گئے۔ اگر امن عامہ بچوں کا مذاق بن گیا تو اس ملک میں نہ پڑھا جا سکتا ہے اور نہ لکھا جا سکتا ہے، نہ انسانیت کی خدمت ہو سکتی ہے نہ علم و ادب کی اور یہ تو بڑی چیزیں ہیں، گھر میں آرام سے آدمی بیٹھ بھی نہیں سکتا، میں ان کو داد دوں گا کہ انھوں نے اصول و اخلاق کی آواز لگائی۔ میں ان سے کہوں گا کہ وہ اس پر مضبوطی سے قائم رہیں، اس راہ میں بڑے بڑے امتحان ہوتے ہیں، اصول و اخلاق کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے یہ سودا اتنا سستا نہیں ہے، اگر انھوں نے اس پر ثابت قدمی دکھائی تو تاریخ میں ان کا نام ہوگا، امید ہے کہ وہ عبادت گاہوں کے معاملہ میں یہ کھیل نہیں ہونے دیں گے کہ آج اس مسجد کے معاملہ میں کل اس مندر کے معاملہ میں تاریخ کو جگایا جا رہا ہے اور ہزار دو ہزار سال پہلے قافلہ جہاں سے چلا تھا پھر قافلہ کو وہاں سے سفر کرنے پر آمادہ کیا جا رہا ہے اگر یہ کام ہندوستان میں شروع ہو گیا تو سارے تعمیری اور ملک کو ترقی دینے والے کام بند ہو جائیں گے اس لئے میں نے جیسے پہلے کہا تھا آج پھر کہتا ہوں "تاریخ ایک سویا ہوا شیر ہے اس کو جگانا نہیں چاہئے" — آپ اس کے پاس سے نکل جائیے اس کو سوتا چھوڑ دیجئے، اگر آپ نے اس کو جگا دیا تو پھر اس غلطی کی قیمت ادا کرنی پڑے گی۔ تاریخ کو پچھلے دور میں واپس لے جانا اور وہاں سے سفر شروع کرنا جب ہندوستان میں باہر سے نسلیں آ رہی تھیں، تہذیبیں اور مذاہب آ رہے تھے تو ہم کو کام ہم اس ملک کے کام آ سکتے ہیں نہیں کر سکتے، میں آپ کی اس توجہ، سماعت اور احترام و محبت کے شکر گزار ہوں اور خدا سے دعا کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ فرقہ وارانہ منافرت اور تعصب کو ختم کرنے کے لئے جو قدم اٹھایا گیا ہے اور جو کوشش شروع کی گئی ہے وہ بار آور، نتیجہ خیز، وسیع و وقیع ہو سکے۔

میاں محمد [illegible] قادری
قسط سوم

اسلامی تصوّف

کشف و کرامات و الہام : اب تک جو تفصیلی بحث کی جا چکی ہے اس سے پوری طرح ہو جاتا ہے کہ سلوکِ باطن کی راہ بھی دین ہی کی روشنی میں طے کی جا سکتی ہے، اس روشنی کے بغیر یہ خطرات سے بھری ہوئی ہے۔ اگر اللہ و رسول ؐ کے احکام، دینی حقیقتیں اور اس کے مسلّمات نظر او جھل ہوں یا او جھل کر دیئے جائیں تو اسلامی تصوّف ملحدانہ تصوّف کا رخ اختیار کر لیتا ہے۔ چنانچہ جاہل اور مکّار صوفیوں نے کشف، مکاشفت، واردات قلبی اور الہامات غیر شرعی حقائق خدا رسیدگی کے دعوے کر کے لوگوں کو گمراہ کرنا شروع کیا تو علمائے حق اور صوفیۂ صدق نے پوری ت سے یہ بتلایا کہ اصل شئے شریعت، احکامِ الٰہی کی تعمیل اور اس پر استقامت ہے، یہ نہ ہو تو تمام سے غلط اور گمراہ کن ہیں۔ اصل کسوٹی کتاب و سنّت ہے، اس پر جانچے اور پرکھے بغیر کوئی چیز قبول نہیں ہے۔ اس طرح کی صراحتیں پہلے بھی گزر چکی ہیں اور ہم یہاں خاص طور سے اس سلسلے کی صراحتیں نقل کر رہے ہیں

ابو یزید طیفور بن عیسیٰ بسطامی (م ٢٦١ھ)

" اگر تم کسی شخص کو دیکھو کہ اسے کرامتیں دی گئی ہیں یہاں تک کہ وہ ہوا میں اُڑنے لگا ہے تو اس سے دھوکا نہ کھانا جب تک یہ نہ دیکھ لو کہ امر و نہی، حدود کے تحفظ اور ادائے شریعت کے معاملہ میں تم اس کو کیسا پاتے ہو۔ ع۱

ع۱ الرسالۃ القشیریہ

اس قول کی شرح کرتے ہوئے شیخ الاسلام لکھتے ہیں۔

"ابوسلیمانی کے قول کی وجہ یہ ہے کہ کرامت تو وہ شئے ہے جو صاحب کرامت کے ان کاموں میں مددگار ہوتی ہے جو اللہ سے قریب کرنے والے ہیں وہ اس کے یقین کو قوی کرتی اور اللہ کی محبت ورضا پر اسے ثابت قدم رکھتی ہے لہٰذا جب کوئی خارقِ عادت شئے کسی بندے سے ظاہر ہو لیکن شریعت اس کی استقامت پر گواہ نہ ہو تو ایسا شخص مکروفریب اور دھوکے میں مبتلا ہے (۱)

ابوسلیمان عبدالرحمٰن بن عطیۃ الدارانی (م ۲۱۵ھ) کا ارشاد :

" میں نے جنید بغدادیؒ کو کہتے ہوئے سُنا کہ ابوسلیمان دارانی فرماتے ہیں، بسا اوقات صوفیہ کے لطائف ونکات میں سے کوئی نکتہ کئی دنوں تک میرے دل میں آتا رہتا ہے لیکن میں اس وقت تک اس کو قبول نہیں کرتا جب تک دو شاہد عدل کتاب وسنت' اس کی صحت پر گواہی نہ دیں۔ (۲)

ابوالحسن احمد بن محمد النوری (م ۲۹۵ھ) کہتے ہیں،

"جس شخص کو تم دیکھو کہ وہ اللہ کے ساتھ اپنی کسی ایسی حالت کا دعویٰ کر رہا ہے جو اسے علم شرعی کی حد سے باہر نکالنے والی ہے تو اس کے قریب بھی نہ پھٹکو کیونکہ وہ بدعتی ہے شریعت جس کے افعال واقوال کی صحت پر گواہ نہ ہو وہ مبتدع ہے اگرچہ اس سے خارق عادت باتیں صادر ہوں یا ہمیں دکھوکہ یہ اس کے ساتھ ایک طرح کا مکر ہے (۳)

المحمد رویم بن احمد (م ۳۰۳ھ) کہتے ہیں،

" صوفیہ کا علم روح کو صرف کئے بغیر حاصل نہیں ہوتا" روح کو صرف کرنے کا مطلب

---

۱) مجموع الفتاویٰ الرسالۃ القشیریۃ ، ص ۱۵

۲) رسالہ قشیریہ مع شرح ج ۱ ص ۱۱۲ (۳) ایضاً ۱۵۰

یہ ہے کہ بدعت کی تمیز اور شبہات سے احتراز میں اپنی پوری کوشش صرف کر دی جائے

رویم نے کہا: اگر تم اس وصف کے ساتھ اس راہ میں آنا چاہو تو ٹھیک ہے ورنہ اپنے آپ کو صوفیوں کی یاوہ گوئی میں مشغول نہ کرو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ محض بزرگ صوفیہ کے اقوال اور ان کے واقعات یاد کرنے اور ان کے باطل طریقوں اور اعمال و مشاغل [illegible] میں مشغول ہونے سے حقیقی تصوف حاصل نہیں ہوتا۔ (۱)

حضرت رویم کا یہ قول دیکھئے اور آج کل کے "صوفیہ" کو دیکھئے۔ تو سو فیصد ایسے لوگ ہیں جو صوفیہ کے اقوال اور ان کے واقعات یاد کر کے اور ان کی لایعنی باتوں میں مشغول ہو کر "صوفی" اور "صحیح العقیدہ" مسلمان بنے ہوئے ہیں اور ان کے مقابلے میں جو لوگ فرائض و واجبات کے پابند اور معاصی سے پرہیز کرنے والے ہیں انھیں تصوف کا منکر اور بدعقیدہ [illegible] قرار دیا جاتا ہے۔

ابو سعید احمد بن عیسیٰ الخراز (م ۲۷۷ھ) کہتے ہیں

"ہر باطن جس کا ظاہر مخالف ہے باطل ہے"۔ باطن سے مراد وہ بات ہے جو دل میں آتی ہے اور ظاہر سے مراد شریعت ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ دل کی جس بات کو شریعت صحیح قرار نہ دے وہ باطل ہے۔ (۲)

اس کے قریب حضرت سیدنا الشیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا یہ قول بہت مشہور ہے:

وکل حقیقة ردتها شریعة فهی زندقة (۳)	اور ہر حقیقت جسے شریعت رد کر دے وہ بے دینی ہے

اس جامع اور بلیغ جملے کی شرح میں شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے لکھا ہے:

" اس جملے کا مطلب یہ ہے کہ اگر حکم شریعت کے خلاف کسی پر کوئی کشف ہو

---

۱) رسالہ قشیریہ مع شرح ج ۱ ص ۱۵۳   ۲) ایضاً ص ۱۶۸

۳) فتوح الغیب مع شرح ص ۵۶

اور وہ دعویٰ کرے کہ اسے اس کا حکم دیا گیا ہے تو یہ دعویٰ باطل ہے اور اگر وہ اس کے صحیح ہونے کا اعتقاد کرے تو کافر اور بے دین ہو جائے گا۔ نعوذ باللہ من ذلک (۱)

حضرت الشیخ جیلانی ایک اور مقام پر ارشاد فرماتے ہیں:

فان خطر بخاطرک وجود الہام فاعرضہا على الكتاب والسنۃ (۲)	اگر دل میں کوئی خیال آئے یا کسی بات کا الہام ہو تو انہیں کتاب و سنت پر پیش کرو۔

یہ قاعدہ کلیہ بیان کر کے شیخ جیلانی قدس سرہٗ نے اس کی کچھ مثالیں پیش کی ہیں جس کا ماحصل یہ ہے کہ غیر نبی کا الہام دلیل شرعی نہیں ہے، دلیل شرعی کتاب و سنت ہی ہیں یہی دونوں فیصلہ کریں گے کہ وہ الہام قابل قبول اور قابل عمل ہے یا نہیں۔

ان عبارتوں سے واضح ہوا کہ کرامت ہو یا کشف یا الہام یا کوئی بھی خواب و خیال، جب تک کتاب و سنت ان کے صحیح ہونے پر گواہی نہ دیں وہ لائق اعتبار ہی نہیں ہیں، ان کا قابل عمل ہونا تو دور کی بات ہے۔

اولیاء اللہ:- چونکہ اولیاء اللہ کے بارے میں مبالغہ آمیز عقیدتیں ذہنوں میں موجود ہیں اس لیے دیکھ لینا چاہیئے کہ خود اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کے ولی کون لوگ ہیں۔

عربی زبان میں وَلِیَ یَلِی کے معنی ہیں کسی شئے سے قریب ہونا۔ مثلاً جب بولتے ہیں "ھٰذا یلی ہٰذا" تو اس کے معنی یہ سمجھتے ہیں کہ یہ شئے اس شئے کے قریب ہے، اسی سے ولایت ہے جس کی اصل محبت و قرب ہے۔ ولایت کی ضد عداوت ہے جس کے اصل معنی بغض اور دوری کے ہیں لفظ ولی اسم فاعل ہے اس کے معنی ہیں قریب اور دوست، اولیاء، ولی کی جمع ہے۔ عربی کے مشہور لغت قاموس میں ہے:

"وَلِیٌ کے معنی قرب اور نزدیکی کے ہیں۔ پے در پے بارش بھی اس کے معنی میں داخل ہے۔ وَلِیّ اسی مصدر کا اسم ہے ولی کے معنی محب، دوست اور مددگار کے ہیں

---

(۱) شرح فتوح الغیب، ص ۵۶		(۲) فتوح الغیب ص ۲۷

ہیں۔ "تَوَلَّاہُ" کے معنی یہ ہیں کہ اس نے اس کو اپنا دوست بنا لیا۔ "دارہ ولی داری" کے معنی یہ ہیں کہ اس کا گھر میرے گھر کے قریب ہے"

مصباح منیر میں اس لفظ کی لغوی تشریح یہ کی گئی ہے:

"ابن الاعرابی نے کہا ولی کے معنی محبت کرنے والے اطاعت گزار کے ہیں۔ موالات معادات کی ضد ہے اور ولی عدو کی ضد ہے اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کے معنی بیان کرتے ہوئے ابو اسحاق نے کہا اللہ مومنوں کا ولی ہے ان کی طرف سے دشمن کو جواب دینے میں، ان کو ہدایت دینے میں اور ان کے لیے دلیل قائم کرنے میں اس لیے کہ اللہ ایمان کی زیادتی کے ساتھ ہدایت میں بھی اضافہ کرتا جاتا ہے جیسا کہ خود ہی فرمایا ہے "جو لوگ ہدایت کی راہ اختیار کرتے ہیں اللہ ان کی ہدایت میں اضافہ کرتا ہے" نیز یہ کہ اللہ، مومنوں کا ولی ہے ان کے دشمنوں پر مدد کرنے میں اور ان کے مخالفوں کے دین پر ان کے دین کو غالب کرنے میں"

ولایت کے معنی نصرت اور محبت دونوں ہی آتے ہیں۔ مُغرب میں ہے:

"وِلَایت اور وَلَایت کے معنی نصرت اور محبت ہیں۔"

عربی لغت اور قرآن و حدیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ولی کا لفظ حسب ذیل معانی میں استعمال کیا جاتا ہے۔

(۱) قریب (۲) دوست (۳) بااختیار نگران کار (۴) کارساز (۵) مددگار (۶) تابع و مطیع (۷) ساتھی (۸) وارث

ان تمام معانی پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ محبت اور قرب لفظ ولی کا اساسی معنی و مفہوم ہے اور اسی مناسبت سے دوسرے معانی بھی پیدا ہوئے ہیں۔ ان الگ الگ معانی کے لیے ولی اور اولیاء کا لفظ قرآن میں کم استعمال ہوا ہے البتہ یہ لفظ ایک جامع اصطلاح کی حیثیت سے قرآن میں زیادہ آیا ہے اور اس کا استعمال چار صورتوں میں ہوا ہے۔

(۱) اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان بندوں کا ولی ہے۔

(۲) اللہ کے مومن بندے اس کے اولیاء ہیں

(۳) شیطان کافروں اور مشرکوں کا ولی ہے

(۴) کافر و مشرک شیطان کے اولیاء ہیں

اللہ تعالیٰ جب اپنے آپ کو مومنوں کا ولی کہتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وہ ان کا دوست ہے، اس کی رحمت ان سے قریب ہے۔ وہی ان کا کارساز و مددگار، وہی ان کا رفیقِ اعلیٰ اور وہی کمالِ اختیار نگرانی ان کی محافظ ہے اور وہ جب مومنوں کو اولیاء اللہ قرار دیتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ مومن بندے اس کی محبت کے متوالے، اس کی رحمت و نظرِ عنایت کے آرزومند، اس کی نصرت و کارسازی پر بھروسہ کرنے والے، اس کے اشاروں پر چلنے والے، اس کی رضا و رغبت کے جویا، اور اس کی مرضیات میں اپنی مرضیات گم کر دینے والے ہیں۔

-:(باقی آئندہ شمارے میں):-

حیدرآباد کے ۴۰۰ سالہ جشن کے موقع پر

"شاداب" کی یادگار پیشکش

مکتبہ مجلہ

لائبریریز اور ریسرچ اسکالرز کے لئے ایک بہترین تحفہ

میاں ظفر احمد

تلاوتِ قرآن

اکثر محفلوں میں یہ بات سننے میں آتی ہے کہ محض ناظرہ قرآن پڑھنے سے کیا فائدہ طوطے کی طرح صبح صبح اٹھ کر قرآن کو رٹنے سے کیا مطلب ہے یہ بات وہ لوگ بھی کہتے ہیں جو کبھی بھولے سے بھی قرآن پاک اٹھا کر نہیں دیکھتے' مجھے اس قسم کی بحث سے قلبی تکلیف پہنچتی ہے لیکن اس بات پر تو اعتراض نہیں کہ ان کے گھروں کے لڑکے لڑکیاں سستی کہانیاں' جنسی اور جاسوسی ڈائجسٹ کیوں پڑھتے' اعتراض ہے تو اس بات پر کہ قرآن پاک کو بغیر سمجھے بوجھے کیوں پڑھتے ہیں یہ بات بہت اچھی ہے کہ قرآن پاک کو ترجمہ اور تفسیر کے ساتھ سمجھ کر پڑھنا چاہیئے' مگر اچھے لوگ کچھ گھروں کی عورتیں' لڑکے لڑکیاں صرف قرآن کا متن ہی پڑھتے ہیں تو اس پر زبان طعن دراز کرنے کا کیا جواز ہے' ارے بابا کوئی فضول سی کتاب نہیں پڑھتے قرآن کی تلاوت کرتے ہیں جو انسان کا کلام نہیں بلکہ جس کا ہر نقطہ' حرف سطر اور سورۃ باری تعالیٰ کا کلام ہے' آخر اللہ تعالیٰ کے مقدس کلام کو پڑھنے پر ایک تو اعتراض کیوں ہے پڑھنے والوں کی کیوں حوصلہ شکنی کرتے ہیں' کیوں نہیں سوچتے تلاوتِ قرآن بھی اس طرح کرنا بھی عین عبادت اور ثواب کی بات ہے ایسا کہنے سے پہلے ذرا تلاوتِ قرآن کی عادت تو اپنے اندر پیدا کر کے دیکھا ہوتا' پھر دیکھیے کہ اس طرح پڑھنے میں کیا حلاوت و لطافت ہے۔ اپنی صبح کا آغاز تلاوتِ قرآن پاک سے کر کے تو دیکھو کہ تمہیں کیا ملتا ہے' تم تو اب اتنے مصروف ہو چکے ہو کہ اس کے لئے تمہارے پاس وقت ہی نہیں رہتا' سارے کاموں کے لئے وقت ہے اگر وقت نہیں ہے تو صرف قرآن پاک کے پڑھنے کے لئے نہیں۔

ہمارے معاشرہ کا یہ وہ طبقہ ہے جو کیسٹ یا ٹیلی ویژن یا ریڈیو کے ذریعہ قرآن پاک کی

تلاوت تو سن لیتا ہے ان کے لئے قرآن پاک پڑھنے کے برابر ہے، کون اس جھمیلے میں پڑنے جائے قرآن پاک پڑھنے کے لئے پہلے اپنے کو طاہر و پاک کرو، وضو بناؤ اور با ادب ہو کر قرآن مبین کو لے کر بیٹھو اور پڑھو، بھلا اس زمانہ میں اتنا وقت کس کے پاس ہے، پھر جب یہ کام کیسٹ، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعہ ہو جاتا ہے تو قرآن پاک پڑھنے کی ضرورت ہے، شیطان کا کمال ہے کہ وہ کس کس طرح ایسے لوگوں کو دلاسا دے کر محض قرآن پاک ناظرہ بھی پڑھنے سے روکتا ہے۔

ہائے ہائے وہ بھی کیا زمانہ تھا جب علی الصبح گھر سے باہر نکلتے تھے گاؤں کی گلیوں سے گزرتے ہوئے ہر گھر سے قرآن پاک کی تلاوت کرنے کی آواز سنائی دیتی تھی، گھروں کی عورتیں لڑکیاں سویرے سویرے پہلے یہی کرتی تھیں، پھر اپنے گھر کے دوسرے کام دھندے شروع کرتی تھیں، بدلے زمانے میں اس منظر کو دیکھنے اور سننے کے لئے آنکھیں اور کان دونوں ترستے ہیں، اس کے لوگو تھوڑی دیر کے لئے آنکھیں بند کر کے اس زمانے کا تصور کر کے تو دیکھو، جب جب گاؤں کی گلیوں سے گزرتے ہوئے اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، الحمد للہ رب العالمین، یٰسین والقرآن الحکیم، الرحمٰن علم القرآن، جیسے بول کانوں میں پہنچتے تھے، وہ منظر کیسا ہوتا تھا، جب صبح کا منظر ایسا ہوتا تھا تو پھر کچھ شام کا عالم کیسا ہوتا ہوگا۔

جو لوگ پابندی سے قرآن پاک کی تلاوت کرتے ہیں ان کی اپنی خوبی کا لوگوں کو شاید اندازہ نہیں کہ معنی اور مطلب سے قطع نظر صرف قرآن کا متن اور ناظرہ ہی پڑھتے رہنے سے انہیں کیا ملا، اس حال میں بھی قرآن کی تلاوت نے کیا کچھ عطا کیا، ان کو کتنا روحانی سکون اور طمانیت قلب نصیب ہوا، اس لئے کہ طمانیت قلب ذکر الٰہی سے ہی نصیب ہوتا ہے اور قرآن کی تلاوت سے بڑا اطمینان قلب کے حصول کا کوئی اور دوسرا ذریعہ کیا ہو سکتا ہے قرآن پڑھنے والے ایسے لوگ ہی قرآن کو یقین صادق کے ساتھ پڑھتے ہیں کہ وہ جو کچھ پڑھ رہے ہیں یہ کلام اللہ ہے اور پھر ایسے ہی لوگ کے قلب پر وہ کیفیت طاری ہوتی ہے جس کی طرف حکیم الامت علامہ اقبالؒ کے والد بزرگ نے اشارہ

یہ کہہ کر متوجہ کرایا تھا کہ ؎

"تلاوت قرآن پاک یوں کرو جیسے یہ کتاب تم پر نازل ہو رہی ہو"

اور جس کا تذکرہ خود علامہ اقبال نے اپنے شعر میں اس طرح کیا ؎

تیرے ضمیر پہ جب تک ہو نزول قرآن
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف

۳ سچ جانیئے جو لوگ قرآن کو ناظرہ اور بغیر ترجمہ کے بھی اس طرح پڑھتے ہیں اللہ انہیں قلب و نظر کی پاکیزگی جیسی نعمت سے سرفراز کرتا ہے، یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ پھر اس پابندی سے قرآن پاک کی تلاوت کرنے والے حافظ قرآن نہ ہوتے ہوئے بھی ان کو قرآن کے اکثر مقامات اسی طرح ازبر یاد ہوتے ہیں کہ وہ ہر اس شخص کو جو قرآن غلط پڑھ رہا ہو، راہ چلتے ٹوک دیتے ہیں، جہاں غلط پڑھ رہا ہو، قرآن ان کی زبان پر اتنا چڑھ چکا ہوتا ہے کہ وہ چھوٹے موٹے حافظ بن چکے ہوتے ہیں، ان کے سینوں میں قرآن کا محفوظ ہو جانا کیا کوئی معمولی نعمت ہے۔ یہ بھی مشاہدہ میں آیا کہ ایسے شخص کے سامنے جب کوئی عالم یا مفسر قرآن کی ریاست کا مفہوم یا تفسیر بیان کرتا ہے تو وہ اس مقام اور آیت جس کا معنی مفہوم اور تفسیر بیان کیا گیا اس کو باآسانی سمجھ لیتا ہے اور یوں حافظ، قاری، عالم مفسر نہ ہوتے ہوئے بھی وہ قرآن کے اکثر مقامات کے مفہوم و مطالب سے واقف و آگاہ ہو جاتا ہے گویا اس آدمی کے قلب و ذہن پر بھی کام کرتا ہے، جیسے سونا پر سہاگہ۔ کیا یہ دولت ان کو نصیب ہو سکتی ہے جو قرآن کو صرف محض اس لئے نہیں پڑھتے کہ وہ معنی و مطلب سے آگاہ ہونے کی استعداد نہیں رکھتے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو شیطان کے وسوسوں سے محفوظ رکھے۔ آمین

قلمکار حضرات اپنی تخلیقات صاف اور خوشخط روانہ کریں، تخلیقات کا طبع شدہ ہونا ضروری نہیں۔

ایم اے شیدا

صیہونی تاریخ پر ایک نظر

اسرائیل کے توسیع پسندانہ عزائم صرف عربوں ہی کا مسئلہ نہیں بلکہ پورے عالم اسلام کا مسئلہ ہے کیونکہ اسرائیل نے مسلمانوں کے قبلہ اول القدس شریف پر غاصبانہ قبضہ کر رکھا ہے وہ یروشلم کو اپنا دارالحکومت بنانے کا اعلان کر چکا ہے اور اب مسلمانوں کی حرمت کے مرکز پر آنکھیں لگائے بیٹھا ہے میں یہ سمجھتا ہوں کہ اہل قلم حضرات کا یہ اولین فرض ہے کہ مسلمان قوم کی نئی نسل کو اپنے قبلۂ اول کے پس منظر سے روشناس کرائیں۔ آئیے ہم اس ضمن میں ہم اپنی گفتگو کا آغاز کریں۔

بیت المقدس جن دو متوازی پہاڑوں کے درمیان واقع ہے ان میں سے مغربی پہاڑ کا نام صیہون ہے جو بلندی میں دوسرے پہاڑ کی نسبت زیادہ ہے یہ وہ مقام ہے جہاں حضرت داؤد علیہ السلام کا مزار موجود ہے بخت نصر نے جب بیت المقدس کو مسمار کیا تو یہودی بھاگ گئے اور مختلف ملکوں میں جا کر پناہ گزین ہوئے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق تقریباً ۱۳۰۰ برس جب تک بیت المقدس مسلمانوں کے پاس رہا۔ یہ لوگ سرزمین حجاز سے شام اور شام سے پرتگال اور پھر بالترتیب اسپین پھر انگلینڈ اس کے بعد فرانس پھر بلجیم اس کے بعد چیکوسلواکیہ اور پھر فرانس چلے گئے تو ہالینڈ آ بسے پھر روس چلے گئے اس کے بعد جرمنی چلے گئے مگر اس بدلتی دنیا میں یہ لوگ تعلیم و تجارت، سائنس و صنعت کے راستے مختلف ملکوں میں پاؤں جماتے رہے۔ اٹھارویں صدی میں کلیسائے انگلستان نے ان کی تذلیل کے لئے انہیں خاص قسم کا لباس پہننے کا پابند بنایا اور لوگوں کو آگاہ کر دیا تاکہ وہ ان کی شرانگیزیوں سے محفوظ رہ سکیں۔

سیاسی تحریک کا آغاز ستر ہویں صدی کے اوائل میں آفریقہ کی ریاست "ویانا" سے ہوا جب ویانا نامی کے ایک یہودی نے اپنا رسالہ "ریاست یہود" کے نام سے جاری کیا جس میں یہودیوں کا نعرہ سلیمان دیا گیا اور اپنے مقاصد تحریک کو متعین کیا۔ یعنی تمام یہودیوں کا ایک علاقہ میں جمع ہو جانا جو کنعان، حبرون اور بیت المقدس کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا ابتدا ہی میں انگلینڈ میں یہودی کمیونٹی کے سربراہ لارڈ اتھس چائلڈ جو کہ دولت کا سرچشمہ تھا میدان میں آ گیا جس نے سوئٹزر لینڈ کے ایک شہر میں ایک کانفرنس منعقد کی جس کا اصل مقصد فلسطین میں یہودیوں کے لئے "ہوم لینڈ" حاصل کرنا تھا ابتدا رفتہ رفتہ ابتدا روس میں موجود یہودیوں نے فلسطین کا رخ کیا اس وقت یہاں ترک عثمانیہ کے سلطان عبدالحمید حکمران تھے۔ ممتاز تجارتی اداروں، نامور برطانوی سیاستدانوں اور سرمایہ داروں نے سلطان مذکور پر مکمل دباؤ ڈالا وہ یہودیوں کو یہاں رہنے کے لئے مکمل شہری حقوق دیں اور آبادکاری کے لئے سہولتیں فراہم کریں۔ اس سلسلے میں سلطان کے دوست جرمن کے حکمران قیصر ولیم کو مجبور کیا گیا کہ وہ اپنے تعلقات کو استعمال کریں۔ یہودی کمیونٹی نے ترک عثمانیہ کے تمام قرضوں کی ادائیگی اور ایک ملٹری فلیٹ کی تشکیل و تعمیر کے تمام اخراجات برداشت کرنے کا لالچ بھی دیا مگر جب سلطان اس پر بھی راضی نہ ہوئے تو ملک میں انتشار پھیلانے کی جستجو میں لگ گئے۔ آخر ترک نوجوانوں کی سوسائٹی آف یونین اینڈ پروگریس کے راستے داخل ہو کر سلطان عبدالحمید کا تختہ الٹنے میں کامیاب ہو گئے۔ سلطان کی معزولی کے بعد جو کابینہ بنی اس میں تین مرکزی وزیر یہودی تھے بالآخر ۱۹۱۴ء میں یہودیوں کو حکومت کا حق حاصل ہو گیا اس اثناء میں یہودیوں نے جرمنی اور انگلستان کے ساتھ عرب علاقوں سے ترک عثمانیہ کی اجارہ داری ختم کرنے کا بھی سودا کر لیا چنانچہ اس کام کو لارنس آف عربیہ نے عربوں کا ہمدرد بنا کر سرانجام دیا اس نے عربوں کی زبان اور وضع قطع اختیار کر کے ان کے دل جیت لیے یہاں تک کہ عرب اس کی امامت میں نماز بھی ادا کیا کرتے تھے۔ چنانچہ اس کا ردعمل یہ ہوا کہ ۴ رجون ۱۹۱۴ء کو ترکی قلمرو کی سرزمین فلسطین سے بغاوت کا علم بلند

تھا اور ۲ سال کے مختصر عرصہ میں ترکی عرب علاقوں سے دستبردار ہو گیا اس دوران جب جنگ عظیم شروع ہو گئی تو یہودیوں نے جرمن سے سودے بازی کرنے کی کوشش کی مگر جرمن نے ترکوں کا حلیف ہونے کے ناطے سے بات کو درگزر کرتے رہے تو یہودی سرمایہ داروں نے انگریزوں کے ساتھ ساز باز شروع کر دی سودا طے پا جانے پر یہودی پروفیسر ڈاکٹر حیم ویزمین نے برطانوی حکومت کو بعض ایسے کیمیاوی راز دئیے جس کی بدولت جنگ کے اخراجات تین چوتھائی رہ گئے اور برطانیہ کو جنگ میں برتری حاصل ہو گئی اس خدمت کے صلے میں فلسطین کو یہودیوں کے حوالے کر دینا کوئی مہنگا سودا نہ تھا۔

ان تدبیروں سے یہودی ۱۹۲۸ء میں تقریباً ڈیڑھ کروڑ اراضی پر قابض ہو چکے تھے جب کہ دوسری عالمی جنگ کے وقت فلسطین میں یہودیوں کی تعداد ساڑھے چار لاکھ سے زائد ہو چکی تھی۔ ۱۹۳۶ء میں حکومت برطانیہ نے فلسطین میں ایک مجلس قانون تشکیل دی جس کے کل ممبران کی تعداد ۲۲ تھی جبکہ ان میں ۱۱ یہودی تھے اس بے انصافی کے خلاف مسلمان جھنجلا اٹھے جس پر انہوں نے عام ہڑتال کا اعلان کر دیا۔ مفتی اعظم فلسطین احمد علی پاشا کی سربراہی میں بین الاقوامی ہڑتالوں کا سلسلہ تقریباً ۸ ماہ تک جاری رہا۔ جس نے تمام دنیا میں ایک تہلکہ مچا دیا اور درآمد کنندگان کی تجارت کا پہیہ اور آبادی یہودی بھوکے مرنے لگے دفاتر ویران ہو گئے یہاں تک کہ ہڑتال نے اس قدر شدت اور قوت اختیار کر لی کہ برطانوی حکومت نے ڈائنامائٹ کے ذریعے تحریک کے اہم مراکز اڑا دیئے مگر ہڑتال بدستور جاری رہی حتیٰ کہ خود انگریز افسروں نے برطانوی طرز عمل کے خلاف احتجاج شروع کر دیا تو انگریزوں نے چند مفاد پرست عرب شیوخ اور شاہوں کو ساتھ لے کر گول میز کے گرد بیٹھ کر مفاہمت اختلاف کا راستہ اختیار کر لیا۔ ۱۶ اکتوبر ۱۹۳۶ء کو ہڑتال ختم کر دی گئی اور لارڈ پیل کی قیادت میں ایک شاہی کمیشن قائم کر دیا گیا اس طرح انگریز ایک تیر سے دو شکار کرنے میں کامیاب ہو گئے انہوں نے کمیشن قائم کرنے کے بعد عوام الناس کو اس کے قائم کرنے کے بارے میں غلط تاثرات دیئے جس پر یہودیوں نے معاہدہ کا بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ کیا جس پر برطانیہ نے اعلان کیا کہ شاہ اور عرب لیڈر ہڑتال ختم کریں

[illegible] نے [illegible] سربراہوں اور عوام میں نفرت کی خلیج کو بڑھا دینے کا کام کیا۔ [illegible] نے عرب ہائی کمان کو خلاف قانون قرار دے کر ممبران کی بھاری تعداد کو جلا وطن کر دیا اور مفتی اعظم کی گرفتاری کے لئے بیت المقدس کا محاصرہ کر لیا مسلم اوقاف اور مسلم علاقوں کی عدالتوں کو ختم کر دیا گیا ہزاروں گھروں کو مسمار اور مسلمانوں کو شہید کر دیا گیا۔ ۱۸۰ سرکردہ مجاہدین کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ حکومت برطانیہ کی ان ناانصافیوں کے دوران دوسری عالمگیر جنگ کا آغاز ہو گیا اور یہودیوں کی [illegible] نے خود ان کا گھیراؤ کر لیا یہاں تک کہ یہودی خود کو یہودی کہتے ہوئے گھبراتا تھا کہ [illegible] گیس چیمبر میں نہ پھینک دے۔ صیہونی ایجنٹوں نے قانونی و غیر قانونی طریقوں سے بے تحاشا طور پر ان کو ملک میں دھکیلنا شروع کر دیا۔ امریکہ کی اتحادیوں میں شمولیت کے بعد گویا یہودیوں کو اتحادی طاقتوں میں موثر اور فعال حیثیت حاصل ہو گئی۔

[illegible] جنگ کے بعد برطانیہ کی حیثیت کو زبردست دھکا لگا اور یہودی سرمایہ کی اجارہ داری کا سرچشمہ بن کر ابھرا۔ برطانوی وزیر اعظم سر ونسٹن چرچل کی زبردست مخالفت کے باوجود برطانوی [illegible] نے برطانوی حکومت کو یہودی کسی کارروائی پر عملاً گرفت نہ کرنے دی البتہ [illegible] ان کو گرفتار کیا جاتا رہا۔ بالآخر ۱۴ مئی ۱۹۴۸ء کو برطانیہ نے [illegible] کے [illegible] فلسطین سے دست کش ہونے کا اعلان کر دیا۔ چھ بج کر ایک منٹ پر یہودیوں نے تل ابیب میں اسرائیلی حکومت کے قیام کا اعلان کیا۔ دس منٹ بعد امریکہ نے اور پندرہ منٹ بعد روس نے تسلیم کر لیا اس کے ساتھ ہی عرب مسلمانوں پر یہودی حملوں کا اضافہ ہو گیا اور اقوام متحدہ خاموش رہا۔ ۱۹۴۸ء کی عارضی صلح کے بعد یہودی اسلحہ کی خریداری کے لئے یورپ اور امریکہ میں پھیل گئے۔ امریکی یہودیوں نے فراخدلی کے ساتھ عطیات دیئے جب صلح ختم ہوئی تو یہودی فوج کو ایک مختصر لیکن موثر فضائیہ اور ایک چھوٹی مگر مضبوط بحریہ کی حمایت حاصل تھی۔

قیام اسرائیل کے بعد سے یہودیوں کا ہر قدم یہودی قوم کو ایک جنگجو فوج میں بدلنے کے لئے وقف رہا۔

سیاسی حیثیت سے ہر موقع پر امریکہ اور اس کے ساتھی یہودیوں کی پشت پناہی کرتے رہے جن
کی حمایت کی وجہ سے اقوام متحدہ اس کی پے در پے زیادتیوں کا تدارک نہ کر سکی۔ یہ موضوع اپنی جگہ پر
تفصیل چاہتا ہے۔

اس امر سے پوری دنیا واقف ہے کہ اسرائیل نومبر ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۰ء تک اقوام متحدہ
کے ۷۰ ریزولیشن مسترد کر چکا تھا اسرائیل کی بے باکی اور جرأت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا
ہے کہ جون ۱۹۶۷ء کی جنگ کے بعد جب جنرل اسمبلی کا اجلاس شروع ہونے والا تھا کہ اسرائیل کے وزیر اعظم
لیوی اشکول نے علی الاعلان کہا کہ اگر اقوام متحدہ کے ۱۲۲ ارکان میں سے ۱۲۱ بھی فیصلہ دیں اور تنہا
اسرائیل کا ووٹ ہی ہمارے حق میں رہ جائے تب بھی ہم اپنے علاقوں سے نہیں نکلیں گے۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ امت مسلمہ باطل قوتوں کے خاتمہ کے لئے آپس میں اختلافات [illegible]
کریں اور اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کریں تاکہ ایک سیسہ پلائی ہوئی قوم بن کر صیہونی قوتوں کا مقابلہ
کیا جا سکے۔

(سہ روزہ دعوت سے ماخوذ)

(باقی سلسلہ صفحہ ۳۶ سے آگے):

اور بیٹے ہیں۔ ان کے علاوہ مناظر قدرت (برائے تحریک علم السموات والارض) قرآنی قصے۔
قرآنی نظمیں اور پہیلیاں داخل نصاب کیے گئے ہیں اور تقریباً تیرہ دن کے اسباق تیار کر دیئے
گئے ہیں تاکہ استاد کو ایک نیا موڑ دینے میں دشواری نہ ہو اور بچے کو درسیات تیار کرنے کے لئے
بہ منزلہ مشق کے ہوں۔

امید ہے کہ درون خانہ، بیرون خانہ اور مکاتب میں داخل ہونے والی یہ قرآنی ہدایات ملت میں
ایک نیا ولولہ پیدا کر دیں گی جس کی بنیاد قرآن اور جس کا عمل حکمت قرآن کا تابع ہو تاکہ بھٹکے ہوئے ماحول
اور بھٹکے معاشرے کو راہ راست نصیب ہو جائے جو تخریب، ظلم اور بربریت کے بادل چھائے ہوئے
اس کام میں شرکت وقت کی اہم ترین [illegible] [illegible]
ہوئے نظر آ رہے ہیں اور ایک ایسے متبادل اور متوازن نظام کی عالمی تلاش شروع ہو گئی ہے جو آگ کے
بڑھتے ہوئے شعلوں کو بجھا سکے۔ یہ موقع قرآنی نظام کے لئے سازگار [illegible]

سید حامد
صدر انجمن ترقی اردو ہند - ہمدرد نگر، تغلق آباد

دینی تعلیم
تجزیہ و تجاویز

یہ مقالہ خدا بخش اورینٹل لائبریری، پٹنہ کے زیر اہتمام "دینی مدارس" پر سیمینار' منعقدہ ۷، ۸، ۹ مئی ۱۹۹۰ء (رانچی) کے لیے لکھا گیا۔ "تہذیب الاخلاق" اگست ۹۰ سے اخذ کر کے قارئینِ شاداب کی نذر ہے (ادارہ)

دینی تعلیم کے موجودہ نظام میں بہت سی خامیاں ہیں' حیرت اس بات پر نہیں بلکہ اس بات پر ہے کہ نامساعد حالات اور موجودہ رفتار زمانہ کے باوجود یہ نظام چل کیونکر رہا ہے۔ دینی مدارس نے ذرائع کی کمی کے باوجود دین کی اشاعت اور حفاظت کے لئے جو کام کیا ہے وہ گراں قدر بھی ہے اور حیرت انگیز بھی۔ ان مدارس کا جو تجزیہ بھی کیا جائے' جو جائزہ بھی لیا جائے اس کا آغاز ان کے معلموں اور منتظموں کی فراموش اور بیش بہا خدمات کے اعتراف سے ہونا چاہیے۔ انھوں نے یہ سب کچھ اللہ کے سہارے' اپنے بل بوتے پر کیا۔ ٹوٹے پھوٹے مدرسے اور ان کے خستہ حال معلم ارتداد کے فتنے اور بے دینی کے سیلاب کے آگے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر کھڑے ہو گئے۔ یاد کیجئے ہم میں سے کوئی کبھی بھی ان کی دستگیری کے لیے آگے بڑھا؟ اس لیے اب ہمیں یہ زیب نہیں دیتا کہ ان مدارس کی طرف ترحم یا تحقیر سے دیکھیں یا اونچائی پر بیٹھ کر ان کی اصلاح یا نقلِ ہیئت یا تنظیم نو اور تجدید کا بیڑا اُٹھائیں۔

اگر ہم دل سے چاہتے ہیں کہ ہمارے مدارس کی حالت میں بہتری آئے تو ہمیں پہلے ہی کچھ باتوں کو

پہلو میں باندھنا پڑے گا۔ ناواقفیت یا لاعلمی میں کوئی قدم اٹھانے سے نفع کے بجائے نقصان کا اندیشہ ہے اگر ہم المدرسوں کے نظام کو ناکارہ سمجھتے ہیں اور ان کی ہمہ جہت اصلاح کے درپے ہیں تو ہمیں یہ سوچنا پڑے گا کہ متبادل نظام تعلیم کیا ہو اور کیا اس متبادل نظام کو چلانے کے لیے ہمارے پاس مالی، افرادی اور تنظیمی وسائل موجود ہیں یا فراہم کیے جا سکتے ہیں اور کیا ہمیں یقین ہے کہ ہم نئے نظام کو فراہمی وسائل کے بعد سلیقہ، لیاقت، اتحاد اور مستعدی کے ساتھ چلا سکیں گے۔ اس بات کا اعتراف شروع میں ہی کر لینا مناسب ہوگا کہ آزاد ہندوستانی مسلمانوں کے اندر کسی بڑی مہم کو سر کرنے یا کسی بڑے ادارے یا نظام تعلیم کو ڈھنگ سے چلانے کی صلاحیت ہے ہی نہیں اور جس مشترک صلاحیت ہم میں سرے سے ہے ہی نہیں، اس کے خواب دیکھنے سے کیا حاصل! فی الحال ہمیں مرکزیت سے گریز کرنا چاہیے۔ چھوٹی چھوٹی مقامی کوششوں کو جڑ پکڑنے اور بار آور ہونے دیجیے۔ ابھی ان مدرسوں اور مکتبوں کو نہ چھیڑیے کہ ایک بار ان میں فساد آ گیا تو پھر کسی کے روکے نہ رکے گا لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ کام بننے کی جگہ بگڑ جائے گا۔

اس بات کی ضرورت سے البتہ انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دینی مدارس کے بارے میں ایک جگہ اطلاعات اکٹھی ہونی چاہئیں۔ ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی، نئی دہلی نے انگریزی اسکولوں [illegible] کے ملک گیر سروے کے بعد دینی مدارس کا سروے شروع کیا تھا مگر اس میں قدم قدم پہ دشواریاں پیش آئیں اور آخر میں یہ محسوس ہوا کہ سوال نامے کے جواب میں جو اطلاعات ملی ہیں وہ قطعی خیز نہیں ہیں، نہ ان پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ ادھوری اور غیر معتبر رپورٹ کو شائع کرنا مناسب نہیں سمجھا گیا۔ اچھا ہو کہ مجوزہ سیمینار میں اس مسئلہ پر بھی غور کر لیا جائے۔ اگر ان مذاکرات سے کچھ ایسی آہٹیں اور دلچسپیاں ملتی ہیں جو سروے کے احیاء، تجدید اور تکمیل کا تقاضہ کرتی ہیں تو غالباً ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی کو ایسا کرنے میں کچھ تامل نہ ہو۔

راقم سطور نے علی گڑھ میں اپنے قیام کے دوسرے دور میں اپنی بساط کے مطابق

دینی مدارس کے نصاب کی تجدید کے لیے قدم اٹھائے تھے۔ سید ہاشم علی صاحب کے نقد میں پروفیسر مرزا احمد صاحب نے مرکز برائے فروغ سائنس کے ذریعے اس کام کو آگے بڑھایا۔ اس مرکز کے تحت ایک بڑا سیمینار منعقد کیا گیا جس میں دینی مدارس کے نمائندوں نے بڑی تعداد میں شرکت کی اور اس تجویز سے اتفاق کیا کہ نصاب کی تجدید کی ضرورت ہے تاکہ اس میں ریاضی، سائنس اور انگریزی جیسے جدید مضامین شامل کیے جا سکیں۔ تہذیب الاخلاق نے اپنے ایک شمارہ مذکورہ سیمینار کی روداد اور متعلقہ مضامین کے لیے وقف کر دیا۔ مرکز نے ان مضامین کا نصاب تیار کرنے کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لی اور اس دشا میں کچھ قدم اٹھائے۔ راقم سطور لاعلم ہے کہ یہ کام پورا ہو پایا کہ نہیں۔ یہ کام بہرحال کلیدی اہمیت رکھتا ہے اچھا ہو اگر حالیہ سیمینار مسئلہ کے اس پہلو کی طرف خصوصی توجہ دے۔

محسوس کیا گیا تھا کہ ہمارے بڑے دینی مدارس بالعموم تجدید و توسیع نصاب کی تجویز کا خیر مقدم نہیں کر رہے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ صرف استثنا ان لوگوں کی دخل در معقولات کہہ رہے ہوں جنہیں دینی تعلیم سے کوئی سروکار نہیں رہا ہے۔ ان رہنما مدارس سے مشورہ کی ضرورت بہرحال رہے گی۔

یہ بات بھی اوائل تجویز میں ہی واضح ہو چلی تھی کہ

۱۔ رہنما دینی ادارے آوازۂ تجدید پر کان دھرنے والے نہیں ہیں۔

۲۔ ہمارے چھوٹے دینی مدارس اپنی تنگ دستی اور تنگ دامانی کے کارن اس حالت میں نہیں کہ نصاب میں ترمیم کی بات سوچیں۔

اب رہ گئے درمیانی حیثیت اور وسعت کے مدارس۔ ابتدائی کوششوں میں تخاطب انھیں سے ہونا چاہیے کہ وہ تجدید نصاب کی ضرورت محسوس کر رہے ہیں اور متعلقہ تجاویز پر غور کرنے کے لیے تیار ہیں۔ یہاں مشکل یہ آ پڑی کہ اس قبیل کے بیشتر مدارس کی مالی حالت بھی زیادہ اچھی نہیں ہے اور وہ باوجود خواہش اور کوشش کے انگریزی، ریاضی اور سائنس کے اساتذہ کی شرح مشاہرہ کی تاب نہ لا سکیں گے اور جو کفالت کر بھی سکیں ان کے سامنے یہ

پُر خار سوال سر اٹھائے گا کہ معلموں کو تنخواہ کے اعتبار سے دو گروہوں میں تقسیم کرنا کس حد تک جائز ہے اور کہاں تک قابلِ پذیرائی۔ اس دور میں جب کہ تیزی کے ساتھ قیمتیں بڑھ رہی ہیں اور قدریں گھٹ رہی ہیں، یہ اُمید بے سود ہے کہ کوئی معلم مذکورہ بالا تین مضامین میں کسی ایک کو پڑھانے کے لیے کسی عنوان بھی ایثار کو دل میں راہ دے گا یا اسے اپنے مطالبات اور توقعات میں منعکس کرے گا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک ہی ادارے میں ایک بڑا طبقہ ایسے معلموں کا دکھائی دے گا جسے انگریزی، ریاضی یا سائنس پڑھانے والے استادوں سے نصف سے کم تنخواہ ملے گی۔ یہ بات فی نفسہٖ ناروا ہے اور اس میں ان علوم کی تخفیف و تحقیر ہوتی ہے جن کو پڑھانا ان مدارس کا بنیادی اور ابتدائی مقصد ہے۔ یہ وضع اختلاف، یہ شانِ امتیاز دیکھ کر شاگرد، استادوں کے دو گروہوں کا موازنہ جس انداز سے کریں گے وہ ہم سب کی طمانیت کو برہم کر دے گا۔ دینی مدارس کو یہ نصیحت کرنا یا یہ مشورہ دینا آسان ہے کہ وہ جدید مضامین اپنے نصاب میں شامل کر دیں، لیکن ان مضامین کے تقاضوں کے بقدر افرادی اور مالی وسائل فراہم کرنا بہت مشکل ہے۔ اس کا حل صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہندوستانی مسلمان دینی تعلیم کو فراہمیٔ وسائل کی حد تک اہمیت دینا شروع کر دیں۔ موجودہ روش سے اس قسم کی امید نہیں باندھی جا سکتی۔ دوسری مشکل یہ ہے کہ مدارس کی کفالت سرکار اپنے شانوں پر لے لے۔ بہار میں ایسا ہوا ہے اس کے نتائج کے بارے میں متضاد خبریں آتی رہی ہیں یہ بھی کہا گیا ہے کہ سرکار کے سایۂ عاطفت میں آنے کے بعد مدارس کے معلمین نے وہی سبق سیکھے جو عام اسکولوں کے معلموں کو ازبر ہیں۔ مشاہیر دل نے نتیجہ بہر حسرت لگائی ہے، اسے وہ تمکین کے ساتھ جذب نہیں کر سکے۔ خود یو۔پی میں بھی بعض مدارس حکومت کے زیرِ نگیں ہیں ان کا کیا حال ہے اس کی تفصیل میں جانا پڑے گا دوسری ریاستوں میں جہاں بھی مدارس کو سرکاری امداد ملتی ہے اس معاملہ کی کھوج لگانی پڑے گی۔ لیکن وہ مدارس جہاں دین کی تعلیم دی جاتی ہے، سرکاری امداد کے کسی طرح مستحق نہیں ہوں گے۔ علاوہ ازیں دینی مدارس بالعموم سرکاری امداد قبول کرنے کو تیار نہیں ہوتے

کہ [illegible] کرکے کتب اور جارہے ہیں [illegible] کا خطرہ ۔

ہم [illegible] کہ دینی مکاتب و مدارس کا خرچ چلتا کیسے ہے ذکوٰۃ اور چرم قربانی [illegible] کے بجائے [illegible] در بدر کی ٹھوکریں کھانے کے بعد جمع کرکے لاتے ہیں۔ تنخواہوں کے [illegible] کی مدت ان کی مقدار کے برعکس ہوتی ہے۔ محصل جب لوٹ کر آتے ہیں تو رزق کا [illegible] کھلتا ہے اور تنخواہیں بانٹی جاتی ہیں ہمیں یہ ماننے میں تامل نہیں ہے کہ بعض مکاتب و مدارس کی اخلاقی حالت سقیم ہے بعض ان میں سے چندہ فراہم کرنے کا ادارہ بن گئے ہیں لیکن بہ حیثیت مجموعی یہ ٹوٹے پھوٹے، خستہ حال، تنگ داماں مکاتب و مدارس اپنا کام بے نفسی، خاموشی، نظم و ضبط، سادگی اور قناعت کے ساتھ انجام دے رہے ہیں اور اگر لاگت اور نفع کا تناسب نکالا جائے تو یہاں شرح بہت اونچی نکلے گی۔ خرچ کم اور نتیجہ زیادہ۔

مدارس کو [illegible] دینے والے یہ بھی کہتے ہیں کہ دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ حرفتی یا ٹیکنیکل تعلیم بھی دی جانا چاہیے۔ اس تجویز کو ارباب مدارس نے کئی بار اس اعتراض کے ساتھ رد کیا تھا کہ کیا دینی تعلیم کو [illegible] پیشوں کا سہارا چاہیے؟ کیا انسان دینی تعلیم پر قناعت نہیں کرسکتا۔ عصری تعلیم پر قناعت نہیں کی [illegible] عصری تعلیم کو ٹیکنیکل اور ووکیشنل و حرفتی اور پیشہ ورانہ تعلیم سے لیس [illegible] کیا جاتا۔ صرف دینی تعلیم کے ساتھ اس کا رشتہ جوڑنے میں کیا وہ تحقیر کا رد عمل [illegible] ہمارے عصری تعلیم کے فارغین دینی تعلیم کے ساتھ روا رکھتے ہیں؟ یہ رد عمل فاصلے اور بدگمانی کی بنا پر ہے؟ [illegible] تعلیم اگر ہاتھ میں کوئی ہنر آجائے تو وہ زندگی میں زاد راہ کا کام کرتا ہے [illegible] اور آزادیٔ فکر اور صلابت کردار کے برگ و بار لاتا ہے اس اعتراض میں البتہ وزن ہے کہ عربی مدارس کا نصاب یوں ہی اتنا بھاری اور گنجان ہے کہ اگر اس میں پیشہ ورانہ تعلیم کا اضافہ کیا گیا تو اصل نصاب کے ساتھ انصاف نہ ہو سکے گا لیکن [illegible] بات [illegible] ہے اگر یہ حاصل ہو گئی تو مل بیٹھ کر سر جوڑ کر نصاب میں ترمیم کی جا سکتی ہے نصاب کی [illegible] کوئی ایسی دشوار یا ناقابل فہم بات نہیں ہے کہ [illegible] غور سے خارج

ہو۔ علاوہ ازیں متداول نصاب میں [illegible] کی [illegible] [illegible]
منتقل ہیں۔ طالب علموں کی سہولت کے مطابق [illegible] کیے جاسکتے ہیں [illegible] تعلیم [illegible] متبادل
انتظامات کی بہت کچھ گنجائش پہلے سے تھی اب اس وجہ سے [illegible] ملک
بہت زیادہ جو تعلیم کے اعتبار سے آگے ہیں [illegible] خیال [illegible] زور پکڑتا
جارہا ہے کہ ہر نصاب میں ایک بنیادی کورس ہو اور اس کے بعد بہت سے [illegible] بنیادی یا
[illegible] کورس طالب علموں کی ایک کثیر تعداد کے لیے کافی ہوگا جب کہ [illegible] جو طلبا
تعلیم آگے جاری رکھنا چاہتے ہیں وہ بہت سے "[illegible]" [illegible] میں اپنی [illegible]
اور سہولت اور ذوق اور رجحان کے مطابق کچھ کو چن سکتے ہیں۔ ہمارے [illegible] تعلیم [illegible]
اگر اس وضع تعلیم کو اصولاً تسلیم کرلیں تو ہمارے نصاب کے نظام میں [illegible] طالب علموں
کے لیے اتنی سہولت اور انتخاب میں اتنی وسعت و رخصت پیدا ہوسکتی ہے [illegible] تو ان کی
تعلیم میں اضافہ کا باعث ہو۔ [illegible]

[illegible] "[illegible]" "[illegible]" [illegible] تعلیم کا
[illegible] ہے اس نظام کے پیچھے [illegible] [illegible]

۱۔ اُن طالب علموں کو جو پڑھنے اور اپنی تعلیم [illegible] حاصل [illegible]
اور فرصت کے اعتبار سے اسکولوں یا [illegible] مدرسوں [illegible] کا
فرض ہے کہ ان کے لیے گھر بیٹھے ان کی فرصت کے اوقات کے مطابق تعلیم کا انتظام کیا جائے
تاکہ وہ تعلیم سے محروم نہ رہ جانے کا کسی کے پاس [illegible] عذر نہ ہو [illegible]

۲۔ تعلیم کا [illegible] جو کچھ حاصل کیا گیا ہے [illegible] نہ لگ جائے [illegible] [illegible]
[illegible] کچھ بھی تعلیم حاصل کی ہے [illegible] [illegible] علم کو
[illegible] اور چمکاتا رہے۔ [illegible]

اس [illegible] کا انتظام اگر [illegible] تعلیم کی قلمرو میں رائج کر دیا گیا تو [illegible] ہو

اس کے بعد وہ بہت سے کاموں کا بوجھ سنبھالنے کے قابل ہو جائے گا۔ ہمارے بڑے بڑے مدارس اور جامعات اگر سر جوڑ کر بیٹھیں اور اہتمام کریں کہ علمائے دین تعلیم کو جو اسلامی نظام تدریس کے ذریعے عموماً تو سیکھی جا سکتی ہے اور اسے گھر گھر عام ہو سکتا ہے۔ جو کچھ نیا بلا پڑھا ہے اسے دہرا سکتے ہیں، تازہ کر سکتے ہیں تاب دہ سکتے ہیں اور جنہیں دینی تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا، توفیق نہیں ہوئی، وہ بھی اس سے بہرہ مند ہو سکیں گے۔

اب ہم باضابطہ مدارس طرز تعلیم کی طرف واپس آتے ہیں وہ جامعات جن کے پاس وسائل ہیں وہ اپنے یہاں تین دھاراؤں کا اہتمام کر سکتی ہیں۔

۱۔ صرف دینی

۲۔ دینی، جدید مضامین کے ساتھ

۳۔ دینی، حرفتی، ٹیکنیکل یا پیشہ ورانہ تربیت کے ساتھ

طالب علم ان تینوں دھاراؤں میں کسی ایک کو چن سکتا ہے۔ اس طرح علماء کی اس تشویش کا ازالہ بھی ہو جائے گا کہ دینی تعلیم تحلیل نہ ہو جائے۔ جے پور کی جامعہ ہدایت نے دینی تعلیم کے ساتھ حرفتی اور پیشہ ورانہ تعلیم کو داخل نصاب کر لیا ہے۔ یہ شاید پہلا تجربہ تو نہیں لیکن غالباً سب سے منظم تجربہ ہے۔ شاہ عبدالرحیم صاحب محترم اس اقدامیت کے لیے سپاس و ستائش کے مستحق ہیں۔

"کس طرح پڑھایا جائے؟" یہ بات "کیا پڑھایا جائے" سے کم اہم نہیں ہے۔ طرز تعلیم کی تجدید پھر تو کسی طور اس سے اعتراض نہیں ہو سکتا، طرز تعلیم، مواد تعلیم کے تعلق سے غیر جانب دار ہوتا ہے گزشتہ دو سو سال میں خصوصاً پچھلے سو سال کے اندر طریق تدریس یعنی پڑھانے کے ڈھنگ میں ایسی تبدیلیاں ہوئی ہیں جن کا ساتھ دینے کی کوشش کیجئے تو سانس پھولنے لگے۔ کچھ بے اعتدالیوں سے قطع نظر، یہ تبدیلیاں موزوں اور صحت مند ہیں اور انسان کے ذہنی نشوونما کی ضروریات کو ملحوظ رکھتی ہیں۔ رٹنے اور یاد کرنے سے زیادہ سمجھنے پر زور دیا گیا ہے حافظہ کی سخت گیری انچھی کھلنے لگی ذہن

کی کمزوری اس سے افضل ہے۔ لیکن تو یہ دونوں باہم گتھے ہوئے ہیں۔ تجربات یا دیکھا [illegible]
محسوس ہو سکتی ہے۔ یاد رکھیے کہ جو بات سمجھ لی گئی اسے کوئی مٹا نہیں سکتا۔ حافظہ کی گرفت میں
پورے مکان کا نقشہ آجاتا ہے سمجھ یا فہم یا ذہن یا ادراک رفتہ رفتہ پروان چڑھتا ہے [illegible]
اور جب تک کہ اسے پتہ نہ چل جائے کہ مکان کیوں بنایا گیا، کیسے بنایا گیا اور اس کے بنانے کے
کیا طریقے ممکن ہیں وہ آگے نہیں بڑھتا۔ حافظہ سے مفر تو ہرگز نہیں کیونکہ ذہن کی عمارت
حافظہ کی بنیاد پر کھڑی کی جاتی ہے لیکن بنیاد کو بنیاد کی حد میں رکھنا چاہیے۔ اسے دیوار اور
صحن اور چھت سب کچھ سمجھ لینا خود حافظہ کے ساتھ زیادتی ہوگی حافظہ کا شعبہ اس طرح بگڑ گیا۔
جس طرح کہ انسانیت بٹوارہ قبول نہیں کرتی اسی طرح علم بھی ناقابل تقسیم ہے۔ علماء نے
صدیوں کے تجربے کی روشنی میں تعلیم و تدریس کے نئے نئے طریقے ڈھالے ہیں تو ان طریقوں کا
چلن اور ان کی افادیت دینی اور عصری تعلیم دونوں کے لیے یکساں ہے۔ دینی تعلیم کو ان سے محروم کرنا
صریح کفران نعمت ہے اور دینی تعلیم کے ساتھ زیادتی۔ طرز تدریس یا "پیڈاگوجی" کی دریافتوں سے
منہ پھیر لینا خود اپنا نقصان کرنا ہے۔ آپ ان کو تحت نظر لائیے ان پر غور کیجیے، انھیں اپنے
منصوبوں، موضوعات اور مقاصد کے مطابق ڈھالیے۔ ان میں ضروری ترمیم کیجیے اور اس کے
بعد انھیں وسیع پیمانے پر اختیار کر لیجیے۔

دینی تعلیم کو مہر بند رکھنے سے کام نہ چلے گا۔ ہم اس طرح کی افادیت کو مسدود کر دیتے ہیں
اسے نظر کی اس تازگی سے محروم کر دیتے ہیں جس کے بغیر علم مرجھانے لگتا ہے۔ دینی تعلیم کے عزیز
عناصر کو صدیاں پھلانگ کر عہد حاضر میں لانا ہے۔ ان میں نئے مضامین کی خاطر گنجائش پیدا
کرنی ہے۔ غور فرمائیے اگر ہماری دینی تعلیم عالمی آگاہی کے دروازے اپنے اوپر بند کر دے گی تو
اس کے فارغین اپنے گرد و پیش اور ان مسائل سے جو عہد حاضر نے پیدا کیے ہیں یا کیے ہیں بے خبر رہ
جائیں گے وہ اسلام کی نہ تو وضاحت کر سکیں گے نہ اشاعت۔ نہ اس بات کو عملی جامہ پہنا سکیں
گے کہ اسلام دین فطرت ہے، اسلام ضابطۂ حیات ہے جو حیات ہے اور اس کو قائم رکھنے [illegible]

بسبب بہت سے مسائل سے تو آپ نے منہ موڑ لیا، پھر ضابطہ کا اطلاق آپ کاہے پر کریں گے ؟

ہمارے بہت سے گھروں میں قرآن کریم کو خیر و برکت کے لیے جزدان میں لپیٹ کر طاق پر رکھ دیا جاتا ہے۔ یہی روش ہم نے اس کی تعلیمات کے ساتھ بھی روا رکھی ہے۔ اگر ایسا ان مذاہب کے ماننے والے کرتے ہیں، جہاں مذہب کا ایک ستون رہبانیت ہے اور جہاں دنیا سے کنارہ کشی کار ثواب گنی جاتی ہے تو بات کچھ کچھ سمجھ میں آجاتی، لیکن یہاں تو یہ طریق ایک ایسی شریعت میں اختیار کیا جارہا ہے جہاں ساحل پر کھڑے ہو کر طوفان کا نظارہ کرنا ممنوع اور مذموم ہے نتیجہ کیا ہوا روزمرہ کی زندگی سے مذہب کے نقوش اثر مٹتے چلے گئے۔ مذہب ظواہر عبادات سے عبارت کیا جانے لگا۔ افکار و اعمال اور اخلاق و اطوار میں سرایت ہونا درکنار ان پر اس کی پرچھائیں پڑنا بھی کم ہوتے ہوتے بند ہو گئی۔ وہ فارغین مدارس جنھیں عصری آگہی سے کوئی سروکار نہیں رہا، وہ دوسروں کے لیے اسلام کی نہ تشریح کر سکیں گے نہ تبلیغ اور اس پر آئے دن جو حملے ہوتے رہتے ہیں ان کا دماغ بھی ان کے بوتے کی بات نہیں ہے۔

دینی مدارس کی تعلیم، مواد، موضوع اور طریق تدریس کے تعلق سے انقلاب انگیز اور عہد آفریں تبدیلیوں کی طالب ہے۔ ان کی ضرورت سے اگر آنکھ موند لی گئی تو ٹوٹے میں نہ صرف دینی تعلیم رہے گی بلکہ عام مسلمانوں کا فہم دین مجروح ہوگا اور دین کے بارے میں جو الزامات لگائے جارہے ہیں اور غلط فہمیاں اور بدگمانیاں پھیلائی جارہی ہیں ان کے سیلاب کے آگے ہم پسپا ہوتے چلے جائیں گے دینی تعلیم کے نصاب کے بارے میں عالم اسلام کو مل کر ورزش اور کوشش کرنی چاہیئے نئے طریق تدریس کو اپنانے کے لئے تو اس کی ضرورت بھی نہیں۔

لیکن سلسلہ اصلاح کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمیں اس طرح بہالے جائے کہ دینی تعلیم کی بنا ر جیسی بھی وہ اس وقت ہے خلل پذیر ہونے لگے۔ اگر خدا نخواستہ ایسا ہوا تو یہ بہت بڑا نقصان ہوگا پہلے تو ہمیں یہ فیصلہ کرنا ہے کہ ہم دینی تعلیم کے لیے ضروری وسائل فراہم نہیں کر سکتے تو انھیں ان کے حال پر چھوڑ دینا اس سے بہتر ہوگا کہ ترمیمات کی بات ہو اور توقعات کا سیلاب ان کے انتشار اور

انہدام کا باعث بن جائے مشورہ دینے کا حق صرف انہی کو ہے جو اُس کو عمل میں لانے کے لئے ساز و سامان فراہم کر سکیں ان مدارس کو آزادی، استشاراتی اور مالی وسائل کی شدید ضرورت ہے اور ایسے حضرات کی جن کو تاریخ کا شعور ہو اور امکانات پر نظر رکھنا جن کا شعار ہو اور جن کی دینی حمیت اور ملی بصیرت کو یہ گوارا نہ ہو کہ دینی تعلیم، عصری تعلیم کے بہت پیچھے گھسٹتی ہوئی چلے۔

یہ خیال بھی بار بار ذہن میں آتا ہے کہ دینی مدارس کی کفالت مقامی اوقاف اپنے ذمے لیں۔ لیکن تعلیمی اور تعمیری کاموں کا جہاں تک تعلق ہے وقت کا دوسرا مفہوم کارفرما ہونے لگتا ہے۔

دینی مدارس نے بلا ارادہ اور ضمناً ایک اور بڑا کام کیا ہے۔ ان کی بدولت یو۔ پی جیسی ریاستوں میں اُردو کا رسم خط جزئی طور پر ہی سہی، محفوظ ہو گیا ہے ورنہ اتر پردیش کے اُردو والوں کو یہ نشانِ امتیاز حاصل ہے کہ انھوں نے ۴۴ سال کی قلیل مدت میں اُردو زبان کو اپنے گھروں سے بڑے موثر انداز سے نکال باہر کیا۔ یو۔پی میں اُردو تھوڑی بہت جو باقی ہے وہ اُن ہی مدارس کی وجہ سے ہے۔

مختصر یہ کہ دینی مدارس اپنی ظاہری فلاکت اور زبوں حالی کے باوصف ہمارا بہت قیمتی سرمایہ ہیں۔ انھوں نے دینی، اخلاقی، لسانی، ادبی اور ثقافتی میدانوں میں اہم کردار ادا کیا ہے ہمارا فرض ہے کہ ان پر زنگ نہ لگنے دیں۔ انھیں نئے اسالیب تدریس سے مستفید ہونے کا موقع دیں۔ اور ان کے نصاب کی جامعیت اور افادیت میں اضافہ کر کے انھیں ملک و ملت کے لئے سرمایۂ افتخار بنا دیں۔

- "شاداب" میں تبصرہ کے لئے دو جلدوں کا آنا لازمی ہے
- تخلیقات صاف اور غیر مطبوعہ روانہ فرمائیے۔
- خریدار قبول فرماتے ہوئے اُردو دوستی کا ثبوت دیجئے۔

ریاض الدین احمد
سابق جنرل سکریٹری دینی تعلیمی کونسل اترپردیش
[illegible]
ص۔ب ۳۰۵۰

دینی تعلیم (قسط دوم)

اس وقت جبکہ زوال اشتراکیت نے عالمی افکار عالیہ کو ایک بار پھر جھنجھوڑا ہے مسئلہ کا حل سوائے قرآن کے اور کہیں نظر نہیں آتا اس لیے تجسس کی نظریں بے تحاشہ قرآن پر پڑ رہی ہیں اور وقت آگیا ہے کہ قرآن اپنا مثبت کردار ادا کرکے دنیا کو تباہی سے بچا سکے۔ ظاہر ہے کہ جس نے یہ صحیفہ عظیم کو عطا فرمایا ہے وہ اہل قرآن کے تعاون کا محتاج نہیں۔

ہم دیکھ رہے ہیں کہ مشرق و مغرب میں قرآنی ادارے تیزی سے قائم ہو رہے ہیں عرب دنیا پھر چونک پڑی ہے سعودیہ اور دوسرے عرب ممالک میں حفظ قرآن کا ذوق پھر عود کر آیا ہے۔ قرأت القرآن کے بین الاقوامی مقابلے اور مظاہرے تیزی سے شروع ہو گئے ہیں لاکھوں کی تعداد میں قرآن کے نسخے سرزمین روس، مشرقی یورپ اور سینیگال افریقہ میں پھیلانے کی ذمہ داری سعودیہ عربیہ اور مصر نے اپنے سر لے لی ہے۔ برطانیہ، کناڈا اور امریکہ کے اسلامی مراکز ہر جگہ بہ طریقۂ ابلاغ کو ترجمۂ قرآن کے لئے استعمال کر رہے ہیں مسلم اور غیر مسلم ماہرین سائنس نے قرآن کو جدید سائنس کا پیش رو تسلیم کر لیا ہے۔

بحرین میں ایک بیت القرآن دس ملین ڈالر کی لاگت سے تعمیر ہو چکا ہے یہ ادارہ ایک سرجن [illegible] ڈاکٹر عبد اللطیف کانو کی ہمت اور عزم کی پیداوار ہے یہ منصوبہ حکومت وقت کے مالی تعاون کا محتاج نہیں تھا۔ ڈاکٹر کانو کا بیان ہے کہ اس منصوبہ [illegible] سے [illegible]

کردیا۔ دور دراز ملکوں سے رقوم برسنے لگیں بچوں نے اپنا جیب خرچ اس میں لگا دیا۔ بڈھوں نے اپنی گاڑھی کمائی کا ایک حصہ اس میں داخل کردیا۔ مسلمان اور غیر مسلموں نے اپنی بچت کا منہ اس کے لئے کھول دیا۔

یہاں قطر میں جہاں اس وقت راقم الحروف مقیم ہے قرآنی مزاج ترقی پر ہے۔ بازاروں میں بورڈ نظر آ رہے ہیں۔ "قرآن پڑھو قرآن تمہارا آخری صحیفہ ہے" مسجدوں میں درس قرآن کا نظام چل رہا ہے ہماری مسجدوں میں درس قرآن کا انتظام چل رہا ہے ہماری مسجد المسیلہ میں ہر روز بعد نماز عشاء ڈاکٹر مرسی المصری کا درس ... میں رمضان بھر بعد نماز عصر درس قرآن کی ٹولیاں جم جاتی ہیں ایک خصوصی اجتماع یہیں ہر دوشنبہ کو مغرب سے عشاء تک ہوتا ہے مسجد النصار میں ہر جمعہ کو نماز کے بعد اردو دانوں کا اجتماع ہوتا ہے ہر منگل کو پاشاہ قادری کے یہاں اجتماع ۹ بجے سے ۱۱ بجے رات تک ہوتا ہے بدلتے ہوئے رجحان کا پتہ اس سے چلتا ہے کہ سوڈان کے ڈاکٹر نورالدین المعون مسجد عمر ابن الخطاب کے اجتماع میں اور انجینئر وجیہ داد خان حیدرآبادی مجھے پاشاہ قادری کے اجتماع قرآنی میں شریک ہونے کے لئے خود اپنے ساتھ لے جاتے ہیں قطر کے ٹی وی پر درس قرآن ہر روز رات میں پوری شان کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے دس راتوں کا قیام اللیل عرب دنیا کی مخصوص عبادت ہے جو رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں ہر مسجد میں منعقد ہوتی ہے ان نمازوں میں لوگوں کی جو کثرت اس سال دیکھی اور استقلال کے ساتھ پوری نماز میں شرکت کا جو سماں اس بار کی نظر آیا وہ پچھلے سال میں نہیں دکھائی دیتا تھا۔ یہ حالات افسانہ نہیں ہیں بلکہ وقت کی پکار ہیں۔

دلی جس سرزمین میں دینی تعلیمی کونسل ایک عرصہ سے سرگرم عمل ہے اس پکار سے ناآشنا نہیں رہی ہے "جس وقت جبکہ اشتراکیت کے صنم خانے مسمار ہو رہے تھے روس کی فکری اور سیاسی بالادستی زوال پذیر ہو چکی تھی صدر کونسل حضرت مولانا سید ابوالحسن ندوی ۱۰ دسمبر ۱۹۸۹ء کو سرزمین الٰہ آباد میں جو ہندوستان کا پہلا اسلام کے سات عظیم خانوادوں کا مسکن رہ چکا ہے اور ملک کی روحانی علمی اور سیاسی تحریکوں کا مرکز رہا ہے تحفظ و سالمیت اور تقاضائے علوم دینیہ کے لئے ایک قرآنی پروگرام منعقد

ترویج القرآن کا افتتاح فرما چکے ہیں۔

یہ منصوبہ اس پس منظر میں ہے جس نے ذمہ داران کونسل کو ملّی سرد مہری کا چیلنج پیش کر دیا تھا۔ اسلام ہمیشہ چیلنج کے سائے میں پروان چڑھا ہے۔

دینی تعلیمی کونسل نے اس چیلنج کو قبول کر لیا اور کام کا آغاز ایک صبر آزما تجزیئے سے ہوا۔ اراکین دفتر میدانِ عمل میں روانہ کیے گئے اعداد و شمار کے خاکے تیار ہوئے عملی دشواریوں کی فہرستیں مرتب ہوئیں بجا مداخلتوں کے لئے حکومت کا دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ راست ملاقاتوں کا نظم قائم کیا گیا۔ ہمارے عزیز دوست ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی صاحب سکریٹری تعلیمی کونسل نے دردر کی خاک چھانی۔ ضلع ضلع میں دورے کیے۔ اپنے پیشے کی شدید مشغولیتوں کو قربان کر کے عوامی رابطہ کی مہم چلائی جہاں ذراسی چمک دکھائی دی وہاں شمع روشن کرنے کی کوشش کی۔ مگر ایک تڑپ کی تلاش ابھی جاری ہے۔

اس تلاش کی راہ میں منصوبہ ترویج القرآن پیش کیا جا رہا ہے کیونکہ ایمان کی جڑ قرآن ہے اور فروغ مکاتب اور مدرسے قرآن کا پہلا مقام گھر دوسرا مقام معاشرہ اور تیسرا مقام اسکول ہے بدقسمتی سے ہماری تمام تعلیمی تحریکیں خواہ وہ سرکاری ہوں یا پرائیوٹ تیسرے سرے سے شروع ہوتی ہیں۔ اور ہماری حکومت قومی تعلیمی پالیسی کو مقالوں تواز بنا کر آنے والی نسل کو کمانے کی مشین میں تبدیل کر رہی ہے یہ پالیسی شاہراہ اخلاق سے بچ نکلنے کے لئے ایک راہ صغیر ہے۔

اس لیے منصوبہ ترویج القرآن کا سیدھا رخ گھروں کی طرف ہے یہ سب سے پہلے عشیرتک الاقربین کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔ گھر کے ذمہ داروں کو آواز دیتا ہے اور خواتین خانہ کو پکارتا ہے۔ "اے ماؤں بہنو بیٹیو! دنیا کی زینت تم سے ہے۔"

تمہاری گودوں میں جو بچہ پل رہا ہے اور تمہارے دیدخانہ سے جو نسل باہر نکلنے والی ہے وہ اس صدائے اللہ اکبر سے بے نیاز نہ ہونے پائے جو ارضِ دنیا پر قدم رکھتے ہی اس کے کان میں گونجی تھی یہ آواز کوئی رسم دنیا نہیں تھی بلکہ عبدیت کا وہ بنیادی سبق تھا جس پر خلیفۃ فی الارض کی عمارت تعمیر ہونے والی ہے تمہیں اس کا پاسبان اور معمار بنایا گیا ہے اپنی عظمت کو پہچانو

اور اپنی ذمہ داری کا حق پوری طرح ادا کرنے کی کوشش کریں

اسی کوشش کی اہتمام میں ترویج القرآن کا رہبر منصوبہ پیش کیا جارہا ہے یہ ایک سلسلہ ایک پنج سالہ پروگرام کا پیش رو ہے۔ اس کا نفاذ یکم محرم ١٤١١ھ (مطابق ٢٠ جولائی سنہ ١٩٩٠ء) ان اضلاع میں کیا جائے گا۔ جہاں کوئی ایک رہبر اس کی ذمہ داری قبول کرنے کو تیار رہے۔

منصوبہ کا اجمالی خاکہ ماہ دسمبر ١٩٨٩ء کے خصوصی اجلاس دینی تعلیمی کونسل منعقدہ الہ آباد میں پیش کیا اور تفصیلی کاموں کے متعلق چار قرطاس عمل تیار کیے گئے ہیں۔ جن میں عملی پروگرام کی ترتیب یہ ہے۔

١۔ پس منظر اور کوششوں کا جائزہ (٢) تلاوت قرآن کی مشق (مع ترجمہ)

٣۔ تفکر فی خلق السموات والارض جس کے متعلق آیات قرآنی بہ لحاظ مضمون اکٹھا کردی گئی ہیں۔

٤۔ قرآنی دعائیں (ان کا پس منظر اور ترجمہ)

٥۔ تنزیہ داخلی (INTROSPECTION)

ایک رہبر منصوبہ کی خاص توجہ اس محرومیت کو زائل کرنے کی طرف ہے جو ترقیاتی عمل پیدا کردی ہیں ساتھ ہی ساتھ ایک مشق قرآن کو تسلسل سے پڑھنے اور سمجھنے کی کی جائے گی اور دوسری مشق اسلامی زندگی کے لئے قرآنی مطالبات پر تدبر کرنے کے لئے ہوگی۔

فی الحال کل نشستوں کی تعداد ٢٨ رکھی گئی ہے اور ہر نشست کی ضرورت کے مطابق آیات کا مواد پیش کیا جارہا ہے تاکہ آراکین کے لئے ایک بامقصد قرآنی زندگی کی شاہراہ کھل جائے اور نئے تازہ بہ تازہ مسائل کو حل کرنے کے لئے حکمت قرآنی کا نسخہ ان کے ہاتھ میں آجائے۔ ان پر بھی جہاں مردوں کی طرف توجہ کی گئی ہے وہیں خواتین کے کرنے کے کاموں کی وضاحت خاص طور پر کی

دوسری طرف جو ہمارا تدریسی نظام چل رہا ہے اس کے لئے ایک نصاب تعلیم اخلاق اور مجوزہ پیش کیا جارہا ہے جو نقوش ایمانی میں بلحاظ عمر رنگ بھرتا رہے گا۔ ان درسیات میں ١٥ منٹ روز کرنے کے لئے قرآنی نسخے تیار کیے گئے ہیں جو اللہ کے وجود اور وحدانیت پر ایک لاشعوری تربیت کا کام کریں گے یہ نسخے بچوں کی عمر کے لحاظ سے قرآنی الفاظ کی ترتیب پر مشتمل ہیں اور بہ لحاظ عم

غوری عطر یائیف

سوویت یونین میں اسلامی تعلیم

سوویت یونین میں مسلم برادری آرتھوڈاکس عیسائیوں کے بعد دوسری سب سے بڑی برادری ہے یہاں بڑی تعداد میں مساجد اور زیارت گاہیں اور ان مساجد کو بھی جنہیں بند کر دیا گیا تھا عبادت کے لئے دوبارہ کھول دیا گیا ہے لیکن مسلم مذہبی معلمین کی اس ملک میں شدید قلت ہے۔

۱۹۸۹ء سے قبل سوویت یونین میں صرف دو اسلامی دینی تعلیمی ادارے موجود تھے ایک بخارا میں قائم مدرسہ میر عرب اور دوسرا تاشقند کا امام البخاری اسلامی انسٹی ٹیوٹ۔ ان دینی تعلیمی اداروں میں سوویت یونین کے علاوہ یمن، افغانستان، بلغاریہ اور ویت نام کے طالب علم بھی دینی تعلیم حاصل کرتے رہے ہیں آج ان اداروں کو مسلم مذہبی تعلیم کے اساتذہ کی شدید قلت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

ازبکستان میں قائم ان دو معروف اداروں کا تعلق حنفی مسلک کے سنی مسلمانوں سے ہے ابھی حال تک دوسرے مسلم عقائد سے تعلق رکھنے والی جماعتوں مثلاً شمالی قفقاز کے شافعی مسلموں، تاجک اسماعیلی مسلموں اور ماورائے قفقاز اور بعض ازبک اور ترکمان علاقوں کی شیعہ اکثریت کے کسی طرح کے دینی ادارے موجود نہیں تھے۔

گذشتہ برس کے آخر میں بشکریائی راجدھانی اوفا اور آذربائیجان ... کئی مدرسے قائم کئے گئے ہیں جن میں ... اور تاجکستان میں ۱۹۹۰ء میں تین اور مدرسے قائم کئے گئے ہیں۔ قزاقستان میں اسلامی انسٹی ٹیوٹوں کا آغاز کیا جا رہا ہے الما آتا کا الحرابی انسٹی ٹیوٹ اس سال تجربے دینی درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا ہے

بقیہ صفحہ ۵۹ پر

ڈاکٹر عبدالستار دلوی قسط سوم

مولوی عبدالحق

چنانچہ جس دل جمعی سے اور انہماک کے ساتھ مولوی صاحب کام کرتے تھے وہ کسی سے ڈھکی چھپی بات نہیں ہے علی گڑھ کالج میں اپنے زمانۂ طالب علمی سے لیکر آخر تک اُن کی زندگی کام کرتے گذری۔ کام سے والہانہ عشق نے انہیں وقت کا بھی پابند بنادیا تھا۔ ہر ہر منٹ کا خیال رکھتے تھے۔ اور دوسروں سے بھی وقت کی پابندی کی توقع رکھتے تھے اور وقت کی پابندی نہ کرنے پر اچھے اچھوں کو بھی نہیں بخشتے تھے۔

خطباتِ عبدالحق میں بھی مولوی صاحب کی بے چین اور مقصدی زندگی کی جھلکیاں دکھائی دے رہی ہیں اُن کی قوتِ مقاومت، عزم، استقلال، مقصد کی لگن، کام کرنے کا جذبہ، یہ تمام چیزیں خطبات میں بدرجۂ اتم موجود ہیں اور اُن کے اندازِ گلفشانی گفتار سے بھی اُن کی تحریریں زعفران زار بنی ہوئی ہیں۔ ساتھ ہی خطبات میں اُن کا طرزِ تخاطب یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ وہ بنیادی حیثیت سے ایک معلم ہیں اور ایک اُستاد کی طرح جو بچوں کو آسان سے آسان زبان میں اپنی باتیں سمجھانے کی کوشش کرتا ہے" اے حضرات، حضرات صاحبو کے بعد اُن کے چھوٹے چھوٹے سلیس اور رواں رواں جملے اور اُن کی ساخت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے مقصد کی تبلیغ کر رہے ہیں اور ظاہر ہے تبلیغ کے لئے سلیس اور سادہ زبان اور پیرایۂ زبان کی ضرورت ہوتی ہے۔

انسان ہمیشہ زندہ رہنا چاہتا ہے لیکن فطرت اُسے زندہ رہنے کی اجازت نہیں دیتی۔ وہ شادی کر لیتا ہے اور اپنی اولاد کے ذریعے اپنا نام زندہ رکھنا چاہتا ہے۔ عبدالحق نے شادی نہیں کی۔ اُن کی اولاد نہیں تھی انھوں نے اُردو کو گود لیا۔ انجمن اور اُردو کے ساتھ اُن کا تعلق وہی تھا جو ایک باپ کا اپنی اولاد سے ہوتا ہے اپنی زندگی، اپنا روپیہ، پیسہ سبھی انجمن اور اُردو کے لئے تھا۔

بیوی اور بچوں سے متعلق مولوی صاحب بہت ہی دلچسپ خیالات رکھتے تھے۔ کہتے تھے کہ "جن لوگوں کو دنیا میں بڑے کام کرنے ہیں انھیں شادی ہرگز نہیں کرنی چاہئے۔ کیونکہ

شادی سے انسان میں خود غرضی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ گھر بار کے چکر میں اس طرح پھنس جاتا ہے کہ تن، من، دھن سے کوئی کام نہیں کر سکتا اور وہ لوگ جو تخلیقی کام نہیں کر سکتے وہ بچے پیدا کرتے ہیں۔ ایک دو نہیں بلکہ دسیوں بچے۔

مولوی صاحب اس ضمن میں بھی بڑے وسیع الذہن تھے گو اولاد کے حصول کے شدید طرفدار تھے مگر ضبطِ تولید کے سختی سے قائل تھے۔ کہتے تھے کہ

"جب مہاجروں کی جھگیوں سے گزرتا ہوں تو دو چیزوں کی افراط پاتا ہوں۔ ایک بھٹے اور دوسرے ننگ دھڑنگ کلبلاتے ہوئے بچے۔"

کہتے تھے کہ

"میرا بس چلے تو ان تمام لوگوں کی نسل آپریشن کرا کر ختم کر دوں۔ جن کی آمدنیاں قلیل ہیں۔"

ایک اور جگہ لکھتے ہیں۔

"انسان نہیں رہتا۔ لیکن اس کے اعمال رہ جاتے ہیں اور یہی اس کی کمائی ہے۔ اولاد مرحوم کی بھی ہے اور کون جاندار ہے جو اس پر قادر نہیں۔ بلکہ جتنے ادنیٰ اور ذلیل جانور ہیں۔ ان کی اتنی ہی زیادہ اولاد ہوتی ہے چنانچہ بعض کیڑے ایسے ہیں کہ ان کے ایک گھنٹے میں ہزاروں بلکہ لاکھوں بچے پیدا ہو کر رہ جاتے ہیں، لیکن اس کا نام انھیں کے نام سے ہے۔ آج جو ہم مرحوم کو یاد کر رہے ہیں۔ تو نہ یا ان کی اولاد اور مکانات اور جاہ و ثروت کی وجہ سے ہم گو نہیں۔ یہ سب آنی جانی چیزیں ہیں بلکہ ان کے کیرکٹر کی وجہ سے۔"

مولوی صاحب کے اعمال، مقصد کی لگن اور ان کے کام میں جو سلیقہ ہے اسے ان کی تحریروں کی روشنی میں دیکھا جا سکتا ہے۔

مذہب کے بارے میں مولوی صاحب کی ذات سے متعلق مختلف قسم کے خیالات ہیں۔ اکثر لوگ انھیں ملحد زندیق سمجھتے ہیں۔ مولوی قسم کے لوگ "لاادریت" ان کا مذہب بتاتے ہیں اور جدید تعلیم یافتہ انھیں اگناسٹک

(Agnostic) کہتے ہیں مگر جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ میرا خیال ہے قدیم لوگوں کی طرح مولوی عبدالحق بھی سخت قسم کے مذہبی آدمی تھے میں نے عبدالحق کو قدیم وضع کا Primitive اسی لحاظ سے کہا ہے۔ اُن کی یہ مذہبیت بالفعل نہ سہی لیکن مذہب میں نظریاتی اعتبار سے اُن کا پورا عقیدہ تھا خدا اور رسول ہی سے نہیں، بلکہ اولیائے کرام اور صوفیا سے بھی مولوی صاحب کو گہری عقیدت تھی۔ البتہ طبیعت میں آزاد مشربی ضرور تھی جو غالباً سرسید کے واسطے سے پیدا ہوئی تھی اور پھر لطیف مذاقِ سخن، جس کی وجہ سے شرارتاً ایسی باتیں کرتے تھے جس سے لوگ مولوی عبدالحق کے مذہب سے متعلق شبہات پیدا ہونے لگتے تھے۔ نظریاتی اعتبار سے ان کی مسلمانیت کی مثالیں، اُن کی تحریروں میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ اُن کے دل و دماغ کی یہ مسلمانی ۱۹۴۷ء گاندھی جی کے نام خط میں کس بری طرح پیش ہوئی ہے کہ اس کے بعد مذہب کے متعلق مولوی عبدالحق کے معتقدات کے بارے میں شبہے کی گنجائش نہیں رہتی۔ بقول کیفی ؎

حال یہ ہے خودیٔ عشق میں کیفی کا ہوا
شیخ کافر اسے اور گبر مسلماں سمجھا

مولوی صاحب مرنجانِ مرنج انسان تھے۔ معتدل لکھنؤ، ہم قوموں سے محبت اور حسنِ خلق کے ساتھ ہی طبیعت میں مزاح اور بذلہ سنجی تھی۔ جو آمد کا حکم رکھتی ہے وہ مزاح کو جا و بے جا استعمال نہیں کرتے، تاہم اسے سنجیدگی بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اُن کی سنجیدگی میں مزاح اور مزاح میں سنجیدگی ہوتی ہے خوش طبعی کو وہ مخصوص نظروں کے لئے اٹھا رکھتے ہیں۔ مولوی صاحب کی مقصدی زندگی میں کامیابی کا شاید ایک راز اُن کی خوش طبعی بھی ہے جس کی مدد سے وہ اپنے کام کے بارِ گراں کو ہلکا کرنے میں مدد لیتے ہیں۔ خود کہتے ہیں۔

"ظرافت" دلیلِ ذہانت ہے اور زندہ دلی، سلامتِ طبعی اور رجائیت کی نشانی ہے
یہ کام کے بارِ گراں کے ہلکا کرنے میں سب سے اچھا مددگار ہے۔"

مولوی صاحب کی یہ باوقار زیرِ لب مسکراہٹ اُن کے ساتھ ہمیشہ رہی۔ ان کی یہ ذہنی پھلجھڑیاں احباب و طلبا کے علاوہ چند ہم عصروں کے مضامین میں بھی بہ کثرت بکھری پڑی ہیں۔ میرن صاحب کے خطوط

لکھتے ہیں۔

"ایک روز میر صاحب کہیں باہر سے آئے۔ بڑی شامت کا مارا اُن سے پوچھ بیٹھا کہ میر صاحب آپ کہاں گئے تھے؟ کہنے لگے میاں! آج آغا کے ہاں کا سوسن کھِل گئی چمن میں تھوڑی دیر ٹہلتا رہا۔ پھر حضرت عنایت شاہ صاحب کے مزار پر فاتحہ پڑھنے پہنچے۔ اتنے میں میاں عادل آ گئے، میں بات کاٹ کر کہا کہ میر صاحب میں نے تو یہ پوچھا تھا کہ آج صبح آپ کہاں تشریف لے گئے تھے؟ فرمانے لگے 'ہاں ہاں! معاف کیجیے! اب آگے سنو جہاں سے بات شروع کی جہاں سے تھوڑی دیر پہلے چھوڑی تھی! ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ اتنے میں میاں عادل آ گئے۔ آج کا سلام تھا کہ وہ کرنال کے رہنے والے ہیں۔ میں انھیں حیدرآبادی سمجھتا تھا۔ ان کا اصلاً کہنا یہی ہے۔ انھوں نے بہت سے کرنال کے پرانے قصے بڑے مزے سے بیان کیے۔ اب مجھے الجھن ہونے لگی اور میں نے قطع کلام کر کے کہا۔ حضرت! میں نے یہ نہیں پوچھا' میں نے تو صرف آپ سے اتنا دریافت کیا تھا کہ آپ تشریف کہاں لے گئے تھے؟ یہ آپ نے کیا قصہ چھیڑ دیا' کہنے لگے "میں تو یہی کہوں گا' تمھیں سننا ہے تو سنو' نہیں تو جاؤ۔"

سرسید کے حال میں لکھتے ہیں۔

"مولوی مشتاق حسین (نواب وقار الملک) ایک دفعہ ان کے ہاں مہمان تھے' ایک روز اپنے کمرے سے کرتا پاجامہ پہنے سرسید صاحب کے بڑے کمرے میں آ گئے جہاں بیٹھے وہ کام کیا کرتے تھے۔ مولوی مشتاق حسین کا کرتا ڈھیلا ڈھالا اور آستین بار بار ڈھلک ڈھلک جاتا تھا اور وہ بار بار ہاتھ سے اسے اوپر چڑھاتے جاتے تھے۔

سید صاحب نے جو دیکھا تو کہنے لگے ' میاں مشتاق حسین تمھارا پاجامہ ہمیشہ کھونٹی پر لٹکا رہتا ہے۔"

اس واقعے کے پیش کرنے میں سرسید سے زیادہ مولوی عبدالحق کی ظرافت طبع اجاگر ہوتی ہے۔ عبدالحق بہت

بڑے بذلہ سنج تھے۔ اُن کی بذلہ سنجی کی بے شمار مثالیں ہیں لیکن اُن تمام مثالوں کا دہرانا طوالت سے خالی نہیں۔ تاہم چند واقعات ملاحظہ کیجئے!

ڈاکٹر انصاری کے بھتیجے کی شادی میں دعوتِ ولیمہ میں مولوی صاحب بھی شریک تھے کھانے میں ایک صاحب نے ہڈی سے گودا منہ سے نکلنے کی کوشش کی مگر جب ناکام رہے تو چینی کی رکابی پر ہڈی بجائی۔ مولوی صاحب نے بیرے سے بہت سی پلیٹیں منگوائیں اور اُن صاحب سے مخاطب ہو کر کہنے لگے آپ کی مشقِ ستم اگر یوں ہی جاری رہی تو انشاء اللہ اِن سب پلیٹوں کی ضرورت ہوگی۔ لہٰذا آپ انہیں اپنے سامنے رہنے دیجئے۔

کھانے کے بعد انگلیاں چاٹ چاٹ کر صاف کرنے کی عادت بھی مولوی قسم کے لوگوں میں عام عادت بھی بہت مذموم اور بد تہذیبی کی نشانی ہے جسے لوگ اسلام جیسے مہذب ترین مذہب کا کارِ ثواب جان کر کیا کرتے ہیں۔ ایک دفعہ کسی دعوت میں ایک صاحب اِس کارِ ثواب میں مشغول تھے صاحب سے نہ رہا گیا۔ آخر اپنی انگلیاں بھی پیش کر دیں اور کہا کہ صاحب! جب آپ کی انگلیاں صاف ہو جائیں تو ذرا انہیں بھی صاف کر دیجئے گا۔

حیدرآباد میں مولوی صاحب کے ایک دوست کی لڑکی کی شادی تھی جس میں کل پچاس مدعو تھے اور اِس فہرست سے مولوی صاحب اور اُن کے احباب غائب تھے۔ مولوی صاحب کی شرارت پسند طبیعت نے کہیں سے ایک رقعہ حاصل کر لیا اور اِسی انداز کے تقریباً ڈھائی سو رقعے چھپوائے اور اتنے ہی افراد کو مع خاندان کے دعوت دی۔ نتیجتاً صاحب خانہ کے یہاں مہمانوں کی کثرت ہو گئی۔ ہوٹلوں سے جلدی جلدی کھانے منگوائے گئے جب شادی کی محفل ختم ہوئی تو صاحب خانہ کو اس کی تلاش ہوئی کہ اس کا سراغ لگایا جائے کہ آخر اتنے دعوتی رقعے کیسے چھپے اور تقسیم ہوئے۔ بہت دنوں کے بعد پتہ چلا کہ یہ شرارت مولوی صاحب کی تھی۔

مولوی صاحب صاف گو اور صاف دل تھے۔ اُن کی صاف گوئی کی متعدد مثالیں تحریر و بیان میں بکھری پڑی ہیں۔ چند اہم عصر تھے انھوں نے جہاں اپنی اخلاقی اقدار و

کی شخصیتوں میں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے، وہیں انہوں نے بڑی جرأت مندی کے ساتھ ان شخصیتوں کی سیرتوں کے بعض پہلوؤں سے اختلاف بھی کیا ہے مولوی صاحب کے اختلافات ذاتی نہیں بلکہ نظریاتی تھے اور پھر اختلاف کرنے میں بھی نہایت سلیقہ مندی سے کام لیا ہے جس کی وجہ سے اختلافات بجائے اختلاف کے مدح کا جز بن گئے۔ تاہم جاننے والے جانتے ہیں کہ مولوی صاحب نے ہلکے ہلکے طنز بھی کیے ہیں۔

مولوی صاحب کی بے لاگ اور غیر جانب دارانہ رایوں میں سے صرف ایک پر اکتفاء کرتا ہوں۔ مولانا محمد علی سے متعلق لکھتے ہیں۔

"وہ آزادی کا دلدادہ اور جبر و استبداد کا پکا دشمن تھا۔ لیکن اگر کبھی اُس کے ہاتھ میں اقتدار آتا تو وہ بہت بڑا جابر اور مستبد ہوتا۔ وہ محبت و مروت کا پُتلا تھا اور دوستوں پر جاں نثار کرنے کے لئے تیار رہتا۔ بعض اوقات ذراسی بات پر اس قدر آگ بگولا ہو جاتا کہ دوستی اور محبت طاق پر دھری رہ جاتی تھی۔ دوست بھی اُس کے جاں نثار اور فدائی تھے، لیکن اِس طرح بچتے تھے جیسے آگ پرست آگ سے بچتا ہے"

مولانا محمد علی سے متعلق ۸ رنومبر ۱۹۲۰ء میں ڈاکٹر انصاری کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں،

"آپ سے کسی بات کا پردہ نہیں اور میں آپ سے صاف صاف کہتا ہوں کہ جب میں یہاں سے علی گڈھ جارہا تھا تو میرا دل جوش اور مسرت سے بھرا ہوا تھا میرا خیال تھا کہ بانیان یونیورسٹی کے متعلق کامل اسکیم تیار کر رکھی ہوگی۔ اُن کے پاس کافی سرمایہ ہوگا اور کام کرنے کے لئے آدمی بھی ہوں گے۔ لیکن جب وہاں جاکر معلوم ہوا کہ اِن میں سے ایک چیز بھی نہیں، تو مجھے بہت افسوس اور رنج ہوا اور مایوسی بھی۔ اتنا بڑا کام اور استغنا اور بے خبری کا یہ عالم!

ایک دوسری بات جس سے میرے دل کو بے انتہا تکلیف ہوئی وہ یہ کہ میں نے محمد علی اور شوکت علی کو ایک انتہا درجے کا مُلّا ٹائپ پایا۔ اس لفظ میں تعصب، توہم، سخت عناد، ناروداری، سب کچھ آگیا۔ میرے حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہ تھی۔ میں محمد علی کے خلوص، صداقت، جرأت، بے نفسی، ایثار اور اعلیٰ قابلیت کا اتنا ہی قائل ہوں، جس قدر آپ۔ لیکن اُن کا ہر بات میں خدا کو لانا اور ہر حکم کو خدا اور اُس کے رسولؐ سے منسوب کرنا اور ہر حکم کو خدا کا حکم اور ہر بات میں سختی اور غلو کے ساتھ تعصب برتنا، ہر معقول پسند آدمی کو ناگوار گزرتا ہے اُن کا بار بار یہ کہنا کہ میں خدا کے حکم سے یہاں ہوں اور خدا اور اُس کے رسولؐ کا یہ حکم ہے، دلوں پر زیادہ اثر نہیں کرتا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ اُس رات کو جب ہم دلی سے علی گڑھ گئے ہیں اور کھانے کے بعد محمد علی نے اپنی اور کلکٹر کی گفتگو سنائی تو اثنائے گفتگو میں کلکٹر نے کہا کہ آپ لڑکوں کو نافرمان بناتے ہیں۔ محمد علی نے کہا کہ میں اُن کو خدا کا فرمان بردار بنانا چاہتا ہوں۔ کلکٹر نے کہا اور اپنا Your Self اگرچہ کلکٹر نے کسی نیت سے کہا ہو، مگر میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ مجھ پر اس لفظ کا بڑا اثر ہوا اور اب تک ہے اور رہے گا۔ بڑے سے بڑا صوفی بھی اگر کہتا تو یہی کہتا۔ اس لفظ کی تہہ میں بڑا راز ہے۔ اچھے اچھے لوگ، یہاں تک بعض اوقات اولیا تک نفس کے احکام کو خدا سمجھنے لگتے ہیں اور اس میں بڑا دھوکا ہوتا ہے، اس سے بچنا چاہیئے۔ یہ نفس ہی تو شیطان ہے۔ میں موجودہ طرز تعلیم کا مخالف ہوں۔ لیکن یہ بھی نہیں چاہتا کہ محمد علی کی طرح علی گڑھ کالج کو کفار اور منافقین کا کالج کہوں اُن لوگوں کو جو ہم سے اختلاف رکھتے ہیں، کافر و منافق و مردود و ملعون کہنا کسی کو بھی اور خصوصاً ایک سردار قوم (لیڈر) کو ہرگز جائز نہیں۔ اگر یہ جائز رکھا جائے تو کفر و ایمان میں کچھ یوں سا فرق رہ جاتا ہے۔ یونیورسٹی بننے کے یہ لچھن نہیں ہیں۔ تعصب، توہم، فسادات و عناد پر اس کی بنیاد نہیں ہو سکتی۔ آپ خدا کے لئے اس رنگ کو بدلیے اور سب سے پہلے کسی معقول شخص کو پرنسپل بنا دیجئے۔ موجودہ حالات میں محمد علی پرنسپل کے لئے موزوں نہیں۔" ۵۰ھ

اس خط سے عبدالحق کے مزاج کی تندی و تیزی، جرأت و ہمت اور سختی کے ساتھ اُن کے مذہبی

معتقدات کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔ بات بات میں خدا ، رسول کا واسطہ، کفر و زندیق کے فتوے اور مذہبی معاملات میں غلو، یہ ساری چیزیں عبدالحق کو سخت ناپسند تھیں وہ صبر و تحمل، اعتدال، رواداری اور فرض شناسی کو پسند کرتے تھے۔ مُلائیت کا مُلاّ پن سے انہیں سخت نفرت تھی۔

تحقیق اور تنقید کے میدان میں جس محنت اور کاوش کی ضرورت ہوتی ہے، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ عبدالحق اس میدان میں بھی بہت ہی محتاط ہو کر قدم رکھتے تھے۔ اپنی ذمہ داری کا احساس، علمی و ادبی کاموں کی افادیت اور اہمیت کا احساس انہیں ہر لحظہ لگا رہتا تھا۔ تحقیق اور تنقید کے میدان میں جگر خون کرنا، مولوی صاحب کی تصانیف سے ظاہر ہے۔ اسی سلسلے میں فرحت اللہ بیگ لکھتے ہیں۔

"کرم نامہ پہنچا اور اس کے ساتھ شوق کے تذکرے کا مقدمہ بھی وصول ہوا۔ ابھی میں نے مقدمہ تو نہیں پڑھا صرف پہلے صفحہ پر نظر ڈالی۔ اس میں آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ آپ نے مجھ سے تذکرے کی طباعت کے متعلق دریافت کیا تو میں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اس میں غلطیاں بہت ہیں۔ حضرت ! ایک دو نہیں، بے شمار غلطیاں ہیں اور جگہ جگہ ناقص ہے۔ یہ کتب خانہ آصفیہ کے نسخے کا حال ہے۔ دو اور نسخے مہیا کیے وہ بھی ناقص نکلے۔ اب ایک اور نسخے کا پتہ چلا ہے، تو وہ بھی دیکھوں گا کہ اس کی کیا کیفیت ہے۔ میرے پاس مرتب کیا ہوا اور خوش خط لکھا ہوا نسخہ موجود ہے۔ لیکن جب تک دو ایک معتبر نسخوں سے مقابلہ کر کے تصحیح نہ کر لی جائے اور جو صفحے چھوٹ گئے ہیں، پورے نہ ہو جائیں، اسے طبع نہیں کر سکتا۔ جھٹ پٹ کام اچھا نہیں ہوتا اور نہ قابل اعتماد اور استناد ہوتا ہے۔ کامل طور پر مرتب ہونے پر جا بجا حواشی دینے کی ضرورت ہوگی۔ اس قسم کے کاموں میں بڑی محنت اور تحقیق اور احتیاط کرنی پڑتی ہے۔"

عبدالحق کی شخصیت کا ایک اور پہلو ان کی طبیعت کی نفاست ہے عبدالحق کی اس نفاست پسندی اور شستگی کا اندازہ ان کی خوش پوشاکی سے ہو جاتا ہے ظاہر سے باطن کا پتہ لگانا آسان ہے چنانچہ مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ عبدالحق کی ظاہری وضع قطع اور خوش پوشاکی کا پتہ تو انکا باطن بھی جھلکتا ہے۔

خوش پوشاکی کے ساتھ ساتھ خوش خوراک بھی تھے اور پھل بہت پسند کرتے تھے۔ کھانے میں تہذیب و شائستگی کو ہمیشہ ملحوظ رکھتے تھے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کو لکھتے ہیں:

"یہ خوب ہوا کہ آپ کو یقین کے اور بھی دیوان مل گئے آپ انہیں ضرور مرتب کیجئے۔ خرچ میں دوں گا۔ لیکن حیدرآباد میں ہرگز طبع نہ کرائیے گا، ورنہ میں ذمے دار نہیں۔ حیدرآباد میں آج تک کوئی کتاب اچھی نہیں چھپی۔ یا تو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پریس میں چھپوا لیجئے یا جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے مطبع میں۔ یہ دونوں مطبعے بہت اچھا کام کرتے ہیں اور قابلِ اعتماد ہیں۔"

باطن کی صفائی کا یہ حال تھا کہ دل میں کبھی کدورت نہ رکھتے تھے۔ دوسروں کی غلطیوں کو نہ صرف معاف ہی نہیں بلکہ معاف بھی کر دیتے تھے، یہاں تک کہ مخالفین سے متعلق بھی اپنے دل میں غبار نہیں آنے دیتے اور جب بھی ملتے، ایسے ملتے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ وہ خوش ذہن بھی تھے اور بات بات میں مزاح پیدا کرتے۔ اسپتال میں جو نرس دوائی پلانے آتی۔ اسے مس روح افزا کے نام پکارا کرتے تھے وہ پیرانہ سالی میں بھی جوان اور بچوں میں بچے تھے وہ بچوں کی طرح معصوم تھے اور اکثر بچوں کی طرح معصوم شرارتیں کرتے تھے ان میں شبنم کی برودت اور نرمی بھی تھی اور شعلے کی لپک، بلکہ آفتاب نصف النہار کی پگھلا دینے والی گرمی بھی وہ انتہائے عشق ہی سے آگ تھے اور انتہائے عشق میں، جب کہ لوگ خاک ہو جاتے ہیں وہ آگ تھے زمانے کی سردی، گرمی اور اونچ نیچ ان کے مقصد کی لگن کی آگ کو سرد نہ کر سکی۔

عبدالحق ایک ادارہ اور ایک عہد تھے تقریباً ایک صدی زندہ رہ کر پرانے اور نئے لوگوں کے درمیان اور آج ہم میں نہ ہوتے ہوئے بھی، ہم میں موجود ہیں۔ سچ ہے، مقصد سے زندگی بنتی ہے، بڑھتی بھی ہے اور باقی بھی رہتی ہے۔ ●●

"شاداب" کے قلمی معاونین سے گذارش ہے کہ وہ غیر مطبوعہ تخلیقات بغرض اشاعت روانہ فرمائیں۔

ابراہیم جلیس

اہلیہ زبان

جن دنوں میں پانچویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ اردو کے ایک ماسٹر نے مجھ سے سوال کیا۔

"بتاؤ بیٹے۔ وہ کیا چیز ہے جو ہمیشہ چلتی رہتی ہے لیکن کبھی خراب نہیں ہوتی"

میں نے ریل گاڑی سے لے کر رسٹ واچ تک ہر چیز پر غور کیا جو ہمیشہ چلتی رہتی ہیں، لیکن صحیح جواب مجھے نہ ملا۔ کیونکہ ریل گاڑی سے لے کر رسٹ واچ تک ہر چیز خراب ہو جاتی ہے۔ بہت سوچ بچار کے بعد میں نے یہ جواب دیا تھا۔

"ماسٹر جی۔ وہ چیز جو ہمیشہ چلتی رہتی ہے لیکن خراب نہیں ہوتی، وہ ماسٹر کا ہاتھ ہے۔"

ظاہر ہے کہ اس کے جواب میں مجھ پر ماسٹر صاحب کے وہ ہاتھ پڑے کہ وہ ہاتھ پڑے کہ آج تک یاد ہیں۔

لیکن اب جب کہ میں جوان ہو کر بوڑھا ہونا شروع ہو گیا ہوں، مجھے اردو کے اس ماسٹر صاحب کی تلاش ہے کیونکہ اب مجھے اس سوال کا جواب مل گیا ہے بس اب ماسٹر صاحب کے ملنے کی دیر ہے۔

ہو سکتا ہے کہ وہ ماسٹر صاحب اب مجھے نہ ملیں۔ ایک تکلیف دہ بات ہے کہ جواب مل گیا ہے تو ماسٹر صاحب نہیں ملتے۔ بہر حال اگر آپ میں سے کسی کو وہ ماسٹر صاحب ملیں تو انہیں یہ جواب پہنچا دیجیے کہ [illegible]

"وہ چیز جو ہمیشہ چلتی رہتی ہے کبھی خراب نہیں ہوتی۔ وہ "عورت کی زبان" ہے

ممکن ہے میرا یہ جواب سن کر عورتیں ناراض ہو جائیں اور میرے خلاف چلنی شروع ہو جائیں، لیکن اس میں قصور میرا نہیں سچائی کا ہے۔ اور سچ جھٹلانا ناممکن ہے۔

ویسے بھی اس میں خواتین کی تضحیک کا کوئی پہلو نہیں ہے۔ یہ تو تعریف کی کہ عورتیں خدا کی دی ہوئی نعمت "زبان" کا کتنا صحیح استعمال کرتی ہیں۔ اللہ میاں نے چلانے کے لئے دی ہے صرف ڈاکٹروں اور حکیموں کو دکھانے کے لئے نہیں

ہمارے ملک میں عورتوں کی زبان شاید اس لئے زیادہ چلتی ہے کہ عورتیں خود نہیں چلتیں۔ پردے کے رواج کے باعث بے چاری عورتیں دن بھر گھر میں بیٹھی رہتی ہیں۔ وہ چلتی ہیں تو سونے کے کمرے سے باورچی خانے، باورچی خانے سے غسل خانے یا غسل خانے سے ایک اور خانے تک چلتی ہیں۔ یا اگر بہت ہوا تو اٹھواڑے بس میں بیٹھ کر بندر روڈ چلی جائیں۔ مگر یہ چلنا بھی کیا چلنا ہوا کہ وہ نہیں اور بس چل رہی ہے۔

اب رہی زندگی — تو وہ "چل چلاؤ" کا دوسرا نام ہے۔ لہذا اگر یہ چلتی نہیں اور ان کی زبان چلتی رہتی ہے تو یہ ایک قانون فطرت ہے کہ کچھ نہ کچھ عورت کی زبان چلے یا مرد کی جوتی چلے۔

صبح ہوتے ہی جب زندگی چلنے لگتی ہے تو عورت کی بھی زبان چلنے لگتی ہے۔ الحمد ابھی تک [illegible] نہیں آیا۔

"ارے منے، بھاگ کر ذرا ڈبل روٹی اور مکھن تو لیتے آؤ۔"

"اری لڑکی۔ اسکول کا وقت ہو گیا، ابھی تک تیری کنگھی چوٹی ختم نہیں ہوئی۔"

"ارے منے کے ابا — آج دفتر سے واپسی میں حلوائی کی دوکان سے ہوتے آنا۔ آج میرے دادا جان کی فاتحہ ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

چلیئے اس کے بعد آپ دفتر چلے جاتے ہیں بچے اسکول چلے جاتے ہیں۔ بیوی پریشان کہ اب کیا دیواروں سے باتیں کرے۔ وہ جھٹ اسٹول اٹھا، ہمسائی کی دیوار کے پاس لگا اس پر کھڑی ہو کر بی ہمسائی سے باتیں کرنے لگتی ہے۔ بی ہمسائی بھی آخر عورت ذات ٹھہری وہ بھی جیسے موقع کی منتظر ہے دونوں کی زبانیں چلنی شروع ہو جاتی ہیں کہ:

فلانی کا بیاہ ہوا یا نہیں ہوا۔ زید نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔ عمر کی بیوی کی عمر بڑی کم ہے۔ وہ بڑا جھوٹ بولتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ

یہ سلسلہ شام کو سونے تک جاری رہتا ہے بلکہ بعض بیویوں کی زبان تو سوتے میں بھی چلتی رہتی ہے۔ اس کو روکنا یعنی "سوئچ آف" کرنا بہت مشکل ہے۔

اس سوئچ آف کرنے پر ایک بڑا زبردست واقعہ مجھے یاد آگیا۔

گراموفون کے ایجاد کرنے والے کا نام "تھامس الوا ایڈیسن" ہے ایک خاتون اس سے یہ معلوم کرنے گئی کہ گراموفون کیسے ایجاد ہوا اور دس منٹ تک لگاتار باتیں کرنے کے بعد اس خاتون نے ایڈیسن سے پوچھا۔

مسٹر ایڈیسن — کیا آپ ہی وہ شخص ہیں جس نے سب سے پہلے بولنے والی مشین ایجاد کی؟

ایڈیسن نے جواب دیا۔

خاتون ـــ بولنے والی مشین تو سب سے پہلے خدا نے آدم کی بائیں پسلی سے ایجاد کی ـــ میں تم جو بولنے والی مشین ایجاد کی ہے وہ صرف ایسی مشین ہے جو جب جی چاہے بند کی جا سکتی ہے۔"

کہنے والے کہتے ہیں کہ عورت کی زبان صرف ایک بار رکی تھی۔ اور اسی سے دنیا کے سب سے بڑے آبشار نیاگرا کی قوت کا اندازہ لگایا گیا تھا۔

وہ واقعہ یہ ہے کہ

"ایک شادی شدہ جوڑا نیاگرا کا آبشار دیکھنے گئے۔ اسے دیکھ کر بیوی جیسے کوئی آدھ گھنٹے تک خاموش اور مبہوت رہی ـــ پھر اس کے بعد اس نے اپنے شوہر سے پوچھا۔

"اس آبشار میں کتنی طاقت ہوگی؟"

"اتنی کہ عورت کی زبان بند کر دے:"

مجھے عورت کی زبان چلنے پر کوئی اعتراض نہیں، بلکہ میں تو اسے دنیا کی زندگی سمجھتا ہوں اگر عورت بولنا بند کر دے تو یہ دنیا ایک دم گونگی ہو جائے گی۔ بالکل قبرستان بن جائے۔

عورت کی زبان ضرور چلے، مگر عورت کسی کو زبان دے کر کبھی نہ مکرے۔

یہی میرا مدعا ہے اور بس۔ ●●

نمونے کی کاپی کے لئے چھ روپے کے ڈاک ٹکٹ روانہ کریں
شاداب کو اپنے حلقۂ احباب میں متعارف کروایئے۔ یہ آپ کی عین دوستی ہوگی

ڈاکٹر کے بھگت وتسل راؤ
ملک پیٹ - حیدرآباد ۳۶

نیند

نیند ایک نعمت ہے جو ہر جاندار کو کسی نہ کسی طرح سے نصیب ہے۔ سُنا ہے کہ پودے بھی سوتے ہیں درخت بھی اونگھتے ہیں ہوا نہ چلے پتہ نہ ہلے تو کیا کیفیت ہے درخت کی۔ بے حس کھڑا رہتا ہے ہم آسانی سے کہہ سکتے ہیں کہ درخت سو رہا ہے۔ جھاڑی کا سوال ہوتا ہے جھنڈ کا ذکر آتا ہے تو صاف طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ جھوکتا ہے اور اُن کی آڑ میں لوگ خراٹے لے رہے ہیں۔ بیچارہ جھنڈ، جھاڑ کیا کر سکتے ہیں۔ گھنے جنگل کے درخت لمبے، اونچے، موٹے، دیو ہیکل ہوتے ہیں۔ اُن کو دیکھتے ہی نیند حرام ہو جاتی ہے۔ بھاگ جاتی ہے نیند میلوں دُور۔

اب آئیے تاریخ کی طرف۔ سیتا کو راون جب اُٹھا کر لے گیا تو ہل چل سی پڑ گئی ماحول میں۔ ماتم چھا گیا۔ بعد میں جب رام کی آمد ہوئی، درخت، پیڑ، جھاڑیاں خاموش گم صم بیٹھے تھے بے حس پڑے ہوئے تھے انہوں نے حالت پہچان لی اور سمجھ لیا کہ دال میں کچھ کالا ہے نہ رام کو نیند لکشمن کو نیند۔ بعد میں والی، سگریو کو جگایا ستایا۔ دونوں درمیان سینہ کی نیند غائب۔ "اِدھر بھاگ" "اُدھر بھاگ" نیند کو بار بار بھگانا پڑتا۔ سردی کو بھگانے کے لئے آگ کے قریب بیٹھ جانا اور پھر سے کر چلتے بنتا۔ پھر بھی نیند سے پرے رہنے کی۔ نیند شب تک نہیں لیتے جب تک کہ سیتا کا پتہ نہ چلا۔ اِدھر سیتا کی حالت کیسی تھی۔ رام کا سمرن۔ ہنومان جی کے ذریعہ رام کی انگوٹھی سے پہچان۔ ہمیشہ چوکنا رہا گئی۔ مہابھارت میں بھی جب پانڈو لاکشا گرہ میں داخل ہوئے تو ماجرا کیا تھا معلوم ہو گیا۔ بھلا سو سکتے تھے جاگتے رہے۔ خندق کھودتے کھودتے نہاتے گئے روز چپکر ہو گئے۔ نیند کو نہ اپنانے سے فائدہ حاصل کیجئے۔

نیند کی کہانی، تاریخ، جغرافیہ الگ الگ ۔ کہانی لا بنی ہے تو تاریخ کی تنگی نہیں۔ جغرافیہ تو جتنا بھی وسیع اور وہ بھی عالمی وسعت، بچہ پیدا ہوتے ہی تھوڑی بہت ہنگامہ کرتا ہے پھر سو جاتا ہے سُنا ہے کہ نومولود چھ مہینے تک ہر روز (۲۰) گھنٹے سوتا ہے اُسے صرف دودھ کے لئے بیدار کیا جاتا ہے خلیوں کی افزائش کے لئے یہ ضروری ہے بستر خراب کردے بھی تو نیند میں مصروف، لکھ پتی، کروڑ پتی کا بیٹا ہو یا بیٹی، جھگی کے مزدور کی بچی ہو یا بچہ۔ دھوپ میں جھولے میں ہو یا ایر کنڈیشنڈ روم کے جھولے میں جھول رہا ہو۔ نیند سب کی مساوی ہوتی ہے وقفہ وہی ہوتا ہے مساوات ہے نیند میں ۔ جمہوری طرز ہے نیند کا۔ چند بچے دن میں سوتے ہیں مزہ سے ۔ نیند میں ہنس رہے ہیں لیکن رات میں ماں کی نیند حرام کر دیتے ہیں نہ بچے کو کوس سکتی ہیں نہ خود پر ترس کھا سکتی ہے سُنا ہے کہ جدید دور میں تبدیلی ہے۔ آج میں شوہر نوکری پر جاتا ہے تو بیوی ممتا کی پرورش کرتی ہے شوہر کے شام گھر لوٹتے ہی حوالہ کر دیتی ہے بچہ کو ۔۔۔ ڈٹ کر کھانا کھا لیتی ہے اور سو جاتی ہے۔ اب شوہر کا حال دیکھئے۔ بچہ رو یا تو شوہر کے پاس نہ دوا کیا ہے، نانی، دادی ہوں تو جھنجھلا کے بچہ کو حوالے کر دیتا ہے اور دیوار سے ٹیک لگا کر سو پڑتا ہے آج کل الگ الگ خاندان ہیں دادی، نانی تو ہوم فار ایجڈ میں رہ پاتے ہیں یا گاؤں میں گائے کا دودھ نکالنے میں مصروف۔ فیشن کا زمانہ ہے میاں، بیوی نوکری کریں تو کریش کا زمانہ ہے کریش میں مزے سے نیند لیتے رہتا ہے بچہ۔ اگر دفتر سے جوڑا جلدی آ جائے تو گھر میں جاکر تھوڑی بہت نیند بھی لے لیتا ہے۔ بچہ الگ، والدین الگ، یعنی آزادی ہے تو والد کو بھی، جوڑے کو بھی۔ بوڑھا جو بڑا ہو تو گھنٹوں نیند، نوجوان جوڑا ہو تو لمحوں کی نیند بس ۔ اوسط جوڑا ہے تو چند منٹوں کی نیند بس ۔ ماشاء اللہ کیا تہذیب، بچہ کمسنی تک کئی امراض کا شکار ہوتا رہتا ہے دوا کی گولیاں انجکشن دیئے جاتے ہیں۔ نیند لیا بچہ تو شکر ہے اللہ کا۔ ورنہ پھرنا پڑتا ہے جوڑے کو ڈاکٹر کے اطراف، ماہر کے اطراف۔

بچہ کو سلانے کے لئے لوری دیتی ہے ماں۔ ممتا کا اظہار ہے۔ مشہور گانا بھی ہے۔

"دھیرے سے آجا رے نندیا میں"

نیند میں بچہ کو لے جانے کے لئے چندا ماما کی یاد بھی تازہ کر لیتے ہیں

چندا ماما دور کے

پوئے پکائیں بور کے

دیدی' دادی' موسی کہانی شروع کرتی ہے بچوں کو نہایت ہی سکون سے۔ دس پندرہ منٹ تو تین چار چست باقی سب نیند کی طرف مرکوز۔ اونگھنے والوں کی تعداد میں اضافہ۔ چند منٹوں کے بعد بچے بھی خراٹے لیتے ہیں نانی۔ دیدی بھی ایک کونے میں سو جاتے ہیں۔

بچہ بڑا ہوا اسکول گیا تو سر کو کھرچتا رہتا ہے۔ نیند کا غلبہ رہتا ہے ہوم ورک کا شر زیادہ۔ چھوڑ دے تو مار پڑنے کی نوبت۔ امتحان میں فیل ہو جائے تو وہ مصیبت الگ۔ نیند کی مقدار میں کمی ہوتی ہے۔ امتحان ختم ہو گیا۔ اسی دن شام کو مزے سے دو چار گھنٹے اطمینان سے سو جاتا ہے۔ کالج میں کچھ دلچسپ نہ رہے تو ایک صف پورے کا پورا نیند کے احاطہ میں رہتا ہے بڑے بچے' کالج کے بچے' جاب کے بچے' صنعتی اداروں کے بچے' ان زمروں کی بچیاں نیند کے احاطے میں الگ الگ جدول بندی کر سکتے ہیں۔ دیر گئے ناول پڑھے۔ بچی جاسوسی ناول پڑھ لی تو رات کی نیند شب خواب میں تبدیل ہوتی ہے چیخنے' چلانے کا ماحول برپا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر ملا تو ٹھیک ہے ورنہ سائیکی یاٹرسٹ کے پاس لے جانا ضروری ہو جاتا ہے۔

نیند کی شکل الگ' بے سڈول' یکدم۔ طرز عجیب بھی۔ فرمائش غائب۔ صرف حالت بے چین دکھائی پڑتی ہے۔ مثلاً نیند کی حالت میں ایک کا سر دوسرے کے ہاتھ پر ہو سکتا ہے بدن پر سر ٹیک پاتا ہے ماں کے آغوش میں بچہ سوتا ہے کندھے پر بھی سو سکتا ہے اگر ہاتھ پھسل جائے تو بچہ کا نشیکر بھی ہو سکتا ہے۔ عاشق معشوق کی نیند کے طور طریق الگ۔ دن بھر کی تھکان رہے۔ دفتر کا کام زیادہ رہے تو بیوی کی گود میں خاوند مصروف نیند۔ آئس کریم۔ پیار سے زیادہ نیند پیاری۔ پہلی ملاقات ہے تو نیند کو تھوڑا بہت پرے رکھتے ہیں ورنہ نیند کی بیماری کا مریض کہلائے جانے کا اندیشہ ہو جاتا ہے۔

نیند اتنی میٹھی ہوتی ہے۔ اتنی پیاری ہوتی ہے اتنی اچھی ہوتی ہے کہ اس کی عادی پیچھے پڑے نہیں رہ سکتے۔ ریلوے اسٹیشن میں گاڑی لیٹ ہو جائے تو پلیٹ فارم کے بینچ پر ہی ایک آدھ جھپکی نیند کا لے لیتا ہے مسافر گاڑی دیر سے آئے تو نیند کا دور مکمل ہو جاتا ہے خاندان کے افراد یکے بعد دیگرے سامان کی حفاظت کرتے ہیں اور وقفہ وقفہ سے آنکھوں کو ہاتھوں سے ملتے رہتے ہیں۔ بعض اوقات میں نیم خوابی میں ایک سوٹ کیس دو سوٹ کیس کے مانند دکھائی دیتے ہیں۔ چور تو چوکنا رہتا ہے چاہے پاکٹ چور ہو یا سامان چور وہ نیند کی دیوتا کی پوجا نہیں کرتا۔ کیونکہ پیٹ کی پوجا کا شیدا ہے۔

گاڑی میں آ گئے سیٹ پر بیٹھ گئے۔ ذرا ہٹو، سرک کے بیٹھو کہتے ہیں مسافر۔ جنرل کمپارٹمنٹ میں اب انتظار کرتے ہیں نیند سے۔ آنکھ بند ہو جاتی ہے۔ ناک سے سانس زور سے لیتے ہیں۔ لبوں پر تھوڑی بہت لالی۔ جھپکی نیند کا شروع ہو جاتا ہے۔ عورت مرد کی تمیز ٹیک لیتے ہیں کندھے سے۔ اگر ہمسایہ کندھا سرکا دے تو جھٹکہ نیند میں لگ جاتا ہے اور پھر سے ادھر ادھر دیکھ لیتے ہیں۔ اس طرح سفر کٹ جاتا ہے رات کا۔ ریزرو ڈ کمپارٹمنٹ رہے تو سونے کے لئے جگہ تو مل جاتی ہے لیکن سامان کی فکر۔ تالہ نہ ڈالے تو خیر نہیں۔ گہری نیند میں تو حادثہ ہوا تو سیدھے پہنچ جاتے ہیں نرک یا سورگ میں اُن کے عملیات و فعلیات کے لحاظ سے۔ گہری نیند سے لوگ ڈرتے ہیں سفر میں کہ وہ نیند لامتناہی ہوتی ہے۔

بس کے سفر میں بھی نیند کی حالت اس طرح ہوتی ہے لیکن جھٹکے زیادہ۔ پاسنجر ہو یا سوپر فاسٹ ڈی لکس ہو یا سوپر ڈی لکس، لاری ہو یا ٹریکٹر، کار ہو یا وین، ماروتی ہو یا پدمنی سب چلانے والے کے اوپر منحصر ہے بریک زور سے مار دے تو گردن پر مار ایک ٹھوس کا رنامہ ہو جاتا ہے۔ نیند کا جھپکہ رات کے دس کے بعد شروع ہوتا ہے ڈرائیور کے بازو بیٹھ کر چند لوگ سوتے ہیں چوٹ اوپل ہو یا جگیا بیٹھے ان کو فکر نہیں کیونکہ موت کی آغوش میں

ہمیشہ چلنے کے لئے ہی بیٹھے رہتے ہیں۔ بس کے سامنے جو رڈا کو آ گئے تو ناک سامنے کی سیٹ سے مس کرتے ہیں زور سے، خون بھی بہہ سکتا ہے جو اندر آ جائے تو رقم حوالے کر دیتے ہیں اور بال بال بچ جاتے ہیں حادثات کا جائزہ لینے پر معلوم پڑتا ہے کہ ہر ایک کو زور دار جھٹکہ لگتا ہے رات کے دو ڈھائی بجے کے درمیان کپٹی گھاٹ ہو یا محبوب گھاٹ اوٹی ہو یا وندھیاچل چمبل جو نربدا گھنڈالا ہو یا پالی ہلس، درہ خیبر ہو یا درہ بولان ایلپس کی چوٹیاں ہوں یا کین جنگا کی سر کر دگی۔ یہ وقت ہی ایسا اثر اہوتا ہے کہ ہوائی جہاز میں، جہاز میں، موٹر میں، گاڑی میں، ریل میں جھٹکہ لگ جاتا ہے دھکّہ دیتی ہے نیند اور دھوکہ کھا جاتے ہیں ہم لوگ۔ اسی واسطے رات کی ڈیوٹی کرنے والے کو بارہ گھنٹے کا آرام کرنا پڑتا ہے خاص ہیلیاٹرنگ پوسٹس فراہم کئے جاتے ہیں۔

سُنا ہے کہ کبھ کرن کی نیند عجیب ہوا کرتی تھی بادل بھی گرڑ گڑاتے تھے اس کے خراٹے سے عورت مرد اس کے سامنے بونے دکھائی دیتے تھے۔ سالہا سال کی نیند لے لیتا تھا۔ جگانے کے لئے باجے کی ضرورت ہوتی تھی۔ دھپڑے بجانے پر مشکل سے کروٹ لیتا تھا۔ گلی وار ٹراولس میں تو اُس دیو ہیکل انسان پر سیڑھیاں ڈال کر چڑھنا ضروری تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ریپ وان ونکل بارہ سال تک سو گیا تھا۔

بعض اوقات سڑک کے حادثوں سے دو چار ہوتے سے مریض مہینوں تک بے حس پڑا رہتا ہے دیدے بند اور، پلک بند نہ ہرا ہوا دیا ہوا۔ رشتہ داروں کا تانتا بندھا رہتا ہے بڑے شہر میں ہو یا گھر میں، گاؤں ہو یا دواخانہ۔ دیکھنے والوں کی بھرمار۔ ڈاکٹر تو کہہ نہیں سکتا کب مرے گا۔ وہ تو نجومی نہیں پیشنگوئی کرنے کے لئے۔ رشتہ داروں کی نیند خراب۔ آخر کار چند مہینوں کے بعد مریض نجات حاصل کرتا ہے اور لوگ بھی نجات دہندہ بن جاتے ہیں۔

نیند کی کئی قسمیں ہیں۔ دھیان کی نیند الگ۔ گوتم بدھ کی تصویر لیجئے۔ مون مُدرا میں دکھائی دیتے ہیں کہیں کہیں دیکھئے تو دناتھ جا بیٹھے۔ سادھو ناتھ جا بیٹھے۔ سائیں جا بیٹھے۔ الیلوہ

جائیے یا اجنتہ جیسے جا نجات کا ہے۔ دھیان کا ہے۔ سادھو سنت تو ہمیشہ دھیان میں رہتے ہیں نہ جنگل کی فکر نہ تیور نیچے کی آمد کی چنتا۔ بھگوان سے بالراست رشتہ قائم۔ بیوی بچے درمیان میں یاد آجائیں تو زاروقطار رونا شروع کر دیتا ہے سنت چاہے جو۔

نیند میں لگ جانے کی کوشش بھی عجیب ہے اس کی گولیاں، سکون کی گولیاں، اطمینان دلانے والی گولیاں، افیون گانجہ، چرس کے عادات الگ۔ معمتوں سے دور بھاگنے کے لئے ایلوپیتھی، آیورویدک، ہومیو پیتھی کی طرف نشہ کا سبق لے کر دوڑتے ہیں گولی تو صرف دو تین گھنٹے نیند میں ڈبو دیتی ہے فطری نیند کی بات الگ ہوتی ہے کھانا کھائیے، پان مصالحہ کھائیے، کنوارہ یا کنواری رہے تو ایک آدھ ویکلی پڑھنا شروع کرے تو ویکلی ایک طرف، کروٹ بدل کر نیند میں چلے جاتے ہیں ودیارتھی کو تو امتحان کے زمانہ میں نیند ایک شیطان کی طرح لپٹی رہتی ہے اُسے بھگانے کے لئے نیند مار گولیاں استعمال کرنا پڑتا ہے چند لوگوں کو نیند کی گولیاں کھاتے کھاتے عادت ہوتی ہے۔ منہ پھیکا ہوا۔ کیلشیم کی بو، پیٹ میں جلن سی کیفیت نمودار ہوتی ہے۔

بیمار کی نیند الگ، افیونی کی نیند الگ، نیم خوابی کی کیفیت الگ۔ نیم خوابی میں یا نیند میں لوگ ایک فرلانگ مزے سے چلتے ہیں دعا بے پدر ہے، منزل کے بالائی حصہ پہ سو گئے ہوں تو نیم خوابی میں فطری پکار کو رجوع ہونے جائیں تو دھڑام سے گر جانے کا اندیشہ ہے مرہم پٹی کرنا پڑتا ہے ہڈی ٹوٹ جائے تو جوڑنے والے کے پاس شاہ علی بنڈہ یا گلزار حوض یونانی دواخانہ میں یا آرتھوپیڈک میں رجوع ہونا پڑتا ہے۔

ہر ایک کو نیند لینے کی عادت ہے۔ اجازت ہے خواہش ہے لیکن گہری نیند سے ڈرتے ہیں کیونکہ گہری نیند سے جاگرت ہونا مشکل ہے یم راج کے پاس میں چلا جاتا ہے فرد، بچہ، بوڑھا، عورت، مرد، ہندو، مسلمان، پارسی، سکھ تمام مذاہب میں ابدی نیند احاطہ میں نہ ڈاکٹر بول سکتا ہے نہ نجومی کہہ سکتا ہے ہر ایک کا ایک وقت گہری نیند کے لئے

منقش رہتا ہے شائد عالم بالا میں بڑا کمپیوٹر رکھا ہوا ہوگا وائرلیس پہ وارننگ ملتا ہوگا چلتا بنتا ہے دوسری دنیا کی طرف۔

خواہش کی تکمیل کا ذکر آتا ہے تو نیند ہی ایک ایسی حالت ہے جس میں خوابیدہ خواب میں خواہش کی تکمیل کر لیتا ہے مثلاً بیرونی ممالک کا سفر، معشوق سے ملاقات، روح سے بات چیت، بلاؤں سے مکالمے، کتاب کا پڑھنا، سڑکوں پر پھرنا۔ دوستوں سے دور دراز ممالک کا ذکر وغیرہ نہ جمع نہ خرچ سو رہے لیے۔ سو گئے، شروع ہوتی ہے سوانح۔ بیوی کے جگانے پر خواب میں بے ترتیبی، انگڑائی لے کر نیند سے چھٹکارا پاتے ہیں۔ ایک پیالی چائے یا کافی کا انتظار رہتا ہے ہوٹل میں رہنے تو ٹیلیفون پر اٹھایا جاتا ہے کھڑکی سے سورج پکارتا ہے آج کل سٹیزن واچ سے سیٹی بجتی ہے لیکن نیند میں ڈوبا ہوا الارم ٹائم پیس کو بھی بند کر کے ایک آدھ گھنٹہ سو جاتا ہے موسم کے لحاظ سے نیند کی حالت بھی الگ۔ بارش میں پانی کے گرنے کی آواز، گیلے کپڑوں کی بو کپڑے ٹھیک طرح سوکھتے نہیں، چھت ٹپکنا شروع ہو جائے تو کہاں کی نیند! صبح کا انتظار۔ صبح ہوتے ہی دودھ لانا، بچوں کو اسکول میں چھوڑنا، بیوی کو دفتر میں چھوڑنا، نوکری کرنا، بیوی بچوں کا لانا اور تھکے ماندے گھر پر آنا وغیرہ وغیرہ۔ چھٹی مل گئی تو غنیمت۔ آٹھ بجے تک نیند چلتی رہتی ہے۔

سرما کے زمانہ میں تاریکی جلد ہو جاتی ہے ٹھنڈ لگ جاتی ہے سوکھڑ ہیں کر نمائش بھی جاتیں گھر کو جلدی جانے کی فکر۔ کنوارے کنواری گھومنے میں دلچسپی۔ بھلا جوڑوں کو گھومنے میں کیا دلچسپی جلدی سے چادر اوڑھ کر نیند میں چلے جانا چاہتے ہیں ہو سکے تو ایک دو بجے اٹھ کر کروٹیں لے لیتے ہیں۔ عمر رسیدہ تو چوکیداری کرتے رہتے ہیں چھٹکنے آنے کے لئے پہرہ داری کرتے ہیں ڈاکو چور تو "سیندھ" مار کر زیورات لوٹ کر جاتا ہے گاؤں کی طرف تو پوری آبادی سب سو جاتی ہے تو دوسرے محلوں سے بیڑیوں کی پکار، کتوں کی بھونک صاف سنائی دیتی ہے قبرستان یا شمشان گھاٹ کھڑکی سے دکھائی دے تو خیر نہیں، تعویز بندھوانے کی نوبت پڑتی ہے۔

موسم گرما میں لوگوں کی پریشانی۔ کولر لگاؤ۔ پنکھا چلاؤ۔ بانس باندھ کر مچھر دانی لگائی جاتی ہے آبادی میں تو لُو لگنے سے وہ گرم لو سے مرجاتے ہیں رات میں دیر گئے نیند آتی ہے صحت متاثر ہوتی ہے۔

اگر گھروں میں کتوں کو پالتے ہیں تاکہ وہ چوکیداری کریں۔ پہرہ داری کریں۔ لیکن دیکھا گیا ہے کہ چور کو چھوڑ کر اجنبی پر جا لپکتا ہے کھرچ دیتا ہے لے ٹی ایس یا ریبیز کے انجکشن دلانا پڑتا ہے سنا ہے کہ نیند لینے والوں کو محفوظ رکھنے کے لئے چور اور کتوں کے درمیان معاہدہ طے پاتا ہے کہ چوری کرکے چلے جانے کے بعد ہی بھونکنا شروع کرے۔ بعد میں تو ٹولی پولیس کی آتی ہے۔ تربیت یافتہ کتے اکثر سونگھنا شروع کرتے ہیں۔ حساب کرتا جاتا ہے سب جانے کے بعد صاف صفائی کر لینا پڑتا ہے۔ گلیوں میں کتے ایک طرف، گدھے ایک طرف، بیل بھینس الگ الگ اجتماع کی شکل میں اونگھتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں رات کے وقت۔ فٹ پاتھ پر دیر گئے گہری نیند میں لگے رہتے ہیں فٹ پاتھ کے شہزادے اور ان کے خاندان پالش والا ہے تو پان والا بھی ہے سیکل والا بھی ہے تو رکشا والا بھی ہے لال روشنی کا علاقہ نیند سے پیاسے رہ پاتا ہے کیونکہ لگاتار ٹرافک چلتی رہتی ہے۔

کوئی گانے بجانے کا پروگرام ہو، بھجن ہو، مذہبی اجتماع ہو، ہری کتھا ہو یا بڑا اکٹھا، لوگوں کو سامعین کو نیند سے الگ تھلگ کرنا پڑتا ہے چاہے پانی کا انتظام کرنا پڑتا ہے ستار وادن ہو یا جل ترنگ، تھوڑی بہت واہ واہ ضروری ہے مشاعرہ ہو تو داد تو حاصل کرنی پڑتی ہے چائے کے دور چلنے پر نیند اُس رات کے لئے بھاگ جاتی ہے اُس محفل سے، مجلس سے اجتماع سے۔ چند جلسوں میں لیڈر کے تقاریر کو زبردستی سن نہیں پاتے لہذا نیند میں مدہوش ہوجاتے ہیں

ایک بات تو سچ ہے کہ نیند کے بغیر انسان یا حیوان جی نہیں سکتا۔ کیونکہ وقفہ آرام ہوتا ہے دماغ جائزہ لیتا ہے تجزیہ ہوتا ہے خواب میں، نیند میں۔ پھر سے چستی میں ڈال دیتا ہے انسان کو پانچ چھ گھنٹوں کی نیند کے لئے یہ مصیبت، چارپائی، پلنگ، چٹائی، بوریا، کمرا اور

لدی، چھپر پلنگ وغیرہ۔ نیند کے دشمن آج کل تو ہر جا شئے ہیں اڈعاکس لگاؤ، جیلے جلاؤ، نوٹ جلانے کے حامل نہیں ہے لیکن چھپر تو حکمران ہیں خصوصاً حیدرآباد کے۔ دول گروہ اُن کا ماضی میں دارالخلافہ تھا اب تو ان کی حکومت ہر طرف ہے مہدی پٹنم جاؤ۔ یلارم، شاہ علی بنڈہ جاؤ دلسکھ نگر، ملکاجگری جاہے شہیا سعید آباد ان کا قبضہ جھونپڑی پہ بھی ہے بنگلہ پہ بھی ہے مناول پر بھی ہے، قلعہ پہ بھی، تالاب پہ بھی۔

یہ بات تو ماننی پڑتی ہے کہ ہر ایک کو نیند پیاری ہے لیکن ابدی نیند سے ہر ایک ڈر جاتا ہے کیونکہ اس سے ہوش و حواس دور، بیوی بچے پرے، کھیت مکان الگ، پیسے بینک یا رشتہ داروں یا قرض داروں کے پاس رہ جاتے ہیں۔ بعض اوقات وصیت نامہ بھی لکھ نہیں سکتے لیکن کوئی اس ابدی نیند کی آمد کی گھڑی کو ٹال نہیں سکتا۔ روتے ہنستے یا ہنستے ہوئے بنگلہ ہو جاتا ہے ابدی نیند چوم لیتی ہے اور نجات دلاتی ہے روح کو بدن سے۔ واہ رے واہ نیند رے نیند تیری کون سی کل سیدھی ۔

بقیہ سلسلہ ص ۳۷ سے آگے

فی الحال یہ تعلیم شہر کی جامع مسجد میں شروع کی جائے گی اور اس وقت تک جاری رہے گی جب تک اس کی اپنی عمارت کی تعمیر مکمل نہ ہو جائے۔ اس عمارت کی تعمیر اور مذہبی تعلیم سے متعلق دوسری ضروریات کے لئے حکام کی جانب سے امداد فراہم کی گئی ہے۔

بخارا کا مدرسہ میر عرب اور تاشقند کا اسلامی انسٹی ٹیوٹ اپنے کتب خانوں کو وسعت دیں گے اس کے ساتھ ہی ازبک حکومت اور سوویت یونین کی وزارتی کونسل کے تحت مذہبی امور کی کونسل نے نئے ہوسٹل کی تعمیر کے لئے اس انسٹی ٹیوٹ کو ایک قطعۂ زمین دیا ہے۔

-٭-

سالانہ طرحی مشاعرہ [illegible] اگست ۱۹۹۰ء بر طرح "غمِ حیات ذرا اور بھی نکھار مجھے"

غزلیں

عزیز بھارتی
آصف نگر - حیدرآباد

اداس ہو کے نہ کر آج شرمسار مجھے
تجھے یہ حق ہے مری زندگی پکار مجھے

ترے سوال کا میں کیا جواب دوں آخر
ملا ہی کب ہے محبت کا اختیار مجھے

مجھے تو ضبط کی ساری حدوں کو چھونا ہے
میں بیقرار سہی دے نہ تو قرار مجھے

مری حیات بظاہر ہے مملکت میری
مگر تجھی پہ تو کرنا ہے انحصار مجھے

جو تیری ذات سے منسوب ہو کے ملتا ہے
وہ غم [illegible] ہی لگتا ہے شاہکار مجھے

خدا کے واسطے مجھ کو سکون مت دیجئے
یہی سکوں تو کرتا ہے بیقرار مجھے

ابھی ابھی تو ملی ہے سکوں کی سانس عزیز
ابھی سے چھیڑ [illegible] ہے کیوں بہار مجھے

بانو طاہرہ سعید - عثمانیہ نگر - حیدرآباد

خزاں نے آکے دیا مژدۂ بہار مجھے
"غمِ حیات ذرا اور بھی نکھار مجھے"

[illegible] چمن پہ ناز تھا [illegible]
نہ آیا راس محبت کا اعتبار مجھے

سنا ہے ڈوبتی کشتی کے اک مسافر نے
تڑپ تڑپ کے پکارا تھا بار بار مجھے

[illegible] میں کہتے ہیں مجھ سے کیا کیا کچھ!
بنا لیا ہے ستاروں نے راز دار مجھے

جو دوسروں کے لئے وجۂ ظلم و جبر ہے
نصیب ہو نہ کبھی ایسا اقتدار مجھے

نہ آتے گر مرے سپنے میں وہ تو اچھا تھا
جھلک دکھا کے کیا [illegible] بے قرار مجھے

رہِ حیات میں [illegible] کہیں
دوبارہ ملنے کا کتنا ہے انتظار مجھے

ازل سے میرے تو حصے میں صرف کانٹے تھے
یہ کیسے مل گیا پھولوں کا آج ہار مجھے

نہیں ہے طاہرہ اب ڈر کسی بھی دشمن کا
دعائیں دوست نے بھیجی ہیں بے شمار مجھے

غزلیں شبانہ

مومن خاں شوق
ملے پلی . حیدرآباد

زمیں مجھ کو بنا اور نہ تاجدار مجھے
ہر اک نظر میں بنا دے تو باوقار مجھے

وہ ایک لمحہ جو سرمایۂ حیات بنے
اس ایک لمحے کا اب تک ہے انتظار مجھے

بکھر کے آؤں گا اک حرفِ آرزو بن کر
ذرا ایک بار اُس پیار سے پکار مجھے

ابھی تو اور بھی زخموں کی تاب ہے مجھ میں
غمِ حیات ذرا اور بھی نکھار مجھے

قدم قدم پہ بھٹکنے کے ہیں کئی ساماں
سنبھل سنبھل کے کرو خود پہ ہے اختیار مجھے

مرے خلوص نے بخشی ہیں عظمتیں مجھ کو
ہر اجنبی بھی سمجھتا ہے رشتہ دار مجھے

جہاں کے شہر میں اے شوق تم اکیلے ہو
یہ خیال ستاتا ہے بار بار مجھے

صادق نوید . نیو ملے پلی . حیدرآباد

زمانے تجھ پہ بھی آئے گا اعتبار مجھے
جو ہو سکے تو نئے ڈھنگ سے سنوار مجھے

جنم جنم کے سفر میں یہ بے رخی کیسی
میں وقت ہوں تو مرے ساتھ آ گذار مجھے

ذرا سی لغزشِ پا پر نہ مسکرا ہمدم
تو میرا دوست اگر ہے تو پھر سہار مجھے

خود اپنے آپ سے ملنے کی آرزو ہے بہت
ملے گا اور کہاں ایسا غمگسار مجھے

سراپا عجز ہوں لیکن انا کے خول میں ہوں
سکوں نواز بہت ہے یہی حصار مجھے

فرشتے رشک کریں جس پہ میں وہ انساں ہوں
ملا ہے روزِ ازل سے یہ افتخار مجھے

میں اپنے آپ کو اُس کے حوالے کر دوں گا
دکھائی دے جو کبھی وقت سازگار مجھے

زمانہ مجھ سے ہے قائم ہوں میں زمانے سے
میں آدمی ہوں کسی نام سے پکار مجھے

میں جب بھی غزل سے کوئی باتِ دل کی کہتا ہوں
سخن کا لوگ سمجھتے ہیں تاجدار مجھے

غزلیں

صلاح الدین نیّر
معرفت روزنامہ سیاست، حیدرآباد

وہ لوگ جن پہ ہے برسوں سے اعتبار مجھے
سمجھ رہے ہیں وہی قاتلِ بہار مجھے

دِیا جلائے ہوئے کب سے دَر پہ بیٹھا ہوں
کبھی تو آئے گا جس کا ہے انتظار مجھے

تمھارے نام کے ساتھ اپنا نام بھی لکھوں
دیا ہے تم نے کہاں اتنا اختیار مجھے

وہ جن کو میں کسی رشتہ کا نام دے نہ سکا
وہی تو کرتے ہیں سب سے زیادہ پیار مجھے

دُکھا کے دل کو ترے رات بھر میں سو نہ سکا
مرا ضمیر جگاتا تھا بار بار مجھے

میں ڈر رہا ہوں کہ پہچان کھو نہ جائے کہیں
ڈبو نہ دے کہیں بھولنے سے اتنا پیار مجھے

جو شخص جاتے ہوئے خوشبو اپنی چھوڑ گیا
اُسی کا آج بھی نیّر ہے انتظار مجھے

افسر عدنان
آصف نگر، حیدرآباد

نہ بے خودی نہ جنوں اور نہ اُس سے پیار مجھے
نگاہِ شوق کر اتنا بے قرار مجھے

شبِ الم مری پلکوں پہ جس سے رونق ہو
اُس ایک آنسو سے ساتھی ذرا سنوار مجھے

وہ ایسے بچھڑا کہ ملتا نہیں ہے اُس کا پتہ
جفا پرست کا اب بھی ہے انتظار مجھے

یہ عزم ہے کہ میں گردش میں آسماں چھو لوں
غمِ حیات نہ پھر سے اُتار مجھے

جہانِ غم میں غمِ دل تری نوازش ہے
دیئے ہیں زخموں کے گُل تو نے بے شمار مجھے

ہجومِ درد میں دل میرا مسکراتا ہے
نہ چھین درد نہ کر اور اشکبار مجھے

کچھ ایسے زخم بھی عدنان! فصلِ گُل نے دیئے
خزاں کے رنگ دکھائے ہے اب بہار مجھے

غزلیں

منان ...
حیدرآباد

دلِ حزیں پہ رہا اب نہ اعتبار مجھے
کہ چوٹ کھا کے رلاتا ہے بار بار مجھے

میں غم کی کیا کہوں غم تو نصیب ہے میرا
خوشی کی آس بھی کرتی ہے سوگوار مجھے

میں اپنے آپ لٹا ہوں وفا کی راہوں میں
میں کیسے کہہ دوں محبت ملی نہ پیار مجھے

کسی کے غم میں یہ دل خون خون روتا ہے
کسی کی یاد بھی کرتی ہے اشکبار مجھے

یہ رونقیں ہیں تماشے ہجومِ یاراں کے
زمانہ ایسے میں کرتا کہاں شمار مجھے

نہ محفلوں کی تمنا ہے اب نہ ساقی کی
کہ بیخودی میں ہی ملتا ہے اک قرار مجھے

انا پسند کو پاسِ وفا نہیں منظور
بہت عزیز ہے پھر بھی خیالِ یار مجھے

عزیز ناگپوری

سکونِ قلب میسر تھا بے شمار مجھے
کیا ہے آپ کی فرقت نے بیقرار مجھے

کہا جو بزم میں دیوانہ پہلی بار مجھے
صلہ وفا کا دیا تم نے شاندار مجھے

غمِ حیات نہ کر پایا اشکبار مجھے
تمہاری یاد رلاتی ہے بار بار مجھے

دیئے فریب زمانے نے بیشمار مجھے
کسی کا آئے بھلا کیسے اعتبار مجھے

عزیز جلوہ دکھا اُن کا ایکبار مجھے
ستا رہا ہے بہت اب خیالِ یار مجھے

آپ کے کنبے میں جب بھی کوئی

پیدائش

یا

موت

ہو تو اسے مقامی اندراج دفتر میں

درج ضرور کرائیں

یہ معاون ہوتا ہے

پیدائش کا سرٹیفکیٹ عمر کا سرٹیفکیٹ ہوتا ہے!

- اسکول میں داخلے
- نوکری حاصل کرنے
- ووٹ کے حق
- ڈرائیونگ لائسنس
- پاسپورٹ لینے کے لئے
- بیمہ پالیسی کے لئے

موت کے سرٹیفکیٹ کی ضرورت ہوتی ہے

- موروثی جائیداد
- بیمے کی رقم
- جائیداد میں حصہ کا تصفیہ کرانے کے لئے

اندراج بروقت کرانے

اور سرٹیفکیٹ بلا معاوضہ حاصل کیجیے

پیدائش اور موت کا اندراج کرانا قانوناً لازمی ہے

تاخیر سے کئے گئے رجسٹریشن بھی قابل قبول ہوں گے۔

رجسٹرار جنرل، انڈیا

ماہنامہ

شاداب

حیدرآباد

Rs 6/-

جلد (۷) شمارہ (۱۱) دسمبر ۱۹۹۰ء : حیدرآباد

ایڈیٹر
محمد قمرالدین صابری

جائنٹ ایڈیٹر
رشید الدین

مینجنگ ایڈیٹر
کلیم الدین احسن

مجلسِ مشاورت ....

محترمہ عائشہ بیگم رباب — یوسف ناظم — ڈاکٹر محمد یوسف الدین — پروفیسر رضی الدین احمد

محمد منظور احمد منظور — محترمہ سیدہ مہر — ڈاکٹر منشاء الرحمن خاں منشا — پروفیسر میر تراب علی

منیر احمد صدیقی

زرِ تعاون :- ....

	ہندوستان	خلیجی ممالک	امریکہ	انگلستان	پاکستان
سالانہ	65 روپے	200 روپے	40 ڈالر	25 پونڈ	175 روپے
دو سال	120 "	360 "	70 "	45 "	300 "
تاحیات	1500 "	3700 "	700 "	400 "	3000 "

.... ترسیلِ زر کا پتہ ....

ماہنامہ "شاداب" 147-5-11 ریڈ ہلز حیدرآباد

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر محمد قمرالدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار محل سے چھپوا کر دفتر شاداب 147-5-11 ریڈ ہلز۔ حیدرآباد ۔ اے پی سے شائع کیا۔

فہرست

نبیوں میں وہ رحمت لقب پانے والا		شاہ حسین نہری	۳
عالم عربی کا تازہ المیہ		حضرت مولانا سید ابوالحسن ندوی	۷
اسلامی تصوف	چوتھی قسط	سید احمد عروج قادری	۱۵
اسلام کے نام پہ		ندر الحفیظ ندوی ازہری	۲۲
خلیج اور امریکی عوام		ڈاکٹر حسن علی	۳۴
علم، عورت اور سماج		بیگم خورشید حمید باشاہ	۳۸
تیسری دنیا کی تنظیم برائے سائنسداں خواتین		صابرہ خاتون	۴۲
جورو کا بھائی ایک طرف		ابراہیم جلیس	۴۸
اردو کے مسائل		راجندر بہادر موج	۵۲
پروفیسر آزاد کا علمی وادبی سفر یورپ			۵۷
نظم		جگن ناتھ آزاد	۶۰
غزلیں		رؤف خیر	۶۲
غزلیں		فراغ روہوی، ڈاکٹر عطاء الرحمن منشا	۶۳
غزلیں		رؤف رحیم ۔ افسر رومان	۶۴

شاہ حسین نہری لیکچرر شعبہ اردو، بل بھیم کالج
بیڑ ۴۳۱۱۲۲ (مہاراشٹرا)

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا ــــ کون ہے وہ ہستی، صرف جس نے ہا تمام نبیوں میں رحمت کا لقب پایا؟ ــــ سب جانتے ہیں اور اکثر جانتے ہیں۔ ہاں جو جانتے ہیں وہ پھر جانیں۔ کیونکہ محبوب کا ذکر بڑا دلچسپ اور فرحت بخش ہوتا ہے، محبوب کے نام کی تکرار بھی بڑی لطف انگیز ہوتی ہے۔ جو نہیں جانتے وہ جان لیں کہ افضل الانبیاء والمرسلین، ختم الرسل، فخر موجودات، خلاصۂ کائنات سرورِ عالم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے رحمت کا لقب پایا تھا۔ پوچھنے والا یہ بھی پوچھ سکتا ہے کہ رحمت کا یہ لقب دینے والا کون ہے؟ عالم مخلوقات کے گل سرسبد، محبوب رب العالمین کو یہ لقب سوائے آپ کے خالق و مالک کے بھلا اور کون دے سکتا تھا۔ جی ہاں! رحمت کا یہ لقب آپ کو اللہ رحمٰن ورحیم نے دیا۔ وہ اپنی کتاب میں فرماتا ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ

اردو میں اس کا مفہوم سنیے: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے محمدؐ! ہم نے تمہیں تمام عالموں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ یہاں "رَحْمَةً لِّلْمُسْلِمِیْنَ" یعنی مسلمانوں کے لئے رحمت یا "رَحْمَةً لِّلْمُؤْمِنِیْنَ" یعنی ایمان والوں کے لئے رحمت نہیں فرمایا گیا بلکہ آپؐ کو "رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ" قرار دیا گیا ــــ

اللہ بھی رَبُّ الْمُسْلِمِیْنَ یعنی صرف مسلمانوں ہی کا رب نہیں وہ تو رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ یعنی تمام مخلوقات یعنی تمام انسانوں اور تمام عالموں کا رب ہے۔ اس نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی

تمام مخلوقات، تمام انسانوں اور تمام عالموں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا۔ آپؐ کا پیغام تمام عالم انسانیت کے لئے رہتی دنیا تک رحمت اور سلامتی کا پیغام ہے۔ آپؐ کے رَحْمَةٌ لِّلْعٰلَمِيْن ہونے کا اولین مفہوم یہی ہے کہ آپؐ نے اللہ کے بندوں کو اللہ کی مرضی کا راستہ دکھایا، نہ صرف زبانی تلقین کے ذریعے بلکہ اس کے مطابق مثالی عملی نمونہ پیش کر کے بھی۔ آپ نے اللہ کا یہ پیغام اُس کے بندوں تک پہنچایا تھا اس طرح کہ نہ آپؐ کا لہجہ درشت اور تند تھا اور نہ عملاً آپؐ کسی کے لئے سخت گیر اور دل آزار تھے اور نہ ہی آپؐ نے کبھی غلط زبردستی کا طریقہ اختیار کیا۔ آپؐ کی خواہش اور کوشش تو بس یہ تھی کہ تمام انسان اپنے پیدا کرنے والے اپنے مالک، اللہ رحمٰن و رحیم کے اچھے اور سچے بندے بن جائیں۔ ارشادِ ربانی ہے۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۔

یعنی، یہ اللہ کی رحمت ہے کہ آپ ان لوگوں کے لئے انتہائی نرم مزاج واقع ہوئے ہیں، ورنہ اگر کہیں آپ سخت مزاج اور تنگ دل ہوتے تو یہ سب آپ کے گرد وپیش سے چھٹ جاتے۔

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ آلہ وسلم کی محبوبیت کا راز یہی ہے کہ آپ انتہائی نرم مزاج، رحم دل اور مجسّم شفقت تھے اپنا ہو کہ پرایا بن جانے والا، ہر ایک کے ساتھ آپؐ کا سلوک انتہائی نرمی اور درد مندی کا تھا آپؐ ہر ایک کی غم خواری اور ہمدردی فرماتے اور خیال رکھتے کہ سب کی دل جوئی ہو۔ آپؐ نے فرمایا کہ جو شخص نرمی سے محروم کر دیا گیا وہ ساری بھلائی اور تمام خیر سے محروم کر دیا گیا۔ آپؐ کے ساتھی صحابہؓ آپ پر نثار ہوتے تھے اور آپؐ کے دشمن بن جانے والے بھی آپؐ کے حسنِ خلق انسانی ہمدردی و غم خواری اور رحمت و فراخ دلی کے معترف تھے۔ مکّہ والے قحط اور خشک سالی کی صورتِ حال سے دوچار ہیں یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے آپؐ کے ساتھیوں کو اس قدر ستایا تھا کہ آپؐ کو اور آپؐ کے ساتھیوں کو مکّے سے ہجرت کر کے مدینہ جانا پڑا۔ آپؐ کے مدینے پہنچ جانے کے بعد بھی وہ اپنی دشمنانہ کارروائیوں سے باز نہیں آئے ہیں۔ وہی مکّے والے قحط اور خشک سالی کی جان لیوا صورتِ حال سے پریشان ہو اُٹھتے ہیں تو آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں اور آپؐ سے درخواست کرتے ہیں کہ اللہ سے دُعا کریں۔ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ آلہ وسلم یہ درخواست اپنی فطری درد مندی اور رحم دلی کی بنا پر اس طرح قبول کر لیتے ہیں کہ نہ انھیں عار دلاتے ہیں نہ طعنے دیتے ہیں۔ اللہ

ربّ العالمین سے بارش ہونے اور خشک سالی کی مصیبت کے دور ہو جانے کی دُعا کرتے ہیں۔ بارش ہوتی ہے خشک سالی دور ہو جاتی ہے، اس کے باوجود مکہ والے اپنی دشمنانہ کارروائیوں سے باز نہیں آتے۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تحسین میں ایک اور مقام پر ارشادِ باری تعالیٰ ہے،

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۔

یعنی بے شک آ گیا تم میں ایک رسول تمھیں میں سے جسے تمہارا کسی تکلیف یا نقصان میں پڑ جانا بہت ہی شاق ہے۔ وہ تمھاری فلاح و کامرانی کا حریص ہے اور ایمان لانے والوں کے لئے تو بالخصوص انتہائی شفیق اور رحم دل ہے۔

انسانیت کا یہ اعلیٰ ترین وصف اور اہم ترین خصوصیت یعنی رحمتؐ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ کے ایک ایک واقعے سے ظاہر ہے۔ آیئے! آپؐ کی پاک اور مبارک سے آپؐ کے رَحْمَةً لِّلْعَالَمِيْنَ ہونے کے یعنی آپؐ کی نرمی، رحم دلی اور شفقت و رحمت کے چند عملی نمونے اور دیکھیں۔

آپؐ کے ایک صحابی حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ میں مدینے میں دس سال تک برابر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں رہا، اور میں اس وقت ایک نو عمر لڑکا تھا اس لیے ظاہر ہے کہ میرا ہر کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مرضی کے مطابق نہیں ہوتا تھا لیکن دس سال کی طویل مدت میں کبھی آپؐ نے مجھے اُف تک نہیں کہا اور نہ کبھی آپؐ نے یہ فرمایا کہ یہ کیوں کیا؟ اور یہ کیوں نہ کیا؟

اور حضرت زیدؓ بن حارثہ کو بھی یاد کیجئے جو رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غلام تھے۔ جب زید کے والد وغیرہ انھیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے آپؐ تک پہنچے اور زید کو جو اُس وقت لڑکے تھے، واپس لے جانا چاہا تو آپؐ نے زیدؓ کو اختیار دے دیا کہ چاہیں تو ان کے ساتھ جائیں اور چاہیں تو آپؐ ہی کے پاس رہیں۔ آپؐ کی محبت اور شفقت کی تاثیر دیکھیے کہ زیدؓ نے آپؐ کی غلامی کو ترجیح دی اور اُن کے ساتھ جانا پسند نہیں کیا۔ آپؐ نے زیدؓ کو اپنا بیٹا بنا لیا اور وہ زید بن محمدؐ کہلانے لگے۔

ایک اور واقعہ یہ بھی دیکھئے۔ ایک بدوّی یعنی دیہاتی شخص نے مسجد میں پیشاب کر دیا۔ مسجد کی اس بے حرمتی

سے لوگ اتنے ناراض ہوئے کہ اسے مارنے دوڑے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"نہیں، اس کو چھوڑ دو اور پیشاب پر ایک ڈول پانی بہادو۔ تم لوگ اس لیے برپا کیے گئے ہو کہ دین کی راہ کو آسان بناکر پیش کرو، نہ اس لیے کہ اپنی غلط روی سے دین کی راہ کو اور دشوار بنادو۔"

اور یہ بھی سُنیے ــ ایک سیاہ فام عورت مسجد میں جھاڑو دیا کرتی تھی۔ ایک دن رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے نہ پایا تو اس کے بارے میں لوگوں سے پوچھا۔ لوگوں نے بتایا کہ اُس کا انتقال ہو گیا ہے آپؐ نے فرمایا کہ تم نے اطلاع کیوں نہیں دی۔ لوگوں نے اس معاملے کو اہمیت نہیں دی تھی لیکن آپؐ نے اس کی قبر کا پتہ پوچھا اور معلوم ہونے پر وہاں جاکر نماز جنازہ ادا فرمائی ــ دیکھیے!... کیسے رحمت والے، شفقت والے اور کمزوروں کا خیال رکھنے والے ہیں اللہ کے رسولؐ ــ عموماً ہوتا یہ ہے کہ ناداروں، کم علموں اور ایسے لوگوں کو، جن کے پیشوں کو حقیر سمجھا جاتا ہے معاشرے میں اہمیت نہیں دی جاتی، لیکن رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک کالی کلوٹی بڑھیا جاروب کش کی طرف سے بھی بے توجہی نہیں برتتے، اس کے انتقال کی اطلاع نہ دینے کو پسند نہیں کرتے اور اس کے جنازے میں شرکت کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ غریبوں اور سماج کے کمزور لوگوں کا بھی خیال رکھنے اور ان کی دلجوئی کی یہ محض ایک مثال ہے، آپؐ کی تو ساری زندگی ہی آپؐ کی اس صفتِ رحمت کی منہ بولتی تصویر ہے۔

ایک عیسائی اسکالر مائیکل۔ ایچ۔ ہارٹ نے انسانوں میں سے ایک سو بہترین انسان اپنے علم اور اندازے کے مطابق منتخب کیے اور کتاب لکھی "دہنڈرڈ" (The Hundred) تو اس میں سرِ فہرست رحمتِ عالم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رکھا۔

بہر حال اپنے ہوں یا غیر، سب نے آپؐ کی عظمت اور آپؐ کے رحمتِ عالم ہونے کا اعتراف کیا ہے:

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ وَّبَارِكْ وَسَلِّمْ۔

—★—

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی

عالمِ عربی کا تازہ المیہ

ماہ جولائی ۱۹۹۰ء کے آخر تک "پیامِ انسانیت" کا کام (اپنے محدود امکانات و وسائل کے ساتھ) سرگرمی سے ہو رہا تھا، ۱۸ مارچ ۱۹۹۰ء کو دہلی کا تاریخی بلکہ تاریخ ساز کنونشن اور ۲۱ جولائی کو لکھنؤ کا کامیاب جلسہ اس کا ایک نمونہ تھے ملک کے متعدد بڑے شہروں اور اہم مقامات پر بھی "پیامِ انسانیت" کا جلسہ منعقد کرنے کے تقاضے اور مطالبے آ رہے تھے اور لوگ مشتاق تھے، اس تحریک کی غیر مسلم دانشوروں، صاف ذہن کے سیاسی رہنماؤں اور صاحبِ ضمیر برادرانِ وطن میں اچھی خاصی پذیرائی تھی اور اس کے روشن امکانات تھے کہ ملک کا ضمیر جاگ اُٹھے اور اس غیر فطری صورتحال کو (جو فرقہ وارانہ فسادات اور خوں ریزی کی شکل میں ظاہر ہو رہی تھی) تبدیل کرنے کی سنجیدہ اور منظم کوششیں کی جائیں۔

اسی کے ساتھ (ملتِ اسلامیہ ہندیہ کے حال و مستقبل کے لحاظ سے) ایک بڑی کامیابی کی بات اور خوش آئند پہلو یہ تھا کہ مسلمان اس ملک میں ایک بار پھر داعیِ حق، محافظِ انسانیت اور معلمِ اخلاق کی حیثیت سے سامنے آئے تھے جس سے یہ امید کی جا سکتی تھی کہ مسلمانوں کو اس ملک میں پھر بجا طور پر قیادت کا مقام حاصل ہو اور ان کو ملک کا نجات دہندہ اور اس کو تباہی سے بچانے والا یاد کیا جائے کہ خدمتِ انسانیت اور سچی حب الوطنی کا یہ محاذ عرصہ سے خالی تھا اور مسلمان جو خدا کے "رب العالمین" ہونے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے "رحمۃ للعالمین" ہونے پر عقیدہ رکھتے ہیں اس محاذ پر سب سے زیادہ کامیاب ہو سکتے ہیں۔

اور اس جدوجہد کے نتیجہ میں ان کے بارے میں سب غلط فہمیوں اور غلط بیانیوں کا پردہ چاک ہو جائے جو غلط تاریخ اور سیاسی اغراض نے ڈال دیا ہے، اسی کے ساتھ ملک بھی اس خطرہ سے بچ جائے گا جو فرقہ وارانہ فسادات، ظلم و سفاکی اور خدا کے غضب کو بھڑکانے والے افعال و واقعات کی وجہ سے اس کے سر پر منڈلا رہا ہے۔

اسی طرح یہ بات بھی خوش آئند اور امید افزا تھی کہ عالم عربی جو اسلام کا داعی اول، مقامات مقدسہ کا امین و متولی اور احترام انسانیت، عدل و مساوات اور امن و سکون کی دعوت و کوشش کا پہلی کامیاب تجربہ گاہ ہے معرصۂ دراز سے امن و سکون، باہمی اعتماد و احترام اور خوشحالی و رفاہیت کی زندگی گذار رہا ہے اور وہ ہر وقت اس حال میں ہے کہ دنیا کو پھر احترام انسانیت، بقائے باہم اور ایک دوسرے کے ساتھ عدل و انصاف کا معاملہ کرنے کی دعوت دے اور اس کے لئے عالمی اسٹیج پر آئے اور پھر انسانیت کے امام و قائد کا منصب سنبھالے۔

جولائی ۱۹۹۰ء کے آخر تک یہی صورتحال قائم تھی امیدوں کے چراغ روشن تھے اور اصلاح و دعوت کا کام کرنے والوں کے سر اونچے اور نگاہیں بلند تھیں کہ اچانک ۲ اگست کو ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس سے نہ صرف احترام اور حفاظت انسانیت کی دعوت دینے والوں کے بلکہ پوری ملت اسلامیہ کے (ہندوستان کے اندر ہندوستان کے باہر) سر خم، آنکھیں نیچی اور پیشانی عرق آلود ہو گئی راقم کو اسلامی تاریخ کے ایک طالب علم اور مصنف کی حیثیت سے یاد نہیں کہ صدیوں سے مسلمانوں کو من حیث القوم ایسی شرمندگی اور ذلت کا سامنا کرنا پڑا ہو، واقعہ کی سنگینی اس وجہ سے اور بڑھ جاتی ہے کہ یہ واقعہ بلاد عربیہ میں پیش آیا جہاں سے احترام انسانیت، عدل، احسان شناسی اور شرافت اور کمزوروں کی حمایت و حفاظت کی عالمی تحریک و دعوت نمودار ہوئی تھی۔ راقم کی مراد عراق کا کویت پر اچانک حملہ ہے جو ایک صاعقہ اثر خبر کی طرح دنیا کے ذرائع ابلاغ و پریس نے نشر کی، اس واقعہ کی سنگینی اور اس کے انسانی اور اسلامی ضمیر پر بار ہونے کے متعدد وجوہ تھے۔

۱۔ عراق کے جیسے بڑے اور طاقتور ملک نے جو حال ہی میں ایران جیسے عظیم و وسیع ملک سے جنگ میں کامیاب

شامل نمبر ۹۹

ہو چکا تھا ۔ کویت کی حسین وجمیل ریاست پر حملہ اور اس پر قبضہ کر کے ایک ایسی خراب نظیر قائم کی جو نہ صرف یہ کہ اسلام کی اخلاقی تعلیم و روایات سے مطابقت نہیں رکھتی بلکہ انسانی ضمیر اور اصول اخلاق کے لحاظ سے بھی ایک مذموم اقدام اور "قزاقی" کے مترادف ہے پھر اس میں مزید سنگینی کا پہلو یہ ہے کہ حملہ آور ملک اور جس علاقہ میں حملہ کیا گیا دونوں مسلمان بھی ہیں اور عرب بھی ۔ مزید برآں یہ کہ ایک ایسے ملک نے اسی ریاست پر حملہ اور اسی پر قبضہ کیا جس نے قریب ترین ماضی میں اس کی فیاضانہ مدد کی تھی اور جس کا کوئی ایسا قصور نہ تھا جس کی اس کو اس طرح سزا دی جائے ۔

۲۔ پھر عراق کے کویت پر اس کامیاب حملہ اور قبضہ کے نتیجہ میں وہ ساری قباحتیں اور شرمناک واقعات پیش آئے جن کا ایسے حملہ اور فتوحات میں حملہ آور فوجوں کے ہاتھوں تجربہ کیا گیا ہے اور جس کو قرآن مجید نے ملکہ سبا کی زبان سے ادا کئے ہوئے لفظوں میں نقل کر کے قیامت تک کے لئے اس کی صداقت پر مہر لگا دی ہے

إِنَّ الْمُلُوكَ إِذَا دَخَلُوا قَرْيَةً أَفْسَدُوهَا وَجَعَلُوا أَعِزَّةَ أَهْلِهَا أَذِلَّةً ۖ
وَكَذَٰلِكَ يَفْعَلُونَ (سورہ نمل آیت ۳۴)

بادشاہ جب کسی شہر میں داخل ہوتے ہیں تو اس کو تباہ کر دیتے ہیں اور وہاں کے عزت والوں کو ذلیل کر دیا کرتے ہیں اور اسی طرح یہ بھی کریں گے۔

۳۔ پھر عراق کے فوجی قائد و حکمران صدام حسین نے ایران کی ان سب شرطوں اور دعاوی کو جن کی بنا پر ایران سے سالہا سال ایک طویل اور خون ریز جنگ ہوتی رہی جس کے نتیجہ میں طرفین کے لاکھوں آدمی لقمۂ اجل بنے اپنے کارنامہ پر خود پانی پھیر دیا ۔ اور ان لاکھوں مقتولین کے ساتھ ناانصافی کی جو اس جنگ میں مارے گئے اور جن کے متعلق پوچھا جا سکتا ہے کہ بِأَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ ۔

ہم جب قرآن مجید کی یہ آیت پڑھتے تھے :

وَقَدِمْنَا إِلَىٰ مَا عَمِلُوا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنَاهُ هَبَاءً مَّنثُورًا

اور جو انہوں نے عمل کئے ہوں گے ہم ان کی طرف متوجہ ہوں گے ، تو ان کو اڑتی خاک کر دیں گے

(سورہ الفرقان آیت ۲۳)

تو کہتے تھے (اور یہ صحیح بھی ہے) کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں آخرت کے انجام اور جنت سے لوگوں کو صالحہ جنھوں نے رضائے خداوندی کے لئے صحیح اصولوں پر کارنامہ انجام نہیں دیا، اپنے معاملہ اور جزا کا ذکر کیا ہے، معلوم ہوا کہ یہ دنیا میں بھی پیش آسکتا ہے اور خود صاحب عمل اپنے عمل کے ساتھ یہ معاملہ کر سکتا ہے کہ وہ کوئی متضاد طرز عمل اختیار کر کے اپنے کارنامہ پر پانی پھیر دے اور اس کو گرد وغبار بنا دے۔

۴۔ صدام حسین کی قوت ارادی، کامیاب فوجی تنظیم اور قیادت سے بعض حلقوں میں یہ امید قائم ہو گئی تھی کہ شاید وہ عالم عربی کی قیادت کے اس خلا کو پُر کر سکیں جو عرصہ سے پایا جاتا ہے اور خدا ان سے کوئی ایسا کام لے جس کے ذریعہ مسلمانوں اور عربوں کی عزت بحال ہو اور تعجب نہیں کہ وہ اپنی تمام توجہات صلاحیتوں اور امکانات کو جمع کر کے اسرائیل کے خلاف محاذ آرائیوں اور شاید خدا ان کو اس کی توفیق دے کہ وہ پورے اخلاص اور خدمت اسلام کے اس جذبہ کے ساتھ جو السلطان المظفر البطل الناصر لدین اللہ صلاح الدین ایوبیؒ کے سینہ میں موجزن تھا اور جس پر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے کھلی ہوئی نصرت ہوئی، وہ مسجد اقصیٰ اور فلسطین کو واپس لینے اور اسرائیل سے صف آرائی کی کوشش کریں لیکن یہ موقع نہیں آیا تھا کہ انھوں نے بجائے اسرائیل کے ممالک عربیہ اسلامیہ کے اندر ایک نیا محاذ کھول دیا اور اپنے بارے میں مسلمانوں کے اعتماد و توقعات کو متزلزل بلکہ ختم کر دیا۔

۵۔ کویت پر اس حملہ اور عرب و مسلمان سربراہان مملکت اور قائدین کے مشوروں اور اندیشوں پر بالکل کان بند کر لینے سے یہ خطرہ بھی پیدا ہو گیا ہے کہ خدانخواستہ وہ کہیں جزیرۃ العرب اور مملکت سعودیہ کی طرف (جو حرمین شریفین کی متولی، خادم اور محافظ و امین ہے اور جس نے حجاز مقدس میں امن و امان قائم کرنے حجاج کے جان و مال کے تحفظ، وسائل زندگی کی فراہمی، خاص طور پر پانی کی فراوانی اور آمد و رفت کی سہولت کے سلسلہ میں وہ تاریخی کارنامہ انجام دیا ہے جس کی صدیوں کی تاریخ میں نظیر نہیں ملتی) طمع کی نگاہ نہ اٹھائیں اور وہ ان کی حوصلہ مندی اقتدار پسندی کا نشانہ نہ بن جائے۔ جو کسی فوجی کامیابی اور فوجی طاقت کی موجودگی میں کوئی ناقابل تصور اور ناممکن العمل چیز نہیں ہے۔

علامہ اقبال نے اپنے اس شعر میں ایک بڑی تاریخی حقیقت بیان کی ہے، جس کی تصدیق خود عراق کی

تاریخِ امم کا یہ پیامِ ازلی ہے ؎ صاحب نظراں! نشۂ قوت ہے خطرناک

اس اندیشہ کے نتیجہ میں جو اقتدار پسندی کی تاریخ میں کوئی نایاب واقعہ نہیں، حکومت سعودیہ کو امریکہ اور برطانیہ سے مملکت کے تحفظ کے لئے فوجی امداد طلب کرنی پڑی اور دنیا کے عام مسلمانوں بالخصوص اس تحتی براعظم کے مسلمانوں کو (جنھوں نے مغربی اقتدار کا تجزیہ کیا ہے) اس موقع پر یہ تمنا ہوئی کہ کاش خود مسلم ممالک اس قابل ہوتے کہ وہ جزیرۃ العرب اور حرمین شریفین کی حفاظت کے سلسلہ میں سعودی مملکت کے لئے اپنی بہترین خدمات پیش کرسکتے اور اس کی حفاظت کو اپنے ملک کی حفاظت سے بھی زیادہ ضروری اور قرب خداوندی و خوشنودی رسول ؐ کا ذریعہ سمجھتے۔

۶۔ اگر عراق کے کویت پر حملہ کرنے اور کسی دوسرے عرب ملک کی طرف بھی حوصلہ مندی کی نگاہ اٹھانے کے جواز میں یہ کہا جائے کہ ان بلادِ عربیہ اور ان خلیجی ریاستوں کی زندگی خود ایسے اقدامات اور تادیبی کارروائیوں کی عرصہ سے دعوت دے رہی تھی اور یہ وہاں کی "مترفانہ" و مسرفانہ زندگی کا نتیجہ ہے جس کی تصدیق قرآن و حدیث کے بیانات و تنبیہات سے ہوتی ہے تو راقم معذرت کے ساتھ اور اضطراراً کہے گا کہ عربوں کی زندگی پر نہ صرف بلادِ عجم میں بلکہ عالمِ عرب میں بھی کسی نے اتنی تنقید نہیں کی اور اس کے بارے میں اتنی صاف گوئی اور جراءت سے کام نہیں لیا جس کی خدا نے اپنے اس گنہگار بندہ کو توفیق دی۔ لیکن اس کا یہ علاج نہیں تھا کہ ایک بڑا ملک ایک چھوٹی ریاست پر اندھا دھند حملہ کردے۔ اور اس پر بلا کسی اصلاحی مقصد اور دعوت کے اپنا قبضہ جمالے، اس کا علاج صحیح اسلامی دعوت و تحریک، احیائے دین کی سنجیدہ اور مخلصانہ کوشش اپنی جگہ پر صحیح اسلامی نظام حکومت اور طرزِ معاشرت کا قیام، صالح نظامِ تعلیم و تربیت (جو نئی نسل کو اسلام کے سانچہ میں ڈھالنے کی خدمت انجام دے سکے) اور ایک معیاری و مثالی اسلامی معاشرہ اور ماحول کی موجودگی ہے جو دنیا کے لئے جاذبِ نظر اور قابلِ رشک ہو، افسوس ہے کہ حملہ آور عراق کے یہاں (ہماری معلومات میں) ان میں سے کوئی امتیاز و خصوصیت نہیں پائی جاتی تھی، اس لئے اس کا کوئی شرعی و اخلاقی جواز نہیں تھا۔

جہاں تک راقم سطور کی حقیر ذات کا تعلق ہے اس کے دل و دماغ پر اپنی شعوری زندگی میں کسی حادثہ کا اتنا اثر نہیں پڑا جتنا اس حادثہ کا، اس لئے کہ تقدیر خداوندی اور توفیق الٰہی کے نتیجہ میں اس نے لکھنے پڑھنے اور خطاب و تحریر کی صلاحیت پیدا ہونے کے بعد سے اپنی محدود صلاحیتوں اور فرصتوں کا اصل میدان عالم عربی ہی کو بنایا اور مخاطب عرب اقوام و ممالک کو، اس کی اکثر اہم تالیفات و تحریریں اصلاً و ابتداءً عربی میں وجود میں آئیں اور دوسری زبانوں میں ان کا ترجمہ ہوا، اس کو ایک اظہارِ حقیقت اور تحدیث بالنعمۃ کے طور پر اقبال کے بلیغ الفاظ میں یہ کہنا پڑتا ہے ؎

مرا ساز گرچہ ستم رسیدۂ زخمہائے عجم رہا ٭ وہ شہیدِ ذوقِ وفا ہوں میں کہ نوا مری عربی رہی

اس لئے اس حادثۂ فاجعہ سے اور اس کے نتیجہ میں قریب کے عرب ممالک اور خاص طور پر جزیرۃ العرب کی محبوب سرزمین، مقاماتِ مقدسہ اور حرمین شریفین کے لئے جو خطرات پیدا ہو گئے ہیں اس سے دماغ کے ساتھ دل پر بھی ایک بڑی چوٹ لگی ہے کہ ع۔ اسی گھر میں جلا ہے چراغ آرزو برسوں

جہاں تک جزیرۃ العرب، حجازِ مقدس اور حرمین شریفین (زادھما اللہ شرفاً وکرامۃً) کا تعلق ہے ان کے مستقبل، ان کی حرمت و عزت کی بقاء اور ان کی حفاظت کے یقینی سامان کی طرف سے مایوسی نہیں ہے کہ وہ اللہ کے اس آخری و عالمی دین کا مطلع و منبع بھی ہیں اور ملجا و ماوی بھی اور قرآن و تاریخ شاہد ہیں کہ وہ واقعۂ فیل اور ابرہہ کے لشکر کے حملہ کے بعد سے سلطنتِ عثمانیہ کے (جس کا سلطان و خلیفہ اپنے خادم الحرمین الشریفین کہتا اور سمجھتا تھا) ضعف و زوال اور معزول طاقتوں کے اثر و اقتدار کے بعد وہ کس طرح محفوظ اور باعزت رہے اور مسلمان ان کی عزت و آبرو کو اپنے اہل و عیال اور اپنے ملک و وطن کی عزت و آبرو پر ترجیح دیتے رہے اور آج بھی دنیا کے مسلمانوں کے کانوں میں اقبال کے لفظوں میں صدا آ رہی ہے ؎

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے ٭ نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر

خدا کی رحمت سے اس کا جو معاملہ اپنے آخری اور مقبول دین اسلام کے ساتھ رہا ہے اور اس پر تاریخ مسلّمہ ہے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ خوف و ہراس اور شک و شبہ کی ان تاریکیوں میں سے سکون و اطمینان کی طرف

ﺮت، دعوتِ حق و حفاظتِ انسانیت کی نئی روشنی طلوع فرمائے گا اور اسلام کے ان داعیان، علمبر
حاملینِ قرآن اور حرم کے پاسبانوں سے پامال و تباہ حال انسانیت کا نمائندہ و ترجمان کہہ سکے گا۔

عالم ہمہ ویرانہ ز چنگیزیٔ افرنگ ✤ معمارِ حرم باز بہ تعمیرِ جہاں خیز

لیکن اس کے لئے نہ صرف ممالکِ عربیہ کو بلکہ ممالکِ اسلامیہ اور مسلم معاشرہ کو اپنی سیرت، اپنے طرزِ زندگی، اپنے نظامِ حیات اور اپنے اخلاق و کردار میں تبدیلی لانے کی ضرورت ہوگی، اور ان کو اسلام کے سانچے میں ڈھالنا ہوگا، اسلام کی صداقت و ابدیت پر نیا ایمان و یقین اور اس کے ابلاغ اور اس کا عملی نمونہ دکھلانے کا عزم اور جوش پیدا کرنا ہوگا اور وہ زندگی اختیار کرنی ہوگی جس پر اللہ کی طرف سے رحمت و نصرت کا وعدہ ہے اور اس طرزِ زندگی اور اعمال و اخلاق سے بچنا ہوگا جو خدا کی رحمت و نصرت سے محروم کرنے والے ہیں۔ وصدق اللہ العظیم

ولینصرنّ اللہُ مَن ینصرہ اِنّ اللہ لقویٌ عزیز۔ (سورۃ الحج آیت ۴۰)

"اور جو شخص خدا کی مدد کرتا ہے خدا اس کی ضرور مدد کرتا ہے بے شک خدا توانا اور غالب ہے"

—★—

جگن ناتھ آزاد پر ایک مختلف کتاب

جگن ناتھ آزاد، ایک مطالعہ

از

محمد ایوب واقف (بمبئی)

(انجمن محبانِ اردو، جموں کی جانب سے انعام یافتہ)

ہر لائبریری میں رہنا ضروری ہے۔

کیا آپ نے قرآن کا مطالعہ کیا ہے ؟

اگر نہیں تو اس سے زیادہ محرومی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے

لوگوں کا حال یہ ہے کہ

- صبح اٹھتے ہی اخبار پڑھنے کے لئے بے چین رہتے ہیں
- رسائل کا شوق سے مطالعہ کرتے ہیں
- دنیا بھر کی کتابیں پڑھنے کے لئے وقت نکالتے ہیں

لیکن اللہ کی کتاب پڑھنے کے لئے ان کے پاس وقت نہیں ہے

حالانکہ

* نزولِ قرآن کا آغاز ہی اس کتاب کو پڑھنے کے حکم اقْرَأْ سے ہوا ہے
* یہ صرف تلاوت کے لئے نہیں بلکہ سمجھ کر پڑھنے اور ہدایت حاصل کرنے کے لئے نازل ہوئی ہے
* یہ انسان کو غور و فکر کی دعوت دیتی ہے تاکہ اس کے خیالات میں نکھار پیدا ہو اور اس کی زندگی سنور جائے۔
* یہ مطالبہ کرتی ہے کہ زندگی کا سفر اس کی روشنی میں طے کیا جائے۔
* کیا یہ مقاصد قرآن کے مطالعہ کے بغیر پورے ہو سکتے ہیں ؟

اور

ایسے مسلمان کتنے ہیں جنھوں نے زندگی میں کم از کم ایک مرتبہ ہی قرآن سمجھ کر پڑھا ہو ؟

سید احمد عروج قادری

قسط چہارم

اسلامی تصوف

اولیاء اللہ اور اولیاء الشیطان، یہی دو گروہ ہیں جن کے ذکر سے قرآن بھرا ہوا ہے۔ اور یہ دنیا انھیں دو گروہوں کی معرکہ آرائیوں کا میدان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اختیار دے رکھا ہے کہ وہ جس گروہ کو پسند کریں اس میں داخل ہو جائیں۔ اس سلسلے میں چند آیتوں کے ترجمے ہم یہاں نقل کرتے ہیں:

۱۔ "اللہ ایمان والوں کا ولی ہے۔ انہیں اندھیروں سے روشنی میں نکال لاتا ہے"
(البقرہ : ع ۳۴)

۲۔ "اللہ کے سامنے وہ ہرگز تیرے کام نہ آئیں گے اور ظالم ایک دوسرے کے ولی ہیں اور متقیوں کا ولی ہے۔"
(الجاثیہ ع ۲)

۳۔ "مسلمان اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں اور کافر طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں۔ پس شیطان کے اولیاء سے لڑو۔ اور یقین جانو کہ شیطان کی چالیں حقیقت میں نہایت کمزور ہیں"
(النساء ع ۱۰)

ان آیتوں میں ولی اور اولیاء کے الفاظ ایک جامع اصطلاح کی طرح استعمال ہوئے ہیں اولیاء کا لفظ سورۂ یونس میں بھی استعمال ہوا ہے اور ہمارے موضوع کے لئے وہی سب سے زیادہ اہم ہے۔

أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ [illegible]

وَكَانُوا يَتَّقُونَ ۝ لَهُمُ الْبُشْرَىٰ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ ۚ لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ ۚ ذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ۝ (یونس ۶۲ ۔ ۶۴)

ترجمہ : سنو اللہ کے اولیاء کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ، یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور تقویٰ کا رویہ اختیار کیا ۔ دنیا اور آخرت دونوں زندگیوں میں ان کے لئے بشارت ہی بشارت ہے ۔ اللہ کی باتیں بدل نہیں سکتیں یہی بڑی کامیابی ہے ۔

کتب تصوف میں ان آیتوں کو اولیائے اُمت رحمہم اللہ کی ولایت خاصہ کے لیے بجا طور پر بطور دلیل پیش کیا گیا ہے ان آیتوں نے پوری طرح واضح کر دیا ہے کہ اللہ کے ولی کون لوگ ہیں ۔ ان میں اولیاء کی تعریف بھی ہے اور ان کے دینوی و اُخروی اجر کا ذکر بھی ۔ " اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ " اولیائے خاص کی تعریف ہے ۔ اس میں دو جزو ہیں ایمان اور تقویٰ ایمان کے بغیر کوئی شخص اللہ کا ولی نہیں ہو سکتا اور تقویٰ کے بغیر لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ کے مژدۂ جاں بخش کا استحقاق پیدا نہیں کرتا ۔ اللہ کا تقرب اور اس کے نزدیک عزت حاصل کرنے کا ذریعہ تقویٰ ہے ۔ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ (اللہ کے نزدیک تم میں سب سے عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے) حاصل یہ نکلا کہ متقی مومن ہی اللہ تعالیٰ کے اولیائے خاص ہیں ۔ جن لوگوں نے تصوف کو طریقِ تقویٰ کہا ہے غالباً ان کے سامنے یہی آیتیں رہی ہیں ——— یہاں اجمالاً یہ لکھنا کافی ہے کہ قرآن نے جس تقویٰ کا مطالبہ کیا ہے اور جو دعوت انبیاء کا مدار کار رہا ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنی زندگی کو خدا کے مقرر کئے ہوئے حدود کے اندر رکھے اور ہمیشہ اس بات سے خبردار رہے کہ اگر اس نے اللہ کی قائم کی ہوئی کسی حد کو توڑا یا اس کی مقرر کی ہوئی کسی سرحد کو پھاندا تو اس کو خدا کی سزا سے بچانے والا کوئی نہیں ہو سکتا الا یہ کہ خود خدا ہی رحم کرے ۔

مومنین متقین کی صفات قرآن مجید میں تفصیل سے موجود ہیں ۔ چند آیتوں کے ترجمے پیش کیے جاتے ہیں ۔ اصل آیتیں قرآن میں مطالعہ کی جائیں ۔ سورۂ بقرہ رکوع ۲۲ آیت ۱۷۷ کا ترجمہ یہ ہے ۔

" [illegible] یہی نہیں کہ تم اپنے چہرے مشرق کی طرف یا مغرب کی طرف کرو بلکہ نیکی یہ

یہ ہے کہ آدمی اللہ کو اور یومِ آخرت کو اور ملائکہ کو اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب اور اس کے پیغمبروں کو دل سے مانتے اور اللہ کی محبت میں اپنا مال، رشتے داروں اور یتیموں پر، مسکینوں پر، مدد کے لئے ہاتھ پھیلانے والوں اور غلاموں کی رہائی پر خرچ کرے، نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دے اور نیک وہ لوگ ہیں کہ جب عہد کریں تو اسے وفا کریں اور تنگی و مصیبت کے وقت میں اور حق و باطل کی جنگ میں صبر کریں، یہ ہیں راست باز لوگ اور یہی لوگ متقی ہیں"

اس آیت نے پرہیزگاروں کو ناپرہیزگاروں سے بالکل الگ کر دیا ہے اور تقویٰ کی حقیقت پر دن کی روشنی پھیلا دی ہے سب سے پہلے اس نے اس غلط فہمی کو دور کیا ہے جو تقویٰ کے متعلق اہلِ کتاب میں پیدا ہو گئی تھی انھوں نے مذہب کی چند آسان اور سہل رسموں کی پابندی اور چند خود ساختہ مظاہر دینداری کو اصل تقویٰ سمجھ رکھا تھا قرآن نے مثال کے طور پر کہا کہ نیکی اور اعلیٰ درجہ کی نیکی یہ نہیں ہے کہ تم مشرق یا مغرب کی طرف منہ کر کے نماز پڑھ لو اور اپنے آپ کو متقی سمجھنے لگو۔ اصل نیکی یہ ہے اور حقیقی متقی یہ لوگ ہیں۔ اس آیت میں پہلے ان بنیادی عقائد پر یقین و اذعان کو نیکی کا سرچشمہ قرار دیا ہے جن کے بغیر کسی کو تقویٰ کی ہوا بھی نہیں لگ سکتی اور پھر مثال کے طور پر چند بنیادی اعمال و صفات کا ذکر کیا گیا ہے۔ اللہ کے بتائے ہوئے مصارف میں انفاقِ مال، اقامتِ صلوٰۃ، ایتاءِ زکوٰۃ، ایفائے عہد، مشکلات اور حق و باطل کی جنگ میں صبر۔ یہ ہیں وہ بنیادی اعمال و صفات جن کے بغیر راست بازی اور تقویٰ کا خیال بھی لغو ہے۔ حق و باطل کی جنگ میں صبر کی حقیقت یہ ہے کہ حق کو قائم رکھنے، حق کی حمایت کرنے اور حق کو قائم و نافذ کرنے میں انسان ہر مصیبت برداشت کرے اور باطل کی ہر چوٹ سہہ لے مگر اپنے مقصد اور نصب العین میں سستی اور بزدلی نہ دکھائے۔ اگر یہ صفت اس میں نہیں ہے تو وہ راست باز اور متقی نہیں ہے چاہے اپنے آپ کو بزدلیوں کی طرح متقیوں کا امام ہی کیوں نہ سمجھتا رہے ـــــ

"اور جو سچی بات لایا اور جس نے اس کی تصدیق کی وہی لوگ متقی ہیں ان کے لیے وہ سب کچھ ہے جو وہ چاہیں' اپنے رب کے پاس یہ بدلہ ہے محسنوں کا ۔"

اس آیت سے معلوم ہوا کہ متقی اور محسن وہی لوگ ہوتے ہیں جو اپنے دعوئے اسلام میں سچے اور ایمان میں پختہ ہوں' سچے اسلام اور پختہ ایمان کے بغیر تقویٰ اور احسان کا درجہ حاصل نہیں کیا جا سکتا ۔

ان دو مقامات پر قرآن نے صراحت کے ساتھ کہا ہے کہ یہی لوگ متقی ہیں۔ اب چند ایسے مقامات پیش کیے جاتے ہیں جن میں متقیوں کی کچھ اور مزید صفتوں کا ذکر ہے ۔

"یہ (متقین) وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ مالک ہم ایمان لائے ہیں ہماری خطاؤں سے درگزر فرما اور ہمیں آتش دوزخ سے بچالے ۔ یہ لوگ صبر کرنے والے ہیں' راست باز فرماں بردار اور خدا کی راہ میں خرچ کرنے والے ہیں اور رات کی آخری گھڑیوں میں اللہ سے مغفرت کی دعائیں مانگا کرتے ہیں ۔" (آلِ عمران ۲)

اللہ پر سچا ایمان' قول و عمل میں سچائی' مصائب و مشکلات میں صبر' اللہ کی فرماں برداری اور اپنے مال میں فیاضی' ان تمام صفات کے باوجود ان کے تواضع و انکسار میں اور ان کے عجز و نیاز کا یہ حال ہے کہ رات کے پچھلے پہر' اطاعت و فرماں برداری میں تقصیر کی معافی مانگا کرتے ہیں' یہ ہے اصل تقویٰ اور یہ ہیں حقیقی متقی ـــــ سورۃ الاعراف میں ہے ،

"خدا نے فرمایا میرے عذاب کا حال یہ ہے کہ جسے چاہتا ہوں دیتا ہوں اور رحمت کا حال یہ ہے کہ ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے پس میں ان لوگوں کے لئے رحمت لکھ دوں گا جو تقویٰ کی روش اختیار کریں اور زکوۃ دیں گے اور میری آیات پر ایمان لائیں گے وہ اس رسولؐ کی پیروی کریں گے جو نبیٔ امّی ہوگا اور اس کے ظہور کی خبر اپنے یہاں تورات اور انجیل میں لکھی پائیں گے' وہ انھیں نیکی کا حکم دے گا' برائی سے روکے گا پسندیدہ چیزیں حلال کرے گا' گندی چیزیں حرام ٹھہرائے گا۔ اس بوجھ سے نجات دلائے گا جس کے تلے دبے ہوں گے' ان پھندوں سے نکالے گا جن میں گرفتار ہوں گے تو جو لوگ اس پر

ایمان لائے، اس کی تقویت کا باعث ہوئے (دشمنانِ حق کے مقابلہ میں) اس کی مدد کی اور اس روشنی کے پیچھے چلے جو اس کے ساتھ بھیجی گئی ہے تو وہی ہیں جو کامیابی پانے والے ہیں۔"

(الاعراف ۱۹۲)

ان آیتوں میں ایمان اور تقویٰ کو ان لوگوں کے اندر محصور کر دیا گیا ہے جو اللہ کے آخری بنی اُمی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی کرنے والے ہیں اللہ کی رحمت اور فلاح انہیں لوگوں کے حصے میں ہے جو آپ پر ایمان لائیں، آپ کی تقویت کا باعث ہوں، آپ کی مدد کریں اور قرآن کو اپنی زندگی کا دستور العمل بنائیں، نزولِ قرآن اور آخری بنی کی بعثت کے بعد ایمان اور تقویٰ کا وجود ممکن ہی نہیں جب تک یہ باتیں نہ پائیں اور جس میں یہ باتیں پائی جائیں اس کو اپنے اندر اس سے الگ نہ کوئی اور صفت پیدا کرنے کی ضرورت اور نہ اُسے کسی دوسری طرف رُخ کرنے کی حاجت۔ اللہ کی ولایت خاصہ اس کے ا چھے میں ہے، چاہے اس کے اندر وہ مظاہر تقویٰ نہ پائے جاتے ہوں جنھیں بہت بعد کو لوگوں نے مظاہر تقویٰ قرار دے لیا ہے۔ بنی امی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انسانوں کو ان پھندوں سے نجات دلائی جنھیں خود انھوں نے اپنے گرد تن لیا تھا اب اگر پھر وہ ان پھندوں کو اپنے گرد جکڑ رہے ہیں تو یہ ان کی خطا ہے اور اگر وہ انھیں پھندوں کو تقویٰ اور ولایت سمجھ رہے ہیں تو یہ خود ان کا اپنا قصورِ فہم ہے یہودیوں نے جو بوجھ اپنے سروں پر لاد لیا تھا اور جو پھندے اپنے گرد کس لیئے تھے وہ کیا تھے؟ مولانا ابوالکلام تحریر فرماتے ہیں۔

"یہ بوجھ کیا تھا اور یہ پھندے کون سے تھے جن سے قرآن نے رہائی دلائی؟ قرآن نے دوسرے مقامات پر اسے واضح کر دیا ہے مذہبی احکام کی بے جا سختیاں مذہبی زندگی کی ناقابلِ عمل پابندیاں، ناقابلِ فہم عقیدوں کا بوجھ، وہم پرستیوں کا انبار، عالموں اور فقیہوں کی تقلید کی بیڑیاں، پیشواؤں کے تعبد کی زنجیریں، یہ بوجھل رکاوٹیں تھیں جنھوں نے یہودیوں اور عیسائیوں کے دل و دماغ مقید کر دیئے تھے پیغمبرِ اسلام ﷺ کی دعوت نے ان سب سے نجات دلائی۔ اس نے سچائی کی ایسی سہل اور آسان

راہ دکھائی جس میں عقل کے لیے کوئی بوجھ نہیں، عمل کے لیئے کوئی سختی نہیں، حنیفیۃ السمحۃ یلیلھا کنھارھا۔

افسوس جن پھندوں سے قرآن نے اہل کتاب کو نجات دلائی تھی، مسلمانوں نے وہی پھندے پھر اپنے گلوں میں ڈال لیے۔

متقین کی صفات اور تقویٰ کے بیان سے قرآن بھرا ہوا ہے یہ نمونے کے طور پر چند آیتوں کے ترجمے پیش کیے گئے، اسی نوع کی دوسری آیتیں بھی آپ کو ملیں گی۔ کتاب وسنت میں "اولیاء اللہ" کی نہ کوئی خاص ہئیت بیان کی گئی ہے اور نہ ان کا کوئی خاص لباس پیش کیا گیا ہے نہ ان کے اندر مافوق البشر کسی طاقت کی نشان دہی کی گئی ہے اور نہ "اولیاء اللہ" کے نام کو کسی خاص طبقے کے ساتھ مخصوص کیا گیا ہے۔

اب یہ بھی دیکھ لیں کہ درجات کے اعتبار سے "اولیاء اللہ" کی تقسیم کیا ہے؟ قرآن کریم میں اللہ ورسول ﷺ کے فرماں بردار مومنوں کے لیئے کئی تعبیریں اختیار کی گئی ہیں۔ اس گروہ کو مجرمین کے گروہ سے علیحدہ کرنے کے لیئے اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیئے) کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے اسی اجمال میں درجات کی ساری تفصیل بند ہے۔ اس میں ادنیٰ درجہ کے نیکوکار مسلمان بھی داخل ہیں اور اعلیٰ درجہ کے مومنین متقین بھی۔ انھیں لوگوں کے لیئے کہیں اولیاء اللہ، کہیں حزب اللہ اور کہیں اصحاب الجنۃ کی تعبیریں بھی اختیار کی گئی ہیں، مومنین صالحین کے گروہ کی اصلاً دو قسمیں بیان کی گئی ہیں۔ مقربین، ابرار ــــ مقربین کی تعبیر کہیں "السابقون" اور کہیں "سابقون بالخیرات" سے بھی کی گئی ہے اسی طرح ابرار کو اصحاب الیمین اور مقتصد کے الفاظ سے بھی ذکر کیا گیا ہے ان دونوں قسموں کی صفات اور آخرت میں ان کی جزا کا علم حاصل کرنے کے لیئے فاطر، واقعہ، دہر اور مطففین کی سورتیں مطالعہ کرنی چاہئیں۔ "اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" ہی کی ایک اور تقسیم قرآن میں پائی جاتی ہے۔ انبیاء، صدیقین، شہداء، صالحین۔ لیکن درحقیقت یہ چار قسمیں بھی انھیں دو قسموں میں داخل ہیں۔ اللہ کی کتاب نے مقربین وابرار کی صفات وخصوصیات کو پوری تفصیل سے بیان کیا ہے اور کوئی قابل ذکر بات چھوڑی نہیں ہے۔ "اولیاء اللہ" کی صفات وخصوصیات

اور ان کا مرتبہ جانچنے کے لئے، قرآن کریم بالکل کافی ہے اور نہ صرف یہ کہ بالکل کافی ہے بلکہ وہی آخری سند بھی ہے اور وہی کامل معیار بھی ہے جس کے پاس قرآن کی سند نہیں اور جو اس معیار پر کھرا نہیں وہ کچھ اور ہو تو ہو اللہ کا ولی نہیں ہے۔ "کَرَامَاتُ الْاَوْلِیَاءِ حَقٌّ" کے تحت عقائد کی کتابوں میں بھی ولایت اور ولی کی تعریفیں لکھی گئی ہیں۔ مثلاً شرح عقائد نسفی میں ہے:

> "ولی وہ ہے جو بحد امکان اللہ تعالیٰ اور اس کی صفات کا عارف ہو، طاعتوں پر مواظبت کر رہا ہو، معاصی سے بچ رہا ہو اور لذات و شہوات میں انہماک سے روگرداں ہو۔"

اس تعریف میں بھی کوئی ایسی بات نہیں ہے جو کتاب و سنت کے خلاف ہو۔ اسی طرح بعض مقامات پر بعض صوفیا نے بھی ولی کے متعلق صحیح اور صاف بات لکھی ہے۔ علامہ شعرانی تحریر فرماتے ہیں:

> "کرامات کا ظاہر ہونا ولایت کی شرط نہیں ہے، ولی ہونے کی شرط تو صرف اللہ کے احکام کی تعمیل اور اس کے نواہی سے اجتناب ہے اس کا معاملہ کتاب و سنت کے دلائل سے مضبوط ہونا چاہیئے، جو شخص ایسا ہوگا اس کی ولایت پر قرآن شاہد ہے اگرچہ کوئی ایک شخص بھی اس کا معتقد نہ ہو اور نہ اس کے پاس مریدوں کی جماعت ہو۔"

علامہ عبدالوہاب شعرانی دسویں صدی ہجری کے مشہور، مستند اور اعلیٰ درجہ کے صوفی و عالم ہیں ولی کے متعلق ان کی یہ صراحت صدفی صد صحیح ہے۔ ولی کے متعلق کتب تصوف میں جو مبالغہ آمیز باتیں لکھی گئی ہیں ہم یہاں ان سے صرف نظر کرتے ہیں اس لیئے کہ ہمارا موضوع مثبت طور پر اسلامی تصوف پیش کرنا ہے۔ غلط باتوں پر تنقید ہم نے دانستہ ترک کر دی ہے۔ آخر میں رسالہ قشیریہ کی ایک عبارت پر گفتگو ختم کرتا ہوں

وبناء هذا الامر وملاكه على حفظ آداب الشريعة وصون اليد عن مد اليد الى الحرام والشبهة وحفظ الحواس عن المحظورات و عد الانفاس مع الله سبحانه عن الغفلات	اس امر یعنی تصوف کی اساس اور دار ومدار حسب ذیل چیزوں پر ہے آداب شریعت کی محافظت، حرام اور مشتبہ چیزوں سے پرہیز ممنوعات سے اپنے حواس کی حفاظت غفلتوں سے بچنے کے لئے ہر سانس میں خدا کی یاد۔

نذر الحفیظ ندوی ازہری

اسلام کے نام پر

کمال اتاترک سے صدام حسین تک عالم اسلام کے مسلمانوں کو عجیب وغریب آزمائش سے گذرنا پڑا ہے، بڑے بڑے ثقہ اور متدین حضرات علماء اور عوام کمال اتاترک سے جذباتی حدتک متاثر تھے اور اس کے خلاف ایک حرف سننے کے لئے تیار نہیں تھے، آخر عرصہ کے بعد اس کی شخصیت اور کارناموں کا طلسم ٹوٹا، پھر جمال عبدالناصر جیسے سامری کے سحر نے عالم عربی میں نیز اسلامی دنیا کے بڑے رقبہ کو غیر معمولی طور سے متاثر کیا بڑی طاقتوں کو للکارنے، برطانیہ، فرانس اور اسرائیل کی ناکام جارحیت پر قابو پانے اور عرب قوم پرستی کے صدر ہونے کی وجہ سے ہندوستانی مسلمانوں اور ان کے علماء کا ایک طبقہ جذباتی طور پر اس سے وابستگی رکھتا تھا۔ جون ۱۹۶۷ء میں شرمناک شکست کھانے کے بعد بھی اس کی شخصیت کے سحر سے آزاد نہیں ہوئے اس معاملہ میں استثنا صرف ندوۃ العلماء کے ترجمان البعث الاسلامی اور میر کارواں سید ابوالحسن علی ندوی اور ان کے رفقاء وتلامذہ کا کیا جاسکتا ہے جنھوں نے ناصر کے عین عروج و ترقی کے زمانہ میں عرب قوم پرستی اور اس کے داعیوں پر تنقید کھل کر کی بالآخر GAMES OF NATOINS نے جمال کے دوہرے کردار کو بے نقاب کردیا، پھر جمال کے تلمیذ رشید معمر القذافی کے سبز انقلاب سے لوگ سرسبز وشاداب ہونے لگے۔ سبز انقلاب کی ترجمانی بالفاظ دیگر

اشتراکیت کے مقاصد کی تبلیغ واشاعت اور ترجمانی کے لئے کچھ لوگ برصغیر میں وقف ہو کر رہ گئے اب بھی بڑے منظم اور منصوبہ بند طریقہ سے دینی روح اور اسلامی تاریخ کی تحریف کا کام ہندوستان میں ایک صاحب بڑے بلند و بانگ دعوی کے ساتھ کر رہے ہیں "پھر خمینی صاحب نے عالم اسلام کے وسیع حلقوں خصوصاً جدید تعلیم یافتہ مسلمان نوجوانوں کو (جو اسلام سے سطحی اور جذباتی لگاؤ اور استعماری طاقتوں سے ظاہری نفرت، لیکن اس کی تہذیب وثقافت سے شعوری ولاشعوری طور پر متاثر بلکہ اس میں سرتاپا غرق ہے) اپنے شاندار اور پُرکشش نعروں سے متاثر و مسحور کیا۔ اس بار آزمائش زیادہ سخت تھی اور متاثر ہونے والوں کی تعداد اور رقبہ کی وسعت اور نتائج بھی غیر معمولی تھے خمینی صاحب کے انتقال اور سیاسی و فوجی میدان میں شکست کھانے کے بعد یہ فتنہ دب گیا ہے لیکن ایران کی جدید نسل کو جن دعوتی مقاصد کے پیش نظر تیار کیا جارہا ہے اس کے سنگین نتائج ربع صدی بعد سامنے آئیں گے خمینی صاحب کے متعلق بھی گہری چھان بین کے بعد لوگوں نے GAMES OF NATIONS جیسی تحقیقات اور دستاویز کو ان پر منطبق کیا ہے اور جمالی کردار کے مشابہ قرار دیا ہے۔

اب تازہ آزمائش (عالم عربی میں کم ہندوستان میں زیادہ) صدام کی صورت میں سامنے آئی ہے ایک تعداد ہے جو جذباتی طور پر صدام کے شاندار نعروں سے متاثر ہو کر ان کو وقت کے صلاح الدین ایوبی سے تعبیر کرنے لگی ہے چہ نسبت خاک را بعالم پاک یہی حضرات صدام کو مجاہد اعظم کا خطاب دیتے رہے ہیں کہ اس نے ایران جیسی طاقت کو شکست دی ہے اور اب وہ اسرائیل و امریکہ کو للکار رہا ہے [illegible] چند ماہ پہلے صدام نے علماء کے سامنے اپنی جذباتی تقریر میں کہا تھا کہ علماء جو چاہیں گے وہی ہوگا [illegible] عراق میں باقی نہیں رہنے دوں گا۔

[illegible] میں اسلامی نصاب نافذ کیا جائے گا۔ اسلامی شرائط کے مطابق جہاد کی روح [illegible] کی جائے گی۔ ہم عیش وعشرت میں ڈوبے ہوئے عرب حکام کا احتساب کریں گے پیٹرول کی [illegible] کو بنیادی طور پر تقسیم کر کے اسلامی معاشرہ کی تشکیل کریں گے۔ اسرائیل کو نیست و نابود

کہہ دیا جائے گا۔ پھر جب صدام نے اچانک بغیر کسی سبب کے راتوں رات کویت پر قبضہ کر لیا؟ یہی حمایتی دلائل فراہم کرنے میں لگ گئے کہ اچھا ہوا۔ کویت برائیوں کا اڈہ بنا ہوا تھا۔ عیش پرست حکام و امراء پر یہ خدا کا عذاب تھا جو نازل ہوا ہے۔ یہی حال ان حکام کا بھی ہونا چاہیئے جو پیٹرول دولت پر قابض ہیں حرمین شریفین کی حفاظت بھی ان سے نہیں ہو سکتی۔ یہ فریضہ صدام جیسے مجاہدین انجام دے سکتے ہیں اور وہی حجاز مقدس کی سرزمین کو عیسائیوں کے ناپاک وجود سے پاک کر سکتے ہیں۔

ہم مسلمانوں کے نزدیک کسی کی تائید و حمایت اور مخالفت کی بنیاد ایمان و عقیدہ اور اسلام سے وابستگی و ناوابستگی ہے، اسی میزان پر مصطفی کمال اتاترک کو مسلمانوں نے تولا تھا اور اسی معیار کسوٹی پہ جمال عبدالناصر، معمر القذافی اور خمینی صاحب کو پرکھا گیا تھا جو لوگ سطحی وجذباتی اور پرکشش نعروں سے متاثر ہوئے انھیں حقائق کے انکشاف پر اپنی تائید و حمایت واپس لینی پڑی۔

اس لیئے ؎ چرا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی

دینی اور دعوتی نقطہ نظر سے صدام کی شخصیت اس کے عقیدے اور عمل کا جائزہ لینے سے حسب ذیل حقائق ہمارے سامنے آتے ہیں۔

شام و عراق میں قومی انقلاب کے بعد البعث العربی الاشتراکی (عرب سوشلسٹ جماعت) عملاً پر قابض اور متصرف ہے اس جماعت کی داغ بیل مشہور عیسائی کمیونسٹ میشیل عفلق کے ہاتھوں شام میں ڈالی گئی تھی، اس جماعت کے منشور کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

عرب قوم ایک ثقافتی وحدت ہے اور اس کے فرزندوں کے درمیان تمام اختلافات و امتیازات عارضی اور بے اصل ہیں۔ حزب البعث ایک قوم پرست جماعت ہے جو اس بات پر [illegible] کہ قومیت ایک ازلی اور زندہ حقیقت ہے، حزب البعث ایک اشتراکی جماعت ہے [illegible] ہے کہ اشتراکیت ایسی ضرورت ہے جو عرب قومیت کے باطن سے پیدا ہوتی [illegible] یہی وہ بہترین نظام ہے جس میں عرب قوم کی صلاحیتوں اور عبقریت کی تکمیل کا امکان [illegible]

ساتھ عرب حکومت کے لئے ایک واحد قانون بنایا جائے گا جو عصر حاضر کی روح کے مطابق ہو اور عرب قوم کی ماضی کے تجربات کی روشنی میں وضع کیا گیا ہو۔　　(الاحزاب السیاسیۃ فی سوریا)

میشیل عفلق اور صدام حسین: صدام حسین کی پیدائش ۲۸ اپریل ۱۹۳۷ء کو ایک معمولی گھرانے میں ہوئی۔ باپ کا انتقال پہلے ہی ہو چکا تھا۔ ماں نے صدام حسین کے چچا سے نکاح کر لیا۔ صدام دس سال ماموں اور چچا کے درمیان ان کے جانور چراتے، کھیتوں کی سینچائی، پھلوں اور غلوں کی تیاری میں گذار سکے پھر پڑھنے کا خیال آیا تو ۱۹۵۶ء تک سکنڈری کا مرحلہ بھی مکمل نہ کر سکے۔ اسی سال حزب البعث کی تشکیل ہوئی تھی صدام نے جماعت کی رکنیت قبول کر لی، ان کا کام یہ تھا کہ دیواروں پر اپنی پارٹی کے نعرے لکھیں۔ اور نوجوانوں میں حکومت کے خلاف تقریریں کریں جو لوگ پارٹی کے مقاصد سے منحرف ہوں ان کی رپورٹ ہائی کمان کو پہونچائیں۔ ۱۹۵۹ء میں عبدالکریم قاسم نے خونی انقلاب کے ذریعہ شاہی حکومت کو ختم کر دیا۔ یہ خون ان کے منہ ایسا لگا کر کرکوک، موصل اور بصرہ کے ہزاروں لوگ پھانسی پر چڑھا دیئے گئے۔ صدام کی اپنی روایت یہ ہے کہ انھوں نے پارٹی کے ہائی کمان کے فرمان کے بموجب عبدالکریم قاسم کو ختم کرنے کا منصوبہ تیار کر لیا۔ ان کے سپرد یہ کام کیا گیا کہ جو لوگ رشید اسٹریٹ پر عبدالکریم قاسم پر گولی چلائیں ان کو صدام بھاگنے میں مدد دیں گے لیکن جب عبدالکریم قاسم کی کار گذری تو صدام نے بے قابو ہو کر گولی چلائی قاسم کے محافظ دستے نے جواب میں گولی چلائی جو صدام کو لگی اور روپوش ہو گئے، خفیہ پولیس برابر ان کی تلاش میں رہی۔ اس سے سکنڈری اسکول کی تعلیم بھی مکمل نہ کر سکے، پارٹی کے مشورہ کے مطابق صدام بھیس بدل کر شام چلے گئے جہاں حزب البعث کے فکری رہنما اور بانی عفلق سے ان کی طویل ملاقاتیں ہوئیں، عراق کے لئے یہیں منصوبہ بنایا گیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر صدام قاہرہ چلے گئے، وہاں بھی ان کی دوستی کمیونسٹوں اور عرب قوم پرستوں سے رہی۔ دو سال بعد عراق واپس آئے تو عبدالرحمٰن عارف عبدالکریم قاسم کا تختہ الٹ چکے تھے اگرچہ عارف کا دور مختصر رہا لیکن ظلم و ستم اور غارت گری سے ان کا عہد خالی رہا، اسلام پسندوں کو آزادی دے دی گئی نشر و اشاعت کے وسائل اور نصاب تعلیم و تربیت کو اسلامی اصولوں کی روشنی میں ڈھالنے کا کام شروع ہوا ہی

عفلق کا احمد حسن البکر اور صدام نے مل کر عارف کا تختہ اُلٹ دیا۔ یہ ۱۹۶۸ء کی بات ہے اب میشیل عفلق مستقل طور پر بغداد آ گئے صدام نے حکومت کے تمام وسائل کو ان کے لئے مسخر کر دیا اور یہ خود سمجھ کر ان کے احکام کی تنفید کرنے لگے۔

پہلے مرحلے میں ذرائع نشر و اشاعت سے دیندار عناصر کو نکال باہر کیا گیا پھر تعلیمی اداروں کے لئے رکا کی مفکیر ولد سے نیا نصاب اور نظام تعلیم و تربیت بنا کر اس کو نافذ کیا گیا اگر دیندار حلقوں نے مخالفت کی تو سختی سے اس مخالفت کو کچل دیا گیا۔ اعلیٰ تعلیم و تربیت کے لئے عراقی طلباء اور فوجی روس و فرانس بھیجے گئے ۱۹۶۰ء سے آج تک کے طویل عرصہ میں رکا کی نظریات کے زیر سایہ پروان چڑھنے والی نسل عراق کے دروبست پر حاوی ہو چکی ہے عجیب بات یہ ہے کہ عراق میں موجود دس فیصدی عیسائی اور دو فیصدی یہودی تمام کلیدی عہدوں پر قابض و متصرف ہیں یہ بات ڈھکی چھپی نہیں رہی کہ عراق ایٹمی ری ایکٹر پلانٹ کے متعلق تمام معلومات ایک عراقی یہودی نے اسرائیل کو فراہم کئے تھے، وزارت خارجہ جیسے اہم منصب پر عیسائی طارق عزیز قابض ہیں، محکمہ دفاع، جاسوسی، وزارت ثقافت و سائنسی امور، محکمہ داخلہ، کسٹم، انا ٹوویژن جیسے حساس اداروں میں ان غیر مسلموں کو سارے اختیارات دیدیئے گئے ہیں، اس وقت ایک محتاط اندازے کے مطابق خود گرباچوف کے کہنے کے مطابق آٹھ ہزار روسی مشیر عراق میں موجود سرگرم عمل ہیں۔

صدام حسین کے کارنامے: اشتراکیت اور قوم پرستی کے جو پودے ۱۹۴۰ء میں شاہی حکومت کے خاتمے پر لگائے گئے تھے اور جن کی آبیاری میں میشیل عفلق اور صدام نے بنیادی کردار ادا کیا ہے وہ اب تناور درخت بن گئے ہیں [illegible] دشمنوں نے عراق کو ملک ہسان کیا اب [illegible] عرب دنیا کے قلب و نظر میں خار مغیلاں بن کر چبھ رہے ہیں۔

آپ جس شخصیت کو سلطان صلاح الدین ایوبی کا خطاب دے رہے ہیں اس کو تو صلاح الدین ایوبی کی قوم کردوں سے محبت اور گہرا تعلق ہونا چاہیئے تھا اور بیت المقدس کی بازیابی کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دینی چاہیے تھی، لیکن کیا آپ یقین کریں گے کہ صرف ایک دن میں صدام کے حکم سے کیمیائی گیس اور بمباری کے ذریعے گیارہ ہزار پانچ سو چالیس کردوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ پچیس ہزار ہمیشہ کے لئے معذور

اپاہج ہو گئے بارہ ہزار معصوم بچے بینائی اور سماعت سے محروم ہو گئے۔

حقوق انسانی کی بین الاقوامی تنظیم ایمنسٹی انٹرنیشنل، ترکی، فرانس اور خود کردوں کی سماجی انجمنوں نے اس سلسلہ میں جو رپورٹ شائع کی ہے وہ آپ بھی دل پر جبر کر کے پڑھ لیجئے۔

حلبچہ نامی مرکزی شہر عراق سے شمال مشرق میں دو سو ساٹھ کیلو میٹر دور ایک شہر ہے جو شامی شہر حلب کے نام سے مناسبت اور محبت میں بسایا گیا تھا اس مرکزی شہر کے آس پاس چھوٹی چھوٹی آبادیاں اور قصبات ہیں مجموعی آبادی ستر ہزار ہے یہ پورا علاقہ اپنی دینداری، دینی مدارس، مساجد کی کثرت اور علماء و فقہاء و داعی کی بناء پر پورے عراق میں مشہور ہے فوجی انقلاب کے بعد اس علاقہ میں بھی حکومت نے اپنا نظام تعلیم و تربیت اور اشتراکی قانون نافذ کرنے کی کوشش کی لیکن چونکہ یہاں کی پوری آبادی کردوں پر مشتمل ہے جو انتہائی دیندار ہے اس لئے انھوں نے حکومت کے ان قوانین اور نظام کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے سنہ ۱۹۷۱ء میں عوام اور علماء نے مطالبہ کیا کہ اسلامی اصولوں کے مطابق یہاں شرعی عدالتیں قائم کی جائیں لیکن حکومت نے نہ صرف اس مطالبہ کو مسترد کر دیا بلکہ چالیس قصبات اور شہروں میں پھیلے ہوئے کردوں کو ملک کے مختلف حصوں میں منتشر ہونے کا حکم دیا۔ علماء کی قیادت میں عوام نے ۱۲ رمضان المبارک ۱۴۰۸ھ کو اس حکم کے خلاف مظاہرہ کیا تو حکومت نے ٹینک اور بمبار طیاروں سے چار گھنٹے تک زبردست بمباری کی۔

اس بمباری سے پہلے ایک دن میں آٹھ سو طلباء اور طلبات، علماء کو گرفتار کر کے پھانسی دے دی گئی، بمباری کے بعد آٹھ طیاروں سے کیمیائی گیس کی بارش کی گئی جو لوگ تہ خانوں میں بمباری سے بچنے کے لئے چھپے تھے ان کا دم گھٹنے لگا پہلے آنکھیں سرخ ہوئیں پھر ان کی بینائی زائل ہو گئی۔ زبردست پیاس بھی لگی، پھر تو ہزاروں افراد بے تحاشا کھلے میدانوں اور پہاڑوں کی طرف بھاگنے لگے جہازوں نے ان بھاگتے ہوئے لوگوں کا پیچھا کیا اور پھر زبردست بمباری کی، تالابوں اور چشموں میں بھی خاص قسم کی زہریلی گیس اوپر سے ڈال دی گئی۔ اس کو پیتے ہی کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ اس پورے علاقہ کے تمام جانور سرسبز و شاداب کھیتی اور درخت جل کر سیاہ ہو گئے اس پر بھی بس نہیں کی تورات کو آٹھ ہوائی جہاز پھر اڑے، پہلے انھوں نے روشنی کے گولے پھینکے اس کے بعد زبردست زہریلی گیس برسائے دوسرے روز صدام نے اس فوجی آپریشن میں حصہ لینے والوں کو اعلیٰ

درجہ کے تمغوں سے نوازا۔

قیامت خیز تباہی کی دوسری صبح شیخ عبداللطیف بدری، شیخ محمود آزادی، شیخ ابوبکر صدیق، شیخ عبدالرحمٰن عبدالعزیز کچھ نوجوانوں کو لے کر اس تباہ شدہ علاقے میں گئے تو انھیں ہر طرف لاشیں ہی لاشیں نظر آئیں، شیر خوار بچے ماؤں کی گودوں میں مرے ہوئے ملے، شوہر بیویوں کو بانہوں میں لئے ہوئے مردہ حالت میں ملے نوجوانوں نے پانچ ہزار چالیس لاشیں تک شمار کیا۔ ایک سو بیس فٹ کے اندر ایک ہزار تیرہ لاشیں ملیں۔ صرف ایک عمارت کے ملبے سے ایک سو اکیاون لاشیں دستیاب ہوئیں، جن مقامات پر میزائل اور بم کے گولوں سے گڑھے بن گئے تھے۔ ان کو اجتماعی قبر بنا دیا گیا۔

اس حادثے کی پوری تصویر امریکی ٹیم نے تیار کی تھی۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل کے نمائندوں کو وہاں جانے کی اجازت نہیں ملی۔ اس علاقہ کی پوری آبادی ترکی کی طرف ہجرت کر گئی۔ ترک حکومت نے اعلان کیا کہ انسانی بنیادوں پر عارضی طور سے ان مصیبت زدہ کردوں کو پناہ دی جا رہی ہے جو لوگ اپاہج ہو گئے تھے ان کی تعداد کو علاج کے لئے مغربی جرمنی، جاپان، سویڈن، سوئٹزرلینڈ اور فرانس نے اپنے ہسپتالوں میں لیا۔ یہ لوگ اب بھی فرانس میں زیر علاج ہیں۔ یہ امریکی پروپیگنڈہ نہیں بلکہ انسانی حقوق کی بین الاقوامی تنظیم کی مستند رپورٹ ہے جو بہت چھان بین اور شہادتیں لینے کے بعد رپورٹ تیار کرتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ سلطان صلاح الدین ایوبی کی قوم پر مصیبت کے پہاڑ کس نے توڑے۔ اس سلوک کی توقع اسرائیل اور امریکہ سے کر سکتے ہیں تو یہی کہیں گے کہ عراق پر اسرائیل سے زیادہ بدتر دشمن حکمران ہے۔

سربراہِ حکومت عام طور سے کسی کے قتل یا جسمانی تصفیہ کی طرف اشارہ ہی کرتے ہیں۔ لیکن صدام کے متعلق یہ بات ہر عراقی کی زبان پر ہے کہ انھوں نے دو ہزار آدمیوں کو اپنی ریوالور سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اپنے عزیز رشتہ داروں میں سے عدنان خیر اللہ (وزیر دفاع) وزیر صحت ڈاکٹر نجیب کو خود اپنے ہاتھ سے موت کے آغوش میں پہنچایا۔

یہ بھی تاریخ اسلام کا نادر واقعہ ہے کہ صدام نے ایک مسجد کے امام و خطیب کو جبکہ وہ جمعہ کے دن منبر پر تقریر کر رہے تھے۔ تمام نمازیوں کے سامنے گولی مار دی۔ یہ شیخ عبدالعزیز بدری تھے۔

۱۹۸۶ء کا سال اس اعتبار سے قتل عام کا سال کہلاتا ہے کہ اس سال جب ایران سے جنگ ختم ہوئی تو صدام حسین داخلی محاذ کی طرف جاہلانہ شان و شوکت سے متوجہ ہوئے۔

۱۹۸۹ء میں پورے سال کرکوک، موصل، السلیمانیہ اور اربیل میں پلاننگ کے مطابق مخالفین کو قتل کر کے ان کی لاشیں شاہراہوں پر ڈالی جاتی رہیں۔

جنوری ۱۹۸۹ء میں صدام کے مخالف مہدی حکیم کو جب وہ خرطوم کے ہوٹل ہلٹن میں مقیم تھے ایک عراقی سفارت کار نے گولی مار دی۔

مرزا اور مروان داشتو کی بالترتیب عمریں ۹ اور تیرہ ۱۳ سال کی تھیں۔ ان دونوں بچوں کو ۱۹۸۵ء میں گرفتار کیا گیا تھا اس لئے کہ ان کے والدین پولیس کے ہتھے نہیں چڑھے تھے ابھی تک یہ بچے سزا بھگت رہے ہیں۔

ایک شخص نے بتایا کہ چودہ ۱۴ مہینے تک وہ سنگین ترین عذاب سے دوچار رہا حالانکہ پولیس نے اسے صرف شبہ میں گرفتار کیا تھا۔

اسی سال السلیمانیہ سے آٹھ سو کردوں کو گرفتار کیا گیا۔ ان میں تین سو ساٹھ بچے تھے ان بچوں کا سراغ آج تک نہیں مل سکا۔

ایران کی جنگ کے خاتمے پر صدام نے اعلان کیا کہ کردوں کو عام معافی دیدی گئی ہے جو لوگ ۱۰ ستمبر تک عراق واپس آجائیں گے ان کو کچھ نہ کہا جائے گا۔ لیکن جب یہ کرد ایرپورٹ پہنچے تو انھیں وہیں سے گرفتار کر کے جیل لاکر پھانسی دے دی گئی۔ اسی طرح ۱۹۸۹ء میں بغیر مقدمہ چلائے سینکڑوں خاندانوں کو تہ تیغ کر دیا گیا ایسا بھی ہوا کہ پورے پورے خاندان کو پھانسی دیدی گئی۔ معصوم بچوں تک کو نہیں چھوڑا گیا۔ مارچ ۸۹ء ں کردا غ کے علاقہ پر زہریلی گیس برسائی گئی اور سینکڑوں لوگوں کو جو علاج کے سلسلہ میں سلیمانیہ گئے تھے گولی اڑا دی گئی تاکہ جرم کا نشان تک باقی نہ رہے اس طرح شیخ وسان نامی بستی کے لوگ جب زہریلی گیس کے لاج کے لئے اربیل کے اسپتال میں داخل ہوئے تو ایک دن میں ۳۰۰ افراد کو گولی سے بھون دیا گیا ا۔ ۱۷ مارچ کو سلیمانیہ کے پانچ سو عورتوں، بچوں کو کیمیائی اسلحہ سے ہلاک کر دیا گیا۔

اگست ۱۹۸۹ء میں اربیل، کرکوک اور موصل کے باشندوں پر زبردست بمباری کی گئی ۲۸ اگست کو

کرکوک میں فوج داخل ہو گئی اس نے ان ایک ہزار لوگوں کو گرفتار کر لیا جو گیس کے شکار ہو گئے تھے۔ خود فوجی حکام کے اعتراف کے مطابق ان ایک ہزار معذوروں کو گولی مار دی گئی تاکہ زندگی کی تکلیف سے نجات پا جائیں مغربی جرمنی اور روس سے ایسی مشینیں درآمد کی گئی ہیں جو چند لمحے میں انسانوں کو ریزہ ریزہ کر دیتی ہیں۔

عراقی جیلوں سے جو لوگ رہا ہوئے انھوں نے بیان دیا کہ تیس طریقے ایذا کے عراقی جیلوں میں استعمال کئے جاتے ہیں۔ زنجیروں سے مدنا، انسانی اعضا کے قتلہ کرنا۔ آری کے ذریعہ چیرنا، عضو تناسل، ناک کان اور مقعد کے ذریعہ گرم سلاخ باہر نکالنا، ہتھوڑوں اور کلہاڑی کے ذریعہ انسانی جسم کو کاٹنا، زخموں پر نمک چھڑکنا، عورتوں کے سینے کاٹنا۔ ان کی ذلت وخواری میں درندوں کو بھی شرما دینا۔ ایک سروے کے مطابق اس وقت ایک لاکھ بچے یتیمی کی زندگی گذار رہے ہیں، صدامی مشنری انھیں اپنے مقاصد کے لئے استعمال کر رہی ہیں دس ہزار بچے جیلوں میں بند ہیں۔ ان کی عمریں ۶ سے ۱۰ سال تک ہیں۔

افغان مجاہدین کے لئے دنیا کے چند ملکوں کے سوا ہر جگہ سے چندہ آیا۔ لیکن عراق کے اس مرد مجاہد نے موصل سکنڈری اسکول کے چار سو طلباء کو افغان مجاہدین کے لئے چندہ وصول کرنے اور دینے کے جرم میں گولی سے اڑا دیا۔

صرف ایک مسئلہ پر اختلاف کی بنا پر مستنصریہ یونیورسٹی کے پانچ سو طالب علموں کو صدام نے خود گولی ماری۔ یہ میشیل عفلق کا لگایا ہوا پودا ہے جو برگ وبار لا رہا ہے کیا آپ ایسے ہی مرد مجاہد کے حوالے حرمین شریفین کرنے والے ہیں۔

اب آئیے کویت پر ناگہانی حملہ اور غاصبانہ قبضہ کی طرف لیکن اس سے پہلے تھوڑا سا ذکر ایران عراق جنگ کا ہو جائے۔

صدام کو مغربی ذرائع نے یہ مشورہ دیا کہ ایران پر اس سے بہتر حملہ کا کوئی موقع نہیں مل سکتا جبکہ ایران خانہ جنگی سے چور چور ہو چکا ہے، اس کے جنگی جہاز کھلے میدان میں موجود ہیں۔ اس لئے اچانک ہوائی حملہ کر دیا جائے گا تو ایران پکے ہوئے پھل کی طرح صدام کی جھولی میں گر جائے گا۔ ادھر اللہ بھی ذرائع نے ایران کو متوقع عراقی حملے کی تمام تفصیلات سے باخبر کر دیا۔ چنانچہ ایران نے اپنے بیشتر جنگی جہاز ہٹا لیئے، عراق کا

یوں ناکام ہو گیا لیکن دونوں ملک ہیڈ ضدوں کی طرح آٹھ سال تک لڑتے رہے۔ عربوں کو عراق نے یہ باور کرا دیا کہ یہ عرب قوم پرستی کی جنگ ہے مجوسیوں کو شکست دینا ضروری ہے، کویت اور سعودیہ سے اربوں ڈالر وصول کئے، امارات نے بھی حصہ لیا۔ مصر نے اپنی فوج اور اسلحہ سے بہت نازک وقت میں مدد کی اس کی وجہ سے جنگ کا پلڑا عراق کے حق میں ہو گیا۔ جنگ کے خاتمے تک کویت پر عراق کا کوئی دعویٰ نہیں تھا لیکن جب مطلب نکل گیا تو عراق نے بین الاقوامی قرضوں کے مطالبات سے پریشان ہو کر کویت پر الزام لگایا کہ تیل کے دو بڑے جزیروں پر اس نے ناجائز قبضہ کر رکھا ہے۔ تیل کے دو بڑے ذخائر سے کویت نے تیل چرا لیا ہے اس لئے ۱۵ ارب ڈالر کا قرضہ کویت معاف کرے دونوں جزیرے حوالے کرے اور دس ارب ڈالر تیل کی قیمت ادا کرے۔

سعودی عرب اور مصر نے درمیان میں پڑ کر مذاکرہ گفتگو کا انتظام کیا۔ لیکن عراقی وفد نے صرف ایک نشست میں شرکت کی دوسری نشستوں میں سربراہ وفد نے یہ کہہ کر شرکت سے معذرت کی کہ میرے سر میں درد ہے اور گفتگو کی تکمیل کے بغیر رات کو بارہ بجے بغداد آ گیا۔ صدام نے رپورٹ سن کر کہا کہ کل ہم کویت میں ناشتہ کریں گے۔ پھر ایک لاکھ بیس ہزار فوجوں نے کویت پر قبضہ کر لیا۔ یہ کہہ کر کہ وہاں کے عوام نے ہمیں دعوت دی تھی۔ اس کے بعد بھی ایک عارضی حکومت کی تشکیل کی گئی پھر اس کو بھی ختم کر کے کویت کو انیسواں صوبہ بنا کر عراق میں ضم کرنے کا اعلان کر دیا گیا۔

کویت پر عراق کا دعویٰ اس لئے باطل ہے کہ دونوں ملک میں سفارت خانے اور سفیر ہیں۔ عبدالکریم قاسم نے سب سے پہلے یہ دعویٰ کیا تھا کہ لیکن ۱۹۶۳ء میں عراق و کویت میں باقاعدہ معاہدہ ہو گیا کہ حکومت عراق (۲۱، ۷، ۱۹۳۲ء) میں عراقی وزیر اعظم کے خط کے بموجب کویت کے جو حدود متعین کئے گئے تھے اور جن کو کویتی حاکم نے بھی ۱۰، ۸، ۱۹۳۲ء کے خط کے بموجب تسلیم کر لیا تھا) ان حدود کو تسلیم کرتی ہے آل صباح کا اس پر قانونی حق ہے، دونوں ملک اپنے حدود میں رہتے ہوئے ایک دوسرے کے ساتھ مشترک مفاد کے لئے تعاون کرتے رہیں گے۔ ثقافتی، سائنسی، تجارتی اور اقتصادی وفنی میدانوں میں تبادلہ کریں گے۔ اس معاہدہ کے بعد پھر عراق نے کیوں حملہ کیا۔ اگر عراق کا یہ کہنا ہے کہ عثمانی حکومت کے زمانہ میں کویت عراق کا جز تھا۔ پھر کیا ترک حکومت کے مطالبہ پر عراق اپنا پورا علاقہ ترکی کو چھوڑ دے گا۔ تب تو حجاز، اردن، شام، لبنان ا

ہمسر بلکہ پورا عالم عربی ترکی کو دینا پڑے گا۔

ہم صدام حسین کو اگرچہ تمام واقعات کے باوجود سلطان صلاح الدین ایوبی کا جانشین کہنے پر مصر ہیں تو ہم صلاح الدین ایوبی کے فتح بیت المقدس اور عراقی صدام کے فتح کویت کا موازنہ کم از کم مزید کیجئے۔ بھاگنے والوں کا قتل، قیدیوں کے واقعات کو آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ سب استعماری پروپیگنڈہ ہے۔ لیکن کویت کی لوٹ کھسوٹ کو آپ کیا کہیں گے۔ کویتی سفیر نے لاہائی (ہالینڈ) کی بین الاقوامی عدالت کے سامنے جو اجمالی فہرست پیش کی ہے اس میں انہوں نے انتیس مقامات کا ذکر کیا ہے، جہاں سے عراقی فوجیوں نے تمام اشیاء چرالیں اور ان کو آگ لگا دی۔ کویتی فوج کے اسلحے کا پورا ذخیرہ، جنگی جہاز، فوجی لباس، غذائی اشیاء، کویت ایئر لائنز کے دو درجن جہاز، اس کے پرزے، ہلال احمر کا طبی ساز و سامان حکومت اور عوام کی ملکیت کے تمام غذائی ذخائر، دس لاکھ سے زائد نئی موٹر گاڑیاں، شوروم اور اسٹورس سے، اس طرح پرائیوٹ اور سرکاری گاڑیاں، سونے چاندی اور ہیرے جواہرات اور بینکوں کے لاکر سے زیورات، ہر طرح کی دوکانوں اور ڈپارٹمنٹل اسٹورس، سرکاری و پرائیوٹ پریس، اخبارات کے کاغذات کے گودام، تیل نکالنے کا تمام ساز و سامان، بندرگاہ پر موجود تمام جہاز اور گوداموں میں موجود تمام ساز و سامان، تمام وزارتوں، تعلیمی اداروں سے فرنیچر، طبی ساز و سامان، سائنسی تجربہ گاہ سے مشین ہسپتال سے سارا ساز و سامان۔ بندرگاہ پر موجود تمام ساز و سامان، ٹیلیفون اور بجلی کے ٹرانسفارمر، فون کے سوئچ۔ تمام ہسپتالوں سے مریضوں کو باہر کر دیا گیا، سینکڑوں مریض حرکت قلب بند ہو جانے سے مر گئے۔ وزارت اطلاعات و نشریات اور فلم ڈویژن میں موجود کمپیوٹر اور تصویر کی مشینیں۔ تمام جا نماز اور فوم سے چھپا لیے گئے۔ حکومت کے ذخیرے اداروں اور عوام کے گھروں کو کلی طور سے لوٹ لیا گیا۔ مدارس اور مساجد کا سارا ساز و سامان لوٹ لیا گیا۔ بیکری کا سارا سامان لوٹ لیا گیا۔ ہزاروں عراقی خاندانوں کو کویت میں بسایا جا رہا ہے (روزنامہ "البیان" ابوظہبی ۸ ستمبر ۹۰ء)

سلطان صلاح الدین نے بیت المقدس کو جس طرح بازیاب کیا تھا وہ انگریز مورخ کے نزدیک نادر تاریخی واقعہ ہے، پھر جس طرح سلطان نے بیمار دشمن کے لئے طبیب اور پھل بھیجے وہ بھلائے نہیں جا سکتے۔ ایسے صلاح الدین ایوبی کے فاتحانہ کے ظالم [illegible] سے نسبت دینا بھی بدمذاقی ہوگی۔

عرب اخبارات نے صدام کے اقدام اور تمام دنیا کی مخالفت مول لینے کی طرف توجہ مبذول کراتے ہوئے لکھا ہے کہ بھڑا کسی کھونٹے کے بل پر اکڑتا ہے ممکن ہے امریکہ و روس دونوں نے صدام کے منہ سے زہریلے دانت نکالنے کے لئے یہ کارروائی خود اس سے کرائی ہو تاکہ اسرائیل کے وجود کی ضمانت فراہم کی جائے اس کی تائید اس واقعہ سے ہوتی ہے کہ عراق نے اردن کی سرحد پر نصب کیمیائی گیس لے جانے والے میزائلوں کے تنصیبات ہٹا لیئے ہیں۔

آخر میں ایک اعلان کی طرف آپ کی توجہ مبذول کراتا ہوں جو صدام کی مملکت میں اس وقت شائع ہوا تھا جب عراقی فوجیں ایران کے ساتھ جنگ میں داخل ہوئی تھی۔

عراقی شکار کلب کی طرف سے یہ خط نمبر ۶ ر ۸۲ ۱۹ء کو عراقی خواتین کی فیڈریشن کو نادی العید کی صدر نیلو تکریتی نے ارسال کیا تھا۔

۱۷ ر جولائی کو نادی العید کے زیر اہتمام ایک تفریحی پروگرام فوجی نوجوانوں کے لئے منعقد کیا گیا عراقی خواتین کی فیڈریشن اور اس کی تمام شاخوں سے درخواست ہے کہ جو خواتین ہمارے فوجی افسران کے دل بہلانے اور ان کے ساتھ شب باشی کے لئے آنا چاہتی ہوں وہ اپنے رشتہ داروں کے بغیر کلب تشریف لائیں۔ ان خواتین کو معقول معاوضہ پیش کیا جائے گا۔ وقت کی اطلاع بعد میں دی جائے گی اس خط کی کاپیاں ریڈیو، ٹی وی کے ویڈیو سکشن، عراقی خواتین کی فیڈریشن کے سکریٹری اور پروگرام منعقد کرنے والی انجمن کو بھی گئیں۔" ترا لائے کاشکے مادر نزادے۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ نے تعمیر حیات کے گزشتہ شمارے میں کویت کے عراقی حملے کے جن دینی دعوتی اور اخلاقی خسارے کی نشاندہی کی ہے ان کو ایک بار پھر ذہن میں تازہ کرلیں کہ دینی و دعوتی کام کرنے والوں کو ناقابل تلافی نقصان پہونچا ہے دعوتی نقطۂ نظر کے علاوہ حجاز مقدس میں امریکی فوجیوں کی آمد ہم مسلمانوں کے لئے بڑا خسارہ ہے ۔ اگر امریکی فوج کے بجائے خود سعودی فوج میں یہ صلاحیت ہوتی تو مسلم ملکوں خصوصاً پاکستان و مصر کی فوجوں کو ملاکر دفاع کا کام لیا جا سکتا تھا اب بھی حل یہی ہے کہ عراق سب سے پہلے کویت خالی کردے اس کے بعد مسلم ملکوں کی فوجیں حجاز مقدس میں دفاع کی پوزیشن سنبھالیں، پھر امریکی فوجیں اس مقدس خطے سے انخلا کریں۔ تمام ملکوں کی فوجیں نکل جائیں مشرق وسطیٰ میں امن و امان کو تباہ کرنے کا موقع امریکہ اور روس کو ہماری غلطیوں نے فراہم کیا ہے ھ

ڈاکٹر احسن علی (واشنگٹن)

خلیج اور امریکی عوام

امریکی افواج جدید ترین اسلحہ کے ذخائر سمیٹے سعودی عرب جانے والی فوج کو تاریخ کی سب سے بڑی فوج "لفٹ" قرار دیا جا رہا ہے گو ویت نام کی تلخ یادیں لوگوں کے ذہنوں میں تازہ ہیں اور محاذ جنگ سے لاشوں کی واپسی کا منظر بھی لوگوں کے ذہن میں ہے جس نے امریکی سوسائٹی میں ایک کہرام مچا دیا تھا اور جس جنگ کے زخم آج تک گہرے ہیں واشنگٹن کے ویتنام میموریل کی سیاہ دیوار جس پر پچاس ہزار جنگ میں کام آنے والوں کے نام کندہ ہیں آج بھی میموریل ڈے وغیرہ پر رقت آمیز منظر پیش کرتی ہے جب ان جواں سال فوجیوں کے لواحقین جمع ہوتے ہیں ہر برس ویت نام کی تلخ یادوں پر مبنی فلمیں بنتی ہیں اور امریکی نفسیات کا مطالعہ کرنے والے ادارے کا یہ کہنا ہے کہ ویتنام کے واقعات نے سب سے زیادہ نفسیاتی مریض پیدا کیے۔ ان تمام تلخ یادوں کے باوجود امریکی افواج کی خلیج روانگی پر واہ واہ ہو رہی ہے اور ایک طرح سے جشن بپا ہے۔ چند الوداعی رقت آمیز مناظر کے علاوہ ہر طرف یوں محسوس ہوتا ہے جیسے محاذ جنگ پر نہیں پکنک پر جا رہے ہیں۔

اصل امیر جنسی یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر عائد ہے جو چوبیس گھنٹے لمحے لمحے کی خبر دینے میں ایک دوسرے کو مات دینے کی فکر میں رہتے ہیں کروڑوں ڈالر محض صحافیوں کو مشن پر بھیجنے پر خرچ ہو گئے ہیں تینوں بڑے قومی ٹیلی ویژن نٹ ورکس نے اپنے سب سے بڑے نام خلیج بھجوائے ہیں دو نٹ ورکس تو اپنی قومی خبریں ہی خلیج سے براہ راست نشر کرتے ہیں آج عمان سے تو

کل دمشق سے تو پرسوں قاہرہ سے۔ ان کی اس اعلیٰ رپورٹنگ کا پھل بھی ملا ہے بلکہ مجموعی طور پر ۶۰ لاکھ نئے ناظرین کا اضافہ ہوا ہے محاذ جنگ سے ٹیلی ویژن وغیرہ کے نمائندے صرف جنگی خبریں نہیں دیتے بلکہ ایسی ایسی کہانیاں لاتے ہیں کہ ہنسی آتی ہے۔ مثلاً ایک بہت بڑے ٹی وی نیوز اسٹار نے دس منٹ محض یہ بتانے میں صرف کیئے فوجیوں کے لیے منرل واٹر کی سپلائی کیسے ہوتی ہے ایک پروگرام میں یہ بتایا گیا کہ آئس پیکٹوں کی قلت ہو گئی ہے۔ ایک تو آدھے گھنٹہ کا پروگرام اس بات پر تھا کہ سعودی عرب میں شراب اور شباب کی پابندی کی صورت میں فوجی کتنے عرصے تک "نارمل" رہ سکتے ہیں۔

فوجیوں سے انٹرویو لیئے گئے جو اور بھی قابل دید تھے سب بے قرار تھے کہ جنگ چھڑے کیونکہ انھیں اپنے ہتھیاروں کا امتحان لینا ہے۔ ایک فوجی "اپاچی" ہیلی کاپٹر کے برابر میں کھڑا ٹیلی ویژن کیمرے کو یہ بتاتا ہے کہ میں بے قرار ہوں کہ اپنے اس "بے بی" کو ٹیسٹ کروں یہ ٹینکوں کا قاتل ہے اور ریگستان میں اس کی کارکردگی لاجواب ہوتی ہے۔ اسی طرح A-10 قسم کے جہازوں کے کمانڈر کا کہنا تھا کہ جلدی سے جنگ شروع ہو تاکہ ہم اپنے اسکواڈرن سے الوداعی خدمت لیں۔ یہ ٹینک قتل جہاز ایک عرصہ سے امریکی فضائیہ میں ہیں اور امریکی فضائیہ انہیں عنقریب ریٹائر کرنے والی ہے۔

کیمیاوی جنگ سے نمٹنے کے لیئے ایک خاص قسم کے ماسک بنائے گئے ہیں فوجی اسے بھی ایک کھیل سمجھ رہے ہیں دراصل اس رویہ کی ایک بنیادی وجہ یہ ہے کہ گزشتہ چند برسوں میں امریکیوں کی خود اعتمادی آسمان پر پہنچ گئی۔ روس کو ترقی کے میدان میں شکست فاش دے کر امریکی عوام کا خیال ہے کہ اس وقت دنیا میں صرف ایک سوپر پاور ہے وہ ہے امریکہ ۔۔۔ پھر بھی روس کا خوف اپنی جگہ ہے گلف کے معرکہ میں چونکہ روس امریکہ کا حلیف ہے اس لیئے یہ خوف بھی نہیں ہے اور عراق کو وہ ایک مکھی سمجھتے ہیں جس سے نمٹنے کے لیئے ان کے ایٹم بم ہے۔

امریکہ میں ایک فوج تو ریگولر ہے جو قاعدہ پر کرتی ہے جب کہ ایک ریزرو فوج ہے جو نے فوجی ٹریننگ حاصل کی ہے مگر کام بطور سویلین کرتے ہیں البتہ سال میں مہینے کے لئے ان کی ٹریننگ ہوتی ہے۔ فوج [illegible] معاشرہ میں کوئی مقام حاصل نہیں ہے نہ ہی اس کے کوئی خاص حقوق ہیں بڑے بڑے [illegible]

اور لفٹیننٹ جنرل ریٹائر ہو کر سول ملازمت کے لئے آتے ہیں تو منیجر لیول کی نوکری کرتے ہیں۔ خود ہم نے ایک کرنل کو عام کے طور پر کام کرتے دیکھا جبکہ ایک کرنل کار سیلز میں تھا اس نے تو باقاعدہ اپنے سینے پر کرنل کا ٹیکہ لگا رکھا تھا یہاں فوج کو یا تو وہ لوگ جوائن کرتے ہیں جو کوئی دوسرا کام کرنے کے اہل نہیں ہوتے یا پھر وہ فوج کی ترقی کی دیگر اسکیموں سے فائدہ حاصل کرنا چاہتے ہیں مثلاً آرمی کالج فنڈ۔ آپ ایک بار فوج میں بھرتی ہو جائیے پھر آپ اس کالج فنڈ سے کسی بھی پیشے میں کسی بھی کالج میں داخلہ حاصل کر سکتے ہیں لہذا یہاں کے فوجی افسران محض انٹرمیڈیٹ تک محدود نہیں ہوتے بلکہ ماسٹرز اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کرتے ہیں۔ انہی ڈگریوں کی بنیاد پر وہ فوج سے ریٹائرمنٹ لے کر سول ملازمت میں جاتے ہیں جو فوجی افسران کوئی ڈگری حاصل نہیں کرتے انہیں ریٹائرمنٹ پر چوکیدار یا سیکیورٹی گارڈ وغیرہ کی نوکری ملتی ہے افسروں کے علاوہ جو عام فوجی ہیں وہ بھی کالج فنڈ سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ لہذا ایسی مثالیں بھی ملیں گی کہ سارجنٹ کے عہدے سے ریٹائر ہونے والا جب سول ملازمت میں آیا تو کسی کرنل کا افسر بن گیا

ریگولر فوج تو خیر ہر وقت ہتھیاروں سے کھیلتی ہے ریزرو فوجیوں کو جب گلف کے لئے طلب کیا گیا ان کا رویہ قابل دید تھا۔ وہ بچوں کی طرح اس بات پر خوش تھے کہ اب حقیقی جنگ میں جدید ترین ہتھیار استعمال کرنے کو ملیں گے۔ ۸۰ ہزار ریزرو فوجی طلب کئے جا چکے ہیں اور عام زندگی میں ہر قدم پر ایسے لوگ ملیں گے جو بے چینی سے طلبی کا انتظار کر رہے ہیں۔

فوجیوں کے علاوہ عوام میں بھی پکنک کا سا تاثر ہے لہذا چھوٹے چھوٹے شہروں میں جہاں سے فوجی طلب ہوئے ہیں پیلے رنگ کے ربن لٹکا کر حب الوطنی کے جذبات کا اظہار کیا جا رہا ہے پھر بزنس کمیونٹی کو چھنی ' قذافی ' کاسٹرو اور نوریگا کے بعد ایک نیا کردار صدام حسین مل گیا ہے جس کے کارٹونوں کے پوسٹر ' کافی مگ اور ٹی شرٹس بازار میں آ گئے ہیں۔ کہیں صدام حسین کے سر میں تیر چبھا ہے تو کہیں صدام حسین کی مونچھوں کو ہٹلر کی مونچھوں کی طرح بتایا گیا ہے۔ کہیں صدام حسین کے پوسٹر کے نیچے لکھا ہے کہ میں دیوانہ ہوں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ یہی صدام حسین تھے جو عراق۔ ایران جنگ میں امریکہ کے دوست تھے۔ امریکی

ان کی کیمیائی جنگ اور ان کے جہازوں کی غلطی درگذر کرنے کو تیار تھے ۔

صدام حسین کے بارے میں اتنا کچھ لکھا گیا، کہا اور سنا گیا ہے کہ صدام حسین کو خود بھی یہ معلوم نہ ہوگا کہ ان میں سب صلاحیتیں ہیں مثلاً یہاں کے ٹی وی جرنلسٹوں نے یہ بات بتائی ہے کہ صدام حسین اپنے سوٹ کہاں سلواتے ہیں۔ سب سے زیادہ یہاں ان کے سوٹوں کی تعریف ہو رہی ہے۔ اس سے قبل تو صدام حسین ہمیشہ یونیفارم میں ہوتے تھے آج کل سوٹ میں ہیں ان کی آنکھوں پر یہ دلچسپ تبصرہ ہوا کہ نہ وہ سیاہ ہیں نہ براؤن۔ پانچ منٹ یہی بحث ہوتی رہی کہ اُن کی آنکھوں کا رنگ کیسا ہے۔ ان کی گھڑی کی باریکی پر تبصرہ کیا گیا پھر ان کی کلائی پر جو دو ستارے کندہ ہیں اس پر چہ میگوئیاں شروع ہوئیں۔ کئی صحافیوں نے یہ مشن بنایا کہ اس کی تہہ تک پہنچنا ہے چنانچہ چار روز بعد یہ خبر آئی کہ صدام حسین نے یہ بچپن میں کھدوائے تھے۔ ان کا تاثر لیڈرشپ کا تھا اور بچپن سے صدام حسین نے لیڈرشپ کا تہیہ کر رکھا تھا۔

صدام حسین کے مظالم پر تو خیر اتنا مواد شائع ہوا ہے کہ رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اس میں اضافہ کتنا ہے اس کا علم تو بعد میں ہوگا۔ جب سے اٹلی کی عریاں فلموں کی اداکارہ ایلونا اسٹالر نے جو گزشتہ برس ممبر پارلیمنٹ بن کر عالمی شہرت حاصل کر چکی ہے اس نے خلیج کے مسئلہ کا حل پیش کیا ہے ٹی وی مزاح نگاروں کو نیا موضوع ہاتھ آگیا ہے ایلونا اسٹالر نے کہا کہ صدام حسین اپنی افواج کو کویت سے واپس بلالیں۔ اس کے اس بیان پر تمام میگزینوں اور اخبارات نے سرخیاں جمائیں۔ اور تقریباً ہر ٹیلی ویژن اسٹیشن کی خبروں کا اختتام اس روز ان کے اسی بیان سے ہوا۔ اسٹالر کی دیکھا دیکھی امریکہ میں ایسی اداکارائیں نکل آئی ہیں جو اپنی خدمات پیش کر رہی ہیں۔ عام طور پر امریکیوں کا خیال ہے کہ گلف کے مسئلے کا حل بغیر گولی چلے نہیں نکلے گا۔ پڑھے لکھے امریکی اس بات سے واقف ہیں کہ یہ پبلک کا موڈ اس وقت ختم ہو جائے گا جب فوجیوں کی لاشیں واپس آنا شروع ہوں گی اور وہ اس امکان کو قطعاً نظر انداز نہیں کرتے گو انہیں یہ بھی یقین ہے کہ امریکہ ہی کی ہوگی مگر وہ ان انسانی جانوں کے تلف کو بیجا نہیں سمجھتے۔ انہیں معلوم ہے کہ امریکہ نے اپنی فوجیں گلف کے شہزادوں اور سعودی حکمرانوں کے تحفظ کے لئے نہیں بھیجی ہیں بلکہ اپنی معیشت اور ان کے مستقبل کے تحفظ کے لئے بھیجی ہیں

(ماخوذ [illegible]

بیگم خورشید حمید پاشاہ
9/69-1-6 سیف آباد حیدرآباد

علم، عورت اور سماج

علم ایسی نعمت ہے جو ہر انسان کو نصیب نہیں ہوتی۔ قسمت سے ملتی ہے علم ایسا پھول ہے جس کی خوشبو ہر طرف محسوس کی جاتی ہے علم ایسا پودا ہے جسے اگر ایک شخص لگائے تو اس کا پھل ہر انسان کھاتا ہے علم ایسی خوشبو ہے جو انسان کے ذہن کو ہمیشہ معطر رکھتی ہے علم ایسی روشنی ہے جو بھٹکے ہوئے انسان کی رہنمائی کرتی ہے علم ایسی لاٹھی ہے جو بے سہارا کو سہارے کا کام دیتی ہے علم ایسا گوہر ہے جو کندۂ ناتراش کو جگمگاتا ہیرا بنادیتا ہے۔

یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ تعلیم نسواں کو کیوں عام نہیں کیا جاتا؟ جبکہ عورت ہی تخلیق کا شاہکار ہے اس کے بغیر کائنات میں رنگینی نہیں تھی۔ خالقِ اکبر نے صنفِ نازک کو بنا کر کائنات میں جان بھردی۔ عورت مونسِ آدم، افزائشِ نسل کا پیکر، معمارِ قوم، قبائل پر بھروسہ کرنے والی اور پیار کرنے والی۔ شوہر کے دکھ سکھ میں برابر کی شریک، بچوں اور گھر بار کی نگراں، اولاد کی تعلیم و تربیت کا پہلا زینہ۔ صبر و رضا کا مجسمہ، رواداری اور اعلیٰ ظرفی میں یکتا۔ ہمہ گیر خوبیوں کا بہترین نمونہ، اسی کے وجود سے حسن و عشق کی دنیا میں ہل چل ہے کائنات اور حیاتِ انسانی میں رونق قائم و دائم ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اس کی تعلیم و تربیت پر مکمل توجہ نہیں دی جاتی۔ روایات، رسومات اور توہمات کی فولادی کڑیوں میں جکڑ دی جاتی ہے۔

یہ کیسا سماج ہے جو کہ اس کو اس طرح جکڑ رکھا ہے اس کو بے زبان جان کر بیاہ دی جاتی۔

خاندانی آن پر قربان کر دی جاتی ہے جہیز اور تلک کے لئے ستائی جاتی ہے پھانسی پر چڑھ کر خاندانی لاج رکھتی ہے یہ کیسی خاموشی ہے؟ آئے دن اس کی ناموس و عصمت کو سر بازار لوٹ لیا جاتا ہے وہ خودکشی کر کے اپنی آن پہ جان قربان کر دیتی ہے۔ ہر روز اس قسم کے واقعات اخبارات میں پڑھے جاتے ہیں لیکن کوئی بندۂ خدا اس قسم کی بربریت کو روا رکھنے والوں کو سزا نہیں دیتا۔ معاشی مشکلات میں پھنس کر وہ محنت مزدوری کر کے مرد کے شانہ بہ شانہ کام کر کے اپنے بچوں اور گھر بار کو سنبھالنا چاہتی ہے تو اس کو شوہر۔ باپ۔ بھائی یا بیٹوں کا تعاون حاصل نہیں ہوتا۔ آپسی اعتماد مفقود ہو جاتا ہے گھریلو سکون ختم ہو جاتا ہے گھریلو ناچاقی کم سن بچوں کے ذہن کا الجھن بن جاتی ہے بچے ممتا کے جذبات اور ماں باپ کے پیار سے محروم ہو جاتے ہیں۔ دو لہے بکتے ہیں۔ خریدار بیویاں بھلا شوہر سے کیسے مرعوب ہوں گی۔ ایسے ماحول میں بھلا نئی پود کیسے پروان چڑھ سکتی ہے۔ یہ سوچنے کا مقام ہے۔ عبرت کا مقام ہے۔ اے رہبران قوم۔ اے قوم کے محافظ بیدار ہو جاؤ۔ ابھی وقت ہے سنبھل جاؤ۔ عورت کی آواز کو سنو اور اس کو آگے بڑھنے دو۔ عورت کی عظمت کو تسلیم کرو۔ خود خالقِ اکبر نے اس کو آدم کا شریکِ حیات بنایا۔ اس میں ہمہ جہتی صلاحیتیں عطا کیں تاکہ کارزارِ حیات کی کشمکش میں خوش اسلوبی سے عمل کر کے کامیاب زندگی بسر کر سکے۔ اس کو ناقص العقل نہ جانو اس کی پوشیدہ صلاحیتوں کو پہچانو اور اسے اپنا ہمسفر بناؤ۔ شیطانی وسوسوں میں نہ پڑو۔ اس کے لئے آگے بڑھنے کے مواقع فراہم کرو۔ اور اسے زیورِ تعلیم و فن سے مزین کرو۔ اپنی اور قومی زندگی کو ترقی کی راہ پہ گامزن ہونے دو۔ اس کے نعرہ کو سنو اور پڑھنے اور آگے بڑھنے دو۔

نعرہ :
بڑھے چلو بڑھے چلو نہ شکست ہو کبھی قدم
تعمیرِ قوم اپنا فن بھارت کی ناریاں ہیں ہم
عالم بنیں گے ہم علم و عمل سے اپنے آگے بڑھیں گے ہم
موقعہ ہمیں عطا ہو آگے بڑھیں گے ہم

بیٹے کو بیچ کر تم بیٹی بیاہنے آئے

پھر بھی تنگ جہیز کے جھگڑے چکا نہ پائے

سیتا کی ہے وہ مورت مریم کی ہے وہ عظمت

بے جوڑ شادیاں تم کیسے رچانے آئے

دریا میں کود کر وہ اب جان دے رہی ہے

پھانسی لگا کے وہ اب قربان ہو رہی ہے

بیاہا تھا جس کو تم نے اک بے زبان سمجھ کر

خاندانی آن پر وہ خاموش جل رہی ہے

افزائش نسل کا پیکر بنی ہوئی ہے

گرہستی کو سنبھالے آگے کو بڑھ رہی ہے

عورت سے زندگی ہے عورت سے بندگی ہے

کیا دکش ہے جو اس کا مر مر کے جی رہی ہے

پڑھنے بھی دو اسے اب بڑھنے بھی دو اسے اب

معمار قوم وہ ہے پہچان لو اسے اب

بڑھے چلو بڑھے چلو نہ سست ہو کبھی قدم

للکار ناریوں کی ہے آگے بڑھیں گے ہم

راہبران قوم سے خطاب

وطن ہے اپنا اک ارم سیتہ وجن شانتی چلن

لیئے ہیں جس کی خاک پر ہمارے راہبر جنم

بھلا کے ایکتا کو ہم بھٹک رہے ہیں دم بدم

شیلاتیت کی راہ پر گشاں گشاں چلے ہیں ہم

آزاد فضاؤں کی شوخیاں، سیاسی چالبازیاں
حصولِ زر کے شوق میں لئے جائیں گی کہاں کہاں
یہ قتل و خون کی ہولیاں ہوا و ہوس کی بازیاں
حیوانیت کے دور کی بنیں گی ایک داستاں

وطن کے پاسبان ہو سنبھل بھی جاؤ وقت ہے
بھولو نہ اپنی ایکتا یہی تمہارا فرض ہے
ہے کشمکشِ حیات میں ہمیشہ سچ کی جیت ہے
ہمالہ بن کے ڈٹ بھی جاؤ یہی تمہاری ریت ہے

دُعا ہے بارگاہ میں چمن یہ پھولتا رہے
صراطِ مستقیم پہ ہمیشہ گامزن رہے
تنویرِ امن بن کے یہ ہمیشہ ضوفشاں رہے
انسانیت کی جیت کا ہمیشہ پاسباں رہے

* * *

IQBAL; MIND AND ART

پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے لیکچر
جو انہوں نے ہندوستان سے باہر کی یونیورسٹیوں میں دیئے
قیمت ۱۷۵/- روپے
ناشر، نیشنل بک ہاؤس پاکستان، اردو بازار، لاہور

صابرہ خاتون
لکچرار فزکس، ویمنس کالج
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

تیسری دنیا کی تنظیم برائے سائنسداں خواتین

Third World Organization For Women In Science.

۱۴ جولائی ۱۹۸۹ء میں The International Guardian میں ایک مضمون شائع ہوا تھا جس کے مطابق انگلستان کی یونیورسٹیوں میں خواتین کا تناسب فزکس اور انجینئرنگ میں بالترتیب دس میں سے چھ اور ایک کا پایا گیا۔ ان اعداد و شمار کی نفی کرنے کے لیے جون ۱۹۸۹ء میں ایک کانفرنس یونیورسٹی کالج لندن میں "خواتین اور فزکس" کے عنوان سے منعقد ہوئی۔

کانفرنس کی آرگنائزر نے (جو یونیورسٹی کالج لندن میں فزکس پڑھاتی ہیں اور جہاں شعبۂ فزکس کے ۵۴ اساتذہ میں سے صرف ۳ خواتین ہیں) فرمایا کہ انگلستان میں اب تک فزکس صرف مردوں ہی کی تجارت رہی ہے۔ موصوفہ نے کہا کہ انگلستان کے تعلیمی نظام میں طلبا و طالبات کو ابتداء میں خصوصی مضامین عمر کے ابتدائی حصہ میں منتخب کرنا پڑتے ہیں جب وہ اپنے والدین اور اساتذہ سے کافی مرعوب متاثر ہوتے ہیں۔ جس کی بنا پر خاص طور سے خواتین فزکس سے دور ہوتی چلی جاتی ہیں۔

اس کانفرنس کا مقصد محض اس غلط فہمی کا ازالہ کرنا تھا کہ فزکس کوئی ایسا مضمون نہیں جو خواتین کے شایان شان نہ ہو اور جس پر صرف مردوں کی ہی اجارہ داری ہو!

جب کہ یہ طے شدہ امر ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں خواتین کی تعداد تیسری دنیا کے ممالک میں خصوصاً اور ترقی یافتہ ممالک میں عموماً بہت ہی کم ہے حالانکہ تیسری دنیا کی مشترکہ آبادی میں خواتین کا تناسب نصف سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ اس لیے کسی بھی ترقی پذیر ملک کی سائنس اور صنعت و حرفت

کی ترقی کے لیے لازمی ہے کہ مرد اور عورت کی منفرد سائنسی صلاحیت پوری طرح بروئے کار لائی جائے۔

لہٰذا ۱۹۶۴ء میں نوبل انعام یافتہ پروفیسر عبدالسلام نے بین الاقوامی مرکز برائے نظریاتی طبیعات International Centre for Theoretical Physics (ICTP) اٹلی میں ترئیسٹے (Trieste) کے مقام پر قائم کیا جس کا مقصد ترقی پذیر اور ترقی یافتہ ممالک کے سائنس دانوں میں باہم اشتراک پیدا کرنا، سائنسی جذبہ ابھارنا، تحقیق کے لئے نئے میدانوں سے روشناس کرانا، غرض یہ کہ کئی اغراض و مقاصد تھے۔

اسی سلسلے کی ایک اور کڑی تیسری دنیا کی سائنسی اکادمی Third World Academy Sciences (TWAS) کا قیام ہے جس کے صدر خود پروفیسر عبدالسلام ہیں اس کا آفس I.C.T.P. سے ملحق ایک عمارت میں قائم ہے یہ اکادمی تیسری دنیا کے ترقی پذیر ممالک کی سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے لئے ہر ممکن امداد کرتی ہے. مثلاً لائق سائنس دانوں کو وظائف دے کر ترقی یافتہ ممالک کی مشہور تجربہ گاہوں میں بھیجنا، تاکہ ان کی سائنسی صلاحیت اجاگر ہو سکے۔ کتب خانوں میں ضرورت کے مطابق سائنسی نصاب کی کتابیں فراہم کرنا، سائنس کی کتابیں شائع کروانا، اچھے محققین کو کانفرنسوں میں شرکت کے لئے بھیجنا وغیرہ۔

اکادمی کی دوسری کانفرنس میں جو ۱۹۸۷ء میں چین کی راجدھانی بیجنگ میں منعقد ہوئی تھی، یہ تجویز پیش کی کہ خواتین سے متعلق ایک سائنسی پروگرام اکاڈمی کے ذریعے مرتب کیا جائے جس کا مقصد خواتین کی سائنسی کارکردگی کا جائزہ لینا اور وہ طریقے اپنانا ہو جن سے خواتین کی تعداد سائنس اور ٹیکنالوجی میں زیادہ ہو، تاکہ ان کی اہلیت اور لیاقت ان کے ملک کی ترقی میں معاون ثابت ہو۔

تنظیم کی بنیاد۔ کینیڈا کی بین الاقوامی ترقیاتی ایجنسی - Canadian International Development Agency (C.I.D.A) اور اکادمی کے اشتراک سے تیسری دنیا کی سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی میں خواتین کا حصہ، عنوان کے تحت ترئیسٹے میں ۳ سے ۷ اکتوبر ۱۹۸۸ء میں ایک کانفرنس ہوئی جس میں ۲۱۸ سائنس داں خواتین اور ماہر فنیات، تیسری دنیا کے ۶۳ ممالک سے اور بیشتر ترقی یافتہ ممالک سے شریک ہوئیں جن میں دو نوبل انعام یافتہ پروفیسر ڈوروتھی کروفوٹ ہاڈکن۔ انگلینڈ نوبل انعام یافتہ

کیمسٹری (۱۹۶۷ء) اور ریاضیاتی موتی سیتی۔ اٹلی نوبل انعام یافتہ میڈیسن (۱۹۸۶ء) بھی تھیں۔

اس کانفرنس میں خواتین سائنس دانوں کی ایک تنظیم قائم کرنے کی پُرزور حمایت کی گئی۔ جس کے مختلف پہلوؤں کا مطالعہ کرنے کے لیے ۱۷ خواتین کی ایک جماعت تشکیل دی گئی۔

اس مطالعاتی جماعت نے یہ طے کیا کہ تیسری دنیا کی تنظیم برائے سائنس دان خواتین — Third World Organization for Women in Science (T.W.O.W.S) کے نام سے ایک آزاد خود مختار غیر منافع بخش اور غیر سرکاری انجمن ہوگی۔ لہذا ۲۰-۲۲ مارچ ۱۹۸۸ء میں اس نئی تنظیم کی رسم اجرا تری ایسٹے میں عمل میں آئی جس کا صدر دفتر اکادمی کی عمارت میں ہی قائم ہوا۔ اس تنظیم کے خاص مقاصد درج ذیل ہیں۔

۱۔ ترقی پذیر ممالک کی خواتین میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی جانب رغبت پیدا کرنا۔

۲۔ تیسری دنیا کی سائنسی سرگرمیوں میں خواتین کی شرکت میں اضافہ کرنا اور ان کا معیار تعلیم بہتر بنانا۔

۳۔ ملکی اور بین الاقوامی سطح پر خواتین سائنس داں کو فیصلہ جاتی ضوابط میں شریک کرنا۔

۴۔ تیسری دنیا کی سائنسی ترقی میں خواتین کی کارکردگی سراہنا۔

رکنیت : اس تنظیم میں تین قسم کے ممبر ہوسکتے ہیں

۱۔ پورا رکن (Full Member) کوئی بھی منفرد رکن یا ادارہ بن سکتا ہے۔

منفرد رکن سے مراد وہ خاتون ہے جو ماہر فنیات یا سائنس داں ہو۔ تیسری دنیا کے کسی ملک سے وابستہ ہو اور تنظیم کے مقاصد کو تسلیم کرتی ہو۔ پورا رکن بننے کی اہل ہو سکتی ہے۔

ادارہ جاتی ممبر وہ سائنسی ادارہ یا جماعت تسلیم کی جائے گی جو تیسری دنیا میں قائم ہو اور جس کا مقصد سائنس اور ٹیکنالوجی میں خواتین کی شرکت کو فروغ دینا ہو۔

۲۔ متعلق رکن Associate Member، اس قسم کے ممبر فرد واحد (مرد) جو سائنس داں یا ماہر فنیات ہو، یا کوئی سائنسی ادارہ جس کا مقصد اس تنظیم کے مقاصد کو بروئے کار لانا ہو، بنائے جاسکتے ہیں

۳۔ امیدوار رکن (Candidate Member) اس رکنیت کی حامل وہ خواتین ہوں گی جو تیسری دنیا کی شہری ہوں مگر جن کی سائنس یا ٹیکنالوجی میں اعلیٰ تعلیم سردست پوری نہ ہوئی ہو۔ تاہم

وہ رکن کال کی اہل نہ ہو کہ امیدوار رکن ہی بن سکتی ہیں ۔

موجودہ سرگرمیاں : اس تنظیم کو کینیڈا کی بین الاقوامی ترقیاتی ایجنسی کی جانب سے نیوز لیٹر چھپوانے، خط و کتابت کرنے اور تیسری دنیا کی خواتین کی فہرست تیار کرنے کے لیے ایک مناسب رقم کا عطیہ دیا گیا ہے ۔ اس تنظیم کا افتتاحی اجلاس ۱۹۹۱ء میں کویت میں منعقد ہوگا جو اکادمی کی چوتھی عام کانفرنس کے ساتھ ساتھ ہوگا ۔

تنظیم کی سرگرمیوں سے ممبران کو آگاہ کرنے کے لئے مطالعاتی جماعت نے بطور وقتی انتظامی کمیٹی Interim executive committee اس وقت تک کام کرنا منظور کر لیا ہے جب تک کہ نئی کمیٹی کی تشکیل عمل میں نہ آئے ۔ اس کی چیر پرسن (Lydia P. Makhubu) بنائی گئی ہیں جو ماہر کیمیا ہیں اور سوئزر لینڈ کی یونیورسٹی کی وائس چانسلر ہیں سکریٹری P. Dennis ہیں ۔ جو Jamaica سے تعلق رکھتی ہیں ۔ پانچ ممبر خواتین یہ ہیں ۔

Ana Maria Cetto	میکسیکو
Bakoly . D. R	مڈغاسکر
فرخندہ حسن	مصر
سامیہ نصر	اردن
سندھو جوشی	انڈیا

اس کمیٹی کی میٹنگ میں تنظیم کا آئین مرتب کیا گیا اور نیوز لیٹر چار مرتبہ سالانہ شائع کرنے کا فیصلہ ہوا ۔ یہ بھی طے پایا کہ ووٹ دینے والے ہر ممبر کو ۱۰ اور اداروں کو ۵۰ امریکی ڈالر سالانہ رقم کا چندہ دینا ہوگا گورنمنٹ اختیار کرنے کی کوئی فیس نہیں ہے ۔

تیسری دنیا کی خواتین کی ایک ڈائرکٹری بھی ترتیب کے مراحل میں ہے جو اپنی نوعیت کی پہلی ڈائرکٹری ہوگی پروفیسر عبد السلام نے علم الحساب سائنس، ایک کانفرنس برائے خواتین I.C.T.P. کی جانب سے منعقد کرنے کے لیے کہا ہے جس میں کسی لائق خاتون کو دس ہزار امریکی ڈالر کا خصوصی انعام بھی دیا جائے گا ۔

جہاں تک اس تنظیم کی رکنیت کا تعلق ہے صرف کچھ ماہ کے عرصے میں ۱۹۴ خواتین سائنس داں، ۸ مرد اور ۶ ادارے اس کے ممبر بن گئے تھے۔ موجودہ صورتحال یہ ہے کہ ۵۱ ممالک کے ۲۷۰ لوگ اس کے ممبر بن چکے ہیں جغرافیائی اعتبار سے TWOWS کی ممبرشپ اس طرح تقسیم کی جا سکتی ہے۔

افریقہ ۳۲٫۸۸٪	ایشیا ۲۳٫۷۲٪
لاطینی امریکا ۱۹٫۷۷٪	سعودی عرب ۶٫۹۸٪
دیگر ۴٫۶۵٪	

دیگر تنظیمیں : سائنس داں خواتین کی مختلف انجمنیں تیسری دنیا کے کئی ممالک میں قائم ہیں۔ ہندوستانی سائنسداں خواتین کی ایسوسی ایشن Indian Women Scientis Association ۱۹۷۳ء میں قائم ہوئی تھی اس کا صدر دفتر بمبئی میں اور دس شاخیں ملک کے مختلف حصوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اس وقت اس ایسوسی ایشن کے تقریباً ۹۰۰ ممبر ہیں۔

ایک S.N.D.T. خواتین کی یونیورسٹی ہے جو ۱۹۱۶ء میں مہاراشٹرا میں قائم ہوئی تھی یہ اپنی نوعیت کی پہلی یونیورسٹی ہے جسے Ford Foundation سے امداد ملتی ہے ۱۹۱۲ء سے اسے Centre for Advanced Women's Studies کا درجہ مل گیا ہے۔

مصر میں عرب خواتین کی سائنسی ایسوسی ایشن Scientific Association of The Arab's Women) ۱۹۷۸ء میں مراقش کی شہزادی فاطمہ الزہرا (جو اس کی پہلی صدر تھیں) اور اردن کی شہزادی باسمہ بنت طلال (جو پہلی نائب صدر تھیں) کی باہم جدوجہد سے قائم ہوئی۔ یہ تنظیم بہت سی عملی کام کر رہی ہے۔ مثلاً مصر کے گاؤں میں دیہی کے تیار کردہ شمسی ہیٹروں کے ذریعے گرم پانی پہنچانا۔ بایو گیس کی سہولیات مہیا کرنا، سیمینار اور کانفرنس وغیرہ منعقد کرنا۔ اس کی پہلی کانفرنس "خواتین، ٹکنالوجی اور ترقی" کے زیر عنوان ۱۹۸۶ء میں اور دوسری ۱۹۸۷ء میں منعقد ہوئی جس کا عنوان تھا "سائنس ٹیکنالوجی اور مصری بچے کی تندرستی"۔ ۱۹۸۸ء میں ایک سمپوزیم بر عنوان "دریائے نیل کا ماحولیاتی آلودگی سے تحفظ اور خواتین کا حصہ" منعقد ہوا جس میں مصر یا بحیثیت شمولیت وابستہ نو افریقی ممالک کے شرکا نے حصہ لیا اور (باقی صفحہ پر)

یہ تجویز منظور کی کہ ایک غیر سرکاری ادارہ دریائے نیل کی ماحولیاتی آلودگی سے تحفظ کے لئے قائم کیا جائے گا۔

نائیجریا میں خواتین کی ایک اسوسی ایشن ۱۹۸۷ء میں قائم ہوئی جس کا نام Nigerian — Association of Women in Science, Technology and Mathematics ہے اور جسے NAWSTEM کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ ملک گیر پیمانے پر خواتین کے سمینار، کانفرنس، ورکشاپ اور انعاماتی مقابلے کراتی رہتی ہے۔

غرض یہ کہ ترقی پذیر ممالک میں خواتین سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں روز بروز ترقی کر رہی ہیں۔ ان میں اب سائنسی بیداری پیدا ہو رہی ہے۔ انھیں سائنس اور ٹیکنالوجی میں ہی اپنا مستقبل چمکتا نظر آرہا ہے جس کا سب سے بڑا ثبوت وہ تنظیمیں ہیں جو اپنے اپنے ملک میں انواع واقسام کے کاموں میں مصروف ہیں لیکن تیسری دنیا کے تمام ممالک کی سائنسی خواتین کو متحد اور یکجا کرنے والی وہ واحد تنظیم ہے جو TWOWS کے نام سے اُبھر کر سامنے آئی ہے۔

اُردو تنقید کی تاریخ میں ایک اہم کارنامہ، اصلاحِ سخن کی روایت کا نظریاتی اور عملی منظرنامہ

ابر احسنی اور اصلاحِ سخن

مرتب، عنوان چشتی نعیم الدین رضوی

قیمت : ۱۰۰ روپے

ملنے کے پتے

* اُردو سماج ۔ بی ۱۱۷ جامعہ نگر ۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵
* مکتبہ جامعہ ، جامعہ نگر ۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

ابراہیم جلیس

جورو کا بھائی ایک طرف

ہم ایک ایسے صاحب کو جانتے ہیں جن کا "کاروبار" ہی وہ "کار — و — بار" ہے جس کے بچے
انگریزی زبان میں یعنی CAR - & - BAR
ان صاحب کے پاس ایک کار (CAR) ہے اور وہ سرشام ہی سے کسی بار (BAR) میں یعنی شراب خانے
میں بیٹھ جاتے ہیں۔

اس کار اور بار کے باعث ان کے تعلقات ان سارے "بڑے لوگوں" سے ہیں جن کے اختیار میں
"سب کچھ" ہے۔

ان صاحب کا نام کیا ہے؟ ہم نہیں جانتے۔ البتہ یہ صاحب اب "مولوی مشکل کشا" کے نام سے خاصے
مشہور ہیں۔ مایوس سے مایوس آدمی بھی ان کی کوٹھی میں داخل ہوتا ہے تو پھر نہایت "مطمئن" ہو کر باہر نکلتا ہے۔

مثال کے طور پر ہم آپ کو واقعہ سناتے ہیں
ایک کنجوس اور چڑچڑے داماد نے اپنی "گھر ساس" (بہ مناسبت گھر داماد) تنگ آ کر گلا گھونٹ کر
اُسے ہلاک کر دیا۔

اس کے بعد جب وہ چڑچڑا داماد ان مولوی مشکل کشا کی کوٹھی کے اُس پھاٹک میں داخل ہو رہا تھا
جس پہ دا لکھا ہوا تھا اُس کے خلاف "قتل کا مقدمہ" درج ہو چکا ہے

اور جب وہ چھٹ بھیا داماد مولوی مشکل کشا کی کوٹھی کے اس پھاٹک کے باہر آ رہا تھا جس پر OUT لکھا ہوا تھا تو اس کی مرحومہ ساس کے خلاف "خودکشی" کا جرم ثابت ہو چکا تھا۔

ساس تو OUT ہو ہی چکی تھی داماد IN ہونے سے بچ گیا۔

بات صرف اتنی سی ہے کہ

داماد نے "خون" کیا تھا، مولوی مشکل کشا نے "فون" کیا تھا۔

ہم نے الفاظ کے ہیر پھیر کی مدد لے کر اور نہایت محتاط ہو کر ساری "ان کہی" بات کہہ دی ہے ورنہ اگر ہم "۔۔" سے کام نہ لیتے تو کسی بے وقوف کی طرح ہم بھی پٹ پٹ بک، دیتے کہ

مولوی مشکل کشا سفارش اور رشوت کے ٹھیکیدار ہیں

لیکن معاف کیجیے گا۔ ہم ایسے اُلو نہیں ہیں۔ ہم مرتے مر جائیں گے لیکن اپنی زبان سے کبھی یہ نہیں کہیں گے کہ

مولوی مشکل کشا سفارش اور رشوت کے ٹھیکیدار ہیں

ہم مشکل کشا سے سخت نفرت کرتے ہیں کیونکہ ہمارا یہ ایقان ہے کہ

کوئی غیر ملک ہمارا اتنا خطرناک دشمن نہیں جتنے کہ سفارش اور رشوت ہمارے خطرناک دشمن ہیں جب تک سفارش و رشوت ہمارے وطن میں دندناتے پھریں گے اس وقت تک قانون' کا نون "نون غنہ" ہوگا اور ملک کبھی اسم بامسمیٰ نہ ہو سکے گا۔

رشوت کے بارے میں تو ہم نہیں جانتے کچھ۔ یا اگر جانتے بھی ہیں تو ہم کچھ کہنا نہیں چاہتے۔ البتہ جہاں تک سفارش کا تعلق ہے ہم علی الاعلان یہ اعتراف کرتے ہیں کہ ہم بھی بڑے سے بڑے قومی مجرم ہو کوئی دن نہیں جاتا جس دن ہمارے پاس ادسطاً بچاس سا ٹھ ایسے اشخاص نہ آتے ہوں جو ہم سے کہہ کر کبھی سفارش نہ کرواتا ہو۔

کسی کو نوکری چاہیئے۔ کسی کے بچوں کا اسکول یا کالج میں داخلہ کروانا ہے۔
کسی کی ترقی کی سفارش کرنی ہے ۔ کسی کو کوئی "الاٹمنٹ" مطلوب ہے
کسی کو قانون کے پنجے سے بچانا ہے ۔ وغیرہ وغیرہ

جب بھی کوئی غرض مند ہمارے پاس آتا ہے تو ہماری اور اس کی گفتگو بالعموم یوں شروع ہوتی ہے۔

"جناب مجھے "ٹوین سٹی مارکٹ" میں ایک کوارٹر چاہیئے؟"

ہم جواب دیتے ہیں

"جو لوگ ٹوین سٹی مارکٹ" کا الاٹمنٹ کر رہے ہیں ہم انھیں نہیں جانتے۔

غرض مند کہتا ہے

"آپ انھیں نہ جانتے ہوں لیکن آپ کو کون نہیں جانتا"

معاف کیجیئے ہم آپ کی کوئی خدمت نہیں کر سکتے۔

ہم صاف گوئی سے کام لیتے ہیں۔

دیکھیئے آپ نے بشیر کو امریکہ بھیجوا دیا۔ غرض مند بولا

"بشیر کو امریکہ خدا نے اور بشیر کی اپنی خوش قسمتی نے بھیجوایا۔ ہم نے نہیں بھیجوایا۔ ہم نے تو صرف ایک کالم لکھا تھا؟

جب آپ ایک کالم لکھ سکتے ہیں تو ایک سفارشی خط بھی لکھ سکتے ہیں

غرض مند کہتا ہے

ہم انکار کرتے ہیں۔

ہم سفارشی خط لکھنا پسند نہیں کرتے ..

غرض مند مسکراتے ہوئے کہتا ہے

"لیکن سفارشی خط پڑھنا تو پسند کرتے ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ ہمارے آگے ایک سفارشی خط بڑھا دیتا ہے۔ یہ سفارشی خط ہمارے "سالے" نے ہمیں لکھا ہے جسے پڑھ کر ہم ڈھیر ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ

ساری خدائی ایک طرف : جورو کا بھائی ایک طرف

ہر آدمی کی ایک جورو ضرور ہوتی ہے اور ہر جورو کا کوئی نہ کوئی بھائی ضرور ہوتا ہے جو علی الاعلان قانون کی ایسی کی تیسی کرتا پھرتا ہے۔

لائسنس، پرمٹ، چور بازاری، ملاوٹ، اسمگلنگ، ترقی، تبادلہ، درس گاہ، تھانہ ــ سب کے پیچھے جھانک کر دیکھئے۔

سالا ـــــ دولہا بھائی کا منہ کالا کر رہا ہے

سالوں نے ملک کو بدنام کر رکھا ہے۔ بلکہ بقول شخصے

دنیا سالوں سے چلی آرہی ہے اور سالوں تک چلی جائے گی

یہ سالے صرف ہمارے ملک ہی میں نہیں بلکہ ساری دنیا میں ہر ملک میں دندناتے پھر رہے ہیں

"سالوں نے ناک میں دم کر رکھا ہے"

لیکن دنیا سے ہمیں کیا ـــــ ہمیں تو اپنے پیارے وطن سے مطلب ہے ہم تو صاف صاف کہتے ہیں کہ

"جب تک سالے دندنائیں گے "خاتون" تو حکومت کرے گی

قانون نہیں۔"

راجندر بہادر موج

اُردو کے مسائل

غم تو اُردو کا بہت ہے مگر آرام کے ساتھ
غم میں اُردو کے ڈنر کھاتے ہیں حکام کے ساتھ

مرحوم اکبر الہ آبادی کی روح سے

معذرت کے ساتھ محبانِ اُردو کی موجودہ اُردو دوستی کا عالم اس شعر کے ذریعہ پیش کر رہا ہوں۔

میرا اُردو سے تعلق تقریباً نصف صدی سے زیادہ عرصے سے ہے مگر خود اُردو والوں کا اُردو کے ساتھ رویہ جتنا خود غرضانہ آج کل دیکھ رہا ہوں اتنا کبھی نہیں دیکھا۔ سیاسی جماعتیں اُردو کو دوسری ریاستی زبان بنانے کا کھلونا دکھا دکھا کر الکشنوں سے پہلے اس کے وعدے کو اپنے منشور میں شامل کر عوام کو بہکا کر مفاد حاصل کرتی ہیں اور الکشن کے بعد وعدے کو بھلا کر چند نام نہاد محبانِ اُردو کو اُردو کی سرکاری و نیم سرکاری کمیٹیوں پر فائز کر کے ان کی زبان بند کر دیتی ہیں۔ کچھ شور مچانے والوں کو اُردو کی نمائشی ترویج کے نام پر کثیر رقوم دے کر خرید لیا جاتا ہے اور مصنوعی عشاقِ اُردو عوام کو حکومت کی جانب سے باور کراتے رہتے ہیں کہ اُردو کو اب دوسری سرکاری زبان بنائے جانے کا درجہ مل گیا ہے یا ملنے والا ہے اب اُردو کی تعلیم لازمی ہونے ہی والی ہے مزہ تو یہ ہے کہ آج تک یہ وضاحت نہ ہو سکی کہ دوسری سرکاری زبان یا ریاستی زبان کے کیا معنی ہیں اور اس سے اُردو کو کیا حق حاصل ہوگا۔

پچھلے سال دہلی میں انجمن ترقی اُردو (ہند) کے سالانہ اجلاس کے موقع پر جب حکومت اُترپردیش

کا یہ اعلان اناکین نے اخبارات میں پڑھا کہ اُردو کو دوسری ریاستی زبان کا درجہ دے دیا گیا ہے تو ہر طرف خوشی کی لہر دوڑ گئی خاص طور پر انجمن ترقی اُردو شاخ اُتر پردیش کے عہدیداران اس بارے میں لمبی لمبی تقریروں میں اپنی مساعی کا ذکر کرکے ایک دوسرے کو مبارکباد دینے لگے اور اس اعلان کو اپنی فتح سے تعبیر کرنے لگے۔ میں اس مبارکباد کے جشن سے بے نیاز رہا۔ اور نتیجہ ہو گیا کہ ایک بار پھر الکشن سے پہلے اُردو والے دھوکا کھا گئے۔ نہ کسی نے کچھ دیا نہ کسی کو کچھ ملا۔ یہ ہوائی مبارک بادیاں اور نمائشی فتحیابی کے سہرے مجھے تکلیف دہ محسوس ہونے لگے۔ میں نے صرف اتنا ہی کہا۔

مچھلی نے ڈھیل پائی ہے دانے پہ شاد ہے
صیاد مطمئن ہے کہ کانٹا نگل گئی

آخر اُردو والے اتنے نادان تو نہیں، ماشاء اللہ اہلِ شعور ہیں اور مجھ سے زیادہ ذی فہم ہیں۔ لگتا ہے یہ دھوکا صرف اس لیے تو نہیں کھاتے ہیں کہ انھیں وعدہ کرنے والی جماعت کی مدح سرائی کرنے کا اور اس سے مفاد حاصل کرنے کا موقع مل جائے۔

پچھلے سال کانگریسی حکومت کو جنوری ۶۸ء میں اُردو کو دوسری ریاستی زبان کا درجہ دینے میں کیا قباحت تھی۔ الکشن سے عین قبل اس قسم کا اعلان دھوکا ہی نہیں بلکہ ایک نظریہ سے الکشن کے قانون کی قانون شکنی کے مترادف ہے۔ میں نے اس وقت کئی مراسلوں میں بجائے تحسین کے اظہارِ افسوس کیا تھا۔

یہی وتیرہ اُتر پردیش میں موجودہ برسرِ اقتدار جماعت اختیار کر رہی ہے۔ جب تک وہ حزبِ مخالف تھی اُردو کو دوسری ریاستی زبان بنانے کے لیے علانیہ بیان دیتی تھی اور آج جب با اختیار ہے تو اس مسئلے کو اُلجھا رہی ہے اور تاخیر کے لیے مبہم دلائل کا سہارا لے رہی ہے یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ جب عوام اُردو نہیں جانتے تو دوسری ریاستی زبان بنانے سے کیا فائدہ ہوگا مگر عوام کو اُردو سے الگ کس نے کیا اس کی ذمہ داری بھی تو حکومت پر ہے جس نے مجہول سیاسی ذمہ داری سے

اُردو کو ختم کیا۔

سب جانتے ہیں کہ کسی تحریک کو اُلجھانا ہو یا ختم کرنا ہو تو اس کے لیئے ایک کمیٹی بنادی جائے اور کمیٹی کے اراکین کو کچھ اختیارات دے کر ان سے کچھ مستقبل کے وعدے کر دیئے جائیں تو وہ اختیارات اور وعدوں کے دائرے میں چکر کاٹتے رہیں اور کمیٹی کی مدت بڑھانے اور وعدوں کے انتظار میں حکومت کے گن گاتے رہیں۔

گجرال کمیٹی کی سفارشات آج کی نہیں مدت کی ہیں۔ سہ لسانی فارمولا بھی آج کا نہیں کافی عرصے کا ہے ان کے عمل درآمد کی صورت طے کرنے کے لیئے ایک کمیٹی بنائی گئی ہے جو پورے ملک میں دورہ کر رہی ہے ظاہر ہے کہ اس پر کثیر اخراجات ہوں گے جو اُردو کے نام پر لکھے جائیں گے لوگ سوچیں گے کہ حکومت اُردو کے لئے کتنا کر رہی ہے مگر صورت جو تھی وہی ہے، اُردو کا ایسا کوئی مسئلہ ہے جو اظہر من الشمس نہیں ہے حکومت سب جانتی ہے اور پھر بھی جاننا چاہتی ہے۔

اُردو آج چند ادبا اور دارالعلموں تک محدود ہو کر رہ گئی ہے اُردو سے عوام کا رشتہ ختم ہو چکا ہے ہم پتوں کی آبیاری کر رہے ہیں اور خوش ہو رہے ہیں یہ نہیں دیکھتے کہ اُردو کی جڑیں کاٹ دی گئی ہیں اور یہ پتے بھی جلد مرجھا جائیں گے۔

جب انگریزوں کے دور میں انگریزی سرکاری زبان تھی، ہندی اور اُردو دونوں ثانوی زبان کی حیثیت سے قائم رہیں۔ دونوں اسکولوں میں پڑھائی جاتی رہیں تو آج جب ہندی جو اُردو کی بڑی بہن ہے سرکاری زبان ہے، اُردو کے ختم کرنے کی کوشش کیوں کی جارہی ہے۔ اسکولوں سے اُردو غائب۔ دفاتر میں اُردو میں لکھی ہوئی درخواستیں دینا ممنوع۔ روز حکومت کے احکامات اخبار میں موصول ہوتے ہیں کہ عدالتی اور دفتری کام صرف ہندی میں کیا جائے۔

حکومت کی یہ کیسی اُردو پروری ہے اور محبانِ اُردو کی یہ کیسی غیرت ہے کہ پانڈوں کی طرح اُردو دروپدی کا چیر ہرن (بے لباسی) دیکھ رہے ہیں اور شیر قالین بنے بیٹھے ہیں کیا وہ بھی پانڈوں کی طرح کوئی بازی ہار چکے ہیں۔

اردو کے اقلیت کی زبان ہونے کے نظریے سے مجھے ہمیشہ اختلاف رہا ہے یہ اور بات ہے کہ ملک کی سب سے بڑی اقلیت نے اردو میں فارسی و عربی الفاظ بکثرت ہونے کی وجہ سے اور اس کا فارسی رسم الخط ہونے کی وجہ سے اسے اپنا لیا ہے مگر اردو کے خادموں میں غیر مسلم حضرات کی بھی تعداد کافی رہی ہے۔

اردو خالصتاً ہندوستان کی پیداوار ہے مسلمانوں کی مذہبی زبان تو عربی ہے اور کاروباری زبان فارسی تھی۔ یہ ضرور ہے کہ مغلیہ حکومت کے دور میں اردو ظہور میں آئی مگر اردو کی گرامر (قواعد) تو ہندی سے ملتی جلتی ہے فارسی یا عربی سے نہیں۔ یہی اس کے ہندی کی چھوٹی بہن ہونے کا نمایاں ثبوت ہے۔ اردو میں تو متعدد زبانوں کے الفاظ ہیں اردو کا یہ کیسا المیہ ہے کہ یہ جس دیس میں پیدا ہوئی وہیں اسے بدیسی مانا جا رہا ہے۔ اردو کے سرپرست اور شیدائی بھی اپنے بچوں کو ابتدائی تعلیم مشرقی طریقے پر دلوانے کے بجائے مانیٹری طریقے پر تعلیم دلوانا پسند کرتے ہیں جہاں اردو قطعی نہیں پڑھائی جاتی۔

وجہ یہ ہے کہ اردو والے خود اردو تعلیم کے اس عظیم مسئلہ کو غیر سنجیدگی سے اور رواداری میں لے رہے ہیں۔ یہ بھول رہے ہیں کہ اس کا انجام اردو کے لیے مہلک ہوگا اور ہو رہا ہے۔ یہی آج کے بچے جو اردو سے نابلد ہو رہے ہیں چند سالوں میں جوان ہوں گے اور معزز شہری بنیں گے کچھ حکومت کے اراکین بنیں گے۔ مگر انھیں اردو سے کوئی لگاؤ نہ ہوگا۔ بغیر اردو کی تعلیم کو فروغ دیئے اردو کی حمایت کا دم بھرنا ایک مذاق معلوم ہوتا ہے۔

اردو کے موجودہ نمائشی ہمدرد حکومت سے تو اردو کے جانے مانے دشمن مرحوم بابو سدیو وزیر حکومت یوپی ہی اچھے تھے جنھوں نے آٹھویں درجے تک اردو کی لازمی تعلیم کی تجویز پیش کی تھی۔ پچھلی جنتا حکومت کے دور میں جب مرحوم بنارسی داس وزیر اعلیٰ تھے آٹھویں درجے تک اردو کی تعلیم لازمی قرار دی گئی تھی جسے بعد میں کانگریس سرکار نے ختم کر دیا۔

لہٰذا ہمیں سردست اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کا مطالبہ ترک کر دینا چاہیئے اور مندرجہ ذیل مطالبے کرنا چاہیئے۔

۱۔ آٹھویں کلاس تک اردو کی تعلیم لازمی کر دی جائے۔ اسکولوں اور کالجوں کی تعلیمی اسکیم ایسی ہو

جائے کہ سائنس اور کامرس کے طلبا بھی اردو پڑھ سکیں۔

۲۔ بلا لحاظ تعداد طلباء اسکولوں و کالجوں میں اردو کی تعلیم کا بندوبست فوری طور پر کیا جائے۔

۳۔ اردو میں دفتری اور عدالتی کام کرنے کی سہولت مہیا کی جائے۔

۴۔ ہر دفتر میں اردو جاننے والوں کی تقرری کی جائے جو اردو خط و کتابت کا جواب اردو میں دے سکیں

۵۔ بڑے شہروں کے علاوہ متصل اضلاع میں بھی اردو کی ترویج و تبلیغ پر توجہ دی جائے۔ اردو کانفرنسیں دہلی اور صوبائی دارالخلافوں کے علاوہ دیگر اضلاع میں بھی منعقد کی جائیں۔

۶۔ اردو کے معاملات میں دارالعلوموں کے استادوں کے علاوہ متصل اضلاع کے محبانِ اردو کو بھی شریک کیا جائے۔

۷۔ جب تک یہ مطالبات پورے نہ ہو جائیں محبانِ اردو کو چاہیئے کہ حکومت کے ذریعہ نامزد کی ہوئی اردو سے متعلق جائزہ کمیٹی یا ایسی کمیٹی میں شریک نہ ہوں جس کا نمائشی مقصد اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کو عملی شکل دینے یا ترویج دینے سے متعلق ہو کیونکہ یہ سب اردو کے مسائل کو الجھانے اور عوام کو بہکانے کے لیے ہوگا۔ اردو کا معاملہ صاف ہے مزید چھان بین اور تاخیر کی ضرورت نہیں ▲▲

(سلسلہ صفحہ ۵۹ سے آگے)

سے آزاد صاحب کا استقبال کرتے رہے۔ اس محبت سے بریز حسنِ سلوک کو دیکھ کر عرش ملسیانی آزاد آبدیدہ ہو گئے اور کچھ کہے بغیر اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔

انگلستان میں پروفیسر آزاد کے دورانِ قیام میں روزنامہ "جنگ" لندن نے جگن ناتھ آزاد کی مصروفیات کو تفصیل سے شائع کرنے کے علاوہ ان کے مائیکروفون پر ڈاکٹر ظ۔ انصاری کا مقالہ شائع کیا اور ہفتہ وار "رومی" "بمبئی" فورٹ پروفیسر آزاد کے بارے میں ایک سپلیمنٹ شائع کر رہا ہے

پروفیسر آزاد کا علمی و ادبی سفرِ یورپ

پروفیسر جگن ناتھ آزاد جو ایشین آرٹس کونسل ناروے اور دوسری علمی اور ادبی تنظیموں کی دعوت پر یورپ گئے ہوئے تھے ڈیڑھ ماہ کے سفر کے بعد وطن واپس پہنچ گئے ہیں۔

اوسلو (ناروے) میں جگن ناتھ آزاد نے انٹرنیشنل مشاعرے میں شرکت کی۔ اس مشاعرے کی صدارت برصغیر کے نامور شاعر احمد ندیم قاسمی نے کی اور جگن ناتھ آزاد کو مہمانِ خصوصی کا اعزاز بخشا گیا۔ ناروے میں مقیم پاکستانی اور ہندوستانی تاجر حضرات اور اہلِ قلم کی جانب سے دی ہوئی ایک دعوت میں تقریر کرتے ہوئے جگن ناتھ آزاد نے کہا کہ یہ مقام مسرت ہے کہ اہلِ نظر نے دور دراز کے علاقوں میں تازہ بستیاں آبادی کر لی ہیں لیکن ان بستیوں میں اپنے تمدن، اپنی تہذیب، اپنے علم و فن اپنی اقدار اور اپنی شناخت کو برقرار رکھنے کا کام ابھی باقی ہے یہ ایک مشکل کام ہے کیونکہ حالات بتا رہے ہیں کہ نئی بستیاں بسانے والے بہت دیر تک دو کشتیوں میں سوار نہیں رہ سکیں گے۔

کوپن ہیگن (ڈنمارک) میں پروفیسر آزاد نے ریڈیو ڈنمارک کے ایک مباحثے میں شرکت کی جس میں دوسرے شرکا حضرات بلراج کومل، ف س۔ اعجاز اور شمشیر سنگھ شیر تھے۔ نصر ملک اس مباحثے کے ماڈریٹر تھے۔ اس کے علاوہ وہاں کے ایک غیر سرکاری ریڈیو نے مختلف موضوعات پر جگن ناتھ آزاد کے تین انٹرویو ریکارڈ کئے۔ معتول شاعر سردار شمشیر سنگھ شیر کی فرمائش پر کوپن ہیگن کے ادبی جلسوں کے لئے جگن ناتھ آزاد نے علامہ اقبال کے فکر و فن پر ایک تقریر بھی ریکارڈ کی۔

پیرس (فرانس) میں پروفیسر آزاد کا قیام صرف ایک دن کے لئے تھا اور ان کا یہ سارا وقت اردو

شلجاب
نومبر ۱۹۹۰
۵۸
فارسی، عربی، فرانسیسی اور اسلامیات کے جید عالم ڈاکٹر حمید اللہ کی محبت میں تیسرا ہوا ۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے جگن ناتھ آزاد کے نعتیہ کلام کا فرانسیسی میں ترجمہ کیا ہے جو HOMMAGE A MAHOMET کے نام سے فرانس کے مشہور اشاعتی ادارے EDITIONS TOOUGUI 30 RUE RENE' BOULANGER - 7010 PARIS نے شائع کیا ہے۔

لندن (انگلستان) میں جگن ناتھ آزاد نے انجمن اسلام کے زیر اہتمام ایک بین الاقوامی مشاعرے میں شرکت کی جس میں انہیں مہمانِ خصوصی کا اعزاز بخشا گیا۔

والتھم اسٹو میں ایشین آرٹس کونسل لندن نے پروفیسر آزاد کے اعزاز میں ایک مشاعرے کا اہتمام کیا جس کی صدارت جناب مقصود الٰہی شیخ ایڈیٹر ہفتہ وار "راوی" بریڈفورڈ (انگلستان) نے کی۔ اس مشاعرے میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، سعادت سعید، سوہن راہی اور دوسرے مقررین حضرات نے اپنی تقریروں میں پروفیسر آزاد کی علمی اور ادبی خدمات کو خراجِ تحسین ادا کیا اور اطہر راز، عبدالخالق بھٹی اور دوسرے شعراء نے ان کے متعلق نظم میں اظہارِ خیال کیا۔

برمنگھم (انگلستان) میں انجمن ترقی اردو (برمنگھم) نے وسیع پیمانے پر جگن ناتھ آزاد کے لئے ایک استقبالیہ کا اہتمام کیا جس میں پروفیسر آزاد نے اقبال کی شعریات پر ایک گراں قدر لیکچر دیا اور بعد میں ایک مشاعرے کی صدارت کی۔ آخر میں انجمن کے صدر جناب عبداللہ بن علی باوہاب نے انجمن کی طرف سے جگن ناتھ آزاد کا شکریہ ادا کیا۔ اور آزاد کی علمی اور ادبی خدمات پر روشنی ڈالی اور رات کے ایک بجے یہ دلکش اور باوقار ادبی محفل اختتام پذیر ہوئی۔

پروفیسر آزاد کے اعزاز میں ایک اور محفلِ سخن ملٹی کلچرل سنٹر لندن کے زیرِ اہتمام ہونسلو میں منعقد ہوئی۔ جس میں انگلستان میں مقیم اردو کے متعدد اہلِ قلم، علم و فن حضرات نے حصہ لیا اور اردو اور پنجابی کے نامور شعراء نے اپنا کلام سنایا۔ ان میں بخش لائلپوری، بسمل کاشمیری، عبدالخالق بھٹی، ماجد لدھیانوی، سردار مہر مجن سنگھ اور سردار ندجیت سنگھ حسن پوری کے نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

پروفیسر آزاد کی ہندوستان روانگی سے قبل نوٹنگھم (انگلستان) میں حلقۂ ارباب ذوق کے زیرِ اہتمام

جگن ناتھ آزاد کے ساتھ ایک شام منائی گئی جس میں ڈاکٹر یعقوب مرزا، جناب ایم ریاست کونسلی
کونسلر نوٹنگھم اور عامی کاشمیری نے آزاد کے فکر و فن پر تقریریں کیں اور غلام قادر آزاد، مسعود احمد اللہ
بُلبل کاشمیری نے جگن ناتھ آزاد کی نظم و نثر کے بارے میں مقالات پیش کیے۔

منتظمین کی فرمائش پر ڈاکٹر جگن ناتھ آزاد نے اقبال کے فلسفے اور شعریات پر لیکچر دیا جو تقریباً
ایک گھنٹہ جاری رہا۔ بعد پروگرام کا دوسرا دور مشاعرے کا تھا جس میں تمام شعراء نے حصہ لیا۔ لیکن
انہوں نے صرف تین تین چار چار اشعار ہی پیش کیے تاکہ جگن ناتھ آزاد کو زیادہ سے زیادہ سنا جا سکے۔
چنانچہ آزاد صاحب نے حاضرین کی فرمائش پر متعدد غزلیں اور نظمیں سنائیں۔ جن میں وہ طویل نظم
نظم بھی شامل تھی جو ڈاکٹر حمید اللہ نے اپنی اُس کتاب میں بھی شامل کی ہے جو آزاد کے منتخبہ کلام کے
فرانسیسی ترجمہ پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے وہ طویل مسدس بھی پیش کیا جس میں انہوں نے خود اپنی
شاعری کا تجزیہ کیا ہے اور جس میں اس طرح کے اشعار آتے ہیں

دیوانگی کو دل میں جو پالے ہوئے ہوں میں ؛ اس کو بہ فیضِ عقل سنبھالے ہوئے ہوں میں
میرا لہو تھا وہ مرے نغمے کی مے نہ تھی ؛ ہوں معترف کہ وہ ترے پینے کی شے نہ تھی
اک نظم ایک رنگ کی تصویر ہی تو ہے ؛ اک شمع ایک صبح کی تنویر ہی تو ہے
غم بھی ملا خوشی کے بہانے لیے ہوئے ؛ سینے میں درد لب پہ ترانے لیے ہوئے
دل سرنگوں ہے عقل کے دربار میں کبھی ؛ آوارہ حسن و عشق کے بازار میں کبھی

جلسے اور مشاعرے کے خاتمے پر صاحبِ صدر جناب مقصود الٰہی شیخ نے اپنی تقریر میں کہا
کہ جگن آزاد کا لیکچر اقبال اور اقبالیات کے متعلق نئے خیالات اور افکار سے لبریز تھا انہوں نے کہا
جگن ناتھ آزاد نے نوٹنگھم میں تشریف لا کر اور اقبال پر لیکچر دے کر اور اپنا کلام سنا کر جس طرح ہمیں
مستفید ہونے کا موقع دیا ہے اُس کا شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہے اس لیے
حاضرین سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ کھڑے ہو کر آزاد صاحب کو خوش آمدید کہیں اور اُن کا استقبال
کریں چنانچہ حاضرین کھڑے ہو کر انتہائی عالم جوش و مسرت میں پانچ سات منٹ تک پُر زور تالیاں

باقی صفحہ پر

محترم تسلیم

ایک تازہ نظم "شب دراب" کے لیے حاضر ہے

غیر مطبوعہ ہے۔ مطمئن رہیں

امید کہ آپ بخیریت سے ہوں گے

نیاز مند

ملک رام ۔۔۔ (دستخط)

شعبۂ اردو، جموں یونیورسٹی۔ جموں ۱۸۰۰۰۱

نظم

یورپ میں چند روز جو میرا قیام تھا
رنگِ سحر عجیب تھا، عجب رنگِ شام تھا

آزاد! اُس قیام کا اب کیا بیاں کروں
ہر لمحہ جیسے کیف مئے لالہ فام تھا

سرور و چپاؤلہ سے جدا ہو کے جب چلا
یادوں کا اک ہجوم تھا، اک اژدھام تھا

دل ہے انہی کی یاد سے پیمانۂ نشاط
پیمانۂ سرور انہی دو کا نام تھا

ماہِ سفر میں تھا جو مرا دوسرا پڑاؤ!
مہر و خلوص و صدق و محبت کا دام تھا

شمشیر سنگھ شیر[3] کی مہمان نوازیاں
ہر صبح و شام جن میں نیا اہتمام تھا

باتیں وہ اُس کی بادۂ اخلاص سے سبو
اُس کا سخن شرابِ محبت کا جام تھا

عُرفی جو کہہ گیا ہے وہ میں کس طرح کہوں
عرفی تو کاروانِ سخن کا امام تھا

"کیا دن تھے جب حلال تھی مجھ کو مئے نشاط[4]
کیا دور تھا کہ بادۂ غصہ حرام تھا"

ہوتا جو عزم پیرس و لندن نہ سامنے
رُکتا میں اور بھی کہ بہت شاد کام تھا

دن یوں گزر گئے کہ ہوں لمحاتِ جشنِ صبح
میں کیا کروں کہ وقت بہت تیز گام تھا

—★—

کوپن ہیگن (ڈنمارک)
۲۴ جولائی سنہ ۹۰ء

[1] جمشید مسرور مدیر "بازگشت" ماہنامہ اوسلو (ناروے)
[2] اُردو کے مشہور افسانہ نگار ہرچرن چاؤلہ
[3] اُردو اور پنجابی کے مقبول و معروف شاعر
[4] مئے نشاط حلال و شراب غصہ حرام (عُرفی)

رؤف خیر ۔ لکچرر ۔ سینٹ الحجر بسالار جنگ گولکنڈہ ۔ حیدرآباد

غزلیں

میں کانچ کا گھر ہوں مجھے پتھر سے بچانا
باہر سے بچانا مجھے اندر سے بچانا

ممکن ہے اسے جذب تو کرنا ہے اسے جذب
دریا کو بھلا کیسے سمندر سے بچانا

رستے میں مسافر کو کہیں نیند نہ آئے
یوں نعرۂ اسباب بسر سے بچانا

سرتا بقدم میں تو فقط ایک بھرم ہوں
پڑ جائے جو چھوٹی اسی چادر سے بچانا

آئے جو کوئی حرف تری کوزہ گری پر !
میں ٹوٹ نہ جاؤں کہیں ٹھوکر سے بچانا

سچ پوچھو تو ایک اپنی ہی مٹی میں مزہ ہے

تو دوست ہے دشمن کے حوالے مجھے مت کر
میں تیرا ہوں یا رب مجھے ہر شر سے بچانا

بکتی نہیں فقیر کی جھولی ہی کیوں نہ ہو
چاہے رئیسِ شہر کی بولی ہی کیوں نہ ہو

احسانِ رنگِ غیر اٹھاتے نہیں کبھی !
اپنے لہو سے کھیل وہ ہولی ہی کیوں نہ ہو

سچ تو یہ ہے کہ ہاتھ نہ آنا کمال ہے
دنیا سے کھیل آنکھ مچولی ہی کیوں نہ ہو

ہے آسماں وسیع ، زمیں تنگ ہی سہی
تعمیر کر کہیں کوئی کھولی ہی کیوں نہ ہو

حق پر جو ہے وہی سرو شانہ بلند ہے [لہ]
ہے ورنہ بے بساط وہ ٹولی ہی کیوں نہ ہو

دریا کی کیا بساط کہ مجھ کو ڈبو سکے
کشتی کہیں کہیں مری ڈولی ہی کیوں نہ ہو

تلخی میں بھی مزہ ہے جو تو خوش مذاق ہے
پک جائے تو بھلی ہے نمبولی ہی کیوں نہ ہو

کچھ تو حدیثِ خیر سمجھنے کے کر جتن
ہر چند بے مزہ مری بولی ہی کیوں نہ ہو

لہ Head & Shoulders above.

غزلیں

فروغ روہوی
مولانا شوکت علی روڈ
کلکتہ ۷۳

آنکھ جو دیکھے منظر لکھنا
ہوتا ہے کیا اکثر لکھنا
امبر کو جب چادر لکھنا
دھرتی کو پھر بستر لکھنا
امن داماں کے شیش محل پر
کس نے پھینکا پتھر لکھنا
دو فرقوں کے ہنگاموں میں
دھرم تھا اک افسر لکھنا
دنگے میں بہنوں کے سر سے
کس نے لوٹی چادر لکھنا

یاد فروغ اس کی آتے ہی
گزری ہے کیا دل پر لکھنا

ڈاکٹر انشاء الرحمن انشا
ناگپور

پتھروں کی بارشیں ہیں کانچ کے پیکر بچاؤ
جس طرح ممکن ہو یارو اپنے اپنے سر بچاؤ
داغ لگ جانے کے امکاں کی نہیں کوئی کمی!
اپنی اپنی اُجلی اُجلی خوشنما چادر بچاؤ
آگ کے شعلوں سے اپنے گھر بچاتے ہیں سبھی!
بات تو جب ہے کہ اس سے دوسروں کے گھر بچاؤ
آندھیوں کی زد پہ ہے ہر دم چراغِ زندگی
ہمتوں سے کام لے کر اس کو بڑھ بڑھ کر بچاؤ
عظمتِ انسانیت کا پاس رکھنا ہے تو پھر
آدمی کے خوں سے اپنا دامنِ اطہر بچاؤ
ہے یہی زندہ دلی کا ایک ہلکا سا ثبوت!
آبروئے زیست فرطِ غم میں ہنس ہنس کر بچاؤ
فی زمانہ وقت کے تیور بڑے سنگین ہیں
ان کی ضربوں سے دلوں کے شیشہ و ساغر بچاؤ
وار کرتے ہیں غزل پر اہلِ جدت تو کریں!
تم تو انشا اس کی عظمت بادلِ مضطر بچاؤ

غزلیں

افسر رومانی
جمیل شفیق
آصف نگر ـ مہدی پٹنم ـ حیدرآباد

رؤف رحیم بشر نگر حیدرآباد

(برسات کی مناسبت سے) :-

برسات کا موسم آتے ہی اک تیر جگر میں کھٹکا ہے
یہ زخم عنایت ہے اُن کی یہ درد اُسی نٹ کھٹ کا ہے
بھولا ہے ناکر کنا کیا شکوہ ہے ہم ان کی نگاہیں دیکھ چکے
اُس برق کا گرنا کچھ بھی نہیں انداز اُسی کی ہٹ کا ہے
برسات میں بھیگے سب کے بدن اک آگ لگا دیں پانی میں
آنکھوں کو بچانا میرے خدا کیا منظر اس پنگھٹ کا ہے
گھنگھور گھٹائیں چھائی ہیں اور چاند بھی ہے بدلی میں چھپا
یہ جادو ہے اُن زلفوں کا یا تھاپ اُسی گھونگھٹ کا ہے
اس موسم میں اے ساقی مرے بھر جام مرے بھر جام مرے
اب مند رہیں اور جام اٹھیں کھولا نہ یہ اب تلچھٹ کا ہے
کیا مانگے دنیا کی خوشیاں کیا ڈر ہو اُسے پھر عقبیٰ کا
جس در سے مرادیں ملتی ہیں بندہ بھی اُسی چوکھٹ کا ہے
یہ حال ہوا ہے اب میرا ایک ایک دن میں اُس کا بھرتا ہوں
کہتے تھے رحیم اب تک جس کو کیا سبب کسی مرگھٹ کا ہے

دل گرفتہ ہوں مجھے کب تک یوں ہی الجھائے گا
بے سبب اس طرح مجھ سے روٹھ کر کیا پائے گا
بے ہنر، بے ذوق، بے دل یوں تراشوں گی تجھے
آتے آتے ایک دن تو راہ پر آ جائے گا
سمٹ جاتی ہے محبت جب ہوس ہو درمیاں
پیار کے متلاشی دل کو کون یہ سمجھائے گا
بجھ رہا ہے دل مرا بے مہری تیری دیکھ کر
بے رخی میں بھی جو کر لوں دل ترا گھبرائے گا
عمر بھر جلتی رہی ہوں صرف لے کر اک یقیں
راستے میں ایک دن تیرا بھی گھر آ جائے گا
کیوں نہیں لیتا کبھی دل سے نکل جانے کا نام
الجھنیں بڑھ جائیں تو کیونکر انھیں سلجھائے گا
دوست، ہمدم، باوفا مجھ سا نہ پاؤ گے کہیں
چھوڑ کر میاں کو تو عمر بھر پچھتائے گا

ماہنامہ

شاداب

حیدرآباد

Rs 6/=

جلد ([illegible]) شمارہ (۱۲) ڈسمبر سنہ ۱۹۹۰ء حیدرآباد

ایڈیٹر: محمد قمرالدین صابری

جائنٹ ایڈیٹر: رشید الدین

مینجنگ ایڈیٹر: کلیم الدین احسن

مجلسِ مشاورت :—

محترمہ فاطمہ بیگم رباب — یوسف ناظم — ڈاکٹر محمد یوسف الدین — پروفیسر رضی الدین احمد

خواجہ منظور احمد منظور — محترمہ سعیدہ مہر — ڈاکٹر منشاالرحمٰن خان منشا — پروفیسر ترار عباس علی

منیر احمد صدیقی

شرحِ تعاون :—

	ہندوستان	خلیجی ممالک	امریکہ	انگلستان	پاکستان
[illegible]	65 روپے	200 روپے	40 ڈالر	25 پونڈ	175 روپے
[illegible]	120 "	360 "	70 "	45 "	300 "
[illegible]	1500 "	3700 "	700 "	400 "	3000 "

(ترسیل زر کا پتہ)

ماہنامہ "شاداب" 147-5-11 ریڈ ہلز۔ حیدرآباد ۴

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر محمد قمرالدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان سے چھپاکر دفتر شاداب 147-5-11 ریڈ ہلز۔ حیدرآباد سے اے پی سے شائع کیا۔

فہرست

اسلامی تصوف قسط ۵	سید عروج احمد قادری	۲
علم النفس	سید غلام محمد کیفی شاہ نظامی	۸
حج اور عمرہ	عمر صدیقی	۱۳
روس میں اسلام	—	۱۷
اسلامی بنک کاری، فاضل رقومات....	محمد خورشید الحسن	۲۴
اردن کے ولی عہد شہزادہ حسن بن طلال	کے۔ ایس۔ شفیق	۳۰
عراقی جارحیت اور کویتی عوامی کانفرنس	—	۳۴
مولانا ابو الکلام آزاد	ڈاکٹر شنکر دیال شرما	۳۶
سروجنی نائیڈو کی نظموں کے اردو ترجمے	ڈاکٹر حسن الدین احمد	۴۰
کویت سے بذریعہ موٹر کار واپسی	علی احمد عمر صدیقی	۴۷
کویت پر صدام کی یورش	نذر الحفیظ ندوی ازہری	۵۰
اردو کیا کہتی ہے	ڈاکٹر کے بھگتہ وتسل راؤ	۵۳
غزلیں	ڈاکٹر منت الرحمن خان منت	۵۹
نظم اینٹ	عزیز بھارتی	۶۰
غزلیں	عزیز ناگپوری، سلطان احمد [illegible]	۶۱
نظم	سروجنی نائیڈو	۶۴

سید عروج احمد قادری قسط ۵

اسلامی تصوف

نیّت :- امام غزالیؒ نے احیاء علوم الدین میں اخلاص سے پہلے ایک مستقل باب میں نیت پر مفصل گفتگو کی ہے اس لیے کہ اخلاص کا تعلق نیت ہی سے ہے اور نیت کا محل قلب ہے مناسب معلوم ہوا کہ ہم بھی پہلے نیت ہی پر گفتگو کریں۔ امام نوویؒ نے بھی ریاض الصالحین کی ابتدا نیت، اور اخلاص ہی کے باب سے کی ہے۔

امام غزالیؒ نے لکھا ہے :- "نیت" ارادہ، قصد۔ یہ تینوں الفاظ ایک ہی معنی کے لیے بولے جاتے ہیں ہر عمل یعنی ہر اختیاری حرکت و سکون تین چیزوں سے پورے ہوتے ہیں۔ علم، ارادہ اور قدرت۔ انسان اسی چیز کا ارادہ کر سکتا ہے جس کا اسے علم ہو کسی چیز کو جانے بغیر اس کا ارادہ نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح انسان کسی چیز پر عمل نہیں کر سکتا۔ جب تک اس کا ارادہ نہ کرے۔ علم اور ارادے کے باوجود کوئی عمل وجود میں نہیں آ سکتا جب تک انسان کو اس کی قدرت نہ ہو۔ مثلاً جس کے ہاتھ پاؤں مفلوج ہوں وہ علم و ارادہ کے باوجود نہ کسی چیز کو اٹھا سکتا ہے اور نہ کہیں جا سکتا ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ کسی چیز پر عمل کرنے کے لیے پہلے اس کا علم ضروری ہے، اس کے بعد اس کا ارادہ پیدا ہوتا ہے پھر اسے وجود میں لانے کی قدرت، حاصل ہو تو وجود میں آتی ہے۔۔۔ یہیں سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کسی چیز پر عمل کرنے کی نیت یا ارادہ و قصد کی غرض اور اس کا مقصد کیا ہے

نیت کا ایک تعلق تو اس کام سے ہوتا ہے جو کوئی شخص کرنا چاہتا ہے مثلاً نماز، روزہ، صدقہ وغیرہ

اور دوسرا اشتق اس غرض اور مقصد سے ہوتا ہے جس کے لیے انسان وہ کام کرنا چاہتا ہے۔ نماز پڑھنے کی غرض یہ ہو سکتی ہے کہ لوگ نمازی کہیں اور احترام کریں اور یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کی جائے اور وہ اس سے خوش ہو۔ باب اخلاص میں نیت کا لفظ اسی دوسرے تعلق کے ساتھ بولا جاتا ہے۔ نماز نیت کے بغیر صحیح نہیں ہوتی اور نماز نیت کے بغیر قبول نہیں ہوتی۔ پہلا جملہ لفظ نیت کے پہلے معنی کو ظاہر کرتا ہے اور دوسرا جملہ اس کے دوسرے معنی کو۔ قرآن کریم میں ارادہ کا لفظ غرض اور مقصد کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ (الانعام: ۵۲) — اور مت دھتکارو ان لوگوں کو جو پکارتے ہیں اپنے رب کو صبح و شام چاہتے ہیں اسی کی رضا۔

اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِى الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ۔ (المائدہ: ۹۱) — شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ ڈالے تم میں دشمنی اور بیر شراب اور جوا کے ذریعہ۔

ان دونوں آیتوں میں "ارادہ" غرض اور مقصد ہی کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور یہی وہ نیت ہے جو کسی عمل کو عنداللہ مقبول یا مردود بناتی ہے۔

نیت پر اعمال کے دار و مدار ہونے کا ثبوت حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی مندرجہ ذیل حدیث میں ہے جس کو احیاء العلوم اور تصوف کی دوسری کتابوں میں بھی بطور دلیل پیش کیا گیا ہے:

"امیر المومنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے کہا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ اعمال کا اعتبار نیتوں سے ہوتا ہے اور ہر شخص کے لئے وہی کچھ ہے جس کی اس نے نیت کی تو جس کی ہجرت اللہ اور رسولؐ کی طرف ہے اس کی ہجرت اللہ و رسولؐ ہی کی طرف ہو گی اور جس کی ہجرت کوئی دنیوی فائدہ حاصل کرنے کے لئے یا کسی عورت سے نکاح کرنے کے لئے ہے تو وہ اسی کے لئے ہو گی جس کی طرف اس

نے ہجرت کی: سلہ (سلہ ریاض الصالحین باب اخلاص)

بخاری و مسلم کی یہ حدیث جس کی صحت پر تمام محدثین و علماء کا اتفاق ہے اہم ترین احادیث میں سے ایک ایسی حدیث ہے جس کو ہمیشہ اپنی نگاہوں کے سامنے رکھنا چاہیئے۔

اس حدیث کا سبب یا پس منظر یہ ہے کہ ایک شخص نے مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی اور اس کی غرض یہ تھی کہ وہاں ایک عورت سے شادی کرے۔ اسی موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حدیث ارشاد فرمائی تھی۔ اس عورت کا نام ام قیس تھا چنانچہ اس شخص کو "مہاجر ام قیس" کہا جانے لگا (نووی)۔

اس حدیث شریف کی روشنی میں اختصار کے ساتھ میں نیت کے اہم اور ضروری پہلو پیش کرتا ہوں۔ سب سے پہلی بات جان لینے کی یہ ہے کہ اس حدیث میں اعمال سے کون سے اعمال مراد ہیں۔ اعمال کی تین قسمیں ہیں۔ عبادات و طاعات۔ مباحات۔ سیئات۔

عبادات و طاعات میں نیکی کے تمام کام داخل ہیں۔ مباحات میں ہر جائز کام شامل ہیں اور سیئات میں تمام برے اعمال داخل ہیں — یہاں اعمال سے مراد پہلی دو قسموں کے اعمال ہیں سیئات، یعنی معاصی اور برے اعمال یہاں مراد نہیں ہیں۔ کیونکہ کوئی برا عمل کسی اچھی نیت سے اچھا نہیں ہو سکتا۔ فرض کیجئے کوئی ڈاکو اس نیت سے لوگوں کے اموال پر ڈاکے ڈالے کہ جو مال حاصل ہوگا وہ غریبوں اور حاجت مندوں میں تقسیم کر دے گا تو اس اچھی نیت کی وجہ سے اس کا عمل نیک اور اچھا نہیں ہو سکتا۔ اس پہلو کی طرف امام غزالیؒ نے بھی توجہ دلائی ہے،

"برائیاں نیت کی وجہ سے اچھائیوں میں تبدیل نہیں ہو سکتیں، لہٰذا "إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ" کے عموم کی بنا پر کسی جاہل کو یہ گمان نہیں ہونا چاہیئے کہ اچھی نیت کی وجہ سے معصیت، طاعت بن سکتی ہے۔ مثلاً کوئی شخص کسی دوسرے شخص کو خوش اور راضی کرنے کے لیے کسی کی غیبت کرے یا کسی دوسرے کا مال لے کر کسی فقیر کو کھلا دے یا کوئی مدرسہ، کوئی مسجد، کوئی مسافر خانہ، حرام سے بنائے اور نیت خیر کی کرے تو یہ سب جہل و نادانی کی بات

ہوگی' ان کاموں کو اچھی نیت 'ظلم' زیادتی اور معصیت ہونے سے خارج نہیں کر سکتی بلکہ جو چیزیں شرعاً ممنوع ہیں ان کو خیر کی نیت سے کرنا ایک دوسرا شر ہوگا۔ اگر کوئی شخص جان بوجھ کر ایسا کرتا ہے تو وہ شریعت کا معاند (دشمن) ہے اور اگر نہیں جانتا تو اپنے جہل کی وجہ سے گنہگار ہے کیونکہ خیر و شر کا علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے" لہ

(لہ احیاء العلوم ج ۴ ص)

اچھی اور بری نیت کا سوال طاعات و عبادات اور مباحات ہی میں پیدا ہوتا ہے طاعات و عبادات کی صحت و عنداللہ مقبولیت' دو چیزوں پر موقوف ہے۔ حسن نیت 'مطابقت شریعت یعنی نیت اچھی ہو اور عبادت 'شریعت کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق کی جائے۔ اگر ان دو چیزوں میں سے کوئی ایک چیز بھی غائب ہوگی تو عبادت' عبادت باقی نہیں رہے گی۔ البتہ جن عبادات و طاعات میں کوئی خاص طریقہ شریعت نے مقرر نہیں کیا ہے لیکن نماز سے باہر شریعت نے اس کے لئے خاص الفاظ یا کوئی خاص طریقہ مقرر نہیں کیا ہے۔ وہ زبان ہلائے بغیر دل میں بھی کی جا سکتی ہے۔ زبان سے ہاتھ اٹھا کر بھی کی جا سکتی ہے اور ہاتھ اٹھائے بغیر بھی کی جا سکتی ہے۔ اردو میں بھی کی جا سکتی ہے اور ہر زبان میں کی جا سکتی ہے۔

اچھی نیت کیا ہے؟ اس کی سب سے بہتر تعبیر یہ ہے کہ عبادت اور ہر نیک کام اللہ کی رضا اور اس کا تقرب حاصل کرنے کی غرض سے کیا جائے۔ عبادت اور اس میں حسن نیت کی ایک مثال زیر گفتگو حدیث میں بیان کی گئی ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد اس وقت کا ہے جب مکہ سے مدینہ 'ہجرت فرض اور بہترین عبادت تھی۔ جس کی ہجرت اللہ اور رسول کی طرف ہے' اس کی ہجرت اللہ اور رسول ہی کی طرف ہوگی"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس کی ہجرت اللہ کی رضا کے لئے اور رسول کے حکم کی تعمیل میں ہو اس کا اجر ثابت ہو گیا۔ اس کی شرح میں علامہ نووی نے لکھا ہے۔

معناہ من قصد بھجرتہ وجہ اللہ — اس کا مطلب یہ ہے کہ جس نے اپنی ہجرت سے اللہ کی رضا کا قصد کیا اس کا اجر اللہ کے ذمہ ثابت ہو گیا

وقع اجرہ علی اللہ

رضائے الٰہی کی طلب کے لیئے متعدد تعبیریں خود قرآن مجید میں آئی ہوئی ہیں کہیں اس کے لیے "وجہ اللّٰہ" کہیں اس کے لئے "رضوان اللّٰہ" کہیں "مرضات اللّٰہ" کہیں اس کے لیئے جہنم سے استعاذہ کی تعبیر اختیار کی گئی ہے اور کہیں حصول جنت کی ترغیب دی گئی ہے۔ کہیں عذاب الٰہی خوف اس کی تعبیر ہے اور کہیں رحمتِ الٰہی کی امید اور کہیں اس کے فضل کی طلب ــــ حاصلِ کلام یہ ہے کہ ہر وہ کام جو آخرت کی کامیابی حاصل کرنے اور وہاں کی ناکامی سے بچنے کی غرض سے کیا جائے وہ سب حُسنِ نیت میں داخل ہے۔

صوفیہ کے کلام میں یہ بات ملتی ہے کہ جنت کی طلب کے لئے کوئی کام کرنا اعلیٰ درجہ کی نیت سے نیچے اُتر آنا ہے ان کی یہ بات اتنی مشہور ہوگئی کہ غالب جیسا شاعر بھی یہ کہہ گذرا ہے۔

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

صوفیہ کی اس بات کے لیے صرف یہی نہیں کہ کتاب و سنت میں کوئی دلیل موجود نہیں ہے بلکہ یہ کتاب و سنت کی تصریحات کے خلاف ہے۔ قرآن میں حصول جنت کے لیے عمل کرنے کی ترغیب بھی موجود ہے اور انبیاء کرام علیہم السلام کی دعاؤں میں بھی جنت کی طلب موجود ہے انبیاء سے بڑھ کر کون اللہ کا مقرب ہوسکتا اور ان سے بڑھ کر کس کی نیت اعلیٰ درجہ کی ہوسکتی ہے۔

سورہ والصّٰفّٰت میں جنت کی نعمتوں کا ذکر کرنے کے بعد کہا گیا ہے:

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ۝ لِمِثْلِ هٰذَا فَلْیَعْمَلِ الْعٰمِلُوْنَ ۝ (رکوع ۲)

بے شک یہی ہے بڑی مراد ملنی، ایسی چیزوں کے واسطے چاہیئے محنت کرنے والے۔

سورہ التطفیف میں جنت کی نعمت اور وہاں کی شراب کا ذکر کرنے کے بعد کہا گیا ہے۔

وَفِیْ ذٰلِكَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ ۝

جو لوگ دوسروں پر بازی لے جانا چاہتے ہیں وہ اس چیز کو حاصل کرنے میں بازی لے جانے کی کوشش کریں۔

موحدوں کے امام و سردار سیدنا ابراہیم علیہم السلام کی دعاؤں میں سے ایک دعا یہ ہے

وَاجْعَلْنِیْ مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِیْمِ ۝ (الشعراء رکوع ۵)

اور مجھے جنت کے وارثوں میں شامل کرنا۔

(باقی آئندہ شمارے میں)

سید غلام محمد کیفی شاہ نظامی
محلہ آغاپورہ ۔ حیدرآباد

عِلمُ النَّفَس

علمُ النَّفَس تمام علوم کا سرتاج ہے علم النفس کے بعد پھر کسی علم ظاہری کی ضرورت نہیں رہتی علم دینی اور قدرت کی فیاضی دیکھئے کہ علم النفس جہاں تمام علوم باطنی کا مخزن ہے وہاں آسان بھی اس قدر ہے کہ تعلیم و تعلم کی شدید ضرورت نہیں رہتی۔ یعنی جس قلب میں روشنی پیدا ہو جاتی ہے تو وہ خود مشعلِ راہ بن کر رہنمائی کرتی جاتی ہے اور منزلِ روحانی کی تاریکی دور ہو جاتی ہے اور آخر معرفتِ کامل سے ہمکنار کر دیتی ہے اس میں صرف توجہ اور مشق کی ضرورت ہے بظاہر نفس ایک معمولی جزو اور مدِ حیاتِ انسانی کی بنیاد ہے لیکن اسی سانس کے آمد و رفت میں علوم و فیوضِ باطنی کے بے پناہ سمندر موجزن ہیں "سانس" کی آمد و رفت کے دو راستے ہیں ایک عارضی اور دوسرا حقیقی۔ عارضی تو منہ ہے اور حقیقی ناک کے دونوں نتھنے ہیں دونوں نتھنے حقیقت میں چاند اور سورج ہیں اور چاند سورج پر ہی دنیا کا انحصار ہے ہم کو قدرت نے چاند سورج مفت میں دے دیئے ہیں مگر ہزاروں میں ایک بھی اس خزانۂ قدرت کی حقیقت سے واقف نہیں ہوتا۔ اس علم کے طفیل میں انسان خدا اور رسول تو نہیں بن سکتا مگر اس کے علاوہ اور سب کچھ بن سکتا ہے یہاں تک کہ فرشتوں پر بھی سبقت لے جاتا ہے مختصر یہ کہ معرفت اور حقیقت کے اکثر و بیشتر راز اس میں پوشیدہ ہیں لہٰذا قرینِ عقل ہی ہے کہ اس علم سے کماحقہ ربط پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔

انسان میں جو نَفَس (سانس) کا زیر و بم چل رہا ہے یہ ایک قدرتی گھڑی ہے جس طرح

گھڑی سے وقت کا پتہ چلتا ہے اسی طرح سانس سے زندگی کا اُتار چڑھاؤ اور واقعات، حادثات اور حالات معلوم ہوتے ہیں مگر جس طرح گھڑی اس شخص کے حق میں بیکار ہے جو گھڑی کے ہندسوں سے واقف نہیں اسی طرح سانس کی آمد و رفت سے وہ شخص بے خبر ہے جو اس علم سے واقف نہیں علم النفس ایسا مکمل علم ہے کہ جو شخص اس علم سے واقفیت حاصل کرے۔ اسے نجوم، رمل، جعفر وغیرہ کی حاجت ہی نہیں رہتی۔ علم النفس حقیقتاً معارف و حقائق اور اخبار و آثار کا ایک مکمل خزانہ ہے چونکہ قدرت کے تمام قوانین سہل اور آسان ہوتے ہیں اس لئے اس لئے اس میں علم نجوم کی سی پیچیدگیاں اور ضرب و تقسیم کی ضرورت نہیں اس میں نہ جعفر کی طرح تکسیر و زمام کی حاجت ہے اور نہ رمل کی طرح ضرب در ضرب کا الجھاؤ ہے یہ علم کس قدر مفید ہے اور کس طرح نوائب، مصائب حوادثات اور انقلابات کا قدرتی الارم ہے غرض کہ بہت سے مسائل کا سرچشمہ ہے۔

علم سرودھا (علم النفس) وہ علم ہے جس میں سانس اور دم کی حقیقت پنہاں ہے پاس انفاس اور حبس دم کا رواج دنیا میں ہمیشہ سے چلا آتا ہے اور اسلام نے بھی اس کو اپنایا ہے لیکن فقراء، یوگی اور حکماء اس علم کو اپنے سینہ میں رکھ کر دنیا سے رخصت ہو گئے حالانکہ یہ علم دنیاوی مطالب و مقاصد اور اخروی سرمایہ فراہم کرنے کا بہترین ذریعہ ہے بلکہ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ علم النفس ایک نعمتِ عظیم ہے جو پروردگار عالم کی طرف سے بندوں کو مفت عطا ہوئی ہے لیکن قدرت کا ایک قانون یہ بھی ہے کہ انسانی ضروریاتِ زندگی تمام کی تمام مفت ہی عطا ہوئی ہیں مثلاً پانی، ہوا، لوہا، سونا، چاندی وغیرہ۔ یہ سب قدرت نے مفت ہی اور بہ افراط دیئے ہیں دنیا والوں نے اپنی طاقت و قوت کے بل پر انہیں اپنی گرفت میں لے رکھا ہے یہ بھی تسلیم شدہ امر ہے کہ مفت کی شئے بے قدر ہوتی ہے چاہے وہ کتنی ہی قابلِ عزت و عظمت ہو۔ علم النفس بھی قدرت کا خزانہ ہے مگر اس کے شائق اور تلاش کرنے والے بہت کم بلکہ عنقا ہیں

قدرت نے دونوں نتھنے نا ک حکمت سے ہی رکھے ہیں قرآن پاک میں ہے کہ ہم نے ہر شے کا جوڑا بنایا ہے اب دیکھو کہ کان دو ہیں، آنکھیں دو ہیں منہ ایک ہے مگر اس ...

بہت پائے جاتے ہیں اسی طرح ناک ایک ہے تو اس میں دو نتھنے موجود ہیں سانس لینے کو ایک ہی سوراخ کافی تھا مگر قدرت نے دو سوراخ کسی نہ کسی حکمت ہی کے تحت بنائے ہیں ہم اس عالم الغیب کی حکمت کو نہیں جان سکتے۔ ہر شئے کی ماہیت وہی جانتا ہے جس نے وہ شئے بنائی۔ مگر سانس کا نتھنے سے نتھنے میں تبدیل ہونا کوئی راز ضرور ہے۔ اسی راز نے علم النفس کی بنیاد ڈال دی اور اگلے وقتوں میں لوگ اپنی عمر کا بیشتر حصہ اس کی جستجو میں صرف کیا اور جو ان کے تجربے میں آیا تھا مگر ہم کسی طرح بھی ان احکام کو جو لگائے جاتے ہیں مطلق نہیں سمجھتے۔ کثرت پر اعتبار کیا جاتا ہے۔

چاند کی پہلی تاریخ کو طلوع آفتاب کے وقت ہمیشہ دو گھنٹے کے قریب داہنا نتھنا چلتا ہے اس میں کبھی فرق نہیں آتا اور چودھویں کا چاند پورا ہو کر دوسرے دن سے کم ہونا شروع ہوتا ہے اس کی پہلی تاریخ کو سورج نکلتے وقت بایاں نتھنا چلتا ہے جو تقریباً دو گھنٹے تک جاری رہتا ہے یہ قدرتی چال ہے اگر کسی موقع پر یہ رفتار تبدیل ہو جائے تو اس دن کوئی سانحہ یا حادثہ پیش آئے گا۔ یہ قدرتی تقسیم ہے اس میں شاید ہی کبھی فرق واقع ہو۔

نفس قدرت کا ایک سربستہ راز ہے اور ایسا عقدہ لاینحل ہے جو نہ آج تک حل ہو سکا اور نہ ہی رہتی دنیا تک اس کا حل ہونا ممکن ہے نفس۔ سکون فا اور نفس بفتحہٗ فا لغت میں دونوں طرح مستعمل ہے نفس بفتحین بمعنی دم (سانس) آیا ہے اور وہ جذب کرنا نسیم کا ہے ناک یا منہ کے ذریعے اور بفتحہٗ اول و سکون ثانی بمعنی آلات تناسل بھی مستعمل ہونا ثابت ہے غرض کہ کتب میں مختلف تصریح کی گئی ہے فی زمانہ بمعنی سانس مستعمل ہے اور بنیادِ حیات ہے روح اور نفس دونوں علیحدہ چیزیں ہیں روح منقسم نہیں اور نفس منقسم ہے قرآن پاک میں نفس کی تقسیم کی گئی ہے یعنی نفس امارہ نفس مطمئنہ اور روح کا قانون جدا بتایا گیا ہے روح کو روح ہی کہا گیا ہے حکماء کا قول ہے کہ روح ایک جوہر لبسیط ہے اور بذات ادراک معقولات کرتا ہے لیکن بعض حکماء کی تحقیق یہ ہے کہ روح براعتبارِ ذات واحد اور باعتبارِ صفات منقسم ہے بہرحال یہ تو حکماء کے خیالات ہیں اور ہم کو

سے چنداں تعلق نہیں ہے ہم تو ظاہری شئے کو جانتے ہیں اور اسی سے نتیجہ اخذ کرتے ہیں ناک کے دو نتھنے (سوراخ) ہیں ان میں سے ایک کھلتا ہے تو دوسرا بند ہو جاتا ہے اور یہ کھلنا اور بند ہو جانا چلتا رہتا ہے جو نتھنا اس وقت چل رہا ہے تھوڑی دیر میں آپ دیکھیں گے کہ یہ بند ہو گیا اور دوسرا چلنے لگا یہ بسط و کشاد سوتے جاگتے ہر وقت جاری رہتا ہے اور اسی بسط و کشاد نے ہمیں دکھایا کہ اس میں کوئی راز ضرور ہے اور اسی پر علم النفس کی بنیاد قائم ہے اور اب یہ ایک مستقل اور علیحدہ علم قرار پاتا ہے۔

جن اصحاب کے پاس اپنی سانس کا حساب ہے اور جن اصحاب نے اپنے نفس پر عبور اور تصرف حاصل کر لیا ہے وہ اپنے نفس کے جزر و مد سے بہت سے فوائد حاصل کرتے رہتے ہیں لیکن جن اصحاب کو علم النفس سے کوئی سروکار نہیں ہے اُن کے نزدیک سانس لینا زندگی ہے اور بس۔ اس میں شک نہیں کہ سانس کا کام ہی زندگی ہے اگر اس کے مد و جزر اُتار چڑھاؤ اور تبدیلی میں ہزار دو ہزار افسانے بیان کیئے جاتے ہیں۔ سانس دن رات ایک رفتار پر نہیں چلا کرتی اور اسی تبدیلی کے ماتحت آپ کی طبیعت بھی دگرگوں ہوتی رہتی ہے جس طرح سانس ایک حال پر نہیں رہتی اسی طرح آپ کا مزاج بھی ایک حال پر نہیں رہتا۔ بعض وقت آپ کو بات بات پہ غصہ آجاتا ہے خواہ مخواہ بھی مزاج میں روکھاپن پیدا ہو جاتا ہے یہاں تک کہ بعض اوقات اچھی بات بھی بُری لگتی ہے۔ مزاج چڑچڑا ہوتا ہے لیکن دوسرے وقت یہی مزاج نرم اور صلح پسند ہوتا ہے غصہ والی بات پر بھی غصہ نہیں آتا۔ لبوں پر ہنسی خواہ مخواہ کھیلتی رہتی ہے جب مزاج میں سختی اور گرمی ہو تو اس وقت زحل یا مریخ کی حکومت ہوتی ہے اور جب مزاج میں لطافت اور خوش طبعی پیدا ہوتی ہے تو اس وقت زہرہ یا مشتری کی حکومت ہوتی ہے علم النفس پر عبور رکھنے والے سانس کی رفتار سے معلوم کر لیتے ہیں کہ اس وقت فلاں ستارے کی ساعت ہے اور جب آپ طلوعِ آفتاب کے وقت سے حساب کرتے رہیں گے تو آپ پر اصل راز کا انکشاف ہو جائے گا اور یہ کوئی معمہ نہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ جو شخص ماہر علم ہوتا ہے اس پر

علم کے تمام راز ظاہر ہوتے رہتے ہیں لیکن جس شخص کو اس علم سے تعلق نہیں وہ اس کی حقیقت اور ماہیئت سے بے خبر رہتا ہے۔

سطحی نظر سے دیکھا جائے تو ہر شئے میں بے ترتیبی محسوس ہوگا مگر جب انسان تعمق اور ژرف نگاہی سے کام لے تو معلوم ہوگا کہ اس بے ترتیبی میں بھی ایک خاص ترتیب ہے قدرت نے ہر شئے کو ایک خاص ترتیب سے بنایا ہے خالق کائنات کی کسی شئے میں بے ترتیبی نہیں ہو سکتی ایک لق و دق صحرا میں میلوں تک بے ترتیب حالت میں خودرو گھاس پات کا سلسلہ ہے جو بظاہر فضول اور ناکارہ معلوم ہوتا ہے مگر نظرِ حقیقت شناس جان سکتی ہے کہ ایک خاص ترتیب سے یہ بڑے کام کی چیز ہے جو

ہر گیا ہے کہ از زمیں دید ۔ وحدہ لاشریک لہ گوید

ایک ایک پتی، شاخ، جڑ قدرت کا شفاخانہ ہے اور تاثیر کے خزانے ہیں قدرت نے جو ترتیب سانس میں رکھی ہے وہ بھی حکمت سے خالی نہیں۔ سانس مدارِ حیات جاندار ہے پھر ایسی شئے جس پر دنیا قائم ہو حکمت سے خالی نہیں ہو سکتی۔ سانس کا دوسرا نام روح ہے اور روح کا مرکز وحدت سے متعلق ہو تو پھر اس کا عجائبات میں سے نہ ہونا محال ہے

ڈاکٹر منشا الرحمٰن خان منشا کا تازہ مجموعۂ کلام

"امر و نہی"

اشاعتی مراحل میں

ملنے کا پتہ " ماہنامہ شاداب " ریڈ ہلز - حیدرآباد ۴

محمد صدیقی
الالیکی، حیدرآباد

میں اور عمرہ

میں اور حظِ وصل خدا ساز بات تھی ❊ جان نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

کس نے مجھے پکارا؟ سنو ایک بے آب و گیاہ وادی سے اٹھی ہوئی صدیوں سے گونجتی ہوئی ایک سریلی آواز میں مجھے کوئی پکار رہا ہے۔

کون پکارے گا مجھے؟ جب کہ میں خود گوشِ نصیحت نیوش کے لئے ایک آواز بن کر رہ گیا ہوں۔

لمحہ بھر یہ خیال تھا یا لاشعور میں کسی گوشے نے کروٹ بدلی تھی ایک تصور تھا آیا اور گزر گیا۔ اور روشنی سے زیادہ تیز رفتار سے گزرنے والا وقت گزرتا رہا۔

چند ماہ پہلے کویت میں مقیم صاحبزادے علی احمد صدیقی کا خط ملا۔ لکھا تھا۔ "میں آ رہا ہوں آپ حضرات کے لئے عمرے کا انتظام کر لیا گیا ہے آپ امی بہن میں اور آپ کی بہو، پانچ ٹکٹوں کا انتظام ہو گیا ہے۔" خط پہچانتا ہوں، سوادِ خط سے بھی واقف ہوں، برسوں سے خط و کتابت ہو رہی ہے پھر یقین کیوں نہیں آتا۔ بیسیوں دلائل ہیں جن کی روشنی میں یقین مشکل ہو گیا ہے۔ ایک مجرم، باغی، مغرور کے لئے ایسے عظیم انعام کا اعلان؟ آخر باور آئے تو کیونکر آئے بہرحال دل و دماغ میں ایک کشمکش برپا تھی۔ کبھی لاشعور کے دھندلکوں سے آواز آتی۔ دیوانے سنتا نہیں۔ سلطانوں اور شہنشاہوں کی عادت یہی ہے کہ کبھی سلام کرو تو غضبناک ہو جاتے ہیں اور کبھی گالیاں کھا کر انعام سے نواز دیتے ہیں اور یہ تو اس سلطان کا معاملہ ہے جس کی سلطانی میں رحمتوں اور بخششوں کے لازوال خزانے موجود ہیں رحمتیں، عفو و کرم، عنایات و الطاف آخر کس کے لئے ہیں۔ دیکھتا نہیں ایک چرواہا اپنی سینکڑوں بکریوں کو چھوڑ کر اس ایک بکری کے پیچھے دوڑتا ہے جو باغی ہو کر ریوڑ سے بھاگ

ذاتی ہے۔ شاید یہ بلا تھیں اور پھر انہیں دھندلکوں میں، میں کھو جاتا ہوں دن بیتے گزرے کیسے گزرے نہیں معلوم وہ کیا تھیں، دنہاروں شام و سحر مشکوک اندیشے۔ ایسے میں فرزند علی احمد آ موجود ہوئے۔ عمرے کے لئے پانچ آدمیوں کے ٹکٹ میرے ہاتھ پر رکھ دیئے گئے۔ علی سلمہ نے اپنی رخصت میں یہ سمجھ کر پروگرام بنایا اور رخصت حاصل کی کہ حج کے ختم ہونے میں عمرے کے ویزے جاری ہونے لگتے ہیں لہذا انہوں نے ستمبر ۱۹۸۹ء میں رخصت حاصل کی اور حیدر آباد چلے آئے ہمارا لڑکا کویت سے آیا ہوا تھا اور ہم سب عمرے کے لئے جانے والے ہیں۔ یہ بات پھیلنے لگی۔ شدہ شدہ احباب و اقارب میں چرچے ہونے لگے۔ ہمدردوں کی طرف سے نیک تمناؤں اور خود غرضوں کی طرف سے طعن و طنز کی سوغاتیں وصول ہونے لگیں۔ اسی اثناء میں میں نے اپنے چھوٹے بھائی حیدر صدیقی مقیم جدہ کو بھی اطلاع دے دی کہ ہم سب بعزم عمرہ آ رہے ہیں پھر ہم سب مل کر حصول ویزا اور دیگر امور کی تکمیل کے لئے بمبئی پہنچے۔ سعودی قونصل ایمبیسی سے ربط پیدا کیا تو معلوم ہوا کہ نومبر ۱۹۸۹ء سے ویزے جاری ہوں گے۔ اس اثناء میں میں اپنے آپ کو تیار کر رہا تھا کہ پیشی ہوگی اس بارگاہ میں حاضر ہونا پڑے گا۔ عجیب منظر ہوگا۔ ایک سراپا خطا کار و گنہ گار [illegible] ہوں گے [illegible] تو کبھی رحمت عالم کی بارگاہ عالی کی جالی مبارک۔ ویزے بند ہیں اور میرا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں　　　کچھ نہ دوا نے کام کیا

دل و دماغ اعضاء و جوارح غرض کہ سارے حواس گویا معطل ہو گئے تھے مایوسی الجھن اور ناکامیوں کے سمندر میں ڈوبتا ابھرتا میں بھنور کی طرف جا رہا تھا یا ساحل کی طرف اس کا بھی ہوش نہ تھا۔ ایسے میں کسی نے جھنجھوڑ کر پکارا۔ سنو۔ میں تمہارا ماضی بول رہا ہوں۔ دیکھ لیا نا اپنے کرتوتوں کا نتیجہ۔ سات سو چوہے کھا کر بلی حج کو چلی تھی۔

عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومن　　　آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

کہاں سے چلے تھے کہاں پہنچے، ذرا سوچو تمہارا ماضی تمہاری عمر گزشتہ کی تاریخ ہے تم حال پہ مجبور ہو [illegible] ایک دھوکا اور ایک فریب کے سوا کچھ نہیں ایک لفظ [illegible] بے معنی [illegible]

چاہے کسی طرح بھی جسے قرار نہیں، ماضی کی تاریخ کی روشنی میں مستقبل کی فکر کرو۔ مستقبل ہی سب کچھ ہے۔ میں مغموم ہوں یا مسرور، مطمئن ہوں یا مضطرب، مجھے کچھ نہیں معلوم، میں سب کچھ بھول جانا چاہتا ہوں۔ گذشتہ کی یادیں آج کے حالات مجھے کچھ نہیں چاہیئے۔ بس اک گوشہ بے خودی مجھے دن رات چاہیئے۔ کہتے ہیں کہ بھول بھی ایک انعام ہے ورنہ کچھ حادثے ایسے ہوتے ہیں کہ اگر ان کی یاد قائم رہ جائے تو آدمی کا جینا محال ہو جائے۔ آہستہ آہستہ ناکامیوں کے بادل چھٹ رہے تھے اور حالات اعتدال پر آنے لگے تھے کہ میرے چھوٹے بھائی حمید صدیقی چیف آرکیٹکٹ حکومت جموں و کشمیر جو پنشن کے بعد جدہ میں مقیم تھے جنھیں میں نے اطلاع دی تھی کہ ہم لوگ حج و عمرہ آنے والے ہیں لیکن شاید وہ ان دنوں اپنے بچوں کے پاس امریکہ گئے ہوئے تھے اور امریکہ سے وہ سیدھے حیدرآباد پہنچے۔ یہاں بھی ان کا لڑکا رہتا ہے۔ مجھ سے ملنے آئے تو کہنے لگے۔ وہ آپ کے عمرے کا کیا ہوا۔ یا کچھ ایسی قسم کا فقرہ تھا۔ مجھے ان کی باتوں میں ایک قسم کا طنزیہ انداز نظر آیا جیسے کہ وہ مجھے میرے اعمال کا آئینہ دکھا رہے ہوں اور [illegible] کہہ رہے ہوں کہ "یہ منہ اور مسور کی دال" میں ان کا یہ [illegible] برداشت نہ کر [illegible] وہ [illegible] اعتبار سے بہت بڑے آدمی ہیں پھر بھی مجھ سے چھوٹے ہی نہیں بلکہ "چھوٹا بھائی ہے" میرے سینے کے داغ تازہ ہو گئے تھے میں نے تلخ لہجہ میں جواب دیا کہ اس معاملہ میں آپ گفتگو نہ کریں وہ عذرخواہی کرنے لگا لیکن میری آخری بات یہی تھی کہ میں اس موضوع پر کوئی بات کرنا نہیں چاہتا۔ بہرحال چند دنوں قیام کے بعد وہ جدہ واپس ہو گئے پھر وہاں سے انھوں نے لکھا کہ میں آمادہ ہو جاؤں تو وہ عمرے کے انتظامات کر دیں گے۔ میری انانیت کو انھوں نے پھر چھیڑا تھا۔ میں نے وہی جواب دیا جو بالمشافہ ان سے کہہ چکا تھا۔ کچھ دن گزرے تھے کہ حمید کا چھوٹا لڑکا جو حیدرآباد ہی میں رہتا ہے میرے یہاں آیا اور بصد اصرار میرا پاسپورٹ وغیرہ لے کر چلا گیا ہفتہ عشرہ گزرا ہو گا کہ پھر آیا اور کہنے لگا کہ تمام انتظامات مکمل ہو چکے ہیں دو ایک روز میں بمبئی چلنا ہو گا۔ میں خود بھی ساتھ رہوں گا آپ کو ہوائی جہاز میں سوار کرا کے واپس ہوں گا۔ جدہ [illegible] پورٹ پر ابا [illegible] آپ کے استقبال کے لئے

موجود ہیں گے کیا میں خواب دیکھ رہا ہوں کیا واقعی مجھے ایک اور ٹھوکر لگانا چاہتا ہے۔ نہیں معلوم۔

بھتیجے نے کہہ رکھا تھا کہ آپ کو کچھ بھی کرنا نہیں ہے صرف چلنا ہے کے لئے آمادہ رہئے میں کل گاڑی سے گھر جا رہا ہوں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ میرے بھائی حیدر کو جب میری ناراضگی اور خفگی کا علم ہوا تو اللہ نے شکریہ بہرحال وہ میری ٹوٹی ہوئی امیدوں کا بار آور کر کے رہیں گے چنانچہ انہوں نے حیدرآباد میں مقیم اپنے عزیز کو لکھا کہ خرچ و اخراجات کا لحاظ کئے بغیر جلد سے جلد اپنے تایا حضرت کے عمرے کا انتظام کر کے انہیں بمبئی تک اپنے ساتھ لا کر ہوائی جہاز پر سوار کر کے مجھے ذریعہ ٹرنک کال اطلاع دی جائے۔ چنانچہ اس بچے نے مکمل انتظامات کر کے مجھے ہر طرح کے آرام و آسائش کے ساتھ بمبئی اور وہاں سے جہاز پر سوار کر کے رخصت ہوا۔ جدہ ایئرپورٹ سے باہر آتے ہی حیدر اور اس کی بیوی اپنی کار لئے ہوئے موجود تھے۔ جدہ کے مشہور محلہ الحمرا میں حیدر کا مکان تھا ہم مکان پہنچے۔ حیدر اور ان کی بیوی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہر دو میری خاطر مدارت میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانا چاہتے ہیں گھر سے قریب ہی جدہ کی مشہور مسجد الحمرا واقع تھی وہیں نمازیں ہونے لگیں ایک دو روز آرام لے کر ہم نے حرم شریف کا احرام باندھا اور چل پڑے بھائی حیدر اور ان کی بیوی دونوں ساتھ تھے حیدر کی بیوی ایک عرصہ سے حجاز میں رہتے ہوئے حج اور عمرے وغیرہ کے احکام سے اچھی طرح واقف ہو چکی تھی چنانچہ راستہ تمام مجھے گائیڈ کرتی رہی حرم کے قریب پہنچے تو کہا کہ جوں ہی خانہ کعبہ پر نظر پڑے دعا کرنا وہ وقت قبولیت کا وقت ہوتا ہے ہماری موٹر کی اللہ کا گھر سامنے تھا۔ بھاوج نے کہا یہ باب السلام ہے مجھے دعا کرنا ہے لیکن کیسی دعا کس کے لئے؟ اپنے گناہوں کی مغفرت کے لئے۔ اپنے بھائی بھاوج کے لئے، ننھے ماں باپ اور سارے اہل و عیال کے لئے۔ ماضی کی داستانوں سے بھرپور ایک پورا عمر میرے دل و دماغ میں طوفان بپا کئے ہوئے ہے آخر میں کیا کروں۔ کس سے کہوں؟ اس سے جو سب کچھ جانتا ہے جو لطیف و خبیر ہے میری دعائیں، میری آرزوئیں، میری تمنائیں، گناہوں کا اعتراف توبہ استغفار ندامت کے سارے جذبات ایک نقطہ پر مرکوز ہو گئے تو دل ٹوٹ گیا اور آنکھیں پھوٹ [illegible] رہا تھا اور میرے ساتھ بھی رو رہے تھے نہ جانے کیوں مجھے اُمنڈ اُمنڈ کر

روس میں اسلام

روسی وسطی ایشیاء "اسلامی چیلنج" کے عنوان سے فار ایسٹرن اکنامک ریویو نے ایک تفصیلی رپورٹ شائع کی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ بخارا کے ۵۰۰ برس پرانے مدرسہ میں جو روس کا واحد اسلامی مذہبی کالج ہے ۱۲۵ طلباء زیر تعلیم ہیں جو وسطی ایشیاء کی مختلف قومیتوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ طلباء ۳۰ ہفتے کی تربیت حاصل کر رہے ہیں۔ نئے مدرسے کھل رہے ہیں اور مساجد کی تعمیر کی تعداد میں ڈرامائی اضافہ ہو رہا ہے جو نمازیوں سے بھری ہوتی ہیں ان حالات میں روسی مسلمانوں کی نئی نسل یہ محسوس کر رہی ہے کہ ۱۹۱۷ء کے انقلاب روس کے بعد پہلی سیاسی وقت ان کے ہاتھ میں ہے۔ دنیا میں اسلام کے احیاء کی تحریک ان دنوں وسطی ایشیاء زوروں پر ہے جو ماسکو کے لئے ایک سنگین سیاسی اور ثقافتی چیلنج کا باعث ہوگی۔

رپورٹ کے مطابق بخارا جو ازبکستان کی جمہوریہ میں واقع ہے قرون وسطیٰ میں دنیائے اسلام کا روحانی دارالحکومت رہا ہے قرون وسطیٰ میں اس شہر میں ۱۰۳ مدرسے اور ۳۶۰ مساجد تھیں اور یہاں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعزہ اور نامور صوفیائے کرام کے مدفن ہیں تاہم ۱۹۱۷ء کے بعد وہاں صرف تین مساجد اور ایک مدرسہ رہ گیا لیکن گزشتہ ۵ ماہ کے دوران ۵۰ نئی مساجد تعمیر ہو چکی ہیں اور صوفیاء کے مزار زائرین سے بھرے رہتے ہیں ازبکستان کی کمیونسٹ پارٹی نے بحالی کے پروگرام کا حکم دیا ہے جس کے بعد قدیم اسلامی یادگاروں کو مذہبی مقاصد کے لئے استعمال کیا جائے گا۔

ایک امام مسجد مختار جان نے کہا کہ روس میں اسلام کو ہمیشہ سیاست اور ریاست سے علیحدہ رکھا گیا لیکن اب نوجوان مختلف انداز میں دیکھ رہے ہیں۔ مختار جان ایک عربی مدرسے کے سربراہ ہیں اس مدرسہ کے طلباء نے میگزین (فار ایسٹرن اکنامک ریویو) سے روس سے باہر کی دنیا میں اسلامی بنیاد پرستی کے بارے میں سوالات کی

بوچھاڑ کردی۔ انھوں نے ایرانی انقلاب اور افغانستان کے مجاہدین کے بارے میں سوالات کئے۔ یہ ظاہر اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ ایک نئے عہد میں داخل ہو رہے ہیں ایک ازبک طالب علم نے نمائندہ سے کہا کہ خدا نے ہمیں نہیں چھوڑا۔ روس میں اس وقت جو سیاسی گندگی ہے اسلام اس میں سے نکلنے کی راہ بتائے گا۔ وہاں یہ بھی کہا گیا ہے کہ وسطی ایشیا کے آر پار ایک بار پھر بنیادی سیاسی بحث کا مرکز بن رہی ہے جمعہ کی نماز کے بعد الما آتا (قازقستان کا دارالحکومت) کی مساجد میں نوجوان مسلمان جنگجو مسلمانوں میں ایک نئے زیرزمین اخبار کی کاپیاں تقسیم کرتے ہیں اس اخبار آلاس (ALAS) کے پہلے شمارے میں اسلامی جمہوریہ ترکستان کے قیام کا مطالبہ کیا گیا ہے جو روس اور چین کے تمام ترک زبان بولنے والے علاقوں پر مشتمل ہوگی۔ اخبار تقسیم ہونے کے بعد کئی گھنٹوں تک عام لوگ اس بارے میں مساجد کے صحن میں نوجوان جنگجوؤں سے بات چیت اور بحث مباحثے کرتے رہتے ہیں مسلمانوں کی ایک نئی زیرزمین تحریک بھی قائم ہو چکی ہے جو ان بہت سی اسلامی اور قومی تحریکوں میں شامل ہے جو پریسترائیکا کے بعد سے روس میں جنم لے رہی ہیں۔

جنوری تک روس میں اسلامی سرگرمیاں ایک سرکاری مسلم ریلیجس بورڈ کی نگرانی میں ہوتی تھیں جو تاشقند (ازبکستان) میں قائم ہے تاہم الما آتا کے قاضی رذبیگ نسان بائی نے ایک چھوٹی سی بغاوت کر ڈالی اور الگ سے اپنا مذہبی بورڈ قائم کر ڈالا۔ انھوں نے خود کو قازقستان کا مفتی اعظم بھی مقرر کر ڈالا۔ وہ قازقستان کی سپریم سوویت کے ڈپٹی بھی ہیں اور انھوں نے اپوزیشن کی طرف سے ایٹمی ہتھیار کے خلاف مہم اور ماحولیاتی تحریک کی حمایت کر کے اپنی طاقت کا ایک موثر مرکز بھی قائم کر ڈالا۔ وہ اس سال بھی میں قازقستان کا پہلا مدرسہ قائم اور قرآن پاک کا قازق زبان میں ترجمہ بھی کر رہے ہیں اور ایک اسلامی ... کا اجراء بھی کر رہے ہیں۔ انھوں نے گزشتہ ۱۵ ماہ کے دوران عوامی تعاون سے ۲ نئی مساجد بھی تعمیر کیں جس کے بعد قازقستان میں مساجد کی تعداد ۹۰ ہو گئی ہے انھوں نے کہا کہ پریسترائیکا مسلمانوں کے لئے فائدہ مند ہے اب ہمارے لوگوں کو مزید نسخوں، مزید مساجد اور اسلامی اسکولوں کی ضرورت ہے۔

تاشقند کے ۴۰ سالہ مفتی محمد یوسف محمد صادق کا کہنا ہے کہ بعد ایک نئی مسجد ... [illegible]

صرف تاشقند میں ۲۰ مساجد تعمیر ہو چکی ہیں۔ مفتی محمد یوسف گزشتہ سال چار بار صدر گورباچوف سے ملاقات کر چکے ہیں جن میں انھوں نے گورباچوف کو مسلمانوں کے مسائل کے بارے میں مشورے دیے۔

اِن دونوں مفتیوں کی اس سخت مسابقت کی جھلک زیرِ زمین اسلامی بنیاد پرست گروپوں کے درمیان بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ گروپ وسطی ایشیا کی پانچوں ریاستوں ازبکستان، قازقستان، کرغیزیا، تاجکستان اور ترکمانیہ میں اپنے پیروکاروں کے حلقے بڑھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

اگرچہ روس کا خدشہ ابھی قبل از وقت نظر آتا ہے کہ اسلامی بنیاد پرستی وسطی ایشیا پر چھا جائے گی پھر بھی صدر گورباچوف اسلامی احیاء کی تحریک کو ایک سیاسی تحریک میں بدلنے سے روکنا چاہتے ہیں تو اسے مسلمانوں کو وسیع تر سیاسی اور ثقافتی خود مختاری دینا ہوگی۔ "مسلم اسٹیبلشمنٹ" جو اب تک کمیونسٹ پارٹی کی ذیلی تنظیم رہی ہے اپنے نو دریافت سیاسی حلقے کو استعمال کر رہی ہے۔ اگرچہ یہ ابھی کمیونسٹ پارٹی کے لئے چیلنج نہیں بنی اور اسلامی بنیاد پرستی کو ایک حد پر برقرار رکھ کر گورباچوف کی خدمت کر رہی ہے لیکن پھر بھی یہ سیاسی اثر کا ایک نیا مرکز بن رہی ہے۔

اسلامی انقلاب کے بعد پہلے وسطی ایشیا کے مسلمانوں کے بیرونی دنیا کے مسلمانوں سے تعلقات ختم ہو گئے تھے لیکن اب مسلمان ان تعلقات کو از سرِ نو استوار کر رہے ہیں وہ اسلامی ممالک سے آزادانہ تعلقات اور وہاں مطالعہ اور سفر کے لئے وسیع تر مواقع کے طلب گار ہیں۔

اس سال تقریباً ۱۵۰۰ روسی مسلمانوں نے حج کیا ہے جو کروڑوں روسی مسلمانوں کے لئے بہت کم تعداد ہے لیکن ۱۹۱۷ء کے بعد سے حج پر جانے والے مسلمانوں کی سب سے بڑی تعداد ہے۔

روس میں قرآن پاک کی بھی بڑی قلت ہے سعودی عرب نے جو دس لاکھ قرآن پاک کے نسخے بھیجے تھے تاشقند میں پہنچ گئے ہیں لیکن اب تک کسی نے بھی انھیں نہیں دیکھا۔ الما آتا کے ... ترجمہ شدہ قرآن پاک کے لئے بے تاب ہیں۔ غیر ملکی زبانوں میں ڈاکٹریٹ کرنے ... انتر گالوف نے جو افغانستان میں روسی فوج کے ساتھ خدمات انجام دے ... دلچسپ بات یہ ہے کہ ... کہا کہ ہم اسلام کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چا ...

شاداب

لیکن ۷۰ سال سے ہمیں اس کے بارے میں کسی بات کا علم نہیں ہو سکا۔ روسی نوجوان گزشتہ ۷۰ برسوں کی

خالی تاریخ کو مکمل کرنا چاہتے ہیں اور اس ضرورت نے اسلام کو وسطی ایشیا میں ایک غیر معمولی کردار ادا کرنے

کے قابل بنا دیا ہے مشرق وسطی اور ایران میں اسلامی بنیاد پرستی نے ریاست کی ایک مکمل نظریاتی تشکیل دے ڈالی

ہے جس میں نسل پرستی قابل مذمت قرار دی گئی ہے لیکن وسطی ایشیا میں جہاں اسلامی جوش و جذبہ نسلی فرقہ

پرستی کے لئے مرکزی سہارا ہے لیکن اس جوش و جذبہ کو روسی غلبہ کی مخالفت کے لئے تو مناسب سمجھا جاتا ہے

لیکن ساتھی مسلمانوں سے جو دوسری نسل سے تعلق رکھتے ہیں سامنا ہونے کے موقع پر اسے فراموش کر دیا جاتا ہے

روسی مسلمانوں میں فرقہ پرستی کم ہے کیونکہ سنی آبادی کی اکثریت ایک ہی فقہ حنفی سے تعلق رکھتی ہے

شیعہ صرف آذربائیجان میں اکثریت میں ہیں۔ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ روسی مسلمانوں کو باہر کی دنیائے اسلام

میں فرقہ وارانہ چپقلش کا بہت کم علم ہے بیشتر مسلمان تصوف کے قائل ہیں۔

روسی دانشوروں کے خیال میں گورباچوف کا یہ اعلان کہ روس مشترکہ یورپی گھر کا حصہ ہے، اس کے

کروڑوں مسلمانوں کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اگر روس اس علاقہ کا کنٹرول اپنے پاس رکھنا چاہے تو اسے

مسلمانوں کو غیر روسی ریاست کا احساس کرنا ہوگا اور ان کے ... [illegible] ... کا لیکن اس بات کا

امکان کم ہے کہ روس کے پاس وسطی ایشیا کے لئے کوئی مربوط حکمت عملی موجود ہے۔

فار ایسٹرن اکنامک ریویو کی دوسری رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ روس میں قومی اور اسلامی بیداری کی

تحریک پر ترکی زبان بولنے والے ازبکوں کا غلبہ ہے جو روس کی سب سے بڑی غیر یورپی آبادی ہیں۔

ازبکستان کی ایک کروڑ ۹۰ لاکھ آبادی میں سے ۶۹ فی صد ازبک مسلمان ہیں اور روس کی دوسری ریاستوں میں

بھی ازبک اقلیتیں پائی جاتی ہیں جن کی تفصیل یہ ہے۔ کرغیزیا آبادی ۴۲ لاکھ ازبک ۱۲ فیصد

تاجکستان آبادی ۴۸ لاکھ ازبک ۲۳ فیصد، ترکمانستان آبادی ۳۴ لاکھ ازبک ۹ فیصد۔

اس کے علاوہ چین اور افغانستان میں بھی ازبک آبادیاں پائی جاتی ہیں۔

ازبکستان کی سب سے بڑی اپوزیشن تحریک بریک (اتحاد) ایک سخت قوم پرست تنظیم ہے جسے

۱۰ لاکھ افراد کی حمایت حاصل ہے یہ تحریک مکمل آزادی کے پہلے مرحلے کے طور پر خود مختاری اور اقتصادی آزادی کا

مطالبہ کرتا ہے اس کے دوسرے مطالبات میں روس کے ترکی زبان بولنے والے گروپوں میں اتحاد، وسطی ایشیا کے مسلمانوں کی کنفیڈریشن کا قیام، اسلام کی وسیع تر نشر و اشاعت اور ازبک زبان کے لئے عربی رسم الخط کی وسیع تر ترویج شامل ہیں۔ برلیک کی قیادت ازبک شعراء اور دانشور کر رہے ہیں اس میں پان الٹرا نیشنلسٹ اور اسلامی بنیاد پرست گروپ شامل ہیں۔ برلیک کے ایک لیڈر ابدیلوف مرالام نے بتایا کہ اس کو ہمارے ساتھ غلاموں جیسا سلوک کرتا ہے ازبکستان روس کی غریب ترین ریاست ہے لیکن اس کے پاس بہت زیادہ قدرتی وسائل ہیں جو روس لے جاتا ہے۔

ازبکستان میں روسیوں کی آبادی ۱۱ فیصد ہے اور عوام ان سے نفرت کرتے ہیں خوفزدہ نوجوان روسی اب ازبکستان چھوڑنے کی تیاری کر رہے ہیں۔

ازبکستان میں ایک خفیہ اسلامی پارٹی بھی قائم ہو چکی ہے جو روس کی اسلامی جمہوریاؤں کی آزاد فیڈریشن بنانا چاہتی ہے اس تنظیم کو تیزی سے مقبولیت حاصل ہو رہی ہے۔ اس قسم کی افواہیں ہیں کہ وادی فرغانہ میں افغانستان سے اسلحہ آ رہا ہے اور متحارب افغان رہنما گلبدین حکمت یار اور احمد شاہ مسعود وسطی ایشیا میں اپنا اثر و رسوخ بڑھانے کے لئے اس اسلامی جماعت پر غلبہ کے لئے زور آزمائی کر رہے ہیں۔

ازبکستان میں بہت غربت ہے لوگ کچے مکانوں میں رہائش پذیر ہیں۔ انہیں بنیادی سہولیات بھی حاصل نہیں۔ بچے گندے نالوں میں کھیلنے پر مجبور ہیں! انہیں مکانات ملازمتوں اور خوراک کی سپلائی میں اپنے حقوق تک کی رسائی سے بھی محروم رکھا جا رہا ہے کرغیزستان میں کرغیز اور ازبک باشندوں کے درمیان جھگڑا امکانات پر قبضہ کے سلسلے ہی میں ہوا تھا۔

جمہوریہ کی ایک اور رپورٹ میں نسلی کشیدگی اور تصادم کے واقعات کے بارے میں جن میں ۱۰۰ سے زائد افراد ہلاک ہو گئے۔ بتایا گیا ہے کہ تصادم کا سلسلہ جون میں اوش کے شہر میں ہوا جب مکانات پر قبضہ کے سلسلے میں ازبک اور کرغیز باشندے آپس میں الجھ گئے۔ کرغیزستان کی صرف نصف آبادی کرغیز ہے یہاں کرغیزستان کے نام سے ایک تنظیم بھی قائم ہے جو بے چینی کے آغاز کے موقع پر قائم ہوئی بتایا گیا ہے کہ اوش میں ۲۳ ہزار بے روزگار ہیں۔

جمیعہ میں ایک اور رپورٹ "نئی شاہراہ ریشم" کے عنوان سے شائع ہوئی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ وسطی ایشیاء کی روسی ریاستیں چین اور مشرقی یورپ کے ساتھ تجارتی تعلقات وسیع کر رہی ہیں اور یہ کام ماسکو سے بالا بالا آزادی کے ساتھ ہو رہا ہے۔ روسی جمہوریہ قازقستان کے صدر نور سلطان نذر بائیف نے نمائندہ کو بتایا کہ ہم بیرون ممالک تعلقات کو مرکز کی امریت کی اغراض سے آزاد رہتے ہوئے بہتر بنانا چاہتے ہیں۔ ہمیں اپنے عوام کے معیار زندگی کو بہتر بنانے کے سلسلے کے سامنے جواب دہ ہونا پڑے گا۔ انھوں نے قازقستان میں ماحولیاتی آلودگی پر ماسکو کو ہدف تنقید بنایا قازقستان کے صدر کی اس بات چیت سے اندازہ ہوتا ہے کہ وسط ایشیا کی کمیونسٹ پارٹیاں خود کو ماسکو کے مقابلے پر منوا رہی ہیں۔

قازقستان اور چین کے درمیان "شاہراہ ریشم" کے نام سے سیاحی ٹرین چلانے کا نظریہ بھی زیر غور ہے یہ ریل بیجنگ سے تریان اور ارومچی سے ہوتی ہوئی ٹرانس کاکیشن ریلوے سے آ ملے گی اور اس طرح وسطی ایشیا کی ریلوے اسٹیشنوں سے چلتی ہوئی یورپ کو جائے گی چین نے ابھی تک اس تجویز پر کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔

چین کا جو علاقہ قازقستان سے ملتا ہے وہ اوئی غر (سنکیانگ) کہلاتا ہے جس میں ۵۰ لاکھ اوئی غر ترک مسلمان آباد ہیں ۳ لاکھ اوئی غر مسلمان ۱۹۴۸ء اور ۱۹۶۰ء کی دہائی میں چین کے انقلابات کے دوران چین سے فرار ہو کر روسی قازقستان اور دوسرے علاقوں میں آ گئے تھے جبکہ ۶۰ء کی دہائی کے بعد سے ۴۰ لاکھ چینی ہان سنکیانگ کے علاقے میں آ کر آباد ہو گئے جس کی وجہ سے اوئی غر مسلمانوں میں بے چینی پھیلی اور ساتھ ساتھ بے روزگاری بھی۔

اس سال اپریل میں سنکیانگ میں شہر بیرین میں فسادات ہوئے اور چینی ملیشیا کی کارروائی سے (۵۰) افراد مارے گئے چین نے الزام لگایا کہ آزاد چینی ترکستان کے قیام کے لئے بنیاد پرست مسلمانوں نے اوئی غر ترکوں کو اکسایا تھا کہ چین کے وزیر اعظم لی پینگ نے روسی رہنماؤں کی بیجنگ آمد پر ان سے اس بے چینی کے ساتھ نمٹنے کے لئے صلاح و مشورہ کیا روس اور چین دونوں ممالک کے اوئی غر مسلمانوں میں اسلامی جوش و جذبہ اور پان ترک ازم مشترکہ مسئلہ ہے روسی اوئی غر مسلمانوں کا ایک ہفتہ وار اخبار عربی رسم الخط

میں شائع ہوا ہے اس کے ایڈیٹر قاسموف علم وزوف نے بتایا کہ اگر چینی اوئی غور آزادی کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں تو ہم ان کا ساتھ دیں گے لیکن یہاں روسی ہمارے ساتھ اچھے سلوک کا مظاہرہ کر رہے ہیں اس اخبار کے بارہ اوئی غور صحافی ۶۰ کی دہائی میں چین سے فرار ہو کر روس آئے تھے اور ان کے چین میں موجود رشتہ داروں سے اب بھی قریبی تعلقات ہیں روس میں قرآن مجید اوئی غور زبان میں موجود نہیں ہے تاہم چین میں اوئی غور ترجمے والا قرآن مجید شائع ہو چکا ہے اور روس کے اوئی غور مسلمان اسی قرآن پاک کا نسخہ منگواتے ہیں علاوہ ازیں بیشتر اوئی غور چینی بولتے ہیں یہ مسلمان ماؤزے تنگ کے مظالم کو نہیں بھولے .

جریدہ کے مطابق چین اور روس دونوں کو اوئی غور مسلمانوں کے قومی تشخص سے خطرہ ہے بالخصوص اگر یہ مسلمان مستقبل میں دونوں ممالک کے اسلامی بنیاد پرستوں اور پان ترک تحریکوں سے رابطے استوار کر لیتے ہیں ایک چینی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ اپریل کے بعد افغان مجاہدین نے اوئی غور باغیوں کو اسلحہ فراہم کیا ہے اور بغاوت کی قیادت ایک اسلامی تحریک نے کی تھی یہی اسلامی جماعت اب روسی ریاستوں ازبکستان اور تاجکستان میں نہایت نمایاں زیر زمین تحریک ہے یہ اسلامی تحریک ترک ریاستوں کی ایک اسلامی کنفیڈریشن قائم کرنا چاہتی ہے یہ پارٹی چین اور روسی وسطی ایشیا کے ساتھ ساتھ افغانستان میں بھی اپنے رابطے استوار کر رہی ہے لہذا اب یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ اوئی غور مسلمان دونوں کمیونسٹ پڑوسیوں کی بالادستی کا شکار رہنے کے لئے ہرگز تیار نہیں . ماسکو میں جو سیاسی اصلاحات کی گئی ہیں وہ وسطی ایشیا سے چھو کر نہیں گزریں جبکہ چین اب بھی اپنی مرضی منوانے کے لئے ظالمانہ قوت کے استعمال پر انحصار کرتا ہے . اگر چین اور روس وسطی ایشیا میں اپنی مشترکہ سرحد پر امن و استحکام دیکھنا چاہتے ہیں تو دونوں کے لئے اوئی غور مسلمانوں کو وسیع تر قومی اور ثقافتی خود مختاری دینا لازمی ہے .

"شاداب" آپ کا اپنا رسالہ ہے
خود بھی اس کا مطالعہ کیجئے اور دوسروں کو مشورہ دیجئے
قلمکار حضرات اپنی غیر مطبوعہ تخلیقات اشاعت کے لئے روانہ کر سکتے ہیں !

محمد عمر ... الحسن
سابق ... ڈائریکٹر ... حیدرآباد

اسلامی بینک کاری

فاضل مدخرات کے استعمال کا طریقہ کار

اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کو دنیوی دولت اور نعمتوں سے مالا مال کیا ہے تو شریعت ان کے لئے ضروری سمجھتی ہے کہ اپنی فاضل دولت باہمی طور پر نفع بخش انداز میں مسلم معاشرہ اور بالعموم انسانیت کی فلاح کے لئے [illegible] تجارت میں مشغول کریں۔ اس سلسلہ میں شریعت کا حکم ہے کہ [illegible] مشغول کی جائیں نفع کے ساتھ ساتھ نقصان کا بھی جوکھم ہے ان [illegible] جس میں [illegible] معاشرہ کے پیداواری عناصر پر [illegible] تجارت میں شراکت کے نظریہ کی طرف اشارہ کرتا ہے جس میں [illegible] مشغول [illegible] نقصان کا بھی امکان رہتا ہے اس کا اصول یہ ہے کہ جو نفع کا امیدوار ہو [illegible] کرنے کے لئے بھی تیار رہے مالیاتی لین دین کے درج ذیل اسلامی اصولوں پر عام اتفاق رائے پایا جاتا ہے۔

(۱) رضا و رغبت پر مبنی تجارت کاروبار کی بنیاد ہے استحصال دھوکہ فریب اور سود کا لین دین منع ہے

(۲) ربوٰ ممنوع ہے کیونکہ اس کے ذریعہ وہ زیادہ سے زیادہ رقم جمع کرنے یا بٹورنے اور [illegible] قسم ضرورت مندوں سے [illegible] کے تحت ہوتی ہے یہ طریقہ سماجی انصاف کے نظریہ کے منافی ہے اس سے صرف چند افراد کا فائدہ اور اکثریت کا استحصال ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فروخت کو جائز لیکن ربوٰ کو ممنوع قرار دیا ہے سماج کی ترقی کے لئے اشیاء اور

خدمات کی فروخت (معاوضہ) اور تجارتی لین دین ناگزیر ہے جبکہ ربا کے نتائج اس کے برعکس ہوتے ہیں صرف پیسہ ہی پیسے کو پیدا نہیں کر سکتا۔ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ زر۔ زر کو فراہم نہیں کر سکتا رقم کا حصول رقم اور محنت کے درمیان ربط و تعلق پر منحصر ہے رقم اور محنت کے درمیان رابطہ منصفانہ اور مناسب ہونا چاہیے تاکہ نفع یا نقصان میں ہر دو کا حصہ رہ سکے۔ اسلامی معاشیات کی بنیاد تجارت اور کاروبار کی اجازت پر ہے اس کو مذہب کے برعکس متصور نہیں کیا جا سکتا اسلامی مالیاتی نظام عوام کی فلاح کی جانب رہنمائی کرتا ہے اس طرح عوام الناس کی زندگیوں کے گناہ کے خاتمہ کی راہ ہموار ہوتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جہاں کہیں منصفانہ لین دین یا کار خیر ہو جس کا منشاء سماجی بھلائی ہو تو اسلام اس کو کار ثواب قرار دیتا ہے اسلام کسی کو بھی نقصان پہنچانا رشوت دینا، لینا اور گناہ کرنا منع ہے کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ [illegible] بخشش کی دعا کیسے مانگوں جب میری برادری اس سے محروم ہے"

اسلامی بینک کاری۔ وقت یا مدت کی بنیاد پر رقم میں اضافہ کی قطعی طور پر اجازت نہیں ہو سکتا۔ لیکن جب کسی حقیقی نفع بخش معاشی سرگرمی میں رقم مشغول کی جاتی ہے تو اس کی قدر میں اضافہ کیا جا سکتا ہے (۲) منافع کے بارے میں کوئی بات یقین سے نہیں کہی جا سکتی اس طرح کسی صنعت کار یا تاجر کے جوکھم کا کچھ حصہ فنڈس دینے والوں یعنی اسلامی بینک کے حصہ میں بھی آئے اگر ان اصولوں پر عمل کیا جائے تو اسلامی معاشی نظام کے حامل ملک میں مالیاتی نظام کے بجائے تجارتی رجحان کو فروغ حاصل ہوگا اور اس کی اہمیت بڑھے گی۔

مغربی جرمنی میں ۶ مئی ۱۹۸۱ء کو فضیلت مآب پرنس محمد الفیصل السعود کی زیر صدارت ایک بین الاقوامی سمپوزیم منعقد ہوا تھا جس میں کئی اسلامی اسکالرس، بینک کاروں اور ماہرین معاشیات نے مغربی ممالک کے لئے اہم منصوبوں سے تبادلہ خیال کیا تھا اس سمپوزیم سے شہزادہ السعود کے افتتاحی خطاب کا خلاصہ پیش ناظرین ہے۔ "آج کے اجتماع میں مجھے یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوتی ہے کہ اسلامی ماہرین معاشیات کو یوروپ اور بالخصوص جرمنی کے ماہرین معاشیات سے ملاقات کرنے کا ان سے

تبادلۂ خیال کرکے اور باہمی تعاون کے طریقوں پر غور کرنے کا موقع مل رہا ہے۔

آج اس اجتماع کے انعقاد کے سلسلے میں سائما (S Y M A) انسٹیٹیوٹ کی کوششوں پر اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں اس ادارہ کی نمائندگی ڈاکٹر کلو رکرتے ہیں اس سمپوزیم میں خطبہ استقبالیہ دینے پر میں میئر شہر مسٹر کارلین کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں اس سمپوزیم کے انعقاد کا ہمارا مقصد ہمارے عوام اور یورپ و نیز جرمنی کے عوام کے درمیان مفاہمت پیدا کرنا ہے آپ جانتے ہیں کہ اسلامی بنک کاری اور فنانس ایک نیا نظریہ ہے جس کو ہم دنیا کے اپنے علاقوں میں پیش کر رہے ہیں ۱۹ بنک کاری کے بنیادی اصول اور نظریات نئے نہیں ہیں نئی بات ان نظریات کے اطلاق کرنے کے ہمارے اقدامات میں مینجمنٹ تکنیک، پراجکٹ کے تخمینہ اور منصوبہ سازی اور ٹکنالوجی و مہارت سے استفادہ میں ہمیں یورپ اور جرمنی کے تجربات سے بہت کچھ سیکھنا ہے ہمارے درمیان تعاون کے امکانات روشن ہیں ضرورت اس بات کی ہے کہ ان طریقوں اور نظریات کا جائزہ لیا جائے جن کو ہم باہمی تعاون کے امکانی شعبہ جات میں استعمال کر سکتے ہیں۔

سمپوزیم کے بعد ایک اعلامیہ جاری کیا گیا جس کا متن درج ذیل ہے۔

"اسلامی بنک کاری اور معاشی تعاون کی حکمت عملی کے موضوع پر بیڈن بیڈن مغربی جرمنی ایک بین الاقوامی سمپوزیم ۶ تا ۸ مئی ۱۹۸۱ء زیر صدارت فضیلت مآب شہزادہ محمد فیصل السعود منعقد ہوا اس سمپوزیم کا اہتمام مشترکہ طور پر انٹرنیشنل ایسوسی ایشن آف اسلامک بنکس اور سائما انسٹیٹیوٹ کے نے کیا تھا اس سمپوزیم میں (۹۰) بنک کاروں ماہرین معاشیات، صنعت کاروں اور قومی اور بین الاقوامی اداروں کے نمائندوں نے شرکت کی ان اداروں میں قابل ذکر آرگنائزیشن آف اسلامک کانفرنس او۔ای۔سی ڈیولپمنٹ سنٹر یونائیٹڈ کے ڈبلیو ایف اسلامک کونسل آف یورپ کنگ عبدالعزیز یونیورسٹی ہیں شرکا میں عام اتفاق رائے یہ تھا کہ سمپوزیم سے ایک اہم مقصد کی تکمیل ہوئی ہے اسلامی بنکوں کی نوعیت، ان کے لین دین کے طریقہ کار اسلامی بنکوں اور مغربی دنیا کے درمیان تعاون کے امکانات بہتر طور پر سمجھنے میں مدد ملی ہے یہ بات تسلیم کر لی گئی ہے کہ اسلامی بنکوں کا ایک نمایاں کردار رہا ہے کہ وہ

کی بنیاد پر رقومات فراہم نہیں کرتیں رقومات نفع میں حصہ کے مختلف انتظامات کے تحت فراہم کی جاتی ہیں ان انتظامات کا عام اصول یہ ہے کہ فریقین کو باہمی تناسب پر متفق ہونے کی آزادی حاصل ہے جس کے تحت وہ منافع میں حصہ دار بنیں گے لیکن اگر کوئی نقصان ہو تو اس کو مختلف فریقین کے سرمایہ کی بنیاد پر تقسیم کرنا ہوگا منافع میں حصہ سے ہٹ کر اسلامک بنک مرابحہ (MARABAHA) جیسی دیگر تکنیک بھی استعمال کر سکتے ہیں مرابحہ کے تحت اشیاء یا آلات کو اس شئے یا آلہ کی بازاری قیمت سے زیادہ قیمت پر فروخت کیا جاتا ہے بشرطیکہ خریدار ملتوی بنیادوں پر قیمت ادا کرے پٹہ پر دینا اور اقساط پر خریدنا شریعت کے تحت جائز ہے یہ بات بھی مسلمہ ہے کہ اسلامی بنکوں کے لین دین میں "نفع میں حصہ" سے ہٹ کر کسی اور تدبیر کو اہمیت حاصل نہیں ہونا چاہیئے اس لین دین کی بنیاد منافع میں حصہ ہونی چاہیئے ویسی دیگر تدابیر کو جو شریعت کے تحت جائز ہیں نفع میں حصہ کے انتظامات میں مدد کے لئے عارضی اقدامات کے طور پر روبعمل لایا جا سکتا ہے شرکاء سیموزیم کا احساس ہے کہ چونکہ اسلامی بنکوں کے رقمی لین دین کا مقصد پیداواری شعبوں میں سرمایہ کاری ہوتا ہے اس لئے وہ (بنک) معاشی ترقی میں اہم رول ادا کر سکتے ہیں یہ امر بھی مسلم الثبوت ہے کہ آج دنیا کے تمام ممالک کو "جوکھم سرمایہ" کی قلت کا سامنا ہے متعدد مغربی ممالک میں قرض سرمایہ وافر مقدار میں دستیاب ہے لیکن تجارتی اداروں کے لئے کافی مقدار میں "جوکھم سرمایہ" اکٹھا کرنا مشکل ہو گیا ہے اگر "جوکھم سرمایہ" زیادہ مقدار میں دستیاب رہے تو کساد بازاری پر قابو پانے میں آسانی ہوگی کئی صنعتی ممالک میں آج کل کساد بازاری پائی جاتی ہے شرکاء نے اس بات پر بھی اتفاق کیا کہ اسلامی بنکوں اور مغربی ممالک کے اداروں کے درمیان تعاون کے وسیع تر مواقع موجود ہیں ترقی پذیر اور ترقی یافتہ دونوں ہی قسم کے ممالک کے پراجیکٹوں کے لئے مغربی ممالک کے مالیاتی اداروں اور اسلامی بنکوں کے درمیان رقومات کی مشترکہ فراہمی کے مواقع بھی موجود ہیں

• بعض ممالک میں اسلامی بنک کاری: گذشتہ دہے کے دوران کویت، متحدہ عرب امارات، اردن سوڈان اور پاکستان میں "نفع نقصان میں حصہ" کے اصول پر بنکوں کا قیام عمل میں آیا ایسے دو بنک لکزمبرگ اور سوئٹزرلینڈ میں بھی قائم کئے گئے حکومت سعودی عرب اور بین الاقوامی ترقیاتی بنک

کی سرگرم حوصلہ افزائی سے سنہ ۱۹۷۵ء میں جدہ میں اسلامی ترقیاتی بینک کا قیام عمل میں آیا۔ بیشتر ممالک میں اسلامی بینک روایتی بینکوں کے ساتھ ساتھ کام کرتے ہیں لیکن بعض حکومتوں نے روا بینکوں کو کچھ عرصہ میں ختم کرنے کے اقدامات کئے ہیں۔ مثال کے طور پر حکومت پاکستان نے بینکنگ نظا سے سنہ ۱۹۸۰ء میں سود پر مبنی لین دین کو ختم کرنے کے بتدریج اقدامات شروع کئے۔ یکم جولا سنہ ۱۹۸۵ء کو قانون کے ذریعہ یہ لازمی قرار دیا گیا کہ بینکوں کا ہر قسم کا لین دین کلیتاً مساوات اشتراک بنیاد پر ہو۔ ۱۴ جون سنہ ۱۹۸۴ء کو پاکستان کے وزیر فنانس نے ایک بجٹ تقریر کے دوران اعلا کیا تھا کہ حکومت پاکستان نے موجودہ معاشی نظام کو اسلامی معاشی نظام میں بدلنے کا تہیہ کر لیا ہے۔ پاکستا وہ واحد ملک ہے جہاں بیرونی بینک کام کرتے ہیں اور جہاں تمام بینکوں پر لازم ہے کہ وہ اندرون ملک کاروبار اسلامی بنیادوں پر چلائیں۔ عربیہ "جلد ششم جز ۷۸ مارچ سنہ ۱۹۸۷ء کی اطلاع کے بموجب ما سنہ ۱۹۸۶ء میں عوامی جمہوریہ چین کے ایک قومی اخبار نے اعلان کیا تھا کہ اس ملک میں اسلامی بینک جانے والا ہے۔ یہ بینک شمالی چین کے خود مختار علاقہ ننگشیا میں جہاں کی آبادی میں نسلی چینی مسلمانوں کا کاروبار شروع کرنے والا تھا۔ یہ بینک ننگشیا اسلامک انٹرنیشنل ٹرسٹ اینڈ انویسٹمنٹ کارپو اور فیصل اسلامک بینک (مصر) کا مشترکہ پراجکٹ ہے معاہدہ کے بموجب اس بینک کا ابتدائی سر (۲۰) ملین ڈالر تھا۔ سمجھا جاتا ہے کہ اسلامی جمہوریہ ایران نے بینک کاری کے اسلامی اصولوں پر کے لئے مناسب اقدامات کئے ہیں۔

اسلامی بینک کا طریقہ کار: بعض فارمولوں کی تفصیل درج ہے۔ فرض کیجئے کہ اسلا کا ایک گاہک یا کھاتہ دار ایک فیکٹری قائم کرنا چاہتا ہے اور اس کو چند لاکھ روپیوں کی ضرو ہے اسلامی بینک اس کو درکار رقم کا ایک حصہ بطور اشتراک دیتا ہے اور یہ یا تو مسلسل نوعیت ہوگا جس میں اسلامی بینک مستقل حصہ دار ہوگا یا پھر یہ مختصر المیعاد اشتراک ہوگا جس میں تین سال بعد مذکورہ گاہک اسلامی بینک سے حصص خریدے گا تاکہ اس کا پورا پلانٹ ان کا ذاتی ہو ہو جائے اس طرح اسلامی بینک منافع اور نقصان کے دونوں میں حصہ دار ہے یہاں یہ بات

بینک ٹھیکہ مدت میں اسلامی بینک اپنے گاہک کی کمپنی کے لئے فنڈ ڈاکومنٹس میں اپنا حصہ رکھتا ہے

مضاربہ۔ MUDARBA ۔ اس فارمولا کے تحت ایک گاہک CLIENT اسلامی بینک سے رجوع ہو سکتا ہے اور چونکہ وہ استثنائی مہارت کا حامل ہو تو بہت اور اپنا شاندار ریکارڈ اور جائز پروجیکٹ رکھتا ہے اسلامی بینک اس کو مضاربہ فنڈس دینے کا فیصلہ کر سکتا ہے اس معاملت میں اسلامی بینک گاہک کے کاروبار میں قطعی مداخلت نہیں کرتا گویا دوسرے الفاظ میں اسلامی بینک اس کاروبار کے نفع و نقصان کا حصہ دار ہے۔

مرابحہ۔ MARABAHA اسلامی بینک ایک قیمت پر اشیاء خریدتا ہے اور اپنے گاہک سے یہ رضامندی حاصل کرتا ہے کہ وہ ان اشیاء کو دوسری قیمت پر اسی گاہک کو فروخت کرے گا گاہک کو واپس فروخت کرنے کی صورت میں اسلامی بینک کو اس دادوستد میں جو آمدنی ہوگی اس کو اپنے انتظامی اخراجات اور حقیقی منافع قرار دیا جائے گا اس میں شرط یہ ہے کہ مصارف کا حساب کتاب صحیح رہے اگر گاہک یہ ثابت کرے کہ مصارف درست نہیں ہیں تو معاملت کو منسوخ کر سکتا ہے یا پھر گاہک کو اختیار ہے کہ وہ صرف مصارف ادا کرے اسلامی بینک اور منافع سے مستفید نہیں ہوگا۔

اسلامی پٹہ خریدی: فرض کیجئے کہ اسلامی بینک کا ایک گاہک کوئی آلہ یا مشنری خریدتا ہے اور گاہک کے لئے اس کو کرایہ پر دیتا ہے اس کرایہ بہ بہت کہ یہ گاہک اسلامی بینک نے جس قدر رقم سے یہ مشنری حاصل کی ہے اس کی ادائی میں ماہانہ اقساط ادا کرتا ہے اور جس وقت بینک کی ادا کی ہوئی رقم کاملاً واپس ہو جاتے ہی یہ مشنری گاہک کی ملکیت بن جاتی ہے اور اس طرح اسلامی بینک سے کیا گیا معاہدہ متعلقہ کرایہ ختم ہو جاتا ہے اسلامی بینک کاری نظام میں ڈپازٹس بھی نفع اور نقصان کی بنیاد پر ہوتے ہیں۔ ایسے ڈپازٹ کنندگان کو ان کی رقومات پر اسلامی بینکوں سے پہلے طے شدہ کوئی رقم نہیں ملتی بلکہ تمام واجبات اور مواصلات کی حساب فہمی اور بینک کے کاروبار میں اخراجات کی منہائی کے بعد جو بھی خالص رقم باقی رہے وہ کھاتہ داروں میں قابل تقسیم قرار پاتی ہے یہ تقسیم ڈپازٹ رقومات اوسط بیلنس BALANCE اور اسلامی بینک کے سرمایہ کی تناسب سے ہوتی ہے۔

کے. ایس. شفیق
نیلکنٹ پیٹ، حیدرآباد

اردن کے ولی عہد

شہزادہ حسن بن طلال

حالیہ خلیجی بحران نے جہاں ان گنت بین الاقوامی مسائل پیدا کر دیئے ہیں وہیں چند شخصیتوں کو ابھارا اور دنیا سے روشناس کروایا ہے ان میں اردن کے شہزادہ حسن بن طلال بھی ہیں جو شاہ حسین کے چھوٹے بھائی اور اردن کے ولی عہد ہیں خلیجی ممالک کے امیروں اور شیوخ کے تعلق سے عام طور پر یہی سنا اور پڑھا جاتا ہے کہ ان کی اکثریت علم اور کردار سے عاری ہے اور عیش پرستی اور پیسے دربے کی فضول خرچی ان کا شعار ہے اور تیل کے ذریعہ حاصل ہونے والی بے اندازہ دولت انہیں اس بات کا موقعہ ہی نہیں دیتی کہ بے راہ روی سے باز آئیں اور مذہب اور اخلاق کی دکھلائی ہوئی راہِ راست پر گامزن ہوں۔ فرانس کے ساحلی [illegible] انگلستان اور امریکہ کی ہوٹلوں، شراب خانوں اور جوئے خانوں میں ان کی احمقانہ حرکتیں زبان زدِ خاص و عام ہیں اور بلا بحث و تکرار واقعات علمی کے طور پر قبول کی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر کویت کے امیر احمد جابر الصباح ہی کو لیجئے۔ یہ وقتِ واحد میں صرف چار بیویاں رکھنے کی شرط کے تو پابند رہے ہیں لیکن اب تک (۳۶) بیویوں کو طلاق دے چکے ہیں اور ان کی اولاد کی تعداد (۰۰) ہے کم و بیش یہی حال دوسرے دولت مند امراء کا ہے مستثنیات سے نہ صرف قاعدہ کلیہ بنتا ہے بلکہ استثنائی شخصیتوں کا حال و قال امید کی ایک کرن دکھائی دیتا ہے۔ اردن کے شاہ حسین اور ان کے بھائی حسن بن طلال ان ہی گنے چنے تعلیم یافتہ روشن خیال اور باوقار افراد میں سے ہیں۔ اردن تیل کی دولت سے مالا مال نہیں ہے لیکن معاشی اقدامات اور نظم و نسق کی بہتری کے باعث ایک چھوٹا سا لیکن خوشحال ملک ہے بدقسمتی سے اس کا جغرافیائی محل و توقع کچھ ایسا ہے کہ خواہی نخواہی اس کو فلسطینی تنازعہ اور اب کویت کے ہنگاموں کے مابعد اثرات سے الجھنا پڑ رہا ہے ہندوستان

پاکستان، بنگلہ دیش وغیرہ کے پناہ گزینوں کے قافلے عراق کی سرحد عبور کرکے اُردن کے سرحدی ریگستان میں آپہنچے تھے۔ ان پریشان حال و بے یار و مددگار لوگوں کے قیام، طعام اور واپسی کے انتظامات کرنے کے سلسلے میں اُردن کی معیشت اور نظم و نسق پر بہت بار پڑا ہے خلیجی بحران کی یکسوئی کے لئے شاہ حسین کی تگ و دو کی افادیت کو ساری دنیا نے تسلیم کیا اور سراہا ہے۔ وہ عراق کے کویت پر حملے اور ناٹو ممالک کی جوابی کارروائی کے خطرناک اثرات کو قابو سے باہر ہو جانے سے روکنے کے لئے اگر آج واشنگٹن میں ہوتے تو دوسرے دن لندن اور پیرس پھر قاہرہ اور بغداد یا پھر ریاض پہنچ جانے اور گفت و شنید اور روک تھام کا سلسلہ جاری رکھے۔

شہزادہ حسن بن طلال اپنے بھائی کی بیرون ملک مصروفیات کے دوران اندرونی نظم و نسق اور معیشت کی باگ ڈور سنبھالے ہوئے تھے اور شاہ حسین کے دست راست تھے ان کی کارگزاری بین الاقوامی نقطۂ نظر سے منظر عام پر اُس وقت آئی جب پناہ گزین افراد کا مسئلہ کھڑا ہوا۔ ان پناہ گزینوں میں ایک لاکھ ۷۰ ہزار تو ہندوستانی تھے ہندوستان کے دورہ کنندہ وزیر خارجہ آئی کے گجرال نے شہزادہ طلال کی خدمات کو بے حد سراہا ہے وہ نہ صرف آئی کے گجرال صاحب کے ساتھ پناہ گزینوں کے کیمپوں میں گئے بلکہ اپنا اثر و رسوخ کا بھرپور استعمال کرکے ان پریشان حال لوگوں کی جلد از جلد اپنے گھروں کو واپسی کو ممکن بنایا جب کہ بتایا جاتا ہے کہ خود ہمارے سفیر مسٹر سنگھ ایک بار بھی ان کیمپوں کو نہیں گئے۔

برصغیر ہند و پاک کے باشندوں کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ شہزادہ طلال کی رفیقۂ حیات کا تعلق اسی ملک سے ہے ان کے والد اکرام اللہ صاحب آئی سی ایس عہدہ دار تھے اور تقسیم ہند کے بعد پاکستان چلے گئے اور وہاں معتمد خارجہ مقرر ہوئے۔ شہزادی ثروت طلال کی والدہ بیگم شائستہ اختر سہروردیہ بنگال کے مشہور سہروردی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں اور مصنفۂ علامہ راشد الخیری کے مشہور ماہنامہ "عصمت" میں ان کے مضامین اکثر شائع ہوتے تھے شہزادی ثروت کے دادا اترپردیش میں ڈپٹی کلکٹر تھے جو اُس زمانے میں بہت بڑا عہدہ سمجھا جاتا تھا اور ان کے چچا جسٹس ہدایت اللہ صاحب ہیں جو سپریم کورٹ کے چیف جسٹس اور مابعد نائب صدر جمہوریۂ ہند مانے جاتے ہیں ان کے ماموں آج کل آندھرا پردیش کا ... آباد ... یونیورسٹی کے چانسلر ہیں موصوف بھی آئی سی ایس ہیں

عراقی جارحیت

اور

کویتی عوامی کانفرنس

کویتی عوامی کانفرنس نے ملک کو عراقی قبضہ سے آزاد کرانے اور وہاں کی جائز قانونی حکومت کو بحال کرانے کے لئے تحریک جاری رکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس کانفرنس میں کویتی پارلیمنٹ کے ممبران اور زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے سات سو سے زیادہ اہم اشخاص نے شرکت کی۔ جدہ میں منعقدہ تین روزہ کانفرنس کا افتتاح امیر کویت شیخ جابر الاحمد الصباح نے کیا اور صدارت وزیر اعظم و ولی عہد سعد العبداللہ الصباح نے کی۔

شیخ سعد نے کانفرنس میں اپنی تقریر میں کہا کہ کویت کے پُرامن عوام کو مجرمانہ جارحیت کا نشانہ ایک ایسے پڑوسی کی طرف سے بنایا گیا جسے کویتی عوام مادی و اخلاقی مدد دیتے رہے ہیں اس نے طاقت کے ذریعہ قبضہ کرکے کویت کے وجود کو ختم کرنے کی کوشش کی ہے لیکن یہ سازش کامیاب نہیں ہو سکتی کیونکہ تمام کے تمام کویتی باشندوں نے جارحیت کے خلاف علم جہاد بلند کر لیا ہے اور اپنی قانونی حکومت کے ساتھ کویت کے سیاسی وجود کو برقرار رکھنے کے لئے جدوجہد پر کمربستہ ہو گئے

عراقی حملہ کے خلاف مزاحمت کے سلسلہ میں کویتی مسلح افواج اور سلامتی دستوں کی سرفروشانہ کوششوں پر اظہار اطمینان کرتے ہوئے شیخ سعد نے کہا کہ انہیں اپنی طاقت سے کئی گنا زیادہ بڑی طاقت سے مقابلہ کرنا پڑا اس لیے وہ اپنی صلاحیت کا پورا استعمال نہیں کر سکے۔ انہوں نے کہا کہ عراقی

حملہ آوروں کو یہ توقع تھی کہ انھیں کویتی باشندوں میں سے کچھ حامی مل جائیں گے جو ان کا گندا کھیل پورا کرنے میں معاون ثابت ہوں گے جبکہ یہ بڑے فخر کی بات ہے اور تاریخ میں اس کا ذکر سنہرے حرفوں میں آئے گا کہ ایک بھی کویتی نے عراقی حملہ آوروں کی حمایت نہیں کی اور کویتی عوام نے ثابت کر دیا کہ بحران کے وہ ایک خاندان اور ایک فرد کی طرح ڈٹ جاتے ہیں۔

شیخ سعد نے کہا کہ کویتی قیادت کو شروع ہی سے دشمن کے ناپاک منصوبوں کا علم ہو گیا تھا اور یہ بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ عراقی قیادت اور حکومت کے ممبران کو ختم کر دینا چاہتا ہے۔ کویتی قیادت نے ان منصوبوں کو ناکام بنا دیا اور برادر و دوست ممالک کے سامنے پورا مسئلہ واضح کر دیا کہ اس مجرمانہ حملہ کے دور رس اثرات کتنے زیادہ ہوں گے

انھوں نے کہا کہ حملہ کے بعد جو لوگ فرار ہو کر دیگر ملکوں میں پہونچ چکے ہیں ان کی دیکھ بھال کے لئے کویتی حکومت شروع ہی سے ضروری اقدامات کر رہی ہے۔

شیخ سعد نے مصیبت کے وقت کویتیوں کی مدد کے سلسلے میں سعودی حکومت، دعوام کا دلی شکریہ ادا کیا ساتھ ہی انہوں تمام عرب اسلامی اور دوست ممالک کا بھی شکریہ ادا کیا جنھوں نے عراق کی ننگی جارحیت کے خلاف کھل کر کویت کا ساتھ دیا۔

شیخ سعد نے وعدہ کیا کہ آزادی کے حصول کے بعد کویت میں جمہوریت کو مستحکم کیا جائے گا۔

کویتی عوام کی نمائندگی کرتے ہوئے جناب عبدالعزیز الصقر نے قیادت کو کویتی عوام کی مکمل اور بھرپور حمایت کا یقین دلایا۔

کانفرنس نے سلامتی کونسل کے مستقل ممبر ممالک کی طرف سے کویت کے کاز کی حمایت کے سلسلے میں ان کا شکریہ ادا کرنے کے لئے ایک وفد بھیجنے کا بھی فیصلہ کیا۔ ساتھ ہی یہ بھی طے کیا کہ دنیا کے مختلف ممالک میں کویتی مسئلہ کی وضاحت کے لئے وفود بھیجے جائیں جن میں سرکردہ سیاستداں اور ماہرین اقتصادیات شامل ہوں۔

کانفرنس نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ کویتی سفارتخانوں میں اسٹاف میں اضافہ کیا جائے

تاکہ ایک طرف کویتی باشندوں کو زیادہ سے زیادہ سہولیتیں بہم پہونچائی جاسکیں دوسری طرف عراق قبضہ سے متعلق معلومات وحقائق کی اشاعت کی جاسکے۔

خلیجی تعاون کونسل کے سکریٹری جنرل عبداللہ بشارہ نے اُمید ظاہر کی ہے کہ مصر، ترکی شام اور پاکستان کے تعاون سے خلیج کے ممالک ایک دفاعی اتحاد تشکیل دینے میں کامیاب ہوجائیں گے جو کافی مضبوط ثابت ہوگا۔

روزنامہ عرب نیوز" کو دیئے گئے ایک انٹرویو میں جناب بشارہ نے کہا کہ مغربی فوجیں ضرورت سے زیادہ ایک دن بھی علاقہ میں نہیں رہیں گی۔ انھوں نے کویت کے مسئلہ کے قومی حل پر زور دیتے ہوئے کہا کہ بغداد کی حکومت تہذیب سے بہت دور ہے۔

گذشتہ ہفتہ اسرائیلیوں کے ہاتھوں ۲۲ فلسطینیوں کے قتل عام کی سخت مذمت کرتے ہوئے جناب بشارہ نے سلامتی کونسل کی قرارداد کی حمایت کی۔

کویتی مسئلہ پر تفصیلی تبادلۂ خیال کرتے ہوئے جناب بشارہ نے کہا کہ بحران کے پُرامن حل کا ہر طریقہ آزمایا جانا چاہیئے لیکن پُرامن حل ممکن نہ ہو تو طاقت استعمال کی جانی چاہیئے۔ مسئلہ کا کوئی جزئی حل ممکن نہیں عراقی فوجوں کی فوری، غیر مشروط اور مکمل واپسی لازمی ہے عراق کو کویت پر حملے سے کوئی فائدہ اُٹھانے نہ دینا چاہیئے انھیں یکم اگست کی پوزیشن پر واپس جانا ہے عراق کو کویت کے ایک ذرہ کا بھی حق نہیں اور نہ اسے ملے گا۔

انھوں نے کہا کہ ڈپلومیسی کے ساتھ ساتھ طاقت کا استعمال بھی ضروری ہے بغیر طاقت کے ڈپلومیسی بیکار شے ہے تنہا اقتصادی ناکہ بندی عراق کو مجبور نہیں کرسکتی۔ نہ غیر معینہ مدت تک انتظار کیا جاسکتا ہے اگر منطق کی زبان کام نہ کرے تو طاقت کی زبان ہی استعمال کرنی پڑے گی۔ عراقی ڈکیٹر کو واضح طور پر بتا دینا چاہیئے کہ فوجی مداخلت کا وقت دور نہیں۔

خادم حرمین شریفین شاہ فہد بن عبدالعزیز نے واضح طور پر کہا ہے کہ کویت کے خلاف عراقی جارحیت کے تعلق سے سعودی عرب کے موقف میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ عرا

ذرائع ابلاغ کی طرف سے اس سلسلہ میں نشر کی جانے والی بعض خبروں پر تبصرہ کرتے ہوئے شاہ فہد نے سعودی پریس ایجنسی کو بتایا کہ سعودی عرب کا موقف بالکل واضح اور دوٹوک ہے اور اس کی بنیاد مندرجہ ذیل باتوں پر ہے۔

عراقی جارحیت کی مذمت۔ نیز بین الاقوامی قوانین، اسلامی تعلیمات اور انسانی اقدار کی خلاف ورزی کرنے والے تمام اقدامات کو مسترد کرنا۔

قاہرہ میں منعقدہ ہنگامی عرب چوٹی کانفرنس کی منظورہ قرارداد، عرب لیگ کونسل کی قرارداد مورخہ ۳ اگست، تنظیم اسلامی کانفرنس کے بیان مورخہ ۴ اگست اور سلامتی کونسل کی قراردادوں (۶۶۰، ۶۶۱ اور ۶۶۲ وغیرہ) کی مکمل پابندی۔

کویت سے مکمل اور عراقی فوجوں کی غیر مشروط واپسی اور شیخ جابر احمد الصباح کی قیادت میں کویتی جائز قانونی حکومت کی بحالی۔

کویت کی ۲ اگست ۱۹۹۰ء سے پہلے کی پوزیشن کی بحالی۔

سعودی عرب کی سرحدوں سے عراقی فوجوں کا جماؤ ہٹانا۔

اس بات کی ضمانت دینا کہ عراقی حکومت کسی بھی دیگر عرب ملک یا خلیج کے ملک پر حملہ نہیں کرے گی۔

شاہ فہد نے کہا کہ خلیج عرب کے بحران کے سلسلہ میں سعودی عرب پالیسی کی بنیاد انھیں باتوں پر ہے۔ ان کے علاوہ جو بات بھی اس سلسلہ میں منسوب کی جائے گی وہ بے بنیاد اور جھوٹی ہوگی۔

اگر آپ اُردو کی بقا چاہتے ہیں تو

کم از کم ایک بچے کو روزانہ آدھا گھنٹہ

ضرور اُردو پڑھائیے، اُردو سکھائیے

ڈاکٹر شنکر دیال شرما

مولانا ابوالکلام آزاد

"نائب صدر جمہوریہ ڈاکٹر شنکر دیال شرما نے ۸ ستمبر ۱۹۹۰ء کو نئی دہلی میں مولانا آزاد صدی تقریبات کے اختتامی جلسہ میں مندرجہ ذیل تقریر کی۔"

یہ میری خوش نصیبی ہے کہ مجھے مولانا ابوالکلام آزاد کی رہنمائی، محبت اور حوصلہ افزائی حاصل رہی۔ میں حقیقی معنوں میں اس غیر معمولی شخصیت سے اپنی ذاتی وابستگی کی قدر کرتا ہوں۔

صد سالہ سالگرہ کی تقریبات کے دوران کئی مواقع پر میں نے مولانا آزاد کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں، ان کی حیات اور کارناموں اور جدوجہد آزادی کے دوران جماعتی اقدار و روایات اور آزادی کے بعد قومی تعمیر نو پر ان کے اثرات کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ ایک ذہین و فطین دانشور تھے۔ ان کے حساس تجزیے اور مشورے جدوجہد آزادی کے دوران اور آزادی کے بعد ہمارے لیے زبردست مددگار ثابت ہوئے۔ میرا خیال ہے کہ مولانا آزاد کی تحریریں، تقریریں اور خطوط نہ صرف تاریخی اعتبار سے بلکہ معاصر دور میں قومی اور انسانی دلچسپی کو جاننے کے لحاظ سے بھی اہمیت رکھتے ہیں۔ ہمیں یہ چیز ذہن میں رکھنی چاہیے کہ مولانا آزاد ایک عظیم اسلامی اسکالر، ایک بلند قامت ادبی شخصیت، ایک سرکردہ قوم پرست اور محب وطن، لائق منتظم کی خوبیوں اور قوتوں کے حامل تھے۔ انھوں نے اپنے بچپن سے

مابین دائمی قدیم انسانی اقدار اور تیز رفتار جدید کاری کے عمل سے گزرنے والے سماج کی ضروریات کے درمیان ہم آہنگی کا آدرش رکھا اپنی بصیرت سے انہوں نے ہماری رہنمائی کی اور ملک کو آئندہ درپیش خطرات سے باخبر کیا۔

پنڈت جی نے مولانا آزاد کے بارے میں کہا تھا ہم ہمیشہ جانتے تھے کہ ان کی رائے میں وزن ہوتا ہے کیونکہ اس رائے کے پیچھے ایک باشعور ذہن اور دماغ، ماضی اور حال کا علم اور وہ ذہانت ہے جو کم لوگوں کے حصہ میں آتی ہے۔ رہنمائی کی۔ لوگوں

ان کی بصیرت کا پیغمبرانہ وصف ان کے اس مشورہ میں ... باندھ کفنیاں ... جب انہوں نے تقسیم ... مسلمانوں کو دیا تھا برصغیر کی دوسری جانب روانہ ... ٹولی نکلی کرتے ہوئے مولانا نے انہیں متنبہ کیا تھا کہ انہیں ... ے ہوئے یہ وہ ماحول ... تعصبات ... ماری نوجوانی کر زمانہ پڑے گا ان کی حیثیت بن بلائے مہمان کی سی ہوگی ... بار ہولی ... جامع مسجد دہلی ... بہت سے دوستوں سے ایک اور تاریخی تقریر میں انہوں نے کہا تھا کہ ... قومی تعمیر نو کے ... وقت ... وہ یقین کی زندگی کیلئے موت کا پیغام ہے انہوں نے اسے ترک کر دینے کی اپیل کی ... کی نظر میں یہ لوگ جس چیز پر انحصار کر رہے تھے وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو رہی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ یہ لوگ جن لوگوں پر انحصار کر رہے ہیں وہ جلد ان کا ساتھ چھوڑ کر انہیں تقدیر کے حوالے کر دیں گے۔ یہ مولانا آزاد کی پیغمبرانہ تنبیہ تھی ... میرے بہت سے دوست جنہوں نے بھارت چھوڑا پچھتاوے کے ساتھ انہوں نے بعد میں مولانا کے الفاظ کی سچائی کی تصدیق کی۔ تاریخ نے انہیں سچ ثابت کر دیا ہے۔

مولانا آزاد بھارتی سیاسی نظام کے سیکولر مزاج کی زندہ علامت تھے۔ آزاد بھارت کی قیادت میں ان کی موجودگی اور تعلیم اور ثقافت کے سیکٹر میں ان کی رہنمائی مسلمانوں اور بھارت کے سیکولر ذہن کے لوگوں کے لئے باعث افتخار اور باعث حوصلہ تھی دنیا کے لوگوں کے لئے اس بات کا یقین دلانے کے لئے یہ ایک پہلو تھا کہ بھارت انسان دوستی اور سیکولرازم کی روایت پر قائم رہے گا۔

مذہب فلسفہ اور سیاست سے متعلق اپنے موقف کے اعتبار سے مولانا آزاد نے بھارت کی ترقی برعظیم

اور مثبت اثر ڈالا۔ اس کے ساتھ ہی ہمیں تکنیکی اور عملی نوعیت کے کام کی ترقی و فروغ میں حکمت عملی کی حیثیت سے زبردست اہمیت کے حامل تھے مولانا آزاد نے تعلیم کے کار کی حمایت کی اور پہلے پنچ سالہ منصوبے میں بنیادی تعلیم کو ایک اہم سیکٹر کی حیثیت سے فروغ دینے میں انہوں نے کامیابی حاصل کی۔ انہیں اعلیٰ تعلیم کے معیار میں اضافے سے گہری دلچسپی تھی مولانا آزاد نے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے قیام میں پہل کی۔ مولانا آزاد ہی تھے جنھوں نے کھڑک پور میں انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی قائم کیا اور ملک میں تکنیکی تعلیم کی بڑے پیمانے پر تنظیم نو کی۔ تک رے میں مجھے ان کے الفاظ یاد آتے ہیں۔ انہوں نے کہا تھا۔

"جمہوریہ کے سنبھالنے ب صدر جمہوریہ ہند نے ملک میں ایک فیصلہ یہ تھا کہ ملک میں اعلیٰ سطح ... ستمبر ۱۹۹۰ء کو ڈالی جائے کہ ہم اپنی بیشتر ضروریات ... کی تقریبات کے اختتام تک جب بھارت میں تکنیکی تعلیم کی سہولیات ... کی تدریس کی۔ " یہاں سائنس اور ٹکنالوجی کی تربیت حاصل کرنے آئیں گے"

یہ تھی آزاد بھارت کی تعلیمی پالیسی کا ابوالکلام نظریہ کی بصیرت۔ ثقافت۔ فنون اور ادب کے میدان میں بھی ان کی اس بصیرت کا اظہار تخلیقی انداز سے ہوا۔ مولانا آزاد نے ساہتیہ اکاڈمی، للت کلا اکاڈمی، سنگیت ناٹک اکاڈمی کے قیام میں اہم رول ادا کیا۔ ادب، مصوری، مجسمہ سازی، موسیقی، رقص، ڈرامہ اور دیگر عملی طور پر کرکے دکھائے جانے والے فنون میں تخلیقی و فنی مہارت کے اظہار کے میدان میں ملک کی آرزوؤں کی تکمیل کے لئے یہ ادارے اس لئے قائم کئے گئے تھے تاکہ یہ بھارتی عوام کی ذہانت اور فطانت کو فروغ دے سکیں۔ مولانا آزاد نے ثقافتی تعلقات کی بھارتی کونسل قائم کرنے میں بھی پہل کی جسے دنیا کے مختلف ممالک کے ساتھ ثقافتی تعلقات قائم کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔

مجھے جدوجہد آزادی کے رہنماؤں، باپو، پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد اور بہت سی عظیم شخصیات کی رہنمائی کا شرف حاصل رہا ہے آج آزادی کی چار دہائیوں کے بعد مجھے پوری

امید ہے کہ آج بہت سے درپیش چیلنجوں کے باوجود بھارت کے لوگوں نسان عظیم رہنماؤں کے آدرشوں، خوابوں اور آرزوؤں کی تکمیل کرلے اس موقع پر مجھے اردو کا جملہ یاد آرہا ہے جو جدوجہد آزادی کے وقت میری نسل کے لوگوں کو بہت پسند تھا

اپنی طاقت تول سپاہی

بلیدانوں کے ارمانوں سے

یہ خواہش ایک عظیم کام کے لئے تھی یعنی ملک کے لئے قربانی کی۔ لوگوں نے شہیدوں کو ان الفاظ میں یاد کیا۔

گھر سے باندھ کفنیاں

شہیدوں کی ٹولی نکلی

یہ اس دور کے جذبات تھے جن میں ہم بڑے ہوئے یہ وہ ماحول تھا جو ہماری نوجوانی کے زمانے میں ہمارے عظیم رہنماؤں نے پیدا کیا تھا میرے بہت سے دوستوں نے جو آج حیات نہیں ہیں اپنے ملک کے خواب دیکھے اور خود کو آزادی اور قومی تعمیر نو کے لئے وقف کیا۔ مجھے امید ہے اور میری دعا ہے کہ یہ عظیم ملک جس نے چار دہائیوں قبل آزادی حاصل کی اور جس نے ساری دنیا میں آزادی کی جدوجہد میں حصہ لیا ان آدرشوں اقدار و مقاصد کو عزیز رکھے گا جو مولانا آزاد کو عزیز تھے یعنی سیکولرازم سچائی، انصاف انسانیت اور بھائی چارے کے آدرش۔ ان آدرش کے بارے میں مولانا آزاد نے ترجمان القرآن میں لکھا اور یہ قرآن شریف کا پیغام ہے۔ سیکولرازم قرآن شریف کا عظیم پیغام ہے یہ چیز تمام مسلمانوں کو جاننی چاہیئے۔ اس سچائی کو جاننے کے لئے ہمیں فاتحہ الفتح کو دیکھنا چاہیئے۔ قرآن شریف میں اس کا بار بار ذکر ہے ہماری جدوجہد آزادی کی ایک اور قدآور شخصیت جن کی ہم مسلسل یاد منا رہے ہیں وہ تھے خان عبدالغفار خاں۔ وہ کہا کرتے تھے کہ انہوں نے انسانیت اور سیکولرازم نہ صرف مہاتما گاندھی بلکہ قرآن شریف سے سیکھا ہے وہ اس قرآنی اصول کا ذکر کیا کرتے تھے کہ ہماری عبادت ہمارے بندوں کی خدمت میں ہے۔ ●●●

ڈاکٹر حسن الدین احمد
عزیز باغ - [illegible] دروازہ حیدرآباد

سروجنی نائیڈو کی نظموں کے اردو ترجمے

جن ہندوستانیوں نے انگریزی زبان میں شاعری کی ہے ان میں ٹیگور، سروجنی نائیڈو، سر نظامت جنگ اور آر بند خاص طور پر قابل ذکر ہیں جن کی شاعری کو انگریز شاعروں کے ہم پلہ قرار دیا جا سکتا ہے لیکن سروجنی نائیڈو انگریزی زبان میں شاعری کرنے والے ہندوستانیوں میں اونچا مقام رکھتی ہیں۔

سروجنی ۱۳ فروری ۱۸۷۹ کو شہر حیدرآباد میں پیدا ہوئیں۔ ان کا تعلق بنگال کے روشن خیال برہمن خاندان سے تھا انیسویں صدی کے ربع آخر کے لگ بھگ حیدرآباد کے نامور وزیر مختار الملک سر سالار جنگ کے دور میں ملک ہندوستان کے مختلف حصوں سے جن لائق افراد نے حیدرآباد کا رخ کیا تھا ان میں سروجنی کے والد ڈاکٹر اگھور ناتھ چٹوپادھیائے بھی تھے وہ ۱۸۷۸ء میں حیدرآباد آئے اور حیدرآباد کالج کے پہلے پرنسپل مقرر ہوئے۔ وہ ایک سائنسداں، ماہر تعلیم، روشن خیال اور وسیع النظر آدمی تھے۔ انہوں نے حیدرآباد میں جدید تعلیم کی ترویج اور ترقی کے سلسلے میں اہم خدمات انجام دیں ان کو تعلیم کے علاوہ حیدرآباد کے سماجی مسائل اور عام ترقی سے گہری دلچسپی تھی۔

سروجنی ان کی بیٹی تھیں، بچپن ہی سے ان کو علم و ادب کا ستھرا ماحول ملا۔ مدراس میں تعلیم حاصل کی اور بارہ سال کی عمر میں مدراس یونیورسٹی سے میٹرک کے امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کی اور یونیورسٹی میں اول آئیں۔ جب سروجنی سولہ سال کی ہوئیں تو سر وقار الملک کی سفارش پر حکومت حیدرآباد سے مہر بانی ملک

اعلیٰ تعلیم کا وظیفہ منظور ہوا اور وہ انگلستان روانہ ہوئیں جہاں تین سال تک زیر تعلیم رہیں اور ۱۸۹۸ء میں ہندوستان واپس ہوئیں۔

سروجنی نے شاعرانہ طبیعت پائی تھی میٹرک میں تعلیم کے دوران ہی سے انہیں شاعری کا ذوق تھا اور وہ انگریزی زبان میں اچھی اچھی نظمیں لکھنے لگیں۔ انگلستان گئیں اور انگریزی شاعروں کا مطالعہ کیا تو اس شوق کو بڑھاوا ملا۔ وہ عموماً انگریزی موضوعات پر طبع آزمائی کرتی تھیں۔ انگلستان میں نامور ادیب اور نقاد ایڈمنڈ گاس EDMUND GOSSE سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے مشورہ دیا کہ ہندوستان اور خاص طور پر حیدرآباد کے ماحول پر نظمیں لکھیں جس کو سروجنی نے خوشی سے قبول کیا کیونکہ خود ان کو ہندوستانی ہونے پر فخر تھا اور حیدرآباد، اس کی ملی جلی تہذیب سے بے حد پیار تھا اور وہ اس ماحول سے اپنائیت محسوس کرتی تھیں۔ حیدرآباد کو شہر گوہرین کہتی تھیں چنانچہ انہوں نے گولکنڈہ کے شاہی مقبرے، حسین ساگر، مچھیرے، ماہی گیر، دیہاتی گیت، شہر حیدرآباد میں، ایمرِ شب، تاجدار دکن، سلامی دعا وغیرہ عنوانات پر خوبصورت نظمیں لکھیں۔

انگلستان سے واپسی کے تین ماہ بعد سروجنی کی شادی ڈاکٹر گوبند راجلو نائیڈو سے ہوئی جو اعلیٰ ذات کے نہ تھے۔ آج بھی ایک اعلیٰ ذات کی لڑکی کا نیچ ذات کے نوجوان سے شادی کرنا رواج کے خلاف بات سمجھی جاتی ہے لیکن اس زمانے میں تو یہ بات فقید المثال تھی۔ یہ شادی برہمو سماج کے رسوم کے تحت ہوئی۔

۱۹۰۵ء سے سروجنی نائیڈو سیاست میں حصہ لینے لگیں۔ آزادیٔ ہند کی تحریک میں پیش پیش تھیں ملک کی آزادی کے بعد پہلی خاتون گورنر کی حیثیت سے یوپی گئیں لیکن سماجی اور سیاسی مصروفیات کے درمیان شاعری سے ناطہ ہمیشہ جوڑے رکھا۔

سروجنی نائیڈو کی انگریزی نظموں کے چار مجموعے شائع ہوئے۔ پہلا مجموعہ The Golden Threeshold سنہرا آستانہ کے نام سے شائع ہوا جس کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہوئی۔ اس کے بعد تین مجموعے Bird of Time طائر وقت The Broken Wing پر شکستہ اور The Sceptered Flute کے نام سے شائع ہوئے۔

بقول جناب محمد فضل الرحمٰن سروجنی نائیڈو کی نظموں میں نہ صرف موضوعات کا تنوع، تخیل کی رنگینی جذبات کی گہرائی اور خیالات کی بلندی پائی جاتی ہے بلکہ سارے کا سارا کلام رنگین اور نغمگی میں ڈوبا ہوا ہے اور جس کی تاثیر سے پڑھنے والا ایک ایسی خیالی دنیا میں منتقل ہو جاتا ہے جو کسی طلسماتی عالم سے کم نہیں۔"

اس مایہ ناز انگریزی شاعرہ کی ایک خوبصورت نظم "تاجدارِ دکن" ہے سروجنی نائیڈو نے شاہ دکن نواب میر محبوب علی خاں کی توصیف میں معرکۃ الآرا نظم لکھی جس کا ترجمہ نثر میں ظفر قریشی دہلوی نے کیا اور اس نظم نے اردو زبان کے مشہور ادیب و شاعر ظفر علی خان کو اس درجہ متاثر اور اپنی جانب متوجہ کیا کہ انہوں نے اس کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا جس کا ایک بند یہ ہے۔

سب اپنی رعایا پہ نظر تیری ہے یکساں
ہے ایک تجھے ہو وہ برہمن کہ مسلماں
تو اُمتِ احمد کا ہے سرتاج تو آقا
اور ان کا جو رکھتے ہیں قشقہ سے تاباں

سورج کے پجاری ہیں تری آنکھ کا تارا
جو چھوڑ کے آئے تھے یہاں ساحلِ ایراں
تو ان کا خداوند ہے جو اس کے ہیں بندے
جو بحر کی موجوں پہ ہوا رات کو پویاں

اسی شاعرہ کی ایک انگریزی نظم "The Prayer of Islam" یعنی اسلامی دعا کا منظوم ترجمہ سعید کاکوروی نے "اسمائے حسنیٰ" کے نام سے کیا ہے (اصل نظم اور منظوم ترجمہ اسی شمارے میں شریکِ اشاعت ہے۔

اگر ہم اس نقطہ نظر سے دیکھیں کہ کس شاعر کی کتنی منظومات کے ترجمے اردو میں ہوئے تو سروجنی نائیڈو کو امتیاز حاصل رہے گا کیونکہ پی بی شیلی کو چھوڑ کر سروجنی نائیڈو کی نظموں کی تعداد جن کے ترجمے اردو میں ہوئے دوسرے انگریزی شاعروں کی نظموں سے زیادہ ہیں۔"

اگر شیل درمیان میں نہ آتے تو شاید یہ خیال ہوتا کہ دیسی شاعرہ ہونے کی وجہ سے سروجنی نائیڈو کے کلام نے اردو شاعروں کو متوجہ کیا لیکن ایسا نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ سروجنی کے کلام کی خوبیوں نے بارہ اردو شاعروں کو اپنی جانب متوجہ کیا ان میں سیف الدین شباب، سیفر کاکوروی، حامد علی خاں، شفیق کاکوروی، لیسین علی خاں، احسن اکبر آبادی، ظفر علی خان اور ضیا ربانی قابل ذکر ہیں۔

سروجنی نائیڈو کے بلند پایہ کلام نے اردو کے شاعر سیف الدین شباب کو اس درجہ متاثر کیا کہ انہوں نے اسی شاعرہ کے انگریزی کلام کو اردو کا جامہ پہنانے کے سوا اور کوئی شاعری تقریباً نہیں کی اور کم و بیش یہی حال سیفر کاکوروی کا بھی رہا۔ اردو ہی کیا کسی بھی زبان کی شاعری کی تاریخ میں اس کی مثال شاید ہی ملے گی کہ کسی شاعر نے اپنی ساری شعری صلاحیتوں کو کسی دوسرے شاعر کی نظموں کے ترجمہ کے لئے وقف کر دیا ہو۔ اس نوبت پر جناب سیف الدین شباب اور سیفر کاکوروی کے حالات کا ذکر مناسب ہوگا۔ محمد سیف الدین شباب یکم اگست ۱۸۸۲ء کو بمقام مدراس پیدا ہوئے۔ ۱۰ ارجون ۱۹۰۳ء سے ریاست حیدر آباد میں سرکاری ملازمت کا آغاز ہوا۔ نواب علی نواز جنگ جس وقت چیف انجینئر تعمیرات تھے تو شباب ان کے محکمہ میں رجسٹرار تھے۔ برج کے مانے ہوئے کھلاڑی تھے۔ نواب محمود نواز جنگ صوبہ دار یعنی کمشنر کے داماد تھے۔ شباب کے فرزند ایڈمرل احسن مشرقی پاکستان کے گورنر رہے۔

شباب کے سروجنی نائیڈو سے دوستانہ تعلقات تھے اور وہ سروجنی کے بڑے مداح تھے۔ شباب نے اپنی شاعری کو سروجنی نائیڈو کی انگریزی نظموں کے منظوم ترجموں کے لئے وقف کر رکھا تھا۔ اس ادبی ربط کا کرشمہ سمجھنا چاہیئے کہ ہر دو کا انتقال ایک ہی دن ہوا یعنی ۲ مارچ ۱۹۴۹ء۔

فخر الدین احمد سیفر کاکوروی ۱۶ راپریل ۱۸۷۶ء کو پیدا ہوئے۔ ذکی الدین احمد تعلقدار یعنی کلکٹر ضلع بیڑ کے فرزند تھے کچھ عرصہ ریاست حیدر آباد کی ملازمت میں رہے لیکن علیل ہو کر وطن کاکوری گئے اور آخر تک وہیں مقیم رہے۔ ۱۹۴۰ء میں بمقام کاکوری انتقال ہوا۔ مجموعہ کلام مرتب ہوا جس کا مقدمہ سر شیخ عبدالقادر نے لکھا تھا۔ اس کی اشاعت نہ ہو سکی۔ انجمن ترقی اردو ہند کے دفتر میں رہا۔ تقسیم کے

وقت تلف ہو گیا۔ سفیر کو سروجنی نائیڈو کی شاعری سے خاص شغف رہا۔ قیام حیدر آباد کے دوران ان سے تبادلۂ خیال کے مواقع بھی فراہم ہوئے۔ سفیر نے سروجنی نائیڈو کی انگریزی نظموں کو اپنی خاص توجہ کا مرکز بنایا اور ان کے منظوم ترجمے کئے جن میں قابلِ ذکر یہ ہیں۔

مجری، حسین ساگر۔ نسترن۔ نغمۂ صحرائی۔ نوائے آوارگی

سروجنی نائیڈو کی نظم "حسین ساگر" کا ترجمہ سفیر کاکوروی نے بھی کیا ہے۔ سیف الدین شباب نے بھی۔ سیف الدین شباب کے ترجمہ کے چند اشعار یہ ہیں:-

ہے چشمۂ محبت تو اے حسین ساگر — دلچسپ و جانفزا ہے کیا خوب تیرا منظر
کرتے ہیں سب نچھاور در نیاز تجھ پر — دوشیزۂ سحر بھی کرتی ہے ناز تجھ پر
دکھلا رہی ہے کیا کیا وہ دلربا ادائیں — گرویدہ کر رہی ہیں سب کو تری فضائیں
بن کر تری محبت خود چھا رہے ہیں بادل — نظارہ کر رہے ہیں منڈلا رہے ہیں بادل

ایک نظم Village song کا منظوم ترجمہ سفیر کاکوروی نے نغمۂ آبگیر اور یٰسین علی تعاشق نے پنہاری کے عنوان سے کئے۔ سفیر کاکوروی کے ترجمہ کے چند شعر سنئیے۔

گھر تک تو بھری گگری سنبھلے گی یہ مشکل سے ؛ دل بیٹھا سا جاتا ہے اب دوریٔ منزل سے
متوالی رہو، کب تک ملاح کے گاتے ہیں ، گھر جانا بھلا بیٹھی بھایا جو مجھے دل سے
یہ رات اور سناٹا دھاڑیں یہ درندوں کی ؛ آواز سنی جاتی ہے چرخ کی مشکل سے
رات آئی اندھیری اور آلو کی صدا آئی ؛ کالے نہ کہیں نکلیں ڈر ہے سم قاتل سے

گولکنڈے کے شاہی مقبروں پر جو نظم ہے اس کے دو ترجمے سیف الدین شباب اور ضیا ہانی نے کیے ہیں۔ ضیا ہانی کے منظوم ترجمے کے چند اشعار سنئیے:

کس طرح شاہی مقابر کی فضا سے وقت شام
گونجتے گنبد ہیں میرے ذہن میں شاہوں کے نام

مقبروں کے پاس بیٹھی سوچتی ہوں بار بار
جنگ کے ڈنکے بجے تھے ان کی ہے یہ یادگار
ہیں ابھی سنسان میداں آج تک اس کے گواہ
بن چکے ہیں جنگ و خونریزی کی یہ تخریب گاہ
پھر رہے ہیں میری نظروں میں وہ تیغوں کے نشان
وہ اُمنگیں وہ تڑپ وہ جوش کا سیل رواں
جان دے دی شوق سے اپنے وطن کے واسطے
مل گئے مٹی میں تسکین چمن کے واسطے

سروجنی نائیڈو کی ایک بڑی خوبصورت نظم Nightfall in the city of Hyderabad ”شہر حیدرآباد میں آمد شب“ اس کا کامیاب ترجمہ یسٰین علی خاں ”نزول شب“ کے نام سے اور شاذ تمکنت نے ”رات شانوں پر ہے“ کے نام سے کیا ہے شاذ تمکنت کا ترجمہ سُنیئے:

اُفق پہ رنگینی شفق ہے کہ فاختہ بال کھولے بیٹھے
تمام نیلم نما، مرجان نگینے جیسے جڑے ہوئے ہیں
وہ شہر کا باب، اور یہ ہے سفید دریا چمک رہا ہے
سنہری چنگاریاں سی نکل رہی ہیں
اذاں کی آواز آ رہی ہے شہر کے بام و در پہ جیسے
فضاؤں میں پیچ و خم کی پھریرے پھر رہے
دریچے جاگے اداس چہرے
پس نقاب وقار شوکت
دریچے جاگے
سنو کہ چاندی کی گھنٹیوں کی صدائیں گونجیں

کہ ہاتھیوں کی قطار گلیوں میں گھومتی ہے

سواریوں کا ہجوم دیکھو وہ چار مینار جس کے اطراف

شور و غل ہے

وہ ساز و آہنگ رقص و مستی کہ شور و غل جس میں کھو گیا ہو

وہ شہر کا پل دمک رہا ہے کہ رات شاہانہ آ رہی ہے

کہ جیسے ملکہ رواں ہو شہر طرب کی جانب

سروجنی نائیڈو کی انگریزی نظم Ecstasy نے تین اردو شاعروں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ اس نظم کا اردو منظوم ترجمہ حامد علی خاں نے "کیفِ بہار" کے نام سے۔ شفیق کاکوروی نے "حالتِ وجد" کے نام سے اور امیر چند بہار نے "بے خودی" کے نام سے کیا۔

امیر چند بہار کے ترجمہ کے پہلے بند کو ملاحظہ فرمائیے۔

اٹھو بہار آ گئی چمن میں ہے سبزہ زار میں

وہ عندلیب خوش نوا خوشی سے گا رہی ہے اب

وہ جوئبار کس طرح مچل کے آ رہی ہے، آج

وہ مور بھی تو دیکھئے محوِ رقص و رنگ ہیں

سروجنی نائیڈو کی نظموں کے اردو ترجموں کا مجموعہ "ورثمین" کے نام سے تصدق حسین تاج نے ۱۹۲۷ء میں مرتب کیا۔ اس مجموعہ میں تمام منظوم ترجموں کا احاطہ نہ ہو سکا۔

"ساز مغرب" کے دس حصوں کے منجملہ دوسرے، چوتھے، ساتویں، نویں اور دسویں حصوں میں سروجنی نائیڈو کی نظموں کے تقریباً تمام منظوم ترجموں کو بازیافت کیا گیا ہے۔

اردو لکھیئے، پڑھیئے اور بولیئے

اردو کی بقاء کیلئے یہ ضروری ہے

علی احمد عمر صدیقی
بیلا ہلز۔ حیدرآباد ۴

کویت سے ذریعہ موٹر کار واپسی

عراق کے حملے کے بعد کویت میں ہندوستانی شہریوں کو جن مصیبتوں اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا وہ آج بھی ہمارے سامنے ہے لیکن تنہا موٹر کار کے ذریعہ کویت سے ہندوستان اور پھر حیدرآباد تک پہونچنے کا تصور خود ایک خواب لگتا ہے لیکن عزم اور حوصلہ کے آگے منزلیں جھک جاتی ہیں، اس کا اندازہ آپ خود میری حیدرآباد آمد سے لگا سکتے ہیں۔ میں موٹر کار کے ذریعہ ۲۸ دن کا سفر کرتے ہوئے ۱۱ اکتوبر کو حیدرآباد میں اپنے مکان واقع بیلا ہلز پہونچا۔

میں ۱۹۷۵ء سے کویت ایئرویز میں ٹرانک آفیسر کے عہدے پر مامور رہا۔ یکم اگسٹ کی صبح ۸ بجے معمول کے مطابق ڈیوٹی پر پہونچا تو کچھ ہی دیر میں رن وے پر عراق کے فوجی ٹینکر سیں آتے دکھائی دیئے۔ پھر ایک فوجی میرے قریب آ پہنچا اور میرا شناختی کارڈ دیکھنے کے بعد گھر واپس لوٹ جانے کی تاکید کرتے ہوئے میرے کندھے پر لگی پٹیاں نکلوا دیں۔ میں ایرپورٹ سے ۲ کیلو میٹر دور موٹر کار میں اپنے مکان پہونچا اور پھر حالات کا جائزہ لینے کے بعد کویت میں (جس پر اب عراق کا قبضہ ہے) قیام کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے دن گزارنے لگا۔ میں اپنے فیصلے کے مطابق وہیں رہنا چاہتا تھا لیکن ۱۲ ستمبر کی شب وائس آف امریکہ نے اطلاع دی کہ تارکان وطن کو واپس ہو جانا چاہیئے اور پھر عراقی فوجی میرے مکان میں داخل ہوئے اور کہا کہ آدھے گھنٹے میں اس ملک کو چھوڑ دیں۔ میں کچھ سامان لینا چاہتا تھا لیکن مجھے اتنا وقت بھی نہیں دیا گیا۔ تنہا مختصر سے سامان کے ساتھ نکل پڑا تو

شہر بصرہ اور بغداد کے بعد ترکی، ایران، پاکستان اور پھر امرتسر کے راستے ہندوستان میں داخل ہو گیا۔

کویت میں (۴۵) دن میں نے بڑے سکون و اطمینان کے ساتھ گذارے کیونکہ میرے پاس رقم تھی اور کھانے پینے کی اشیاء بھی آسانی سے دستیاب ہو رہی تھیں تاہم پینے کا پانی صاف ستھرا نہ ہونے کے باعث ایک تھکان اور کاہلی سی محسوس ہو رہی تھی۔ اور پانی کے استعمال سے جلد بھی اکھڑ رہی تھی۔ ہندوستانیوں کے ساتھ عراقی فوجوں کا سلوک انتہائی دوستانہ تھا اور ہندوستانیوں کو ہندوستانی سفارت خانے میں بھی بڑی حد تک سہولتیں فراہم کی گئیں۔ کویت کے امیر شیخ جابر احمد الصباح کی جانب سے بھی تارکان وطن کو پیام وصول ہوا تھا جس میں تلقین دیا گیا کہ بیرونی باشندے اپنے وطن واپس جائیں۔ دوبارہ کسی بھی وقت حالات میں بہتری پر طلب کر لیا جائے گا۔ اگرچہ کہ میں ۱۵ ستمبر کو کویت سے روانہ ہوا لیکن عراق کی سرحد پر مجھے صدر عراق صدام حسین کے احکامات کے حصول تک (۵) دن رکنا پڑا جہاں اس دوران (۳) تا (۴) ہزار افراد اور جمع ہو گئے۔ یہاں ایک پاکستانی لڑکی جو بیمار رہا کرتی تھی دوا نہ ملنے پر فوت ہو گئی۔ بہرحال ۲۰ ستمبر کو میں نے کار کا سفر شروع کیا اگرچہ کہ تنہائی اور خوف برابر تھا لیکن منزل کی امید میں جیسے جیسے میں آگے بڑھتا گیا میرے حوصلے بڑھانے والے بھی برابر ملتے گئے ایران میں مجھے نہ صرف کھانے پینے کی خوراک فراہم کی گئی بلکہ میری ہمت افزائی بھی کی گئی اس طرح میں آگے بڑھتا گیا اور سفر میں کہیں توقف نہیں کیا صرف سرحد سے سرحد پہنچنے پر ہی کچھ دیر آرام ضرور کیا۔ میری کار میں (۵۰۰) کیلو میٹر تک راستہ طے کرنے کا پٹرول تھا مگر ہر (۴۰۰) کیلو میٹر کے بعد جہاں پٹرول ٹینک ملا پٹرول حاصل کرتا رہا۔ تمام راستے طے کر کے جب میں پاکستان پہونچا تو ویزا کے لئے مجھے وہاں (۵) دن توقف کرنا پڑا۔ اس دوران میری بہتر طور پر خاطر تواضع کی گئی۔ پھر امرتسر سے ہندوستانی سرحد پر قدم رکھتے ہوئے دہلی ہو یا تہ وادی جبل اور عادل آباد ہوتے ہوئے حیدرآباد پہونچا۔ اپنے اس طویل سفر کے دوران میں مسلسل کار چلاتا رہا۔ تھکان اور جسمانی اعضاء جواب دے رہے تھے لیکن میرا عزم مصمم مجھے آگے بڑھاتا رہا۔

ایک بار مسلسل (۲۰) [illegible] چلاتا رہا۔ اور ایک مرتبہ تو اونچائی چکار شدہ رہی تھی کہ میری

آنکھ میں کچھ چلا گیا مگر اس کے باوجود اسٹیرنگ سے میں نے ہاتھ نہیں ہٹائے اور آنکھ بھی بند نہیں کر سکا۔ اور یہ کشمکش مسلسل ۱۰ منٹ تک جاری رہی۔ میرے سفر کا سب سے دلچسپ پہلو یہ رہا کہ جب میں خوفناک ڈاکوؤں کی وادی چنبل سے رات بھر سفر کر کے صبح صبح ایک پیٹرول پمپ پہونچا تو وہاں پیٹرول پمپ والوں نے خود حیرت کا اظہار کیا اور کہا کہ "ہم اس راستے سے دن میں تنہا نہیں گذرتے" اس کے علاوہ عادل آباد سے بھی میں جب آگے بڑھا تو لوگوں نے مجھے دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا۔ کویت میں اب بھی ۸ تا ۱۰ ہزار ہندوستانی ہیں اور وہ اسی کشمکش میں مبتلا ہیں کہ آیا واپس ہوں یا نہیں اگر واپس آتے ہیں تو ان کا مستقبل کیا ہوگا؟ یہ سوال اس وقت ان کے لئے پریشان کن ثابت ہو رہا ہے لیکن فوج کی نظر میں آئے بغیر حالات کے معمول پر آنے تک ہندوستانی وہاں نکل سکتے ہیں۔ عراق کے حملے کے ۸ تا ۱۰ دن بعد کویت میں کچھ ادارے کھلے لیکن کچھ دن بعد پھر بند بھی ہو گئے۔ بعض کویتی شہریوں نے عراقی فوج کے خلاف تحریک بھی کی لیکن اس کا انجام ظاہر ہے۔ اس لمبے اور تھکا دینے والے سفر میں میں جہاں سے بھی گذرا مجھے پیار و محبت کے ساتھ لوگوں کی مدد بھی ملی۔ گو میرے (۵۰) ہزار روپئے خرچ ہوئے جو (۷۰۰) کویتی دینار کے برابر ہوتے ہیں۔ میری پرانی TOYOTA CAR نے میرا ساتھ دیا اور میرا عزم مجھے آگے بڑھاتی رہی۔ ایک مرحلہ پر میں اپنی کار سرحد پر چھوڑ دینا چاہتا تھا مگر موقعہ مل گیا اور میں اسے اپنے گھر تک لا سکا۔ نہ جانے مستقبل کس صورت میں سامنے آئے۔ ہو سکتا ہے گھر بیٹھے بیٹھے کر دن گذاروں یا بمبئی میں ملازمت کر لوں یا کویت میں اپنی سابقہ ملازمت پر رجوع ہو جاؤں۔

جب میں (۲۸) دن کے سفر کے بعد اپنے مکان واقع ریڈ ہلز پہونچا تو میری تھکان خود بخود دور ہو گئی اور گھر کے افراد کو دیکھنے کے بعد میں نے راحت و چین کی سانس لی۔ یہ میری والدہ کی دعاؤں کا اثر ہے کہ میں صحیح و سلامت خیر و عافیت سے مکان واپس لوٹا۔ میری والدہ ہمیشہ سے میرے لئے منتیں مرادیں کرتی آئی ہیں اس لئے کویت سے نکلتے وقت ہی مجھے یہ یقین تھا کہ مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ اور میں صحیح سلامت اپنی والدہ کے پاس پہنچ جاؤں گا۔ بس دعاؤں اور میرے حوصلے نے مجھے یہاں پہنچایا!

نذر الحفیظ ندوی ازہری

کویت پر صدام کی یورش

نقصان کس کا ہوا؟

صدام فلسطینیوں کے سب سے بڑے ہمدرد و غم گسار ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اس یورش سے مقبوضہ فلسطین کے باشندے ایک سو بیس ملین ڈالر سالانہ آمدنی سے محروم ہو گئے۔ جو اُن کے عزیز و اقارب کویت سے مہیا کرتے تھے حکومت کویت کے خرچے پر جو ہزاروں فلسطینی تعلیم حاصل کر رہے تھے ان کی تعلیم ختم ہو گئی، انتفاضہ تحریک کو جو فیاضانہ مدد ملتی تھی وہ بند ہو گئی۔

جبل طور پر کویت کے تحریک پسندوں کی مدد سے جو شاندار ہاسپٹل قائم کیا گیا اس کے ۵۷٪ اخراجات بھی جمعیۃ الاصلاح کے ذریعے فراہم کئے جاتے تھے، اس شفاخانے کو انتفاضہ ہاسپٹل بھی کہتے ہیں کہ زخمی فلسطینیوں کی بڑی تعداد یہیں علاج کے لئے داخل ہوتی ہے ۱۹۸۴ء میں جمعیۃ الاصلاح نے فلسطین کی اقتصادی و معاشرتی اصلاح و ترقی کے لئے دو امدادی کمیٹی بنائی تھی، اس کمیٹی نے ۱۹۸۲ء سے اب تک ہر ماہ چھ ملین ڈالر پابندی سے مقبوضہ فلسطین کے شہداء اور زخمیوں کے لئے مہیا کیے تاکہ جو لوگ شہید اور زخمی ہونے کی وجہ سے آمدنی سے محروم ہیں ان کی مدد کی جائے۔

مقبوضہ فلسطین کے باشندوں کے لئے جو طبی مراکز قائم کئے گئے تھے ان کو دواؤں کی مد میں ۱۹۸۷ء سے اب تک سالانہ ساٹھ ملین ڈالر کی مدد دی۔ پہلے بہ ۱ ایمبولینس گاڑیاں دی گئیں

مرکزی شہر کے لئے پانچ ایمبولینس الگ ہیں۔

اس کمیٹی نے پچاس لاکھ چالیس ہزار ڈالر کی لاگت سے پورے مقبوضہ فلسطین میں کلینک اور طبی مراکز قائم کیئے۔

اس کمیٹی نے ساڑھے چھبیس ملین ڈالر کی لاگت سے حفظ قرآن، اسلامی سنٹرس یتیم خانے اور مویشی فارم قائم کیئے۔

مساجد اور مدارس، داعیوں، واعظوں اور مبلغین پر سالانہ سات ملین ڈالر خرچ کرتی ہے۔

ہر سال تین ملین ڈالر سماجی وفلاحی اسکیموں پر صرف کرتی ہے

چودہ ملین ڈالر سالانہ صرف شہداء کی بیواؤں کے لئے مخصوص تھے۔

ایک سو چالیس ملین ڈالر سالانہ امداد واعانت کے نام سے بھیجا جاتا تھا۔

اب آپ میزان لگاکر دیکھ لیجئے کہ صرف فلسطینی کاز کے لئے کویت کے تعیش پسند کتنی مدد فراہم کرتے تھے، یہ سارے اعداد وشمار کویت کی سماجی تنظیم جمعیۃ الاصلاح کی خدمات کے ہیں سرکاری امدادی رقم کا یہاں ذکر نہیں۔

فلسطین کے بعد دوسرے نمبر پر اسلامی دنیا کے لئے افغانستان کا قضیہ ہے جس نے تمام دنیا کے مسلمانوں کو بے چین ومضطرب بنا رکھا ہے۔ اس دس سالہ جہاد میں افغانیوں نے ایک لاکھ سالانہ کے حساب سے اپنے کو قربان کیا ہے۔ دنیا کے دوسرے خطوں کے مسلمانوں نے بھی جان ومال سے حسب حیثیت حصہ لیا ہے عراق کے علاوہ عالم عربی کے ہر خطہ سے عرب نوجوان جذبۂ جہاد سے سرشار ہوکر شہادت کے خلعت سے سرفراز ہوتے رہے ہیں کویت نے اس دس سالہ جہاد میں اپنے دو سو فرزندوں کی قیمتی جانوں کا نذرانہ پیش کیا ہے۔

جمعیۃ الاصلاح نے جہاد کے آغاز ہوتے ہی ایک کمیٹی بنادی تھی۔ اس نے اب تک حسب ذیل کام انجام دیئے ہیں۔

پاکستان اور افغانستان کی اٹھارہ سو میل لمبی سرحد پر ایک سو پچاس طبی مرکز۔ بارہ سو بستروں پر مشتمل دو بڑے ہسپتال۔ طلباء اور طالبات کے لئے الگ الگ آٹھ سو مدارس ان میں تعلیم پانے والے تمام افغان طلباء وطالبات کا اخراجات کویتی اہل خیر برداشت کرتے ہیں پچاس ہزار افغان یتیم بچوں کی پرورش کے سارے اخراجات کویت کے اہل خیر برداشت کرتے ہیں۔

اسی ملین ڈالر سالانہ کی رقم شہداء کے گھرانوں کے لئے مخصوص تھی۔

افغانستان کے اندر پانچ سو کنویں کھدوا کر وقف کئے گئے ہیں

کویتی ھلال احمر کی طرف سے پچاس ایمبولینس افغان مجاہدین کے لئے وقف ہیں۔ اس کے سارے اخراجات کویتی ھلال احمر اٹھاتی ہے۔

تعیش پسند کویتیوں کے اس سلوک کے برعکس اسلامی جہاد کا نعرہ بلند کرنے والے مجاہد صدام حسین کا یہ حال ہے کہ افغانستان کے لئے چندہ وصول کرنے اور دینے والے چار سو طلباء کو گولی سے اڑا دیا۔

اردن کو اس یورش سے سالانہ ایک ارب ڈالر کا خسارہ ہوا ہے، اس کے بیالیس فیصدی باشندے کویت میں کام سے لگے ہوئے تھے وہ بیکار ہو گئے۔

لبنان کے مسلمانوں کو خانہ جنگی سے نمٹنے کے لئے مہیا رقوں کی مد میں سالانہ ۴۲ ملین ڈالر، دینی مدارس ومکاتب کے لئے تین ملین ڈالر سالانہ، بیواؤں اور یتیموں کی خبر گیری کے لئے نو لاکھ ڈالر سالانہ دو لاکھ اسی ہزار زرعی منصوبوں کے لئے آٹھ سو لاکھ چھتیس ہزار ڈالر سالانہ لبنانی مسلمانوں کی عمومی مدد کے لئے۔

عراقی نفاق : عراقی ریڈیو عربی زبان کی نشریات میں اپنے عرب سامعین سے جہاد کرنے، عرب حکمرانوں کو تختہ دار تک پہونچانے، دینی و اسلامی الکویت بلکہ اسلامی خلافت قائم کرنے کی اپیل کرتا ہے تو دوسری طرف انگریزی نشریات میں سعودی عرب میں

(باقی صفحہ پر)

ڈاکٹر کے بھگتہ وتسل راؤ
نیو ملکپٹ۔ حیدر آباد ۳۶

اُردو کیا کہتی ہے

اُردو سرزمینِ ہند کی ایک زبان ہے اس کی جوانی بھارت ماتا کی گود میں ہوئی ہے سلطنت میں آنے سے پہلے کوتوالی زبان تھی۔ فوج کی زبان تھی۔ سپاہیوں کی زبان تھی۔ پہرہ داروں کی زبان تھی۔ گھوڑ سواروں گھوڑوں کو سنوارتے ہوئے آپس میں اس زبان میں ہی مخاطب ہوا کرتے تھے بات چیت کرتے تھے لطف اندوز ہوتے تھے اس میں جوش ہے ولولہ ہے مٹھاس بھی ہے روانی ہے تو سیلاب کی کمی نہیں رواداری ہے تو بھائی چارگی کی کمی نہیں اس زبان میں صبر و تحمل ہے تو ہم آہنگی بھی۔ جتنی دبی رہی اتنی ہی ترقی کرتی رہی۔

دوسری زبانوں کو لے کر چلتی تھی۔ ملنساری کی کیفیت ہونے کے بعد بھی مجھ پر کیچڑ اُچھالا جاتا ہے۔

اُردو کو ملیچھ زبان کیوں سمجھتے ہو
یہ تو چکبست و سرور کی زبان ہے اُردو
اُردو کو مٹاؤ گے تو مٹ جائے گی
تجھ کو کیا معلوم تہذیب میں کس قدر کمی آئے گی (جگن ناتھ آزاد)

مجھ کو بودا بھی کہا گیا۔ یہ بھی کہا گیا کہ ہندو مسلم کے خون سے سینچی گئی ہوں۔ مجھے انکار نہیں۔ میں نے غالب کو اپنایا اور میر، اکبر، کیفی کو بھی۔ سکھوں نے، عیسائیوں نے مجھے بغلگیر کیا۔ میں نے ہر ایک کو ماں کا پیار دیا۔ ملکہ وکٹوریہ بھی مجھ سے مراعت ہوئی اور لندن میں اُردو سیکھنے کا

استعمال کرلیا۔ روزنامچہ لکھنے کی صلاحیت بھی حاصل کرلی۔

آزادی کی جدوجہد میں، اعلیٰ تعلیم کے فروغ میں، قوم میں شعور پیدا کرنے کے لئے میری مانگ رہی ''انقلاب زندہ باد'' کا نعرہ میرا ہی تھا۔ منشی نولکشور مجھ پر ہی چھپائی کے احاطہ میں مہربان رہے حب الوطنی کے نغموں کی مجھ میں کمی نہیں۔ گیان پیٹھ ایوارڈ میرے شہزادوں کو ہی ملا۔ فراق، قرۃ العین حیدر کو یہ اعزاز ملا ہے۔ سرکاری زبان کسی ریاست کی نہیں ہوں۔ لیکن کشمیر سے کنیا کماری تک سمجھی جاتی ہوں۔

ہوا کو وایو، آگ کو اگنی، تالاب کو جلاشے، باغ کو پشپاوان۔ دوکانوں کو وستو بھنڈار سڑک کو مارگ، آدمی کو مانو یا منشیا، عام آدمی تو یہ کہہ نہیں پا رہا ہے۔ میری ہی زبان کو استعمال کررہا ہے، کررہا تھا، کرتا رہے گا۔ اب تک ہمارے ملک کے باون جامعات میں مجھ پہ مطالعہ ہے، تحقیق ہے۔ تدریس ہے۔ عالمی سطح پر بھی لوگ میری زبان میں گفتگو کرتے ہیں، مقالے لکھتے ہیں، شاعری کرتے ہیں کنگس کالج لندن میں آصف اقبال نے ''ولیم جیمس اور اقبال کے فلسفہ پر'' مقالہ پیش کیا ہے رفیع حبیب ''جدید اردو انگریزی ادب کا تقابلی مطالعہ'' کررہے ہیں۔

انگلستان میں کوئی ایک ہزار پروانے مجھ پر اشعار لکھتے ہیں۔ ساز کے ساتھ نغمے الاپتے ہیں جہاں میرا تمدن رہا وہیں میری قدر زیادہ نہیں رہی۔ عرضی، درخواست تک بھی دینا محال ہے رسالوں کی تو حد نہیں۔ خود حیدرآباد میں دس روزنامے ہیں چالیس ہفتہ وار، پندرہ روزہ ماہنامے ہیں۔ ''شب خون'' میں بھی ہوں تو ''گفتگو'' میں بھی گھس گئی ہوں۔ ''شاعر'' میں نصف صدی سے ہوں تو دورِ حاضرہ کی ''شاداب'' میں بھی ہوں۔ ''سیاست'' سے قریب ہوں تو ''قومی آواز'' و ''انقلاب'' سے بھی اُلفت ہے۔ دنیا کا سفر ''شمع'' سے کرلیتی ہوں تو ''نئی دنیا'' ''اکیسویں صدی'' ''مولوی'' ''منادی'' میں بھی میری کردٹ ہے۔ چند لمحوں کے لئے ''مجرم'' میں بھی جکڑ گئی ہوں۔ ''نکہت'' میں ''روشن چراغ'' ''شہزادہ'' میں بھی سموگئی ہوں۔ ہر ایک سے ہمہ گیری لئے ہے۔ میں دار المطالعہ میں بھی شریک ہوں۔ رام پور لائبریری، آصفیہ لائبریری، نظام ٹرسٹ لائبریری، نیشنل

لائبریری میرے ہی آنگن ہیں۔

چند لوگ میری ہی زبان میں، زبان سے کاروبار کرتے ہیں۔ میرے حدود نہیں۔ تاریخ کی گہرائی ہے تو جغرافیہ کی وسعت ہے غالب صدی تقاریب، اقبال صدی تقاریب، گاندھی صدی تقاریب سے دنیا کا سفر کر چکی ہوں۔ شہرت تو میری فطرت میں ہے۔ میں ہر ایک کو بھاتی ہوں۔

میرے لباس (رسم الخط) پر بھی حملے ہوئے۔ سرمایہ کی خاطر میرے شیدائی اس تجویز میں گمراہ ہو گئے۔ میں سنبھل ہوں۔ میری ایک انفرادیت ہے۔ میں مقبول ہوں۔ "دس دن میں اردو" بھی منظر عام پر آ گیا۔ اردو کے گرائی اسکول کھول دیئے گئے۔ کئی ریاستوں میں اکیڈیمیاں قائم کی گئیں۔ نت نئے ادارے معرض وجود میں آئے۔ ادبی ٹرسٹ بھی آ گیا۔ زندہ دلان بھی آ گئے۔ میرا دم اب گھٹ نہیں سکتا پھر سرکار کا بھی تو رہے عوام کی سرپرستی پر بھروسہ ہے۔ دعوے سے دلچسپی نہیں۔ مذہب سے، دین سے سروکار نہیں۔ سب میری بیٹیاں ہیں بیٹے ہیں سب کا مان میرا ہے۔ سب کا سہاگ میرا ہے؛

فلمی دنیا میں ہیرو ہیروئین میری زبان ہی میں گاتے ہیں۔ گانے گنگناتے ہیں، دھن بناتے ہیں۔ ناچتے ہیں۔ روپیہ کماتے ہیں۔ گنواتے ہیں۔ "برسات" ہوتی ہے تو "گائیڈ" مل جاتا ہے "مغل اعظم" ہے تو چودھویں کا چاند بھی ہے میں "میرا دیس" میں بھی ہوں۔ میرے احاطے میں، میری آنگن میں میرے سایہ میں ماہرین ہیں، نقاد ہیں، صاحب راشے ہیں، صحافی ہیں، تجار ہیں، علمبردار ہیں، پارلیمانی ارکان ہیں، سوشل ورکر ہیں قانون داں ہیں تو ممبران اسمبلی وکونسل بھی۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ میرے بدولت پرورش پانے والے، عظمت و شوکت حاصل کرنے کے بعد، مال بنانے کے بعد ٹھکرا دیتے ہیں۔ فٹ پاتھ والے بھی چاہتے ہیں۔ قصر کی جھونپڑی کے دو ہوالوں میں ہوں تو پریسیڈنٹ کے مظہر میں بھی۔ جمہوریت کی سادہ مثال میری ہی ہے

مجھ پر مرثیے، مثنویاں، گیت لکھے گئے۔ نظم، غزل، خطوط، جادو بیان کی کمی نہیں، تحفہ جات ادب میں قدیم شاعری قلی کی ہے تو جدید شاعری فہمی کی ہے علی سردار جعفری کی بھی ہے۔ داغ کی بھی۔ رباعی تو نئی تالیف ہے نئی صنعت ہے جو دوسری زبانوں میں نہیں پائی جاتی۔

گنگا جمنی تہذیب کی نشانی ہوں۔ میرے ملک میں کوہ غالب، کوہ میر، کوہ آتش ہیں۔ آبشارانِ مخدوم، جگر ہیں میرے بھگت گن نہاتے ہیں ڈبکیاں لگاتے ہیں مشاعرے، ادبی اجلاس ادبی میاں نامی فصلیں اگاتے ہیں۔ میری زرخیز ادب کی سینچائی دریا ئے کلام سے ہوتی ہے۔ حسن تخیل اور جدت بیان دلکش انداز میں ہے۔

دل میں ڈوبا ہوا ہے جو نشتر
میرے دل کی زبان نہ ہو جائے
قسمتوں سے ملا ہے درد ہمیں
کہیں آرام جان نہ ہو جائے (جگر مرادآبادی)

مفید اشارہ ہے انسان کو اس شعر میں

ہر حال میں نیک و بد کی پہچان رہے
انسان بڑا بن کے بھی انسان رہے (جوش)

اس شعر کی تاثیر دیکھئے

تنکا حقیر سا ہے لیکن
وہ ہواؤں کا رخ بتلاتا ہے (دواکر راہی)

انگریز، فرنگی، پرتگیزی میری لطافت و نفاست سے بچ نہ رہ سکے۔ انہوں نے پختہ مشق پائی ہے۔ بلیک صاحب کی بیٹی کا تخلص خفی تھا۔

جن سے ہم آشنائی کرتے ہیں
ہم سے وہ بے وفائی کرتے ہیں

اوج یعقوبی کے ان اشعار کو ملاحظہ کیجئے

عزیزانِ وطن

سورج کی کرنوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا

جب اس کی فیض بخشی عام ہے سب پہ

تو پھر کیا ستم ہے

فیض یابوں کے دلوں میں فاصلے کیسے؟

اس شعر میں تنبیہ ہے

اگر بدل نہ دیا آدمی نے دنیا کو

تو جان لو کہ یہاں آدمی کی خیر نہیں (فراق)

امن کے ماحول میں ہی ادب کی سرپرستیاں پائندہ باد ہوتی ہیں۔ میری رائے ہے

جنگ ایک وبا ہے

امن ایک دھیلا ہے

ہم جنگ پسند کو آگے بڑھنے نہ دیں گے

ہم امن پسند کو رکنے نہ دیں گے (دقتیل)

مجھ میں وصیلوں کی کمی نہیں۔ حروف تہجی میں ترمیم کی ضرورت نہیں۔ رسم الخط میں تبدیلی کی بالکلیہ ضرورت نہیں۔ تاریخ، جغرافیہ، ماحول، کائنات، قدرت، احساسات، مشاہدات میرے مبداء ہیں اشیائے سخن یوں سرچشمے ہیں ہر ایک زبان کے الفاظ کو لے کر چلتی ہوں۔ اپنے حروف کو دان بھی کرتی ہوں دوسری زبانوں کو۔ میرے الفاظ کو لے کر چلتی ہوں۔ اپنے حروف کو دان بھی کرتی ہوں میرے الفاظ جمابندی میں ہیں تو عام بول چال کی زبان انگریزی میں بھی۔ کھڑی بولی میں ہوں تو برج بھاشا میں بھی، پنجابی میں گھل مل گئی ہوں تو سندھی میں مہذب ہو گئی ہوں۔ چند الفاظ کے ترجمہ کرنے کی کوشش مجھ میں نہیں ہے مثلاً ریل گاڑی، انجن وغیرہ۔ اجزا ایمان ادب بن گئے ہیں۔

میری گذارش ہے، خواہش ہے، طلب ہے کہ ہر ایک جو اردو سے لگاؤ رکھتا ہے کچھ وقت لکھنے میں صرف کرے، کام کرے۔ ماں کیا چاہتی ہے بچوں سے صرف پیار، محبت، انس۔ مجھ سے ادب ساز، قلم کار، شاعر، مصنف، صحافی قریب ہی رہ پائیں۔ اپنے پھل کو میری زبان

سکھائیں۔ خوبیاں بتلائیں۔ جنسی ادب، فحش ادب کی پرورش نہ کریں۔ ذخیرۂ ادب، مطالعہ آموز ادب کی سینچائی کریں۔ نصابی کتب کی کمی کو دور کریں۔ سائنس کو میڈیم ہی ذریعہ عوام تک پہنچائیں۔ خیر لینا۔ خیرات کرنا نیک افعال ہیں، نعمتیں ہیں اس حرکت میں برکت ہے۔

ولی بنیں یا صوفی۔ مرشد بنیں یا پیر۔ لیڈر بنے یا بلیڈر۔ منسٹر بنے یا کلکٹر۔ مجھے اپنانے کی کوشش کریں۔ پرورش کریں۔ سیکھیں، اشاعت کریں۔ جاہی زبان کبھی نہ کہیں۔ نعرہ بازی کی ضرورت نہیں۔ سیوا کریں۔ پریم کریں۔ پریم سے بھگوان بھی مل جاتا ہے تو میں کیا ہوں۔ میں صرف آپ کی زبان ہوں۔

مجھے کیا بھلا دین و مذہب سے نسبت
مرا کوئی مذہب نہیں جز محبت

—★—

(بقیہ صد ۵۲ سے آگے)

موجودہ امریکی فوجوں سے کہتا ہے کہ تم لوگ ایسی سرزمین پر ہو جس کی حکومت گرجا گھر بنانے کی اجازت نہیں دیتی اور نہ ہی یہودیوں اور عیسائیوں کو ادنیٰ حق دیتی ہے۔

لیکن اس کے برعکس عراق کی سیکولر حکومت اپنی سرزمین پر عیسائیوں اور یہودیوں کو عبادت گاہ قائم کرنے کی اجازت دیتی ہے۔ پھر اعداد و شمار بتائے جاتے ہیں کہ عراق میں مساجد سے زیادہ گرجا گھر ہیں، مدارس کا سرکاری نصاب تعلیم خالص سیکولر ہے

" اِنَّ الْمُنَافِقِیْنَ فِی الدَّرْکِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ "

—★—

ڈاکٹر منت الرحمن منشا
اسٹارکی ٹاؤن - ناگپور

غزلیں

دل تو دل جان بھی محرومِ شکیبائی ہے
جانے کس جرم کی ہم نے یہ سزا پائی ہے

اہلِ عالم نے جو دل کھول کے بخشی ہے ہمیں
حاصلِ عشق وہی دولتِ رسوائی ہے

کچھ مرے خونِ جگر کا بھی ہے پَرتو اس میں
تیرے چہرے پہ جو اے دوست یہ رعنائی ہے

خندۂ گل ہے ترے حسنِ تبسم کی جھلک
برق کیا ہے تری ٹوٹی ہوئی انگڑائی ہے

ہے انہی پر مری بربادیٔ جاں کا الزام
وہ نگاہیں جنھیں دعوائے مسیحائی ہے

کچھ نہ کہہ کر بھی کھلا جاتا ہے سب راز اپنا
خامشی میں بھی عجب قوتِ گویائی ہے

فیضِ قدرت سے مجھے دل وہ ملا ہے منشا
جو ازل سے غم و آلام کا شیدائی ہے

دامِ سحرِ چمن کی کھڑکیاں نہیں ہوتیں
اُن گھروں سے پُر رونق بستیاں نہیں ہوتیں

لطفِ گرمیٔ ہستی ان کو مل نہیں سکتی
جن کے خون میں رقصاں بجلیاں نہیں ہوتیں

ہم جنوں مزاجوں میں ملتی ہیں جو کثرت سے
ہر کسی کو حاصل وہ خوبیاں نہیں ہوتیں

اُن کی قدر و قیمت سب موتیوں کے دم سے ہے
کچھ بھی کام کی خالی سیپیاں نہیں ہوتیں

یہ اصول فطرت کا ہے اٹل بہر صورت
ریت پہ رواں ہرگز کشتیاں نہیں ہوتیں

نقشۂ ہنر میں کچھ رنگ بھر نہیں سکتیں
خونِ دل میں جب ڈوبی انگلیاں نہیں ہوتیں

ہیں ہمارے بچے اب ہم سے دو قدم آگے
ان کی شوخیاں خالی شوخیاں نہیں ہوتیں

آدمی سمجھ لیتا قدرِ آدمی کی تو پھر
کوچہ کوچہ میں خوں کی ندیاں نہیں ہوتیں

منشا ہوش میں رہتے گر خرد کے دیوانے
یوں لباسِ ہستی کی دھجیاں نہیں ہوتیں

نظم

عزیز طارق ۔ حیدرآباد

اینٹ

میں ایک اینٹ ہوں
مذہب نہیں ہے کوئی مرا
مجھے کس نے سجایا ہے اپنے مندر میں
میں مسجدوں کی بھی تعمیر کا ایک حصہ ہوں
یہ جانتے ہیں سبھی
مجھی سے گرجا گھروں نے وجود پایا ہے
نہیں یہ جھوٹ نہیں
میں گردواروں کی تقدیس کا بھی قصہ ہوں
سُنا ہے سب نے ایسے
مگر یہ کیا ہوا، کیسے ہوا
نہیں معلوم!

سُنا ہے میں نے کہ اب ٹوٹنا پڑے گا مجھے
میں سوچ سوچ کے حیراں ہوں آج کا انسان
"یقین" کو اپنے وہ اینٹوں میں دفن کرتا ہے
عبادتوں کے لئے اور پوجنے کے لئے
کسی وشیش تپوبھومی کی نہیں حاجت
مگر میں کس سے کہوں اور
کیوں کہوں — آخر

میں ایک اینٹ ہوں
مذہب نہیں ہے کوئی مرا

*

غزلیں

عزیز ناگپوری

شاخِ خم دار کی بلبل کو ادا بھائی ہے
خوب لاکھوں میں صنم تیری بھی انگڑائی ہے

تمام عمر وفا زندگی نبھائی ہے
بس تو اپنی وفا اب نبھانے آئی ہے

سالے دَر کی تو مٹی بھی کمائی ہے
ئیں کے جھکتے ہی تقدیر جگمگائی ہے

ت آثارِ قیامت کی صادق آئی ہے
دُآج بھائی کا دشمن ہر ایک بھائی ہے

پناہ زمانے پہ یارب یہ کیسی چھائی ہے
فا کے نام پہ ہر سمت بے وفائی ہے

شبو آپ کہا مانیئے بزرگوں کا !
زیز اس میں پنہاں آپ کی بھلائی ہے

خان احمد جبلپوری

وہ جو آغوشِ صحرا میں پائے گئے
کرکے رسوا چمن سے نکالے گئے

پیار کی راہ میں پھول کم تو نہ تھے
کیوں کدورت کے کانٹے اچھالے گئے

چاند کے پیچھے پیچھے اُفق کی طرف
ظلمتِ شب سے چھین کر اجالے گئے

ڈوبتے تیرے میرے جذبات کو
جھیل سے کچھ پرندے اُڑا لے گئے

کتنے چہرے ندامت سے جھکنے لگے
سامنے سے وہ جب آئینہ لے گئے

شہر کی قتل گاہوں کی جانب مگر
جان پر ٹوٹ کر جانے والے گئے

روشنی آپ کے گھر کی مطلوب تھی
جانے کتنے گھروں کے اجالے گئے

کس کو احمد یہ تفسیرِ کرم ہو گئی
بحرِ ظلمات سے ہم نکالے گئے

سفیر کاکوروی

اسمائے حسنیٰ

مالک و مولا ہمارے ہے اے خدائے مہرباں
اے محبت کے خزانے گنجِ اسرارِ نہاں
قبضۂ قدرت میں تیرے گردشِ دورِ زماں
مظہرِ جبروت میں بحرِ رواں، بادِ وزاں
کلمہ گویاں ہیں ترے ہم یا حفیظ یا؟

جان و دل سے ہے تو پیارا اے خداوندِ عزیز
اے فروغِ نورِ ایماں ہادیٔ عقل و تمیز
اے عفو تسکین بخش ہوں روزِ رستخیز
نامِ نامی ہے ستاروں تک میں تیرا نور ریز
کلمہ گویاں ہیں ترے ہم یا غفور یا

جیتے ہیں ہم آرزو میں تیری حیّ لایموت
ذکر میں تیرے ہیں نغمے فکر میں تیرے سکوت
بھیجتا ہے تو شعاعِ مہرِ تاباں تا بہ حوت
اور اُگاتا ہے زمیں سے تو ہی سب اشیائے قوت
کلمہ گویاں ہیں ہمیشہ ترے وہاب الوحید

تیری قدرت سے یہ جسمی اور روحانی قویٰ
دم بدم لحظہ بہ لحظہ پاتے ہیں نشو و نما
روز افزوں ہے جہاں میں قوتِ فکرِ رسا
رہگزارِ دہر میں یعنی ہے تو ہی رہ نما
کلمہ گویاں ہیں ترے ہم یا قدیرُ یا قوی

یہ تری بزمِ تجلا ہے ہماری زندگی
سربسر اعجازِ قدرت ہے جہانِ عنصری
حسنِ بے ہمتا کو منظور اک نمائش اپنی تھی
بس اُسے ذوقِ تماشا کی ہے اک جلوہ گری
کلمہ گویاں ہیں ہمیشہ ترے رحمان الرحیم

-*-

"سازِ مغرب (حصۂ چہارم) مرتبہ ڈاکٹر حسن الدین احمد سے

A Prayer of Islam

We priase Thee, O Compassionate!
Master of Life and Time and Fate,
Lord of labouring winds and seas,
YA HAMEED! YA HAFEEZ!

Thou at the Radiance of our ways,
Thou art the pardon of our days,
Whose home is known from star to star,
YA GHANI! YA GHAFFAR!

Thou art the God for which we long,
Thou art our silence and our song,
Life of the sunbeam and the seed,
YA WAHHAAB! YA WAHEED!

Thou dost transmute from hour to hour.
our mortal weakness in to power.
our bondage in to liberty.
YA QUADEER! YA QUAVI!

We are the shadows of Thy Light,
We are the secrets of Thy Might,
The visions of Thy primal Dream.
YA RAHMAAN! YARAHEEM!

by:

SAROJINI NAIDU